

سوارِ نوحِ علمائے دیوبند

جلد ۱

کتاب

ڈاکٹر نواز دیوبندی

toobaa-elibrary.blogspot.com

نوارِ پبلی کیشنز دیوبند

سوانح علمائے دیوبند

جلد اول

مرتب

ڈاکٹر نواز دیوبندی

ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

نواز پبلی کیشنز دیوبند

© Reserved

ضابطہ ۲

ضابطے کی خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف
کاپی رائٹ ایکٹ کے مطابق سخت کارروائی کی جائیگی

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : سوانح علمائے دیوبند جلد اول

مرتب : ڈاکٹر نواز دیوبندی

کمپیوٹر کتابت : نواز پبلی کیشنز دیوبند

سن اشاعت : جنوری ۲۰۰۰ء

باہتمام : اشرف عثمانی

ہدیہ : Rs.164/-

رابطہ :

نواز پبلی کیشنز دیوبند

ضلع سہارنپور یوپی

انڈیا۔ 247554

Phone. 01336-(Off)24824

(Fax) 22822 (Resi) 22822

Nawaz Publications Deoband

Distt. Sah.

India Pin - 247554

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انتساب

- اسلامی اقدار کے محافظ
- ملت اسلامیہ کی بقاء کے ضامن
- مسلم تہذیب و تمدن کے امین
- علوم نبوت کے پاسبان
- اور _ عظمت اسلامی کے نشان

دینی مدارس

کے نام

جن کے وجود میں ہمارا وجود مضمر ہے

توضیحات

دارالعلوم دیوبند

اور

اس کے ہم مشرب دینی اداروں کے مؤسسين،
اکابرین اور علماء و فضلاء کے حالات، مجاہدات، خدمات
اور بے مثال کارناموں کا قابل قدر اور وقیع وزریں سلسلہ،
اکابر دیوبند کی سوانح کا ایک حسین مجموعہ، جس میں ان
علماء کے مفصل حالات زندگی بھی موجود ہیں
جن کی سوانح ابھی تک نامکمل اور
تشنہ قلم رہی ہیں۔

شخصیات

- ۱۱۹ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی
- ۱۵۱ حضرت مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی
- ۲۵۵ حضرت مولانا محمد مظفر حسین کاندھلوی
- ۲۴۱ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری
- ۲۵۷ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی
- ۳۱۷ حضرت حافظ محمد ضامن شہید
- ۳۴۱ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی
- ۳۷۷ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی
- ۴۷۱ حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی
- ۴۹۳ حضرت مولانا مظہر نانوتوی
- ۵۰۵ حضرت مولانا احسن نانوتوی
- ۵۶۱ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی

تصریحات

• صفحہ اوّل

• ضابطہ

• رابطہ

• انتساب

• توضیحات

• شخصیات

• تصریحات

• توجیہات

ڈاکٹر نواز دیوبندی

• تقریظات

حضرت مولانا سیدانظر شاہ کشمیری مدظلہ العالی

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری مدظلہ العالی

حضرت مولانا حبیب الرحمن قاسمی مدظلہ العالی

جناب مولانا محمد عمران قاسمی صاحب بگیا نوی

• تحریرات

مختصر تذکرہ دارالعلوم دیوبند

علمائے دیوبند کے تفصیلی حالات

ڈاکٹر نواز دیوبندی

توجیہات

علم دنیا و آخرت کی ترقی کا زینہ ہے۔ اس کا ہر پائیدان بلندی کی طرف لے جاتا ہے، علم کیا ہے؟ اس کی تعبیر و تشریح کے لئے فلسفہ و منطق کی پیچیدہ راہوں سے گذرنا ضروری نہیں۔ بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ علم اللہ سبحانہ تعالیٰ کی عطاء کردہ معرفت کا نام ہے۔

میں اس موقع پر کسی اور وہابی علم کی بحث بھی نہیں چھیڑنا چاہتا، اپنے نظریہ کے مطابق صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ علم کو اگر حقیقی اعتبار سے اور معنویت کے وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو علم نام ہے صرف خشیت الہی، رضا، مولیٰ اور مستقیم راستہ جان لینے کا۔ اس کے علاوہ ”معلومات عامہ“ سے زائد کچھ بھی نہیں۔

باری تعالیٰ نے انسان کو قوت عقلی سے سرفراز کیا ہے۔ جس کا کام یہ ہے کہ انسان کو اس کی زندگی کے مقصد اور صلاحیتوں کا ادراک کرائے۔

انسانی صلاحیتیں منفی بھی ہوتی ہیں اور مثبت بھی۔ انسان میں رکھی گئیں یہ منفی اور مثبت صلاحیتیں کسی نفس شناس مصلح کے بغیر متوازن نہیں رہ سکتیں۔ اسی توازن کو قائم رکھنے کیلئے معاشرتی قانون اور ضابطے وضع ہوتے ہیں۔ بغیر دباؤ اور بغیر کسی راہبر اور راہنما کے انسانی صلاحیتیں اپنے اپنے انداز میں پروان چڑھتی ہیں یا ان کا نشوونما بگڑ جاتا ہے، جس کا منطقی نتیجہ انسان کی داخلی اور ظاہری زندگی کا توازن بگڑ جانے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جہاں یہ توازن باقی رہتا ہے وہاں ”سیدھی راہ“ پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی صحبت، ان کی اصلاح و تربیت اور ان کی نظر عنایت اس توازن کو قائم کرنے میں کتابی علم سے زیادہ سودمند اور مؤثر ہوتی ہے، دور قحط الرجال میں۔ اب ایسے رجال ساز کہاں سے لائیں، جن کی انگلی پکڑ کر توازن کو برقرار رکھا جاسکے۔ اس محرومی کے ماحول میں ان بزرگان دین کی سوانح بھی اپنا اثر دکھاتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں۔۔۔ اسلاف اور بزرگان دین کے نقش قدم پر چلنے سے ایک معمولی آدمی

بھی غیر معمولی اور مثالی انسان بن سکتا ہے۔

اسلام کا معاملہ عجیب ہے۔ اس دین سے عروج کی سیڑھیاں اور ترقی کی راہیں سر کرنے کے لئے آگے کا کوئی راستہ نہیں بلکہ چودہ سو سال پیچھے لوٹنا پڑتا ہے، ٹھوس حقیقت یہی ہے کہ ہمارے ماضی کی طرف لوٹنے میں ہمارے دائمی مستقبل کی فلاح ہے۔

اس واپسی کے سفر کی سمت جانے کے لئے قرآن و حدیث کی رہنمائی سب سے معتبر ہے اور جنہوں نے قرآن و حدیث کی رہنمائی کا ادراک کیا، ان برگزیدہ اسلاف سے بہتر کوئی رہبر و امیر بھی نہیں ہو سکتا۔

اسی قسم کے بکھرنے بکھرنے مختلف خیالات نے اس کتاب کو ترتیب دینے کی تحریک پیدا کی، اس سلسلے میں تلاش و جستجو کا آغاز ہوا، بہت سے کتب خانے دیکھے اور کچھ سوانح اور تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اسی دوران دنیا کی بہت سے تحریکوں کے احوال بھی سامنے آئے، تقابلی مطالعہ میں شدت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ اسلامی تحریک سے زیادہ مؤثر اور وسیع نیز کامیاب تحریک اس کرہ ارض پر رونما نہیں ہوئی۔ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے، لیکن اگر عمرانیات کی زبان میں اس کو ایک تحریک مان لیا جائے، تب بھی یہ سچ ہے اس سے زیادہ پاکیزہ تحریک کوئی نظر نہیں آتی، فرق صرف اتنا ہے کہ ہم اس میں پاکیزہ کا اضافہ کرتے ہیں اور ماہرین عمرانیات اس کو ”پھوٹ پڑنے والی تحریک“ کہتے ہیں۔ فلاسفہ سماجیات کے نزدیک عظیم الشان تحریکیں وہ ہوتی ہیں، جن کے ہر گوشے کا رخ اپنے اصل کی جانب ہو اور وہ گوشہ اپنے اصل کیلئے خود ایک تحریک بن جائے۔ اس اصول کی روشنی میں توسیع اسلام کی ایک جزوی تحریک جس کو دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانا جاتا ہے، بھی زیر مطالعہ رہی۔

دارالعلوم ایک تحریک ہے۔ اس کی ہم عصر مختلف مذہبی تحریک کے تقابلی مطالعہ نے یہ بھی بتایا کہ دارالعلوم تحریک اپنے درجہ وجود اور اثرات و ثمرات کے لحاظ سے نہ صرف اپنی ہم عصر بلکہ ماضی بعید کی بھی بہت سے تحریک سے زیادہ وسیع و عریض ہے۔

میں کل بھی طفل مکتب تھا اور آج بھی ہوں۔ معمولی فرق صرف یہ آیا ہے کہ کل تک میں دارالعلوم کو ایک بہت بڑا مدرسہ سمجھتا تھا اور آج احیاء دین کیلئے دنیا کی سب سے بڑی تحریک سمجھتا ہوں۔

اس تحریک کا سلسلہ کہاں سے ملتا ہے، اس تحریک کا محرک کون ہے، اس کا منصوبہ ساز کون ہے، کس نے اس کو عملی جامہ پہنایا، یکے بعد دیگرے کس کس سرخیل کے ماتھے میں اس کا

پر چم آتا رہا اور اس قافلے کے وہ لوگ کیسے تھے، جنہوں نے اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ وہ کون تھے اور کیا تھے؟؟ ان سب سوالات کا جواب تلاش کرنے میں جو کچھ مطالعہ کیا، نہایت حیرت انگیز تھا۔ میں تنہا اس حیرت و استعجاب کے عالم میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس کیفیت میں میں دوسروں کو بھی شامل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جو کچھ سرمایہ میرے پاس جمع تھا اس کے متعلق یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اس کو مزید اضافوں کے ساتھ ”آپ تک“ پہنچاؤں۔ اسی جذبے کے تحت میں نے دارالعلوم تحریک سے وابستہ علماء کرام کی سوانح یکجا کرنے اور ترتیب دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ بہت سی شخصیات کے حالات زندگی مہیا تھے لیکن ”مزید“ کی خواہش نے بڑی عرق ریزی کرائی۔ بزرگوں سے سنا تھا ”نیک نیت منزل آسان“ ایسا ہی ہوتا گیا۔ خدا کا شکر ہے چند محسنوں نے حوصلہ افزائی اور مدد کی جس کی بدولت یہ کام مکمل سا ہو گیا۔

خصوصاً یہاں اپنے بہت ہی عزیز برادر ام اشرف عثمانی کا ذکر نہ کرنا حق تلفی ہوگی موصوف کو اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے ملک کے معروف نوجوان صحافی اور صاحب قلم ہیں اشرف عثمانی کی مخلصانہ علمی معاونت نے بہت سی مشکلوں کو آسان کیا اور اس کام کی تکمیل میں انہوں نے بڑا وقت دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ غایت درجہ کا تعاون اور توجہ نہ فرماتے تو ابھی کام مکمل ہونا بہت دشوار ہوتا۔ خدا تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولانا محمد شاہد صاحب سہارنپوری اور حضرت مولانا نور الحسن صاحب راشد کاندھلوی نے بھی بڑی راہنمائی فرمائی اور کتابوں کی فراہمی میں بڑی شفقت اور فراخ دلی کا معاملہ فرمایا، جناب مولانا محمد عمران صاحب قاسمی نے نہایت احسن طریقے سے اس کتاب کی تصحیح فرمائی اور موصوف نے دوران تصحیح بہت سے مفید و قیمتی مشوروں سے بھی نوازا اس کتاب کی تکمیل میں ان کی بھی دوا اور دعاؤں شامل ہیں۔

تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ قبل ازیں ”دارالعلوم اور اسکی اردو صحافتی خدمات“ پر راقم نے ایک تحقیقی مقالہ قلم بند کیا، اس کے اعتراف میں میرٹھ یونیورسٹی نے راقم کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا۔ یہ مقالہ زیر طباعت ہے۔

اس تحقیقی مقالے کی تکمیل میں بھی کئی دشوار کن راہوں سے گزرنا پڑا۔ جملہ صحافیوں کی بکھری داستانیں اور ان کے کارنامے سمیٹنا مجھ جیسے کم علم کیلئے یقیناً آسان نہ تھا۔ اس دوران

بھی مجھے یہ احساس رہا کہ ہم نے اپنے اسلاف کی نہ قدر کی اور نہ ہی ان کے مقام و مرتبہ کو پہچانا، یہی احساس ”سوانح علمائے دیوبند“ پر کام کرتے ہوئے بھی ہوتا رہا۔
 سچ تو یہ ہے کہ سوانح علمائے دیوبند جیسے تحقیقی اور علمی موضوع پر کام کرنا مجھ جیسے کم علم کا کام نہیں اس کام کے لئے باقاعدہ ایک منظم تحقیقی ادارہ کی ضرورت ہے۔

میں صدق دلی سے اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ جو کچھ اس کتاب کے سلسلہ میں میں نے کیا ہے۔ وہ ان عظیم المرتبت بزرگوں کے شایان شان نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ بکھرے شیرازے کو مرتب کر کے میں نے ایک نقش اول دیدیا ہے۔ سوچتا ہوں۔ وہ وقت ضرور آئے گا، جب کوئی بڑا تحقیقی ادارہ اس نقش اول کی اصلاح و تکمیل میں آگے ضرور بڑھے گا۔

یہاں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ مذکورہ تحریک یکایک ۱۸۶۶ء کی پیداوار نہیں، اس کی منصوبہ سازی کے سلسلے دور تک پھیلے ہوئے ہیں اس لئے یہی فیصلہ کرنا مشکل رہا کہ اس کا آغاز کہاں سے کیا جائے اور کن کن شخصیات کو اس میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ یہ کیا کہ استاذ العلماء حضرت مولانا مملوک العلیٰ سے اس کتاب کا آغاز کیا اور اس میں ان بزرگوں کو بھی شامل کیا جو کسی نہ کسی انداز میں اس تحریک کا حصہ رہے ہیں۔ سردست پہلی اور دوسری جلد پیش خدمت ہے، تیسری، چوتھی اور پانچویں جلدیں زیر طبع ہیں۔ مزید جلدوں کا سلسلہ اسکے بعد بھی جاری رہیگا (انشاء اللہ)

اس کتاب میں ماضی بعید کے بجائے ماضی قریب کے ان افراد کو لینے کی کوشش کی گئی ہے جن کی وابستگی واستہ یا بلا واستہ تحریک دارالعلوم (ولی اللہی) سے رہی ہے۔
 میں اللہ رب العزت کا شکر بجا لاتا ہوں کہ اس نے مجھے یہ توفیق عطاء کی کہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ اس موضوع پر میں کام کر سکا۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاء گو ہوں کہ وہ میری تمام خامیوں اور کمزوریوں کو درگزر فرما کر ان نفوس قدسیہ جن کا اس کتاب میں ذکر ہے، کی برکت سے اس خدمت کو شرف قبولیت سے نوازے اور مسلمانوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید فرمائے۔ نیز اس سیہ کار و گنہگار کو دین کی مزید خدمت کی توفیق اور صلاحیت سے سرفراز کرے اور اس کوشش کو آخرت میں بخشش کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین

(ڈاکٹر) نواز دیوبندی

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری مدظلہ العالی

تقریظات

بت پرستی عام، شرک کے چرچے، کفر کا تعفن، جا بجا صنم خانے، غضب بالائے غضب، سلطنت مغل اپنی بنیادوں پر گرتی ہوئی تعمیر، عیسائیت کی یلغار، آریہ سماجی ہنگامے، شیعیت و رافضیت کے زلزلے، بدعات و محدثات کا شور، پیر پرستی و قبر پرستی کے نفرت انگیز منظر، قبور پھولوں سے لدی ہوئیں، مزارات پر چادریں، اگر بیٹوں کے لیے، سماع کا شور، قوالیوں کی بھرمار، تقلید کے خلاف محاذ، باطل نبوت کے دعوے، گویا کہ توحید سے کلیتہً انقطاع، برائے نام اسلام، رسمی ایمان، نہ عقائد کی صحت، نہ ایمانیات پر اطلاع، تصوف کے نام پر ابدیسی غوغا، ایک طرف غربت و افلاس کی گرفت، دوسری جانب زمیندارانہ و رئیسانہ ٹھاٹھاٹ، پوجنے والوں سے زیادہ معبود، شجر پرستی، حجر پرستی، گنگ و جمن کا تقدس، یہ تھا ہمارا ہندوستان!

سوچنے اور ذرا حقیقت کی گہرائیوں سے دیکھنے، نگاہ دور میں سے، کہ یہ سب کچھ، محمد رسول اللہ ﷺ کی پیغمبرانہ کاوشوں کے دور سے ملتا جلتا کیسا منحوس عہد تھا، نہ یہاں علم تھا نہ عمل، نہ سنت تھی نہ آثار صحابہؓ، نہ ذوق صحیح تھا، نہ اسلام اپنی واقعی شکل میں، پھر یہاں کام کس قدر دشوار تھا، یہاں کی انجمنیں کیسی جانگداز تھیں، یہاں قدم قدم پر رکاوٹیں، یہاں کی ہر منزل وادی پر خار، اب آئیے اور دیکھئے۔ دیوبند کیا ہے اور دیوبندیت کیا؟

ایک مومنانہ تحریک، منضبط تنظیم، ایمانیات کی اشاعت، اسلام کی علمبرداری، فکر و نظر کی صحت، اعلیٰ کلمتہ الحق کا جذبہ ربے اختیار، اتباع سنت کی دعوت و تلقین، بدعات و محدثات کا استیصال، باطل فرقوں کا تعاقب، قرآن و حدیث، اور اصحاب النبی رضی اللہ عنہم و رضو اعنہ کی پاکیزہ زندگی کے چلتے پھرتے نمونے، وطن اور عالم اسلام کو اغیار کے آہنی پنجوں سے نجات دلانے کیلئے مسلسل کوشش، اور اس راہ میں بے مثال قربانیاں، تردید شیعیت، رد رافضیت، تقلید و عدم تقلید کی آویز شوں میں صراطِ مستقیم، قرآن کی جانب دعوت، حدیث سے باطن کی تطہیر، فقہ و تفقہ کا صحیح مقام، اعتدال، میانہ روی، متوازن فکر، مناسب انداز۔

رہے اکابر دیوبند تو اتباع سنت کے پیکر، صبر و رضا، استغناء، توکل و استقامت کے پہاڑ، انکی راتیں ذکر سے معمور، انکے دن مجاہدانہ عزائم کے مظاہرے، انکی خلوت فکر الہی، انکی جلوت ذکر خدا، انکی مجالس میں علم و عرفان کا فیضان، انکی محفلوں میں غلتہائے سلوک و معرفت کا انکشاف، انکی درسگاہیں قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں سے مترنم۔ انکا قلم گوہر بار، انکے قلوب اور روشن آنکھیں غم ملت میں اشک بار، حسن عمل کے ہمالے، عزیمت کی چٹانیں، احقاق حق کے دیوانے، ابطال باطل کیلئے شمشیر بے نیام، رفتار و گفتار، نشست و برخاست میں سنت کے سانچے، انکے چہرے بشرے معصومیت کے شگفتہ پھول، جنکی دید ایمان کے گلزار میں نسیم سحر کی جانفزائی، ان کے دیکھے سے اسلام متحرک ہوتا، قلب بیدار ہوتا، دماغ جذبہ حق سے سرشار، یہ باطل پر شاہیں کی طرح جھپٹتے، بطلان کیلئے ان کی آواز شیر کی دھاڑ تھی، ان سے مدرسے آباد، ان کے انفاس قدسیہ سے خانقاہیں مصروف، ہو، حق، محراب و منبر کی زینت، اسلام کے تاج محل کی آرائش، ان کی صف بندی باطل سے معرکتہ آلا راجہاد۔

انہوں نے آزاد روش کو پابند شریعت کیا، انہوں نے مزاجی و ارتگی کو تہہ تیغ کیا، یہ اسلام کی جاذب نظر تصویر، یہ ایمان کے پیکر جمیل، انہیں میں حجتہ الاسلام، انہی میں شیخ الاسلام، اسی طبقے میں علم و فن کے امام، انہی میں حکیم الامت، انہی میں شیخ طریقت، جب بطلان کا فرعون رقص کرتا تو ان کے تعاقب سے تھراتا، انہوں نے نصرانیت کو شکست فاش دی۔ یہ ہی برہمنیت پر حملہ آور ہوئے (حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب) پنجاب سے قادیانیت کا فتنہ اٹھا تو دیوبند نے اس کے مقابلے کے لئے انور شاہ کشمیری کو کھڑا کیا۔ تحفظ ختم نبوت کی اس بنیادی شخصیت نے قادیانیت کو ہرجا پر شکست دی، یہ ہی مرد مومن تھا جس نے بھاو پور کی عدالت میں قادیانیت کے مکروہ چہرے سے نقاب الٹی اور قادیانیت کو کفر ثابت کیا۔

ملک کو آزادی سے ہم کنار کرنے کے لئے تحریک چلی تو سیادت و قیادت کا تاج یہیں کے فرد فرید محمود حسن کے سر پر، محاذ آرائی کے لئے پلٹنیں گرم کار ہوئیں۔ تو بہت سے عبید اللہ سندھی، حسین احمد، کفایت اللہ، حفظ الرحمن یہیں سے دستیاب ہوئے۔

یہ اپنے خلوت کدوں سے یہ کہتے ہوئے نکل آئے۔

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے ☆ مرثدہ اے خار دشت تلو امر اکھجلائے ہے

اور جب استخیری و ختم ہوا تو ان کے مقدس لاشے گرد و پیش کو یہ سناتے!

کون ہوتا ہے حریف مے مردا فلک عشق ہے مکر رلب ساقی پہ صدا میرے بعد
 فقہ و تفقہ کیلئے کسی جاندار شخصیت کی تلاش ہوئی، تو نگاہیں رشید احمد پر جاٹکیں، خانقاہوں
 کو کوئی حکیم الامت درکار ہوا تو مرکز نگاہ اشرف علیؒ تھا، حدیث کو کسی بخاری وقت کی تلاش
 تھی، تو انور شاہ کشمیریؒ موجود، ان کا علم تو صیف مستغنی، ان کا فن تعریف سے بے نیاز، ان
 کا ظاہر و باطن یکساں، انکی خلوت و جلوت نپی تلی، ان کی زندگی، ان کے کارناموں، ان کے
 کردار، انکے شعار کو سمیٹنے کیلئے جس قلم، جس متوازن فکر، جس فکر صحیح، جس اعتدال و انصاف
 کی ضرورت تھی، تو خدا تعالیٰ نے اس کیلئے ہندوستان نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت کے معتبر
 مورخ، متوازن انشاء پرداز، خوش گو، خوش گلو جناب محترم نواز دیوبندی صاحب کا انتخاب کیا،
 یہ انتخاب من جانب اللہ، یہ توفیق خیر رفیق، یہ سعادت سرمدی، یہ امتیاز قابل رشک، شاعر
 حساس ہوتا ہے اس کا ذوق لطیف، اس کا فکر نظیف، اسکی تشبیہات نادر، اس کے استعارے
 دلکش، جب یہ سب کچھ ہے تو علمائے دیوبند کی تاریخ کا یہ صحیفہ نگارستان تاریخ کا وثیقہ ہے،
 مطالعہ سے پہلے اس حقیقت کو نہ بھولئے، کہ علمائے دیوبند الحکمتہ کو ضالۃ المومن
 سمجھتے، ان کا مسلک خذ ما صفا ودع ما کدر تھا۔ وہ پھول چنتے لیکن کانٹوں سے خود کو
 بچا کر، وہ سفر کرتے لیکن اپنے قدموں کو خار مغیلاں سے محفوظ رکھ کر، یہ نگینہ لیتے اور تاج علم
 و معرفت میں خود جڑتے، یہ موتی اٹھاتے اور اسکی قیمت کے مطابق اس کی جگہ پہنچاتے،
 انہوں نے کسب فیض میں ان اصول کی پابندی کی جو منصوص تھے، ان ضوابط سے باہر نہ
 ہوتے جو شریعت و سنت کے آئینہ دار تھے۔

تو لیجئے اب پڑھئے، اور نواز دیوبندی صاحب کی کاوشوں کی داد دیجئے، رہی بارگاہ رب
 العالمین، تو وہاں کیلئے قبولیت کی دعائیں محبوبیت کی صدائیں اس تڑپ کیساتھ یا معجب
 الداعوات، یا سمیع الدعاء اس تالیف کو قبول کیجئے، اور قبولیت کے مظاہر قدم بقدم نہیں
 بلکہ باران رحمت کی طرح برسمیں اور انوار الہی کی طرح جگمگائیں۔ آمین بجاہ سید المرسلین

(نظر شاہ کشمیری)

(شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند)

۱۷ شعبان المعظم ۱۴۲۰ھ

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری مدظلہ العالی

تقریظات

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى!
 بزرگوں کے احوال اور ان کی سوانح کو قید تحریر میں لانا ایک قدیم رجحان ہے اور اسلامی نقطہ نظر سے بھی اس کی بہت اہمیت ہے، قرآن کریم میں رسول پاک ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے۔

و كلا نقص عليك من انباء
 الرسل ما نثبت به فؤادك
 وجاءك في هذه الحق
 وموعظة وذكرى للمومنين
 (سورہ ہود آیت ۱۲۰)

ہم رسولوں کے احوال سے آپ کے سامنے
 سب بیان کرتے ہیں جس سے آپ کے
 دل کو تسلی دیتے ہیں اور اس میں آپ کے
 پاس تحقیقی چیز اور اہل ایمان کیلئے نصیحت
 اور یادداشت کے لائق بات آئی ہے۔

معلوم ہوا کہ ان حالات کے بیان کا ایک فائدہ تو دل جمعی اور سکون خاطر ہے اور دوسرا
 فائدہ یہ ہے کہ اس سے اہل ایمان کو نصیحت و عبرت حاصل ہوتی ہے، یہ تو صالحین کی
 سیرت اور ان کے ذکر خیر سے متعلق ارشاد فرمایا گیا۔

لیکن جہاں تک عبرت ناک سبق کی بات ہے تو وہ صالحین کے تذکرے کے ساتھ
 خاص نہیں، قرآن کریم میں بلعم باعوراء کا حال نقل کر کے فرمایا گیا۔

فاقصص القصص لعلمهم
 يتفكرون (سورہ الاعراف آیت ۱۷۶)

آپ یہ احوال بیان کریں تاکہ وہ لوگ
 غور و فکر کریں۔

بلعم بن باعوراء اہل کتاب کا ایک بڑا عالم اور صاحب تصرف درویش تھا، بعد میں اللہ
 کے احکام سے روگردانی کر کے ہوا و ہوس کا اسیر ہو گیا، قرآن کریم نے اس کا کچھ حال
 بیان کر کے یہ ارشاد فرمایا: کہ اس کے واقعات میں علماء سور کے لئے بڑا عبرت انگیز
 اور سبق آموز بیان ہے۔

نیز یہ کہ خداوند کریم نے رسول پاک ﷺ کو جو بہ صیغہ امر فاقصص کہہ کر مخاطب فرمایا

ہے اس سے فقہاء نے یہ سمجھا ہے کہ سچے اور عبرت انگیز واقعات کا بیان کرنا کم از کم استحباب کے درجہ کی چیز ہے بشرطیکہ اس کا مقصد دینی فائدہ ہو۔

پھر یہ کہ اگر احوال و سوانح کے اس بیان و ترتیب میں متعدد دینی مصلحتیں اور فائدے ہوں تو ان کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جائے گی، زیر نظر کتاب میں جہاں اکابر دیوبند کے کارناموں سے درس عبرت حاصل کیا جائے گا، وہیں یہ کتاب ان بزرگوں کے احسانات کے اعتراف کا بھی ایک خوبصورت طریقہ ہے کہ ان بزرگوں نے زندگی کی سنگلاخ راہوں میں آبلہ پائی کر کے بعد میں آنے والوں کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے اور ان کے احسانات کا تقاضا ہے کہ ہم ان کے ذکر خیر سے اپنے قلب و دماغ کے تمام پہلوؤں کو منور کریں۔

اکابر دیوبند دراصل ایسے سدا بہار قافلے کا نام ہے جن کا ہر فرد اپنی جگہ ایک جماعت ہے، اس جماعت کے ایک ایک فرد نے اتنا کام کیا ہے کہ بسا اوقات پوری پوری جماعت سے وہ کام انجام نہیں پاسکا ہے، یہ گلہائے رنگارنگ کا وہ گلدستہ ہے جس کا ہر پھول گل سرسبد کہلانے کا مستحق ہے، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے اکابر دیوبند کے بارے میں بجا فرمایا تھا۔ ع

ایک مجلس تھی فرشتوں کی جو برخاست ہوئی

ان حضرات نے اس آخری دور میں جس طرح کا کردار پیش کیا اس کے پیش نظر متقدمین کے اوصاف و کمالات پر یقین کرنا آسان ہو گیا، اور یہ ثابت ہو گیا کہ پیغمبر آخر الزماں ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور آپ کے پاک طنیت اور پاکیزہ صفت اصحاب کا اتباع یا دوسرے الفاظ میں زندگی گزارنے کا وہ طریقہ جسے اتباع سنت کہتے ہیں۔ کسی بھی دور میں دشوار نہیں ہے۔

قرآن کریم نے انبیاء کرام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے جو اوصاف حمیدہ ذکر کئے ہیں اور جن کمالات علم و عمل کا بیان کیا ہے، آپ کو اکابر دیوبند کی سوانح میں وہ تمام اوصاف نہات روشن طریقہ پر جلوہ گر نظر آئیں گے، اور ان حضرات کی زندگی میں کردار و عمل کی بلندی کے وہ نمونے جابجا ملیں گے جن پر خیر القرون کا گمان ہوگا۔ اور کردار و عمل کی ان عظمتوں کے ساتھ علمی فتوحات کا بھی ایک وسیع باب نظر آئے گا، ان حضرات نے اپنی علمی جانفشانیوں سے قرون اولیٰ کے اصحاب علم و فن کی یاد تازہ کر دی، نیز یہ کہ ان علمی و عملی کمالات

کے ساتھ قوم و ملت کے لئے سرفروشانہ جدوجہد کے میدان میں بھی ان بزرگوں نے قائدانہ کردار ادا کیا۔

اکابر دیوبند کے ان تمام کارناموں میں اخلاص اور لوجہ اللہ کام کرنے کی روح، ان کا طرہ امتیاز ہے، یہ حضرات صرف اللہ کے لئے اور اللہ کی رضا کے لئے کام کرتے رہے، شہرت اور نام و نمود کے لئے کام کرنے کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے اس لئے انہوں نے اپنے دامن کو اس داغ سے پوری طرح محفوظ رکھا اور ان کے کمالات و حالات پوری طرح دنیا کے سامنے نہ آ سکے۔

تاہم ان بزرگوں کے احوال و سوانح کا جو حصہ محفوظ رہ گیا، نہایت مسرت کی بات ہے کہ مشہور اور ہر دل عزیز شاعر محترم جناب ڈاکٹر نواز دیوبندی صاحب دام اقبالہ نے اس موضوع پر کام شروع کر دیا ہے، اور وہ انشاء اللہ خدائے پاک کی توفیق سے اس موضوع کا حق ادا کریں گے، کام بہت بڑا ہے اور اس کی متعدد ضخیم جلدیں مرتب ہوں گی، جلد اول آپ کے ہاتھ میں ہے جس میں متعدد بزرگوں کی زندگی کا تفصیلی مرقع ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ مرتب محترم کو اس کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے، راستے کی مشکلات کو دور کرے، اور اکابر دیوبند کے حقوق کی ادائیگی کے لئے وہ ہم سب کی طرف سے جو فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں اس کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول سے نوازے۔ آمین

ریاست علمی بجنوری خفرہ
(استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند)

۱۹ اکتوبر ۱۹۹۹ء

حضرت مولانا حبیب الرحمن قاسمی مدظلہ العالی

تقریظات

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على خاتم

الانبياء والمرسلين وعلى اله واصحابه واتباعه اجمعين۔

اما بعد۔۔۔۔۔ اسلام کا تہذیبی ورثہ اور علمی میراث جو خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام

سے صحابہ کو اور صحابہ سے تابعین، ائمہ مجتہدین اور محدثین کو پہنچا پھر یہ زریں سلسلہ یونہی جاری رہا اور اسلام کے ہر عہد میں ایسی شخصیتیں ظہور میں آتی رہیں، جنہوں نے دین قیم کے اصول و عقائد اور اساس اعمال کو ہر قیمت پر زندہ رکھا۔ تاریخ میں کسی ایسے وقفہ کا دور دور تک بھی سراغ نہیں ملتا جس میں اسلام کی تعبیر اور کتاب و سنت کی تفسیر اور تشریح یکسر تحریف کی نذر ہو گئی ہو، بلکہ خدائے کار ساز ہر زمانہ میں ایسے افراد اور جماعتیں پیدا کرتا رہا جن کی زندگی حفاظت دین اور اظہار حق کے لئے وقف رہیں حالات کے پیچ و خم اور طاغوتی طاقتوں کے ظلم و ستم انہیں ایک انچ بھی اسلام کی شاہراہ مستقیم سے نہ ہٹا سکے۔

یہی اسباب کی وہ دنیا ہے جس کے تحت دین اسلام کی ابدی حفاظت ہوئی اور رب قدیر

کا یہ وعدہ پورا ہوتا آیا ”انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون“

عصر حاضر میں سرحد اسلام کی جماعت کیلئے خدائے علیم و حکیم نے علمائے دیوبند کا انتخاب کیا، اور آج یہی جماعت دین خالص کی علمی و فکری نمائندگی کی خدمت انجام دے رہی ہے، اور اس سلسلہ میں اس جماعت نے جانبازی و جانپاری کی ایسی مثالیں قائم کی ہیں جن سے اسلام کے عہد قدیم کی یادیں تازہ ہوئیں۔ علمائے دیوبند کی ان مخلصانہ خدمات کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا کے جس خطہ میں بھی آپ چلے جائیں، آپ کو وہاں اسلام کے خدمتگار کی حیثیت سے علمائے دیوبند کا ذکر ضرور ملے گا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف اپنے اور پرائے سبھی کو ہے۔ بایں ہمہ علمائے دیوبند کے خدمات و کارناموں کے مفصل و مرتب تذکرہ سے ہمارا علمی و ادبی سرمایہ اب تک تہی دامن تھا۔

اہل علم بالخصوص جماعت دیوبند کی جانب سے محترم ڈاکٹر نواز دیوبندی تحق ستائش ہیں

کہ انہوں نے اس کمی کو محسوس کر کے سالہا سال کی متواتر جدوجہد کے ذریعہ اس خلاء کو پر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور علمائے دیوبند کے حالات و سوانح اور علمی و عملی کمالات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب مرتب کر دی ہے جس کی یہ پہلی جلد آپ کے سامنے ہے۔

ڈاکٹر نواز صاحب شعر و ادب کی دنیا میں ایک خاص پہچان رکھتے ہیں اور برصغیر ہی نہیں بلکہ یورپ تک کے ادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اب اس مبارک کتاب کے توسط سے وہ علمی حلقوں میں ایک سیرت نویس و تذکرہ نگار کے روپ میں سامنے آرہے ہیں اور توقع ہے کہ انشاء اللہ وہ اس میدان میں بھی گویا سبقت لے جائیں۔

۱۰ شعبان المعظم ۱۴۲۰ھ

۱۹ نومبر ۱۹۹۹ء

حبیب الرحمن فاسمی
(استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند)

مولانا محمد عمران قاسمی بگیا نوی

تقریظات

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين . والصلوة والسلام على

سيد المرسلين وعلى اله واصحابه اجمعين .

نفس علم کی اہمیت و افادیت اور معنویت ہر ذی شعور کے نزدیک مسلم ہے۔ دنیا کا ہر عاقل و صاحب فہم جانتا ہے کہ لاعلمی و جہالت ایک اندھیرا و ظلمت ہے اور انسانی زندگی کی ترقی و کامیابی کا دار و مدار علم پر ہے۔

اسلام نے نہ صرف علم کی فضیلت بیان کی بلکہ اس کو وصول الی اللہ کا ذریعہ قرار دے کر اس کی حقیقی تعریف اور مرتبہ اصلی کو بھی ظاہر کیا۔ قرآن پاک میں بصورت استفہام اگر ایک طرف اہل علم کی فضیلت و امتیاز اہل یتوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون سے بیان کیا گیا تو دوسری طرف مسجود ملائکہ حضرت آدم علیہ السلام کو کمال علمی ہی کی بنا پر افضل الملائکہ قرار دیا گیا، پھر انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء کے ذریعہ اس طرف بھی تنبیہ کر دی گئی کہ خوف خدا اور خشیت الہی درحقیقت اہل علم ہی کا حصہ ہے۔

حدیث پاک میں بھی شرف علم اور کمال علمی کی اہمیت و فضیلت کو مختلف انداز سے واضح کیا گیا ہے۔ کہیں اعلان ہے کہ العلماء ورثة الانبیاء یعنی انبیاء کے حقیقی جانشین علماء ہی ہوتے ہیں۔ کہیں فرمان ہے کہ ان خیر الخیر خیار العلماء وانما بعثت معلما یعنی دنیا میں سب سے بہترین چیز علماء دین ہیں اور مجھ کو معلم بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔ جہاں علماء کی وقعت و عظمت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم ————— فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد —————

ان العالم یتغفر لہ من فی السموات ومن فی الارض وہیں یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ عالم کے چہرے کو دیکھنا اور اس کی زیارت کرنا بھی افضل ترین عبادت ہے۔ نیز یہ واشگاف اعلان بھی کتابوں میں ملتا ہے کہ عالم کی بقاء سے عالم کی بقاء ہے، یہ کارخانہ عالم اسی وقت تک باقی رہے گا جب تک اللہ کے نیک بندوں اور علماء حق کا وجود مبارک اس کے

ساتھ وابستہ ہے، اور جب اس کے فناء کا وقت آئے گا تو اولاً علماء اٹھائے جائیں گے۔ اسی لئے اسلام میں طلب علم کی بڑی فضیلت و عظمت مذکور ہے۔ جہاں اس کی اہمیت و لازمیت طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة کے ذریعہ بیان کی گئی ہے۔ وہیں من طلب العلم کان کفارة لما مضیٰ اور ان الملائكة لتضع اجنحتها رضا لطالب العلم فرما کر اس کی ترغیب و تشویق دلائی گئی ہے۔ بہر حال علم اور علماء دین کی فضیلت و کرامت ایسا امر مسلم ہے جو کسی دلیل کا محتاج نہیں۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد کب اور کس طرح ہوئی، علماء امت نے تبلیغ دین کے لئے کیسے کیسے مصائب و مشکلات کا سامنا کیا، مخلوق خدا کی ہدایت و خیر خواہی کیلئے میدان عمل میں کس طرح مصروف رہے، اسلامی فتوحات کے بعد شجر اسلام کیسے پھلا پھولا، اقوام ہند اسلام اور مسلمانوں کی خوبیوں اور اخلاق کریمانہ سے متاثر ہو کر کس طرح مشرف بہ اسلام ہوئیں، علماء و فقہانے کس طرح مدارس و مساجد قائم کر کے درسی اور علمی مجالس قائم کیں، صوفیا و اہل دل نے خلق خدا کو کیونکر فیض یاب کیا، پھر عروج و ترقی کے بعد اسلامی سلطنت کا زوال کس طرح ہوا، زوال سلطنت سے قوم مسلم کس طرح بے یار و مددگار ہوئی، مدارس و مکاتب کس طرح اجڑے، علماء و فقہاء کس طرح حیران اور معاش کے لئے پریشان ہوئے، خانقاہوں کی رونق کس طرح پھیلنے لگی، علمی محفلیں اور درسی مجالس کس طرح ویران ہوئیں، فرنگیوں نے عیاری و مکاری سے کس طرح سلطنت مغلیہ پر قبضہ کیا، مسلم امراء و علماء پر کس طرح جبر و تشدد کیا گیا، مذہب اسلام کے احکامات میں کس طور پر دخل اندازی کی گئی، امت مسلمہ میں کس کس طرح تفرقہ ڈالا گیا، کسی کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تو کسی کو امامت بخشی گئی، کسی کو قید تقلید سے رہائی و آزادی کی شہ دے کر فرقہ بندی کی گئی، قرآن و حدیث کو کس طرح مٹانے کی کوشش کی گئی، صحیح العقیدہ مسلمانوں کو بدعت و شیعیت اور قادیانیت و نیچریت کے مراحل سے گزار کر کس طرح مقام لادینیت تک پہنچایا گیا، اگر اہل علم نے احتجاج کیا تو کس طرح ان کی جاگیریں ضبط، اہانت و بے حرمتی، قید و بند کی صعوبتوں اور دار و رسن تک پہنچا کر انتقام لیا گیا، بے یاری و مددگاری کے اس ماحول میں اہل حق پر کیا گزری ہوگی ذرا خیال کیجئے بس خون کے آنسو رو کر رہ گئے ہوں گے۔

قید تھی اس میں ہر اک ظلم و ستم کی داستاں
وہ جو آنسو جھلملا کر چشم تر میں رہ گیا

اہل اسلام کو کچلنے اور برادران وطن کو اٹھانے کی منافقانہ پالیسی کس طرح وضع کی گئی،
عیسائی مبلغین نے حکومت کی سرپرستی میں اسلام اور مسلمانوں پر کس طرح یلغار کی، مذہب
اسلام، پیغمبر برحق ﷺ اور تہذیب اسلامی پر کس طرح رکیک حملے کئے گئے اور مسلمانوں کی
دنیا کیسا تھ ساتھ دین و ایمان کو لوٹنے کیلئے کیا کیا سازشیں رچی گئیں، منصوبے بنائے گئے
آندھیاں آئیں چمن اجڑا نشیمن جل گیا

مجھ سے سنئے یاد ہیں مجھ کو یہ افسانے بہت

چشم فلک نے یہ سب مناظر دیکھے ہیں اور تاریخ کے سینہ میں سب کچھ محفوظ ہے، علماء
کے حافظے اس سے خالی نہیں اور مورخ کا قلم اس دور کے واقعات نویسی اور تبصرہ نگاری
سے خاموش نہیں۔

لیکن یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ باطل کے ساتھ ساتھ حق بھی موجود رہا حامیان
اسلام اور علماء امت نے بڑے ضبط و تحمل سے کام لیا وہ اپنی بڑھی ہوئی ذمہ داریوں سے عہدہ
برآ ہوئے اور انہوں نے اس چراغ ہدایت کو بجھنے نہیں دیا، باطل کی چالوں اور ٹکڑوں کا میاب
نہیں ہونے دیا اور تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کو مٹانے والے، عظیم سلطنت کے مالک، دولت
و حکومت کے نشہ میں بدمست و مدہوش اور اپنی طاقت و شان و شوکت پر نازاں و متکبر اہالیان
برطانیہ نہ صرف ہندوستان جیسی عظیم سلطنت سے محروم ہوئے بلکہ بڑے بے آبرو ہو کر
اپنے گھر واپس پہنچے۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد دین اسلام کی خدمت کی توفیق جن حضرات کو نصیب
ہوئی ان میں شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان و متعلقین سرفہرست ہیں۔ ان حضرات کے
حالات و خدمات مفصل کتابیں لکھی جا چکی ہیں، میرا مقصد تحریر صرف اتنا ہے کہ سلسلہ حدیث
پاک کا ہندوستان میں باکمل و احسن اجراء اسی خاندان کا فیض ہے اور الحمد للہ اکابرین دارالعلوم
دیوبند اور ان کے اسلاف کا سلسلہ سند حدیث پاک خاندان ولی اللہی سے جڑا ہوا ہے۔

اکابرین دیوبند پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور زیر نظر کتاب بھی اسی سنہرے اور مبارک
سلسلے کی ایک اہم کڑی بننے جارہی ہے نیز دارالعلوم دیوبند کی تاریخ بھی دو جلدوں میں

مرقوم ہو چکی ہے، لہذا یہاں ان موضوعات سے صرف نظر کی جاتی ہے تاکہ اس مضمون کی طوالت نہ بڑھ سکے تاہم ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابرین و مستسبین کے مسلک و مشرب، وصف امتیازی، رخ و رجحان، مزاج و مذاق، سلسلہ نسبت، مقاصد و نصب العین، اہمیت و افادیت، قومی اور ملی خدمات اور دینی قیادت و علمبرداری کے تعلق سے مختصراً چند اشاراتی اور تعارفی عبارات پیش کر دی جائیں تاکہ واقفوں کے لئے باعث تذکیر اور ناواقفوں کے لئے سرمایہ بصارت و بصیرت ہو۔

ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم نے تو دیوبندیت کی تعریف ایک جملہ میں ہی اس طرح ادا فرما دی کہ ”ہر معقول پسند دیندار آدمی کا نام دیوبندی ہے“ لیکن ناواقف و کم علم حضرات یا وہ صاحبان جو دیوبندیت اور مسلک علمائے دیوبند کے بارے میں کسی سوء ظنی یا غلط فہمی کا شکار ہیں ان کیلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیوبندیت، علمائے دیوبند کی تعریف و مسلک اور اس مشرب کے ترجمان حضرات کے متعلق مشہور اہل قلم حضرات کی تحریرات نقل کر دی جائیں۔ دارالعلوم دیوبند کی اہمیت و افادیت اور اس کے مقاصد و نصب العین پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سید محبوب رضوی رقم طراز ہیں۔

”جدید نظام تعلیم کے جاری ہونے سے مسلمانوں کا علمی اور عملی شیرازہ منتشر اور پراگندہ ہو گیا، عقائد اور فکر و نظر سے لے کر عمل و کردار تک ان کی زندگی کا ہر گوشہ متاثر ہو گیا، نئے تعلیمی نظام کے جاری ہونے پر مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہو گئے تھے، اس وقت مسلمان سخت ترین اقتصادی اور معاشی بد حالی کا شکار ہو چکے تھے، اس سنگین صورت حال سے نمٹنے کیلئے ضرورت تھی کہ بڑے پیمانے پر کوئی تحریک چلائی جائے تاکہ مسلمانوں کی زندگی میں جو خوفناک رخنے پڑ گئے ہیں ان کا کافی الجملہ انسداد ہو سکے۔

دارالعلوم دیوبند صرف ایک دینی تعلیم گاہ ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت ایک مؤثر اور فعال تحریک ہے، اس تحریک نے مسلمانوں کے عقائد اور اعمال کے خس و خاشاک کو جدا کر کے ان کو صاف اور بے میل اسلام سے روشناس کیا، شرک اور توہمات سے انہیں نجات دی، مسلمانوں کے دلوں سے خوف اور ڈر کو دور کر کے سیاسی اعتبار سے انہیں اس لائق بننے میں مدد بہم پہنچائی تاکہ وہ آزادی کی تحریک میں قائدانہ طور پر حصہ لے کر مسلمانوں کے قومی وقار کو بلند کر سکیں، تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی لحاظ سے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں

انہوں نے اپنی عظیم الشان خدمات کا نقش قائم نہ کیا ہو، اس تحریک کی افادیت صرف اندرون ملک تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ دور دور تک اس کے حلقہ اثر کا دائرہ وسیع ہو گیا، اس لئے صرف برصغیر ہی کا نہیں بلکہ ایشیا کا بھی دارالعلوم دیوبند ایک انقلاب آفریں مرکز بن گیا۔

تیرہویں صدی ہجری کے ہندوستان میں مسلمانوں کے سامنے دو اہم مسئلے تھے، ایک مسئلہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کا تھا اور دوسرے کی نوعیت سیاسی تھی، جس کا مقصد ہندوستان کو سامراجی اقتدار سے نجات دلانا تھا، اوپر بتا چکا ہوں کہ ہندوستان میں مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ اسلامی زندگی کی قدریں بھی تباہ ہو گئی تھیں، اسلام کے سیدھے سادھے فطری اصولوں کی جگہ شرک و بدعت اور رسوم و رواج نے لے لی تھی، توحید کا وہ خالص اعتقاد جو اسلامی عقیدے کی جان ہے، اسلامی تعلیم کی یہ روح شرک و بدعت کے پیہم حملوں سے مضمحل ہو گئی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ رحمہم اللہ نے اسلامی روح کی حفاظت کی اور تحریک کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش فرمائی حضرت نانوتویؒ نے اعتقادی اور معاشرتی اصلاح کی زبردست جدوجہد کی، انہوں نے اسلامی مسائل کو عقلی دلائل سے مستحکم کیا، تباہ کن رسم و رواج کی مخالفت کی، بیواؤں کے نکاح، عورتوں کے حق وراثت اور معاشرتی اونچ نیچ کے خاتمے کی بھرپور کوشش کی، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی مساعی کا ہندوستان کے ہر گوشے پر اثر پڑا، اور مسلمانوں کی بڑی تعداد اس سے متاثر ہوئی، یہ حالات تھے جن میں اکابر دارالعلوم نے اسلامی عقائد، سماجی رسوم، دینی تعلیم و تربیت اور سیاسی جدوجہد کے گونا گوں مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے دینی مدارس کے قیام کو ضروری قرار دیا، اس سلسلے میں سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا، اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم کی تحریک کو شرف قبول عطا فرمایا، ملک کے طول و عرض میں ہر طرف لوگوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا، اوہام و رسوم اور شرک و بدعت کے جو گہرے بادل ہندوستان کی فضاؤں میں چھائے ہوئے تھے رفتہ رفتہ چھٹنے شروع ہو گئے اور ان کی جگہ کتاب و سنت کے احکام پر عمل کیا جانے لگا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام جن مقاصد کے لئے عمل میں لایا گیا، ان کی تفصیل دارالعلوم

کے قدیم دستور اساسی میں حسب ذیل بیان کی گئی ہے :-

۱ قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد و کلام اور ان کے علوم کے متعلقہ ضروری مفید فنونِ عالیہ کی تعلیم دینا، اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا، رشد و ہدایت اور تبلیغ کے ذریعے اسلام کی خدمت انجام دینا۔

۲ اعمال و اخلاق اسلامیہ کی تربیت اور طلباء کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

۳ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دین کا تحفظ و دفاع، اور اشاعتِ اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر و تقریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم و تبلیغ کے ذریعے سے خیر القرون اور سلف صالحین جیسے اخلاق و اعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

۴ حکومت کے اثرات سے اجتناب و احتراز اور علم و فکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

۵ علوم دینیہ کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق۔

یہ وہ مقاصد ہیں جو اگرچہ اسلامی روایات و تاریخ کے دامن سے ہمیشہ وابستہ رہے ہیں، مگر اُس وقت اُن کے احیاء و تجدید کی ضرورت اس لئے درپیش تھی کہ تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں حکومت کی تبدیلی اور محرومی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے علم و عمل اور فکر و نظر میں جو اختلال اور رخنہ پیدا ہو گیا تھا اس کے انسداد کے لئے ناگزیر تھا کہ آئندہ کے لئے ایسے وسائل اختیار کئے جائیں جن کے ذریعہ سے اسلام، اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب و معاشرت کی حفاظت کی جاسکے، دارالعلوم کا نصب العین انہیں مقاصد کا احیاء اور ان کی تجدید ہے۔“ (۱)

اس سے قبل کہ مسلک علمائے دیوبند پر ایک وضاحتی تحریر نقل کی جائے اولاً اسی کی صراحت ہو جانا بہتر کہ ”علمائے دارالعلوم دیوبند“ سے کون حضرات مراد ہیں۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

”علمائے دیوبند سے صرف وہ حلقہ مراد نہیں جو دارالعلوم دیوبند میں تعلیم و تدریس یا افتاء و قضاء یا تبلیغ و موعظت یا تصنیف و تالیف وغیرہ کے سلسلہ سے مقیم ہے بلکہ وہ تمام علماء مراد ہیں جن کا ذہن و فکر حضرت اقدس مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے فکر و نظر سے چل کر

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت سے جڑا ہوا اور بنیان دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس اللہ اسرارہم کے ذوق و مشرب سے وابستہ ہے، خواہ وہ علمائے دارالعلوم دیوبند ہوں یا علمائے مظاہر علوم سہارنپور، علمائے مدرسہ شاہی و امدادیہ و حیات العلوم و جامع الہدیٰ مراد آباد ہوں یا علمائے مدرسہ جامع مسجد و چلہ امروہہ علمائے مدرسہ امینیہ و عبدالرب و فتح پوری دہلی ہوں یا علمائے مدرسہ کاشف العلوم بستی حضرت نظام الدین۔ علمائے مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد مدرسہ نور الاسلام و مدرسہ دارالعلوم و مدرسہ امدادیہ چھاؤنی میرٹھ ہوں یا علمائے مدارس متو اعظم گڑھ، علمائے جامعہ رحمانیہ مونگیر و دیگر مدارس بہار ہوں یا علمائے جامعہ اشرفیہ و حسینیہ راندیر یا دیگر مدارس گجرات۔ علمائے مدارس بنگال و آسام ہوں یا دیگر صوبہ جات و اضلاع ہند کے سینکڑوں مدارس کے علماء، خواہ وہ تعلیمی سلسلوں میں مصروف کار ہوں یا تمدن و سیاست اور اجتماعیات کی لائنوں میں کام کر رہے ہوں یا تبلیغی سلسلہ سے دنیا کے ممالک میں پھیلے ہوئے ہوں یا تصنیفی سلسلوں میں مشغول ہوں۔ پھر وہ یورپ و ایشیاء میں ہوں یا افریقہ و امریکہ میں، سب کے سب علمائے دیوبند کے عنوان کے نیچے آئے ہوئے ہیں اور علمائے دیوبند ہی کہلاتے ہیں۔

علمائے دیوبند یا جماعت دیوبند کی یہ نسبت دیوبندیت یا قاسمیت کوئی وطنی یا قومی یا فرقہ داری نسبت نہیں بلکہ صرف ایک تعلیمی نسبت ہے جو مقام تعلیم (دیوبند) یا مدار و روایت شخصیت (حضرت قاسم العلوم) کی نسبت سے معروف ہو گئی ہے جس سے اس جماعت کا تعلیمی انتساب اور اس کی روایت و درایت کا استناد واضح ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کسی پارٹی یا فرقہ کا لیبل اور عنوان نہیں کہ انہیں اس نسبت سے کوئی فرقہ یا اصطلاحی قسم کی کوئی پارٹی سمجھا جائے بلکہ ارباب تدریس و تعلیم اور ارباب ارشاد و تلقین کی ایک علمی جماعت ہے جو اس نسبت سے پہچانی جاتی ہے، بالکل اسی طرح سے جیسے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے فضلاء علیگ کے لقب سے یا جامعہ ملیہ دہلی کے فضلاء جامعہ کے نام سے یا مظاہر علوم کے فضلاء مظاہری کے نام سے یا ندوۃ العلماء کے فضلاء ندوی کے نام سے یا مدرستہ الاصلاح کے فضلاء اصلاحی کے لقب سے یا باقیات صالحات مدراس کے فضلاء باقوی کے نسبت سے معروف ہو گئے ہیں، کہ نہ یہ فرقے ہیں نہ پارٹیاں، یہی صورت دیوبندی یا قاسمی کی نسبت کی بھی ہے۔

علمائے دیوبند اپنے دینی رخ اور مسلکی مزاج کے لحاظ سے کلیتہً اہل سنت والجماعت ہیں۔ نہ وہ کوئی نیا فرقہ ہے نہ نئے عقائد کی کوئی جماعت ہے، جسے وقت اور ماحول نے پیدا کر دیا ہو، اس لئے اس ملک اور بیرون ملک میں یہی ایک جماعت ہے جس نے اہل سنت والجماعت کے معتقدات اور ان کے اصول و قوانین کی کما حقہ حفاظت کی اور ان کی تعلیم دی، جس سے اہل سنت والجماعت کا وجود قائم ہے اور جسے موسسین دارالعلوم دیوبند نے اس کے اصلی اور قدیم رنگ کے ساتھ اپنے تلامذہ اور بلواسطہ و بلاواسطہ تربیت یافتوں کے ذریعہ پھیلایا اور عالمگیر بنادیا۔ (۱)

اب ہم اس نقطہ پر آتے ہیں کہ مسلک دیوبند کیا ہے اور اس کے ترجمان کون ہیں اور درحقیقت علمائے دیوبند کہلائے جانے کے کون مستحق ہیں۔ دور حاضر کے معروف اسلامی مفکر اور قلم کار حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی ارقام فرماتے ہیں۔

”مسلک علمائے دیوبند“ درحقیقت فکر و عمل کے اس طریقے کا نام تھا جو دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور اس کے مستند اکابر نے اپنے مشائخ سے سند متصل کے ساتھ حاصل کیا تھا اور جس کا سلسلہ حضرات صحابہؓ و تابعینؓ سے ہوتا ہوا سرکار رسالت مآب ﷺ سے جڑا ہوا ہے۔ یہ فکر و اعتقاد کا ایک مستند طرز تھا، یہ اعمال و اخلاق کا ایک مثالی نظام تھا، یہ ایک معتدل مزاج و مذاق تھا جو صرف کتاب پڑھنے یا سند حاصل کرنے سے نہیں بلکہ اس مزاج میں رنگے ہوئے حضرات کی صحبت سے ٹھیک اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے جس طرح صحابہ کرامؓ نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے، تابعینؓ نے صحابہؓ سے اور ان کے مستند شاگردوں نے تابعینؓ سے حاصل کیا تھا۔

دوسری طرف دارالعلوم دیوبند، جس کی طرف عموماً اس مسلک کی نسبت کی جاتی ہے ایک ایسی درس گاہ ہے جو ایک صدی سے زیادہ مدت سے اسلامی علوم کی تعلیم کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس دوران اس سے فارغ التحصیل ہونے والوں کی تعداد عجب نہیں کہ لاکھوں میں ہو۔ اس کے علاوہ بعد میں برصغیر کے اندر ہزار ہا ایسے دینی مدارس قائم ہوئے جو سب اپنا سرچشمہ فیض دارالعلوم دیوبند کو قرار دے کر اس سے اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں اور ان کے فضلاء کو بھی عرف عام میں ”علمائے دیوبند“ ہی کہا جاتا ہے۔

(۱) علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج ص ۲۲، ۲۳ (از حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب)

اب ظاہر ہے کہ ان درسگاہوں سے لاکھوں کی تعداد میں فارغ التحصیل ہونے والوں میں سے ہر ہر فرد کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ”مسلم علمائے دیوبند“ کا صحیح ترجمان ہے۔ کوئی بھی باقاعدہ درسگاہ جو کسی خاص نصاب و نظام یا نظم و ضبط کی پابند ہو، وہ اپنے زیر تعلیم افراد کی خدمت اسی حد تک انجام دے سکتی ہے اور ان کی نگرانی اسی حد تک کر سکتی ہے جس حد تک اس کے لگے بندھے قواعد و ضوابط اجازت دیں۔ لیکن وہ ایک ایک طالب علم کے بارے میں اس بات کی مکمل نگرانی نہیں کر سکتی کہ تنہائی میں اس کے دل و دماغ میں کیا خیالات پرورش پا رہے ہیں اور وہ کن خطوط پر آگے بڑھنے کو سوچ رہا ہے؟ بالخصوص درسگاہ سے ضابطے کا تعلق ختم ہونے کے بعد تو اس قسم کی نگرانی کا کوئی امکان ہی نہیں رہتا۔

چنانچہ ان درسگاہوں سے کچھ ایسے حضرات بھی نکل کر میدانِ عمل میں آئے ہیں جو تعلیمی حیثیت سے بلاشبہ دارالعلوم دیوبند کی طرف منسوب ہیں۔ لیکن انہیں اکابر علمائے دیوبند کا مسلک و مشرب یا ان کا وہ متواتر مزاج و مذاق جو صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا ٹھیک ٹھیک حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لحاظ سے وہ مسلک علمائے دیوبند کے ترجمان نہیں تھے۔ لیکن تعلیمی طور پر دارالعلوم دیوبند یا اس کی فیض یافتہ کسی اور درسگاہ سے منسوب ہونے کی بنا پر بعض لوگوں نے انہیں مسلک علمائے دیوبند کا ترجمان سمجھ لیا اور ان کی ہر بات کو بھی علمائے دیوبند کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا۔

ان میں سے بعض حضرات ایسے بھی تھے جو علمائے دیوبند کے بعض عقائد و افکار کی نہ صرف تردید و مخالفت کرتے رہے بلکہ ان کو گمراہی تک قرار دیا، اور اس کے باوجود اپنے آپ کو مسلک علمائے دیوبند کا ترجمان بھی کہتے رہے۔ بعض حضرات نے اپنے ذاتی افکار کو علمائے دیوبند کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیا۔ بعض نے مسلک دیوبند کے جامع اور معتدل ڈھانچے سے صرف کسی ایک جزء کو لے کر بس اسی جزء کو ”دیوبندیت“ کے نام سے متعارف کر لیا اور اس کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا۔

مثلاً بعض حضرات نے یہ دیکھ کر کہ حضرات اکابر علمائے دیوبند نے ضرورت کے وقت ہر باطل نظریے کی مدلل تردید کر کے اپنا فریضہ ادا فرمایا ہے۔ بس اسی تردید کو علمائے دیوبند کا مسلک قرار دے لیا اور اپنے عمل سے تاثر یہ دیا کہ مسلک علمائے دیوبند صرف ایک متفی تحریک کا نام ہے جس کے نصب العین میں دین کے مثبت پہلو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ پھر

باطل نظریات کی تردید میں بھی مختلف نظریات نے مختلف میدان عمل طے کر لئے جو تقسیم کار کی حد تک تو درست ہو سکتے تھے، لیکن بعض حضرات نے ان میں مبالغہ کر کے مسلک علمائے دیوبند کے صرف اپنے میدان عمل کی حد تک محدود ہونے کا تاثر دیا۔ بعض حضرات نے باطل کی تردید کے اصول کو تو اختیار کر لیا۔ لیکن تردید کے طریقے میں اکابر علمائے دیوبند نے جن اصولوں کی پیروی فرمائی تھی ان کی طرف کما حقہ التفات نہیں کیا اور بعض حضرات کے طرز عمل سے کچھ ایسا تاثر قائم ہوا کہ مسلک علمائے دیوبند بھی (خدا نخواستہ) ان ہی دھڑے بندیوں کا ایک حصہ ہے جو دنیا میں پھیلی نظر آتی ہیں اور جن کا مسلک یہ ہے کہ اپنے دھڑے کے آدمی کی ہر خطا بھی معاف اور قابل دفاع ہے اور باہر کے آدمی کی ہونکی بھی دریا برد کرنے کے لائق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ”مسلک علمائے دیوبند“ ان تمام بے اعتدالیوں سے بری ہے اور یہ ایسے حضرات کی طرف سے منظر عام پر آئی ہیں جو ضابطے کی تعلیم کے لحاظ سے خواہ دارالعلوم دیوبند یا اس کے منتسب اداروں میں سے کسی ادارے سے وابستہ رہے ہوں۔ لیکن مسلک و مشرب اور مزاج و مذاق میں اکابر علمائے دیوبند کے ترجمان نہیں تھے۔ اور نہ انہوں نے یہ مزاج و مذاق اس متواتر طریقے پر حاصل کیا تھا جو اس کے حصول کا صحیح طریقہ ہے۔ اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے قیام سے لے کر آج تک کی تاریخ سامنے ہو تو اس قسم کی بے اعتدالیوں کی مقدار کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن اکابر علماء کے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور ناواقف لوگ ان کو مسلک علمائے دیوبند سے منسوب کرنے لگے۔ (۱)

..... علمائے دیوبند کا اعتدال یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت پر ایمان کامل کے علاوہ سلف صالحین پر اعتماد اور ان کی پیروی کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر میں سلف صالحین کے بیانات اور ان کے تعامل کو مرکزی اہمیت بھی حاصل ہے اور وہ ان کے ساتھ عقیدت و محبت کو بھی اپنے مسلک و مشرب کا اہم حصہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف اس عقیدت و محبت کو عبادت اور شخصیت پرستی کی حد تک بھی نہیں پہنچنے دیتے۔ بلکہ فرق مراتب کا اصول ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے۔

اب جو حضرات قرآن و سنت پر ایمان اور عمل کے تو مدعی ہیں لیکن ان کی تشریح و تعبیر میں سلف صالحین کو کوئی مرکزی مقام دینے کیلئے تیار نہیں بلکہ خود اپنی عقل و فکر کو قرآن و سنت کی تعبیر کیلئے کافی سمجھتے ہیں۔ وہ حضرات علمائے دیوبند پر شخصیت پرستی کا الزام عائد کرتے ہیں اور یہ پر ایسی گندہ کرتے ہیں کہ انہوں نے (معاذ اللہ) اپنے اسلاف کو معبود بنا رکھا ہے۔ اور دوسری طرف جو حضرات اسلاف کی محبت و عقیدت کو واقعۃً شخصیت پرستی کی حد تک لے گئے ہیں۔ وہ حضرات علمائے دیوبند پر یہ تہمت لگاتے رہے ہیں کہ ان کے دلوں میں اسلاف کی محبت و عظمت نہیں ہے، یا وہ اسلام کی ان مقتدر شخصیتوں کے بارے میں (معاذ اللہ) گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ (۱)

اسی سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ارقام فرماتے ہیں۔

”مسلم علمائے دیوبند محض نظری مسلک نہیں عملی طور پر ایک مستقل دعوت بھی ہے جو آج سے سو برس پہلے سے دی گئی اور آج سو سو برس کے بعد بھی دی جا رہی ہے اور وہ جس طرح اس وقت کارآمد تھی اسی طرح آج بھی کارآمد ہے۔ البتہ رنگ اس کا تعلیمی ہے، پھیلاؤ تبلیغی ہے، جماؤ معاشرتی ہے، بچاؤ افتائی و قضائی ہے۔ چڑھاؤ ریاضت و سپہ گری ہے۔ ضبط نفس تربیتی ہے، مدافعت مجاہداتی ہے اور دعوت بین الاقوامی ہے۔ علمائے دیوبند کا یہی وہ جامع مسلک اور طریق عمل ہے جس سے اس جماعت کا مزاج جامع بنا اور اس میں جامعیت کے ساتھ اعتدال قائم ہوا اس لئے چند بندھے جڑے مسائل یا خاص خاص فنون یا عملی گوشوں کو لے کر ان میں جمود اختیار کر لینا اور اسی میں اسلام کو منحصر کر دینا یا اسی کو پورا اسلام سمجھ لینا اس کا مسلک نہیں۔

بہر حال علمائے دیوبند اپنے جامع ظاہر و باطن اور مسلک کے لحاظ سے نہ تو منقولات اور احکام ظاہر سے بے قیدی اور آزادی کا شکار ہیں اور نہ اس کی باطنی اور عمومی گنجائشوں کے ہوتے ہوئے قومی نفسیات اور مقتضیات وقت سے قطع نظر کر لینے کی بیماری اور ضیق النفس میں گرفتار ہیں۔ ان کا یہی وہ جامع اور معتدل مشرب ہے جو ان کو اس آخری دور میں اہلسنت والجماعت کے مسلوک طریقہ پر ان کے علمی مورث اعلیٰ حضرت الامام شاہ ولی اللہ

دہلوی اور بانی دارالعلوم حضرت حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور ان کے بعد اس کے سرپرست اعظم قطب وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور اس کے اولین صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس اللہ اسرارہم سے پہنچا، جس پر وہ خود بھی رواں دواں ہیں اور اپنے مستفیدوں کو بھی سو برس سے اسی پر تعلیم و تربیت دے کر رواں دواں کر رہے ہیں۔

اس لئے یہ مسلک جامع عقل و عشق، جامع علم و معرفت، جامع عمل و اخلاق، جامع مجاہدہ و جہاد، جامع دیانت و سیاست، جامع روایت و درایت، جامع خلوت و جلوت جامع عبادت و مدنیت، جامع علم و حکمت، جامع ظاہر و باطن اور جامع حال و قال مسلک ہے۔ نقل کو عقل کے لباس میں پیش کرنے کا مکتب فکر اسے حکمت ولی اللہی سے ملا۔ اصول دین کو معقول سے محسوس بنا کر دکھلانے کا فکر اسے حکمت قاسمیہ سے ملا۔ فروع دین میں رسوخ و استحکام پیدا کرنے کا جذبہ اسے قطب گنگوہی سے ملا۔ سلوک میں عاشقانہ جذبات و اخلاق کا والہانہ جوش و خروش اسے قطب عالم حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ سے ملا۔ اور تصوف کے ساتھ اتباع سنت کا شوق و ذوق اسے حضرت مجدد الف ثانی اور سید الشہید رائے بریلوی قدس سرہ سے ملا۔ اس لئے علمائے دیوبند قرآن و حدیث کے معانی اور گہرے مطالب و حقائق و اسرار کو بھی مضبوط پکڑے ہوئے ہیں جن کا ذوق انہیں شیوخ علم کے محبت و فیضان سے میسر ہے جن سے وہ نصوص کے ظواہر اور بواطن دونوں ہی سے استدلال کی راہ پر ہیں۔ نہ وہ اصحاب ظواہر میں سے ہیں جو الفاظ نصوص پر جامد ہو کر رہ جائیں اور بواطن نصوص یا ان کے حقائق سے بے نیاز ہو جائیں۔ اور نہ وہ باطنیہ میں سے ہیں کہ ظواہر کو محض لفظی نقوش کہہ کر ان سے بے توجہی برتن یا شرعی تعبیرات کی ان کے یہاں کوئی قدر و قیمت نہ ہو اور محض ذہنی گھمیر میں گم ہو کر رہ جائیں۔

پس ان کے مسلک پر شرعی تعبیرات قطع نظر ان کے معانی و مدلولات کے خود اپنے نظم و عبارت کے لحاظ سے بھی ہزار ہا علوم و احکام کا سرچشمہ ہیں اور ان کی عبارت، ولالت، اشارات اور اقتضاء سے ہزار ہا مسائل وجود پذیر ہوئے ہیں۔ جن سے دین باغ و بہار بنا ہوا ہے اور دوسری طرف ان تعبیرات کے معانی نہ صرف لفظی اور معنوی مدلول کی حد تک ہی علوم کے حامل ہیں بلکہ ان معانی کے ہر ذریعہ میں ہزار ہا مسائل و حقائق مستور ہیں جو

قواعد شرعیہ اور قواعد عربیت کے ساتھ عمل صالح کی مداومت صلحاء کی صحبت و معیت اور مجاہدہ و ریاضت ہی سے قلوب پر وارد ہوتے ہیں۔

حرف حرفش راست اندر معنی
معنی در معنی در (۱) معنی

اس لئے علمائے دیوبند کا مسلک استدلال کے دائرہ میں نصوص کے ظواہر و باطن دونوں کو جمع رکھ کر دونوں ہی کا علمی حق ادا کرنا اور ان میں سے کسی ایک پہلو کو بھی ظاہر یہ یا باطنیہ طبقات کے انداز سے نظر انداز کرنا نہیں تاکہ نصوص کا ظاہری علم بھی قائم رہے اور ان کی باطنی معرفت بھی برقرار رہے اور اس جامع ظاہر و باطن مسلک سے ایسے جامع لوگ بنتے رہیں جو عالم باللہ بھی ہوں اور عالم بامر اللہ بھی ثابت ہوں اور ان کا افادہ عمومی اور ہمہ گیر ہوتا رہے۔ کیونکہ ان کے مسلک میں جیسے روایت کے سلسلہ سے منصوصات قرآنی و حدیثی اور نصوص فقہیہ کو ان کے صحیح مدلول اور معانی کے ساتھ قوم تک پہنچانا ضروری ہے کہ اس کے بغیر دین ہی قائم نہیں رہ سکتا، بالخصوص جبکہ شریعت کا مدار بھی ظاہری احکام پر ہے جس کے معیار سے مواخذہ و گرفت ہوتی ہے، ویسے ہی درایت کے راستوں سے ان منصوص معانی کے حقائق و اسرار اور علل و حکم سے بھی قوم کو مستفید کرنا ضروری ہے جن کی وسعتوں اور گنجائشوں کی بدولت ہی ہر دور کی قومی نفسیات اور وقت کے مقتضیات کی رعایت ممکن ہے۔ تاکہ فتنہ کے زمانہ میں جبکہ دین کے اصول ہی کا سنبھالنا بھاری ہو اور ظواہر پر جمود محض اور جزئی جزئی کی سخت گیر پابندیوں سے نفس دین ہی سے قوم کے بیزار ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو تو مر بیان نفوس ان وسعتوں سے قوم کو تھام سکیں اور رفتہ رفتہ ان پابندیوں پر حکمت کے ساتھ لے آئیں اور انہیں دائرہ دین سے باہر نہ نکلنے دیں۔

پس جیسے علمائے دیوبند کے مسلک میں جزئی جزئی پر خواہ وہ فقہی ہوں یا حدیثی و قرآنی تھیں و جماد ضروری ہے ویسے ہی دین کی اندرونی وسعتوں اور گنجائشوں سے ممکنہ حد تک قوم کو گنجائش دینا اور عوام کے حق میں تشدد اور سخت گیر پالیسی سے بچتے اور بچاتے رہنا بھی ضروری ہے ورنہ دین کی کلیاتی گنجائشیں اور رخصتیں جن کا تعلق بہت حد تک دین کے باطنی حصہ ہی سے ہے کا عدم ہو کر رہ جائیں۔“ (۲)

(۱) ترجمہ :- اس کے ہر حرف میں ایک معنی پوشیدہ ہیں اور معنی میں پھر معنی اور پھر معنی ہیں۔

(۲) علمائے دیوبند کا اپنی روحانی مسلک کے مزاج میں ۱۸۰۳ء

مجھے توقع ہے کہ ان وضاحتی تحریروں کے بعد مسلک دارالعلوم، مشرب علمائے دیوبند اور دیوبندیت مزید کسی تفصیل کی محتاج نہیں رہی ہوگی اور ذہنی شکوک و شبہات کو رفع کرنے نیز اتمام حجت کے لئے یہ بیان کافی وافی ہے۔

علمائے دیوبند اور ان کی تحریک کی افادیت کو عالم اسلام کی مشہور و محترم شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کیا ہے۔
 ”اس تحریک اور اس کے قائدین نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر دین کی محبت، شریعت کا احترام اور اس کے راستہ میں قربانی کی طاقت اور مغربی تہذیب کے مقابلے میں زبردست استقامت و صلابت (جو کسی اور ایسے اسلامی ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی جسکو مغربی تہذیب اور مغرب کے اقتدار سے واسطہ پڑا ہو) پیدا کر دی، دیوبند اس رجحان کا علمبردار اور ہندوستان میں قدیم اسلامی ثقافت و تہذیب و تربیت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔“ (۱)

ندوۃ العلماء ہی کے ایک مشہور اہل قلم حضرت مولانا محمد الحسنی مرحوم اس حقیقت کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

”لیکن ان سب باتوں کے ساتھ اس حقیقت سے کوئی ہوش مند اور منصف انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دیوبند کے فضلا نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے، اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام اور بقا اور استحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے“ (۲)

تحریک دیوبند کی کامیابی و افادیت اور علمائے دیوبند کی نمایاں و ممتاز خدمات کے ان اعترافات کے بعد یہ کہنا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔

بنے وہ رونق محفل جس انجمن میں رہے
 رہے بہار چمن ہو کے جس چمن میں رہے

(۱) مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش ص ۹۰ (از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہم)

(۲) سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۷۳ (مرتبہ مولانا محمد الحسنی مرحوم استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ)

علمائے حق اور بزرگان دین کے حالات و واقعات کی اہمیت و افادیت اور معنویت و اثر آفرینی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اسلاف سے یہ معمول چلا آتا ہے کہ اپنے بڑوں اور اکابرین کے حالات و معمولات اور فرمودات و تعلیمات سے نفع انگیزی و سبق آموزی جاری ہے۔ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم تحریر فرماتے ہیں۔

”بزرگان سلف کے واقعات انسان کی اصلاح کے لئے انتہائی مفید اور موثر ہوتے ہیں کیونکہ ان سے اسلامی احکام کی عملی تطبیق سامنے آتی ہے اور بزرگوں کا وہ مزاج و مذاق واضح ہوتا ہے جو آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام سے لے کر آخری دور تک عملی طور پر نسلاً بعد نسل منتقل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لمبی چوڑی نصیحت آمیز تقریریں ایک طرف اور کسی بزرگ کا کوئی ایک واقعہ دوسری طرف رکھا جائے تو بسا اوقات یہ واقعہ ان طویل تقریروں سے کہیں زیادہ دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی لئے ہر دور کے مصنفین نے بزرگوں کے متفرق واقعات جمع کر کے انہیں امت کے لئے محفوظ کیا ہے۔

آخری دور میں علمائے دیوبند کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ امتیازی شان عطا فرمائی تھی کہ انہوں نے صرف اپنی تحریر و تقریر سے نہیں بلکہ اپنی سیرت و کردار سے بھی عہد صحابہ و تابعین کی یادیں تازہ کیں۔“ (۱)

علماء و فقہاء، مصلحین و مرشدین امت اور ان کی تعلیمات کی اہمیت بیان فرماتے ہوئے مولانا محمد منظور نعمانی رقم طراز ہیں۔

”امت کو جس طرح ہر دور میں ان علماء اور فقہاء کی ضرورت ہے جو فاسد عقائد اور گمراہانہ خیالات سے امت کی حفاظت کرتے ہوئے عقائد حقہ کی تعلیم دیتے رہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں عبادات، معاملات، معاشرت وغیرہ کے متعلق اللہ و رسول کے احکام امت کو بتاتے اور حلال و حرام کے بارے میں ان کی رہنمائی کرتے رہیں اسی طرح امت کی یہ بھی ایک دوائی ضرورت ہے کہ اس میں ایسے اصحاب ارشاد و رہبانین پیدا ہوتے رہیں جن کی فکر و توجہ کا خاص نشانہ اور موضوع قلوب کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ ربط و تعلق ہو جس کو کتاب و سنت کی زبان میں اخلاص و احسان کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کا جو تکوینی انتظام فرمایا ہے اس میں کتاب و سنت کی علمی و

کتابی حفاظت کے ساتھ امت میں ایسے علماء فقہاء اور صوفیائے ربانین کا مسلسل وجود بھی شامل ہے اور امت کی گذشتہ ساڑھے تیرہ سو سال کی دینی تاریخ کی شکل میں وہ ہمارے سامنے موجود بھی ہے اور محفوظ تاریخ بھی اس خداوندی انتظام کے سلسلہ کی ایک مستقل کڑی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور اس کی صفت رحمت و ربوبیت نے جب ہمارے اس دور میں بھی (جو بلاشبہ الحاد و مادیت اور خدا فراموشی کا دور ہے) دین کو زندہ و محفوظ رکھنے کا فیصلہ فرمایا تو اس کے حامل و محافظ بھی پیدا فرمائے۔ آج کے بحر ظلمات میں علمائے حق اور صوفیاء ربانین کا وجود ——— خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو ——— اللہ تعالیٰ کی رحمت و مشیت کے اسی فیصلہ کا نتیجہ ہے اور یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ جب تک دین کو اس دنیا میں زندہ باقی رکھنا چاہے گا اس کے خاص حاملین و محافظین بھی پیدا ہوتے رہیں گے۔“ (۱)

علمائے امت اور بزرگان دین کی صحبت جس طرح کیمیا گر ہے اسی طرح ان کی نورانی زندگی، تالیفات، اقوال و مواعظت بھی فائدہ سے خالی نہیں اور حد تو یہ ہے کہ ان مقبولات بارگاہ الہی کی یاد اور تذکرہ نویسی بھی فیضان و عرفان کا موجب اور قبول و قرب الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ ”گو مجھ سے کوئی بیعت نہ ہو لیکن عقیدت کے ساتھ میری کتابیں لے کر کوٹنے میں بیٹھ جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ و اصل الی المقصود ہو جائے گا۔“ (۲)

دور جانے کی ضرورت نہیں دور حاضر کے مشہور و معروف مصنف بزرگ و محترم شخصیت اور عالم اسلام کے دل کی دھڑکن مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہم العالی کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کے یہاں ان کی مقبولیت و محبوبیت میں بزرگوں کی سوانح نگاری و تذکرہ نویسی کو خاص دخل تھا۔ جس کو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اس طرح ارقام فرماتے ہیں۔

”اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ مولانا علی کی اس محبوبیت میں ان کی جن خصوصیات کو دخل تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اللہ کے مقبول بندوں کی سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی ان کا خاص محبوب شغل ہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی خاص صلاحیت

(۱) مقدمہ سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری ص ۱۲، ۱۳ (مرتبہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہم)

(۲) مآثر حکیم الامت ص ۱۷۰

بخشی ہے سب سے پہلے انہوں نے اپنی بالکل نو عمری میں ”سیرت سید احمد شہید“ لکھی جس نے اب سے پچیس سال پہلے جب اس برصغیر میں وہ سیاسی انقلاب شروع ہو رہا تھا جو ۱۹۴۷ء میں مکمل ہوا، یہاں کے مسلمانوں پر ایک خاص اثر ڈالا۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی سوانح لکھی، پھر تاریخ دعوت و عزیمت کا سلسلہ شروع کیا جو امت کی پوری تاریخ کے خاص اصحاب دعوت و عزیمت مجددین و مصلحین کا یقین آفریں اور حیات بخش تذکرہ ہے، اس کی تین جلدیں چھپ کر شائع بھی ہو چکی ہیں، اس درمیان میں انہوں نے حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کا تذکرہ بھی لکھا۔

حضرت (شاہ عبد القادر رائے پوری) قدس سرہ کو مولانا علیؒ کی ان سوانحی تصانیف کا اتنا اشتیاق رہتا تھا کہ دعوت و عزیمت کے کچھ حصے اور حضرت گنج مراد آبادیؒ کا تذکرہ حضرت نے چھپنے سے بھی پہلے مسودہ ہی منگوا کر سنا۔۔۔۔۔ الغرض حضرت کے ہاں مولانا علیؒ کی محبوبیت میں ان کی سوانح نگاری کو بھی خاص دخل تھا اور حضرت کو ان کی ان کتابوں کے سننے سے بڑی روحانی مسرت ہوتی تھی اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔“ (۱)

حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ ہی کے یہاں نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عند اللہ بھی حضرت مولانا علیؒ میاں صاحب مدظلہم العالی کی مقبولیت و محبوبیت میں ان کے اس ”شغل محمود“ کو کافی دخل ہے۔ واللہ اعلم

بزرگان دین کے فیض اور عطاء و بخشش کی تو بات ہی نرالی ہے۔ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ فرماتے ہیں کہ

”سلف میں ایسے ایسے اولیاء اللہ گذرے ہیں کہ جو کوئی کلمہ گو دور سے ان کی زیارت کر کے چلا گیا اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم فرمایا اور اس کو بخش دیا، بعض ایسے گذرے ہیں کہ جس پر انہوں نے ایک نظر ڈال دی وہ ولی ہو گیا۔“ (۲)

اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ان حضرات کی نظر فیض جس کی طرف اٹھ گئی اس کا بیڑا پار ہو گیا۔ اسی کتاب میں متعدد واقعات اس قبیل کے آپ کی نظر سے گذریں گے۔ حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ کے حالات میں ہے کہ جس پر نظر اصلاح ڈال دی اسکی یکسر

(۱) مقدمہ سوانح حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری ص ۲۲، ۲۳

(۲) تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی ص ۸۸ (مرتبہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہم)

دنیا ہی بدل گئی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے تذکرے میں ملتا ہے کہ اجمیر میں قیام کے دوران انہوں نے ایک ماہر فن سے موسیقی کی تحصیل کی تھی اور کبھی کبھی اس کا ریاض بھی کیا کرتے تھے۔ ایک روز اپنے بالا خانے میں اسی شغل میں مصروف تھے کہ نیچے سے ایک صاحب دل نے کہا ”او مولوی تو اس لئے پیدا نہیں ہوا“ فوراً تنبیہ ہوا اور اس سے توبہ کر لی، آپ کے موسیقی کے استاذ کو جب مولانا کی توبہ کرنے کا حال معلوم ہوا تو اس نے بھی توبہ کر کے اسے خیر باد کہہ دیا۔ گویا ع

ہم تو ڈوبیں گے صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

ان استاذ موسیقی کی ہدایت کو قدرت نے اسی طرح مقدر فرمایا تھا۔

حافظ ضامن شہید کا واقعہ مشہور ہی ہے کہ ایک بزرگ نے جب ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد مراقبہ کیا تو بعد فراغت لوگوں سے معلوم کیا کہ یہ کن بزرگ کی قبر ہے بڑے ہی ظریف معلوم ہوتے ہیں کہتے ہیں ”جاؤ جاؤ کسی مردے کی قبر پر فاتحہ پڑھنا تم نے ہمیں مردہ سمجھ رکھا ہے“

مرض الموت میں ایک خادم کی بے قراری دیکھ کر مولانا محمد علی مونگیری کا پر جوش انداز میں فرمانا کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ موت کے بعد ہماری سر پرستی و رہنمائی ختم ہو جائے گی، نہیں بلکہ ”اولیاء اللہ جب تک زندہ رہتے ہیں تلوار نیام میں ہوتی ہے اور اس کے بعد تلوار نیام سے باہر ہو جاتی ہے“ اسی طرح حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی کا یہ فرمانا کہ اولیاء اللہ دنیا سے پردہ کرتے ہیں اور جسم کا چھوڑنا گویا لباس بدلنا ہے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر نکی کا یہ فرمانا کہ میرے مرشد کا فیض آج بھی اسی طرح جاری ہے۔ کہاں تک ذکر کروں ایسے واقعات و حکایات کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔

اللہ اللہ داستان آرزو کا سلسلہ

کہ چکے سب کچھ مگر پھر بھی بہت کچھ دل میں ہے

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا گنگوہی، حضرت شیخ الہند، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی وغیرہ حضرات کے تذکرے و سوانح حیات بیشمار محیر العقول واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ یہاں اس تحریر سے میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ بزرگان دین کا فیض بعد الموت بھی جاری رہتا ہے جس کی شکلیں مختلف ہیں۔ اللہ ان حضرات کے تذکرے و

حالات لکھنا و پڑھنا کسی بھی حال میں خیر و برکت سے خالی نہیں۔

غم جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش

وہ ان کے درد محبت سے ساز باز کرے

بزرگوں کی بہت سے سوانح عمریاں شائع ہو چکی ہیں اور شائقین ان سے فیضیاب بھی ہو رہے ہیں اور ایسی کتابوں کو ہمیشہ ہی وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ زیر نظر مجموعہ کی کچھ خصوصیات ہیں جنہیں سامنے لانا ضروری ہے تاکہ اسکی اہمیت و افادیت اجاگر ہو سکے اس مجموعہ میں متعدد ایسے علماء کے حالات و سوانح بھی شامل ہیں جن پر بہت کم لکھا گیا ہے یا اگر لکھا گیا ہے تو نظروں سے اوجھل تھا، نواز دیوبندی صاحب نے بڑی محنت و جانفشانی اور عرق ریزی سے اس کام کو بحسن و خوبی پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

استاذ العلماء مولانا مملوک العلّی نانوتوی کو کون نہیں جانتا۔ مگر حالات کھوجیں تو مرتب طور پر دو چار صفحات سے زائد کچھ نہ ملے گا۔ نواز صاحب نے مشہور و مستند اہل قلم مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی مدظلہ العالی سے اس عنوان پر خامہ فرسائی کی درخواست کی تو آں موصوف نے اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود تقریباً چالیس صفحات میں مولانا مملوک العلّی نانوتوی کے حالات لکھ کر علمی دنیا پر بڑا احسان کیا، اور بعض اہم تاریخی اغلاط کی نشاندہی بھی کی۔ اسی طرح دیوبند کے مشہور بزرگ اور دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اول حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب کے حالات دو چار صفحات کے مضمون سے زیادہ میں دستیاب نہیں۔ ایک طویل تذکرہ ان کے سوانح کے نام پر اگرچہ ملتا ہے مگر وہ رطب و یابس سے اس طرح بھرپور ہے کہ اس سے بجائے کسی فائدے کے ذہنی الجھاؤ ہی حاصل ہوتا ہے۔

اس عنوان پر نواز صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات پر مامور ایک صاحب سے ایک اچھا خاصا مضمون لکھوایا۔ حضرت شیخ الہند کے والد محترم ادیب شہیر مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کے متعلق کچھ تلافی تو ندارد۔ تقریباً بیس صفحات کا ایک مضمون راقم الحروف کے ذریعہ اس عنوان پر لکھا گیا۔

بعض ایسے علماء کے حالات بھی شامل مجموعہ ہیں جن کے تذکرے کسی مخصوص علاقے و حلقے میں شائع ہو کر نایاب ہو گئے تھے اور عمومی طور پر اہل علم و شائقین حضرات ان سے محروم تھے، جیسے مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شاگرد مولانا عبدالعلی میرٹھی اسی طرح مولانا شیخ

محمد تھانویؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ اور حافظ ضامن شہیدؒ وغیرہ وغیرہ۔

تلاش و جستجو کا دور چلا تو کچھ حضرات کے حالات رسائل کی پرانی فائلوں میں دستیاب ہوئے جیسے مولانا احمد حسن امروہیؒ اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ وغیرہ۔ وہاں سے نقل کر کے انہیں بھی شامل مجموعہ کیا گیا۔ اسی طرح بعض حضرات کے تذکرے بہت طویل تھے جو اس کتاب کے مجوزہ پروگرام کی استطاعت سے باہر ہونے کے سبب موزوں نہ تھے ان کی تلخیص و ترتیب جدید کی گئی۔

یہ ایک ہلکی سی تصویر ہے اس محنت و کوشش کی جو اس مجموعہ کو مفید بنانے اور منظر عام پر لانے کے سلسلہ میں کی گئی۔ مجھے نہایت مسرت و خوشی ہے کہ جناب نواز دیوبندی صاحب نے اپنے بعض دیگر مخلصین (جیسے بھائی اشرف عثمانی دیوبندی وغیرہ) کے ساتھ ساتھ اس ناچیز کو بھی اس قابل سمجھا کہ ان کے اس مقصد عظیم میں میں ان کا کچھ ہاتھ بٹا سکوں۔ راقم الحروف نے تصحیح کے دوران کہیں کہیں حسب ضرورت قلم برداشتہ بعض حاشیے لکھ دیئے ہیں جن کے رد و قبول کیلئے اہل علم و ناظرین حضرات آزاد ہیں عدم افادیت اگر متحقق ہو جائے تو آئندہ ایڈیشن میں حذف بھی کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے وہ یہ کہ علمائے دیوبند کے حالات پر مشتمل یہ مجموعہ اس میں شامل شخصیات کے حالات پر کسی طرح بھی مکمل یا حرف آخر نہیں کہا جاسکتا۔ آپ خود ہی سوچئے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے حالات زندگی پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ”سوانح قاسمی“ کی شکل میں ڈیڑھ ہزار سے زائد صفحات سیاہ کرنے کے بعد بھی اس سوانح کے تشنہ تکمیل رہ جانے کا اعلان کیا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم صرف چوبتر (۷۴) صفحات لکھ کر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی زندگی و خدمات کا احاطہ کر سکیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ یہ مجموعہ آپ کی تشنگی و پیاس کو بجھانے کے لئے نہیں بلکہ اسے اور مزید بڑھانے اور ہوادینے کی غرض سے مرتب کیا گیا ہے۔ ان علماء کے یہ مکمل حالات نہیں بلکہ حالات کی ایک جھلک ہے اور خیال رہے کہ

جلوہ بے پردہ تو ہوتا ہے فقط ہوش رہا

وہ قیامت ہے جو چلمن کی جھلک ہوتی ہے

ہم چاہتے ہی یہ ہیں کہ اس جھلک کو دیکھ کر آپ زبان حال سے یہ کہتے پھریں کہ ۔
 سب غلط کہتے تھے ذکر یار کو وجہ سکوں
 درد دل اسنے تو حسرت اور زیادہ کر دیا

اگر اس کتاب کے ذریعہ ڈاکٹر نواز دیوبندی آپ کی رغبت و شوق کو فروں کرنے،
 تمنا و اضطراب کو جوش دینے، طلب و خواہش کو بھڑکانے اور بے قراری و تشنگی کو بڑھانے میں
 کامیاب ہو گئے تو ان کے لئے یہ باعث صداطمینان ہوگا، اور ہم سمجھیں گے کہ ہماری
 محنت ٹھکانے لگی۔ کیونکہ اس صورت میں الدال علی الخیر کفاعلہ کے بموجب ہم
 تواب و ثواب کے انشاء اللہ مستحق ہو ہی جائیں گے۔ ان کا مقصد و تمنا ہی یہ ہے کہ اس
 شیرینی و قند کا نمونہ آپ کو ایسا پسند آئے اور ذائقہ پر چڑھے کہ آپ ہل من مزید کی رٹ
 لگاتے ہوئے اس کے اصل کارخانے و دکان تک پہنچ جائیں اور وہاں ملاحظہ فرمائیں کہ جو
 نمونہ آپ کو پیش کیا گیا تھا اس سے بھی کہیں زیادہ ذائقہ دار اور پر حلاوت میوے و مٹھائیاں
 وہاں موجود ہیں۔ علمائے دیوبند کے حالات و خدمات اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دینی و
 دنیوی فلاح و کامرانی کے کتنے زریں اصول اور گوہر آبدار اس خزانے میں موجود ہیں۔ طلب
 اور جستجو شرط ہے۔

یہ طور اس وقت تک نامکمل رہیں گی جب تک اس شخصیت کے سوانحی خدو خال اور
 مزاج و مذاق سے قارئین حضرات کو متعارف نہ کرایا جائے، یہ سوانحی مجموعہ جس کے دیرینہ
 خوابوں کی حسین تعبیر، برسوں کی محنت و جانفشانی کا ثمرہ و صلہ، عقیدت و محبت کا گلدستہ، دلی
 تمناؤں کی شرح آرزو اور ذہنی تخیلات کی تصویر مجسم ہے۔ میری مراد اپنے مخلص و کرم فرما
 جناب ڈاکٹر نواز دیوبندی سے ہے۔

نواز دیوبندی اردو زبان کے ایک مقبول و معروف شاعر ہیں، شیریں سخن اور خوش آواز
 ہیں، متعدد بیرونی ممالک کے سفر کر چکے ہیں اور مشاعروں میں ان کے پسند کرنے والے
 اور مداحوں کی ایک بڑی تعداد ہوتی ہے۔ یہ ان کی عرفی حیثیت ہے، لیکن کچھ عرصہ سے
 ان سے نزدیکی تعلق کے بعد معلوم ہوا کہ ان کی شخصیت کے کئی اور بھی قابل توجہ پہلو ہیں

۔ حسرت موہانی کے اس شعر میں لفظ ”ذکر“ کے بجائے لفظ ”لطف“ ہے ہم نے اس کو اپنے مفید مطلب بنانے کیلئے یہ
 معمولی تصرف کیا ہے۔ (م.ع.ق)

اور غیر قریبی حلقے کے لئے یہ حضرت اچھے خاصے چھپے رتم ہیں۔

ان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں سوچتا ہوں کہاں سے شروع کروں، جی ہاں! دیوبند ان کا مولد و مسکن ہی نہیں نام کا جز بھی ہے اور دیوبندیت ان کے مزاج و گھٹی میں پڑی ہوئی، سر و قد، حسن سیرت کے ساتھ ساتھ ظاہری شکل و صورت میں بھی قدرت نے فیاضی سے کام لیا ہے، اخلاق حسنہ کے پیکر، شیریں سخن، پر حلاوت اور دلفریب انداز گفتگو، شاعری کا درجہ معیار تو اہل نظر جانیں کہ ۷

نہ شہم نہ شب پرتم کہ حدیث خواب گویم

سنا ہے کہ آواز کی دلکشی سے مشاعروں میں چھا جاتے ہیں، شاعری عام فہم زبان میں کرتے ہیں بقول شجاع خاور ۷

اپنی بات اب اس سے صاف صاف کہیں گے
اچھی خاصی اردو کی فارسی نہیں کرنی

اسی کا اثر ہے کہ اردو سے واقف طبقہ کے علاوہ اردو سے نا بلد اور غیر مسلم حضرات میں بھی آل موصوف کے مداحوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، ادبی محفلوں کی جان اور مشاعرے ان کے بغیر بے رونق و پھیکے سمجھے جاتے ہیں، بہت سے دل کے ماروں کے لئے وجہ سکوں اور ذوق شاعری و خوش آوازی کے بیماروں کے مسیحا، تاہم آنجناب مشاعروں اور ادبی محفلوں کے بہت سے لوازمات و مفاسد سے کوسوں دور، اپنے سفید لباس کی طرح دامن بھی بے داغ رکھتے ہیں۔

یہ شاعر ہیں مگر روایتی شعراء کے بہت سے امتیازات سے مبراء، ایک طویل عرصہ شعراء اور مشاعروں میں گزارنے کے باوجود مزاج شاعروں جیسا نہیں، مگر گفتگو اور انداز تکلم شاعرانہ نزاکت و تکلف سے خالی بھی نہیں، لب و لہجہ سحر آمیز تو مزاج میں انکساری و فروتنی رچی بسی ہوئی، تاہم چالاک و عیار اور بد عنوان حضرات ہو شیار باش! کہ خاں صاحبوں کی جہالتوں اور حماقتوں کے علاوہ سخت مزاجی اور دلیری و شجاعت بھی ضرب المثل ہے اور آل موصوف بھی اسی ”صنف درشت“ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لکھنا پڑھنا معمولات میں شامل قلمی مشق بھی کافی کی اور اسی طرح کی ایک کاوش ”دارالعلوم دیوبند کی اردو صحافتی خدمات“ پرمیٹھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے اڑے۔

نواز دیوبندی کی شخصیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ آنجناب مسلم فنڈ دیوبند کے تحت چلنے والے ایک فلاحی ادارے کے روح رواں ہیں، جہاں ان کی انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ قومی و ملی ہمدردی اور انسان دوستی کے مظاہر بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ معاملہ فہمی، جوہر شناسی، قوت تفہیمی، ہمدردی و طلبہ نوازی، دانائی و تجربہ کاری اور تعلقات و شناسائی کے ذریعہ ملک و قوم کے مستقبل (طلباء کی زندگیوں) کو سنوارنے میں مصروف، پریشان حال کی خبر گیری ان کے مزاج میں شامل اور سماجی خدمات مذاق کے عین مطابق، گویا مروت میں درد سری مول لینے سے بھی نہیں چوکتے، ضرورت مند و پریشان حال کو فوری دلا سہ و تسلی کے ساتھ ساتھ اپنے تعلقات و رسائی کی حد تک عقیدہ کشائی اور مشکلات کو حل کر اڈالنے کی پیشکش بھی کر ڈالتے ہیں، طلبہ ہوں یا اساتذہ، اعزاء ہوں یا رشتہ دار، عام ملنے جلنے والے ہوں یا واقف کار حسب ضرورت ان کی حوصلہ افزائی و تعریف یعنی زبانی داد و دہش دل کھول کر کرتے ہیں، تعاون و خبر گیری اور کشادہ دستی کے متعلق بھی حسن ظن ہی رکھنا چاہئے۔

ملی خیر خواہی کوئی ایسی چیز نہیں جو امتیاز، طرفداری اور جرم کی فہرست میں آئے اور خصوصاً آج کے سیاسی ماحول میں کہ ہندوستان میں حکومتیں ہی ذات برادری اور طبقاتی اجزاء کا معجون مرکب ہو کر رہ گئی ہیں، پچاس سالوں سے فائلوں میں دبا طبقاتی سیاست کا آئینی نظام اب ایک حقیقت و واقعیت کی شکل مجسم اختیار کر کے سامنے کھڑا ہے اور اب تو حکومتوں کے ذریعہ اسی طرز و نہج کو اٹھایا، ابھارا اور اسی کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔

نواز دیوبندی صاحب کے اندر بھی ملک و قوم کے ساتھ ساتھ ملی خیر خواہی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے زیر نگرانی چلنے والا ادارہ ایک مسلم ادارہ ہے اور ان کی خواہش و تمنا ہے کہ اس طبقہ کے حضرات اس سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہوں، اس سلسلہ میں وہ تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ اس طبقہ کے طلباء کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور خوابیدہ جوہر کو بیدار کرنے میں خصوصی محنت و ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ان حضرات کی وجہ سے بڑی ذہنی کلفتیں بھی برداشت کرتے ہیں اور حتی الامکان افہام و تفہیم اور کوتاہیوں پر چشم پوشی و صرف نظر سے بھی کام لیتے ہیں اس سلسلہ میں ان کے جذبات و خواہشات اور دلی کیفیت کے اندازہ کے لئے ان کی ایک گفتگو نقل کرتا ہوں۔ اسی ہمدردی ملی کے موضوع پر جاری

گفتگو کے دوران ایک بار کہا کہ

”داخلوں کے وقت اکثریتی فرقے کے جو امیدوار آتے ہیں وہ تو مرے پاؤں چھوتے ہیں اور جب مسلم اقلیتی فرقہ کا کوئی اچھا طالب علم امیدوار آتا ہے تو بھائی..... میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے پیر پکڑ لوں اور خوشی ہوتی ہے کہ اس کی زندگی سدھر جائے گی اور قوم کا ایک فرد خود کفیل ہو کر باعزت زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے گا“

واقعی بڑا قابل تعریف و ستائش جذبہ ہے۔ اللہم زد فزد جزاء اللہ تعالیٰ

احسن الجزاء۔

ہم ابھی بھی وہاں تک نہیں پہنچے جسے میں ان کا جوہر اصلی مانتا ہوں اور جو ان کے لئے اس قابل قدر مجموعہ کی ترتیب کا محرک حقیقی ہے، میں اب مزید شرح و بسط اور تفصیل و وضاحت سے احتراز کرتے ہوئے مختصر طور پر آں موصوف کی زندگی کے ایک اہم اور خاص رخ و رجحان اور جوہر گراں قدر کو بیان کرتا ہوں۔

نواز دیوبندی کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی علم دوستی، علماء سے وابستگی اور اہل قلم حضرات سے تعلق داری و عقیدت کیشی ہے۔ ان کی شہرت و عروج کے سبب ایک بڑی تعداد ان سے ملنے کی خواہاں، گفتگو کرنے کی مٹمنی اور قرب کی خواہش مند نظر آتی ہے تو یہ حضرت علماء و اہل قلم صاحبان کی خدمت میں حاضری دینے کے عادی اور خود کو ان سے مربوط و منسلک رکھنے کے خوگر۔ یہ واقعی ان کی بڑی خوش قسمتی ہے۔ علماء کی صحبت و مجالس، تعلق و ربط اور محبت و عقیدت ہی کا ثمرہ ہے کہ شہرت و مقبولیت کے آسمان کو چھونے کے باوجود ”نشہ خودی“ سے تاہنوز محروم ہیں اور کسی کے عند اللہ محبوب و مقبول ہونے کی علامت یہ بھی ہے کہ اولیاء اللہ اس سے خوش ہوں اور اسے محبوب رکھتے ہوں۔

زمانے کی زندہ شخصیات کے ساتھ ساتھ یا انہیں کے فیض صحبت کے سبب تاریخ کی درخشاں شخصیات یعنی بزرگان دین اور علمائے حق کے تذکروں اور حالات زندگی کا مطالعہ اور ان سے اخذ فیض بھی نواز صاحب کی مزاجی خصوصیات میں شامل ہے۔ خصوصاً اکابرین علمائے دیوبند کے تو گرویدہ و عاشق زار ہیں۔ ان کے تذکرے کے وقت محویت کے عالم میں ہوتے ہیں ان کی ہر ہر ادھر پرش و عیش کراٹھتے ہیں۔ یہی ان کی زندگی کا وہ پہلو ہے جس سے میرے ان کا جوہر اصلی اور قابل قدر و فخر سرمایہ مانتا ہوں، اس کے علاوہ آں موصوف اور

بھی بہت سی صفات حسنہ اور خوبیوں کے مالک ہیں، خدا تعالیٰ ان پر استقامت و صلابت اور مزید کی توفیق عنایت فرمائے۔

جمال یار کی رنگینیاں ادا نہ ہوئیں

ہزار کام لیا ہم نے خوش بیانی سے

یہ انسان کا مزاج ہے کہ جب اسے کوئی دل خوش کن اور نادر و نمایاں چیز یا کامیابی حاصل ہوتی ہے تو خواہش ہوتی ہے کہ میری اس کامیابی اور یافت کا علم دوسروں کو بھی ہوتا کہ وہ میری خوشی میں شرکت کے ساتھ ساتھ خود بھی اس گر انقدر سرمایہ کے حصول میں مشغول ہوں۔

قرآن پاک میں سورہ یٰسین میں جن صاحب ایمان کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو رسولوں کے اتباع کی ترغیب دی اور ان کی نافرمانی سے باز رہنے کے لئے کہا تھا جس کے نتیجے میں قوم نے برا فروختہ ہو کر انہیں قتل کر دیا۔ جب ان کی پیشی بارگاہ رب العالمین میں ہوئی اور مغفرت و بلندی درجات کا پروانہ ملا تو انکی زبان سے نکلا یلیت قومی یعلمون O بما غفر لی ربی و جعلنی من المکرمین کہ کاش میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ میرے رب نے میری مغفرت و اکرام کس طرح کیا ہے تاکہ وہ بھی اسی راستے پر چل کر کامیاب ہو جاتے۔ قرآن پاک ہی میں ہے کہ روز قیامت جس شخص کو اپنا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں مل جائے گا جو جہنم سے خلاصی کی علامت اور جنت میں داخلے کی ضمانت ہو گا وہ لوگوں سے کہتا پھرے گا کہ ہاؤم اقرء و کتابیہ یعنی آؤ میری کتاب پڑھو۔ یہ گویا خوشی و مسرت کا اظہار ہوگا۔

نواز دیوبندی صاحب پر جب یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ اس وقت مسلمان جو پستی و انحطاط میں جا رہے ہیں اس کا سبب ان کا اپنے اسلاف کے علم و تجربات کی روشنی سے عدم استفادہ ہے، جس کے سبب ہمارے کردار میں وہ بلندی نہیں رہی جس کے سبب فتح و نصرت ہمارا مقدر تھی۔ اور آج بھی اس درد کا درماں انہیں ہستیوں کے مرتبہ اصول زریں اور نمونہ واسوہ عمل کرنے میں ہے تو انہوں نے قوم و ملت کو اس طرف متوجہ کرنے کے لئے یہ قابل تعریف خدمت انجام دینے کا عزم مصمم کیا جس میں منجانب اللہ انہیں کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

تاریخ بتاتی ہے کہ مسلم قوم جب ہندوستان میں آئی تو بلند کرداری اس کا جوہر اصلی تھا، جو ترقی کا سبب بنا اور ہر طرح کی بلندی و رفعتوں سے وہ سرفراز ہوئے۔ آج ضرورت ہے کہ اپنے اندر بلند حوصلگی اور اصلاح اخلاق کے لئے ہم ایسی تاریخی مذہبی اور علمی و روحانی شخصیات کی سیرتوں کا مطالعہ کر کے اپنے لئے رہ نمائی حاصل کریں، جن کے اخلاق فاضلہ اور بلند کرداری انہیں قیادت و حکمرانی تک لے گئی، تاکہ ہمیں اپنی اصلی بیماریوں، کمزوریوں، نقص اور خامیوں پر اطلاع ہو سکے اور ایک نئے جوش و جذبہ کے ساتھ علمی و عملی میدان میں آگے بڑھ سکیں۔

بہر حال فاضل مرتب کی یہ کوشش نہایت قابل قدر اور موجب برکت و رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرما کر موصوف کے لئے ذخیرہ آخرت فرمائے اور جمیع مسلمانوں کو اس سے فیضیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایں دعاء از من و از جملہ جہاں آمین باد

رقمہ الراجی الی رحمة المنان

محمد عمر (فاسی) بگبانوی

مقیم محلہ محمود نگر، مظفر نگر

سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند

مختصر تذکرہ دارالعلوم دیوبند

سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند

مختصر تذکرہ دارالعلوم دیوبند

فہرست

۴۹	اسلام میں تعلیم کی اہمیت
۵۰	مسلمانوں کی خدمت تعلیم کا اعتراف
۵۱	برصغیر انقلاب کی زد میں
۵۱	علماء کا احساس ذمہ داری
۵۲	انگریزوں کا مکمل تسلط
۵۳	عیسائیت کا پرچار
۵۳	دارالعلوم دیوبند کا قیام
۵۵	بنائے دارالعلوم
۵۶	اساسی اصول ہشت گانہ
۵۸	انتظامی اصول ہشت گانہ
۵۹	دارالعلوم کی تاسیس اور پیشین گوئیاں
۶۰	دارالعلوم کا سلسلہ سند و استناد
۶۲	دارالعلوم کا مسلک
۶۳	دارالعلوم کا نصاب
۶۵	تحصیل علوم جدیدہ کی ترغیب
۶۵	دارالعلوم دیوبند کا مجموعی مذاق اور اسکی تربیت کا رخ
۶۶	دارالعلوم کی مجالس
۶۶	مجلس شوریٰ
۶۷	مجلس عاملہ
۶۷	اسمائے گرامی ممبران مجلس شوریٰ و عاملہ
۷۲	مجموعہ مجالس شوریٰ

- ۷۲ مجلس علمیہ
- ۷۳ دارالعلوم کی سندیں اور سرٹیفکیٹ
- ۷۴ دارالعلوم کا ملک کے دوسرے اداروں سے رابطہ
- ۷۵ مجلات و جرائد
- ۷۵ دارالعلوم کا دفاع عن الدین
- ۷۶ دارالعلوم نے ملک کو کیا نفع پہنچایا
- ۷۶ دارالعلوم اور اصلاح امت
- ۷۷ دارالعلوم اور خدمت تفسیر
- ۷۸ علمائے دیوبند اور علم القرآن
- ۸۶ دارالعلوم اور خدمت حدیث
- ۸۷ دارالعلوم اور خدمت فقہ
- ۸۸ دیگر علوم و فنون میں دارالعلوم کی خدمات
- ۸۸ دارالعلوم اور تحریر و صحافت
- ۸۸ صحافی و اہل قلم
- ۹۰ دارالعلوم فتنوں کے تعاقب میں
- ۹۰ تحریک آزادی ہند میں علمائے دیوبند کا کردار
- ۹۱ شیخ الہند اکیڈمی
- ۹۲ مجلس تحفظ ختم نبوت
- ۹۲ مسجد رشید
- ۹۳ دارالعلوم کے شعبہ جات
- ۹۳ اندورن دارالعلوم علمی و ثقافتی سرگرمیاں
- ۹۴ انعامی جلسہ
- ۹۴ مہمانوں کی آمد پر اجلاس
- ۹۵ طلبہ کی انجمنیں
- ۹۵ شعبہ تقریر، شعبہ تحریر

۹۶	شعبہ مطالعہ
۹۶	طلبہ کی لائبریریاں
۹۶	انجمنوں کی تعداد
۹۷	النادی الادبی
۹۸	مقابلہ و مسابقہ
۹۸	فضلاء دارالعلوم دیوبند
۹۸	دارالعلوم کے اسلاف
۹۹	دارالعلوم کے اعلیٰ مناصب
۱۰۰	دارالعلوم کے سرپرست
۱۰۰	دارالعلوم کے مہتمم
۱۰۳	دارالعلوم کے صدر المدرسین
۱۰۶	دارالعلوم کے مفتی
۱۰۷	دارالعلوم کا حصہ تصانیف میں
۱۰۹	طبقات مشاہیر علمائے دیوبند
۱۰۹	محدثین
۱۱۰	مفسرین، متکلمین اسلام
۱۱۰	مصنفین و مؤرخین
۱۱۱	فقہاء، اصحاب تدریس
۱۱۲	مبلغین اسلام
۱۱۲	حضرات مشائخ
۱۱۳	مجاہدین و قائدین ملت
۱۱۳	مناظرین اسلام
۱۱۴	مصارف پر ایک نظر
۱۱۶	چند واردین و زائرین
۱۱۸	ترانہ دارالعلوم

مختصر تذکرہ دارالعلوم دیوبند

یہ مضمون حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی دارالعلوم دیوبند سے متعلق مختلف تحریروں کو جمع کر کے ترتیب دیا گیا ہے بعض معلومات، حضرت سید محبوب رضوی، حضرت مفتی ظفر الدین مدظلہ، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے مضامین اور اہتمام دارالعلوم دیوبند کی جانب سے شائع شدہ مختلف کتابچوں سے ماخوذ ہیں۔ تازہ ریکارڈ اور اعداد و شمار دارالعلوم دیوبند کے مختلف دفاتر سے یکجا کئے گئے ہیں۔ نوآز دیوبندی

کائنات انسانی کے لئے اسلام میں ایک مکمل ضابطہ حیات اور دستور زندگی ہے، زندگی کا کوئی گوشہ اور حصہ ایسا نہیں ہے جس کے لئے اس میں منضبط اور مرتب ہدایات نہ ہوں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سرور کونین ﷺ نے جہاں دنیا کی اصلاح و فلاح کے لئے بہت سارے لازوال چشمتے بہائے دیے وہیں آپ نے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور سیرت سازی پر بھی خصوصی توجہ دی، تاکہ دنیا امن و سلامتی اور صلح و آشتی کا گہوارہ باقی رہ سکے، اور انسان جامعہ انسانیت کو تار تار کرنے کا گناہ مول نہ لے۔

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

جن لوگوں کی اسلامی نظام زندگی پر گہری اور وسیع نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی بسم اللہ ہی تعلیم و تعلم، درس و تدریس اور کتاب و قلم سے ہوئی ہے رحمت عالم ﷺ پر پہلی وحی یہ نازل ہوئی۔

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ
الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ
الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ
الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

اپنے رب کے نام سے پڑھ، جو سب کا
بنانے والا ہے، اس نے انسان کو جمے
ہوئے خون سے بنایا، پڑھ اور تیرا رب برا
کریم ہے جس نے قلم سے علم سکھایا، سکھایا

(حق) آدمی کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔

ابتداء میں جب خود سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا، تو حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کو اپنے سینہ سے بار بار لگایا، جس سے آپ کا سینہ مبارک کھل گیا اور زبان مبارک پر یہ آیتیں جاری ہو گئیں۔

یہ پہلی وحی الہی اشارہ تھی کہ دنیا ظلمت و ضلالت کی وادی سے نکل کر اس وقت تک شاہراہ ہدایت و نور پر نہیں آسکتی ہے، جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لکھنا پڑھنا شروع نہ کر دے اور تعلیم و تربیت، درس و تدریس اور کتاب و قلم کے ساتھ وابستہ نہ ہو جائے، کیونکہ اس کی کامیابی کا راز کتاب و قلم اور تعلیم و تعلم میں ہی مضمر ہے۔

جس دین میں تعلیم و تربیت کی یہ شان ہو، اور تحصیل علم کیلئے جبر و کراہ تک کی اجازت دی گئی ہو، اس دین قیم میں علم و فن کی اشاعت، کتاب و سنت کی تعلیم و ترویج اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگی پرس قدر ابھار گیا ہو گا، اور اس دین پر ایمان لانے والوں میں عمل کا کیسا جذبہ و ولولہ ہو گا، اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

قرآن پاک اور حدیث نبوی ﷺ میں تعلیم و تربیت کی بڑی اہمیت و فضیلت آئی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے ہر دور میں علم و فن اور کتاب و سنت کی تعلیم و اشاعت پر اپنے ذہن و فکر اور مالی سرمایہ کا ایک بڑا حصہ خرچ کیا اور تعلیم و تربیت کے بے شمار ادارے قائم کئے، جہاں رہ کر ہزاروں لاکھوں افراد نے علم و عمل کی دولت حاصل کی اور اپنے ملک اور اپنی ملت کے لئے باعث صدا افتخار بنے۔

مسلمانوں کی خدمتِ تعلیم کا اعتراف

مسلمانوں کی اس خدمت کا اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے، اور ساتھ ہی مدح و ستائش کی ہے، مشہور فرانسیسی مصنف ڈاکٹر لیبان لکھتا ہے :-

”خلفائے اسلام نے حکومت مستحکم کرنے کے بعد بڑے بڑے شہروں میں تعلیم و تربیت کے مرکز قائم کئے۔ تمام زبانوں کی کتابوں کو عربی زبان میں بدلا، پھر زبان سیکھی، اور ہر علم کے امام بن گئے، اور اس کو ترقی دی۔“

(تمدن عرب ص ۳۹)

یہ بھی لکھا ہے کہ: ”عام تعلیمی مدارس کے علاوہ بغداد، قاہرہ، طلیہ، قرطبہ وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں علمی و تحقیقی مراکز قائم کیے گئے، جہاں علم و فن کی اشاعت و ترویج کا غرض کل

(ایضاً ص ۳۹۹)

مسالہ علمی تحقیقات کا موجود تھا۔“

مسلمانوں کے ذوق تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں رقمطراز ہے :-

”عربوں نے جو مستعدی تحصیل علم میں ظاہر کی وہ فی الواقع حیرت انگیز ہے، جب وہ

کسی شہر کو لیتے تو ان کا پہلا کام وہاں مسجد اور مدرسہ بنانا ہوا کرتا تھا۔“ (ایضاً)

خود اس ملک ہندوستان میں جب مسلمانوں کے قدم آئے تو ان کے ساتھ علم و عمل، عدل

و مساوات اور رواداری و فیاضی بھی ساتھ آئی، جہاں اس ملک کو بہت کچھ انہوں نے عطا

کیا، وہاں علم و فن اور تعلیمی اداروں کی بھی کمی نہیں رکھی، خود انگریزوں نے لکھا ہے کہ حکومت

برطانیہ کے پہلے صرف بنگال میں اسی ہزار دیسی مدارس تھے، ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ

”ہندوستان اسکولوں سے بھرا ہوا ہے، وہاں ہر اکتیس لڑکوں پر ایک اسکول ہے“

سندھ کے متعلق مورخین نے بیان کیا ہے کہ :-

”وہاں مختلف علوم و فنون کے چار سو کالج تھے“

ہندوستان کا کوئی شہر اور صوبہ متعدد تعلیمی اداروں سے خالی نہیں تھا، ہر جگہ درس گاہیں

قائم تھیں جہاں بچے اور نوجوان تعلیم میں منہمک ہوتے تھے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے تعلیمی ہند)

برصغیر انقلاب کی زد میں

لیکن ہندوپاک اور بنگلہ دیش پر ایک ایسا وقت آیا کہ یہاں سے دینی درس گاہیں اور

اسلامی مدارس و مراکز کا نام و نشان تک مٹ گیا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بہت پہلے

۱۷۷۱ء میں شاہ فرخ سیر نے انگریزوں کو تجارت کی اجازت دیدی اور ان کی تجارت کو

مخصوص ٹیکسوں اور چنگیوں سے مستثنیٰ قرار دے دیا، پھر ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم ثانی نے اکیس

لاکھ سالانہ معاوضہ لے کر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ان کے حوالہ کر دی۔

علماء کا احساس ذمہ داری

انہی حالات سے متاثر ہو کر خاندان ولی اللہی کے چشم و چراغ سراج الہند حضرت شاہ

عبدالعزیز محدث دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) (م ۱۲۳۹ھ) نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا

اور اعلان کیا کہ مسلمانوں کے امام کا حکم قطعاً جاری نہیں ہے، بلکہ عیسائی سرداروں کی حکمرانی ہے اور اس شہر دہلی سے کلکتہ تک نصاریٰ کی حکومت قائم ہے۔

اور یہی حالات تھے کہ آپ کے فیض یافتہ حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۴۶ھ) اور آپ کے برادر زادہ حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۴۶ھ) نے مجاہدین کی ایک منظم جماعت کے ساتھ برصغیر میں عدل و مساوات کی اسلامی حکومت قائم کرنے کی بھرپور جدوجہد کی اور اس راستہ میں جام شہادت نوش کیا۔

اس کے بعد بھی خاندان ولی اللہی کے ایک نیرتاباں حضرت مولانا محمد اسحاق محدث دہلوی (م ۱۲۶۲ھ) اپنے نانا جان شاہ عبدالعزیز کی اس مسندِ درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کو آباد کئے رہے، جسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) کے پدر بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم (م ۱۱۳۱ھ) نے دہلی میں بچھائی تھی، اور جس کے غلغلہ سے پورا برصغیر پر شور تھا، مگر حالات سے مایوس ہو کر وہ بھی ۱۲۵۸ھ میں راہ ہجرت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، اور ہندوستان سے نکل کر حجاز مقدس میں پناہ لی۔

آپ کے بعد قال اللہ اور قال الرسول کا آوازہ مجددی خاندان کے چشم و چراغ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی (م ۱۲۹۶ھ) سے قائم تھا، اور آپ سے علم و عمل کے چشمے پھوٹ پھوٹ کر ملک کو سیراب کر رہے تھے، مگر انقلابِ زمانہ نے اس محدث کو بھی یہاں چین سے بیٹھنے نہ دیا اور ۱۲۷۲ھ میں آپ نے بھی یہاں سے ہجرت فرما کر حجاز مقدس کی راہ لی، اس کا انجام یہ ہوا کہ برصغیر حدیث نبوی اور دینی تعلیمات کی اشاعت و ترویج سے محروم سا ہو گیا۔

انگریزوں کا مکمل تسلط

بالآخر اس پر آشوب دور کا شباب ۱۲۷۵ھ ۱۸۵۷ء پر مکمل ہو گیا، اور سلطنتِ مغلیہ کا منہماتا چراغ گل ہو گیا، اور پورے ملک پر انگریزوں کی حکمرانی قائم ہو گئی مسلمانوں کا دہلی میں قتل عام ہوا، اور دہلی الاشوں سے پت گئی، علماء بے دریغ تہ تیغ کئے گئے، پھانسیوں پر بے دردی سے لٹکائے گئے، جونچ بچائے گئے تھے ان کو گرفتار کر کے جزیرہ انڈمان میں قید کر دیا گیا، پھر اس کے بعد ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی، اوقاف و معافیات جن سے مدارس چلتے تھے، ان

”ہم نے ان کے طریق تعلیم کو بھی اس سرمایہ سے محروم کر دیا جس پر اس کی بقا کا دار و مدار تھا، اس سے مسلمانوں کا تعلیمی نظام اور ان کے تعلیمی ادارے یک قلم مٹ گئے۔“

تفصیل ملاحظہ کرنا ہو تو اس کے لئے ”ہمارے ہندوستانی مسلمان“ کا بغور مطالعہ کریں، پھر اندازہ ہو گا کہ اس ملک میں مسلمانوں کا کیا حال ہو گیا تھا۔

عیسائیت کا پرچار

انگریزوں نے اسی پراکتفا نہیں کیا، بلکہ حکومت کے قدم جمتے ہی عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی اور وہ بھی اس طرح کہ :

”دیسی پادریوں کے علاوہ جن کا کوئی شمار نہیں صرف نو سو ولایتی پادری تھے جو تندہی کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف تھے، اس کے علاوہ ایک مکتی فوج تھی، جس کے اسی دستے ان کی پشت پناہی اور امداد کرتے تھے اور ان کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔“

سیرت مولانا محمد علی مونگیری : ص ۴۶

برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن نے ۱۸۵۷ء کے بعد ایوان میں تقریر کی :-

”خداوند تعالیٰ نے یہ دن ہمیں اس لئے دکھایا ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرا دیں، ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کے عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہئے اور اس میں کسی طرح تساہل نہیں ہونا چاہئے۔“

دارالعلوم دیوبند کا قیام

یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ وقت بڑا ہی صبر آزما تھا، ۱۸۵۷ء کے بعد جو چند علماء ربانین اور مشائخ عظام انگریزوں کی گرفت سے بچ گئے تھے اور جو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، حالات نے ان کو جھنجھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں آزاد مدارس دینیہ کے قیام کی اسکیم ڈال دی، تاکہ ان کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کے بقا و تحفظ اور کتاب و سنت کی اشاعت و ترویج کا سلسلہ جاری ہو سکے۔

تیرھویں صدی ہجری آخری سانس لے رہی تھی۔ ہندوستان میں اسلامی شوکت کا

چراغ گل ہو چکا تھا، صرف اٹھتا ہوا دھواں رہ گیا تھا جو چراغ بجھ جانے کا اعلان کر رہا تھا۔ دہلی کا تخت مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا۔ صرف ڈھول کی منادی میں ”ملک بادشاہ کا“ رہ گیا تھا۔ اسلامی شعائر رفتہ رفتہ روبہ زوال تھے۔ دینی علم اور تعلیم گاہیں پشت پناہی ختم ہو جانے کی وجہ سے ختم ہو رہی تھیں۔ علمی خانوادوں کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ دینی شعور رخصت ہو رہا تھا اور جہل و ضلال مسلم قلوب پر چھاتا چلا جا رہا تھا، مسلمانوں میں پیغمبری سنتوں کی بجائے جاہلانہ رسوم و رواج، شرک و بدعت اور ہوا پرستی وغیرہ زور پکڑتے جا رہے تھے۔ مشرقی روشنی چھپتی جا رہی تھی اور مغربی تہذیب و تمدن کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ جس سے دہریت و الحاد، فطرت پرستی اور بے قیدی نفس، آزادی فکر اور بے باکی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں، جس سے نگاہیں خیرہ ہو چلی تھیں۔ اسلام کی جیتی جاگتی تصویر بیمار آنکھوں میں دھندلی نظر آنے لگی تھی، اور اتنی دھندلی کہ اسلامی خدو خال کا پہچانا بھی مشکل ہو چکا تھا، چمن اسلام میں خزاں کا دور دورہ تھا۔ خوش آواز اور شیریں ادا پرندوں کے زمزمے مدھم ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ زاع و زغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی، اور اسی قسم کے اور ہزار ہا حوادث اور المناک واقعات کے چند اجمالی عنوانات ہیں جن سے اس وقت کے ہندوستان کی مسموم فضا کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔

اند کے باتو بگفتیم و بدل تر سیدیم کہ دل آزرہ شوی ورنہ سخن بسیار است
ان حالات سے یقین ہو چلا تھا کہ اسلام کا چمن اب اجڑا اور یہ کہ اب ہندوستان بھی اسپین کی تاریخ دہرانے کیلئے کمر بستہ ہو چکا ہے، کہ اچانک چند نفوس قدسیہ نے بالہام خداوندی اپنے دل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی، یہ خلش علوم نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اور اس کے راستہ سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ ایک جگہ جمع ہوئے اور اس بارے میں قلبی واردات کا تذکرہ کیا جو اس پر مجتمع تھیں کہ اس وقت بقائے دین کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ دینی تعلیم کے ذریعہ مسلمانان ہند کی حفاظت کی جائے اور تعلیم و تربیت کے راستہ سے ان کے دل و دماغ کی تعمیر کر کے ان کی بقاء کا سامان کیا جائے اور اس کی واحد صورت یہ ہی ہے کہ ایک درس گاہ قائم کی جائے، جس میں علوم نبویہ پڑھائے جائیں اور ان ہی کے مطابق مسلمانوں کی دینی، معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلامی سانچوں میں ڈھالی جائے جس سے ایک طرف تو مسلمانوں کی داخلی راہ نمائی

ہو اور دوسری طرف خارجی مدافعت۔ نیز مسلمانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات بھی پھیلیں اور ایمان دارانہ سیاسی شعور بھی بیدار ہو۔ ان مقاصد کے لئے کمر باندھ کر اٹھنے والے یہ لوگ رسمی قسم کے رہنما اور لیڈر نہ تھے، بلکہ خدار سیدہ بزرگ اور اولیاء وقت تھے اور ان کی یہ باہمی گفت و شنید کوئی رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلہ خیال نہ تھا بلکہ تبادلہ الہامات تھا۔ جیسا کہ میں (حضرت قاری محمد طیبؒ) نے حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی (رحمۃ اللہ علیہ) مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند سے سنا۔ کہ وقت کے ان تمام اولیاء اللہ کے قلوب پر بیک وقت یہ الہام ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کی واحد صورت قیام مدرسہ ہے، چنانچہ اس مجلس مذاکرہ میں کسی نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حفظ دین و مسلمین کیلئے اب ایک مدرسہ قائم کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو، کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ کا قیام ضروری ہے۔ کسی نے بہت صریح لفظوں میں کہا مجھے منجانب اللہ الہام کیا گیا ہے کہ ان حالات میں تعلیم دین کا ایک مدرسہ قائم ہونا ضروری ہے۔ ان اہل اللہ کا اس تبادلہ و واردات کے بعد قیام مدرسہ پر جم جانا درحقیقت عالم غیب کا ایک مرکب اجماع تھا جو قیام مدرسہ کے بارے میں منجانب اللہ واقع ہوا۔ اس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں قیام مدرسہ کی یہ تجویز نہ رسمی تھی بلکہ الہامی تھی۔ وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس تجویز کے پردہ میں ملک گیر اصلاح کی، اسپرٹ چھپی ہوئی تھی۔ جو محض مقامی یا ہنگامی نہ تھی، کیونکہ اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا اثر بھی مقامی نہ تھا۔ جس کے تدارک کی فکر تھی وہ پورے ملک پر پڑ رہا تھا، اس لئے اس کے دفعیہ کی یہ ایمانی رنگ کی تحریک بھی مقامی انداز کی نہ تھی بلکہ اس میں عالمگیریت پنہاں تھی۔ گو ابتداء میں اس کی شکل ایک چھوٹے سے تخم کی سی تھی، مگر اس وقت اس میں ایک تناور شجرہ طیبہ لپٹا ہوا تھا جس کی جڑیں سچے قلوب کی زمین میں پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اس سلسلہ میں ان نفوس قدسیہ کے سربراہ حجتہ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ تھے جنہوں نے اس غیبی اشارہ کو سمجھا اور اسے ایک تجویز کی صورت دی۔

بنائے دارالعلوم

کچھ وقت گزرنے کے بعد یہ مبارک تجویز عملی صورت میں نمودار ہوئی اور ۱۵ محرم

الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو دارالعلوم کی بناء رکھ دی گئی۔

بناء رکھنے کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی۔ اس بناء میں خصوصیت سے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب قدس سرہ، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہ اور حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب قدس سرہ قابل ذکر ہیں، جن کا ہاتھ ابتداء ہی سے تائیس مدرسہ میں تھا۔ یہ حضرات خصوصیت سے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہ کے دست و بازو رہے ہیں اور بناء کے بعد بھی اس کی ذمہ دار مجلس کے رکن رکیں کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام امور میں عملاً شریک رہے ہیں۔ بعد میں حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مجلس خیر کے رکن رکیں ہوئے اور بالآخر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد و ایما پر دارالعلوم کے عہدہ اہتمام پر فائز ہوئے اور آپ کا عہد اہتمام خیر و برکت کا سرچشمہ ثابت ہوا۔ دارالعلوم کی معنوی بناء کے لئے تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھ اصول تحریر فرمائے۔ جو اس ادارہ میں تمام قوانین کے لئے اساس و بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھ اصول عملی تجویز فرمائے جو اس ادارہ کے نظم و انتظام کی اساس و بنیاد ہیں۔ دونوں بزرگوں کے اصول ہشتگانہ درج ذیل ہیں جو اس دارالعلوم کی حکمت علمی اور نظم و انتظام کی اساس ہیں۔

اساسی اصول ہشتگانہ

از حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی

بانی دارالعلوم دیوبند

- ۱ اصل اول یہ ہے کہ تمام قدور کارکنان مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ کو شش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشان مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے۔
- ۲ ابقاء طعام طلباء بلکہ افزائش طعام طلباء میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ

مشیران ملک رحمۃ اللہ علیہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔
 القصہ تہ ول سے بروقت مشورہ اور اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ
 رہے، سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ
 سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے
 کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ، بدل و جان قبول کریں گے
 نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ
 کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل
 رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ
 سے مشورہ کی نوبت نہ آوے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ
 کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر مہتمم
 نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

۴ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرک ہوں اور مثل علماء روزگار
 خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدا نخواستہ جب اس کی نوبت آئے
 تو مدرسہ کی خیر نہیں۔

۵ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور اندازہ مشورہ
 سے تجویز ہو پوری ہو جلیا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہو گا اور اگر ہو گا تو
 بے فائدہ ہو گا۔

۶ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک مدرسہ انشاء اللہ بشرط
 توجہ الی اللہ چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا
 کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ
 ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع
 پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سرو سامانی رہے۔

۷ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے
 امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا حاکم ہوتا ہے۔

انتظامی اصول ہشتگانہ

از حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ

مہتمم دوم دارالعلوم دیوبند

- ۱ ہر کارخانہ کے امور جزئیہ کی بناء ایک شخص کی رائے پر رہنی چاہئے۔ اسی قاعدہ پر اس کارخانہ کے امور جزئیہ کے انجام میں کسی صاحب کو اہل مشورہ میں سے دخل نہ ہو، الا مشورہ اور رائے کہ وہ اپنے موقع پر اظہار فرمادیں جیسا اہل شوریٰ مل کر پسند کریں۔
- ۲ امور جزئیہ میں جو کوئی صاحب بندہ کے مددگار ہوں گے یا اچھا مشورہ دیں گے بندہ ان کا مشکور ہوگا مگر انجام ان کا موقوف بندہ ہی کی رائے پر رہنا چاہئے۔
- ۳ جس کسی صاحب کو، خواہ اہل شوریٰ خواہ اور عام خلق، کوئی امر قابل اعتراض معلوم ہو تو مہتمم سے مزاحمت نہیں۔ جلسہ شوریٰ میں پیش کر کے اس کو طے کرالیں اور جیسا قرار پائے اس کے انجام پر مہتمم کو عذر نہ ہوگا۔
- ۴ مشورہ کے جلسے جب کبھی ہوں بے حاضری مہتمم نہ ہوں اگرچہ اس کی کسی بات پر خوردہ ہو، اور یوں اہل شوریٰ کو اختیار اعتراض کا ہر وقت ہے اور مہتمم کو موقع جواب کا۔
- ۵ مہتمم اگر اہل شوریٰ کے اجتماع تک کسی امر ضروری کے انجام پر انتظار نہ کر سکے تو بذریعہ خط سب صاحبوں کو اطلاع دے گا اور اس ضروری امر کو سب صاحبوں کو قبول کرنا ہوگا۔
- ۶ آمدنی مدرسہ کی مہتمم کے ہاتھ میں رہے گی کیونکہ صرف ضروریہ کیلئے کسی قدر روپیہ مہتمم کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے، حاجت ضروری سے زیادہ روپیہ جب جمع ہو جایا کرے گا تو خزانچی کے پاس جمع کر دیا جائے گا۔
- ۷ ہر روز وقت مقررہ مدرسہ مہتمم مدرسہ میں جایا کرے گا اور اسی وقت میں امور متعلقہ مدرسہ کو انجام دیا کرے گا۔
- ۸ مناسب ہے کہ سب اہل شوریٰ مل کر اپنے دستخط اس معروضہ پر فرمادیں کہ مہتمم کو جائے

سند رہے۔

دستخط
العبد محمد عابد

دستخط
العبد ذوالفقار علی

دستخط
العبد محمد قاسم

(تحریر ۳۱ ذیقعدہ ۱۲۸۸ھ)

دارالعلوم کی تاسیس اور پیشین گوئیاں

دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ کی مسجد کہتے ہیں ایک انار کا درخت ہے۔ اسی درخت کے نیچے سے آب حیات کا یہ چشمہ پھوٹا اور اسی چشمہ نے ایک طرف تو دین کے چمن کی آبیاری شروع کر دی اور دوسری طرف اس کی تیز و تند رو نے شرک، بدعت، فطرت پرستی، الحاد و دہریت اور آزادی فکر کے ان خس و خاشاک کو بھی بہانا اور راستہ سے ہٹانا شروع کر دیا جنہوں نے مسلمانوں کے قلوب میں جر پکڑ کر انہیں یہ روز بد دکھایا تھا۔ بانی دارالعلوم کا یہ خواب کہ ”میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں“ پورا ہوا اور مشرق و مغرب میں علوم نبوت کے چشمے جاری ہونے کی راہ ہموار ہو گئی۔ دارالعلوم کے مہتمم ثانی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہاجر مدنی قدس سرہ کا یہ خواب کہ ”علوم دینیہ کی چابیاں مجھے دی گئی ہیں“ خواب ہی نہ رہا بلکہ حقیقت کے لباس میں جلوہ گر ہو گیا۔ اور اس مدرسہ کے ذریعہ ان چابیوں نے ان قلوب کے تالے کھول دیئے جو علم کا ظرف تھے یا ظرف بننے والے تھے، جن سے علم کے سوتے ہر طرف سے پھوٹنے لگے اور چند نفوس قدسیہ کا علم آن کی آن میں ہزار ہا علماء کا علم ہو گیا۔ حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے گذرتے ہوئے جب اس مقام پر پہونچے تھے جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہوئی ہے تو فرمایا تھا کہ ”مجھے اس جگہ علم کی بو آتی ہے“ پس وہ خوشبو جس کو سید صاحب کی روحانی قوت شامہ نے سونگھا تھا ایک سدا بہار گلاب کے پھول، بلکہ گلاب آفریں درخت کی شکل میں آگئی جس سے ہزاروں پھول کھلے اور ہندوستان کا اُجڑا ہوا چمن تختہ گلاب بن گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ خوشبو بیج بنے گی، بیج سے کلی کھلے گی، شگفتہ کلی سے پھول بنے گی، پھول سے گلہستہ بنے گی اور اس گلہستہ کی خوشبو سے سارا عالم انسانی مہک اُٹھے گا اور کسے پتا تھا کہ ایتسیا کی فضا میں مغربی استعماریت کے جو جراثیم پھیلے ہوئے ہیں وہ اس کی جراثیم کش مہک سے آپ ہی اپنی موت مرنے شروع ہو جائیں گے۔ بہر حال وہ ساعت محمود آگئی کہ

مدرسہ کا آغاز ہوا اور اس کی یہ تعمیر و دفاع کی ملی جلی تعلیم عملاً ساحت وجود پر آگئی۔ ملا محمود رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی نے (جو حضرت بانی دارالعلوم کے امر پر مدرسہ دیوبند کا یہ تعلیمی منصوبہ جاری کرنے کیلئے بحیثیت مدرس میرٹھ سے دیوبند تشریف لائے) اپنے ایک شاگرد کو (کہ ان کا نام بھی محمود ہی تھا اور آخر شیخ الہند مولانا محمود حسن کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے) بٹھا کر سی عمارت میں نہیں جو مدرسہ کے نام سے بنائی گئی ہو بلکہ چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس مشہور عالم درس گاہ دارالعلوم دیوبند کا افتتاح کر دیا۔ نہ کوئی مظاہرہ تھا نہ شہرت پسندی کا ر و کار اور جذبہ، نہ نام و نمود کی تڑپ تھی اور نہ پوسٹرو اشتہارات کی بھرمار۔ بس ایک شاگرد اور ایک استاد، شاگرد بھی محمود اور استاد بھی محمود۔ دو نفر سے یہ لاکھوں کے ایمانوں کی حفاظت کی اسکیم معرض وجود میں آگئی۔ سادگی اور ندرت ایمان کا دور دورہ شروع ہو گیا جو سنت نبوی اور اتباع سلف کی روح ہے۔ مقصد نہ ترقی تھا نہ تنعم، نہ تعیش نہ تزیّن نہ تفاخر نہ تکاثر بلکہ صرف ”ما انا علیہ واصحابی“ کا مرقع بنانا اور ”علیکم بسنتی الخ“ و ”واتبع سبیل من اناب الی“ کی سیدھی راہ کی عملی تصویر کھینچنی تھی اور اس تصویر کشی میں کمال احتیاط و اعتدال بھی پیش نظر تھا کہ صراطِ مستقیم کے یہ خطوط کہیں ان بہتر فرقوں کے خطوط سے نہ مل جائیں جنہیں شریعت کی اصطلاح میں سُبُل متفرقہ کہا گیا ہے۔

ہفتاد و دو طریقِ حسد کے عدو سے ہیں اپنا ہے وہ طریق کہ باہر حسد سے ہے
اس لئے جامعیت و اعتدال اور دین و دانش کے ملے جلے اندازوں کے ساتھ اس درس گاہ میں تعلیم و تربیت کا خطِ مستقیم کھینچا گیا۔

دارالعلوم کا سلسلہ سند و استناد

دارالعلوم دیوبند کا سلسلہ سند حضرت الامام شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی قدس سرہ العزیز سے گزرتا ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے۔ شاہ صاحب اس جماعت دیوبند کے مورثِ اعلیٰ ہیں جن کے مکتب فکر سے اس جماعت کی تشکیل ہوئی۔ حضرت ممدوح نے اولاً اس وقت کے ہندوستان کے فلسفیانہ مزاج کو اچھی طرح پرکھا۔ پھر علوم شریعت کو ایک مخصوص جامع نقل و نقل کے طرز میں پیش فرمایا۔ جس میں نقل کو عقل کے جامہ میں ملبوس کر کے نمایاں کرنے کا ایک خاص انداز نہاں تھا، تحت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانی

دارالعلوم دیوبند نے ولی اللہی سلسلہ کے تلمذ سے اس رنگ کو نہ صرف اپنایا جو انہیں ولی اللہی خاندان سے ورثہ میں ملا تھا بلکہ مزید تنور کے ساتھ اس کے نقش و نگار میں اور رنگ بھرا، اور وہی منقولات جو حکمت ولی اللہی میں معقولات کے لباس میں جلوہ گر تھے، حکمت قاسیمہ میں محسوسات کے لباس میں جلوہ گر ہو گئے۔ پھر آپ کے سہل ممتنع انداز بیان نے دین کی انتہائی گہری حقیقتوں کو بلاشبہ علم لدنی کے خزانہ سے ان پر بالہام غیب منکشف ہوئیں، استدلالی اور لمبائی رنگ میں آج کو خوگر محسوس یا حس پرست دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور ساتھ ہی اس خاص مکتب فکر کی جو ایک خاص طبقہ کا سرمایہ اور خاص حلقہ تک محدود تھا، دارالعلوم دیوبند جیسے ہمہ گیر ادارہ کے ذریعہ ساری اسلامی دنیا میں پھیلا دیا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ولی اللہی مکتب فکر کے تحت دیوبندیت، درحقیقت قاسمیت یا قاسمی طرز فکر کا نام ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد اس دارالعلوم کے سرپرست ثانی قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے قاسمی طرز فکر کے ساتھ دارالعلوم کی تعلیمات میں فقہی رنگ بھرا جس سے اصول پسندی کے ساتھ فروع فقہیہ اور جزئیاتی تربیت کا قوام بھی پیدا ہوا اور اس طرح فقہ اور فقہاء کے سرمایہ کا بھی اس میراث میں اضافہ ہو گیا۔ ان دونوں بزرگوں کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے اولین صدر مدرس جامع العلوم اور شاہ عبدالعزیز ثانی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نے جو حضرت بانی دارالعلوم سے سلسلہ تلمذ بھی رکھتے تھے دارالعلوم کی تعلیمات میں عاشقانہ، والہانہ اور مجذوبانہ جذبات کا رنگ بھرا جس سے یہ صہبائے دیانت سہ آتشہ ہو گئی۔

آپ کے وصال کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرست ثالث شیخ الہند حضرت مولانا محمد حسن صاحب قدس سرہ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند جو حضرت بانی دارالعلوم قدس سرہ کے تلمیذ خاص بلکہ علم و عمل میں نمونہ خاص تھے، ان تمام الوان علوم کے محافظ ہوئے اور انہوں نے چالیس سال دارالعلوم کی صدارت تدریس کی لائن سے علوم و فنون کو تمام منطقہ ہائے اسلامی میں پھیلا دیا اور ہزار ہا تلمذگان علوم ان کے دریائے علم سے سیراب ہو کر اطراف میں پھیل گئے۔ اس لحاظ سے یوں سمجھنا چاہئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ جماعت دارالعلوم کے جدا مجاہد ہیں، حضرت نانوتوی قدس سرہ جد قریب، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ الخ الخ اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بمنزلہ پدر بزرگوار ہیں۔

دارالعلوم کا مسلک

عملی حیثیت سے یہ ولی اللہی جماعت مسلک اہل سنت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب و سنت اور اجماع و قیاس پر قائم ہے۔ اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین درجہ نقل و روایت اور آثارِ سلف کو حاصل ہے جس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے یہاں کتاب و سنت کی مرادات اقوال سلف اور ان کے متواتر مذاق کی حدود میں محدود رہ کر محض قوت مطالعہ سے نہیں بلکہ اساتذہ اور شیوخ کی صحبت و ملازمت اور تعلیم و تربیت ہی سے متعین ہو سکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ عقل و روایت اور تفقہ فی الدین بھی اس کے نزدیک فہم کتاب و سنت کا ایک بڑا اہم جزو ہے۔ وہ روایات کے مجموعہ سے حنفی فقہ کی روشنی میں شارع علیہ السلام کی غرض و غایت سامنے رکھ کر تمام روایات کو اسی کیساتھ وابستہ کرتا ہے اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیں۔ اس لئے جمع بین الروایات اور تعارض کے وقت تطبیق احادیث اس کا خاص اصول ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی چھوڑنا اور ترک کر دینا نہیں چاہتا جب تک کہ وہ قابل استدلال ہو۔ اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ میں انصوص شرعیہ میں کہیں تعارض اور اختلاف نہیں محسوس ہوتا۔ بلکہ سارے کا سارا دین تعارض اور اختلاف سے مبرا رہ کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے، جس میں ہر رنگ کے علمی و عملی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ بطریق اہل سلوک جو رسمیات اور رواجوں اور نمائشی حال و قال سے بیزار اور بری ہے۔ تزکیہ نفس اور اصلاح باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری ہے اس نے اپنے مستسبین کو علم کی رفعتوں سے بھی نوازا اور عبدی و تواضع جیسے انسانی اخلاق سے بھی مزین کیا اور اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار، استغناء (علمی حیثیت سے) اور غناء نفس (اخلاقی حیثیت سے) کی بلندیوں پر فائز ہوئے، وہیں فروتنی، خاکساری اور ایثار و زہد کے متواضعانہ جذبات سے بھی بھرپور ہوئے۔ نہ رعونت اور کبر و نخوت کا شکار ہوئے اور نہ ذلت نفس اور مسکنت میں گرفتار، وہ جہاں علم و اخلاق کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے اونچے دکھائی دینے لگے وہیں عجز و نیاز، تواضع و فروتنی اور امتیازی کے جوہر و لوازم سے مزین ہو کر عوام میں مل جلے اور ”کا حد من

الناس“ بھی رہے۔ جہاں مجاہدہ و مراقبہ سے خلوت پسند ہوئے وہیں مجاہدانہ اور غازیانہ اسپرٹ نیز قومی خدمت کے جذبات سے جلوہ آرا بھی ثابت ہوئے۔ غرض علم و اخلاق، خلوت و جلوت اور مجاہدہ و جہاد کے مخلوط جذبات و دوائی سے ہر دائرہ دین میں اعتدال اور میانہ روی ان کے مسلک کی امتیازی شان بن گئی۔ جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑے یا فقیہ ہونے کے معنی محدث سے بیزار ہو جانے یا نسبت احسانی (تصوف پسندی) کے معنی متکلم دشمنی یا علم کلام کی حداقت کے معنی تصوف بیزاری کے نہیں۔ بلکہ اس کے جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فارغ درجہ بدرجہ بیک وقت محدث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی (محسن) اور حکیم و مربی ثابت ہوا، جس میں زہد و قناعت کے ساتھ عدم تقشّف، حیاء و انکسار کے ساتھ عدم مداہنت، رافت و رحمت کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر قلبی یکسوئی کے ساتھ قومی خدمت اور خلوت در انجمن کے ملے جلے جذبات راسخ ہو گئے۔ ادھر علم و فن اور تمام ارباب علوم و فنون کے بارے میں اعتدال پسندی اور حقوق شناسی نیز ادائیگی حقوق کے جذبات ان میں بطور جوہر نفس پیوست ہو گئے۔ بنا بریں دینی شعبوں کے تمام ارباب فضل و کمال اور راسخین فی العلم خواہ محدثین ہوں یا فقہاء، صوفیاء ہوں یا عرفاء، متکلمین ہوں یا اصولیین، امراء اسلام ہوں یا خلفاء اس کے نزدیک سب واجب الاحترام اور واجب العقیدت ہیں۔ اس لئے جذباتی رنگ سے کسی طبقہ کو بڑھانا اور کسی کو گرانا یا مدح و ذم میں حدود شرعیہ سے بے پروا ہو جانا اس کا مسلک نہیں۔

دارالعلوم کا نصاب

تیرہویں صدی کے نصف آخر میں دہلی اور خیر آباد کی علمی مرکزیت ختم ہو چکی تھی، البتہ لکھنؤ میں علم کی کچھ روشنی باقی تھی، گو ان مقامات کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی، تاہم ان تینوں مرکزوں کی ماہر امتیاز خصوصیات ہندوستان کے مدارس عربیہ میں کم و بیش موجود تھیں۔

دارالعلوم دیوبند نے ان علوم کی عظمت کو نہ صرف یہ کہ باقی رکھا ہے، بلکہ ان کو ترقی دینے میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں ان تینوں مقامات کی خصوصیات کو جمع کر دیا گیا، اور ان کے امتزاج سے جو نصاب تیار ہوا ہے، کم و بیش

ایک صدی (زائد) سے وہی بالعموم مدارس عربیہ میں زیر درس ہے، بعض مقامات پر دوسرے جدید نصاب بھی رائج ہیں، ایسے مدارس میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کی حیثیت زیادہ ممتاز ہے، مگر یہ نصاب زیادہ عام نہیں ہے۔

نصاب دارالعلوم کی مذکورہ بالا جامعیت کے باوجود جس طرح ہر زمانے میں حالات کے تقاضوں کے مطابق نصاب تعلیم میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے اسی طرح دارالعلوم کے نصاب میں بھی وقتاً فوقتاً حالات زمانہ کے تقاضے کے مطابق حذف و اضافہ کیا جاتا رہا ہے جس میں علوم دینیہ کے ساتھ عصری علوم اور معاشی ضرورتوں کا بھی فی الجملہ لحاظ رکھا گیا ہے (اب باقاعدہ کمپیوٹر اور شعبہ صحافت کا شعبہ بھی قائم کر دیا گیا ہے) اور اسے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

موجودہ نصاب چار طبقات پر مشتمل ہے، ابتدائی، متوسط، اعلیٰ، تکمیل درجہ تکمیل لازمی نہیں ہے، اگر طلب علم کو مزید کسی خاص موضوع یا فن میں مہارت حاصل کرنا مقصود ہو تو وہ درجہ تکمیل میں داخلہ لے کر مزید اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم حسب تفصیل ذیل علوم و فنون اور کتابوں پر مشتمل ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا نصاب خالص مذہبی اور دینی تجویز کیا گیا، اس کی وجہ خود بانی کی زبان سے سنیں، فرماتے ہیں:

”در باب تحصیل یہ طریقہ خاص تجویز کیا گیا اور علوم جدیدہ کو کیوں شامل نہ کیا گیا، منجملہ دیگر اسباب بڑا سبب اس بات کا ایک تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص اس پہلو کا لحاظ چاہئے جس طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو، سواہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کی سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہیں ہوئی ہوگی، ہاں علوم نقلیہ کا تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا، ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل الاحاصل نظر آیا..... دوسرے یہ کہ زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد ہوتی ہے۔“

تحصیل علوم جدیدہ کی ترغیب

لیکن آپ نے یہ بھی مشورہ دیا کہ یہاں سے فراغت کے بعد علوم جدیدہ حاصل کرنے کی سعی کی جائے، آپ کے الفاظ یہ ہیں:

”اس کے بعد طلبہ مدرسہ ہذا کو مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ میں کمال پیدا کرنے کی سعی جاری رکھنی چاہئے۔“ (روداد ۱۲۹۰ھ)

بعد میں دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں بقدر ضرورت علوم جدیدہ کا بھی اضافہ کیا گیا، تاکہ یہ اس طرف سے بالکل نا آشنا نہ ہوں، لیکن زیادہ توجہ اور محنت علوم دینیہ پر کی گئی جو دارالعلوم کا خاص موضوع ہے، اور جو موجودہ دور میں توجہ کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا مجموعی مذاق اور اس کی تربیت کا رخ

۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں جب کہ مسلمانوں کی شوکت ہندوستان سے پامال ہو چکی تھی اور حالات میں یکسر انقلاب اور تبدیلی آچکی تھی۔ دارالعلوم نے ان بدلتے ہوئے حالات میں جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ کہ مسلمانوں میں بلحاظ دین و مذہب اور بلحاظ معاشرت تبدیلی نہیں ہونے دی کہ وہ حالات کی رو میں بہہ جائیں۔ پختگی اور عزیمت کے ساتھ انہیں اسلامی سادگی اور دینی ثقافت کے زاہدانہ و متوکلانہ اخلاق پر قائم رکھا مگر اس حکمت کے ساتھ کہ عوام کی حد تک اندرون حدود جائز توسعات سے گریز نہیں کیا جو بدلتے ہوئے تمدن و معاشرت میں طبعی طور پر ناگزیر تھا مگر خواص کی حد تک دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا جس سے عام مسلمانوں میں اسلامی مدنیت کا سادہ نقشہ قائم رہا اور جدید تمدن و معاشرت میں اغیار کی نقالی کا غلبہ نہیں ہو سکا اور اسلامی غیرت و حمیت باقی رہ گئی۔ مرعوبیت اور احساس کمتری قلوب میں جمنے نہیں پایا۔ ضمیر کی حریت و آزادی کا پورا پورا تحفظ کیا اور اتباع اغیار کے بجائے سنت نبوی کو معیار زندگی بنانے کے جذبات قلوب میں ابھارے جس سے عام تمدن و معاشرت میں پرہیزگاری اور تقویٰ و طہارت کے دوائی اجاگر رہے۔

بلحاظ حقیقت یہ سب کچھ اس کا ثمرہ تھا کہ دارالعلوم اور اس کے پروردوں کے مسلک اور زندگی کے معاملات کی اساس و بنیاد فلسفہ اور عقل محض پر نہیں تھی بلکہ انبیاء علیہم السلام

کے ڈالے ہوئے راستہ پر یعنی ————— محبت و عشق پر تھی جو ایمان کا بنیادی جوہر اور غالب عنصر ہے۔ فلسفہ اختراعات اور آزادی فکر کی راہ پر لے جاتا ہے اور عشق و محبت اتباع و ادب کی راہ پر چلاتا ہے فلسفہ کی بنیاد چونکہ عقلی اختراعات پر ہے اس لئے اگلا فلسفی پچھلے فلسفی کی تحمیق اور تغلیط کو اپنا واجبی حق سمجھتا ہے اور نبوت کی بنیاد چونکہ وحی اور عشق محبت و خداوندی پر ہے اس لئے ہر اگلا پیغمبر پچھلے پیغمبر کی تصدیق و محبت کو جزو ایمان بتاتا ہے۔ اندرونی جذبات کا یہی فرق فلاسفہ اور انبیاء کے متبعین میں بھی ہے۔ پس دارالعلوم کے طرز تربیت اور تعلیم و تمدن کا اہم جزو چونکہ وحی الہی کیساتھ ہمہ وقتی شغل و اشتغال اور قال اللہ و قال الرسول ہی کا تمام تر مشغلہ تھا اس لئے طبعی طور پر اس کے حلقوں میں ادب و اتباع اور عشق و محبت کی بنیادیں استوار ہوئیں اور ان کا اثر اوپر کی تعمیر یعنی دیانت، معاشرت اور عادت و عبادت میں آنا گزیر تھا اس لئے اس نے بدلتے ہوئے حالات پر پچھلوں کے نقش قدم کو برقرار رکھا اور زمانہ کی رو میں عوام کو کلیتہً بہنے نہیں دیا اور اس کی اس عزیمت کی عظمت کو دوستوں اور مخالفوں سب نے تسلیم کیا۔

لیکن جن بزرگوں نے اس دور میں اپنے حسن نیت اور اخلاص سے ہندوستانی مسلمانوں کی عزت نفس اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان کی مادی ترقی و سر بلندی کے لئے مساعی سرانجام دیں ان سے کبھی آویزش نہیں کی، ان کے کسی اقدام سے اگر دین یا دینی ذوق اور دین کے کسی عقیدہ و عمل کو متاثر ہوتے دیکھا تو اس کا کھل کر مقابلہ کیا اور اس طرح امکانی حد تک دین میں آزاد فکری اور آزاد روشی اور بے قیدی کی مداخلت کے راستے روکے رکھے۔

دارالعلوم کی مجالس

دارالعلوم میں تین ذمہ دار مجالس ہیں۔
۱۔ مجلس شوریٰ ۲۔ مجلس عاملہ ۳۔ مجلس علمیہ

۱۔ مجلس شوریٰ

یہ مجلس دارالعلوم کی سب سے بڑی بااختیار مجلس ہے۔ دارالعلوم کا تمام نظم و نسق اس

جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی جملہ تجاویز دربارہ انتظام و تعلیم قطعی اور جملہ کارکنان دارالعلوم کے لئے واجب التعمیل ہوتی ہیں۔ اس مجلس کے ارکان کی تعداد اکیس ہے جس میں کم از کم گیارہ علماء کا ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ باقی ارکان مسلمانوں کے دیگر طبقات سے منتخب ہو سکتے ہیں مگر حتی الامکان دو ممبر باشندگان دیوبند سے لئے جاتے ہیں۔ مہتمم اور صدر مدرس بحیثیت عہدہ مجلس شوریٰ کے رکن رہتے ہیں۔ اس مجلس کے سال میں دو جلسے ہوتے ہیں ایک محرم میں دوسرا رجب میں۔ اس مجلس کا کورم سات ہوتا ہے۔

۲۔ مجلس عاملہ

یہ مجلس، مجلس شوریٰ کے ماتحت ایک مستقل مجلس ہے جو مجلس شوریٰ کے فیصلوں اور منظور کردہ تجاویز کے عمل درآمد کے سلسلہ میں ذمہ داروں کے طریق عمل پر نظر رکھتی ہے۔ نظم و تعلیم اور دفاتر کے حسابات کی اور کارکردگی کی نگرانی اس کے ذمہ ہے۔ اس مجلس کے ارکان کی تعداد نو (۹) ہے مہتمم اور صدر مدرس باعتبار عہدہ اس کے مستقل رکن ہوتے ہیں بقیہ سات ممبر مجلس شوریٰ کے ارکان میں سے منتخب ہوتے ہیں۔ اس مجلس کا انتخاب سالانہ ہوتا ہے مجلس عاملہ کے سال بھر میں چار جلسے ہوتے ہیں۔ پہلا ربیع الاول میں، دوسرا جمادی الاول میں، تیسرا شعبان میں اور چوتھا ذی قعدہ میں مجلس عاملہ کا کورم پانچ ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے ممبران مجلس شوریٰ و مجلس عاملہ

ذیل میں ان حضرات کے اسماء گرامی درج کئے جاتے ہیں جو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے ہیں۔

اسماء گرامی حضرات ممبران مجلس شوریٰ و عاملہ دارالعلوم دیوبند

نمبر شمار اسماء گرامی

۱ حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب دیوبند کی

۲ جتوئی الاسلامیہ مولانا محمد قاسم صاحب مانوٹوئی

۳ مولانا مبین صاحب صاحب

- ۴ مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی
- ۵ مولانا فضل الرحمن صاحب دیوبندی
- ۶ منشی فضل حق صاحب
- ۷ شیخ نہال احمد صاحب
- ۸ حکیم مشتاق احمد صاحب
- ۹ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی
- ۱۰ حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری
- ۱۱ شیخ ظہور الدین صاحب دیوبندی
- ۱۲ مولانا احمد حسن صاحب امرہوئی
- ۱۳ مولانا قاضی محمد محی الدین صاحب مراد آبادی
- ۱۴ مولانا محمد عبد الحق صاحب پور قاضی
- ۱۵ شاہ مظہر حسین صاحب گنگوہی
- ۱۶ حکیم محمد اسماعیل صاحب گنگوہی
- ۱۷ شاہ سعید احمد صاحب انبیٹھوئی
- ۱۸ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
- ۱۹ حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب رائے پوری
- ۲۰ مولانا حافظ حکیم احمد صاحب رامپوری
- ۲۱ خلیفہ احمد حسن صاحب دیوبندی
- ۲۲ حافظ داد الہی صاحب دیوبندی
- ۲۳ منشی مظہر حسن صاحب دیوبندی
- ۲۴ منشی فراغت علی صاحب دیوبندی
- ۲۵ شیخ محمد حسن صاحب دیوبندی
- ۲۶ مولانا حکیم مسعود احمد صاحب ابن حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی
- ۲۷ مولانا سعید الدین صاحب رامپوری مدار المہام ریاست بھوپال
- ۲۸ مولوی ظہور علی احمد صاحب پوری قاضی وکیل بھوپال

- ۲۹ شیخ حبیب الرحمن صاحب دیوبندی محلہ کوٹلہ
- ۳۰ مولانا قاضی محمد حسن صاحب مراد آبادی قاضی القضاۃ بھوپال
- ۳۱ حاجی حافظ فصیح الدین صاحب میرٹھی
- ۳۲ مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگیوئی
- ۳۳ مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب کٹھوری
- ۳۴ مولانا حکیم مشیت اللہ صاحب بجنوری
- ۳۵ مولانا عبد الرحمن صاحب سیوہاروی
- ۳۶ مولانا حکیم محمد اشفاق احمد راپوری خواہر زادہ حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب
- ۳۷ مولانا حکیم رضی الحسن صاحب کاندھلوی
- ۳۸ حاجی شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی
- ۳۹ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند (بحیثیت عہدہ)
- ۴۰ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن
- ۴۱ مولانا حکیم مقصود علی صاحب مقصود جنگ ناظم الاطباء حیدر آباد دکن
- ۴۲ مولانا محمد صادق صاحب کراچی بانی مدرسہ مظہر العلوم کھڑہ کراچی
- ۴۳ مولانا حکیم سعید احمد صاحب گنگوہی المعروف بہ حکیم اجمیری
- ۴۴ مولانا محمد سہول صاحب بھاگل پوری سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدی پٹنہ
- ۴۵ خواجہ فیروز الدین صاحب جنرل اکاؤنٹینٹ ریاست کپورتھلہ
- ۴۶ مولانا محمد فضل اللہ صاحب وائس مہارشی مدراس
- ۴۷ مولانا عبد الرحمن خان صاحب خورجہ
- ۴۸ مولانا سعید احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ ہاٹ ہزاری ضلع چاٹگام
- ۴۹ مولانا شاہ رحمت علی صاحب موضع بہیران ضلع جالندھر
- ۵۰ مولانا حافظ محمود صاحب راپوری مدار المہام ریاست اندر گڑھ راجپوتانہ
- ۵۱ مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی صدر مدرس مدرسہ عبد الرب دہلی
- ۵۲ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب بانی جماعت تبلیغ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی
- ۵۳ مولانا نواب حبیب الرحمن صاحب شیروانی صدر یار جنگ علی گڑھ

- ۵۴ مولانا حافظ محمد یوسف صاحب گنگوہی
- ۵۵ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی بحیثیت عہدہ (صدر مدرس)
- ۵۶ نواب عبدالباسط خان صاحب حیدر آبادی
- ۵۷ خان بہادر شیخ ضیاء الحق صاحب راجوپوری ضلع سہارنپور
- ۵۸ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی بحیثیت عہدہ صدر مہتمم
- ۵۹ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیتہ العلماء ہند دہلی
- ۶۰ مولانا ابراہیم صاحب راندیری
- ۶۱ مولانا حکیم محمد یسین صاحب نگینوی
- ۶۲ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب راجوپوری قدس سرہ دوبارہ
- ۶۳ مولانا ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی
- ۶۴ مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی
- ۶۵ مولانا حفیظ الرحمن صاحب سیوہاروی ناظم اعلیٰ جمعیتہ العلماء ہند دہلی
- ۶۶ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی
- ۶۷ مولانا خیر محمد صاحب جالندھری
- ۶۸ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی حال مقیم پاکستان
- ۶۹ مولانا بشیر احمد صاحب کٹھوری
- ۷۰ مولانا احمد سعید صاحب دہلوی
- ۷۱ حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب
- ۷۲ مولانا محمد نبیہ صاحب خانجہاں پوری
- ۷۳ مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی دہلی
- ۷۴ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اعظم گڑھ
- ۷۵ مولانا سید میاں صاحب دہلی
- ۷۶ مولانا ذاکر مصطفیٰ حسن صاحب علوی لکھنؤ
- ۷۷ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری
- ۷۸ مولانا مفتی

- ۷۹ محدث شہیر مولانا حبیب الرحمن صاحب منوٰع اعظم گڑھ
- ۸۰ مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی مانڈر ضلع مونگیر
- ۸۱ مولانا محمد سعید صاحب سملکی (سورت)
- ۸۲ مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ (مونگیر)
- ۸۳ مولانا حکیم محمد اسماعیل صاحب نگیوئی دہلی
- ۸۴ حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی بحیثیت عہدہ صدر مدرس
- ۸۵ مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- ۸۶ مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ لکھنؤ
- ۸۷ مولانا عبد القادر صاحب مدظلہ مالیر گاؤں
- ۸۸ مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی
- ۸۹ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
- ۹۰ مولانا حامد الانصاری غازی صاحب صدر جمعیۃ العلماء بمبئی
- ۹۱ مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ بجنوری دوبارہ بحیثیت عہدہ مہتمم
- ۹۲ مولانا فضل اللہ صاحب حیدر آبادی
- ۹۳ مولانا سید حمید الدین صاحب فیض آبادی شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ
- ۹۴ مفتی ابو سعود صاحب عربک کالج سمیل الرشاد بنگلور
- ۹۵ مولانا حکیم افہام اللہ صاحب سول لائن علی گڑھ
- ۹۶ مولانا سید فخر الحسن صاحب سابق صدر مدرس دارالعلوم دیوبند
- ۹۷ حاجی علاء الدین صاحب بمبئی
- ۹۸ مولانا حافظ محمد صدیق صاحب ہتھور ابانڈہ
- ۹۹ نواب عبید الرحمن خان صاحب شیروانی علی گڑھ
- ۱۰۰ مولانا محمد عثمان صاحب دیوبند
- ۱۰۱ حکیم عبد الجلیل صاحب دہلی
- ۱۰۲ مولانا معراج الحق صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند
- ۱۰۳

موجودہ مجلس شوریٰ

یہاں موجودہ مجلس شوریٰ کے اراکین کے اسمائے گرامی پیش ہیں۔

- ۱ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب لکھنؤ
- ۲ حضرت مولانا حکیم محمد زماں احسینی صاحب کلکتہ
- ۳ حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب جوہپور
- ۴ حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنی دیوبند
- ۵ حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب صدر المدرسین
- ۶ حضرت مولانا غلام رسول خاموش صاحب بمبئی
- ۷ حضرت مولانا مفتی منظور احمد کانپور
- ۸ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدراس
- ۹ محترم جناب حافظ محمد صدیق صاحب مراد آباد
- ۱۰ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب حیدر آباد
- ۱۱ حضرت مولانا ناظر حسین صاحب ہاپوڑ
- ۱۲ حضرت مولانا محمد اسماعیل موٹا صاحب گجرات
- ۱۳ حضرت مولانا محمد ازہر نعمانی صاحب رانچی
- ۱۴ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب اڑیسہ
- ۱۵ حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی صاحب بنارس
- ۱۶ حضرت مولانا بدر الدین اچمل علی صاحب آسام
- ۱۷ حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

۳۔ مجلس علمیہ

تمام درجات عربی، فارسی، اردو، دینیات اور تجوید وغیرہ کے تعلیمی کاموں میں صدر

المدرسین کو مشورہ دینے کیلئے ایک مجلس ہے، جس کا نام مجلس علمیہ ہے۔ اس کے ممبران میں صدر المدرسین، مہتمم دارالعلوم اور اساتذہ طبقہ اعلیٰ شامل ہیں۔

دارالعلوم کی سندیں اور سرٹیفکیٹ
دارالعلوم میں مندرجہ ذیل اسناد دی جاتی ہیں۔

۱۔ سند فاضل

یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو دورہ حدیث کا امتحان پاس کر لے۔

۲۔ سند تفسیر

یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو ”تکمیل تفسیر“ پڑھ چکا ہو۔

۳۔ سند علوم اسلامیہ

یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو ”تکمیل علوم“ پڑھ چکا ہو۔

۴۔ سند فقہ

یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو ”تکمیل فقہ“ پڑھ چکا ہو۔

۵۔ سند ادب

یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو ”تکمیل ادب“ پڑھ چکا ہو۔

۶۔ سند تخصص فی الادب العربی

یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو ”تخصص فی الادب العربی“ پڑھ چکا ہو۔

۷۔ سند التدریب علی الافتاء

یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو ”التدریب علی الافتاء“ پڑھ چکا ہو۔

مذکورہ بالا سندیں طالب علم کی استعداد اور اخلاقی حالت کے اعتبار سے تین درجے کے

ہیں۔ اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ۔ جن میں بہ تفاوت الفاظ اور عنوان امتیاز رکھا گیا ہے۔ یہ سب سندیں عربی میں ہوتی ہیں۔ دارالعلوم کی اسناد کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ ازہر قاہرہ (مصر) اور مدینہ یونیورسٹی مدینہ منورہ (حجاز) نے منظور کر لیا ہے۔

● شعبہ خوش خطی، درجہ تجوید و قرأت اور شعبہ تحفیظ القرآن الکریم سے فارغ ہونے والوں کو جیسی سند دی جاتی ہے۔

● شعبہ دینیات اردو و فارسی سے فارغ ہونیوالے کو طلب کرنے پر سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے

● اس کے علاوہ اگر نصاب کی تکمیل سے پہلے کوئی شخص کسی مجبوری کی وجہ سے دارالعلوم کو چھوڑنا چاہے تو جس درجہ تک کی کتابیں اس نے پڑھی ہیں اس کا سرٹیفکیٹ (تصدیق نامہ) دیا جاتا ہے۔

● فراغت کے بعد اگر کوئی شخص سند کے علاوہ سرٹیفکیٹ بھی لینا چاہے تو اسے ایک مطبوعہ سرٹیفکیٹ بھی دیا جاتا ہے جو اردو اور انگریزی میں ہے۔

دارالعلوم کا ملک کے دوسرے اداروں سے رابطہ

۱ ملک کے دوسرے علمی اور ثقافتی اداروں سے دارالعلوم کا بھی رابطہ قائم ہے۔ چنانچہ دارالعلوم کے کارکن ادارہ ثقافت ہند کے ممبر بنائے گئے۔

۲ دارالعلوم و ثقافتی ادارہ ہند و ستان میں منعقد ہونے والی تعلیمی اور ثقافتی نمائشوں میں بھی ان کی درخواست پر باضابطہ شرکت کرتا ہے اور اس کی منظومات وہاں بھیجی جاتی ہیں جس سے دارالعلوم کے کتب خانہ اور نوادر کے ذخیرہ کی عظمت قائم ہوتی ہے۔

۳ علمی اداروں میں اس کے کتب خانہ کی قلمی اور نوادر کتابیں بھیجی جاتی ہیں۔

۴ تعلیمی اداروں میں (مثلاً حیدرآباد، کن و غیرہ) یہاں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں اور منظومات بھیجے جاتے ہیں۔

۵ سرکاری کمیشنوں، سائنسی میٹھن یا اوقاف میٹھن وغیرہ میں بھی دارالعلوم کی مختلف اوقات میں شرکت ہوتی ہے۔ نمائندہ شاہدین کو بھیجا جاتا ہے۔

مجلات و جرائد

علمائے دیوبند کے علوم و معارف کو عام کرنے اور دارالعلوم کے ذوق و مسلك کی ترجمانی کے لئے مختلف اوقات میں دارالعلوم سے اردو اور عربی دونوں زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل اور ان کے ایڈیٹروں کے نام حسب ذیل ہیں:-

(۱) القاسم ۱۳۲۸ھ تا ۱۳۳۹ھ

ایڈیٹر:- مولانا حبیب الرحمان عثمانی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی

(۲) الرشید ۱۳۳۲ھ تا ۱۳۳۹ھ

ایڈیٹر:- مولانا حبیب الرحمان عثمانی، مولانا مناظر احسن گیلانی

(۳) الانصار ۱۳۴۵ھ تا ۱۳۴۷ھ

ایڈیٹر:- مولانا محمد طاہر قاسمی، مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری، مولانا عتیق احمد صدیقی

(۴) دارالعلوم ۱۳۶۰ھ تا حال (جاری)

ایڈیٹر:- مولانا عبد الوحید صدیقی، قاضی خلیق احمد صدیقی

ایڈیٹر:- مولانا عبد الحفیظ بلیاوی، مولانا ازہر شاہ قیصر

مولانا ریاست علی بجنوری، مولانا حبیب الرحمان قاسمی

(۵) دعوة الحق (عربی) ۱۳۸۵ھ تا ۱۳۹۵ھ

ایڈیٹر:- مولانا وحید الزمان کیرانوی

(۶) الداعی (عربی) ۱۳۹۶ھ تا حال (جاری)

ایڈیٹر:- مولانا بدر الحسن قاسمی، مولانا نور عالم خلیل الایمنی

(۷) آئینہ دارالعلوم..... مولانا کفیل احمد علوی

دارالعلوم کا دفاع عن الدین

دارالعلوم کی جماعت اپنے مسلک کی ہمہ گیری کی وجہ سے ہر فتنہ کی مدافعت کیلئے سینہ سپر رہی۔ خواہ وہ فتنہ نقل و روایت کی راہوں سے آیا یا عقلیت پسندی کی بنیادوں سے اٹھا، اس جماعت نے ہر دور میں اعلیٰ کلمۃ اللہ اور امر بالمعروف کا فرض ادا کیا اور اسی اسلوب اور راہی

رنگ میں جس رنگ ڈھنگ میں کسی دینی فتنہ نے سراٹھایا، متصوفین بے تصوف کی جانب سے بدعات، محدثات اور شرکیہ حرکات کا فتنہ روایتی انداز میں ابھرا تو اس نے روایتی ہی طور پر مقابلہ کیا اور فتنہ کی بے سرو پا اور بے سند روایتوں کی قلعی کھول کر شریعت و طریقت کی مستند نقول سے اس کا استیصال کیا اور مقابلہ میں نقل و روایات کا ایک بڑا ذخیرہ پیش کر دیا۔ مدعیان عقل و اجتہاد کی طرف سے آزادی فکر، عدم اتباع سلف اور نیچریت کا فتنہ عقل محض کا سہارا لے کر دین میں داخل ہونے لگا تو اس نے عقلی دلائل پیش کر کے کامیاب مدافعت کی۔ اور جس کے لئے حضرت بانی دارالعلوم قدس سرہ نے ایک مستقل حکمت ہی مدون فرمادی جس کے سامنے فلسفہ کسی بھی روپ میں آیا تو اس نے فلسفہ کے انداز قدم کو پہچان کر اس کے راستے روک دیئے۔ غرض بدعت پسندی، ہوا پرستی، دہریت نوازی، بے قیدی، مطلق العنانی اور آزادی افکار کی جڑیں دارالعلوم نے کھوکھلی کر کے عقل و نقل، روایت و درایت اور حکمت و دین کی جڑیں مضبوط کر دیں۔

دارالعلوم نے ملک کو کیا نفع پہنچایا

دارالعلوم نے اس نوعیت کے افراد پیدا کئے جنہوں نے تعلیم، تزکیہ اخلاق، تصنیف، افتاء، مناظرہ، صحافت، خطابت، وعظ و تذکیر، تبلیغ، حکمت اور طب وغیرہ میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان افراد نے کسی مخصوص خطہ میں نہیں بلکہ ہندوپاک کے ہر صوبہ اور بیرونی ممالک میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔ ۱۲۸۲ھ سے ۱۴۲۰ھ تک ایک سو اڑتیس سال کی مدت میں اگر دارالعلوم کی ان خدمات کا جائزہ لیا جائے جو اس نے ہندوپاک میں انجام دیں تو معلوم ہو گا کہ ان دونوں ملکوں کے ہر حصہ میں اس نے اپنے ایسے فرزند ان رشید پہنچائے جو اس خطہ میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور مخلوق خدا کو ظلمت و جہل سے نکال کر انہوں نے نور علم سے مالا مال کر دیا۔

دارالعلوم اور اصلاح امت

یہ بات دارالعلوم کی خدمات کا ایک روشن باب ہے، دارالعلوم کی بنیاد اخلاص و تقویٰ پر ہے اور اس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت اور ان کو رضائے الہی کی راہ پر گامزن کرنا ہے، دارالعلوم کے بانی وہ اتقواء امت تھے جن سے ایک عالم فیض حاصل کرتا

تھا، جن میں سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ، حجتہ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، عارف باللہ حضرت حاجی عابد حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم کے اسماء گرامی سے ساری دنیا واقف ہے، ان حضرات کی اصلاحی خدمات جن سے لاکھوں انسانوں کی آخرت سدھ گئی، تاریخ کا ایک روشن باب ہیں، انہی حضرات کی برکت تھی کہ دارالعلوم کے فرزندوں میں سے بھی سینکڑوں مشائخ و مصلحین نے امت کے درمیان مؤثر اصلاحی کام کئے ان میں سے ہر ایک ہزاروں مسلمانوں کیلئے مینارہ نور تھا، مثال کے طور پر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری کے اسماء گرامی پیش کئے جاسکتے ہیں، یہ چند نام محض نمونہ ہیں، ورنہ اس مقدس قافلہ کا ہر فرد اپنی جگہ مرکز رشد و ہدایت ہے، جس کی خاموش خدمت سے نہ جانے کتنے انسان ہدایت کی راہ پر گامزن ہوئے ہیں۔

دارالعلوم اور خدمت تفسیر

دارالعلوم کی اساس ہی اسلامی علوم و فنون کی خدمت پر ہے، اس لئے علم تفسیر بھی یہاں کے علماء کی خدمت کا ایک خصوصی میدان رہا ہے، اس عظیم فن کے سینکڑوں ماہرین دارالعلوم نے تیار کئے جن کے قلم سے ترجمہ شیخ الہند، ترجمہ مولانا احمد علی لاہوری بیان القرآن، مشکلات القرآن، فوائد عثمانی، احکام القرآن، معارف القرآن اور قصص القرآن جیسی مستند کتابوں کے علاوہ کئی سو معیاری تالیفات وجود میں آئی ہیں۔

درس تفسیر کو بھی دارالعلوم میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے، مختلف مراحل میں داخل کتب تفسیر کے علاوہ ایک مستقل شعبہ فضلاء کے لئے تکمیل تفسیر کے نام سے قائم ہے اس میں باضابطہ درس سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد ہزاروں ہے اس کے علاوہ عام مسلمانوں کو قرآن کے معانی سے روشناس کرانے کیلئے ہر زمانے میں فضلاء دیوبند نے مختلف علاقوں کی مساجد میں جو درس قرآن جاری کیا اس سے لاکھوں افراد نے استفادہ کیا ہے۔

علماء دیوبند اور علم القرآن

ایک سرسری جائزہ

شمار	زبان	اسماء کتب	اسماء مصنفین	کیفیت
۱	اردو	موضع فرقان مع تفسیری فوائد سورہ بقرہ ونساء	حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن	یہ ترجمہ طبع زاد نہیں بلکہ حضرت شاہ عبد القادر دہلوی کے ترجمہ قرآن کا جدید اردو ایڈیشن ہے، حضرت شاہ عبد القادر کے الہامی ترجمہ کے تسہیل و تیسیر بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔
۲	اردو	تفسیری فوائد	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی	سورہ بقرہ ونساء کے علاوہ پورے قرآن کے یہ تفسیری فوائد مستند و معتبر تفسیروں کا سلیس و صاف اردو میں خلاصہ ہے جو کوزہ میں دریا سمودینے کا مصداق ہے۔
۳	اردو	ترجمہ قرآن مع حواشی	حضرت مولانا احمد علی لاہوری	ترجمہ نہایت سلیس ہے حواشی میں رابط آیات اور ضروری وضاحتیں بڑی وقیع ہیں، اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
۴	اردو	ترجمہ قرآن مع حواشی	حضرت مولانا عاشق الہی میرٹھی	یہ ترجمہ نہایت سلیس اور صاف اردو میں ہے اور اہل علم میں مقبول ہے اس ترجمہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کا ایک ایک حرف حضرت شیخ الہند کی نظر سے گزرا ہے

۵	اردو	ترجمہ قرآن	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی	یہ ترجمہ سلاست و وضاحت میں اپنی مثال آپ ہے۔
۶	اردو	کشف الرحمن ترجمہ قرآن	حضرت مولانا احمد سعید دہلوی	نہایت مقبول و معتبر ترجمہ ہے ادبی ذوق رکھنے والے بطور خاص اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔
شار	زبان	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	کیفیت
۷	بنگلہ	ترجمہ قرآن	مولانا محمد طاہر خلیفہ حضرت مدنی	بنگال میں یہ ترجمہ بہت مقبول ہے۔
۸	آسامی	ترجمہ قرآن	مولانا عبدالحق آسامی خلیفہ حضرت مدنی	
۹	اردو	بیان القرآن	حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی	یہ تفسیر بے پناہ ظاہری و معنوی خوبیوں کی حامل ہے اور اہل نظر علماء اسے اہم عربی تفسیروں کے درجہ میں شمار کرتے ہیں۔
۱۰	اردو	معارف القرآن ۸ جلدوں میں	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی	قرآنی مسائل و معارف کا بیش بہا خزانہ اور عام فہم فصیح اردو میں ہے اب تک اسکے دستیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں
	اردو	معارف القرآن	حضرت مولانا محمد ادریس صنا کاندھلوی	اس تفسیر میں مؤلف نے حقائق و معارف کے بیش بہا جواہرات جمع کر دیئے، سورہ حجرت تک مولانا موصوف کے قلم سے اور بقیہ حصہ کی تفسیر ان کے خلف رشید مولانا محمد مالک کاندھلوی نے تحریر کی ہے۔
۱۲	اردو	جواہر القرآن دو جلد	شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خاں	نہایت عمدہ اور بیش بہا علمی فوائد پر مشتمل ہے خاص طور پر ان کے استاذ غلام حسین علی تلمیذ حضرت کشمیری کے افادات کو موصوف نے اس تفسیر میں بڑی خوبی سے جمع کر دیا ہے۔

۱۳	اردو	بلغة الحیران فی تفسیر قرآن	شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خاں	یہ تفسیر بھی مولانا علامہ حسین علی کے فرمودات و افادات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔
۱۴	اردو	تفسیر القرآن	مولانا قاضی شمس الدین صنا سابق استاذ دارالعلوم دیوبند	اس تفسیر کے بعض اجزاء تسلیم کمپنی پاکستان نے شائع کئے تھے، پتہ نہیں مکمل شائع ہوئی یا نہیں۔
۱۵	عربی	مشکلات القرآن	محدث عصر علامہ انور شاہ کشمیری	نام سے اس کا موضوع ظاہر ہے یعنی اس میں قرآنی مشکلات و مہمات کا حل موجود ہے اہل علم کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔
۱۶	عربی	احکام القرآن	مولانا مفتی محمد شفیع // محمد ادریس کاندھلوی مولانا ظفر احمد تھانوی مولانا جمیل تھانوی	آیات احکام کی فقہی تفسیر ہے، اور اپنے موضوع پر اہم ترین خدمت ہے متعدد ضخیم جلدوں میں ادارۃ القرآن کراچی سے شائع ہو چکی ہے۔
۱۷	پشتو	انوار القرآن	مولانا سید انوار الحق کا کا خیل فاضل دیوبند	
۱۸	پشتو	انکشاف القرآن	مولانا محمد ادریس طروری فاضل جامعہ اسلامیہ بھیل	
۱۹	افغانی	تیسیر القرآن	مولانا محمد طاہر مردانی فاضل دیوبند	ترجمہ و تفسیر غیر مطبوعہ
۲۰	عربی	حاشیہ تفسیر بیضاوی	مفسر قرآن مولانا عبدالرحمن امروہوی	
۲۱	اردو	حاشیہ تفسیر جلالین مع ترجمہ	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی	جلالین کا یہ ترجمہ دیوبند سے قرآن کے حاشیہ پر چھپا تھا۔
۲۲	اردو	ترجمہ تفسیر خازن	// // //	

۲۳	عربی	منہج الجلیل خلاصہ معالم التنزیل	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی	یہ خلاصہ لامع النور پریس آگرہ سے چھپا تھا اب بالکل نایاب ہے۔
۲۴	اردو	ترجمہ تفسیر ابن کثیر	مولانا انظر شاہ کشمیری	
۲۵	//	ترجمہ تفسیر مدارک التنزیل	// // //	
۲۶	//	ترجمہ تفسیر جلالین	مولانا محمد نعیم دیوبندی	
۲۷	ہندی	ترجمہ حضرت شیخ الہند مع فوائد عثمانی	مولانا سید ارشد مدنی بشرکت ماسٹر محمد سلیمان	ہندی زبان میں ترجمہ کے ساتھ تفسیر تشریحات کی یہ اولین خدمت ہے جو بجملہ علماء دیوبند کے حصہ میں آئی جمعیۃ علماء نے عمدہ کاغذ و طابعت سے مزین کر کے شائع کیا ہے۔
۲۸		ترجمہ و تفسیر	مولانا حبیب احمد کیرانوی	اس تفسیر کو حرفاً حرفاً حضرت تھانوی نے پڑھا ہے اور بعض مقامات کی اصلاح بھی فرمائی ہے۔
۲۹	پشتو	ترجمہ و تفسیر	مولانا فضل و دود مولانا گل رحیم فاضل دیوبند	نصف نصف قرآن کی تفسیر دونوں حضرات نے کی ہے، خازن، معالم التنزیل، جمل اور روح البیان وغیرہ کو سامنے رکھ کر یہ تفسیر مرتب کی گئی ہے۔
۳۰	اردو	البدیان فی علوم القرآن مع ترجمہ قرآن	مولانا سید ممتاز علی دیوبندی بانی دارالاشاعت لاہور	موصوف نے قرآن مجید کا ترجمہ اور علوم قرآن کی مکمل فہرست بڑی محنت و کاوش سے اس میں جمع کر دی ہے، یہ قرآنی انڈکس ۱۹۴۹ء میں گیانی پریس لاہور سے شائع ہوا تھا۔
۳۱	اردو	تفسیر تعلیم القرآن	مولانا قاضی زاہد الحسینی فاضل دیوبند	
۳۲	اردو	درس قرآن مجید	// // //	

۳۳	اردو	معالم التنزیل	مولانا محمد علی صدیقی کاندھلوی	تیس جلدوں پر مشتمل یہ ضخیم تفسیر درحقیقت تمام مستند و معتبر قدیم و جدید تفسیروں کا خلاصہ ہے۔
۳۴	اردو	الہام الرحمن	مولانا عبید اللہ سندھی	تدوین و تہذیب مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی
۳۵	اردو	تفسیر سورہ فاتحہ	// // //	یہ جملہ تفاسیر دراصل مولانا سندھی مرحوم
۳۶		تفسیر سورہ قتال	// // //	کے درسی افادات ہیں، جنہیں بعد میں
۳۷		تفسیر سورہ فتح	// // //	ان کے تلمیذ مولوی بشیر احمد لدھیانوی
۳۸		تفسیر سورہ منزل	// // //	نے جمع و مرتب کر کے شائع کیا ہے،
		و مدثر	// // //	اس مجموعہ تفاسیر میں بعض باتیں قابل
۳۹		تفسیر سورہ العصر	// // //	گرفت ہیں جس کی ذمہ داری مرتب
۴۰		تفسیر سورہ اخلاص	// // //	پر ہی آتی ہے، مولانا سندھی اپنی
۴۱		تفسیر سورہ مودتین	// // //	تشریحات میں حضرت شیخ الہند اور
۴۲		المقام المحمود	// // //	حضرت شاہ ولی اللہ قدس اسراہما کی
		تفسیر سورہ عم	// // //	تحقیقات سے باہر نہیں نکلتے، جیسا کہ
۴۳		المقام المحمود	// // //	ان کی خود نوشت تالیفات شاہد ہیں۔
		تفسیر سورہ بقرہ	// // //	
۴۴		درس قرآن کی سات مجلس	حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی	مراد آباد جیل میں حضرت شیخ مدنی کے درس قرآن کا مجموعہ ہے جو اگرچہ سورہ فاتحہ سے متعلق ہے پھر بھی علمی لطائف رموز قرآن اور اسرار و حکم کا ایک خزانہ ہے جسے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب نے جمع و مرتب فرمایا ہے۔
۴۵	سندھی	تفسیر القرآن	مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی	

۴۶	اردو	دروس سورۃ الفاتحہ	حضرت مولانا شمس الحق افغانی	یہ حضرت مولانا افغانی کے درسی افادات کا مجموعہ ہے جنہیں ان کے تلمیذ مولانا علی اصغر عباسی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے، دروس کا یہ مجموعہ علمی نکات کا ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے۔
۴۷	عربی	یتیمۃ البیان	حضرت مولانا محمد یوسف صاحب محدث بنوری	یہ مشکلات القرآن از محدث کشمیری کا مبسوط بلند پایہ مقدمہ ہے جو بجائے خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے الگ سے کتابی شکل میں اور مشکلات القرآن کیساتھ متعدد بار شائع ہو چکا ہے
۴۸	عربی	سبق الایات فی	حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی	پہلا رسالہ ربط آیات و سود سے متعلق ہے اور بقیہ سارے تفسیر و ترجمہ سے
۴۹		نسق الایات احسن الاثاث فی النظر الثانی		
۵۰		اصلاح ترجمہ ہلویہ		
۵۱		اصلاح ترجمہ حیرت		
۵۲		التقصیر فی التفسیر		
۵۳	عربی	سمط الدرر فی ربط الآیات والسور	مولانا محمد طاہر مردانی	موضوع نام سے ظاہر ہے یہ کتاب اہل علم میں مقبول ہے اب تک اس کے چار ایڈیشن سے زائد نکل چکے ہیں۔
۵۴	اردو	علوم القرآن	حضرت مولانا شمس الدین افغانی	علوم قرآن پر بڑی معلومات افزا کتاب ہے اور اہل علم میں معروف و مقبول ہے
۵۵	اردو	علوم القرآن	مولانا محمد تقی عثمانی	علوم قرآن میں مشہور عربی کتاب منابل العرفان کا عطر اس کتاب میں نچوڑ لیا گیا ہے

۵۶	اردو	معارف القرآن	مولانا قاضی زاہد حسینی صاحب	علوم قرآن میں جامع و مفید کتاب ہے اب تک کئی بار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں
۵۷	اردو	منازل العرفان فی علوم القرآن	مولانا محمد مالک کاندھلوی	اپنے موضوع پر نہایت جامع و ضخیم کتاب ہے حضرت شاہ ولی اللہ کی مشہور تالیف الفوز الکبیر کا خلاصہ بھی اس میں درج کر دیا گیا ہے۔
۵۸	عربی	العون الکبیر شرح الفوز الکبیر	مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری استاذ دارالعلوم دیوبند	الفوز الکبیر کے حل کے لئے یہ شرح نہایت کار آمد اور علماء و طلبہ میں مقبول ہے۔
۵۹	اردو	تاریخ القرآن	مولانا عبد الصمد صام فاضل دیوبند	تاریخ قرآن پر نہایت مستند اور معیاری کتاب ہے مصر و شام کے علماء نے بھی اسے وقعت کی نگاہ سے دیکھا ہے یورپ کے مصنفین اس کا حوالہ دیتے ہیں۔
۶۰	اردو	البرہان فی اصول القرآن	مولانا محمد طاہر مردانی	مخطوطہ
۶۱		تفسیر ہدایت القرآن	مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری استاذ دارالعلوم دیوبند	موصوف اپنے دیگر علمی مشاغل کی وجہ سے چند پاروں سے زائد کی تفسیر اب تک نہیں کر سکے ہیں۔
۶۲	اردو	تفسیری اشارات	العبد الضعیف حبیب الرحمن قاسمی خادم التدریس دارالعلوم دیوبند	تفسیر سورہ بقرہ جس میں سورہ کے عمود اور آیات کے مابین ربط کو ایک خاص انداز سے بیان کیا گیا ہے یہ تفسیر قسط وار ماہنامہ دارالعلوم دیوبند اور ہفت روزہ الجمعۃ دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔
۶۳	اردو	قصص القرآن جلد ۴	حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی	آیات تاریخیہ کی محققانہ تفسیر و تشریح اپنے موضوع پر یہ کتاب نہایت بلند پایہ اور وسیع ہے اور اہل علم میں مقبول و مستند اول ہے۔

۶۴	اردو	نیل السائرین فی طبقات المفسرین	مولانا محمد طاہر مردانی	اپنے موضوع پر نہایت مفید ہے۔
۶۵	اردو	تذکرۃ المفسرین جلد ۲	مولانا قاضی زاہد حسینی	مفسرین کے تذکرہ میں ایک عمدہ کتاب ہے تقریباً سات مفسرین کا تذکرہ کیا گیا ہے
۶۶	اردو	قاموس القرآن	مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی	قرآن کی لغت میں ایک بہتر کتاب ہے اور علماء و طلبہ میں متداول ہے۔
۶۷	اردو	لغات القرآن	مولانا قاضی زاہد حسینی	نام سے موضوع ظاہر ہے۔
۶۸	اردو	لغات القرآن ۷ جلدوں میں	مولانا عبدالرشید نعمانی و سید عبدالداہم جلالی	اپنے موضوع پر نہایت جامع اور تحقیقی کتاب ہے۔
۶۹	اردو	جنت النعیم فی استخراج لغات القرآن الکریم	مولانا اسد اللہ سندھی فاضل دیوبند	
۷۰	اردو	اعجاز القرآن	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی	اس رسالہ میں قرآن کے اعجاز سے متعلق بڑی فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔
۷۱	اردو	مقدمۃ القرآن	حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند	
۷۲	اردو	محاسن موضع القرآن	مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی	
۷۳	اردو	مستند موضح القرآن		
۷۴	اردو	درس تفسیر قرآن	مولانا علامہ حسین علی پنجابی تلمیذ حضرت گنگوہی	مولانا موصوف کے درسی افادات ہیں جنہیں انکے بعض تلامذہ نے جمع کر دیا ہے
۷۵	عربی	حاشیہ تفسیر مدارک	مولانا عبدالقادر بھوپالی فاضل دیوبند	صرف سورہ بقرہ کا حاشیہ ہے اور بہت خوب ہے۔
۷۶		اسرار قرآنی	حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی	معوذتین کی تفسیر میں یہ رسالہ عجیب و غریب معلومات اور اسرار و موزن پر مشتمل ہے۔

۷۷	تفسیر رشیدی	حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ	اس مجموعہ تفسیر کو مولانا مفتی عزیز الرحمن بجنوری نے حضرت گنگوہی کی تصانیف سے اخذ کر کے جمع کیا ہے۔
۷۸	اردو الحاوی شرح بیضاوی سورہ بقرہ	مولانا فخر الحسن مراد آبادیؒ	یہ مولانا موصوف کے درسی افادات پر مستمل ہے جسے مولانا ثکیل احمد سیتاپوری نے بوقت درس تحریر کر لیا تھا۔

دارالعلوم اور خدمت حدیث

خدمت حدیث دارالعلوم کی خدمات کا ایک جلی عنوان ہے اور اس میدان میں دارالعلوم کو وہ امتیاز حاصل ہے جو اسلامی تاریخ میں کم اداروں کے حصے میں آیا ہے۔ یوں تو ہندوستان میں علم حدیث کے چراغ روشن ہوتے رہے اور کہیں نہ کہیں بلند پایہ محدثین اس کی خدمت کرتے رہے، لیکن حدیث کو ایک فن غالب کی حیثیت سے عام کرنے کا سہرا حجت الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سر ہے۔ جنہوں نے صحاح ستہ کو داخل درس کیا۔ اس کے بعد ولی اللہی مدرسہ کے فیض یافتگان کا ایک جم غفیر اس امانت کو لے کر ہندوستان میں پھیل گیا، لیکن اس کا مرکز بننا دیوبند کیلئے مقدر تھا اس لئے اس سلسلے کے بلند پایہ استاذ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ تلامذہ میں سے چند شخصیات یہاں فیض رسانی کیلئے منتخب ہوئیں۔ دیوبند آکر خدمت حدیث کا میدان وسیع ہو گیا، درس حدیث نے وہ ترقی کی کہ صرف برصغیر ہی نہیں عالم عرب تک اس درس کی عظمت کا آوازہ سنا گیا، اس میدان میں دارالعلوم کے جن اسلاف اور فرزندوں کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ان میں مثال کے طور پر قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، امام العصر حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے اسمائے

گرامی پیش کئے جاسکتے ہیں۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا تو فضلاء دیوبند کے قلم سے اس موضوع پر لامع الدراری، الکوکب الدری، بذل المجہود، فیض الباری، العاء السنن، فتح الملہم، معارف السنن، اوجز المسالك، القول النصیح اور التعلیق الصبح جیسی کتنی ہی معیاری کتابیں وجود میں آئیں۔ یہ چند نام محض نمونہ کے طور پر ہیں ورنہ فضلاء دیوبند میں بلند پایہ محدثین اور ان کی مستند تصنیفات کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے، اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان آخری صدیوں میں علم حدیث میں امامت کے منصب کی عظمت دارالعلوم ہی کے فرزندوں سے قائم ہے۔

دارالعلوم اور خدمتِ فقہ

علوم اسلامیہ میں فقہ کی اہمیت سے کون ناواقف ہے؟ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مرضی واضح طور پر بتانے کی ذمہ داری اسی مبارک علم کی ہے، اللہ کا فضل ہے کہ دارالعلوم اس میدان میں بھی امتیاز کا حامل ہے یہاں کے نصاب تعلیم میں فقہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے تقریباً ہر تعلیمی سال میں فقہ کی کوئی نہ کوئی اہم کتاب داخل درس ہے، اس کے علاوہ فقہ کی روشنی میں عام مسلمانوں کی رہنمائی اور پیش آنے والے مسائل میں احکام شریعت کی وضاحت کے لئے دارالافتاء ہے جسے ملک کا سب سے مستند دارالافتاء تسلیم کیا جاتا ہے، جس سے صادر کئے گئے فتاویٰ کی تعداد چھ سات لاکھ کے قریب ہے۔

دارالعلوم کے فضلاء میں باریک بین فقہاء اور نکتہ رس مفتیوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، اسی طرح فقہی تصانیف کی بھی ایک طویل فہرست ہے، جس میں فتاویٰ کے بہت سے مستند مجموعوں کے علاوہ مستقل تصانیف اور شروح و حواشی کی ایک کثیر تعداد ہے، فتاویٰ میں فتاویٰ رشیدیہ، فتاویٰ دارالعلوم، امداد الفتاویٰ، کفایت المفتی، فتاویٰ محمودیہ، فتاویٰ رحیمیہ، نظام الفتاویٰ مشہور ہیں۔ اور فقہی موضوعات پر حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الادب حضرت مولانا اعجاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم کی سینکڑوں کتابیں مقبول خاص و عام ہیں۔

دیگر علوم و فنون میں دارالعلوم کی خدمات

علوم و فنون کا ایک عظیم تاریخی مرکز ہونے کی حیثیت سے دیگر علوم میں بھی دارالعلوم کی خدمات کا ایک وسیع باب ہے، مثلاً علم کلام میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی نہایت وسیع تصانیف ہیں، عربی ادب میں بہت سے اکابر کائنات و شعری ذخیرہ، ان کی بے شمار عربی تصنیفات ہیں، لغت میں مصباح اللغات، بیان اللسان، القاموس الجدید وغیرہ، تجوید و قرأت میں سینکڑوں کتابیں اور شاطبیہ و جزریہ وغیرہ پر ہونے والے مختلف کام اور ان کے علاوہ تاریخ، اردو ادب اور دیگر قدیم و جدید علوم و فنون پر ابنائے دارالعلوم کی بے شمار تصانیف ہیں۔

دارالعلوم اور تحریر و صحافت

اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا سب سے مؤثر اور پائیدار ذریعہ تحریر ہے، فرزند ان دارالعلوم نے اس میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے علماء دیوبند کا تصنیفی سرمایہ جو تعداد میں دسیوں ہزار کتابوں پر مشتمل ہے ان کی صلاحیت تحریر ہی کا مظہر ہے، صحافت کے میدان میں فضلاء دیوبند کے کارناموں سے ایک تاریخ مرتب ہو سکتی ہے شاید اس سے بہت کم لوگ واقف ہوں کہ فضلاء دیوبند نے مختلف اوقات میں جو ماہنامے، پندرہ روزہ پرچے، ہفت روزہ، سہ روزہ اخبار یا روزنامے جاری کئے ہیں یا ان کی ادارت میں شائع ہوئے ہیں ان کی تعداد بھی سینکڑوں میں ہے جن میں اکثر ایک طویل مدت تک میدان صحافت میں چمکتے رہے اور ان کی ایک بڑی تعداد آج بھی جاری ہے۔ (۱)

صحافی و اہل قلم

۱..... مولانا سید مناظر احسن گیلانی..... ایڈیٹر ماہنامہ القام دارالعلوم دیوبند

۲..... مولانا منظور احمد نعمانی..... ایڈیٹر ماہنامہ الفرقان بریلی و لکھنؤ

(۱) احقر نے "دارالعلوم دیوبند کی اردو صحافتی خدمات" پر اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے، جس پر میرٹھ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری ایوارڈ کی ہے۔ یہ مقالہ زیر طباعت ہے۔ (نواز دیوبندی)

- ۳ ... مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایڈیٹر ماہنامہ برہان دہلی
- ۴ ... مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی .. آپ کی ادارت میں دسیوں رسائل جاری ہوئے
- ۵ ... مولانا مظہر الدین بجنوری روزنامہ الامان دہلی
- ۶ ... مولانا شائق عثمانی عصر جدید کلکتہ
- ۷ ... مولانا عامر عثمانی ماہنامہ تجلی، دیوبند
- ۸ ... مولانا قاضی زین العابدین میٹھی الحرم میٹھی
- ۹ ... مولانا حبیب الرحمن بجنوری منصور اور الخلیل ہفتہ وار
- ۱۰ ... مولانا عبد الوحید صدیقی نئی دنیا
- ۱۱ ... مولانا ازہر شاہ قیصر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند (سابق ایڈیٹر)
- ۱۲ ... مولانا حامد الانصاری غازی مدینہ بجنور، اور جمہوریت دہلی
- ۱۳ ... مولانا محمد تقی عثمانی البلاغ کراچی
- ۱۴ ... مولانا سمیع الحق الحق اکوڑہ خٹک
- ۱۵ ... مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی بینات، بنوری ٹاؤن کراچی
- ۱۶ ... مولانا عبد العلی البدر کاکوری
- ۱۷ ... مولانا محمد صادق علی بستوی نقوش حیات، بستی
- ۱۸ ... مولانا اسیر ادروی ترجمان الاسلام بنارس، سہ ماہی
- ۱۹ ... مولانا اعجاز احمد اعظمی المآثر منو، سہ ماہی
- ۲۰ ... مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری ندائے شاہی مراد آبادی
- ۲۱ ... مولانا نور الحسن راشد احوال و آثار مفتی الہی بخش اکاڈمی کاندھلہ
- ۲۲ ... مولانا محمد ہاشم القاسمی الفیصل حیدر آباد
- ۲۳ ... مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی بحث و نظر پٹنہ، سہ ماہی
- ۲۴ ... مولانا رضوان القاسمی صفا، جامعہ سبیل السلام حیدر آباد
- ۲۵ ... حبیب الرحمن قاسمی ماہنامہ دارالعلوم دیوبند
- ۲۶ ... مولانا کفیل احمد علوی کیرانوی آمینہ دارالعلوم دیوبند (پندرہ روزہ)
- ۲۷ ... مولانا نور عالم خلیل الایمنی الداعی (عربی)

۲۸.. مولانا محمد سالم جامعی فاضل دیوبند..... ہفت روزہ الجمعیت دہلی

۲۹... مولانا شاہین جمالی..... پندرہ روزہ دیوبند ٹائمز

۳۰.. مولانا مولانا اعجاز قاسمی..... پندرہ روزہ دیوبند ٹائمز

یہ نام بطور نمونہ پیش ہیں تفصیلات کے لئے ”دارالعلوم دیوبند کی اردو صحافتی خدمات ملاحظہ فرمائیں۔ (نواز دیوبندی)

دارالعلوم فتنوں کے تعاقب میں

دارالعلوم دیوبند کا مسلک خالص کتاب و سنت پر استوار اور ان کی روشن ہدایات سے ماخوذ ہے اور اسی مسلک مستقیم پر امت کو گامزن کرنا اس کا مقصد عظیم ہے، اس لئے جن اور جہاں کتاب و سنت سے ثابت پاکیزہ اور مسلمہ عقائد سے انحراف کی کوئی بات سامنے آئی تو دارالعلوم اور اس کے فرزندوں نے خود اپنا فرض منصبی ادا کرنے کیلئے سرگرم جدوجہد کی، ابتداء سے آج تک مختلف ادوار میں عیسائیت، ہندومت، قادیانیت و شیعیت، انکار حدیث، بریلویت، عدم تقلید اور مودودیت وغیرہ کے مضر اثرات سے مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت دارالعلوم کا اہتمام رہی ہے۔ اور اس قسم کے موضوعات پر علماء دیوبند کی تصانیف ہزاروں ہیں جنہوں نے بلاشبہ اصلاح عقائد میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

دارالعلوم نے ہمیشہ امت کو مانا علیہ و اصحابی کے مستحکم معیار پر لانے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں دارالعلوم کی خدمات اتنی روشن ہیں کہ ان آخری ادوار میں لفظ دیوبندیت ہی مسلک صحیح کا عنوان بن گیا ہے۔

تحریک آزادی ہند میں علمائے دیوبند کا کردار

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے آزاد ہند کا بیہ قائم ہوئی اس کا بیہ کی تشکیل اس طرح کی گئی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ امیر المؤمنین، حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ امیر جہاد، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کمانڈر انچیف، مولانا منیر صاحب فوجی سکریٹری، مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ وزیر لام بندی اور سید حسن عسکری سیاسی نمائندہ۔

اس لشکر نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شمالی اور تھانہ بھون کے مورچہ پر لڑی، حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس میں شہید ہوئے، مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ زخمی ہوئے مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سزائے موت سنائی گئی، جو بعد میں قید میں تبدیل ہو گئی۔ جنگ ۱۸۵۷ء میں ساڑھے اکیاون ہزار علماء نے شرکت کی اس میں دولاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۶ء تک چودہ ہزار علماء کو آزادی کے مطالبے کے جرم میں سزائے موت دی گئی، اور ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا، ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم مولانا محمود حسن کی تحریک شیخ الہند کا قیام ہوا جس کا ظہور ۱۹۱۶ء میں تحریک ریشمی رومال کی شکل میں ہوا مگر اتفاق سے یہ اسکیم ناکام ہو گئی جس کے جرم میں بڑے بڑے علماء کو کالا پانی اور ہندوستان کی جیلوں میں قید کر دیا گیا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنے رفقاء کے ساتھ چار سال مالٹا میں نظر بند رہے۔

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مجموعی طور پر نو سال اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے گیارہ سال قید و بند کی مصیبت کاٹی۔ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں جمعیت العلماء ہند کا قیام میں آیا، ۱۹۲۶ء میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مقدمہ کراچی کی سماعت ہوئی جس میں آپ نے انگریزی فوج میں مسلمانوں کی بھرتی کو حرام قرار دیا تھا ۱۹۲۸ء میں سب سے پہلے جمعیت العلماء نے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا، ۱۹۳۰ء کی جنگ آزادی میں چودہ ہزار مسلمان جیل گئے، اور پانچ سو سرحدی جوان شہید ہوئے، ۱۹۳۶ء میں جمعیت العلماء، مسلم لیگ اور کانگریس نے ایک پلٹ فارم پر جمع ہو کر انگریزی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کیا، اور آخری جنگ ۱۹۴۲ء میں بھی ہزاروں عالموں اور مسلمانوں نے حصہ لیا بالآخر ۲۱ جون ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا آخری گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن رخصت ہو گیا۔

سوبار سنوارا ہے ہم نے اس ملک کے گیسوئے برہم کو

شیخ الہند اکیڈمی

اکابر دارالعلوم کو اللہ نے دیگر امتیازات کے ساتھ علم و حکمت میں بھی خصوصی شان عطا کی تھی، رسوخ فی العلم، وقت نظر اور وسعت مطالعہ میں یہ حضرات اپنی نظیر آپ ہیں، ان حضرات کے یہاں علمی تحقیقات ناقدانہ آراء اور فیصلہ کن اقوال ملتے ہیں۔ امت اسلامیہ کا یہ

حق ہے کہ اکابر کے علوم سے اس کو روشناس کرایا جائے، قدیم تصانیف کو نئے انداز میں طبع کیا جائے اور نئے موضوعات پر تحقیقی کتابیں تیار کرائی جائیں۔

اسی طرح مسلک دیوبند میں جو اپنی جامعیت و اعتدال میں بے مثال ہے اسے دوسرے تک واضح انداز میں پہنچایا جائے تاکہ وہ راہ ہدایت پر گامزن ہو سکیں۔

انہی مقاصد کے پیش نظر دارالعلوم نے شیخ الہند اکیڈمی کے نام سے ایک علمی، تحقیقی و تالیفی ادارہ قائم کیا ہے جس کی اب تک متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔

مجلس تحفظ ختم نبوت

مسلمہ پنجاب غلام احمد قادیانی کا پھیلا یا ہوا فتنہ جب ہندوستان میں دوبارہ سر ابھارنے لگا، تو دارالعلوم اپنی روایت کے مطابق اس فتنہ کی بیخ کنی کے لئے میدان میں آیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ۲۹ تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء عالمی اجلاس تحفظ ختم نبوت منعقد ہوا۔ اسی موقع پر اس موضوع پر مستقل کام کرنے کے لئے کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کا قیام عمل میں آیا تھا یہ مجلس اسی وقت سے مسلسل خدمات انجام دے رہی ہے۔

مسجد رشید

طلبہ کی روز افزوں تعداد کے پیش نظر عرصہ دراز سے ایک وسیع مسجد کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، چنانچہ اللہ کا نام لے کر تقریباً ۱۲ سال قبل ایک وسیع و عریض مسجد کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ جو اس وقت الحمد للہ تکمیل کے قریب پہنچ رہی ہے۔ اس مسجد کی خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان کی کسی بھی مسجد کا مسقف حصہ اس کے برابر نہیں ہے۔ اس کے مسقف حصے میں آٹھ ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے، جب کہ پوری مسجد (بشمول صحن) میں اٹھارہ ہزار افراد نماز ادا کر سکتے ہیں اس کے مسقف حصہ کا رقبہ شرقاً غرباً (یعنی طول) ایک سو بیس فٹ، اور شمالاً جنوباً (یعنی عرض) ایک سو چالیس فٹ ہے۔ اس کی تین منزلیں ہیں۔ ایک منزل میں ۲۵ صفیں ہیں ایک صف میں نوے نمازی آسکتے ہیں۔

یہ مسجد بلاشبہ حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ العالی کے دورِ اہتمام اور ہندوستان کے مخلص مسلمانوں کے اخلاص کا شاہکار ہے جن کے عطیات سے یہ عظیم الشان

خانہ خدا تعمیر ہوا اس میں کسی حکومت وغیرہ کا کوئی تعاون نہیں ہے صرف عام مسلمانوں کے خون پسینہ کی کمائی سے وجود میں آئی ہے۔ مسجد کی تعمیر کی نگرانی اور ذمہ داری حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدراسی نے بحسن و خوبی انجام دی ہے۔ یہ مسجد تعمیر کا ایک شاہکار نمونہ ہے۔ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی، دارالعلوم کیلئے عظیم خدمات کے اعتراف کے طور پر اس عالیشان مسجد کو آپ کے نام نامی سے منسوب کیا ہے۔

دارالعلوم کے شعبہ جات

۱ دفتر اہتمام	۲ دفتر تعلیمات	۳ دارالافتاء
۴ دفتر محاسبی	۵ شعبہ تنظیم و ترقی	۶ دفتر برقیات
۷ دفتر اوقاف	۸ دفتر تعمیرات	۹ مہمان خانہ
۱۰ دارالصنائع	۱۱ دفتر ماہنامہ دارالعلوم	۱۲ دفتر آئینہ دارالعلوم
۱۳ دفتر الداعی	۱۴ دفتر تحفظ ختم نبوت	۱۵ عظمت ہسپتال
۱۶ دارالعلوم پریس	۱۷ کتب خانہ	۱۸ محافظ خانہ
۱۹ دارالاقامہ	۲۰ دفتر تنظیم بمبئی برانچ آفس بمبئی	
۲۱ مکتبہ دارالعلوم	۲۲ شیخ الہند اکیڈمی	۲۳ دفتر تبلیغ
۲۴ مطبخ	۲۵ آٹا چکی	۲۶ صفائی چمن بندی
۲۷ شعبہ کمپیوٹر ٹریننگ	۲۸ شعبہ صحافت	

کل اسٹاف مع استاذہ کرام تقریباً پونے تین سو

اندرون دارالعلوم علمی و ثقافتی سرگرمیاں

دارالعلوم دیوبند ایک بے مثال تعلیمی ادارہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے نظیر ثقافتی مرکز بھی ہے، یہاں کی سرگرمیاں صرف دائرہ تعلیم ہی میں محدود نہیں ہیں، یہاں کے کاموں میں آفاقیت ہے، مشاغل میں تنوع ہے اور مجموعی مزاج میں وسعت و کشادگی ہے، یہاں رہ کر

ایک طالب علم صرف دریائے علم کے آبدار موتیوں سے دامن مراد بھرنے پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ یہاں وہ زندگی کا مفہوم بھی سیکھتا ہے۔ اور زندہ رہنے کا سلیقہ بھی۔ یہاں اسے اخلاق و ادب کی تعلیم بھی ملتی ہے اور علمی و فکری غذا بھی، یہاں طالب علم کی صلاحیتیں اس طرح پروان چڑھتی ہیں جیسے کوئی صحت مند پودا موافق موسم میں نشو و نما پاتا ہے اور یہ سب نتیجہ ہے دارالعلوم کے مثالی تعلیمی و تربیتی نظام کا جس میں حدود شریعت کی پاسداری کے ساتھ طلبہ کی ذہنی سطح کی رعایت اور ان کی مکمل نگرانی کا اہتمام ہے۔

دارالعلوم ہر وہ اقدام کرتا ہے جس سے طلبہ کو آگے بڑھنے میں مدد ملے، دارالعلوم کی جانب سے طلبہ کے ہر اچھے کام کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

انعامی جلسہ

دارالعلوم تعلیمی معیاری کو ترقی دینے کے لئے باذوق و محنتی طلبہ کی برسرعام حوصلہ افزائی اور دیگر طلبہ کی ترغیب کے مقصد سے انعامی جلسہ منعقد کرتا ہے جس میں تمام اساتذہ و طلبہ شرکت کرتے ہیں۔ ہر کامیاب طالب علم کو کتابوں کی شکل میں انعام دیا جاتا ہے ہر جماعت کے ممتاز طلبہ کو خصوصی انعام ملتا ہے پورے دارالعلوم میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے پر علیحدہ انعام دیا جاتا ہے۔ کبھی غیر حاضری نہ کرنے والوں کو بھی انعام ملتا ہے۔ اس طرح تعلیم کے میدان میں مسابقت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، محنتی طلبہ کو حوصلہ ملتا ہے دوسروں کو ترغیب ہوتی ہے، طلبہ اپنی مادر علمی اور اپنے موقر اساتذہ کے عطاء کردہ انعام کو ایک قیمتی اور متبرک تحفہ کی حیثیت سے محفوظ رکھتے ہیں۔

مہمانوں کی آمد پر اجلاس

دارالعلوم کی بین الاقوامی اہمیت کے پیش نظر یہاں نہایت اہم شخصیات رونق افروز ہوتی رہتی ہیں اگر موقع ہو تو دارالعلوم طلبہ کو ان مہمانوں سے روشناس کرانے اور ان کے خیالات سے واقف ہونے کا موقع دینے کیلئے اجلاس منعقد کرتا ہے اس سے طلبہ کا شعور بیدار ہوتا ہے اور معلومات میں اضافہ کے ساتھ ان میں پاکیزہ اور اچھے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مختلف مواقع پر حسب موقع علمی اصلاحی جلسے منعقد کئے جاتے ہیں۔

طلبہ کی انجمنیں

دارالعلوم کے طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں ان کی انجمنیں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہیں۔ دارالعلوم اور اس کے اساتذہ ان انجمنوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ان انجمنوں کا مشترکہ مقصد تحریر و تقریر کی مشق، مطالعہ میں وسعت پیدا کرنا اور حالات حاضرہ سے واقف رہنا ہے ان انجمنوں کے نظام اور سرگرمیوں کو ۳ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) تقریر (۲) تحریر (۳) مطالعہ

شعبہ تقریر

ہر انجمن کے تحت یہ شعبہ سب سے فعال مانا جاتا ہے، جمعرات کی شام کو بعد مغرب یا بعد عشاء ہر انجمن کا تقریری پروگرام منعقد ہوتا ہے، باقاعدہ ایک صدر اور ایک ناظم کے تحت یہ پروگرام چلتا ہے انجمن کا ہر فرد اس میں تقریر کرنے کا مجاز بلکہ پابند ہوتا ہے۔ طلبہ ہفتہ بھر درسیات سے فارغ اوقات میں تقریر کی باقاعدہ تیاری کر کے اس میں شرکت کرتے ہیں۔ ناظم اور صدر حسب موقع طلبہ کی فروگزاشتوں پر متنبہ کرتے ہیں، اس طرح بہت سلیقے کے ساتھ طلبہ کی تقریری صلاحیت پروان چڑھتی رہتی ہے اس شعبے کے خصوصی پروگرام بھی منعقد ہوتے ہیں، افتتاحی، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ کے عنوانات سے منعقد ہونے والے ان خصوصی پروگراموں میں اساتذہ و باقاعدہ شرکت کرتے ہیں اور طلبہ کی رہنمائی کرتے ہیں۔ تقریری پروگرام میں اردو کے علاوہ ہر علاقہ کے طلبہ اپنی علاقائی زبان میں بھی مشق کرتے ہیں

شعبہ تحریر

انجمن کا دوسرا اہم شعبہ تحریر کا ہوتا ہے۔ اس کے تحت انجمن کا ایک دیواری پرچہ نکلتا ہے ہر پرچہ کا ایڈیٹر، نائب ایڈیٹر، اور معاونین ہوتے ہیں۔ تمام افراد انجمن اپنی تحریری کاوشیں اپنے پرچہ کے ذریعہ منظر عام پر لاتے ہیں، اس طرح طلبہ کی تحریری مشق پختہ ہوتی رہتی ہے، ہر پرچہ کی نگرانی کوئی نہ کوئی استاد کرتے ہیں ایک نووارد کو اپنی طرف متوجہ کرنے والی سب سے پہلی چیز یہی پرچہ ہوتے ہیں کیوں کہ صدر گیٹ سے ہی ان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے،

احاطہ اہتمام اور احاطہ مولسری کا ہر وہ حصہ جہاں پرچے آویزاں کرنا ممکن ہو، پرچوں سے گھرا رہتا ہے تقریر کی طرح یہ پرچے بھی مختلف زبانوں میں ہوتے ہیں، جن میں سب سے زیادہ پرچے اردو کے پھر عربی کے اس کے بعد دیگر علاقائی زبانوں کے ہوتے ہیں۔

شعبہ مطالعہ

طلبہ کو علمی و فکری غذا پہنچانے اور تقریر و تحریر میں علمی مواد فراہم کرنے کیلئے ہر انجمن کے تحت لائبریری ہوتی ہے جس میں شرکاء انجمن کو ایک ہفتہ کیلئے کتابیں دی جاتی ہیں، اگلے ہفتہ جمع کرنا ضروری ہوتا ہے اگر اس کی مزید ضرورت ہو تو دوبارہ اندراج کرا کے لی جاسکتی ہے طلبہ کی یہ لائبریریاں اس لائق ہیں کہ مستقل عنوان کے تحت ان کا ذکر کیا جائے۔

طلبہ کی لائبریریاں

ہر انجمن اپنی لائبریری قائم کرنا ضروری سمجھتی ہے، ان کے لئے طلبہ عموماً لوہے کی بند الماری (سیف) استعمال کرتے ہیں۔ ہر لائبریری کا ایک ناظم ہوتا ہے جو کتابوں کی حفاظت اور اندراج و تقسیم وغیرہ کا ذمہ دار ہوتا ہے ان لائبریریوں میں ہزاروں کتابیں ہیں۔ یہاں تک کہ بعض انجمنوں کی لائبریری میں بعض مدارس کے کتب خانوں کے برابر کتابیں ہیں، مثلاً مدنی دارالمطالعہ کی لائبریری میں چھ ہزار کتب و رسائل کا ذخیرہ ہے۔ طلبہ پالنپور کے انجمن دعوت المفکر چار ہزار کتابوں کا ذخیرہ رکھتی ہے۔ طلبہ مغربی بنگال کی حمایت الاسلام کے پاس دو ہزار کتب ہیں۔ بستی واعظم گڑھ کی لائبریریوں میں سے ہر ایک بارہ سو کتب پر مشتمل ہے، طلبہ سورت کی لائبریری دو ہزار سے زائد کتب پر مشتمل ہے، یہ محض چند نمونے ہیں ورنہ ضلع کی لائبریری میں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔

انجمنوں کی تعداد

طلبہ کی ان انجمنوں کی تعداد سو کے قریب ہے یوپی کے تقریباً تمام اضلاع کی اپنی اپنی انجمنیں ہیں، صرف چند اضلاع ایسے ہیں جن کی انجمن نہیں ہے یا جو کسی دوسرے ضلع کے ساتھ ملحق ہیں صوبہ بہار و اڑیسہ کی انجمنوں کی تعداد ۷۳ ہے، مغربی بنگال کے اکثر اضلاع

کی انجمنیں ہیں۔ بقیہ صوبوں کی صوبائی انجمنیں ہیں، گجرات میں پالنپور اور سورت کی ضلعی انجمنیں ہیں۔

اضلاعی انجمنوں کے علاوہ کچھ انجمنیں پورے دارالعلوم یا کسی بڑے صوبے کی ہیں۔

مثلاً:-

(۱) مدنی دارالمطالعہ :- یہ انجمن ۱۳۶۷ھ میں قائم ہوئی اس کے تحت تقریباً دس بارہ تقریری پروگرام ہوتے ہیں جو عام انجمنوں کے پروگراموں سے علیحدہ ہیں۔ دیواری پرچہ بھی نکلتا ہے اور جیسا کہ اوپر گذرا۔ اس کی لائبریری چھ ہزار کتب مشتمل ہے۔ اس کے دروازے دارالعلوم کے ہر طالب علم کیلئے کھلے ہوئے ہیں۔

(۲) تقویۃ الاسلام :- (مجلس مناظرہ) یہ انجمن مناظرہ کی مشق کے لئے قائم ہے جس کے ہفتے وار پروگرام جمعہ کے بعد منعقد ہوتے ہیں۔ کسی اہم موضوع پر ماہانہ مناظرہ کے پروگرام دارالحدیث کے وسیع ہال میں منعقد ہوتے ہیں۔ اس انجمن سے دارالعلوم کے بہت سے طلبہ منسلک ہو کر مشق مناظرہ کرتے ہیں۔

(۳) سجاد لائبریری :- یہ طلبہ بہار اڑیسہ نیپال کی مشترکہ انجمن ہے جس کے تحت بہار اڑیسہ کی تمام انجمنیں کام کرتی ہیں، اس کے اپنے بھی سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔

اسی طرح صوبہ آسام کی انجمن امدادیہ اور صوبہ بنگال کی انجمن حمایت الاسلام بھی اہم صوبائی انجمنیں ہیں۔

النادی الادبی

انجمنوں کے تذکرے میں طلبہ دارالعلوم کی عربی انجمن ”النادی الادبی“ کا ذکر بھی ضروری ہے اس کے تحت جمعرات کو بعد مغرب عربی میں تقریری پروگرام ہوتے ہیں۔ تقریباً دس بارہ عربی پرچے نکلتے ہیں، عربی کتابوں کی ایک لائبریری ہے جس میں کتب و رسائل کی تعداد تین ہزار سے زائد ہے۔

اس انجمن نے طلبہ میں عربی سے دلچسپی پیدا کرنے اور عربی تحریر و تقریر کے افراد تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

شعبہ تجوید کے طلبہ کی بھی کچھ انجمنیں ہیں جو قرأت قرآن اور تحسین صوت کی مشق کراتی ہیں۔

مقابلہ و مسابقہ

طلبہ کی انجمنوں کی سرگرمیوں کا ایک اہم جزء وہ مقابلے ہیں جو تحریر و تقریر دونوں ہی میدانوں میں ہوتے ہیں۔ مختلف صوبائی اور مشترک انجمنیں، انعامی مقابلے منعقد کرتی ہیں۔ اساتذہ کی زیر نگرانی پروگرام ہوتے ہیں، اساتذہ ہی حکم ہوتے ہیں، کامیاب طلبہ کو انعامات بھی دیئے جاتے ہیں، تجوید کی انجمنیں بھی سابقہ قرأت منعقد کرتی ہیں۔ یہ تمام مقابلے بھی طلبہ کے اندر اپنے اپنے فن میں آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں

فضلاء دارالعلوم دیوبند

ایک سو اڑتیس سال کی اس مدت میں دارالعلوم دیوبند سے براہ راست کسب فیض کرنے والے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان، نیپال، برما، سری لنکا، چین، روس، ایران، عراق، کویت، سعودی عرب، مسقط، مالدیپ، ترکستان، مصر، یمن، انڈونیشیا، ملیشیا، کمبوڈیا، امریکہ، افریقہ، برطانیہ، سوڈان، ویسٹ انڈیز، تھائی لینڈ، نیوزی لینڈ، فرانس، جی اور لبنان کے وہ خوش نصیب جنہوں نے باقاعدہ داخل ہو کر سند فضیلت حاصل کی، ان کی تعداد تقریباً اٹھائیس ہزار سے زائد ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے جزوی استفادہ کیا یا دورہ حدیث کے علاوہ دیگر درجات سے مستفید ہوئے ان کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اور اگر اس میں علم و فن کے ان پروانوں کو بھی شامل کیا جائے جنہوں نے فضلاء دارالعلوم یا ان کے قائم کردہ اداروں سے فیض حاصل کیا تو یہ تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو جائے گی۔

دارالعلوم کے اسلاف

دارالعلوم دیوبند کے اسلاف میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ سے لے کر حضرت مولوی رحمہ اللہ تک کے سارے بزرگ شمار ہوتے ہیں، کیونکہ ”مسلم کا اور روایت“

دارالعلوم دیوبند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جانب منسوب ہے، اور سلوک میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ اکابر دارالعلوم میں جاری و ساری ہوا، چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہ دونوں بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفا میں سے تھے، اور خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے اسلاف میں ہیں، دارالعلوم کے قیام اور اس کی ترقی میں حضرت کے مشورے اور حوصلہ افزائی کا بڑا حصہ ہے۔

ان کے علاوہ دارالعلوم کے اسلاف میں وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے دارالعلوم کی رسمی یا معنوی سرپرستی فرمائی، مثلاً حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہ محدث سہارنپوری، جن کا دخل دارالعلوم کے معاملات سے رہا اور ان کی مبارک آراء کو اہمیت حاصل رہی، چنانچہ تعمیر مدرسہ اور عمارتی سنگ بنیاد کے سلسلے میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کا ذوق تو یہ تھا کہ مدرسہ کی عمارات خام ہوں، گھاس پھوس پر بیٹھ کر طلباء تعلیم پائیں تاکہ زہد و قناعت، سادگی و قناعت اور صبر و توکل کی شان ان میں نمایاں رہے۔ لیکن دوسرے اہل الرائے حضرات کی رائے یہ تھی کہ دارالعلوم کی عمارات پختہ اور مستحکم بنوائی جائیں تاکہ مدرسہ اپنی صورت کے لحاظ سے بھی نمایاں رہے، لیکن اس بارہ میں جب حضرت نانوتوی قدس سرہ کی رائے متاثر نہ ہوئی تو آخر کار حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہ سے حضرت نانوتوی قدس سرہ پر اثر ڈلوایا گیا، اور آپ نے حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے بعد اپنی رائے تبدیل فرمادی، اور مدرسہ کی پختہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔

اسی طرح حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ منگلوری، جو صاحب سلسلہ اور نہایت پائے کے بزرگوں میں سے تھے، دارالعلوم کے قیام کے سلسلے میں ان کے مکاشفات بھی تھے، جن کا ظہور قیام دارالعلوم کی صورت میں ہوا، اس لئے آپ بھی اسلاف دارالعلوم ہی میں شمار کئے جاتے ہیں۔

دارالعلوم کے اعلیٰ مناصب

دارالعلوم میں اعلیٰ ذمہ دارانہ عہدے چار رہے ہیں :-

سرپرستی ۲ اہتمام ۳ صدارت تدریس ۴ افتاء

ان چاروں عہدوں کے لئے ہمیشہ ایسی ممتاز شخصیتوں کا انتخاب عمل میں آتا رہا ہے جو اہل اللہ، اہل دین و اہل تقویٰ اور جامع شریعت و طریقت ہوا کرتے تھے۔

دارالعلوم کے سرپرست

دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے، جن کا پر امن و بابرکت عہد آج تک احاطہ دارالعلوم میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے، آپ ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء سے ۱۲۹۷ھ ۱۸۷۹ء تک سرپرست رہے حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد دوسرے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ مقرر ہوئے، آپ کے عہد کی برکات دارالعلوم پر نور آفتاب کی طرح چھائی رہیں، جن سے ظلمتوں کو قرار پکڑنے کا موقعہ نہ مل سکا، آپ ۱۲۹۸ھ ۱۸۸۰ء سے تاحیات ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء تک سرپرست رہے، آپ کے بعد ۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء میں باجماع اہل دارالعلوم شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ سرپرست تسلیم کئے گئے، جن کے نورانی آثار سے آج تک دارالعلوم کا احاطہ چمک رہا ہے، ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۴ء میں جب آپ حجاز تشریف لے گئے تو حضرت اقدس مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہ کو سرپرست تسلیم کیا گیا، آپ ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۵ء سے ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۸ء تک رہے، لیکن جب حضرت شیخ الہند مالٹا سے رہا ہو کر واپس تشریف لے لائے تو پھر آپ ہی ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۰ء تک سرپرست رہے۔

آپ کے بعد ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۵ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ العزیز سرپرست ہوئے، آپ نے اپنی باطنی توجہات اور صرف ہمت کے ذریعہ دارالعلوم کے جہاز کو فتن و حوادث کے تھپیڑوں سے محفوظ رکھا، ۱۳۵۴ھ ۱۹۳۵ء میں اپنے گوناگوں مشاغل اور اس وقت کے اندرونی حالات کی وجہ سے حضرت تھانوی قدس سرہ العزیز نے سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔

اسکے بعد سے آج تک سرپرست کے نام سے کسی شخصیت کا انتخاب عمل میں نہیں آیا۔

دارالعلوم کے مہتمم

اہتمام کے عہدہ پر بھی ہمیشہ اپنے وقت کے منتخب مخصوص حضرات کا انتخاب ہوتا رہا۔

سب سے پہلے مہتمم حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی تھے، جو طریقہ چشتیہ، صابریہ کے ایک معروف صاحب سلسلہ بزرگ تھے، اور زہد و ریاضت کا پیکر تھے، آپ کا حلقہ اثر دیوبند اور اطراف و جوانب میں بہت وسیع تھا، آپ اولاً محرم ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء سے رجب ۱۲۸۴ھ ۱۸۶۸ء تک مہتمم رہے۔ ثانیاً ۱۲۸۶ھ ۱۸۷۰ء تا ۱۲۸۸ھ ۱۸۷۲ء اور ثالثاً ربیع الاول ۱۳۰۶ھ ۱۸۸۹ء تا شعبان ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۳ء مہتمم رہے۔

آپ کے اہتمام اول کے بعد حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ عہدہ اہتمام پر فائز ہوئے، آپ طریقت و حقیقت کے ایک بلند پایہ شیخ اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی نور اللہ مرقدہ کے ارشد خلیفہ تھے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان پر فخر کیا کرتے تھے، موصوف بہت سے اکابر دارالعلوم مثل حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمن صاحب قدس سرہ اور حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند وغیرہ کے شیخ طریقت تھے۔

دارالعلوم کی معنوی ترقیات میں حضرت ممدوح کی تربیت و صرف ہمت کا اسی طرح حصہ ہے جس طرح قطب عالم عارف باللہ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور قطب الارشاد عارف باللہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، آپ اولاً شعبان ۱۲۸۴ھ ۱۸۶۸ء اور ثانیاً ذیقعدہ ۱۲۸۸ھ ۱۸۷۳ء تا ربیع الاول ۱۳۰۶ھ ۱۸۸۹ء دارالعلوم کے مہتمم رہے، آپ کے بعد تیسرے مہتمم حاجی محمد فضل حق صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے، جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اور ایک صالح و متقی بزرگ تھے، آپ شعبان ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۳ء سے ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۴ء تک مہتمم رہے۔

آپ کے بعد ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۴ء میں حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے چوتھے مہتمم ہوئے آپ حضرت نانوتوی قدس سرہ کے رشتہ کے بھائی اور جہاد شامی کے ردیف کی حیثیت رکھتے تھے، نہایت ہی باخدا بزرگ اور صاحب دیانت و تقویٰ لوگوں میں تھے، آپ کے زمانہ اہتمام کی انتہا جمادی الاول ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء ہے۔

آپ کے بعد جمادی الثانی ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے پانچویں مہتمم بنائے گئے، آپ کا عہد سابقہ تمام عہدوں سے زیادہ طویل، پر شوکت اور پر ہیبت دور گذرا ہے، یہ دور چالیس برس

تک ممتد رہا اور اس چالیس سالہ مدت میں دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی، حضرت ممدوح کی ذاتی و آبائی وجاہت نے بہت سے پیدا شدہ فتنوں کو دبا کر دارالعلوم کے حلقہ اثر کو وسیع تر بنایا، مالی امدادیں کثیر مقدار میں بڑھیں، بڑی بڑی عمارتیں مثلاً دارالطلبہ قدیم، دارالطلبہ جدید کا کچھ حصہ، دارالحدیث تھانی، مسجد دارالعلوم، کتب خانہ، دارالمشورہ قدیم مہمان خانہ اور مختلف احاطے ارض دارالعلوم پر نمایاں ہوئے، کارکنوں میں اضافہ ہوا، حاصل یہ کہ اس درس گاہ نے مدرسہ سے دارالعلوم اور دارالعلوم سے ایک جامعہ کی صورت اسی زمانے میں اختیار کی، جس کے ماتحت آج بہت سے اضلاع اور صوبہ جات کے بہت سے ادارے چل رہے ہیں۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جمادی الثانی ۱۳۲۷ھ ۱۹۲۹ء میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے چھ مہتمم ہوئے۔ آپ ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نیابت میں رکھے گئے تھے، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اپنی دانش و بینش اور فہم و فراست میں یگانہ ہند تسلیم کئے جاتے تھے، ممدوح نے اپنے خداداد تدبیر سے دارالعلوم کے انتظامات کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر منظم کیا، تقسیم کار کے ذریعہ مخلوط امور کو شعبوں میں تقسیم کیا اور دارالعلوم کو حقیقی معنی میں مرکزی حیثیت دی۔ موصوف کا یہ مستقل اہتمام گو تقریباً ڈیڑھ برس رہا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دست راست اور ان کی چالیس سالہ خدمات کے روح رواں نیابت کی صورت میں آپ ہی رہے، آپ کا زمانہ اہتمام شعبان ۱۳۲۸ھ ۱۹۳۰ء تک رہا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کے بعد ۱۳۲۸ھ ۱۹۳۰ء میں دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کا بار گراں شدید انکار کے باوجود احقر (حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے ناتواں دوش پر ڈالا گیا۔

دارالعلوم کے نام پر ہندوپاک اور بنگلہ دیش سے گذر کر افغانستان، برما، حجاز مقدس، ایران، مصر، ایسٹ افریقہ، جنوبی افریقہ، امریکہ اور یورپ تک سفر کرنا پڑا، اور ان تمام ممالک میں دارالعلوم کا تعارف ہوا، اور وہاں سے بھی امدادی رقوم حاصل ہوئیں۔

اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ، دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی، اور دارالعلوم کا حلقہ اثر کافی وسیع ہوا، مالیات میں بھی بے حد اضافہ ہوا اور تعمیرات بھی بہت زیادہ ہوئیں۔

اضافہ

اجلاس صد سالہ کے بعد ملت اسلامیہ کے اس عظیم رہنما (دارالعلوم دیوبند) کو بعض ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر ایک انقلاب سے گذر کر دو حصوں میں تقسیم ہونا پڑا اور ۱۴۰۲ھ سے حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ العالی دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قرار پائے اور تاحال آل موصوف اس عظیم الشان عہدے پر فائز ہیں۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مدظلہ العالی دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے قدیم رکن نہایت متقی اور مخلصانہ طبیعت کے مالک ہیں، اور نہایت متواضع و خلیق انسان اور شاندار منتظم ہیں۔ حضرت مہتمم صاحب نے منتشر اور ہنگامی حالات میں زمامِ اہتمام سنبھالی، آپ کے دورِ اہتمام میں شعبہ تعلیمات میں نئی اور مفید اصلاحات برپا کی گئیں، قدیم نصاب میں مقصد سے ہم آہنگ بعض جزوی تبدیلیاں، شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ تجوید کی بہتر کارکردگی، مدرسہ ثانویہ کا علیحدہ نظام چار شعبوں میں تدریب (ٹریننگ) کا سلسلہ، شیخ الہند اکادمی اور کل ہند مجلس ختم نبوت کا قیام، پندرہ روزہ ”آئینہ دارالعلوم“ کا اجراء آپ ہی کے دورِ اہتمام کی دین ہیں۔ آپ کی سرپرستی میں تعمیرات کے سلسلے میں بھی ناقابلِ فراموش کام ہوا، دارالمدرسین، مدرسہ ثانویہ، دفتر اہتمام کی توسیع، دارالافتاء کی توسیع دفتر تعلیمات کی جدید تعمیر، مہمان خانہ کی جدید تعمیر، اعظمی منزل اور مختلف جگہوں پر طلبہ کیلئے رہائشی کمرے اور خاص طور پر مسجد رشید آپ کے دور کا ایک حسین شاہکار ہے۔

دارالعلوم دیوبند نے آپ کے دور میں روز افزوں ترقی کی خدا آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ تادیر قائم و دائم رکھے۔ آمین

دارالعلوم کے صدر المدرسین

● دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ فائز ہوئے جو اپنی جامعیت علوم ظاہرہ و باطنہ کے سبب شاہ عبدالعزیز ثانی تسلیم کئے جاتے تھے، آپ ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء سے ربیع الاول ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۶ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

● حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۶ء

میں حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس مقرر فرمائے گئے جو علوم منقولہ کیساتھ علوم معقولہ خصوصاً علم ہیئت و ریاضی میں امام وقت تسلیم کئے جاتے تھے، آپ ۱۳۰۷ھ ۱۸۸۹ء تک صدارت تدریس پر فائز رہے۔

● ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۰ء میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی دارالعلوم کے تیسرے صدر مدرس مقرر فرمائے گئے، آپ نے پچیس برس تک مسلسل حدیث اور تفسیر، کلام ربانی کے علوم کے دریا بہائے اور تشنگان علوم اس بحر ذخار سے سیراب ہو کر دوسروں کو سیراب کرتے رہے، آپ ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۴ء تک اس عہد پر فائز رہے، آپ سے فیض یافتہ تمام علماء اپنے دور کے بے نظیر محدث، مفسر، فقیہ، متکلم، ادیب اور ہر فن میں مہارت تامہ رکھنے والے تھے، اور یہ واقعہ ہے کہ آپ کے تلامذہ سے ہندوپاک اور دوسرے ممالک میں علم و عمل کو بہت فروغ ہوا۔

● ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۵ء میں بحر العلوم، محدث دوراں، علامہ عصر، حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری قائم مقام صدر مدرس مقرر فرمائے گئے، آپ شیخ الہند کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، پھر ۱۳۳۹ھ ۱۹۱۹ء میں موصوف مستقل صدر مدرس ہوئے، آپ اپنے علم و عمل، زہد و تقویٰ، تجر و تفقہ اور حفظ و روایت کے لحاظ سے یگانہ روزگار تھے، آپ ۱۳۳۲ھ سے ۱۳۳۸ھ تک قائم مقام صدر مدرس اور ۱۳۳۹ء سے اوائل ۱۳۴۶ء ۱۹۲۶ء تک صدر مدرس رہے۔

● شوال ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۶ء میں استاذ العرب و انجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مسند نشین صدارت تدریس ہوئے، آپ کا بھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہے، آپ کے علم و فضل اور اخلاق فاضلہ سے ہزاروں تشنگان علوم نے ظاہری و باطنی تکمیل کر کے اپنی علمی و روحانی پیاس بجھائی، آپ جمادی الاول ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۸ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

● ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۸ء میں جامع معقول و منقول حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی دارالعلوم کے صدر مدرس مقرر فرمائے گئے، آپ معقولات کے امام، حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں تھے، پہلے اپنے استاذ محترم سے ہی بیعت ہوئے، پھر بعد میں حضرت اقدس مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے باطنی علق رہا، مؤخر الذکر بزرگ نے جو آپ کے شاگرد بھی تھے، اصرار کیا کہ بیعت فرمایا

کریں۔ خصوصیت سے صحیح مسلم آپ کے درس کا شاہکار رہی، جس کی مقبولیت طالبان علم حدیث میں عام رہی۔

حضرت علامہ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ۱۳۸۷ھ کے اخیر میں اس عہدہ جلیلہ پر شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ فائز ہوئے، آپ ۱۳۷۷ھ سے بخاری شریف پڑھاتے آرہے تھے، اب بھی آپ کے یہاں یہی کتاب رہی، آپ کا درس بخاری مشہور و مقبول تھا، آپ کے دور صدارت میں طلباء دورہ حدیث کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا، ذی الحجہ ۱۳۹۱ء تک آپ کا درس جاری رہا، بیمار ہو کر مراد آباد تشریف لے گئے مگر باوجود کافی علاج معالجہ صحت نہ ہوئی۔ ۲۰ صفر ۱۳۹۲ھ میں آپ کی وفات ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون..... آپ کے بعد اس سال کے بقیہ حصوں میں بخاری شریف کا سبق کچھ مہینوں احقر (قاری محمد طیب) کو پڑھانا پڑا، لیکن عہدہ صدارت پر حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب مراد آبادی رونق افروز ہوئے، مولانا نے اپنی صحت کی کمزوری کیوجہ سے بخاری شریف کا سبق ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ میں حضرت مولانا شریف حسن دیوبندی کی طرف منتقل کر دیا اور تاحیات مولانا شریف احمد دیوبندی ہی بخاری شریف کا درس دیتے رہے، ۱۵ جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ کو مولانا کی وفات ہو گئی تو یہ سبق مجلس شوریٰ نے حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب کے سپرد کر دیا، جسے مولانا موصوف اب تک حسن و خوبی سے پڑھا رہے ہیں، بلکہ محرم ۱۴۰۰ میں مجلس شوریٰ نے متفقہ طور پر آل محترم کو صدر المدرسین کا قائم مقام بنادیا تھا، کیونکہ عملاً حضرت مولانا فخر الحسن صاحب مدظلہ کا صدارت و تدریس سے قطعاً معذور تھے۔

اضافہ

حضرت مولانا فخر الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب مدظلہ العالی صدارت تدریس کے عہدہ پر فائز ہو گئے اور تاحال اسے رونق بخشنے ہوئے ہیں، ساتھ ہی بخاری شریف کی ایک جلد کی تدریس بھی مولانا موصوف سے متعلق ہے اور شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند ہونے کا شرف بھی آل محترم ہی کو حاصل ہے۔ جبکہ بخاری شریف کی ایک جلد کی تدریس کے فرائض حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی عمت فیوضہم انجام دیتے ہیں۔

دارالعلوم کے مفتی

۱۔ دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کے علاوہ افتاء کا کام بھی ابتداء ہی سے ہوتا رہا، سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے صدر المدرسین تھے وہی اس اہم کام کو بھی انجام دیتے رہے، چنانچہ آپ نے ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۰۱ھ تک اس خدمت کو بھی انجام دیا۔

ب۔ اس کے بعد کسی مخصوص شخصیت کے ذمہ یہ کام نہیں رکھا گیا بلکہ مختلف اساتذہ کرام سے افتاء کا کام لیا جاتا رہا، چنانچہ ۱۳۰۲ھ سے ۱۳۰۹ھ تک اسی طرح کام چلتا رہا۔
ج۔ استفتاء کی تعداد بڑھ کر غیر معمولی حد تک پہنچ جانے کے سبب باقاعدہ ایک دارالافتاء کی بنیاد ڈالی گئی، اور ۱۳۱۰ھ میں دارالافتاء قائم کر کے حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی قدس سرہ کو مفتی کا عہدہ سپرد کیا گیا، آپ کے زمانے میں دارالافتاء سے ۱۳۳۰ھ سے ۱۳۴۶ھ، ۱۶ برس کی مدت میں ۲۲۶۲۱ فتاویٰ روانہ کئے گئے ۱۳۳۰ھ سے پہلے کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ملتا، اس لئے ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۲۹ھ تک انیس سال کے فتاویٰ کی تعداد سامنے نہیں آسکی۔

د۔ ۱۳۴۷ھ میں حضرت مولانا محمد اعجاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مفتی اور حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی کی حیثیت سے دارالافتاء کے ذمہ دار بنائے گئے، یہ دور ۱۳۴۸ھ تک رہا، اور اس دور میں ۲۴۴۸ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

۵۔ ۱۳۴۹ھ میں تنہا حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحب کی ذمہ داری میں دارالافتاء آگیا، اور اس دور میں ۲۴۵۳ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔

و۔ ۱۳۵۰ھ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، سابق مفتی اعظم پاکستان و ناظم اعلیٰ دارالعلوم کراچی مفتی دارالعلوم بنائے گئے، آپ اس عہدے پر ۱۳۵۴ھ تک فائز رہے، آپ کے زمانے میں ۱۸۹۵ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

ز۔ ۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۵۷ھ تک مفتی رہے، آپ کے دور میں ۱۵۱۸۵ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔
ح۔ ۱۳۵۸ھ میں حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب میرٹھی مفتی مقرر فرمائے گئے،

آپ ۱۳۵۹ھ تک مفتی رہے، آپ کے دور میں ۱۵۱۸۵ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔
 ط: ۱۳۵۹ھ میں دوبارہ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مفتی مقرر فرمائے گئے، اور
 ۱۳۶۱ھ تک آپ مفتی رہے، اس دوران میں ۶۸۷۷ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔
 ی: ۱۳۶۲ھ میں حضرت مولانا محمد فاروق صاحب انبھیٹوی ابن حضرت مولانا صدیق احمد
 صاحب مفتی مالیر کوٹلہ، دارالعلوم کے مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۶۳ھ تک مفتی رہے،
 آپ کے دور میں ۸۴۲۷ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔

ک: ۱۳۶۴ھ میں حضرت مولانا اعجاز علی صاحب مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۶۶ھ
 تک مفتی رہے، اور آپ کے اس زمانے میں ۲۰۴۰۷ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔
 ل: ۱۳۶۷ھ میں حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری رحمہ اللہ مفتی
 مقرر فرمائے گئے، فتاویٰ میں آپ کی محنت و عرق ریزی اور شب و روز کا انہماک معروف اور
 زبان زد ہے، آپ کے زمانے میں ۱۳۸۲ھ تک ایک لاکھ ۷۳ ہزار ۵۳ فتاویٰ دارالافتاء
 سے روانہ کئے گئے۔

اضافہ

حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب رحمہ اللہ کے بعد فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی
 محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ نے مسند صدارت افتاء کو چار چاند لگا دیئے اور آپ کے دور صدارت
 میں نسبتاً ہر سال فتاویٰ کی تعداد بڑھتی رہی اور امت مسلمہ نے آپ کے قلم گوہر بار سے فیض
 کثیر حاصل کیا (۱۴۰۰ھ ۱۹۹۶ء) میں آپ کے وصال کے بعد حضرت مولانا مفتی نظام الدین
 صاحب مدظلہم العالی آپ کے جانشین قرار پائے۔ جو تاحال اس جلیل القدر منصب پر فائز ہیں۔

دارالعلوم کا حصہ تصانیف میں

دارالعلوم کا مسلک اور مخصوص رنگ علماء دارالعلوم کی تصانیف میں صاف نمایاں رہا،
 ہمیشہ بروقت اور بر محل تصانیف اس احاطہ سے نکلتی رہیں۔ دارالعلوم نے سو سال کے عرصہ
 میں ۱۱۶۴ مصنفین پیدا کئے جن میں سے تقریباً ۶۷۲ درجہ اعلیٰ کے مصنفین ہیں۔ علماء

دارالعلوم میں سے چند مشہور و معروف مصنفین کی فہرست درج ذیل ہے۔

نمبر شمار نام مصنف تصنیف کا رنگ

۱ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند متکلمانہ

۲ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب محدثانہ

۳ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب امبیٹھوی محدثانہ

۴ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی عارفانہ، صوفیانہ، فقیہانہ

اور مفسرانہ آپ کی تصانیف

کی تعداد جو ہر علم و فن میں

ہیں ایک ہزار سے زائد ہے

۵ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی محدثانہ

۶ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب مناظرانہ

۷ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری فقیہانہ و مناظرانہ

۸ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سیاسی و فقیہانہ

۹ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مورخانہ

۱۰ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب فقیہانہ و مورخانہ

۱۱ حضرت مولانا اعجاز علی صاحب مخشیانہ، فقیہانہ اور ادبیانہ

۱۲ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی فلسفیانہ و متکلمانہ

۱۳ حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی مورخانہ و محققانہ

۱۴ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فقیہانہ

۱۵ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی محدثانہ و متکلمانہ

۱۶ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میٹھی مہاجر مدنی محدثانہ

۱۷ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیاسی و مورخانہ

۱۸ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مورخانہ

۱۹ حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ادبیانہ و مورخانہ

۲۰ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری محدثانہ

- ۲۱ حضرت مولانا عبدالصمد صاحب صاوم سیوہاری محققانہ
- ۲۲ احقر (حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب) کو اس فہرست میں اپنا نام شمار کراتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ تاہم تحدیثاً للنعمت اظہار نعمت بھی شکر نعمت ہے کہ اس ناکارہ کی تالیفات کا عد و بھی جو مختلف موضوعات پر ہیں تقریباً سو سو (۱۲۵) ہے جن کا رنگ ان کے مطالعے سے واضح ہو سکتا ہے۔

طبقات مشاہیر علماء دیوبند

یہاں مرحومین کا ہی تذکرہ قلم بند ہے سردست زندوں کا تذکرہ رہنے دیا حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں ان زندوں میں کیسے کیسے محدثین، مفسرین، متکلمین، مبلغین، مصنفین، مجاہدین، قائدین اور فقہان امت موجود ہیں، جن کی برکات سے زندہ انسانوں کے دل نور الہی سے منور اور دماغ لمعات سنت سے روشن ہیں۔

محدثین

- | | |
|--|---|
| ۱ حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری | ۲ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی |
| ۳ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی | ۴ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی |
| ۵ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی | ۶ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی |
| ۷ حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی | ۸ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری |
| ۹ حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھی | ۱۰ حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری |
| ۱۱ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی | ۱۲ حضرت مولانا محمد اسحاق امرتسری |
| ۱۳ حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی | ۱۴ حضرت مولانا محمد اد ریس کاندھلوی |
| ۱۵ حضرت مولانا عبدالعزیز گجر نوالہ | ۱۶ حضرت مولانا فخر الدین مراد آبادی |
| ۱۷ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری | ۱۸ حضرت مولانا حبیب الرحمن محدث اعظمی |
| ۱۹ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری | ۲۰ حضرت مولانا ماجد علی جوہر پوری |
| ۲۱ حضرت مولانا عبدالغفار منوکی | ۲۲ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی |
| ۲۳ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی | ۲۴ حضرت مولانا شفاق الرحمن کاندھلوی |
| ۲۵ حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہ جہانپوری | ۲۶ حضرت مولانا عبدالرحمن کامل پوری |

مفسرین

- | | | | |
|----|---|----|-----------------------------------|
| ۱ | حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی | ۲ | حضرت مولانا عبد الرحمن امروہی |
| ۳ | حضرت حکیم الامتہ مولانا اشرف علی تھانوی | ۴ | حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی |
| ۵ | حضرت مولانا احمد علی لاہوری | ۶ | حضرت مولانا احمد سعید دہلوی |
| ۷ | حضرت مولانا حسین علی پنجابی | ۸ | حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی |
| ۹ | حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی | ۱۰ | حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی |
| ۱۱ | حضرت مولانا غلام اللہ خان | ۱۲ | حضرت مولانا قاضی زاہد احسینی |

متکلمین اسلام

- | | | | |
|---|----------------------------------|----|---------------------------------------|
| ۱ | حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی | ۲ | حضرت مولانا رحیم اللہ بجنوری |
| ۳ | حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری | ۴ | حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی |
| ۵ | حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی | ۶ | حضرت مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی |
| ۷ | حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی | ۸ | حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانی |
| ۹ | حضرت مولانا سید مناظر حسن گیلانی | ۱۰ | حضرت مولانا قاضی مظہر حسین |

مصنفین و مؤرخین

- | | | | |
|----|--------------------------------------|----|------------------------------------|
| ۱ | حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی | ۲ | حضرت مولانا اشرف علی تھانوی |
| ۳ | حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی | ۴ | حضرت مولانا مناظر حسن گیلانی |
| ۵ | حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی | ۶ | حضرت مولانا حبیب الرحمن محدث اعظمی |
| ۷ | حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی | ۸ | حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی |
| ۹ | حضرت مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث | ۱۰ | حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی |
| ۱۱ | حضرت مولانا قاضی زین العابدین | ۱۲ | حضرت مولانا نور الحسن شیرکوٹی |
| ۱۳ | حضرت مولانا یعقوب الرحمن | ۱۴ | حضرت مولانا محمد منظور نعمانی |
| ۱۵ | حضرت مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی | ۱۶ | حضرت مولانا سید نور الحسن بخاری |
| ۱۷ | حضرت مولانا قاضی محمد اطہر مبارکپوری | | |

فقہاء

- | | | | |
|----|---|----|---|
| ۱ | حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی | ۲ | حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن دیوبندی |
| ۳ | حضرت مولانا سعادت علی سہارنپوری | ۴ | حضرت حکیم الامتہ مولانا اشرف علی تھانوی |
| ۵ | حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی | ۶ | حضرت مولانا اعزاز علی امروہی |
| ۷ | حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی | ۸ | حضرت مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوری |
| ۹ | حضرت مولانا مفتی ریاض الدین بجنوری | ۱۰ | حضرت مولانا مفتی محمد فاروق |
| ۱۱ | حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ میرٹھی | ۱۲ | حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن |
| ۱۳ | حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی | ۱۴ | حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاچپوری |
| ۱۵ | حضرت مولانا مفتی محمد اسماعیل سم اللہ سورتی | ۱۶ | حضرت مولانا مفتی احمد سعید اجڑوی |
| ۱۷ | حضرت مولانا فقیر اللہ رائے پوری | ۱۸ | حضرت مولانا مفتی محمود سرحدی |
| ۱۹ | حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی | ۲۰ | حضرت مولانا مفتی محمد یوسف آزاد کشمیر |
| ۲۱ | حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی | | |

اصحاب تدریس

- | | | | |
|----|--------------------------------------|----|---|
| ۱ | حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی | ۲ | حضرت مولانا سید احمد دہلوی |
| ۳ | حضرت مولانا احمد حسن امروہوی | ۴ | حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی |
| ۵ | حضرت مولانا منفع علی دیوبندی | ۶ | حضرت مولانا عبد العلی میرٹھی |
| ۷ | حضرت مولانا عبد المؤمن دیوبندی | ۸ | حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی |
| ۹ | حضرت مولانا غلام رسول خاں ہزاروی | ۱۰ | حضرت مولانا محمد صدیق انبیٹھوی |
| ۱۱ | حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی | ۱۲ | حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی |
| ۱۳ | حضرت مولانا خیر محمد جالندھری | ۱۴ | حضرت مولانا عبد الرحمن کامل پوری |
| ۱۵ | حضرت مولانا محمد صدیق کشمیری | ۱۶ | حضرت مولانا محمد عبد السمیع دیوبندی |
| ۱۷ | حضرت مولانا زین العابدین اعظمی | ۱۸ | حضرت مولانا محمد یحییٰ سہرانی |
| ۱۹ | حضرت مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوری | ۲۰ | حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہی |

- | | |
|-------------------------------------|--|
| ۲۱ حضرت مولانا محمد مراد پاک پٹنی | ۲۲ حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندی |
| ۲۳ حضرت مولانا محمد رسول خاں | ۲۴ حضرت مولانا عبدالحق اکوڑ وہی |
| ۲۵ حضرت مولانا حمید الدین فیض آبادی | ۲۶ حضرت مولانا محمد حیات سنہلی |
| ۲۷ حضرت مولانا احمد حسن کانپوری | ۲۸ حضرت مولانا عبد الستار احمد بلند شہری |
| ۲۹ حضرت مولانا بشیر احمد بلند شہری | ۳۰ حضرت مولانا معراج الحق دیوبندی |
| ۳۱ حضرت مولانا محمد حسین بہاری | ۳۲ حضرت مولانا شکر اللہ اعظمی |
| ۳۳ حضرت مولانا علی احمد اعظمی | ۳۴ حضرت مولانا عبد الصمد کوپانجی |

مبلغین اسلام

- | | |
|---|--------------------------------------|
| ۱ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی | ۲ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن بجنوری |
| ۳ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی | ۴ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب |
| ۵ حضرت مولانا ابوالوفا شاہ جہانپوری | ۶ حضرت مولانا محمد ادریس سکر وڈوی |
| ۷ حضرت مولانا سید معظم علی | ۸ حضرت مولانا محمد قاسم شاہ جہانپوری |
| ۹ حضرت مولانا عبد الجبار حصاروی | ۱۰ حضرت مولانا محمد علی جالندھری |
| ۱۱ حضرت مولانا سید ارشاد احمد فیض آبادی | ۱۲ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی |
| ۱۳ حضرت مولانا عبید اللہ بلیاوی | ۱۴ حضرت مولانا محمد عمر پالن پوری |
| ۱۵ حضرت مولانا قاری محمد صدیق | |

حضرات مشائخ

- | | |
|--|--|
| ۱ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجرکی | ۲ قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی |
| ۳ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری | ۴ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی |
| ۵ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی | ۶ حضرت مولانا محمد علی مونگیری |
| ۷ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری | ۸ حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین دیوبندی |
| ۹ حضرت مولانا ضرغام الدین فیض آبادی | ۱۰ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری |
| ۱۱ حضرت مولانا عبدالغفور عباسی مدنی | ۱۲ حضرت مولانا احمد علی لاہوری |

- | | | | |
|----|---|----|--------------------------------------|
| ۱۳ | حضرت مولانا مفتی محمد حسن | ۱۴ | حضرت مولانا خیر محمد جالندھری |
| ۱۵ | حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی | ۱۶ | حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا |
| ۱۷ | حضرت مولانا اسعد اللہ رامپوری | ۱۸ | حضرت مولانا عبدالحق اکوڑوی |
| ۱۹ | حضرت مولانا منت اللہ رحمانی | ۲۰ | حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری |
| ۲۱ | حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری | ۲۲ | حضرت مولانا مسیح اللہ خاں جلال آبادی |
| ۲۳ | حضرت مولانا قاری فخر الدین گیاوی | ۲۴ | حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی |
| ۲۵ | حضرت مولانا عبد الجبار معروفی، سابق شیخ الحدیث شاہی مراد آباد | | |
| ۲۸ | حضرت مولانا قاری محمد صدیق | ۲۹ | حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی |

مجاہدین و قائدین ملت

- | | | | |
|----|--|----|--|
| ۱ | امام العصر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی | ۲ | امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی |
| ۳ | حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی | ۴ | حضرت مولانا محمد میاں منصوری انصاری |
| ۵ | حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد دین پوری | ۶ | حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ شاہ جہانپوری |
| ۷ | مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی | ۸ | رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی |
| ۹ | حضرت مولانا محمد صادق کراچی سندھ | ۱۰ | حضرت مولانا سجاد حسین بہاری |
| ۱۱ | حضرت مولانا احمد علی لاہوری | ۱۲ | حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی |
| ۱۳ | حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی | ۱۴ | حضرت مولانا مفتی محمود سابق وزیر سرحد |
| ۱۵ | حضرت مولانا احتشام حسین تھانوی | | |

مناظرین اسلام

- | | | | |
|---|--------------------------------------|----|--------------------------------------|
| ۱ | حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی | ۲ | حضرت مولانا احمد حسن لاہوری |
| ۳ | حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری | ۴ | حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوری |
| ۵ | حضرت مولانا ابوالوفا شاہ جہانپوری | ۶ | حضرت مولانا اسعد اللہ رام پوری |
| ۷ | حضرت مولانا سید ارشاد احمد فیض آبادی | ۸ | حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی |
| ۹ | حضرت مولانا منظور احمد نعمانی | ۱۰ | حضرت مولانا نور محمد ٹانڈوی |

۱۱ حضرت مولانا عبد اللطیف اعظمی

۱۲ حضرت مولانا عبد السلام فاروقی لکھنؤی

۱۳ حضرت مولانا عبد الحلیم

۱۴ حضرت مولانا قاضی محمد مظہر حسین

یہ مختصر فہرست ان مشاہیر کی ہے جن کے فیوض سے ہندوپاک کا گوشہ گوشہ سیراب ہو رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیرون ہند میں بھی ان حضرات کے فیوض جاری ہیں۔ مشاہیر میں بہت سے ذی استعداد افراد ایسے ہیں جو پڑھنے پڑھانے میں تو زیادہ مشہور نہیں ہوئے لیکن اپنی اہلیت اور قابلیت کی بنا پر دوسرے علمی کاموں میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے مثلاً تصنیف، خطابت، طب اور صحافت وغیرہ میں بہت مشہور ہوئے۔ چند افراد کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱ مولانا احسان اللہ صاحب تاجور نجیب آبادی (رحمۃ اللہ علیہ)

سابق پروفیسر دیال سنگھ کالج، لاہور و ایڈیٹر ”ادبی دنیا“ لاہور۔ آپ بہت مشہور صحافی اور ممتاز شاعر تھے۔

۲ مولانا مظہر الدین صاحب بجنوری (رحمۃ اللہ علیہ)

سابق ایڈیٹر ”الامان“ دہلی۔ آپ مشہور مقرر اور صحافی تھے۔ مسلم لیگ کے ممتاز لیڈروں میں سے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں کچھ عرصہ مدرس بھی رہے۔

۳ مولانا شائق احمد صاحب عثمانی (رحمۃ اللہ علیہ)

سابق ایڈیٹر ”عصر جدید“ کلکتہ۔ آپ دیوبند کے ممتاز فاضل اور ذہن و ذکاوت اور علمی استعداد میں اپنے دور میں فرمانے جاتے تھے۔ مگر فراغت کے بعد علمی سلسلہ قائم نہیں رہا۔ بلکہ اخباری دنیا میں آکر اسی میں منہمک رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستانی قومیت اختیار کر لی۔

۴ مولانا حبیب الرحمن صاحب بجنوری (رحمۃ اللہ علیہ) سابق ایڈیٹر ”منصور و نجات“ بجنور

۵ مولانا حکیم جمیل الدین صاحب بجنوری (رحمۃ اللہ علیہ)

آپ مشہور طبیب تھے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے استاذ تھے۔ (اضافہ) مشاہیر کی یہ فہرست حضرت مولانا عبد الحق صاحب۔ پیشکار دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند کی مرتب کردہ ہے۔

مصارف پر ایک نظر

۱۲۸۳ھ سے ۱۳۹۶ھ تک ۱۱۴ سال کی مدت میں دارالعلوم دیوبند کے مجموعی مصارف

کی میزان ۶۲ء ۸۲۱۰۸۳۳ روپے ہے، اور اس مدت میں فضلاء دارالعلوم دیوبند کی مجموعی تعداد ۱۱۵۲۴ ہے، اگر ان مصارف کو فضلاء دارالعلوم دیوبند تقسیم کیا جائے تو فی نفر ۲۴۵۸ روپے ۴۲ پیسے اخراجات ہوئے۔ یہ ۸ سالہ نصاب تعلیم کے مصارف ہیں، یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ فضلاء دارالعلوم دیوبند کی اس تعداد (۱۱۵۲۴) میں وہ طلباء شامل نہیں ہیں جنہوں نے دورہ حدیث سے پہلے اپنی تعلیم چھوڑ دی یا وہ دورہ حدیث کے سالانہ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے، یا جنہوں نے مختص قرآن شریف ناظرہ پڑھا، یا حفظ کیا، یا جنہوں نے صرف جدید ادب عربی، درجہ فارسی، درجہ تجوید، درجہ اردو، دینیات، جامعہ طبیبہ، درجہ خوش نویسی اور دارالصنائع وغیرہ درجات سے فراغت حاصل کی اگر ان سب کو بھی شامل کیا جائے جن کی تعداد کم و بیش فضلاء دارالعلوم دیوبند ہی کی تعداد کے برابر ہے اور دارالعلوم کے کم و بیش مصارف بہر حال ان پر بھی ہوئے ہیں تو مذکورہ بالا اخراجات کا اوسط فی نفر ہزار بارہ سو روپے سے زیادہ نہ ہوگا، اس رقم میں طالب علم کے کھانے کپڑے، رہنے سہنے، نقد و طائف کے اخراجات اور طلباء کیلئے صحت و صفائی اور روشنی وغیرہ کے انتظامات شامل ہیں، اس کے علاوہ تعمیرات کے مجموعی مصارف (۲۳۷۰۲۳ روپے) اساتذہ اور کارکنوں کے مشاہرے، طلباء کے لئے کتابوں کی فراہمی اور کتابوں کی جلد بندی وغیرہ کے علاوہ دوسرے متفرق اخراجات بھی اسی میں شامل ہیں، تو یہ اوسط مصارف اور بھی کم ہو جاتا ہے جسے بلا مبالغہ بانی دارالعلوم دیوبند کی للہیت، خلوص نیت اور کرامت ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے مصارف کی یہ رقم اس قدر کم ہے جس پر مشاہدے کے بغیر یقین کرنا مشکل ہے، اتنی اربوں اور کفایت شعارانہ تعلیم مدارس دینیہ کے علاوہ کہیں اور نہ مل سکتی گی، مدارس دینیہ کی یہ خصوصیت بلاشبہ بہت بڑا کارنامہ ہے، اس خصوصیت میں دارالعلوم دیوبند نے جس حیرت انگیز کفایت شعاری، فقیرانہ زندگی اور سادہ معاشرت کیساتھ جس اعلیٰ ترین دینی تعلیم کا انتظام کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے!

چنانچہ ایک مرتبہ صوبہ متحدہ (موجودہ اتر پردیش) کے گورنر سرجان اسٹریچی کے سکریٹری جان پامر نے دارالعلوم دیوبند کی اعلیٰ تعلیم کو دیکھ کر کہا تھا کہ :-

”جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں صرف چند روپے میں ہو رہا ہے، مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی۔“

بلکہ اگر کوئی غیر مسلم بھی یہاں تعلیم پائے تو نفع سے خالی نہ رہے۔“
آج کل دارالعلوم دیوبند کا سالانہ بجٹ تقریباً پانچ کروڑ اور چار ہزار کوئٹل غلہ ہے۔

چند واردین و زائرین کے اسماء گرامی

علامہ سید رضا مصری رحمۃ اللہ علیہ

نواب محمد اسماعیل خاں میرٹھ

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

سلیمان یوسف ملان ڈر بن

ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند

ضیاء الاسلام مجسٹریٹ کاندھلہ

فخر الدین علی احمد رحمۃ اللہ علیہ صدر جمہوریہ ہند

جولیس جرنیس بوڈاپسٹ یونیورسٹی ہنگری

جے، ڈی، لاٹوش لیفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ

ایم، آئی، شاہ کیو چن صدر چینی

مولانا فتح محمد لکھنوی

پروفیسر گرے ونٹ اکسفورڈ یونیورسٹی

مولانا انوار اللہ خاں حیدر آباد

نواب بہادر یار جنگ، حیدر آباد

رشید احمد ٹکولیا جنوبی افریقہ

ایس ای ملاں جنوبی افریقہ

مسیح الملک حکیم اجمل خاں

مسلم مشن جامعہ ازہر

سید ضمیر الدین چیف سکریٹری

مولانا شوکت علی

نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن خاں شروانی

نواب لطیف یار جنگ بہادر حیدر آباد

شاہ افغانستان محمد طاہر شاہ

بشواتھ مکرجی

محمد عثمان کیدو نمائندہ چینی فیڈریشن

سی، ایل ماتھر ہندوستان ٹامبر

ڈاکٹر احمد جلال الدین، لاہور

سالوجی، جنوبی افریقہ

نیاز برکیز، ترکی

شیخ سعد حجازی

ڈاکٹر چچی، جی ہار، ڈی، لندن یونیورسٹی

جے، ڈی، اینڈرسن لندن یونیورسٹی

سردار نجیب اللہ خاں سفیر افغانستان

پروفیسر ہمایوں کبیر

ایم، اے امین ڈپٹی ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو

محمد یوسٹ فرانس ساؤتھ افریقہ

شیخ عبدالفتاح مصر

باسد یوسنگہ، رجسٹرار اتر پردیش

علی امیر مغرناظم نشریات فارسی دہلی ریڈیو

جگدیش سہائے جسٹس الہ آباد

عبدالفتاح ابوالمنہ

عبدالستار امین متحدہ عرب جمہوریہ

عبد اللطیف وزیر عدل و صحت حکومت برما
انور السادات، صدر مصر
علی اصغر حکمت سفیر ایران
اجیت پرشاد جین، گورنر کیرالہ
ابراہیم تحلیل، افغانستان
عمر ابوریشہ سفیر مملکت شام
انس یوسف یسین سفیر سعودی عرب
عیسیٰ سراج الدین سفیر مملکت مصر
یوسف السید ہاشم رفاعی
بی، گوپالاریڈی، گورنر یوپی
ولیم، آر، راف، پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی امریکہ
حکیم عبد الحمید، متولی ہمدرد و خانہ دہلی
ناظم عمومی رابطہ عالم اسلام مکہ مکرمہ
ڈاکٹر محمد اسحاق، پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی
سوئس دان، مغربی جرمنی
ڈاکٹر محمد یو جل، استنبول
وفد رابطہ علماء عراق، بغداد
اچاریہ ونوبابھاوے
خان عبد الغفار خاں پشاور
قتیل شفقانی لاہور
جمیل جالبی کراچی
امام کعبہ مکہ مکرمہ

الشنکاوی
عبد اللہ عمر نصیف سعودی عربیہ
ایچ، اے حمید، امریکہ
شیخ محمد الحکیم مفتی حلب (شام)
تاں سری حاجی عبد الخالق، ہائی کمشنر ملیشیا
شیخ عبد الحکیم محمود، شیخ الازہر
علی عبید محمد غزالی، متحدہ امارت
شیخ محمد الفام، شیخ الازہر
عبد المنعم عبد الستار، قطر
جگرٹ اے، جیمس، دہرہ دون
فتحی عبد الحمید، تنظیم آزادی فلسطین
راجہ مہندر پرتاپ سنگھ
مقبول عبد الکافی مدرسہ تحفیظ القرآن مکہ مکرمہ
اکبر علی خاں، گورنر اتر پردیش
عبد الخالق ہمدانی، جموں و کشمیر گورنمنٹ
مولانا ظفر علی خاں، ایڈیٹر اخبار
”زمیندار“ لاہور
ایم حسن وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی
قاری عبد الباسط مصر
علی سردار جعفری
مفتی اعظم ترکستان
امام بیت المقدس

ترانہ دارالعلوم

از حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند

یہ علم و ہنر کا گہوارہ، تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے
خود ساقی کوثر نے رکھی، میخانے کی بنیاد یہاں
جو وادی فاراں سے اٹھی گونجی ہے وہی تکبیر یہاں
کہسار یہاں سجاتے ہیں طوفان یہاں ک جلاتے ہیں
یہ چمن چمن ہے برکھارت، ہر موسم ہے برسات یہاں
اسلام کے اس مرکز سے ہوئی تقدیس عیاں آزادی کی
جو شمع یقین روشن ہے یہاں وہ شمع حرم کا پرتو ہے
یہ مجلس سے وہ مجلس ہے خود فطرت جسکی قاسم ہے
عابد کے یقین سے روشن ہے سادات کا سچا صاف عمل
یہ ایک صنم خانہ ہے جہاں محمود بہت تیار ہوئے
ہے عزم حسین احمد سے بپا ہنگامہ گیر و دار یہاں
رومی کی غزل، رازی کی نظر، غزالی کی تلقین یہاں
اس بزم جنوں کے دیوانے ہر راسے پہنچے یزداں تک
سوار سنوارا ہے ہم نے، اس ملک کے گیسوئے برہم کو
جو صبح ازل میں گونجی تھی، فطرت کی وہی آواز ہیں ہم
بلبل کی دعا جب گلشن میں فطرت کی زباں ہو جاتی ہے
امداد و رشید و اشرف کا یہ قلم عرناں پھیلے گا
خورشید یہ دین احمد کا، عالم کے افق پر چمکے گا
یہ نور ہمیشہ چمکا ہے، یہ نور برابر چمکے گا

یوں سینہ گیتی پر روشن، اسلاف کا یہ کردار رہے

آنکھوں میں رہیں انوار حرم سینہ میں دل بیدار رہے

حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

فہرست

- آبادی ۱۲۲
- نانوتہ میں صدیقی خاندان کے جدِ اعلیٰ اور ان کا عہد ۱۲۲
- ابتدائی نسب، صحیح نام ۱۲۳
- سنہ پیدائش ۱۲۳
- ابتدائی تعلیم ۱۲۵
- متوسطات کے اہم استاد اور دوسرے اساتذہ ۱۲۵
- اس علاقہ کا دینی علمی ماحول اور اس پر مفتی الہی بخشؒ کے اثرات ۱۲۶
- مولانا سید محمد قلندر اور مفتی الہی بخشؒ سے متوسطات و ادب کی تعلیم ۱۲۸
- اعلیٰ تعلیم کے لئے دہلی کا سفر ۱۳۳
- حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تبرک کیلئے ایک سبق ۱۳۴
- مولانا رشید الدین خانؒ سے تلمذ ۱۳۴
- مولانا رشید الدین کی شفقت اور نظرِ عنایت ۱۳۵
- دہلی کالج کی ملازمت ۱۳۵
- دہلی کالج کے قیام کا مقصد اور اس کی ابتدائی حیثیت ۱۳۶
- مولانا مملوک العلی کا ابتدائی منصب اور ترقی ۱۳۶
- تنخواہ ۱۳۷
- مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس یا صدر امین کی ملازمت پر مولانا کے لئے اسپرنگر کی کوشش ۱۳۸
- مدرسہ دارالبقاء سے وابستگی کی بے اصل روایت ۱۳۹
- کالج سے فارغ اوقات میں اسباق اور طلبہ کا ہجوم اور ہر وقت کی سخت مصروفیت ۱۴۱

۱۲۳	سفر حج
۱۲۴	مولانا کی سفر حج اور مولانا محمد قاسم کے
۱۲۴	تعلیم کے لئے دہلی آنے کی معروف تاریخ صحیح نہیں
۱۲۵	یادداشت سفر حج، واقع بتاریخ بست ششم رجب ۱۲۵۹ھ
۱۲۵	از مقام دہلی یعنی روانگی از قبل سارسیدن
۱۲۵	علمی آثار و باقیات
۱۲۶	ترجمہ اردو سنن ترمذی
۱۲۶	تصحیح و حاشیہ تاریخ یحییٰ
۱۲۶	کتاب المختار فی الاخبار والآثار
۱۲۶	ترجمہ تحریر اقلیدس
۱۲۷	نتیجہ تحریر
۱۲۷	ایک نام تمام تالیف حاشیہ حماسہ
۱۲۷	مکتوبات
۱۲۸	شاگرد
۱۲۹	وفات اور مدفن

حضرت مولانا مملوک العلّی نانوتوی

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

نانوتہ مغربی یوپی کے مشہور ضلع سہارنپور کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی پرانی تاریخ اور (دو تین مشائخ کے علاوہ) قدیم اصحاب علم کے احوال تقریباً مفقود ہیں اور جو تاریخ معلوم ہے اس میں کسی بڑے تاریخی واقعہ اور آثار و عمارت کا ذکر نہیں۔

آبادی

کہا جاتا ہے کہ یہ بستی نانوتام کے ایک گوجر، یارا جپوت نے آباد کی تھی اسی کی نسبت سے اس کو نانوتہ کہا جاتا ہے۔ اس بستی کی آبادی پرلے دور میں بھی بہت زیادہ نہیں تھی مگر جس قدر تھی پر رونق تھی، مکانات آباد تھے، مگر جب یہاں سے نہر (جمن شرقی) نکلی اس وقت سے نانوتہ کی آب و ہوا خراب ہو گئی تھی اس لئے قصبہ کے بہت سے باشندے یہاں سے ترک وطن کر گئے جس کی وجہ سے بڑی بڑی حویلیاں ویران پڑی رہ گئیں قصبہ کی آبادی بہت کم ہو گئی تھی (۱) نانوتہ کے دو خاندان کو اللہ تعالیٰ نے خاص عنایات سے نوازا اور ان کو دینی خدمات کا موقع نصیب کیا۔ جب مغلوں کے اقتدار کا آفتاب نصف النہار پر تھا اس وقت قصبہ کے خاندان سادات کو عروج بخشا گیا اور جب مغل حکومت کا دم واپس تھا ان دنوں صدیقی خاندان پر بہار آئی۔ نانوتہ کے صدیقی خاندان کی ایک شاخ وہ تھی جو مولوی شیخ محمد ہاشم کی اولاد میں ہے۔

نانوتہ میں صدیقی خاندان کے جدِ اعلیٰ اور ان کا عہد

نانوتہ میں اس خاندان کی آمد اور قیام کا عہد نویں صدی ہجری کا آخری یا دسویں صدی ہجری کا ابتدائی دور ہے۔ نانوتہ میں اس خاندان کے جو بزرگ سب سے پہلے تشریف لائے وہ

(۱) حالات مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ از مولانا یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ ص ۳ (بہاولپور: ۱۳۹۷ھ) نیز جغرافیہ ضلع سہارنپور ص ۲۲

قاضی میراں عرف قاضی بڑے تھے، قاضی میراں کے والد قاضی مظہر الدین جن کا سلسلہ نسب سینتیس واسطوں سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے جو سمرقند کے رہنے والے تھے اور سلطان بہلول لودھی کے زمانہ حکومت میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے، قاضی مظہر الدین کو جہان آباد (کٹرہ مانک پور) کا قاضی مقرر کیا گیا، قاضی صاحب کا جہاں آباد میں قیام رہا، وہیں وفات ہوئی۔ (۱)

قاضی صاحب کے کئی فرزند تھے، جس میں سے ایک قاضی میراں عرف قاضی بڑے تھے، قاضی میراں کو با اختیار حاکم اور قاضی بنا کر نانوتہ بھیجا گیا، اس علاقہ میں ڈاکوؤں اور باغیوں کی سرکشی اور لوٹ مار کی وجہ سے بے اطمینانی اور بد انتظامی کا دور دورہ تھا، قاضی میراں نے جرأت و ہوش مندی سے کام لے کر ان کی جتھہ بندی اور جنگی قوت کو ختم کر کے علاقہ میں امن و امان قائم کیا، جو حکومت کی خوشنودی کا سبب ہوا۔ قاضی میراں کی رجب ۹۰۲ھ (مارچ ۱۷۹۷ء) میں تقریباً ستانوے سال کی عمر میں وفات ہوئی۔ (۲)

قاضی میراں کے عہد سے آج تک یہ خاندان نانوتہ میں مقیم ہے اس خاندان میں اللہ تعالیٰ نے بہت وسعت و برکت عطا فرمائی اور اس کی کئی شاخیں ہو گئیں، بعد کی نسلیں ان ہی شاخوں یا خاندان کے خاندان شخصیات کی نسبت سے مشہور ہوئیں، ایسی ہی ایک شاخ وہ ہے جس کو شیخ محمد ہاشم کی اولاد یا خاندان کہا جاتا ہے۔

مولانا محمد ہاشم عہد شاہجہاں کے علماء میں تھے اور مفتی محمود صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کے الفاظ میں ”علم و معرفت کے ایک جلیل القدر شیخ ہوئے“ (۳)

مولوی محمد ہاشم کی اولاد کو بھی اللہ تعالیٰ نے خدمت دین کی غیر معمولی توفیق سے سرفراز کیا، اس خانوادہ میں علم و عمل کی ایک نورانی زنجیر نظر آتی ہے جس کا خاندانی نسب نامے سے کچھ اندازہ ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ اس کی تمام کڑیاں پورے طور پر واضح نہیں ہیں، لیکن چند صاحبان کے نام کے ساتھ مولوی اور مفتی (۴) کا لاحقہ بتا رہا ہے کہ اس خانوادہ میں علم کی روایت اور عمل کی شاخ قدیم زمانہ سے پر بہار تھی ضروری نہیں کہ یہ شاخ ہمیشہ ثمر بار رہی ہو، تاہم قدیم اثرات کسی نہ کسی

(۱) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (بیاض یعقوبی) تمہید از امیر احمد شرقی (برادرزادہ مولانا یعقوب) (طبع اول تھانہ بھون ۱۹۲۹ء)

(۲) نسب نامہ (صدیقیان نانوتہ) مرتبہ مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی رحمہ اللہ، ص ۴ (طبع اول دہلی: غالباً ۱۳۷۹ھ)

(۳) نسب نامہ، ص ۴ (۴) اوپر کے واسطوں اور تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو نسب نامہ (صدیقیان نانوتہ) ص ۶، ۵ اور

تمہید بیاض یعقوبی از امیر احمد شرقی ص ۲ (طبع اول تھانہ بھون ۱۹۲۹ء)

صورت میں باقی رہے۔ آخری دور میں مولوی محمد ہاشم کی اولاد کی پانچویں نسل میں حکیم غلام شریف تھے۔ ان کے بیٹے مولوی احمد علی، مولوی احمد علی کو اللہ تعالیٰ نے ایک بلند مرتبہ اور عالی قدر فرزند عطا فرمایا جس کا مملوک العلّی نام رکھا گیا، یہ مملوک العلّی جو زمانہ طالب علمی سے خود کو مملوک العلماء لکھا کرتے تھے، بعد میں مملوک العلماء، استاد جہاں، اور پیشوائے عصر ہوئے ان کی ذات سے برصغیر کی علمی محفلوں میں وسیع روشنی اور ایسا چراغاں ہوا کہ اس کی روشنی آج تک نور افزائے نظر اور راہ نمائے منزل بنی ہوئی ہے۔ اور مولانا کی جلالتی ہوئی شمعوں کی روشنی میں علم و دین کے قافلے ان راہوں پر سفر طے کر رہے ہیں اور اس شاہ راہ پر کاروان فکر و فن بے تکلف رواں دواں ہے۔

ابتدائی نسب

مولانا مملوک العلّی کا سلسلہ نسب شیخ محمد ہاشم تک اس طرح ہے :-
 ”مولانا مملوک العلّی، بن مولوی احمد علی، بن حکیم غلام مشرف، بن حکیم عبد اللہ
 بن شیخ ابوالفتح، بن شیخ محمد مفتی، بن شیخ عبد السمیع، بن مولوی محمد ہاشم“ (۱)

صحیح نام

مولانا کا صحیح نام مملوک العلّی ہے، جو مولانا کی مہر اور اکثر دستخطوں میں درج ہے۔ چند تحریروں میں مملوک علی بھی ہے مگر جن تحریروں میں مملوک علی ہے ان کا زمانہ کتابت تحریک حضرت سید احمد شہید سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔

سنہ پیدائش

مولانا مملوک العلّی کی تاریخ ولادت کی کوئی معاصر قریب العہد معتبر تحریری شہادت دستیاب نہیں، مگر کریم الدین پانی پتی نے جو مولانا کا شادگر اور ہر وقت مولانا کی خدمت میں حاضر رہنے والا ہے ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں مولانا کی عمر کا اندازہ ساٹھ سال کا کیا ہے۔ (۲) اگر یہ اندازہ صحیح ہے تو مولانا کا سنہ ولادت ۱۲۰۳ھ ہو گیا لیکن خاندانی روایت یہ ہے کہ مولانا ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء)

(۱) اوپر کے واسطوں اور تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو نسب نامہ (صدیق بیان نانوتہ) ص ۶۵ اور تمہید بیاض یعقوبی از امیر احمد عشرتی ص ۲ (طبع اول تھانہ بھون ۱۹۲۹ء)

(۲) طبقات شعرائے ہند ص ۲۶۳ (نکس طبع اول ۱۸۴۷ء۔ لکھنؤ ۱۹۸۳ء) یہ تذکرہ ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں مرتب ہوا

میں تولد ہوئے (۱) اگرچہ اس کی تحقیق و تصدیق کا بھی کوئی ذریعہ ہمدست نہیں، تاہم کریم الدین کی روایت سے متاخر اطلاع کی ضمناً تصدیق و تائید ہو رہی ہے اس لئے ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) کو مولانا کا سنہ ولادت سمجھنا چاہئے۔

ابتدائی تعلیم

مولانا کی ابتدائی تعلیم کے متعلق معلومات کا فقدان ہے، مگر مولانا کے خانوادہ میں متعدد علماء اور طبیب موجود تھے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی ابتدائی تعلیم خاندان کے بڑوں اور اہل علم کی نگرانی میں ہوئی ہوگی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا کی ابتدائی تعلیم و تربیت (حضرت مفتی الہی بخش رحمۃ اللہ علیہ کے نانوتوی شاگردوں) مولانا عبد الرحمن (۲) یا مولانا عبد الرحیم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (۳) کے سپرد کی گئی ہو۔

متوسطات کے اہم استاد اور دوسرے اساتذہ

مولانا پر لکھنے والے بیشتر اہل قلم کا خیال یہ ہے کہ مولانا وطن سے براہ راست دہلی گئے تھے اور مولانا نے اکثر تعلیم مولانا رشید الدین خاں سے حاصل کی ہے اور مولانا کا مولانا رشید الدین خاں کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر استاذ نہیں، مگر (شہرت عام کے باوجود) یہ خیال درست نہیں حقیقت یہ ہے کہ مولانا مملوک العلی نے پہلے اپنے وطن کے نواح میں متعدد علماء سے درسیات کی مختلف کتابوں اور مضامین کی تعلیم حاصل کی اور متوسطات کی تکمیل کے بعد دہلی گئے۔

متوسطات کی تعلیم جن علماء سے حاصل کی ان میں سے دو علماء (خاص طور سے اس خطہ کی تیرہویں صدی ہجری کی تاریخ میں) بہت نمایاں اور ممتاز ہیں، حضرت مفتی الہی بخش رحمۃ اللہ علیہ

(۱) مکتوب مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (بنام مولانا انوار الحسن شیر کوٹی) انوار قاسمی رحمۃ اللہ علیہ، ص ۸۴، ج ۱، لاہور (۱۹۸۹ء) اور سیرت یعقوب و مملوک، ص ۲۶ (کراچی: ۱۳۸۴ھ) ہر دو از مؤلفات مولانا شیر کوٹی

(۲) مولانا عبد الرحمن کے حالات دریافت نہیں مگر بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے تھانہ بھون میں ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں شہادت پائی اور کہا جاتا ہے کہ تھانہ بھون میں حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ میں جو دوسری قبر ہے وہ مولانا ہی کی ہے مگر نسب نامہ (صدیقیان نانوتی) میں لکھا ہے کہ یہ قبر عبد اللہ خلف غلام محمد نانوتوی کی ہے۔ نسب نامہ ص ۹

(۳) مولانا عبد الرحیم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بھی مفقود ہیں، مگر حضرت مفتی الہی بخش رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں ان کا نام شامل ہے، ملاحظہ ہو حالات مفتی الہی بخش رحمۃ اللہ علیہ (ضمیمہ اختتام مثنوی مولانا روم، ص ۸۸) (محمود المطابع: کانپور: ۱۳۲۲ھ) حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عبد الرحیم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے حصن حصین اور شرح فقہ اکبر پڑھی تھی، شام امدادیہ اور امداد المشتاق ص ۷ (دہلی: ۱۹۸۱ء)

کاندھلوی اور مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی رحمہ اللہ۔ اور یہ بات متعدد تحریرات و شواہد سے ثابت ہے کہ مولانا مملوک العلی ان دونوں علماء سے تلمذ و تعلیم کے بعد ہی دہلی آئے تھے۔ دہلی کے متعدد علماء سے تعلیم کیلئے وقت حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز سے ایک سبق تبرکاً پڑھنے کی سعادت میسر آئی، معروف عالم مولانا عبداللہ خاں علوی رحمہ اللہ سے تلمذ کی بھی ایک اطلاع ہے۔ بعد میں درسیات کی اعلیٰ کتابیں مولانا رشید الدین خاں رحمہ اللہ کی مجالس درس میں مکمل کیں، اس اجمال کی کسی قدر تفصیل درج ذیل ہے۔

اس علاقہ کا دینی علمی ماحول اور اس پر مفتی الہی بخش کے اثرات

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے فیض صحبت سے اس خطہ کی علمی دنیا میں ایک نئی زندگی، نئی حرارت اور خوشی و مسرت کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی تھی، یہاں پہلے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کرام نے پھر حضرت شاہ عبدالعزیز کے بلند مرتبہ شاگردوں نے جگہ جگہ علم کی شمعیں روشن کیں اور دین و دیانت کے چراغ جلانے، جو حضرات اس خدمت میں پیش پیش تھے، اس میں ایک بہت اہم اور ناقابل فراموش نام مفتی الہی بخش کاندھلوی رحمہ اللہ کا ہے۔

مفتی صاحب رحمہ اللہ نے اپنے استاد گرامی مرتبت (حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ) کے طریقہ خدمت دین اور تعلیم و تدریس میں پوری زندگی صرف کی۔ مفتی صاحب تعلیم سے فراغت کے بعد سے وفات تک جہاں رہے ہمہ وقت درس و تعلیم، اصلاح و تربیت، وعظ و تلقین، تصنیف و تالیف، اور مختلف حیثیتوں سے دینی علمی خدمات میں مشغول رہے، جس میں تقریباً آدھا وقت اپنے علاقہ کی دینی رہنمائی اور یہاں دین و علم کی آبیاری میں صرف کیا۔

مفتی صاحب رحمہ اللہ کے تبحر علمی، تعلیمی، تدریسی، اصلاحی خدمات اور علمی عملی بلکہ ہر پہلو سے حضرت شاہ عبدالعزیز کی کامل و مکمل نمائندگی کا اور برصغیر ہند میں تعلیمات حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی اشاعت و توسیع اور اس خانوادہ کے کام کو بھرپور طریقے سے آگے بڑھانے میں حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے جن شاگردوں کی خدمات اور کارناموں کا اکثر مورخین اور تذکرہ نگاروں نے بلند آہنگ سے تذکرہ و اعتراف کیا ہے۔ ان میں حضرت مفتی الہی بخش رحمہ اللہ کا نام سرفہرست ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حلقہ تربیت کے اجل علماء اور اساتذہ کبار کے عنوان کے تحت سب سے پہلے مفتی صاحب رحمہ اللہ کا ذکر کیا ہے، جس

سے مذکورہ بالا سطور کی پوری تائید ہوتی ہے مولانا تحریر فرماتے ہیں:-

”حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کے درس و تربیت و صحبت سے جن علماء نے فائدہ اٹھایا پھر اپنا حلقہ درس قائم کر کے سارے ہندوستان میں نام پیدا کیا اور دینی نظام تعلیم میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی پھر خود ان کے درس کے فیض سے کثیر التعداد جید علماء تیار ہو کر نکلے ان میں سے چند کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں، جو اپنی قوت و ملکہ تدریس، منقول و معقول کی جامعیت اور تبحر علمی میں مشہور و مسلم تھے اور جو اپنی اپنی جگہ خود ایک مدرسہ اور دبستان تھے (۱)

مولانا نے اس کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے چھ شاگردوں کے نام لکے ہیں، جن میں سب سے پہلا نام مفتی صاحب کا ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے فیض صحبت سے بھی ایسے پچاسوں علماء نکلے جنہوں نے اپنے استادوں کے طریقہ کو نمونہ حیات بنایا اور ان کی بھی پوری زندگی پڑھنے پڑھانے اور طلبہ کی تعلیم و تربیت میں گزری، ان حضرات کے حلقہ ہائے درس بھی معمولی نہیں تھے، یہاں بھی بلند پایہ علماء، اہل نظر مصنفین اور مایہ ناز محدثین و مدرسین تیار ہوئے اور ان کا فیض دور دور تک پہنچا اور عام ہوا۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ کے اس قسم کے متعدد شاگرد سہارنپور، نانوتہ، تھانہ بھون، جلال آباد، لوہاری، کیرانہ وغیرہ (یعنی ان اطراف کی اکثر بستیوں) میں موجود تھے، جس میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ایک دائرہ علم اور سرچشمہ اصلاح و تربیت تھا، مولانا مملوک العلی کے وطن نانوتہ میں بھی مفتی صاحب رحمہ اللہ کے کم از کم دو شاگرد (مولانا عبدالرحیم رحمہ اللہ اور مولانا عبدالرحمن رحمہ اللہ) موجود تھے، ان کا اوپر تذکرہ آچکا ہے یہ دونوں بھی درس و تدریس اور افادہ میں مشغول رہتے تھے۔

مذکورہ اشارات سے واضح ہے کہ موجودہ مغربی یوپی خصوصاً دہلی کے شمال میں بارہویں صدی ہجری کے اواخر اور تیرہویں صدی کے پہلے ساٹھ ستر برس (یا جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک احیاء دین کی جدوجہد، اتباع سنت کے ذوق، علمی بیداری اور دینی تعلیمی ترقی میں سب سے بڑا اور اہم ترین حصہ مفتی الہی بخش رحمہ اللہ اور مفتی صاحب رحمہ اللہ کے شاگردوں کا ہے۔ اس عہد کی جو علمی روایات و مآخذ موجود ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ کے علماء

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہم ص ۳۸۱، ۳۸۲ جلد پنجم (تاجنہ ۱۳۱۴ھ)

اہل ذوق اور اصحاب سلوک و معرفت حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ اور ان کے شاگردوں سے وابستگی اور استفادہ کو فخر اور اعزاز سمجھتے تھے، مولانا مملوک الاعلیٰ کی حضرت مفتی صاحب اور ان کے شاگردوں کی خدمت میں حاضری اسی روایت کا تسلسل اور اپنے اکابر اور وطن کے مشائخ و علماء کی عملی پیروی کی ایک مثال تھی، اس لئے مولانا مملوک الاعلیٰ بھی (غالباً) پہلے مولانا سید محمد قلندر کی خدمت میں حاضر ہوئے اسکے بعد مفتی صاحب رحمہ اللہ سے براہ راست استفادہ کیا۔

مولانا سید محمد قلندر اور حضرت مفتی الہی بخشؒ سے متوسطات و ادب کی تعلیم

اگرچہ مولانا عبد الرحیم نانوتوی رحمہ اللہ سے مولانا مملوک الاعلیٰ رحمہ اللہ کے تلمذ کی کوئی روایت و اطلاع نہیں، تاہم قرین قیاس ہے کہ مولانا مملوک الاعلیٰ رحمہ اللہ نے مولانا سے ابتدائی استفادہ کیا ہو، مگر یہ بات ثابت ہے کہ مولانا مملوک الاعلیٰ رحمہ اللہ تعلیم حاصل کرنے کیلئے نانوتہ سے براہ راست دہلی نہیں گئے تھے، بلکہ مولانا نے اولاً کئی سال تک حضرت مفتی الہی بخشؒ اور مولانا محمد قلندر جلال آبادی (۱) سے تعلیم حاصل کی، اور دونوں حضرات کی مجالس درس سے خاصے استفادہ اور متوسطات کی تکمیل کے بعد تعلیم کے آخری دور میں دہلی گئے تھے۔

مولانا مملوک الاعلیٰ رحمہ اللہ نے پہلے مولانا سید محمد قلندر رحمہ اللہ سے پڑھایا مفتی صاحب رحمہ اللہ سے، اور کس وقت کس کی خدمت میں رہے، اس کی تفصیل بھی معلوم نہیں، مگر جب نواح کے بڑے علماء سے تلمذ و تعلیم کی بات آئی ہوگی تو بظاہر سب سے پہلے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ

(۱) مولانا سید محمد قلندر خلف سید محمد رضا: مولانا کے آبائی وطن اور خاندان کی تفصیلات دریافت نہیں، صرف یہ معلوم ہے کہ جب نواب نجیب الدولہ کی معارف پروری اور علماء کی عزت افزائی کی وجہ سے نجیب آباد مرکز علماء بنا ہوا تھا، اور دور دور سے علمی خاندان یہاں آکر بس رہے تھے اس وقت مولانا سید محمد قلندر کا گھرانہ (غالباً) ان کے والد ماجد نجیب آباد آئے تھے مفتی الہی بخش کے نواب ضابطہ خاں کے دور ملازمت میں مولانا محمد قلندر مفتی صاحب کے دامن تعلیم و تربیت سے وابستہ ہوئے شروع سے آخر تک تمام درسیات اور مثنوی مولانا روم کی ظاہری و باطنی تعلیم حضرت مفتی صاحب سے حاصل کی، تمام علوم و کمالات اور عشق نبوی میں اپنے استاد کا عکس اور مثنیٰ تھے، مولانا عبد الحلیم انصاری نے لکھا ہے۔

”یہ بزرگ بڑے پایہ کے عالم تھے حضور رسول مقبول ﷺ کے ساتھ ان کو نسبت حضوری حاصل تھی، خواب میں زبارت سے مشرف ہوتے تھے اپنے علاقہ میں نہایت صاحب کشف و کرامت مانے جاتے تھے، علم و فضل کے ساتھ تقویٰ، نیکی اور پرہیزگاری میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔“

تذکرہ رحمانیہ، تالیف مولانا عبد الحلیم انصاری، ص ۵۳ (پانی پت ۱۳۵۷ھ)

مولانا محمد قلندر کی پوری زندگی درس و تعلیم میں گزری، حضرت مولانا کا درس حدیث اس نواح کا اہم ترین حلقہ درس حدیث تھا جس سے بے شمار علماء اور اہل توفیق نے فائدہ اٹھایا۔ مولانا محمد قلندر کے مفصل حالات معلوم نہیں۔ (باقی صفحہ ۹ پر)

سے رجوع کیا ہو گا حضرت مفتی صاحب کثرت درس و افادہ کی وجہ سے سخت مصروف رہتے تھے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مملوک الاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا سید محمد قلندر کے حوالہ کیا ہو یا ممکن ہے کوئی اور وجہ اور ترتیب بنی ہو، بہر حال قرآن سے یہ تاثر ملتا ہے کہ پہلے مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی سے تعلیم حاصل کی بعد میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان علماء سے تلمذ کی ترتیب اس سے مختلف بھی ہو سکتی ہے مگر دونوں حضرات سے استفادہ یکے بعد دیگرے ہوا ہے۔

ان علماء کرام سے تعلیم کی تفصیلات کا علم نہیں مگر یہ ضرور معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا محمد قلندر سے معقولات اور حدیث شریف کی چند کتابیں پڑھیں۔ اسی طرح حضرت مفتی الہی بخش رحمۃ اللہ علیہ (۱) سے تلمذ و استفادے کی تفصیلات بھی مفقود ہیں، مگر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بیاضوں میں مولانا مملوک الاعلیٰ کے قلم سے جو تحریریں یا اقتباسات منقول ہیں وہ عربی ادب کے متعلق ہیں، جس کی

(۱) حضرت مولانا مفتی الہی بخش نشاط کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، خلف مولانا محمد شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی، متوسطات سے منتہیانہ کتابوں تک حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں اور اکثر اسباق میں حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے رفیق درس رہے۔ تعلیم کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد پر نواب ضابطہ خاں کی ریاست سے بحیثیت قاضی وابستہ ہوئے، اور ضابطہ خاں کی وفات ۱۲۰۰ھ ۱۷۸۵ء تک اسی عہدہ پر فائز رہے اس کے بعد مختلف مقامات پر قیام رہا اور ہر جگہ فقہ و افتاء، درس و تعلیم، اصلاح و تربیت اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اس عہد کی دینی فقہی، علمی، اصلاحی، تربیتی تاریخ میں بلند مرتبہ ہے، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فیض تربیت سے سینکڑوں علماء اور بے شمار کامل افراد اٹھے اور شمال مغربی ہندوستان میں بے پناہ عمومی دینی فائدہ اور فیض عام ہوا۔ اور ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ تک مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حلقہ درس جاری رہا۔ جس سے بہت بڑی تعداد میں طلبہ نے فیض حاصل کیا اور مولانا عبدالحی حسنی نے لکھا ہے: واخذ عنہ خلق لا يحصون بعدد عدان سے بے حد و بے شمار لوگوں نے تعلیم حاصل کی۔ (ثقافت الاسلامیہ فی الہند ص ۳۱۱) (دمشق ۱۳۷۷ھ) (باقی صفحہ ۱۰ پر)

صفحہ آٹھ کا باقی :-

مولانا کی ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۳ء میں وفات ہوئی۔ مفتی الہی بخش کے فرزند مولانا ابوالحسن کاندھلوی نے قطعہ تاریخ کہا تھا جس کے پہلے مصرعہ سے مولانا قلندر کے کمالات کا کچھ اشارہ ملتا ہے۔

وہ تھا مرد حقانی و حق پرست

بہت فیض دیں اس سے عالم کو تھا

مولانا محمد قلندر کے شاگردوں میں مولانا مملوک الاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مولانا قاضی عبدالرحمن پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا غوث علی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ برصغیر کی دینی اور علمی تاریخ کے مہر و مادہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ کرام ضمیمہ امداد المشتاق حضرت مولانا تھانوی (دہلی: ۱۹۸۱ء)

وجہ سے یہ خیال بے محل نہ ہوگا کہ مولانا مملوک العلّی نے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ سے اور علوم کے علاوہ عربی ادب میں خاص استفادہ کیا۔ یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ مولانا مملوک العلّی کا اصل امتیاز عربی ادب میں مہارت ہے، تمام تذکرہ نگاران کے اس کمال کے مداح و معترف ہیں، دہلی کالج میں بھی مولانا کی یہی خصوصیت معروف تھی اور اس میں مولانا کا مفتی صاحب رحمہ اللہ سے استفادہ کی خود مولانا کی تحریریں گواہ ہیں۔

مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی رحمہ اللہ (تحریک سید احمد شہید سے پہلے مولانا کا نام قلندر بخش بھی لکھا جاتا تھا) سے مولانا مملوک العلّی رحمہ اللہ کے تلمذ کا مولانا عاشق الہی میرٹھی رحمہ اللہ نے تذکرۃ الرشید (مؤلفہ ۱۳۲۶ھ) میں اشارۃً ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

”نیز سنا ہے کہ آپ نے معقول کا کچھ حصہ مولانا قلندر بخش سے بھی پڑھا ہے۔“ (۱)

اس روایت کی وضاحت اور تائید مولانا احمد اللہ کیرانوی رحمہ اللہ کی ایک روایت سے ہوتی ہے مولانا (اپنے استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کے حوالہ سے) نقل کرتے تھے کہ

”مولانا مملوک العلّی رحمہ اللہ نے حدیث کی چند کتابیں مولانا محمد قلندر رحمہ اللہ

سے پڑھی تھیں۔“ (۲)

مولانا احمد اللہ کیرانوی رحمہ اللہ کی اس روایت کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مولانا مملوک العلّی نے معقولات اور حدیث کی کچھ کتابیں مولانا سید محمد قلندر سے پڑھیں اور مولانا مملوک العلّی رحمہ اللہ کے مفتی الہی بخش رحمہ اللہ سے تلمذ کی رہنمائی اور تصدیق مولانا مملوک العلّی رحمہ اللہ کے قلم سے لکھی ہوئی ان متعدد تحریروں سے ہو رہی ہے۔ جو حضرت مفتی الہی بخش رحمہ اللہ کی بیاضوں میں درج

(۱) تذکرۃ الرشید ص ۲۷ (حاشیہ) جلد اول (۲) حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمہ اللہ کے اساتذہ ضمیمہ امداد المشتاق (دہلی: ۱۹۸۱ء)

(باقی صفحہ ۹۶) مفتی صاحب رحمہ اللہ کے اہم ترین تلامذہ میں سے چند ممتاز اور مشہور علماء یہ ہیں: مولانا مرزا حسن علی (صفیر) محدث لکھنؤی، مولانا وجیہ الدین صدیقی سہارنپوری رحمہ اللہ، مولانا عبد الرزاق جھنجھانوی رحمہ اللہ، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمہ اللہ، مولانا مغیث الدین سہارنپوری رحمہ اللہ، مولانا محمد حسن رامپوری رحمہ اللہ، مولانا عبد الرحیم نانوتوی رحمہ اللہ، مولانا مظہر حسین کاندھلوی رحمہ اللہ۔

مفتی صاحب رحمہ اللہ کی عربی فارسی اردو اور ہندی میں اس وقت تک ایک سو چوبیس تصانیف انتخاب اور ترجموں کا علم ہے امید ہے کہ اس تعداد میں ابھی اور خاصا اضافہ متوقع ہے۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ کی تصانیف میں سب سے اہم اور مشہور ترین علمی، روحانی، ادبی، شعری کارنامہ مثنوی مولانا روم کے چھپنے و فتر کا اختتام ہے، جس کی وجہ سے مفتی صاحب رحمہ اللہ خاتم مثنوی مولانا روم سے یاد کئے جاتے ہیں۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ شعر و سخن کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ شعراء کے متعدد اردو فارسی تذکروں میں مفتی صاحب کا اونچے اظہار میں ذکر ہے اور مفتی صاحب رحمہ اللہ کی شعر گوئی، سخن منی اور کمال فن کی توصیف کی گئی ہے۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ نے ۱۵ جمادی الاخرہ ۱۳۳۵ھ، ۱۳ اکتوبر ۱۸۴۹ء کو کاندھلوی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

ہیں۔ چونکہ مولانا مملوک العلّیٰ کے حضرت مفتی الہی بخش رحمہ اللہ سے تلمذ کا پہلی مرتبہ مولانا مملوک العلّیٰ کے حالات میں ذکر کیا جا رہا ہے، اس لئے اس کی کسی قدر تفصیل ضروری ہے۔ مفتی صاحب رحمہ اللہ کی بیاضوں میں مولانا مملوک العلّیٰ کے قلم سے متعدد اقتباسات و منتخبات درج ہیں اور یہ تحریریں مجموعی طور پر تین قسم کی ہیں۔

۱ وہ تحریریں جن پر مولانا مملوک العلّیٰ کے واضح دستخط ہیں۔

۲ وہ تحریریں کہ ان پر مولانا مملوک العلّیٰ کے دستخط تو نہیں مگر وہ چند خاص اشارات جو مولانا مملوک العلّیٰ کی تحریروں کو اور تحریروں سے ممتاز کرتے ہیں، وہ ان تحریروں یا اقتباسات میں موجود ہیں، جس کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب تحریریں بھی مولانا مملوک العلّیٰ کے قلم سے ہیں۔

۳ چند تحریریں ایسی بھی ہیں جن کے ابتدائی یا آخری صفحات ضائع ہو گئے ہیں لیکن قرائن اور طرز تحریر سے وہ مولانا مملوک العلّیٰ کی یادگار معلوم ہو رہی ہیں، ہر قسم کی کئی تحریریں بفضلہ تعالیٰ ہمارے ذہن میں موجود ہیں:-

۱ پہلی قسم کی تحریروں میں نختہ الیمن اور طیف الخیال (تالیف محمد مومن شیرازی متوفی ۱۱۱۸ھ) کے اقتباس اور منتخبات ہیں نختہ الیمن کے اقتباس کے اختتام پر لکھا ہے:

”راقم مملوک العلّیٰ..... نقل من نختہ الیمن“

اور طیف الخیال کے آخر میں یہ الفاظ درج ہیں:

”تمت تمام شد..... نوشته مملوک الطباء مملوک علی“

۲ وہ تحریریں جن پر ایسے کلمات و اشارات لکھے ہوئے ہیں جو مولانا مملوک العلّیٰ کی تحریرات کی ایک پہچان اور گویا امتیاز ہیں یہ کلمات و اشارات کئی طرح کے ہیں:-

الف:- مولانا کی نقل کی ہوئی کتابوں میں سب سے پہلے صفحہ کی پیشانی پر سب سے اوپر ایک درود شریف لکھا ہوا ہوتا ہے جس کے خاص الفاظ یہ ہیں:-

”اللهم صل علی محمد و علی آل محمد، وبارک و سلم“

ب:- دوسری سطر میں یا فتاح

ج:- تیسری سطر میں۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا ہوتا ہے۔

د:- اس کے بعد کتاب کا متن اور مضمون شروع ہوتا ہے پھر یہ کتاب اور نقل اگر متعدد صفحات

پر مشتمل ہے تو مذکورہ بالا درود شریف پہلے صفحہ کے علاوہ اور بھی دو تین جگہ (پہلے صفحہ کی طرح) اس صفحہ کی پیشانی پر درج ہوگا۔

کتاب کے آخر میں ”تمت هذه القصيدة“ یا تمت بعون الملك الوهاب لکھتے ہیں۔

مؤخر الذکر عبارت لکھنے کا بھی ایک خاص انداز ہے۔
 { الملك الوهاب
 هذه القصيدة بعونه
 تمت }

مفتی صاحب کی بیاض میں اس قسم کی کئی تحریریں ہیں کہ ان پر اگرچہ مولانا مملوک کے دستخط نہیں مگر درج بالا تمام اشارات موجود ہیں اس لئے (بلا تامل) کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب مولانا کے قلم سے ہیں (۱)

۳ وہ تحریریں کہ ان پر نہ مولانا کے دستخط ہیں، نہ مذکورہ عبارتیں اور فقرے تحریر ہیں مگر ان کا قلم اور انداز تحریر ایسا ہی ہے۔ جو مولانا مملوک العلی ؒ کی مذکورہ بالا محقق تحریروں کا ہے، مولانا کے لکھے ہوئے مذکورہ بالا صفحات اور یہ تحریریں سامنے رکھ کر دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی شخص اور ایک ہی قلم کی لکھی ہوئی ہیں، اس لئے ان تحریروں کو بھی مولانا مملوک العلی ؒ کی باقیات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

ان سب تحریروں کے مفتی الہی بخش ؒ کے بیاضوں میں موجود ہونے کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد و مفہوم نہیں ہو سکتا کہ مولانا مملوک العلی ؒ حضرت مفتی صاحب کے معتمد شاگردوں اور زمرہ تلامذہ و خدام خاص میں شامل تھے۔

اکثر علماء اور مدرسین کا معمول رہا ہے اور اب تک بھی ہے کہ وہ اپنے خاص شاگردوں کی تربیت و مشق کے لئے ان سے مختلف چھوٹے بڑے علمی تحریری کام لیتے رہتے ہیں، قلمی مضامین و رسائل اور اقتباسات، فتاویٰ وغیرہ کی نقل کرانا، لکھوانا، جس کو یہ شاگرد (عموماً) اپنے لئے سعادت اور ترقی کا زینہ سمجھ کر بہت شوق اور دلچسپی سے کرتے ہیں، اسی طرح مفتی صاحب کی بیاضوں میں بھی مفتی صاحب ؒ کے متعدد و ممتاز شاگردوں کے قلم سے پچاسوں اقتباسات و فتاویٰ وغیرہ نقل ہیں، ایسے اقتباسات و افادات میں مولانا مملوک العلی ؒ کی تحریروں کی موجودگی

(۱) یہ تمام بیاض اور افادات و تحریرات ہمارے ذخیرے میں موجود ہیں۔

سے صاف واضح ہے کہ مولانا مملوک الاعلیٰ رحمہ اللہ بھی مفتی صاحب رحمہ اللہ کے معتمد شاگردوں اور خادموں میں شامل تھے اور مولانا نے مفتی صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں خاصا وقت گزارا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کیلئے دہلی کا سفر

مولانا مملوک الاعلیٰ رحمہ اللہ نے مولانا سید محمد قلندر رحمہ اللہ اور مفتی الہی بخش رحمہ اللہ سے استفادہ کے بعد دہلی کے اکابر علماء اور ان کے علوم و فنون سے سیرابی کیلئے دہلی کا سفر کیا، یہ سفر کب ہو اس کی صراحت نہیں ملی مگر مولانا شروع ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۵ء میں دہلی میں موجود تھے، مولانا نے صفر ۱۲۳۰ھ / جنوری فروری ۱۸۱۵ء میں سب سے تعلقات اور اس پر روزنی کا حاشیہ نقل کیا تھا۔ یہ حاشیہ دہلی میں لکھا گیا تھا، ترقیمہ کاتب میں تحریر ہے:-

مولانا مملوک الاعلیٰ رحمہ اللہ کے دہلی کے سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ:-

۱۷۹۲ء جو مولوی عبدالحق صاحب کی تحقیق کی رو سے اس کالج کے قیام

کا سن ہے، اس وقت مولانا مملوک الاعلیٰ صاحب رحمہ اللہ کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی اس لئے یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ دلی پہنچ کر مولانا رشید الدین خاں کے حلقہ درس میں مولانا مملوک الاعلیٰ اسی زمانہ میں شریک ہوئے جب کالج میں مولانا رشید الدین خاں کام کر رہے تھے“ (۱)

(الف) مولوی عبدالحق نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ دہلی کالج ۱۷۹۲ء-۱۲۰۶ھ میں قائم ہوا تھا، یہ سنہ مدرسہ غازی الدین کی تعمیر کا ہے، (۲) یہی مولوی عبدالحق نے بھی لکھا ہے (۳) دہلی کالج کی ابتدا ۱۸۲۵ء ۱۲۴۰ھ میں ہوئی تھی اور مولانا رشید الدین خاں اس کے مدرسہ اول مقرر ہوئے۔

(ب) اور یہ بھی صحیح نہیں کہ مولانا رشید الدین رحمہ اللہ نے مدرسہ غازی الدین میں پڑھایا ہے اور وہاں استاد رہے ہیں، مدرسہ غازی الدین کے آخری سال ۱۲۳۹ھ ۱۸۲۴ء میں اس مدرسہ میں صرف نو طالب علم پڑھتے تھے، مولانا عبد اللہ (ان کا تعارف نہیں ملتا) ان کو پڑھاتے تھے، (۴) اس لئے مولانا گیلانی کی یہ اطلاع صحیح نہیں۔

(۱) سوانح قاسمی، مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ، ص ۱۰۱ (طبع اول: دیوبند: ۱۳۷۳)

(۲) ملاحظہ ہو آثار الصنادید، سرسید احمد، ص ۷۳، باب سوم (طبع اول: دہلی: ۱۸۴۷)

(۳) مرحوم دہلی کالج، مولوی عبدالحق، ص ۶، ص ۷۳ (دہلی: ۱۹۴۵ء) (۴) مرحوم دہلی کالج، ص ۳ (دہلی: ۱۹۴۵ء)

(ج) نیز مولانا کے اس قول سے بھی اتفاق ممکن نہیں کہ مولانا مملوک علی صرف پانچ سال کی عمر میں دہلی پڑھنے کیلئے چلے گئے تھے۔ اس زمانہ میں اس عمر کے بچے مکتب میں بھی مشکل سے داخل کئے جاتے تھے، ان کے اپنی بستی کے باہر جانے کا تو تصور بھی نہیں تھا اور جب اس عمر کے بچے مکتب میں بھی نہ داخل کئے جاتے ہوں، اس وقت مولانا مملوک اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کچھ پڑھ کر، یا بلا پڑھے دہلی آگئے ہوں اور ان کا دہلی کے اعلیٰ ترین علمی حلقوں میں رسوخ ہو گیا ہو اور وہ مولانا رشید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہو گئے ہوں۔ کسی پہلو سے بھی درست اور قابل قبول نہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے تبرک کیلئے ایک سبق

مولانا مملوک اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی میں کئی علماء اور مدرسین سے پڑھنا چاہا مگر مولانا جس عالم سے بھی پڑھنے جاتے وہ ایک دو سبق پڑھانے کے بعد مزید تعلیم سے منع کر دیتے تھے، مولانا مملوک اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ اس غیر متوقع کیفیت سے پریشان تھے۔ پریشانی میں (علماء ہند کے امیر و سربراہ) حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے دعا اور توجہ کی درخواست کی، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کل آنا! دوسرے دن جب گئے اس وقت حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہدایۃ النخو کا ایک سبق پڑھلایا اور فرمایا:

”جاؤ اب جس استاذ سے پڑھو گے وہ پڑھانے سے انکار نہ کرے گا“ (۱)

مولانا رشید الدین خانؒ سے تلمذ

غالباً حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کے بعد مولانا رشید الدین رحمۃ اللہ علیہ (۲) سے رجوع کیا ہوگا، مولانا نے اس خدمت کو منظور فرمایا، مولانا مملوک اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ، مولانا کے تلامذہ میں شامل ہو گئے اور اعلیٰ درسیات مولانا رشید الدین سے اخذ کیں۔

(۱) ارواح شائشہ (بحوالہ روایات الطیب) ص ۱۸۹، ۱۹۰ مگر روایات الطیب (مرویات امیر شاہ خورجوی) مرتبہ مولانا قاری محمد طیب صاحب (تاج المعارف: دیوبند، ۱۹۵۳ء) میں یہ روایت موجود نہیں۔

(۲) مولانا رشید الدین رحمۃ اللہ علیہ خلف مولانا امین الدین کشمیری دہلوی، دہلی میں تقریباً سو سال سے مقیم کشمیری خاندان کے رکن تھے، دہلی میں پیدا ہوئے مفتی علی کبیر بنارسی، مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ سے آکر تعلیم حاصل کی شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالعزیز سے بھی بھرپور استفادہ کیا، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ مولانا اپنے خاص مستفیدین میں شمار فرماتے تھے۔ معقولات و منقولات میں پایہ کے عالم متقدم و ادیب تھے، پوری زندگی درس و افتادہ اور تحریر و تصنیف میں مشغول رہے۔ (باقی صفحہ ۱۵ پر)

مولانا رشید الدین کی شفقت اور نظر عنایت

مولانا مملوک الاعلیٰ، مولانا رشید الدین خاں کے عزیز ترین شاگرد تھے، مولانا مملوک الاعلیٰ کے تعلیم پوری ہونے کے بعد بھی مولانا رشید الدین خاں رحمۃ اللہ علیہ سے نیازمندانہ روابط ہمیشہ قائم رہے، مولانا کو بھی اپنے شاگرد کی خاطر عزیز تھی وہ مولانا مملوک الاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائشوں کے پورا کرنے کا اہتمام فرماتے اور مولانا کا خاص خیال رکھتے تھے، کریم الدین پانی پتی کی اطلاع ہے کہ مولانا رشید الدین خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اہم کتاب ”صولت غصنفریہ“ مولانا مملوک الاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر لکھی تھی، (۱) اور جب دہلی کالج قائم ہوا اور اس میں مدرس اول کے عہدہ پر مولانا رشید الدین رحمۃ اللہ علیہ کا تقرر کیا گیا۔ اس وقت بھی مولانا رشید الدین رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مملوک الاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کو یاد رکھا اور مدرس دوم کے عہدہ کیلئے مولانا مملوک الاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا نام پیش کر کے اس کو منظور کرایا تھا

دہلی کالج کی ملازمت

مولانا مملوک الاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی دہلی میں موجودگی کی قدیم ترین اطلاع ۱۲۳۰ھ، ۱۸۱۵ء کی ہے۔ دہلی کالج اس کے دس سال بعد ۱۲۴۰ھ، ۱۸۲۵ء میں شروع ہوا، مگر یہ معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ (راقم سطور کی دسترس میں) نہیں کہ مولانا مملوک الاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دس سال کا عرصہ کہاں گزارا، کب تعلیم مکمل ہوئی، کب تک دہلی میں رہے کب وطن واپس آئے یا اس دوران وطن اور دہلی کے

(۱) تذکرہ فرائد الدھر، کریم الدین پانی پتی، ص ۴۰۱ (مطبع العلوم، مدرسہ دہلی: ۱۸۳۷ء) مگر فرائد الدھر میں اس کا نام غالباً سہو کتابت سے صولت الضغیم لکھا ہوا ہے، جو صحیح نہیں۔

(باقی صفحہ ۱۴۰ کا) تقریباً بیس فاضلانہ اور اہم کتابیں علمی یادگار ہیں، جن میں سے اکثر شیعیت کے رد میں یا شیعہ علماء کی تصانیف کے جواب میں ہیں۔ مولانا سے بے شمار علماء اور اہل کمال نے استفادہ کیا، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں بھی مولانا کا حلقہ درس معروف اور بعض خصوصیات میں ممتاز تھا۔

آخر میں دہلی کالج کے مدرس اول ہو گئے تھے، مگر اس عہدہ پر دیر تک کام کرنے کا موقع نہیں ملا سخت بیماری کے بعد شروع محرم الحرام ۱۲۴۳ھ جولائی، اگست ۱۸۲۷ء میں وفات ہوئی۔

مولانا کی تاریخ وفات کی ایک اور روایت ۱۲۴۹ھ کی بھی نقل کی جاتی ہے جو صحیح نہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کی ایک (غیر متعارف) بیاض میں مولانا خیر آبادی کا ایک خط نقل ہے جو وسط محرم ۱۲۴۳ھ کا لکھا ہوا ہے اس میں مولانا رشید الدین کی وفات پر تاسف کا اظہار ہے اس لئے ۱۲۴۳ھ ہی صحیح سنہ وفات ہے۔

مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہو، ۱۔ وقائع عبدالقادر خانی (علم و عمل) عبدالقادر چیف رامپوری، ص ۲۴۹ ج اول (کراچی: ۱۹۷۰ء) نزمۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۸۰ نیز تذکرہ فرائد الدھر اور آثار الضادہ۔

علاوہ کہیں اور قیام یا تعلیمی تدریسی مصروفیت تھی کچھ معلوم نہیں، مگر جب دہلی کالج کا (شوال ۱۲۴۰ھ، جون ۱۸۲۵ء میں) افتتاح ہوا اس وقت مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں موجود تھے، کالج کے مدرس مقرر ہوئے اور زندگی کے آخری لمحات تک اس خدمت پر فائز دہلی میں مقیم رہے، وہیں وفات پائی۔

دہلی کالج کے قیام کا مقصد اور اس کی ابتدائی حیثیت

دہلی کالج شمالی ہندوستان میں انگریزوں کا قائم کیا ہوا سب سے پہلا بہت باوقار اور اہم ترین تعلیمی ادارہ تھا۔ اس کی ابتداء کے وقت اس کے مقاصد صاف تھے، اور اس میں انگریزوں کے مذہبی یا سیاسی مفادات کا فرما نظر نہیں آتے تھے، بلکہ اس کا خاص مقصد دہلی اور نواحی علاقوں میں بڑھتے ہوئے تعلیمی زوال کو کم کرنا اور اچھے خاندانوں کے بچوں کو ہر قسم کی تعلیم سے آراستہ کر کے ان کے معاشی اور معاشرتی مرتبہ کو برقرار رکھنا تھا۔ غالباً اسی لئے کالج کی ابتداء ایک مدرسہ کی طرح ہوئی تھی، وہی طور طریقے اور تقریباً ایسا ہی نصاب تعلیم تھا۔ تو وسیع اور ترقی کا سلسلہ آہستہ آہستہ شروع ہوا، مختلف زبانیں اور علوم دہلی کالج کے نصاب تعلیم میں شامل کئے گئے، پڑھانے کیلئے مسلم اور غیر مسلم استادوں کا تقرر ہوا، اور دہلی کالج نے تعلیمی تدریسی راستہ پر تیزی سے قدم بڑھائے اور اس کے اثرات بھی ظاہر ہوئے، لیکن کالج کے نصاب تعلیم میں اسلامی دینی علوم اور عربی فارسی کی اول دن سے جو اہمیت تھی وہ آخر تک بڑی حد تک برقرار رہی جب تک مولانا رشید الدین خاں رحمۃ اللہ علیہ زندہ تھے وہ کالج کے علمی سربراہ رہے، مولانا کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کے کاندھوں پر آگئی تھی، مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ نے پوری زندگی اس کی پاسداری فرمائی اور اس خدمت کو اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ (کریم الدین پانی پتی کے الفاظ میں) ”بناء مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے“ (۱)

مولانا مملوک العلی کا ابتدائی منصب اور ترقی

مولانا کا دہلی کالج کے افتتاح کے وقت شوال ۱۲۴۰ھ (جون ۱۸۲۵ء) میں عربی کے مدرس دوم کے عہدہ پر تقرر ہوا تھا، مولوی سید محمد مدرس سوم تھے، مولانا رشید الدین خاں رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مدرس اول کا عہدہ خالی ہو گیا تھا، ضابطہ کے مطابق مولانا کی وفات کے بعد

اس منصب پر مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کا فوراً تقرر ہونا چاہئے تھا، مگر اس میں بہت دیر بلکہ کئی برس لگ گئے، اور مشکلات کے علاوہ ایک بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ نواب حامد علی خاں نے (جو دہلی کالج کیلئے وقف اعتماد الدولہ لکھنؤ کے متولی تھے) مولوی جعفر علی چار جوی کو (شیعہ دینیات کا) مدرس مقرر کر دیا تھا اور چاہتے تھے کہ چار جوی صاحب کو کالج کا مدرس اول بنادیا جائے، مگر کالج کے ذمہ دار اس کیلئے تیار نہیں تھے، معاملہ تصفیہ کیلئے مولانا مفتی صدر الدین آزرہ کے پاس بھیجا گیا، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کے فضل و کمال کی تعریف کی اور مولانا کے حق میں رائے دی مگر اس پر بھی اتفاق نہ ہوسکا، (۱) اس لئے اس وقت اس عہدہ کو خالی رکھنے کا فیصلہ ہوا، جو کئی سال تک اسی طرح رہا کئی سال کے وقفہ کے بعد ۸ نومبر ۱۸۴۱ء، ۲۳ رمضان ۱۲۵۷م کو مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ مدرس اول نامزد کئے گئے۔

تنخواہ

مولانا کی کالج میں تقرری کے وقت پچاس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی تھی، مدرس اول کے عہدہ پر تقرر کے وقت تک یہی تنخواہ تھی، صدر مدرس مقرر ہونے کے بعد اس میں دس روپے کا معمولی اضافہ کیا گیا، بعد میں کسی وقت اور اضافہ ہو کر تنخواہ سو روپے ماہانہ ہو گئی تھی، جو مدرس اول کی مقررہ تنخواہ تھی، اس اضافہ کی تاریخ معلوم نہیں مگر ۱۸۴۷ء ۱۲۶۳ھ میں مولانا کو ایک سو روپے ماہوار ملتے تھے، کریم الدین پانی پتی نے لکھا ہے:

”مدرس اول مدرسہ دہلی جناب مولوی مملوک العلی مدظلہ عالم بے بدل اور

مفتی بے مثل :- اور فاضل کامل ہیں عہدہ میر مولوی بمشاہرہ سو روپیہ ماہواری

مدرسہ میں مقرر ہیں (۲)“

اس تنخواہ پر کسی اضافہ کی اطلاع نہیں ملتی، اس منصب اور تنخواہ پر مولانا آخر تک کام کرتے رہے اور اسی پر وفات پائی۔

(۱) تذکرہ مولانا محمد حسن نانوتوی، محمد ایوب قادری (از رپورٹ جنرل میجر کراچی، ۱۹۶۶ء، ۱۸۴۱ء) ص ۱۷۳، ۱۷۴

(۲) طبقات شعرائے ہند، ج ۲۳ (لکھنؤ، ۱۹۸۳ء)

مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس یا صدر امین کی

ملازمت پر مولانا کیلئے اسپرنگر کی کوشش

دہلی کالج کا علم دوست پرنسپل اسپرنگر (ALOYS SPRENGER) (۱) جو مولانا کو اچھی طرح جانتا تھا اور مولانا کا قدردان تھا جب اس کا مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل کے عہدہ پر تقرر ہوا تو اس نے چاہا کہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ بھی کلکتہ آجائیں۔

اور مدرسہ عالیہ میں صدر مدرس یا صدر امین کے عہدہ پر کام کریں۔ اسپرنگر نے مولانا کو اطلاع دے اور ان سے اجازت لئے بغیر اس منصب کیلئے مولانا کا نام حکام بالا کو بھیج دیا اور پر سے منظوری کے بعد مولانا کو اس کی اطلاع کی۔ اس لئے مولانا کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اس ملازمت کو منظور کر لیں، مولانا نے اس کو منظور کر لیا، مگر چاہا کہ دہلی کالج سے ان کی ملازمت ختم نہ ہو، بلکہ دو سال کی چھٹی مل جائے، رخصت کی یہ درخواست منظور نہ ہوئی تو مولانا نے ایک سال کی رخصت کی کوشش کی، جب اس میں بھی کامیابی نہ ملی تو مولانا نے کلکتہ کی ملازمت کا خیال ترک کر دیا اور اسپرنگر کو لکھ دیا کہ :

”لہذا سب اہل رائے اور جمیع دوستوں کی عقل میں اس صورت میں کہ

(۱) اسپرنگر (ALOYS SPRENGER) نامور فاضل، محقق مخطوطات اور نادر کتابوں کا شوقین اور پرکھنے والا، تصنیف و اشاعت کا خوگر، فہرست ساز، منتظم اور ہندوستان کے دو بڑے تعلیمی اداروں دہلی کالج اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل تھا۔ اسپرنگر کرسٹوفر کاینا تھا اور آسٹریا کارنے والا تھا ۱۲۲۸ھ ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوا ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی، اس کو شروع سے مشرقیات اور اسلامی کتابوں سے دلچسپی تھی، ۱۸۳۳ء میں ہندوستانی آیا ۱۸۴۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذمہ داروں نے دہلی کالج کا پرنسپل بنا کر دہلی بھیج دیا۔ اسکے دہلی کے علماء اور اہل کمال سے قریبی دوستانہ روابط رہے، مولانا مملوک العلی سے بھی خوب ملاقات اور خط و کتابت تھی۔ ۱۸۴۷ء میں اس کو شاہان اودھ کے علمی ذخائر کی فہرست بنانے کے لئے لکھنؤ بھیجا گیا وہیں مدرسہ عالیہ کے پرنسپل کے عہدہ پر تقرر ہو گیا، اس لئے لکھنؤ سے کلکتہ چلا گیا چند سال بعد مشرق وسطیٰ کی سیاحت پر نکل گیا، وہاں سے واپس آکر ۱۸۵۶ء میں وطن چلا گیا۔

اسپرنگر کی توجہ اور تحقیق سے کئی اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں الاتقان فی علوم القرآن، علامہ سیوطی، الاصابہ فی تمیز الصحابہ، حافظ ابن حجر کشاف اصطلاحات الفنون قاضی محمد اعلیٰ تھانوی جیسی اہم ترین تصانیف بھی شامل ہیں، اس کے علاوہ اس کی انگریزی اور جرمن میں کئی تالیفات ہیں، اس نے خاصی عمر پائی ۱۸۹۳ء (۱۳۱۰ھ) میں اپنے وطن میں فوت ہوا۔

اس نے ہندوستان کے قیام کے زمانہ، میں قلمی کتابوں کا بہت بڑا اور اہم ذخیرہ اکٹھا کر لیا تھا یہ کتابیں اور علماء ہند کے اس کے نام خطوط جرمنی میں محفوظ ہیں۔ مزید معلومات کے لئے : الاعلام زر کل، ص ۸، ج ۲ (بیروت : ۱۹۷۹ء) نیز ایک اور مجموعہ

رخصت ایک سال کی بھی نہ ہو چھوڑنا روزگار مدرسہ دہلی کا واسطے درخواست
عہدہ کلکتہ کے مناسب نہیں اور اغلب ہے کہ آپ کی رائے بھی ان سب کی
رائے کے موافق ہوگی اور احقر کو پس نہ بھیجنے درخواست کے معاف اور معذور
تصور فرمائیں گے“ (۱)

کالج سے چھٹی نہ ملنے کے علاوہ کلکتہ نہ جانے کی غالباً ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ دہلی
کے علماء خصوصاً مفتی صدر الدین آزرہ اور دہلی کالج کے استاد خاص طور سے مولانا کے نائب
مولانا سید محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہیں چاہتے تھے کہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ دہلی چھوڑ کر جائیں۔
مولانا کیلئے ان دوستوں اور علماء کی رائے کی برملا مخالفت دشوار تھی اس لئے بھی مولانا کا ارادہ
کمزور ہو گیا تھا اور کلکتہ کا سفر نہ ہو سکا۔

مدرسہ دارالبقاء سے وابستگی کی بے اصل روایت

مغلوں کے عہد حکومت میں دہلی کے جو دینی مدرسے دینی علمی زندگی اور درس تعلیم کے
لئے مشہور تھے، ان میں سے ایک مدرسہ دارالبقاء بھی تھا، یہ مدرسہ جامع مسجد کے ساتھ شاہ
جہاں نے تعمیر کرایا تھا اور جامع مسجد دہلی کی جنوب سمت میں واقع تھا (۲) مگر بے توجہی کی وجہ
سے اس کی عمارت خراب اور خستہ ہو گئی تھی، مولانا مفتی صدر الدین آزرہ نے اس کی مرمت
اور تجدید کرا کر یہاں تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا، مدرسین ملازم رکھے اور مدرسہ میں رہنے
والے طلبہ کے اخراجات کی ذمہ داری لی (۳) کہا جاتا ہے کہ اس مدرسہ میں مولانا مملوک العلی
رحمۃ اللہ علیہ بھی مدرس رہے ہیں اور اس روایت کا مآخذ مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی اور مولانا
اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دو اقتباسات ہیں، مولانا حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

”وولی التدیس بمدرسة
دارالبقاء، فدرس وافاد مدة
عمره“
ان کو مدرسہ دارالبقاء میں تعلیم کا ذمہ دار بنایا
گیا اور انہوں نے اپنی تمام عمر پڑھانے اور
اپنی ذات سے فائدہ پہنچانے میں گزار دی

(۱) مکتوب مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ، بنام اسپرنگر، مورخہ ۱۹ اگست ۱۸۵۰ء (۹ سوال ۱۲۶۶ھ) مکتوب ۶، ایک نادر مجموعہ۔

مکاتیب مرتبہ محمد اکرام صاحب چغتائی ۷۴

(۲) سید المنازل، مرزا شمس الدین بیگ، ترجمہ و حواشی ڈاکٹر شریف احمد قاسمی، ص ۱۸، ۱۶۲ (دہلی: ۱۹۸۲ء)

(۳) آثار الصنادید، سید احمد، ص ۱۱، ۱۲، باب سوم (نولکشور، لکھنؤ: ۱۳۰۰ھ)

سوانح علمائے دیوبند علیٰ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ ۱۲۰

اور حضرت تھانویؒ کے ملفوظات میں بھی مولانا مملوک العلیؒ کے مدرسہ دارالبقاء میں ملازم ہونے کا مجملہ ذکر آیا ہے، مگر یہ اطلاعات صحیح معلوم نہیں ہوتیں، خود ان دونوں روایتوں میں ایسے اشارات موجود ہیں جن سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس میں مدرسہ دارالبقاء کا نام سہواً آگیا ہے، دونوں صاحبان کا مقصد دلی کالج کا ذکر کرنا تھا۔

الف: مؤلف نزہۃ الخواطر نے اس اطلاع کے لئے حالات مولانا محمد قاسمؒ، مرتبہ مولانا محمد یعقوب کا درج ذیل الفاظ میں حوالہ دیا ہے۔

”کما فی رسالۃ ولدہ یعقوب، جیسا کہ ان (مولانا مملوک العلیؒ) کے بیٹے مولانا محمد یعقوبؒ کے رسالہ (تالیف) میں ہے جو مولانا شیخ محمد قاسمؒ کے حالات میں ہے۔

مگر مولانا محمد یعقوبؒ کے اس رسالہ میں مولانا مملوک العلیؒ کے مدرسہ دارالبقاء سے وابستہ ہونے یا وہاں رہنے کا اشارہ تک نہیں ہے، اس تالیف میں صرف ایک موقع پر مدرسہ دارالبقاء کا ذکر آیا ہے جو مولانا محمد قاسمؒ کے کچھ دنوں مدرسہ دارالبقاء میں رہنے کی اطلاع ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

”(مولانا محمد قاسمؒ) پھر دارالبقاء میں چند روز رہے“ (۲)

اس لئے رسالہ حالات مولانا محمد قاسمؒ کے حوالہ سے نزہۃ الخواطر کی یہ اطلاع صحیح نہیں۔

ب: حضرت مولانا تھانویؒ کے ملفوظات میں ہے:

”مولانا مملوک العلی صاحبؒ دہلی میں دارالبقاء

سرکاری مدرسہ تھا اس میں ملازم تھے“ (۳)

مگر اس عبارت میں مدرسہ دہلی کے الفاظ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت تھانویؒ دراصل دہلی کالج کا ذکر فرمانا چاہتے تھے، اس وقت دہلی میں وہی ایک سرکاری مدرسہ تھا، مدرسہ دارالبقاء نہ سرکاری مدرسہ تھا نہ اس کے انتظام، مدرسین اور اخراجات کا سرکار سے کچھ تعلق تھا۔

(۱) نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی حسنی، رائے بریلوی، ص ۵۰۲، ج ۷ (حیدرآباد: ۱۳۹۹ھ)

(۲) حالات طیب مولانا محمد قاسمؒ، مرتبہ مولانا محمد یعقوبؒ نانوتویؒ، ص ۹ (بھاولپور: ۱۲۹۷ھ)

(۳) (ملفوظات) حسن العزیز، متون خواجہ غلام الحسن، ص ۲۹۹، ج ۱ (تالیفات اشرفیہ قادیان)

نیز جن تذکرہ نگاروں نے مدرسہ دارالبقاء کا تذکرہ کیا، انہوں نے اس مدرسہ کے صرف دو استادوں کا نام لکھا ہے مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کا نام اس میں شامل نہیں، حالانکہ مدرسہ دارالبقاء کا احوال لکھنے والے مدرسہ دارالبقاء، اس کے مدرسین اور مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ سے ذاتی طور پر واقف تھے (۱) اس لئے یہ اطلاع صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ دارالبقاء میں مدرس تھے۔

کالج سے فارغ اوقات میں اسباق

اور طلبہ کا ہجوم اور ہر وقت کی سخت مصروفیت

مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ نے درس اور تعلیم کا سلسلہ کب شروع کیا تھا مولانا کے متعلق اور معلومات کی طرح اس کی بھی صراحت نہیں ملتی، قرین قیاس ہے کہ اس دور کے علماء کے معمول کے مطابق زمانہ طالب علمی میں درس کی ابتداء ہوئی ہوگی، اور تعلیم کے بعد اکثر وقت اسی خدمت میں گذرتا ہوگا، مگر جب سے مولانا دہلی کالج میں استاد مقرر ہوئے اس وقت سے وفات کے دنوں تک چھبیس سال کا طویل عرصہ ہر وقت پڑھانے اور طلبہ کی تربیت اور خدمت میں گزرا۔

مولانا دہلی کالج کے مشرقی شعبہ کے سربراہ تھے، کالج میں اونچی جماعتوں کو ادب، تاریخ اور معقولات کی اعلیٰ ترین کتابیں پڑھاتے تھے، اس کے علاوہ کالج کے تمام علمی تعلیمی امور کی نگرانی مولانا کے سپرد تھی، کالج کے جو اوقات اسباق سے خالی تھے، وہ ان مصروفیات میں گزر جاتے تھے، مگر مولانا کی ذات گرامی مجمع علوم اور مخزن کمالات تھی اس لئے کالج میں داخل طلبہ کے علاوہ اور بھی پچاسوں طالب علم ایسے تھے جو مولانا سے تعلیم اور استفادہ کے لئے دہلی میں رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کو بھی مولانا سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع ملے اور مولانا کی مجلس نصیب ہو، یہ طلبہ بھی کئی طرح کے تھے۔

ان میں سے کچھ اپنے اپنے انتظام سے علیحدہ علیحدہ جگہوں پر رہتے تھے اور دہلی کے اور علماء کے ساتھ مولانا سے بھی پڑھنا چاہتے تھے اور کچھ طلبہ ایسے بھی ہوتے تھے جو صرف مولانا کے زیر تعلیم تھے جن میں متعدد طلبہ کے تمام اخراجات و ضروریات کا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ

انتظام فرماتے تھے اور ان کا قیام بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر یا آس پاس کسی مسجد وغیرہ میں ہوتا تھا، اس لئے مولانا کے مکان پر فجر بلکہ تہجد کے وقت سے رات دیر گئے تک طلبہ کا ہجوم رہتا تھا، اور کریم الدین پانی پتی کے الفاظ میں۔

”ان (مولانا رحمۃ اللہ علیہ) کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ وہ کسی طالب علم کی

خاطر رنجیدہ کریں“ (۱)

مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ ان علماء میں سے تھے، جن کیلئے تعلیم و تدریس اور اپنی صلاحیت اور علم سے دوسرے کو فائدہ پہنچانا معاشی ضرورت یا کسی دنیوی فائدہ کیلئے نہیں تھا بلکہ حق تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب اور آخرت میں ترقی درجات کا ذریعہ، اور ایک مقصد حیات تھا اس لئے مولانا کے کالج کے تھکا دینے والی مصروفیات سے فارغ تمام اوقات بھی درس و افادہ میں گذرتے تھے، اسباق کی کثرت اور طلبہ کے ہجوم کی وجہ سے مولانا کو دن رات میں ایک لمحہ بھی فرصت اور آرام کا میسر نہیں ہوتا تھا اور ”تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلبہ میں نصف شب تک منقسم تھے“ (۲)

طبقات شعرائے ہند میں لکھا ہے:

”اسی لئے رات دن سوا مدرسہ کے ان کے گھر طلبہ پڑے رہتے ہیں ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی سے نکار نہیں کر سکتے سب کو پڑھاتے ہیں تمام شب اور دن میں شاید دو پہر رات کو آرام کرنا ان کو نصیب ہوتا ہو گا والا رات دن درس دہی طلباء میں گذرتا ہے“ (۳)

دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی مصروفیت کا حال اس سے بھی کچھ بڑھ کر تھا جو کریم الدین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے، یہاں تک کہ جب مولانا گھر سے دہلی کالج جاتے تھے۔ (مولانا کا گھر کوچہ چیلان میں تھا اور دہلی کالج کشمیری دروازہ پر) کیا وہاں سے فارغ ہو کر گھر آتے تھے، اس وقت بھی طلبہ ساتھ ہوتے، اور مولانا کی پالکی کا پایہ پکڑ کر ساتھ ساتھ دوڑتے اور سبق پڑھتے جاتے تھے۔ پوری زندگی یہی معمول رہا کہ کالج کے وقت کالج

(۱) تذکرہ فرائد الدھر، ص ۴۰۳ (دہلی: ۱۸۳۷ء) (۲) تذکرہ فرائد الدھر، ص ۴۰۳ (دہلی: ۱۸۳۷ء)

(۳) طبقات شعرائے ہند، ص ۶۴

میں اور کالج سے فارغ وقت گھر پر 'راستوں میں' ہر جگہ طلبہ کی تربیت اور علمی رہنمائی فرماتے رہتے تھے، اور یہ ایک دو دن کی بات نہیں تھی بلکہ دہلی میں قیام کے چھبیس سال اسی جہد و عمل اور درس و مصروفیت میں بسر ہوئے۔

سفر حج

مولانا دہلی کالج میں مدرس تھے کہ دہلی بلکہ ہندوستان بھر کے اس وقت کے سب سے بڑے عالم اور علماء کے مرجع و مقتدی حضرت شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ و شاہ محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان سے ہجرت کا ارادہ فرمالیا، اور ذیقعدہ ۱۲۵۸ھ (دسمبر ۱۸۴۲ء) میں دہلی سے ہجرت کے سفر پر روانہ ہو گئے، ان بزرگوں کے جانے سے برصغیر کے علمی دینی ماحول پر ایک اندھیرا سا چھا گیا تھا، متعدد علماء حضرات شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت کیلئے بے چین ہو گئے، کچھ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گئے اور کچھ نے بعد میں سفر کا ارادہ کیا، مولانا مملوک اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ مؤخر الذکر اصحاب میں شامل تھے، شاہ صاحبان کی روانگی کے تقریباً نو مہینے بعد مولانا مملوک اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے سفر حرمین کے لئے رخت سفر باندھا اور ۲۶ رجب ۱۲۵۹ھ، ۲۴ اگست ۱۸۴۳ء میں دہلی سے روانہ ہو گئے، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ (جو مولانا کے شاگردوں کی طرح تھے) اس سفر میں مولانا کے ساتھ تھے۔ مولانا مملوک اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مبارک سفر اندازہ سے پہلے مکمل ہو گیا، مولانا رجب ۱۲۶۰ھ میں دہلی واپس آ گئے تھے جو اس زمانہ کی سفر کی مشکلات اور ذرائع سفر کمیاب ہونے کی وجہ سے ایک غیر معمولی واقعہ سمجھا گیا، اور اس پر مولانا کے دوستوں کو حیرت ہوئی مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ :-

”اس وقت یہ سفر جلد طے ہونے میں عجیب تھا“ (۱)

سفر حج سے واپسی کے وقت کالج سے (ایک سال کی) رخصت کا وقت ختم ہو رہا تھا، اس لئے مولانا حج کے بعد واپسی پر سیدھے دہلی آ گئے تھے۔ وطن (نانوتہ) نہیں گئے تھے، جب ذی الحجہ ۱۲۶۰ھ (دسمبر ۱۸۴۴ء) میں کالج کی چھٹی ہوئی، اس وقت سفر حج کے بعد پہلی مرتبہ نانوتہ گئے اور محرم الحرام ۱۲۶۱ھ (جنوری، فروری ۱۸۴۵ء) میں نانوتہ سے دہلی واپس آئے۔

مولانا کا یہ سفر اگرچہ معمول کا سفر حج تھا، مگر اس سفر کی تاریخ سے برصغیر ہند و پاکستان میں ملت اسلامیہ کے دینی احیاء اور نشاۃ ثانیہ کی ایک تاریخ وابستہ ہے اس لئے اس کی تاریخ اور

سوانح علمائے دیوبند ۱۴۴ حضرت مولانا مملوک الاعلیٰ نانوتوی

سند کی صحیح واقفیت ضروری ہے مگر اس کا سنہ عموماً غلط نقل کیا جاتا ہے اس لئے اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

مولانا کے سفر حج اور مولانا محمد قاسم کے تعلیم کیلئے دہلی آنے کی معروف تاریخ صحیح نہیں

شاہ محمد اسحاق کے سفر حج کی صحیح تاریخ جو مومن خاں مومن (۱) اللہ ظہور (شاگرد مفتی صدر الدین آزرہ) اور احسن اللہ کے قطعات تاریخ سے معلوم ہو رہی ہے۔ ذیقعدہ ۱۲۵۸ھ ہے، یہی شاہ محمد اسحاق کے خاص شاگرد نواب قطب الدین نے احکام العیدین کی تمہید میں لکھا ہے (۲) مگر یہ پتہ نہیں کہ کس طرح متعدد مورخین اور اہل قلم کے یہاں ۱۲۵۶ھ یا ۱۲۵۷ھ نقل ہو گیا ہے، سرسید احمد نے ۱۲۵۶ھ (۳) اور مولانا محمد یعقوب نے ۱۲۵۷ھ لکھا ہے (۴) بعد کے اکثر لکھنے والوں نے ان دونوں کی نقل کی ہے ۱۲۵۸ھ زیادہ مشہور ہے، مگر یہ دونوں اطلاعات قطعاً غلط اور بے بنیاد ہیں اسی غلط فہمی کی وجہ سے حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ کے (مولانا مملوک الاعلیٰ رحمہ اللہ کے ساتھ) نانوتہ سے دہلی تعلیم کیلئے آنے کا سن ۱۲۶۹ھ نقل کیا جاتا ہے وہ بھی درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نے ذیقعدہ ۱۲۵۸ھ میں دہلی سے سفر ہجرت شروع کیا، ۲۶/ رجب ۱۲۵۹ھ (۲۴/ اگست ۱۸۴۳ء) کو مولانا مملوک الاعلیٰ رحمہ اللہ دہلی سے حج کیلئے روانہ ہوئے، رجب ۱۲۶۰ھ (اگست ۱۸۴۴ء) میں دہلی واپس آئے اور ذی الحجہ ۱۲۶۰ھ (دسمبر ۱۸۴۴ء) کی تعطیلات میں حج کے بعد پہلی مرتبہ نانوتہ گئے، اس رخصت سے واپسی کے بعد ماہ محرم الحرام ۱۲۶۱ھ (جنوری، فروری ۱۸۴۵ء) میں مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ مولانا مملوک الاعلیٰ رحمہ اللہ کے ہمراہ دہلی آئے تھے۔

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمہ اللہ اس زمانہ میں حضرت شاہ محمد اسحاق سے حدیث پڑھ

(۱) یہ قطعہ تاریخ جو چھ اشعار پر مشتمل ہے مومن کے فارسی دیوان میں شامل ہے، ص ۳۱ (مطبوع سلطانی دہلی: ۱۲۷۱ھ) یہ دیوان نہایت نادر بلکہ معدوم ہے اس کا ایک نسخہ ہمارے دینی کتب خانے میں موجود ہے۔

(۲) احکام العیدین، ص ۴ (نولکشور، لکھنؤ: ۱۲۹۰ھ) احسان اللہ ظہور اور خواجہ احسن اللہ کے قطعات تاریخ بھی نواب صاحب نے نقل کئے ہیں۔

(۳) آثار الصنادید، سرسید احمد، ص ۵۹ باب چہارم (تذکرہ شاہ محمد اسحاق نولکشور، لکھنؤ: ۱۹۰۰ء)

(۴) حالات مولانا محمد قاسم۔ حاشیہ، ص ۶ (بجاول پور: ۱۲۹۷ھ)

رہے تھے، وہ اسباق حدیث کی تکمیل و اعادہ کیلئے مکہ معظمہ گئے تھے، اور اس سفر میں مولانا مملوک اعلیٰ کے ساتھ گئے تھے مولانا احمد علی کے بیاض میں اس سفر کے موقع پر موجود سامان اور اخراجات وغیرہ کی تفصیل ایک سے زائد موقعوں پر لکھی ہے، سب سے پہلا اندراج ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

”یادداشت سفر حج، واقع بتاریخ بست شرم رجب ۱۲۵۹ھ

از مقام دہلی یعنی روانگی از فیل تار سیدن.....“

مولانا احمد علی کے ایک تحریر میں اس کی بھی صراحت ہے کہ اس سفر میں مولانا مملوک اعلیٰ کی بھی رفاقت حاصل ہے لکھا ہے۔

”فہرست کتب کہ رفتن بسمت مغرب بمعیت مولوی مملوک اعلیٰ صاحب“

بتاریخ بست شرم رجب، یوم پنجشنبہ ۱۲۵۹ھ در..... در احمد علی بودند (۱)

ان تصریحات کے بعد مولانا مملوک اعلیٰ کے سفر حج کیلئے روانگی کی تاریخ اور سنہ میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا اس لئے مذکورہ واقعات کی ہی تاریخیں صحیح ہیں جو اوپر درج کی گئیں ہیں۔ اور ان واقعات کے تذکرہ میں یہی سنہ اور تاریخیں لکھی جانی چاہئیں۔

۱۔ علمی آثار و باقیات

اوپر گذر گیا ہے کہ مولانا بے حد مصروف رہتے تھے اور ان کے دن رات کا کوئی حصہ درس اور تعلیم دینے سے فارغ نہیں تھا۔ فرصت عنقا تھی، تحریر و تصنیف کیلئے جس یکسوئی اور اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے اس کا کوئی موقع میسر نہیں تھا، اس لئے مولانا کی علمی تحریری باقیات بہت کم ہیں۔ تحقیق و تصنیف، حواشی اور تراجم پر مشتمل صرف چھ کتابیں یادگار ہیں:-

سب سے بڑی اور اہم ترین دینی علمی خدمت سنن ترمذی کے متن اور حواشی کی تصحیح اور نظر ثانی ہے، سنن ترمذی کا یہ نسخہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے مرتب کیا تھا، مولانا مملوک اعلیٰ نے مولانا کی درخواست پر اس کی مکمل تصحیح و نظر ثانی فرمائی، یہ نسخہ مطبع اشرف العلوم اور مطبع احمدی دہلی سے سنہ ۱۲۶۵ھ (جنوری ۱۸۴۹ء) میں شائع ہوا۔ (۲)

۲۔ ترجمہ اردو سنن ترمذی

دہلی کالج کی ترجمہ کمیٹی نے جن کتابوں کے ترجمہ کا منصوبہ بنایا تھا ان میں سنن ترمذی کا اردو ترجمہ بھی شامل تھا۔ یہ خدمت مولانا مملوک العلّی کے سپرد ہوئی، اور مولانا نے اس کو سر انجام فرمایا، مولوی عبدالحق نے اس ترجمہ کا ذکر کیا ہے (۱) مگر اس کا کوئی قلمی نسخہ دریافت نہیں اور اس کی طباعت کی بھی اطلاع نہیں ملتی، بہ ظاہر ترجمہ شائع نہیں ہوا اور اس کا قلمی نسخہ دہلی کالج کی ۱۸۵۷ء کی تباہی میں جل گیا۔

۳۔ تصحیح و حاشیہ تاریخ یمنی

تاریخ یمنی ابو محضر محمد بن عبد الجبار عتیبی (وفات ۴۲۷ھ ۱۰۳۶ء) کی سلطان محمود غزنوی (وفات ۴۲۱ھ) کے حالات کے پر ایک معاصر اور معروف تصنیف ہے۔ یہ کتاب دہلی کے دینی علمی حلقوں میں پسند کی جاتی تھی اور دہلی کالج کے نصاب میں بھی شامل تھی، کالج کے طلباء کی آسانی کیلئے مولانا مملوک العلّی نے اس کے متن کے تصحیح کی، حل لغات کیا، اور مختصر حاشیہ لکھا، یہ قیمتی کتاب تالیف کے فوراً بعد مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کے پریس مطبع العلوم سے رمضان المبارک ۱۲۶۳ھ اگست ۱۸۴۷ء میں چھپی (اس کا ایک عمدہ نسخہ راقم سطور کے سامنے ہے)

۴۔ کتاب المختار فی الاخبار والآثار

یہ کتاب راقم سطور کی نظر سے نہیں گذری، محمد اکرام چغتائی صاحب نے مولانا کی تالیفات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ کتاب المختار، مروج الذهب مسعودی کی تلخیص ہے اس کام میں دہلی کالج کے پرنسپل اسپرنگر کی بھی شرکت رہی ہے۔ المختار فی الاخبار والآثار چغتائی صاحب کی اطلاع کے مطابق ۱۸۴۶ء (۱۲۶۲ھ) میں دہلی کالج سے چھپی تھی، جو پونے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

۵۔ ترجمہ تحریر اقلیدس

تحریر اقلیدس، ہندسہ کی قدیم اور شہرہ آفاق کتاب ہے جو تمام عالمی علمی حلقوں کی طرح دہلی کالج کے نصاب تعلیم میں بھی شامل تھی، دہلی کالج کی مجلس ترجمہ نے اس کے اردو ترجمہ

(۱) مرحوم دہلی کالج حنفی ۱۲۵۲ھ (تحت فہرست تراجم دہلی سہ ماہی ۱۱۴)

کافیصلہ کیا اور یہ کام بھی مولانا مملوک العلی کے سپرد کیا گیا، مولانا کے بحر علم کے سامنے اس کی حیثیت ایک قطرہ سے زیادہ نہ تھی، مولانا نے اس کا ترجمہ کیا اور ایسا ترجمہ کیا جس کی اہل کمال نے بہت تعریف کی، یہ ترجمہ اقلیدس کے صرف چار مقالوں کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ پہلی مرتبہ مولوی کریم الدین پانی پتی کے لیتھوگرافک پریس دہلی سے ۱۸۴۲ء (۱۲۶۰ھ) میں شائع ہوا اور خاصا مقبول ہوا۔ اسی سال اس مطبع سے دوبارہ چھپا، بعد میں بھی کئی مرتبہ شائع ہوا (پہلی اور بعد کی ایک طباعت پیش نظر ہے)

۶۔ نتیجہ تحریر

نام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب ریاضی کی ہوگی، اس کا بھی کوئی تعارف راقم سطور کو نہیں ملا اس کا محمد اکرام چغتائی نے گارسان دتاسی (GARCIN DETASSY) کے حوالہ سے ذکر کیا ہے، (۱) اس کا نسخہ چغتائی صاحب کو بھی نہیں ملا یہ بھی اردو میں ہے ایک مرتبہ (غالباً) چھپی تھی۔

۷۔ ایک نا تمام تالیف حاشیہ حماسہ

مولانا نے حماسہ کے انتخاب اور اس کی شرح لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور اس کے لئے اپنے ایک شاگرد علی اکبر سونی پتی سے تعاون چاہا تھا مگر علی اکبر کا خود یہ کام کرنے کا خیال تھا اس لئے اس نے مولانا کے کام کی صاف مخالفت کی (۲) اس کے بعد مولانا نے کیا کیا، حماسہ کی تلخیص کس منزل تک پہنچی اور اس کا کیا انجام ہوا، کچھ معلوم نہیں۔

مکتوبات

درج بالا تالیفات حواشی اور ترجموں کے علاوہ مولانا کی ایک اور علمی تحریری یادگار مولانا کے خطوط ہیں۔ یہ عربی اور اردو میں ہیں، عربی میں ایک خط ہے، جو شاہزادہ فیروز کو لکھا تھا (۳) اور نو خطوط اردو میں ہیں اس میں سے آٹھ خط (دہلی کالج کے پرنسپل) اسپرنگر کے نام ہیں اور ایک خط تھارن ٹن (THORAN TON) کو لکھا گیا ہے (۴)

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب صفحہ ۴۱

(۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب صفحہ ۴۵ نیز صفحہ ۲۹۹، صفحہ ۳۰۸

(۳) یہ گرائی نامہ مولانا کے شاگرد کریم الدین پانی پتی نے تذکرہ فرزند الدھر میں نقل کیا ہے صفحہ ۴۰۴ صفحہ ۴۰۶ (دہلی ۱۸۴۷ء)

(۴) یہ سب خطوط جناب محمد اکرام چغتائی نے "ایک نادر مجموعہ مکاتیب" میں مشعل حواشی اور توضیحات کے ساتھ شائع کر دیے ہیں۔

شاگرد

طلباء کو پڑھانا اور ان کی تربیت کرنا مولانا کا مقصد حیات اور زندگی کا محور تھا۔ دہلی کالج میں داخل ہوں یا کالج سے غیر متعلق طلباء، مولانا کا دامن شفقت اور باب علم و کمال سب کے لئے کھلا ہوا تھا، مولانا کسی طالب علم کی پڑھنے کیلئے درخواست رد نہیں کرتے تھے۔ کریم الدین پانی پتی کے یہ الفاظ گزر گئے ہیں کہ :

”سوائے مدرسہ کے ان کے گھر پر طلبہ پڑے رہتے ہیں۔ ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے، سب کو پڑھاتے ہیں تمام شب اور دن میں شاید دو پہر رات کو آرام کرنا ان کو نصیب ہوتا ہوگا۔ ورنہ رات دن درس دہی طلبہ میں گزرتا ہے“ (۱)

مولانا کے اخلاق کریمانہ اور طالب علموں پر مہر و عنایت کی نظر کی وجہ سے طالب علم ہر وقت مولانا کو گھیرے رہتے تھے، دن رات اسباق اور تعلیم کا سلسلہ رہتا تھا، معقولات و منقولات کی چھوٹی سے بڑی کتابوں تک ہر اک کتاب کا حسب ضرورت درس ہوتا تھا، اور ہر علم و فن کے مباحث کی گرہ کشائی ہوتی تھی۔ حدیث شریف کا سبق ہوتا ہوگا مگر اس کا کہیں ذکر نہیں ملا۔ یہ طلباء جن میں مولانا کے فرزند، قریب ترین عزیز، وطن کے اطراف و نواح کے طلبہ شامل تھے اس کے علاوہ دور دراز سے آئے ہوئے غریب و امیر اہل علم اور اصحاب ذوق ہوتے تھے، اس میں نہ علاقہ کی پابندی تھی نہ کسی رنگ و نسل کی قید سب آتے، پڑھتے، مولانا کے کمالات سے بلا تامل مستفید ہوتے تھے اور اپنی اپنی منزلوں کو چلے جاتے تھے، مگر افسوس ہے کہ مولانا کی مجالس درس سے فائدہ اٹھانے والے چند ہی اہل کمال کے نام محفوظ ہیں، حالانکہ مولانا کا حلقہ درس خاصا معروف اور ممتاز حلقہ درس تھا جو دہلی کالج کی ملازمت کے ساتھ مولانا کے زمانہ وفات تک برابر جاری رہا۔

اس چھبیس سال کے طویل عرصہ میں اگر کالج میں اور مولانا کے گھر پر مولانا سے پڑھنے والوں کی مجموعی تعداد ہر سال میں پچاس بھی رہی ہو تو پچیس سال میں مولانا سے تقریباً ڈیڑھ ہزار طلباء نے ضرور پڑھا ہوگا۔ اس خیال کی تائید کریم الدین پانی پتی کے ان الفاظ سے ہو رہی ہے۔

”گھر اس کا محط رجال طلباء، مدرسہ اس کا مجمع علماء و فضلاء، صد ہا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف و اقطار ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے درمیان اکثر بلاد افغانستان کی اور ہندوستان کے اپنا نام پیدا کر گئے“ (۱)

کریم الدین کا یہ مشاہدہ اور اطلاع مولانا کی وفات (۱۲۶۷ھ) سے تقریباً چار سال پہلے کا ہے، اس کے بعد طلبہ کی تعداد میں اور اضافہ ہوا ہو گا مگر افسوس ہے کہ دستیاب ماخذ اور تذکروں میں مولانا کے بہت کم شاگردوں کا احوال درج ہے۔ مولانا کے متعارف شاگردوں کی تعداد ۳۵-۳۶ شاگردوں میں آٹھ دس ایسے ہیں جن میں ایک ایک اپنے استاد اور اپنی درسگاہوں کے لئے مایہ صد عزت و افتخار ہیں اور ان میں سے دو چار ایسے بھی ہیں کہ ان پر ان کا عہد ہی نہیں بلکہ صدیوں تک آنے والی نسلیں رشک کریں گی۔

یہاں سب کے تعارف کی گنجائش نہیں مگر برصغیر کی دینی، علمی، تعلیمی، تصنیفی، اصلاحی، فکری تاریخ کا کون واقف اور طالب علم ایسا ہے جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، (والد شیخ الہند مولانا محمود حسن) مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتی، مولانا عالم علی مراد آبادی، مولانا سید جمال الدین کنانوی، (مدار المہام بھوپال) رحمہم اللہ تعالیٰ، مولوی سمیع اللہ دہلوی (رفیق سرسید) مولوی کریم الدین پانی پتی، ڈپٹی نذیر احمد، ڈاکٹر ضیاء الدین کو کون نہیں جانتا، ان میں سے ہر ایک ہماری دینی، ملی، علمی تاریخ کا غازہ اور ایک تابناک عنوان ہے اور ان میں سے ہر ایک مولانا مملوک العلی کے دریائے فیض کا جرعہ نوش اور مولانا کے فیض صحبت سے منور و مستفید ہے، سرسید احمد کو بھی متعدد اصحاب نے مولانا کا شاگرد لکھا ہے مگر یہ اطلاع درست نہیں، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

وفات اور مدفن

مولانا اپنے معمول کے مطابق تعلیم و افادہ میں مشغول تھے کہ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو پہلی تاریخ سے طبیعت خراب ہوئی بخار اور یرقان ہو گیا تھا، پہلے معمولی بیماری تھی آخر میں چارپانچ دن بہت بے چینی اور تکلیف رہی مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے۔

”والد مرحوم کا گیارہویں ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو بمرض یرقان قبل السابع انتقال

ہو گیا ایام مرض والد مرحوم کے ممتد نہ تھے گیارہ روز کل مرض رہا مگر چار پانچ روز بہت غفلت اور کرب رہا“ (۱)

اس کرب و بے چینی میں تریسٹھ سال کی عمر میں اذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۷ اکتوبر ۱۸۵۱ء) کو وفات ہو گئی، اس وقت مولانا کا دہلی میں کوچہ چیلان میں قیام تھا، تدفین کے لئے مہندیان کا انتخاب ہوا جو حضرت شاہ ولی اللہ اور خاندان ولی اللہ کا معروف قبرستان ہے۔

مولانا کو دہلی دروازہ کے پیچھے (قبرستان خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے پڑوس میں) مہندیان کی پرانی مسجد کے صحن سے متصل چبوترہ پر دفن کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
رحمہ اللہ رحمۃ الابرار الصالحین وجزاہ اللہ عنا وعن المسلمین خیر

الجزاء واحسن الجزاء۔

دہلی کے متعدد تذکرہ نویسوں نے مولانا کے مدفن کا ذکر کیا ہے، واقعات دارالحکومت کی تالیف کے وقت (۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء) تک مولانا کے مزار پر کتبہ نہیں تھا، مولوی بشیر الدین احمد کو اس کا بہت احساس ہوا، انہوں نے اپنے تأسف کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے۔

”شیخ عبد العزیز صاحب شکر بار کے پائیں میں آپ کی قبر کجی ہے جب تک کوئی نہ بتائے مل نہیں سکتی، نا قدر دانی زمانہ ملاحظہ ہو کہ آپ کے ہزاروں شاگرد صاحب ثروت و اقتدار تھے مگر استاد کو کسی نے بھی نہ پوچھا اور اتنا بھی نہ کیا کہ ایک ہاتھ بھر کا پتھر کا ٹکڑا لگا دیتے کہ اس خاک کے ڈھیر پر سے گزرنے والے فاتحہ تو پڑھ لیتے“ (۲)

مگر اس کے بعد بھی برسوں تک اس مزار کو کتبہ نصیب نہیں ہوا۔ ۱۳۴۶ھ تک مولانا کا مدفن بغیر کتبہ کے تھا بعد میں کتبہ نصب کیا گیا اور اب خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے مدفن مہندیان میں داخلہ کے بعد مسجد کے صحن سے ملے ہوئے چبوترہ کے سرہانے مولانا کی قبر معروف ہے، کتبہ لگا ہوا ہے۔

(۱) حالات مولانا محمد قاسم۔ مولانا یعقوب نانوتوی صفحہ ۹ (بھاو پور: ۱۲۹۷ھ)

(۲) واقعات دارالحکومت (دہلی) صفحہ ۵۸۳ جلد دوم آگرہ: ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء

نوٹ:- اس مضمون کے مندرجات کی وضاحت حوالوں اور متعلقہ مباحث کی تفصیل کیلئے راقم السطور کی

سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند

حضرت مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی

فہرست

۱۵۷	اجداد کرام
۱۵۷	حضرت شاہ مضباح العاشقین
۱۶۰	شیوخ کبار
۱۶۰	حضرت شاہ محمد آفاق
۱۶۱	حضرت خواجہ ضیاء اللہ
۱۶۲	حضرت خواجہ محمد زبیر
۱۶۳	حضرت خواجہ محمد نقشبندی
۱۶۴	حضرت خواجہ محمد معصوم
۱۶۵	حالات و معمولات
۱۶۵	والد ماجد
۱۶۵	ولادت
۱۶۵	آپ کا بچپن
۱۶۶	مزدوری
۱۶۷	اجرت کتابت
۱۶۷	دہلی کا سفر، تعلیم
۱۶۹	مرشد کا آپ کے ساتھ معاملہ
۱۶۹	شادی و مراد آباد کی سکونت
۱۷۰	معاشرت و سامان معیشت
۱۷۰	ایک شورش
۱۷۱	پوشاک، وجاہت و محبوبیت
۱۷۲	معمولات و اوقات

- ۱۷۳ تہجد کے وقت
- ۱۷۳ دیگر اشعار اردو
- ۱۷۴ تہجد و بیداری کا اہتمام
- ۱۷۴ معتقدین و زائرین کا ہجوم اور ان کی رخصتی
- ۱۷۴ مولوی نجل حسین صاحب لکھتے ہیں
- ۱۷۵ تحفہ و تبرک، خفگی اور اس کا سبب
- ۱۷۶ زمانہ آخر
- ۱۷۷ درد و محبت اور ذوق و شوق
- ۱۷۷ ایک آیت پر کیفیت
- ۱۷۸ اللہ کے معنی زبان ہندی میں
- ۱۷۸ حدیث دوست
- ۱۷۸ محبت و نسبت کے بغیر زندگی بیکار
- ۱۷۹ عشق کی دکان
- ۱۷۹ اللہ و رسول پر جان قربان کرنا چاہئے
- ۱۷۹ پریم کا پیالہ، اللہ کی محبت میں مزہ
- ۱۸۰ دردِ عاشق
- ۱۸۰ اشعار عاشقانہ
- ۱۸۲ ہندی اشعار
- ۱۸۳ آنحضرت ﷺ سے تعلق و عشق
- ۱۸۴ اتباع سنت اور احترام شریعت
- ۱۸۴ علو مرتبہ کا سبب
- ۱۸۴ شریعت کے بغیر کچھ نہیں
- ۱۸۴ اتباع سنت کا درجہ
- ۱۸۴ اتباع کے معنی
- ۱۸۵ اتباع شریعت کی تاثیر

- ۱۸۵ ازکار و اوراد میں حدیث کی پیروی
- ۱۸۶ ماثورہ دعائیں
- ۱۸۶ درود شریف کی اہمیت
- ۱۸۶ اتباع سنت کا مفہوم
- ۱۸۶ فناء فی الرسول ﷺ کا مطلب
- ۱۸۶ ولایت کی تعریف
- ۱۸۷ رسوم کی ناپسندیدگی
- ۱۸۷ چہلم و عرس کی ممانعت
- ۱۸۷ بدعات و رسوم کی مخالفت
- ۱۸۸ احکام و مسائل شریعت کا احترام
- ۱۸۸ حدیث و فقہ کی عظمت
- ۱۸۹ علم و علماء کا احترام
- ۱۹۰ قرآن و حدیث سے عشق
- ۱۹۰ قرآن کی لذت و دولت، شغل حدیث
- ۱۹۱ حدیث سے خوشی، حدیث پڑھنے میں توجہ الہی
- ۱۹۱ حدیث کا فیضان
- ۱۹۱ حدیث و قرآن کی مزاوت کے اثرات
- ۱۹۲ درس حدیث کے وقت سرور و فیض
- ۱۹۲ درس حدیث کی کیفیت
- ۱۹۲ حدیث کے انوار کو کوئی نہیں پاتا
- ۱۹۳ حدیث انتقال کے وقت، حدیث دم واپسیں تک
- ۱۹۴ بذل و عطا
- ۱۹۴ نفع عام اور خدمت خلق کا جذبہ
- ۱۹۴ تحائف اور کتابوں کی تقسیم
- ۱۹۵

- ۱۹۶ حق ہمسائیگی
- ۱۹۷ زہد و توکل
- ۱۹۷ روپیہ کی قدر
- ۱۹۷ روزمرہ کے خرچ کا قاعدہ
- ۱۹۸ فقیر کی دولت
- ۱۹۹ حاتم دگراں و گدائے خویشتن
- ۱۹۹ کیمیا اور دست غیب سے بیزاری
- ۲۰۰ لاکھ روپیہ پر خاک
- ۲۰۱ اہل حکومت و وجاہت کی بے وقعتی
- ۲۰۲ فیض و تاثیر
- ۲۰۲ گریہ محبت، کلام کی تاثیر
- ۲۰۳ اسماء حسنیٰ کا بیان، غیر مسلموں کا قبول اسلام
- ۲۰۳ دولار کا تھپڑ
- ۲۰۴ لسانی توجہ، ایک شعر باعث توبہ و اصلاح
- ۲۰۵ ایک شعر کا اثر، بیسواؤں کی توبہ
- ۲۰۶ صحبت و توجہ کی تاثیر
- ۲۰۷ کمال علمی
- ۲۰۷ نماز قصر کا ایک مسئلہ
- ۲۰۷ کتابوں کے اغلاط کی تصحیح
- ۲۰۸ احادیث پر عبور، اختلاف قرأت پر نظر
- ۲۰۹ تفسیر و نکات قرآن
- ۲۱۰ قرآن و حدیث کے الفاظ کے ہند ترجمے
- ۲۱۰ ایک حدیث کا ترجمہ، نسبت کا ترجمہ
- ۲۱۰ درود کا ترجمہ، تجلی کا ترجمہ
- ۲۱۱ بدیع کا ترجمہ، نفی اثبات کا ترجمہ

- ۲۱۱ زینۃ الحیوۃ، ترجمہ قرآن کے کچھ نمونے
- ۲۱۳ علالت اور وفات
- ۲۱۳ علالت کی ابتداء
- ۲۱۳ اتباع سنت کا اہتمام اور درس حدیث
- ۲۱۴ حدیث شریف کا آخری سبق
- ۲۱۴ ایک نعتیہ شعر اور کیفیت
- ۲۱۴ ایک شعر پر رقت
- ۲۱۵ صلحائے امت کا مرتبہ
- ۲۱۵ محویت و استغراق کی زیادتی
- ۲۱۵ صبر کی فضیلت اور حضرت ابو بکرؓ کی منقبت
- ۲۱۵ مرشد کی یاد
- ۲۱۶ اولیاء امت کا درجہ، دعائے تسہیل
- ۲۱۶ مریدوں کو تلقین
- ۲۱۷ رضا بالقضاء، مناقب خلفاء اربعہ، بشارات
- ۲۱۸ فنائے کامل
- ۲۱۸ حدیث کا تقاضا، اہل تعلق کیلئے دعا
- ۲۱۸ ذکر جلی، محبین و زائرین کا ہجوم
- ۲۱۹ حدیث کی تلاوت بالیس پر، وقت اخیر
- ۲۲۰ غایت اتباع سنت، ساعت و داع
- ۲۲۰ سکینت و رحمت، وفات
- ۲۲۱ آثار قبولیت و رحمت
- ۲۲۲ غسل تکفین، نماز جنازہ و تدفین
- ۲۲۳ خواص اہل تعلق کی آمد اور ان کا تاثر
- ۲۲۳ قرض کی ادائیگی
- ۲۲۴ اولاد و احفاد

حضرت مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی

اجداد کرام

مولانا نسباً صدیقی ہیں، آپ کے اجداد میں سب سے پہلے شیخ شہاب الدین زاہد غالباً آٹھویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان تشریف لائے اور بہار میں سکونت اختیار کی، ان کے صاحبزادے شیخ داؤد سلطان فیروز شاہ کے عہد میں دہلی تشریف لائے، اور کچھ مدت وہاں رہ کر پانی پت میں قیام اختیار کیا، اور ۷۸۷ھ میں وہیں وفات پائی، آپ کے صاحبزادے شاہ منکن تھے، اور ان کے صاحبزادے محمد معروف بہ شاہ مصباح العاشقین چشتی تھے، جو نامور مشائخ چشت اور کبار اولیاء اللہ میں سے تھے۔

حضرت شاہ مصباح العاشقین

حضرت شاہ مصباح العاشقین رحمۃ اللہ علیہ ۸۱۰ھ میں پانی پت میں پیدا ہوئے، ابتدائے شباب میں ملتان میں جا کر شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی خانقاہ میں مقیم رہ کر مولانا حسین سے علوم درسیہ کی تحصیل کی اور حج سے مشرف ہوئے، وطن کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد تلاش مرشد میں مشرق (پورب) کا رخ کیا، لکھنؤ میں مولانا محمد اعظم ثانی اور شاہ مینا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں کچھ وقت گزارا، پھر اودھ (فیض آباد) میں شیخ احمد راوی کی خدمت میں منازل سلوک طے کئے۔ اور سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی، تکمیل سلوک کے لئے شیخ ہی کی ہدایت و ایماء سے شیخ جلال الدین گجراتی کا قصد فرمایا، اور پنڈوہ (بنگال) کا سفر اختیار کیا، اثنائے راہ میں بنارس میں عشق مجازی میں مبتلا ہوئے، پھر شیخ کی تنبیہ اور جاذبہ توفیق الہی سے مردانہ وار اس کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہوئے، اور پنڈوہ میں شیخ جلال الدین گجراتی کی خدمت میں

حاضر ہوئے، شیخ نے مصباح العاشقین لقب دیا، اور بڑی پذیرائی فرمائی، اور تین سال کمال شفقت کے ساتھ رکھ کر علم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی، اور خلافت سے سرفراز فرمایا، ایک سال کے بعد حضرت شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ اپنے ہر مرید کو شاہ مصباح العاشقین کے سپرد فرماتے، اور ان کے ہاتھ سے خرقہ خلافت عطا فرماتے، ۸۸۱ھ میں شیخ کی شہادت کے بعد عازم مغرب ہوئے، کچھ عرصہ بہار میں جو مسکن آبائی تھا، قیام فرمایا، اہل خاندان و حاکم شہر نے بیعت کی، بالآخر اپنے شیخ کی ہدایت کے مطابق مغرب (پچھتم) کی طرف کوچ فرمایا، اور ۸۸۷ھ میں ملاواں میں طرح اقامت ڈالی، جہاں نصف صدی گزار کر ۹۳۹ھ میں وفات پائی۔ (۱)

آپ صائم الدہر، نہایت متوکل و زاہد تھے، پورے پورے دن ذکر الہی اور ادائے سنن نبوی میں مشغول رہتے صبح سے ظہر کے وقت تک علوم دینی کا درس دیتے، نماز ظہر سے فراغت کے بعد صحیح بخاری و مسلم کو سامنے رکھ کر وعظ و تلقین فرماتے، اس کے بعد زائرین و طالبین کی طرف توجہ فرماتے، اور نہایت شفقت و حسن اخلاق سے پیش آتے، تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں میں دین و سلوک اور حصول یقین و معرفت کا شوق پیدا ہو گیا، اور رجوع عام شروع ہو گیا، فتوحات کا دروازہ کھل گیا، نماز جمعہ کے بعد معمول تھا کہ برادر زادہ فخر الدین سے فرماتے کہ سوائے کتابوں اور پارچہ ضروری کے جو کچھ فاضل اور زائد از ضرورت ہو فقراء و طلباء کو تقسیم کر دیا جائے، اذن عام تھا کہ جو چاہے جو سامان اٹھالے جائے، اس کا اہتمام تھا کہ رات کی کوئی چیز صبح تک نہ رہے۔ (۲)

آپ نے سلطان بہلول لودھی اور سلطان سکندر لودھی کا زمانہ پایا، آپ کے آخری زمانہ میں ہندوستان میں بابر کی آمد ہوئی، سلطان سکندر لودھی نے تشریف آوری دہلی کی درخواست کی، معذرت فرمائی، اور اس کی فرمائش کی کہ ملاواں کو مسلمانوں سے آباد اور شرفاء کے لئے مدد معاش کا انتظام کیا جائے، اس کی تعمیل ہوئی، کچھ عرصہ کے بعد دہلی تشریف لے گئے، سلطان سکندر لودھی خود ملنے آیا اور نذر گزرائی، دہلی میں مجالس سماع خوب گرم رہیں، جن میں

(۱) محمد بن ابی البقاء الکرمانی نام اور اعظم ثانی لقب تھا، یہ لقب ان کو علمائے حجاز نے ان کے علمی و فقہی تبحر کی بناء پر دیا تھا، شیخ ابوالفتح بن عبدالحی بن عبدالمقتدر الکندی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد و خلیفہ تھے، تلامذہ میں حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ لکھنوی اور مولانا سعد الدین خیر آبادی جیسے اکابر ہیں، ۸۷۰ھ میں وفات پائی۔ (۲) (نزهۃ الخواطر جلد سوم)

(۲) یہ مقام پہلے نواحی قنوج میں شمار ہوتا تھا، جو دریائے گنگا کے دوسرے کنارے پر ہے، اب انار کا ایک قصبہ ہے، گنج

بادشاہ نے خود شرکت کی، اور الطاف خصوصی سے سرفراز ہوا، اپنے مشائخ کرام کے مزارات کی زیارت اور کچھ عرصہ دار السلطنت میں قیام فرمانے اور متعدد اہل علم و اہل استعداد کو اجازت و خلافت سے مشرف فرمانے کے بعد اپنے مستقر (ملاواں) کو مراجعت فرمائی اور پھر کہیں تشریف نہیں لے گئے۔

وفات کے قریب سخت مجاہدات اور طویل خلوتیں اختیار کیں، اور زیادہ تر زمانہ گوشہ گیری اور باطنی مشغولیت میں گزارا، وفات کے قریب بیوی صاحبہ نے روضہ کی تعمیر شروع کر دی، دیواریں قد آدم اٹھ چکی تھیں، آپ کی نظر پڑی تو فرمایا، کہ بیوی نے اپنے بیٹے (سجادہ نشین) کیلئے دکان بنائی ہے، فقیر کے لئے سایہ آسمان کافی ہے۔

۲۳ جمادی الثانیہ سے مرض وفات کی ابتدا ہوئی، رجب کی چاند رات سے حواس ظاہری میں تغیر ہوا، اور کامل طور پر بخود و باخدا ہو گئے، وصیت فرمائی کہ نماز جنازہ صاحبزادہ شیخ عبد الرزاق جو سب صاحبزادوں میں کمسن ہیں پڑھائیں، میا شیخ عبد الرحیم جو حافظ قرآن ہیں، نوحہ کی ممانعت فرمائی، ایک مرتبہ آنکھ کھولی تو دیکھا کہ صاحبزادوں اور اہل تعلق پر گریہ طاری ہے، اور وہ زار و نزار ہیں، آپ نے منع فرمایا، شیخ عبد الرحیم نے فرمایا کہ ایسی نعمت عظمیٰ، اور ایسا پدر بزرگوار ہم سے جدا ہو رہا ہے، ہم کیوں نہ روئیں، جبکہ حضرت کی چشم مبارک بھی اشک آلود ہے، فرمایا ”گریہ شما از اندیشہ جان من، و گریہ ما از اندیشہ ایمان من، فرزندِ ام! کار بتقوے و عبادت نیست، بلکہ برحمت و مغفرت اوست، انتقال کے وقت دونوں پاؤں سیدھے کر لئے اور روح لطیف جسد عنصری سے پرواز کر گئی یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربك راضیة مرضیة، یہ واقعہ یکم رجب ۹۳۹ھ کا ہے، انتقال کے وقت عمر شریف ۱۲۹ سال تھی۔ (۱)

مولانا فضل رحمن رحمۃ اللہ علیہ آپ کی آٹھویں پشت میں ہیں، اور آپ کی خصوصیات عشق و محبت، زہد و توکل، بذل و سخا، اتباع سنت، یہاں تک کہ طول عمر میں بھی آپ کی یادگار ہیں، سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ مولانا فضل رحمن بن اہل اللہ بن محمد فیاض بن برکت اللہ بن عبد القادر بن شیخ سعد اللہ نور محمد بن عبد اللطیف بن عبد الرحیم (معروف بہ شاہ مصباح العاشقین چشتی) قدس اللہ سرہ

(۱) حضرت مصباح العاشقین رحمۃ اللہ علیہ کے حالات آپ کے خلیفہ مولانا وجیہ الدین کی کتاب ”مصباح العاشقین فی ایضاح احوال السالکین“ سے ماخوذ ہیں، یہ کتاب ۱۳۳۰ھ میں خواجہ سید محمد محی الدین حسین مودودی کی سعی اور مولانا حکیم سید عبدالحی کی تصحیح سے ”کشف الظلوم“ کے نام سے شائع ہوئی۔ ۱۲

شیوخ کبار

مولانا رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و خلیفہ تھے، حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حضرت شیخ محمد سعید خازن رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں، آپ کے والد ماجد احسان اللہ خاں صاحب نواب اظہر الدین خاں صاحب کے فرزند ارجمند ہیں، جو زمانہ اورنگ زیب میں منصب دار شاہی تھے، خطاب خانی و نوابی سے سرفراز تھے، وہ فرزند حضرت شیخ محمد نقی رحمۃ اللہ علیہ فرزند حضرت شیخ عبدالاحد شاہ گل المتخلص بوحیدت فرزند حضرت خازن رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، اور از روئے ارادت و خلافت آپ کا سلسلہ حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ فرزند و خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، حضرت شاہ آفاق رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے مرشد بزرگوار حضرت خواجہ ضیاء اللہ سے اجازت حاصل ہے، جو حضرت خواجہ محمد زبیر کے اعظم خلفاء میں سے تھے۔ (۱)

حضرت شاہ محمد آفاق

حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۶۰ھ میں پیدا ہوئے (۲)، سلوک کی تکمیل اپنے طریقہ آبائی نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت خواجہ ضیاء اللہ سے کی، اور ان کے خلفاء میں ممتاز ہوئے، حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ نے حاشیہ سیر المرشدین میں تحریر فرمایا ہے۔

”حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ از حضرت خواجہ ضیاء اللہ رحمۃ اللہ علیہ کہ از خلفائے

حضرت محمد زبیر اندر رضی تعالیٰ عنہ نسبت اس خاندان کسب نمودہ بسرگرمی حلقہ

و مراقبہ و افادہ نسبت دریں وقت ممتاز اند۔“

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد مدت دراز تک حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے (۳) جو اپنے والد محمد ناصر عند لیب کے خلیفہ تھے، اور خواجہ محمد ناصر عند لیب حضرت خواجہ محمد زبیر رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں تھے، اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ محمد آفاق کو قبول عام عطا فرمایا، اور شہرہ آفاق بنایا، دہلی سے کابل تک لوگوں نے آپ سے فیض اٹھایا، خود بدولت کابل تشریف لے گئے اور زماں شاہ شاہ افغانستان نے بیعت کا شرف حاصل کیا، سلوک میں

(۱) شہرہ آفاق۔ تالیف نواب نور الحسن خاں مرحوم۔ (ص ۷، ۸)۔ ۱۲

(۲) نزہۃ الخواطر۔ (جلد ۷)۔ ۱۳ (۳) شہرہ آفاق۔ (ص ۷، ۸)۔ ۱۲

اپنے شیوخ کرام اور آبائے عظام کی طرح عالی ہمت و بلند حوصلہ و سرگرم تھے، مولانا فضل رحمن صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ ”ہمارے حضرت رحمہ اللہ دس ہزار مرتبہ درود شریف اور پچاس ہزار مرتبہ کلمہ پڑھتے تھے، اور دس پارے قرآن مجید کے تہجد میں پڑھنے کا معمول تھا، اور کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا، دس پارے اتنی دیر میں ہو جاتے تھے کہ انجان سمجھے کہ ایک پارہ پڑھا ہو گا، اور پانچوں وقت صلوٰۃ التَّسْبِيح پڑھتے تھے (۱)۔ مزاج میں نہایت تواضع و مسکنت تھی، مولانا فرماتے ہیں، کہ۔ ”ہمارے حضرت (حضرت شاہ محمد آفاق رحمہ اللہ) سب باتیں موافق سنت کے کرتے تھے، لیکن کسرِ نفسی سے ایسا فرماتے تھے کہ ہم سے جو کوئی بات موافق سنت کے ہو جاتی ہے، تو عرش سے ایسا فیض آتا ہے کہ ہم ترتر ہو جاتے ہیں (۲)۔“

حضرت شاہ غلام علی رحمہ اللہ اکثر اپنے مریدوں کو بعد تعلیم کے حضرت شاہ محمد آفاق رحمہ اللہ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے، جو وہ صاد فرماتے مسلم کرتے تھے (۳)، ۷ محرم روز چہار شنبہ ۱۲۵۱ھ میں انتقال فرمایا اور پنج شنبہ کو مغلیہ پورہ میں عقب مسجد شریف مدفون ہوئے (۴)۔

حضرت خواجہ ضیاء اللہ

آپ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمہ اللہ کی اولاد میں ہیں تاجر کشمیر تھے، ایک ایک لاکھ کا آپ کا خیمہ تھا، طلب خدا میں حضرت خواجہ محمد زبیر رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تمام اسباب اپنا راہ خدا میں لٹا دیا اور کمال و تکمیل پر فائز ہو کر خلافت پائی (۵) حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جس نے نسبت مجددی مجسم نہ دیکھی ہو حضرت خواجہ ضیاء اللہ کو دیکھے، فرماتے تھے کہ حضرت خواجہ آخر شب میں گریہ و زاری کرتے اور لوگوں کو زجر و تنبیہ کر کے فرماتے، اور کہتے، کہ حیف ہے تمہارے حال پر کہ محبت الہی کا دعویٰ کرتے ہو اور تمہارا لیا و محبوب بیدار اور تمہاری طرف متوجہ ہے اور تم خفتہ و غافل ہو، تم دعویٰ محبت میں دروغ گو ہو ورنہ عاشقوں کا حال تو یہ ہوتا ہے، کہ :-

مجنوں بہ خیال لیلیٰ در دشت
در دشت بجستجوائے لیلیٰ می گشت
می گشت بدشت بر زبانش لیلیٰ
لیلیٰ می گفت تاز بانش می گشت (۶)

(۱) ارشادِ رحمانی ص ۲۶۔ (۲) اسرارِ محبت۔ از نواب نور الحسن خاں مرحوم مجموعہ رسائل تصوف ص ۵۳۔

(۳) شہرۃ آفاق ص ۸۔ (۴) نشہ عرفان۔ از نواب نور الحسن خاں مرحوم مجموعہ رسائل تصوف ص ۵۱۔

(۵) اسرارِ محبت۔ از نواب نور الحسن خاں مرحوم مجموعہ رسائل تصوف ص ۶۹۔ (۶) در المعارف ص ۱۲۔

حضرت خواجہ محمد زبیرؒ

والد کا نام حضرت ابوالعلا تھا، سلسلہ نسب اس طرح ہے:-

محمد زبیر بن ابی العلاء بن محمد بن خواجہ محمد معصوم بن حضرت مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد فاروقی رحمۃ اللہ علیہ، سرہند میں ولادت ہوئی، والد کا صغر سنی میں انتقال ہو گیا اس لئے اپنے جد نامدار حضرت خواجہ حجۃ اللہ محمد نقشبندی کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی، اور انھیں سے تکمیل سلوک کی، اور بشارتوں سے سرفراز ہوئے، دادا کے انتقال کے بعد ان کے سجادہ کو رونق بخشی، اور تھوڑے عرصے میں اپنی علو استعداد اور علو ہمت سے سلسلہ عالیہ مجددیہ کا مرکز ارشاد بن گئے۔

حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات ”در المعارف“ میں آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ صلوٰۃ اوابین میں دس پارے قرآن مجید کے پڑھتے تھے، اس کے بعد مردوں کا حلقہ ہوتا تھا اور آپ توجہ دیتے تھے، پھر دولت خانہ تشریف لے جا کر عورتوں کا حلقہ کرتے تھے، اور آدھی رات کو چند گھڑی آرام فرما کر تہجد کے لئے اٹھ بیٹھتے تھے، اور تہجد کی نماز میں چالیس مرتبہ یا ساٹھ مرتبہ سورہ لیس پڑھتے تھے، بعد ازاں چاشت کے وقت تک مراقب رہتے تھے، پھر مردوں کا حلقہ ہوتا تھا، اور آپ توجہ دیتے تھے، پھر تھوڑی دیر قیلولہ فرما کر قرأت طویل کے ساتھ چار گھڑی میں نماز فی زوال پڑھتے تھے، پھر ختم خواجگان پڑھ کر ظہر کی نماز ادا کرتے تھے، بعد اس کے قرآن مجید کی تلاوت کر کے کھانا نوش کرتے تھے، رات دن میں یہی وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کھانے کا تھا۔

بعد عصر کے مشکوٰۃ شریف یا مکتوبات امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کا درس فرماتے تھے، غرض کہ تمام دن توجہ دینے اور ہدایت خلق میں صرف کرتے تھے، جب آپ مکان سے مسجد تشریف لاتے تھے تو امراء اپنے دو شالے اور پگڑیاں مکان سے مسجد تک بچھا دیتے تھے تاکہ قدم مبارک زمین پر نہ پڑے، اور اگر کسی مریض کی عیادت یا دعوت میں جانے کے لئے سوار ہوتے تو بادشاہوں کے مشل آپ کی سواری جاتی تھی۔

ایک روز دہلی کی جامع مسجد کے نیچے سے آپ کی سواری نکلی، حضرت شاہ گلشن نے دیکھا کہ ایک شخص پاکلی میں سوار ہے اور بہت سی پاکلیاں اس کے پیچھے چلی جاتی ہیں اور مجمع کثیر ان پاکلیوں کے ہمراہ ہے، اور انوار الہی اس پاکلی کے اس طرح محیط ہیں کہ پاکلی سے لے کر آسمان

تک نور تاباں کا ایک تختہ معلوم ہوتا ہے، اور تمام گلی نور سے بھر گئی ہے، حضرت شاہ گلشن نے اپنے سر سے پرانی کملی اتار کر ڈال دی اور اپنے مریدوں سے فرمایا کہ اس میں آگ دیدو، انھوں نے عرض کیا کہ اس کا کیا سبب ہے، فرمایا کہ اس امیر کی سواری پر ایک ایسا نور ہے کہ میں نے کبھی اپنی کملی میں مشاہدہ نہیں کیا، باوجودیکہ تیس برس اس کملی میں ریاضت سے گزارے ہیں، کسی نے عرض کیا کہ یہ سواری حضرت محمد زبیر رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، آپ نے فرمایا الحمد للہ کہ ہمارے پیر زادے ہیں۔ ہماری آبر و باقی رہی، اور اپنے مریدوں کو خدمت میں حضرت قبلہ عالم کے بھیجا اور فرمایا کہ :- جس جا حضرت رحمۃ اللہ علیہ تشریف رکھتے ہوں، ہم کو مرید کرنا جائز نہیں (۱)

حضرت خواجہ محمد زبیر رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے بڑے خلفاء یادگار چھوڑے ہیں، ان میں سے تین بڑے نامور ہوئے، حضرت خواجہ ضیاء اللہ رحمۃ اللہ علیہ جن کے خلفاء میں حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ ہیں، دوسرے حضرت خواجہ محمد ناصر عندلیب رحمۃ اللہ علیہ جن کے فرزند و خلیفہ حضرت خواجہ میر درد دہلوی ہوئے، تیسرے حضرت خواجہ عبد العدل رحمۃ اللہ علیہ جن کے خلیفہ حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مترجم قرآن و فرزند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

۴ ذی قعدہ ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی، جسد مبارک سرہند لے جایا گیا جہاں اپنے آبائے کرام کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

حضرت خواجہ محمد نقشبندی

حجتہ اللہ نقشبندی ثانی لقب، محمد نام، حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند سعید اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہیں، روز جمعہ ۲۶ رمضان المبارک ۱۰۳۴ھ میں پیدا ہوئے، اپنے والد بزرگوار سے استفادہ اور سلوک کی تحصیل کی، اور مدت دراز تک ان کی صحبت و تربیت میں رہے، یہاں تک کہ سلوک و معرفت میں درجہ کمال میں پہنچے کہ ان کے والد بزرگوار کے خلفاء میں سے (باوجود کثرت کے) کمتر پہنچے، حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو اپنا جانشین و خلیفہ بنایا، اور ان کی وفات کے بعد ارشاد تلقین میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، ۱۱۱۴ھ میں وفات پائی خلفاء میں حضرت خواجہ محمد زبیر جیسا شیخ وقت، اور دوسرے اہل علم و فضل ہیں۔

”آپ کی قدر اپنے بزرگوں میں لڑکپن سے تھی، آپ کے لڑکپن کی بہت سی حکایتیں مشہور ہیں کہ شریعت کے مطابق باتیں آٹھ برس کی عمر کے وقت سے سرزد ہوتی تھیں اس لئے آپ کے تمام بزرگ آپ کی تعظیم کرتے تھے، ایک مرتبہ آپ اپنے والد کے ساتھ ملاواں سے چلے، آپ کے والد کے ہاتھ میں ایک پنجرہ تھا، جس میں طوطی تھا، آپ جب کوئیں کے کھیت پر پہنچے تو آپ کے والد نے کوئی یعنی کاکن کے درخت کا ایک خوشہ توڑ کر جانور کو پنجرہ میں دیدیا، مولانا مرحوم نے منع کیا آپ کے والد نے اس کو خفیف سمجھ کر نہیں مانا اور چلے گئے۔ جب آپ کے والد بیس پچیس قدم چلے گئے تو دیکھا کہ مولانا مرحوم میرے پیچھے نہیں ہیں، بلکہ وہیں کھیت پر کھڑے ہیں، پکارا کہ او کیوں کھڑے ہو، آپ نے فرمایا کہ جب مالک کھیت کا آوے گا تو اس سے معاف کرا کر آؤں گا کہ خوشہ ہمارے پنجرہ میں ہے، آپ کے والد نے کم سنی کے سبب سے نہیں چھوڑا اور کہا، کہ لو ہم نہیں لے جاتے ہیں پنجرہ کھول کر خوشہ کو پھینک دیا، تب آپ وہاں سے تشریف لے چلے (۱)۔“

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لڑکپن میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی زیارت ہوا کرتی تھی۔ (۲)

آپ کی والدہ ماجدہ بہت بڑی زاہدہ اور متوکل تھیں، آپ نے فرمایا کہ ہماری عمر گیارہ بارہ سال کی ہوگی کہ والد رحمہ اللہ نے انتقال فرمایا، جو کچھ سرمایہ تھا وہ وقتاً فوقتاً خرچ ہو گیا تھا کہ سخت قحط پڑا، ہماری والدہ ماجدہ نے جب تک قحط رہا مکان کا دروازہ بند رکھا اور جو درخت گھر میں تھے ان کے پتوں کو اہال کرکھا لیتیں اور کسی کو اپنے حال سے مطلع نہ ہونے دیتیں، حالانکہ یگانے اور دوست ایسے تھے کہ مدد کرتے، مگر یہ گوارا نہ تھا۔ (۳)

مزدوری

مولوی تجمل حسین صاحب نے لکھا ہے:- ”حضرت قبلہ راقم الحروف سے بطور تعلیم فرماتے تھے کہ جب میں دہلی سے آیا تو سنا کہ فرنگی پل بناتے ہیں اور دو آنہ مزدوری دیتے ہیں، چنانچہ ہم نے بھی ایک روز مزدوری کر لی تھی اور شام کو ہم کو بھی دو آنے ملے تھے۔ (۴)

(۱) فضل رحمانی ص ۲۷۲ (۲) اسرار محبت مجموعہ رسائل تصوف ص ۶۳
(۳) انوار الایمان مولفہ مولوی حسام الدین احمد صاحب فضلی ص ۱۹۰ (۴) فضل رحمانی، ص ۵۷

اُجرت کتابت

فرمایا کہ ہم نے کبھی نوکری نہیں کی، مگر جب میں دہلی گیا تو البتہ کتاب کے صحیح کرنے کے لئے لوگوں نے کچھ مقرر کر دیا تھا، دو ڈھائی روپیہ مزدوری کی۔ (۱)

دہلی کا سفر

آپ فرماتے تھے کہ جب ہم حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا شہرہ سن کر لکھنؤ سے چلے، تو ہمارے پاس تھوڑے پیسے تھے، راہ میں پیسہ دو پیسہ کے دانے لیکر کھا لیتے، راستے میں دوستوں یگانوں کے گھر ملے، مگر ہم کہیں نہیں ٹھہرے، صرف اپنی ایک بہن کے یہاں کہ عرصہ سے ان کو نہیں دیکھا تھا ایک شب ٹھہر گئے، پھر راہ میں ایک شخص ملے اور ہم سے کہا کہ آپ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جاتے ہیں دو روپیہ لیتے جائیے ان کو دیدتے گئے گا، ہم نے کہا کہ اس شرط پر لئے جاتے ہیں کہ راہ میں ہم کو ضرورت ہوگی تو ہم صرف کر لیں گے، پھر ایک جگہ پہونچے وہاں کے لوگوں کو کچھ حاجت تھی ہم نے دعا کی، ان کی حاجت برآئی، انہوں نے کچھ روپے دیئے بآرام دہلی پہونچ گئے۔ (۲)

تعلیم

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں:- حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے شرح وقایہ مولوی نور صاحب سے لکھنؤ میں پڑھا تھا، اور جب دہلی تشریف لے گئے مرزا حسن علی صاحب محدث (لکھنؤی) اور مولوی حسین احمد صاحب (ملیح آبادی) اور آپ، تینوں صاحب ساتھ گئے تھے، پھر آپ نے علم حدیث شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا، آپ سات مرتبہ دہلی تشریف لے گئے، مسلسل بالاولیت کی سند آپ نے شاہ صاحب سے لی تھی، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے چار مہینے ٹھہرنے کو فرمایا تھا، مگر آپ نے معذرت فرمائی کہ والدہ صاحبہ کی اجازت نہیں ہے۔ (۳)

”بعض عالم دہلی و سہارنپور سے سند حدیث کی لینے کیلئے آتے تھے، اس وقت حضرت حجرہ

(۱) فضل رحمانی ص ۱۳۳

(۲) انوار العیون مولفہ مولوی حسام الدین احمد صاحب فضلی ص ۱۹۲ (۳) فضل رحمانی ص ۶۲، ۶۳

میں تشریف رکھتے تھے اور میں حاضر تھا، ارشاد ہوا کہ ہم نے کچھ تھوڑی حدیث تو حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، اور باقی شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے، دوسرے جلسہ میں پھر اس کا ذکر فرمایا، اور آنسو بھر آئے اور یہ شعر پڑھا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ مکان سے ہم دہلی گئے، اور شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث مسلسل بالاولیت سنائی اور چند اور بھی حدیثیں اور اس وقت مرزا حسن علی صاحب محدث لکھنوی اور مولوی عبد الصمد صاحب وغیرہ بیٹھے تھے، ان سے فرمایا کہ اگر یہ لڑکا چار مہینے بھی ہمارے پاس ٹھہرے، تو ہم حدیث پڑھادیں، میں نے عرض کیا کہ حضرت مجبور ہوں۔

میری والدہ نے مجھے ایک مہینہ کی اجازت دی ہے، اس سے زیادہ میں نہیں ٹھہر سکتا، بعض دفعہ فرمایا کہ ہم ایک ایک دن میں دو دو پارے بخاری کے مولانا اسحاق صاحب سے پڑھا کرتے تھے، اور مولانا صاحب کبھی کبھی اپنے گھر کے اندر پڑھاتے تھے اور ہم چادر اوڑھے پڑھا کرتے تھے اور مولانا صاحب کی صاحبزادیاں وغیرہ پھرا کرتی تھیں۔ (۱)

ارشاد فرمایا کہ ہمارا سن سترہ یا اٹھارہ برس کا تھا ہم دہلی میں شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوئے تو شاہ صاحب بیمار تھے، آپ نے حدیث مسلسل بالاولیہ پڑھی، میں نے حدیث پڑھنے کی درخواست کی فرمایا کہ مولوی اسحاق صاحب سے پڑھو، ان کے پاس گیا اور کچھ سنایا اور بعض حدیث کا ترجمہ بھی کیا، شاہ صاحب بہت خوش ہوئے اور شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جا کر بیان کیا پھر میں شاہ صاحب کے پاس گیا تو فرمایا کہ اگر یہ لڑکا چار مہینے ہمارے پاس رہے تو ہم حدیث کی کتابیں پڑھادیں، میں نے عرض کیا کہ حضرت والدہ نے صرف ایک مہینہ کی اجازت دی ہے، نہیں ٹھہر سکتا، اس وقت تو میں ایک مہینہ کے بعد چلا آیا، پھر جب گیا تو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا تھا، شاہ اسحاق صاحب سے حدیث پڑھی ہم تنہا پڑھتے تھے، بخاری شریف کے دو پارے پڑھ لیتے تھے۔ (۲)

(۱) ارشاد رحمانی ص ۵۹

(۲) ارشاد رحمانی ص ۶۲

مرشد کا آپ کے ساتھ معاملہ

نواب نور الحسن خاں مرحوم ”نور احمدی“ میں لکھتے ہیں ”ہمارے حضرت رحمہ اللہ نے حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمہ اللہ کو بھی دیکھا ہے اور شاہ احمد سعید صاحب اور آپ مولانا محمد اسحاق صاحب کے درس حدیث میں ہم سبق تھے، شاہ احمد سعید صاحب کے بھائی شاہ عبدالغنی صاحب حضرت شاہ محمد آفاق کے داماد تھے، دونوں صاحب حضرت شاہ محمد آفاق رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، نماز کے وقت حضرت شاہ محمد آفاق رحمہ اللہ ہمارے حضرت رحمہ اللہ کے پیچھے اقتدا فرمایا کرتے تھے، جب آپ سترہ برس کی عمر میں دہلی تشریف لے گئے اور حضرت شاہ محمد آفاق رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ان کو اندورن خانہ لے گئے اور صاحبزادی صاحبہ اور داماد سے فرمایا کہ ان کو نذر دکھلاؤ ہر چند آپ نے تواضع کی نہ مانا۔ (۱)

شادی و مراد آباد کی سکونت

”جب آپ بڑے ہوئے، آپ کی شادی ہوئی، دو بیٹے ہوئے جناب میاں عبد الرحیم و جناب میاں عبد الرحمن صاحب مرحوم، جن کی اولاد موجود ہے، اور مقام ملاواں میں مقیم ہے، اس وقت غلبہ شریعت آپ پر بہت تھا۔ ایک مرتبہ تعزیرے میں آگ لگادی، نواب لکھنؤ یہ خبر سن کر آپ کو تکلیف دینے پر آمادہ ہوئے چودھریاں سندیلہ نے آپ کو بچایا، اور بڑی کوشش کی، کچھ عرصہ کے بعد آپ کی بی بی صاحبہ کا انتقال ہو گیا اور اہل بستی نے حسب عادت قدیم جو انبیاء و اولیاء کے ساتھ چلی آتی ہے کچھ تکلیف پہونچائی، آپ ملاواں کو چھوڑ کر مراد آباد میں آئے اور عقد کا عزم ہوا، آپ کی بی بی کے چچا نے کہ وہ مردم شناس تھے اپنی بھتیجی کا آپ سے عقد کرنا چاہا، مگر آپ کے سالے آپ کے جانی دشمن ہو گئے کہ ایک فقیر سے شادی کرنا چاہتے ہیں، اور جناب احمد میاں صاحب کی والدہ صاحبہ کو منع کیا کہ تمہارا عقد چچا نے ایک فقیر مفلس سے کرنا چاہا ہے آپ بھی مکدر ہوئیں، مگر چچا نے سمجھا کر عقد کر دیا چونکہ مراد آباد کے زمیندار اور رئیس آپ کے سرالی لوگ تھے اس لئے حقیر سمجھتے رہے، اس وقت ایسی غربت پیش آئی کہ مہینوں اروی اہال کرکھاتے تھے مگر نوکری یا پیشہ نہیں کرتے تھے۔ (۲)

معاشرت و سامان معیشت

”جب آپ نے رئیس مراد آباد سے عقد فرمایا تو ان کو ان کے مکان سے جدا کر کے متصل مسجد (جو آج جناب احمد میاں صاحب کی حویلی ہے) مقیم کیا، اور طریقہ یاد الہی کا ان کو سکھایا، صحن مسجد میں جو ایک گنبد ہے اور آج بھی موجود ہے قیام رکھا اس طرح پر کہ ایک چارپائی باندہ کی بنی ہوئی، بچھاؤن اس پر ندارد، اور اس کی بغل میں کلوخ کے ڈھیلوں کا ڈھیر اور ایک لوٹا مٹی کا وضو کرنے کا موجود رہتا تھا اور ایک تین ہاتھ کی چوکی جس پر چٹائی کھجور کی بچھی رہتی تھی، اس میں مدت گزار دی، دروں کو مٹی سے بند کر دیا تھا، چونکہ شام تک پیسہ کوڑی اور اسباب بیش قیمت نہیں رکھتے تھے، اس لئے کوڑ لگانے کی حاجت نہ تھی۔“

ایک شورش

”پھر آپ مسجد کی طرف متوجہ ہوئے کہ نماز باجماعت ہو، تو وہاں اولاً کوئی نمازی نہیں تھا فقط ایک مؤذن البتہ دو روپیہ معاش، وقف شدہ سے یا ورثہ اہل مقبرہ سے پاتا تھا کہ فقط اذان دے کر چلا جاتا تھا، نماز نہیں پڑھتا تھا، مسجد میں ایک طرف تعزیہ رکھا رہتا تھا آپ نے تعزیہ کو جدا کرنا چاہا، خوانین مراد آباد نے یورش کی، چنانچہ ایک خاں صاحب نے جن کا نام یاد نہیں رہا نواب وقت کے یہاں جا کر درخواست دی کہ مولانا فضل رحمن صاحب نے تعزیہ کو پھینک دیا ہے اور بڑی بے ادبی کی ہے، چنانچہ اس حکم ہوا کہ فوج سلطانی جا کر ان کو گرفتار کر لاوے۔ تلنگے آئے اور زیادہ حصہ ان کا ملیح آباد میں رہ گیا، آپ اس روز ملاواں تشریف لے گئے، وہاں دوڑ تلنگوں کی پہونچی، اور دشمنوں نے وہاں تلنگوں کو پہونچوا دیا، پھر تلنگوں نے گرفتار کیا، اور لوہے کی بیڑی پائے مبارک میں ڈالی، اور ملیح آباد تک چھاؤنی میں فوج کے ساتھ لے آئے، اس درمیان میں محمد جعفر خاں ایک صاحب سندیلہ کے، جو اس وقت راجہ گوالیار کے میشرشی تھے، انہوں نے لکھنؤ کے نواب کو خط لکھا کہ مولوی فضل رحمن صاحب ہمارے تمہارے استاد کے نواسہ ہیں ان کو چھوڑ دیجئے، نواب نے منظور کر کے آپ کی رہائی کا حکم بھیجا آپ ملیح آباد تک پہونچے، بیڑی پائے مبارک سے کاٹی گئی، بیڑی کاٹنے والے کو آپ نے پانچ روپے انعام دیئے۔ (۱)

الغرض مراد آباد کی مسجد آپ کے دخل میں آئی اور جو دشمن آپ کے ہوئے تھے تباہ ہو گئے، پھر آپ نے مدتوں اس میں بسر کی، آپ کی ضرورت و استعمال کیلئے صحن کا کنواں (جو غالباً اسی زمانہ کا ہوگا) بڑا شور تھا خدا نے اس کو میٹھا کر دیا، ایک مدت تک یہ مسجد شکستہ و بے مرمت رہی پھر جناب نواب صدیق حسن خاں صاحب بہادر نے مبلغ دو ہزار روپیہ مسجد شریف کی درستی اور مرمت کے لئے بھیجا۔ (۱)

پوشاک

آپ پارچہ معمولی پہنتے تھے، دو تین جوڑے پارچہ سے زیادہ نہیں رکھتے تھے، موسم سرما میں بیشتر رضائی پر اکفتا فرماتے، اسی کو شب کو اوڑھتے اور وہی دن میں اوڑھتے جب آپ نماز ادا فرماتے رضائی جدائی کر دیتے۔ اور نماز کے وقت سر پر دوپٹہ باندھتے کرتہ تہبند نہیں پہنتے تھے، نہ تکیہ گدہ آپ رکھتے۔ اکثر آپ دال ماش اور باجرہ کی روٹی یا کھجڑی قدرے قلیل نوش فرماتے، یاد دودھ قدرے قلیل نوش کرتے۔ (۲)

لنبا انگر کھا اور بڑے خالطہ کا پانچامہ اور دوپلیہ ٹوپی پہنتے تھے، دھوبی کے یہاں سے جب کپڑا آتا، تو آپ اس کو پھر پاک کرتے تھے، اور سکھا کر پہنتے تھے (۳)

وجاہت و محبوبیت

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں، جس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ حجرے سے نکلتے تھے، سب لوگوں کی نظر آپ کی صورت کی طرف ہوتی تھی، اور یہی جی چاہتا تھا کہ تمام دن آپ کی صورت دیکھا کریں، چنانچہ ایک مرتبہ مولوی عبدالکریم صاحب سے ذکر آیا کہ آپ کو ہر وقت دیکھنے کو جی چاہتا ہے، مولوی عبدالکریم صاحب نے فرمایا: خدا کی قدرت ہے کہ غیب سے باری تعالیٰ نے حضرت مولانا قدس سرہ کو لباس جمیل سر سے پاؤں تک اوڑھا دیا ہے اسی کا یہ اثر ہے کہ ہر شخص کیا مسلمان کیا ہندو کیا نصاریٰ جس نے آپ کی صورت مقدس دیکھی عاشق ہو گیا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ مجھے تسخیر کا عمل ہے، ہم نے تو تسخیر کا عمل کبھی نہیں

کیا البتہ یحبہم و یحبونہ کا مراقبہ کیا کرتے ہیں یعنی تسخیر عالم کی وہ وجہ نہیں ہے جو کوتاہ اندیش اور کم مایہ لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ وہ وجہ ہے جس کا ذکر حدیث میں آیا، جسے اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے اس کا اعلان فرشتوں میں کر دیتا ہے اس کو محبوب رکھنے کا حکم فرماتا ہے اور فرشتے اہل زمین کے قلوب کو اطلاع دیتے ہیں، جس کی وجہ سے اہل زمین کو خواہ مخواہ اس سے انس پیدا ہوتا ہے اور خود بخود دل اس کی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں۔ (۱)

معمولات و اوقات

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں۔ بعد فراغت نماز صبح تھوڑی دیر ذکر میں مشغول رہتے تھے، آپ نے فرمادیا تھا کہ جب میرے حجرہ میں یا جب میرے پاس بیٹھو، میرے قلب کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھو، راقم شب کو جا کر توجہ لیتا تھا، آپ لیٹے لیٹے کبھی توجہ دیتے کبھی بیٹھ کر، یہ ذکر اس وقت کا ہے جب آپ خود امامت کرتے تھے، اور مسجد میں نماز پڑھتے تھے اور حجرہ میں مسجد کے رہتے تھے، یا مقبرہ موجودہ جو کن مسجد میں ہے اس میں رہتے تھے اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ طلوع آفتاب تک آپ مسجد میں مشغول رہتے تھے، نماز اشراق ادا کر کے آتے تھے، اور کبھی نماز پڑھ کر حجرہ میں آکر اذکار میں مشغول ہوتے تھے، اور وہیں مراقبہ رہتے تھے مگر جب سے آپ کو ضعف ہو گیا تھا مسجد میں آنا موقوف ہو گیا اور باہر احاطہ مسجد کے قبل از وصال ایک سال سے زائد اس میں رہے، اور پانچ چھ برس مسجد کے متصل جو حجرہ ہے اس میں تشریف رکھی، بعد اشراق کے درس حدیث شریف کا ہوتا تھا، اور دس برس پہلے فقط صحت قرآن شریف کی ہوتی تھی، اور اس میں کچھ ترجمہ ہو جاتا تھا پھر نکلتے عجائب اور غرائب بیان ہوتے تھے، اب آخر زمانہ میں تمام دن حدیث ہوتی تھی، آپ لفظ سے فیض لیتے تھے۔ (۲)

بعد نماز مغرب اذکار و اشغال سے فرصت پا کر حجرہ مسجد میں کچھ دیر مراقبہ میں رہتے تھے اکثر مراقبہ محبت کا فرماتے تھے، اور کبھی دوسرا مراقبہ بھی فرماتے تھے، اس لئے بعض مریدوں سے ارشاد فرمایا کہ مراقبہ محبت یحبہم و یحبونہ کا کرتا ہوں، پھر آپ حویلی میں جا کر طعام تناول فرماتے تھے آپ کے کھانے میں اکثر باجرہ کی روٹی کہ بہت محبوب ہوتی تھی اور کبھی مونگ کی یا ماش وغیرہ کی دال بھی ہوتی تھی، قلیل سی کھا لیتے تھے اور کبھی کھجڑی۔ (۳)

مٹی کے برتن میں ہمیشہ آپ کھاتے تھے اور بورے پر بیٹھتے تھے، عشا کی نماز بہت ہی سویرے ہوتی تھی بعد اداۓ نماز پھر لیٹ جاتے تھے پھر کلام نہیں کرتے تھے۔ (۱)

تہجد کے وقت

جب آپ ایک بجے رات کو بیدار ہوتے تھے تو پوچھتے تھے کہ اس وقت کتنی رات ہے اور کسی کے پاس گھڑی ہے، اگر سب نے کہا کہ نہیں ہے اس وقت آپ بہت خفا ہوتے تھے کہ نمازی ہو کر گھڑی نہیں رکھتے ہو، پھر میں نے عرض کیا کہ حضور، میرے پاس گھڑی موجود ہے، وقت دیکھتا ہوں پھر خود ہی شفقتاً فرماتے تھے کہ میں وقت کہہ دوں ہم عرض کرتے تھے فرمائیے، آپ ٹھیک اتنی ہی رات فرماتے تھے جو گھڑی میں ہوتی تھی، پھر آپ اور معمولی وظیفہ پڑھ کر بیٹھتے تھے، اس وقت بہ نسبت تمام دن کے بہت خوش رہتے تھے، اس لئے کہ وہ وقت وہ ہے کہ جس کی شان میں نازل ہوا ہے: یا ایہا المزمّل قم اللیل (یعنی اس وقت ہم لوگوں سے فرماتے تھے کہ اس وقت جاگا کرو، اور استغفار پڑھو کہ اس وقت کا جاگنا بڑی فضیلت ہے، جاگنے میں آیت صریحی وارد ہوئی، اور شاید یہ بھی پڑھا۔ تتجافی جنوبہم عن المضاجع یدعون ربہم خوفا وطمعاً المختصر تہجد کے وقت عشاق کا مجمع آپ کے پاس ہوتا تھا اور کبھی ہم تنہا ہوتے تھے اس وقت اشعار عاشقانہ جناب خود پڑھ کر سناتے تھے، اور کبھی مضامین تصوف از قسم نصیحت یا حکایت بزرگان بیان کیا کرتے تھے کبھی توحید کا ذکر اور کبھی اذکار و اشغال کا ذکر بیان فرمایا کرتے تھے اور اشعار اس قسم کے پڑھا کرتے تھے۔

صحبت یک ساعت با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گفتہ او گفتہ اللہ بود گر چہ از حلقوم عبد اللہ بود

دیگر اشعار اردو

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں
ارض و سما کہاں تری وسعت کے سامنے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے (۲)

تہجد و بیداری کا اہتمام

آپ کو تہجد اور بیداری کا اس قدر اہتمام تھا کہ تمام عمر سائبان میں سردی ہو چاہے گرمی، سب حالت میں وہیں آرام فرماتے تھے فقط اسی واسطے تھا کہ غفلت شب کو نہ ہو جاوے، اور شب کو پہچاننے میں فتور نہ ہو جاوے، جب شب تمامی پر ہوتی تھی کچھ لیٹ کر کے بیدار ہوتے تھے اس وقت سے نماز صبح کا اہتمام ہوتا تھا اور پھر پوچھتے تھے کہ کہو میاں کچھ شب ہے یا نہیں کسی نے کہا کہ شب ہے کسی نے کہا کہ نہیں آپ فرماتے تھے کہ اب شب نہیں ہے، بعض وقت فرمادیتے تھے کہ اس قدر شب ہے پھر ذرا سا بھی طہارت میں اگر آپ کو شبہ ہوتا تھا تو چاہے کسی طرح کا جاڑا ہوتا مگر فوراً بدن پر سے دولائی اتار کر غسل خانہ چلے جاتے تھے پھر صبح صادق کے وقت نماز صبح کی اذان دلواتے تھے نماز مذہب حنفیہ کے موافق اول وقت جماعت سے پانچوں وقت تمام عمر ادا کی۔ (۱)

معتقدین و زائرین کا ہجوم اور ان کی رخصتی

بعد طلوع آفتاب اور کبھی قبل طلوع آفتاب مسافران مسجد رخصت کئے جاتے تھے بعض آدمی عذر بھی کرتے تھے کہ مجھے اجازت ملے کہ میں دو چار روز ٹھہروں، مگر آپ فرماتے تھے کہ اگر دو دن سب مسافروں کو ہم روک رکھیں پھر جگہ یہاں نہ ملے کہ لوگ عافیت سے رہیں۔ چنانچہ آخر زمانہ میں یہ کثرت ہوئی کہ دس دن اور بیس دن کی راہ سے لوگ آتے تھے، اور فوراً رخصت کر دیئے جاتے تھے۔ (۲)

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں

ایک مرتبہ سات آٹھ رئیس ہمارے ساتھ گئے، ارشاد ہوا کہ آج شمار کرو کہ مسجد میں کتنے آدمی ٹھہرے، ہم نے جا کر عرض کیا کہ قریب ڈیڑھ سو آدمی کے اس وقت موجود ہیں، باوجودیکہ بہت سے آدمی رخصت کر دیئے گئے تھے ارشاد ہوا کہ تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں، عرض کیا کہ آٹھ آدمی ہیں فرمایا کہ اب ان کو رخصت کرو، عرض کیا کہ ہم سے زائد چودھری نصرت علی

صاحب رئیس سندیلہ کے ساتھ آدمی ہیں۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ کئی پالکیاں جس میں وہ خود اور ان کے صاحبزادے اور بہت عورتیں اور رتھ اور گھوڑے ہیں اور شاید ہاتھی بھی ساتھ تھا، اور سات آٹھ سپاہی اور خدمت گار اور اسی طرح بہت آدمی ہیں ارشاد ہوا کہ ان کو بھی جانے کو کہو مگر چونکہ وہ علیل ہو گئے تھے اس لئے حضرت احمد میاں صاحب نے ان کو اپنا مہمان کر لیا۔ (۱) قبل علالت کے آپ کی عادت تھی کہ دروازہ مسجد تک مسافروں کو پہونچانے آتے تھے، اور بعض بزرگان دین کو بستی کے باہر تک بھی پہونچانے جاتے تھے۔ (۲)

تحفہ و تبرک

بوقت رخصت جو چیز آپ کے پاس موجود ہوتی تھی جیسے کپڑا یا برتن یا کھانے کی چیز مسافروں کو دیدیتے تھے۔ (۳)

کسی کو چلتے وقت لوٹا اور دری عنایت فرماتے تھے اور جس کے پاس راستہ کا خرچ نہیں ہوتا تھا آپ زادہ راہ اپنے پاس سے دیتے تھے اور مخفی نہ رہے کہ جو لوگ محض طلب خدا میں آتے تھے جلدی آپ اپنی زبان سے نہیں فرماتے تھے کہ چلے جاؤ۔ (۴)

خفگی اور اس کا سبب

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں:۔ ایک بار ہم نے عرض کیا کہ حضرت اس زمانہ کے آدمی اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت مولانا کا سب عمل سنت پر ہے مگر مخلوق سے اس قدر بگڑنا یہ کیسی سنت ہے؟ آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ میاں ادھر آؤ اور کان میں فرمایا کہ اوپر کے جی سے میں کڑکا کرتا ہوں، اور ہم نے اپنے خالق سے پہلے ہی دعا کر لی ہے کہ جس کے لئے میں بد دعا کروں وہ دعا سمجھی جائے ورنہ ہجوم خلق سے نماز پڑھنا مشکل ہو، دہقانی لوگ بہت تنگ کریں بقول نور میاں صاحب۔

دانائیوں سے پھنتے ہیں نادانیوں میں ہم
ہیں جلوۂ نگار کی مہمانیوں میں ہم (۵)

دیوانگی بھی اپنی ہے تجویز عقل سے
جالے خیال غیر کہ فرصت نہیں یہاں

(۳) فضل رحمانی ص ۴۰

(۲) فضل رحمانی ص ۳۹

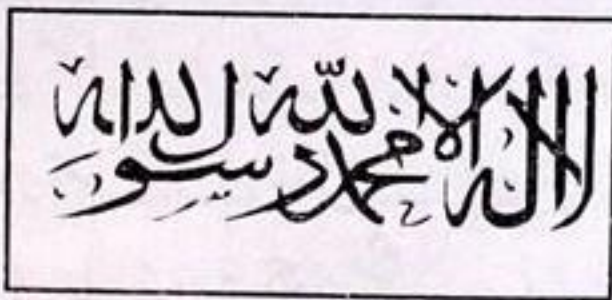
(۱) فضل رحمانی ص ۳۹

(۵) فضل رحمانی ص ۱۴۲

(۴) فضل رحمانی ص ۴۱

زمانہ آخر

زمانہ آخر میں آپ کو خلوت در انجمن زیادہ حاصل تھی، کبھی تولیٹ جاتے تھے اور چادر اوڑھ لیتے تھے اور جب کسی نے کچھ عرض کرنا چاہا تو خدام یا صاحب حاجت پیر دباتا تھا آپ اٹھ بیٹھتے تھے مگر اس بیداری میں خلوت در انجمن کا مضمون حاصل تھا، اس لئے باتوں میں آپ کی صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی دوسرے کی جانب متوجہ ہیں بہ تکلف ہماری طرف متوجہ ہیں، خط کے جواب میں فقط سلام و دعا ختم کرتے تھے اور کبھی کوئی جملہ بھی لکھ دیتے تھے اور ہر وقت کے کلام میں عجب انداز تھا خود آپ نے کبھی کسی بات کا سوال کیا اس کا جواب ہم نے دیا، اس پر آپ خفا ہو جاتے تھے کہ کیا بک رہے ہو، عرض کیا گیا کہ آپ نے جو پوچھا تھا اسی کا جواب دیا گیا، فرمایا کہ ہم نے کب پوچھا تھا، الغرض فنائیت اور استغراق اس درجہ کا تھا کہ بعض وقت بہ تکلف ہم لوگوں کو پہچانتے تھے اور فرماتے تھے کہ کون ہو کہاں سے آئے ہو گویا آپ کو خلوت در انجمن کا مضمون حاصل تھا۔ (۱)



درد و محبت اور ذوق و شوق

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خمیر میں درد و محبت کی ایسی چنگاری تھی کہ ایک ذرا سی تحریک سے مشتعل ہو جاتی تھی اور آپ پر وجد و کیفیت اور عشق و مستی کی ایک حالت طاری ہو جاتی تھی، اکثر زبان مبارک سے قائم کا یہ شعر پڑھتے تھے جو بالکل حسب حال تھا۔

دل ڈھونڈھنا سینہ میں مرے بوا لعلی ہے
ایک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دہی ہے

اس دہی ہوئی آگ کو اگر کوئی چھیڑ دیتا، یا ہوا دیدیتا تو سارے جسم سے اس کی آنچیں نکلنے لگتیں اور پاس بیٹھنے والوں کو بھی اس کی گرمی اور آنچ محسوس ہوتی۔

ایک آیت پر کیفیت

مولوی تاجل حسین صاحب لکھتے ہیں۔ ایک بار مولانا محمد علی صاحب وغیرہ کا مجمع تھا قرآن شریف کا ترجمہ ہوا رکوع یہ تھا:- واذکر فی الكتاب ابراہیم انه کان صدیقاً نبیاً۔ اس کا ترجمہ فرمایا، بعد اس کے وہ آیت پڑھی گئی جو حضرت اسماعیل کے بیان میں ہے:- وکان عند ربہ مرضیاً۔ ترجمہ فرمایا کہ تھا اپنے رب کا پیارا، یہ فرما کر چیخ ماری، اور آپ پر گویا کیفیت مدہوشی کی طاری ہوئی اس واقعہ کے بعد دو مہینے سخت علیل رہے۔ (۱)

ایک مرتبہ جب اس آیت کا ترجمہ پیش ہوا:- أنت قلت للناس اتخذونی وامی الہین من دون اللہ۔ یعنی حضرت عیسیٰ کو حکم ہو گا کہ کیا تم نے آدمیوں سے کہہ دیا تھا کہ ہم کو اور ہماری ماں کو خدا سمجھیں اور خدا کو خدا نہ سمجھیں، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گھبرا کر یہ فرمانا: انک انت العزیز الحکیم یعنی غفور رحیم کا موقع تھا مگر عزیز الحکیم فرمایا اس وقت واقعہ قیامت گویا سامنے ہو گیا اور کیفیت مصیبت قیامت کی سب پر طاری ہوئی، مجھ کو

خیال آتا ہے کہ زیادہ حضرت نے اس آیت سے اس آیت (۱) پر چیخ ماری کہ سب کو پل صراط پر ایک روز اترنا ہوگا، غرض جس چیز کا بیان مجلس میں ہوتا تھا پہلے آپ پر کیفیت آتی تھی بعد اس کے بطور عکس موافق استعداد ہر شخص پر طاری ہوتی تھی۔ (۲)

اللہ کے معنی زبان ہندی میں

مولانا سید محمد علی صاحب لکھتے ہیں۔ ایک روز عصر کے وقت اس کمترین کو نزدیک بلا کر ارشاد کیا، کہ مولوی عبدالقادر صاحب کے ترجمہ سے دو سو برس پیشتر بھا کھا میں نہایت عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا ہے ہم نے دیکھا ہے، اللہ کا ترجمہ جانتے ہو ہندی میں کیا ہے میں نے تامل کیا، فرمایا منموہن، الہ کو ولہ یلہ سے بھی مشتق کہتے ہیں من کہتے ہیں دل کو موہن موہنے والا یہ کہتے ہوئے چیخ ماری اور آہ کی۔ (۳)

حدیث دوست

ایک بار مولوی امیر احمد صاحب نے مولوی عبدالکریم صاحب (۴) کو خط لکھا تھا مولوی عبدالکریم صاحب کا دستور تھا کہ کوئی کام بے اجازت حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے نہیں کرتے تھے، وہ خط حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیا حضرت نے فرمایا کہ اس کے جواب میں لکھ دو۔
ماہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الاحدیث دوست کہ تکراری کنیم (۵)

محبت و نسبت کے بغیر زندگی بیکار

ایک بار حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک بڑے معقولی مدرس کا ذکر آیا پہلے تو ان کے تضحیح اوقاتی پر چند کلمے افسوس کے فرمائے جس سے ان مدرس صاحب کی اہانت نکلتی تھی پھر حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گورحمت اس کی بڑی وسیع ہے، بخشے گا مگر کس کام کی وہ زندگی کہ جب اس میں کوئی بات ہی نہیں پیدا کی۔ (۶)

(۱) وان منکم الا وادھا یہی آیت تھی کہ جس پر آپ نے چیخ ماری

(۲) فضل رحمانی ص ۳۳ (۳) ارشاد رحمانی ص ۴۶

(۴) مولانا عبدالکریم صاحب فاضل، صاحب درس تھے سب چھوڑ چھوڑ کر حضرت مولانا کی خدمت میں آ رہے تھے مولانا کے

خلفاء میں میں گنج مراد آبادی میں انتقال کیا۔ (۵) فضل رحمانی ج ۱ ص ۴۷ (۶) ایضاً ج ۲ ص ۱۲ و ۱۳

عشق کی دکان

حضرت مولانا محمد علی صاحب نے فرمایا کہ ایک بار ہم مراد آباد حاضر ہوئے حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم نے کوئی عشق کی دکان دیکھی ہے؟ ہم نے سکوت کیا پھر آپ نے خود ہی فرمایا کہ ہم نے دودکانیں دیکھی ہیں، ایک شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دوسری حضرت شاہ آفاق رحمۃ اللہ علیہ کی، کہ اس دکان میں سودا عشق کا بکا کرتا تھا۔ (۱)

اللہ و رسول پر جان قربان کرنا چاہئے

مولانا محمد علی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک روز ارشاد فرمایا کہ پڑھنے پڑھانے سے کیا ہوتا ہے دیکھو میں کچھ قرآن شریف پڑھ لیتا ہوں اور تھوڑا سا کچھ اور، پھر لطف میں آکر فرمایا کہ اللہ و رسول پر جان قربان کرنا چاہئے، اس سے سب کچھ ہوتا ہے اور چند شعر پڑھے جن میں سے دو شعر یہ ہیں۔

سحر میں سامری کے کیا قدرت تیری آنکھوں میں جواثر دیکھا
ہجوم داغ نے میرے یہ گلفشانی کی کہ اس نے آپ تماشے کو مہربانی کی (۲)

پریم کا پیالہ

ایک جوان لڑکا، طالب خدا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا، آپ نے از روئے امتحان مسجد سے نکلوا دیا جب دروازہ کھلا احمد میاں صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر مسجد میں لے آئے پھر آپ نے کچھ نہ فرمایا، بعد نماز کے اس کو بلا کر مطلب پوچھا کہا پریم کا پیالہ پلا دو، آپ نے شربت منگا کر آدھا خود نوش فرمایا اور آدھا اس کو پلا دیا کہ چلا جاوہ کامیاب روانہ ہو گیا۔ (۳)

اللہ کی محبت میں مزہ

ارشاد ہوا کہ :- اللہ کی محبت میں جو مزہ ہے وہ جنت کی چیزوں میں نہیں ہے، حور و قصور اور کھانے کی چیزیں اور حوض کوثر ان سب کا مزہ اس مزہ کے روبرو کچھ نہیں ہے، عاشقوں کو جنت بھی اسی وجہ سے پسند ہوگی کہ اس میں اسی کا جمال ہے۔

عاشق راز و محشر باقیامت کار نیست کار عاشق جز تماشاۓ جمال یار نیست ہمیں یہ مزہ قرآن مجید پڑھنے میں آتا ہے جنت میں جب ہمارے پاس حوریں آئیں گی تو ان سے کہیں گے کہ آؤ ذرا قرآن مجید تو سن لو، بعض مرتبہ ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ قریب تھا کہ دم نکل جائے مگر حضرت (شاہ محمد آفاق صاحب رحمہ اللہ) پاس بیٹھے ہوئے تھے اللہ کے فضل سے بچ گئے۔ (۱)

دردِ عاشق

مولانا محمد علی صاحب نے ایک مرتبہ مزاج مبارک کا حال دریافت کیا کمر میں درد تھا فرمایا کہ ہم ہمیشہ اچھے رہتے ہیں اور یہ شعر پڑھا۔
نزد عاشق درد و غم حلوا بود گرچہ بادِ یگر کساں بلوا بود
پھر اور مضامین عشقیہ اور اشعار زبان فیض ترجمان سے جوش میں نکلے جس سے بہت کچھ کیفیت اور گریہ رہا۔ (۲)

اہل درد اور اہل محبت کو بڑی مدد اشعار عاشقانہ سے ملتی ہے اس ”حدیث دیگران“ میں وہ ”سر دلبران“ بیان کرتے ہیں اور دلوں کا سر جوش ان اشعار کی راہ سے نکلتا ہے کسی عرب شاعر نے سچ کہا ہے۔

سقونی وقالوا لا تغنّ ولو سقوا جبال سلیمی ماسقیت لغنت
”مجھے جام محبت پلایا اور ترنم اور اور نغمہ سرائی سے منع کیا، حالانکہ پہاڑ کو بھی اگر یہ جام پلادیا جائے تو وہ نغمہ سرا ہو جائیں“

مولانا لطف و شفقت کے وقت بکثرت شعر پڑھتے اللہ تعالیٰ نے ایسا مذاق سلیم عطا فرمایا تھا کہ جو شعر زبان سے نکلتا وہ انتخاب ہوتا اور دل کی کیفیت کا صحیح ترجمان، ان کی قلبی کیفیت پڑھنے کا لطف اور موقع بھی اس شعر میں جان ڈال دیتا اور سننے والوں کے دل نقش ہو جاتا۔

اشعار عاشقانہ

مولانا محمد علی صاحب لکھتے ہیں: حضرت قبلہ رحمہ اللہ کو اشعار کثرت سے یاد ہیں اور جس

سوانح علمائے دیوبند ع ۱۸۱ حضرت مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی

مجلس میں آپ لطف میں اگر اشعار پڑھنے لگتے ہیں وہ صحبت بھی عجیب لطف کی ہوتی ہے جس کے مزے کو دل ہی جانتا ہے نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اشعار جو آپ کی زبان فیض تر جان سے نکلے ہیں اور اس وقت پیش نظر ہیں ہدیہ اہل مذاق کروں، ایک روز بعد نماز صبح حسب معمول حضرت مراقب تھے اور یہ کمترین پیچھے بیٹھا ہوا تھا کہ رقت طاری ہوئی، آپ فارغ ہو کر کھڑے ہوئے میں اسی حال میں تھا آپ نے مجھے دیکھ کر یہ شعر پڑھا۔

اے خوش آں چشمے کہ گریاں می نمود

اے خوش آں جانبکہ بریاں می نمود

اس شعر کے سنتے ہی میں از خود رفتہ ہو گیا رباعی ۔

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عزیز و خانماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی دیوانہ توہر دو جہاں راچہ کند
صحیح بخاری کا سبق ہو رہا تھا، اس میں وہ حدیث آئی کہ لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اور ان کے بعد تابعین کو تلاش کیا کرتے تھے تاکہ ان کی برکت سے دشمن پر فتح یابی چاہیں، اس وقت حضرت ﷺ نے یہ شعر پڑھا۔

سر سبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو

ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

ریتا شاہ جو ایک کامل درویش تھے ان کا ایک مرید ”پھر مانگ“ لکھاتا پھرتا تھا حضرت نے فرمایا کہ وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے بھی لکھنے کی درخواست کی، میں نے کہا کہ ہم نہیں لکھتے، یہ تو بتاؤ کہ تم کیوں لکھواتے ہو، اس نے کہا مرشد نے کہا ہے اور میں کچھ نہیں جانتا حضرت نے فرمایا کہ ہم سے سنو اور یہ قطعہ اسے سنایا۔ قطعہ

کس نے پھر مانگ کہا کس نے منگایا مجھ کو کس نے دیوانہ صفت آپ پھر لیا مجھ کو

تو وہ داتا ہے کہ سیری نہیں دینے سے تجھے لذت جود سے پھر مانگ سکھایا مجھ کو

یعنی ادعویٰ استعجب لکم قرآن مجید میں فرمایا۔

ایک روز حضرت سورہ مریم پڑھ کر اس کا ترجمہ فرماتے تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حال میں یہ آیت آئی :- وکان عند ربہ مرضیا اس کا ترجمہ کیا ”اور تھا اپنے رب کا پیارا“ اور زور سے چیخ ماری اور سکوت کیا پھر یہ شعر پڑھا۔

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

اسی روز آپ بیمار ہوئے اور بعض اوقات یہی شعر پڑھتے تھے جس کی وجہ سے ارادتمندوں کو ہراس ہوتا تھا۔

یہ شعر بھی اکثر آپ کی زبان مبارک سے سنے گئے۔

ہجوم داغ نے میرے یہ گلفشانی کی کہ اس نے آپ تماشے کی مہربانی کی

دن میں سو سو بارواں جانا مجھے اس میں سودائی کہے یا کوئی دیوانہ مجھے

دل کس کی چشم مست کا سرشار ہو گیا کس کی نظر لگی کی یہ بیمار ہو گیا

ہندی اشعار

اسمن مور لب دیو تو ہیں سمرن تور بسر گیومن ہیں

اپنے پیار پر تن من واروں جو واروں سو تھوڑارے

ندیکنارے مور لا بولے میں جانوں پیا مورارے

گونکے باجے باجن لاگے انگنا میں ٹھاری لجاؤں

ان کے نام کی آسا لگی ہے جن کا محمد ناؤں

جائے کس واسطے اے درد میخانہ کے بیچ

اور ہی مستی ہے اپنے دل کی پیمانہ کے بیچ

کیا کریں سیر چمن یاں آرزو کچھ اور ہے

گل کو کیا سونگھیں دماغ اپنے میں بو کچھ اور ہے

ایک مرتبہ فرمایا کہ بوڑھے ہونے سے کچھ آتش محبت کم نہیں ہو جاتی بلکہ زیادہ ہو جاتی

ہے اور یہ شعر پڑھا۔

دل ڈھونڈھنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے

اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے (۱)

مولوی سید تاجمل حسین صاحب کہتے ہیں ایک بار بوقت رخصت ارشاد ہوا۔

دیدہ سعدی و دل ہمراہ تست

تانہ پنداری کہ تنہائی روی (۱)

ملاواں کے راستہ میں ایک باغ پڑا، اس میں کھڑے رہے اور فرمایا۔

باد نسیم آج بہت مشکبار ہے

شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلف یار ہے

شعر فرمودہ حضرت ﷺ

جب عشق میں تیرے بھر گئے ہیں

تو ہی رہا گذر گئے ہم

تیرے ہی طرف کو راہ نکلی

بھولے بھٹکے جدھر گئے ہم

آنحضرت ﷺ سے تعلق و عشق

مولوی تاجمل حسین صاحب اور نواب نور الحسن خاں لکھتے ہیں کہ حضرت ﷺ نے

آنحضرت ﷺ کے ذکر میں پڑھا ”جن گلیاں محمد ﷺ چلیں وہ گلیاں میں پلکیں بہوروں (۲)“

نواب نور الحسن خاں مرحوم لکھتے ہیں:- ایک صاحب نے دو کتابیں تصوف کی حضرت

قبلہ کی خدمت میں پیش کیں، حضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں کوئی کتاب تصوف کی نہیں دیکھتا

اور میرا دل خود تصوف ہے اور میرا تصوف یہ ہے کہ سورہ مزمل کی پہلی آیت پڑھ کر ترجمہ

فرمایا اور شعر نعت کا پڑھا۔

تر ہوئی باران سے سوکھی زمین

یعنی آئے رحمتہ للعالمین (۳)

(۱) ارشاد رحمانی ص ۴۵

(۲) فضل رحمانی ص ۶۵ و مجموعہ رسائل تصوف ص ۵۳

(۳) صحیفہ راز۔ مجموعہ رسائل تصوف ص ۹۷

اتباع سنت اور احترام شریعت

اس عشق و محبت و ذوق و شوق کے باوجود اس درجہ کا اتباع سنت اور احترام شریعت تھا کہ مبصر اور صاحب نظر دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس درجہ کا تتبع سنت ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، ان دو چیزوں کا اجتماع ایسا نادر و نایاب ہے کہ کہنے والوں نے بہت پہلے کہا ہے۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

ہر ہو سنا کے نداند جام و سندان باختن

لیکن مولانا کی زندگی ”سندان عشق“ اور ”جام شریعت“ کے اجتماع کا اس دور آخر میں بہترین نمونہ ہے۔

علو مرتبہ کا سبب

مولوی تاجل حسین صاحب لکھتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضور نے کون سا عمل عمدہ فرمایا ہے کہ اس درجہ کو پہونچے۔ ارشاد ہوا کہ سنت رسول اللہ ﷺ پر عمل کرنے سے (۱)

شریعت کے بغیر کچھ نہیں

فرمایا کہ۔ غوث ہو یا قطب، جو خلاف شرع کرے، وہ کچھ بھی نہیں (۲)

اتباع سنت کا درجہ

نواب نور الحسن خاں صاحب لکھتے ہیں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ۔ اتباع سنت یہی غوثیت اور قطبیت ہے (۳)

اتباع کے معنی

ایک جلسہ میں یہ ارشاد ہوا کہ فاتبعونی یحببکم اللہ اس کا ترجمہ کہو پھر خود ہی فرمایا کہ۔ ہماری چال چلو تب پیار کرے گا اللہ تم لوگوں کو (۴)

(۱) فضل رحمانی ج ۱ ص ۱۳۶ (۲) مجموعہ رسائل تصوف ص ۴۴ (۳) ایضاً ص ۴۸ (۴) فضل رحمانی حصہ دوم ص ۵

اتباع شریعت کی تاثیر

مولانا سید محمد علی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ مشائخ تصور شیخ بھی تعلیم کرتے ہیں اور اس کو نہایت موثر اور سہل ترین راہ بتاتے ہیں مگر ہمارے حضرت مدظلہم العالی۔ بسبب کمال احتیاط کے اس کی تعلیم نہیں فرماتے، میں نے مکرر تصور شیخ کی نسبت دریافت کیا، ایک مرتبہ ارشاد ہوا کہ ہمارے حضرت کے یہاں یہ تعلیم نہیں تھی، شیخ کی محبت اور اس کا اتباع چاہئے، اور محبت کی وجہ سے بے اختیار تصور آجانا اور بات ہے خود صحابہ کو ایسا ہوتا تھا۔ چنانچہ بعض صحابہ کا مقولہ ہے۔

کانی انظر الی و بیص ساقیہ (۱)

ارشاد ہوا کہ تصور یا بے تصور شیخ کی محبت ہونی چاہئے، ہم نے کبھی نہیں کیا ہم تو وہی باتیں کرتے تھے جو حدیث میں آئی ہیں اسی سے کلمہ لا الہ الا اللہ جاری رہتا تھا یاد رکھو کہ جو بات شریعت کے اتباع اور ان اعمال سے حاصل ہوتی ہے جو حدیث میں آئے ہیں وہ کسی سے نہیں ہوتی۔ (۲)

اذکار و اوراد میں حدیث کی پیروی

مولانا سید محمد علی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ بعد ظہر انا فتحن پڑھنا چاہئے؟ ارشاد ہوا کہ حدیث میں نہیں آیا پھر عرض کیا کہ بعد عصر عم یتساء لون پڑھنا چاہئے؟ ارشاد ہوا کہ یہ بھی حدیث میں نہیں آیا مگر میں کبھی بعد عصر اور کبھی قبل عصر پڑھ لیتا ہوں۔ (۳)

ایک مرتبہ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دعا پڑھی :- اللھم اغفر لی ذنبی ووسع لی فی داری وبارک لی فی رزقی اور ارشاد ہوا کہ وضو کے اندر اسی دعا کا پڑھنا حدیث سے ثابت ہے اور کسی دعا کا پڑھنا حدیث میں نہیں آیا۔ (۴)

میں نے عرض کیا کہ پیشتر حضور فلاں آیت پڑھ دیتے تھے، ارشاد ہوا کہ حدیث میں نہیں آیا، معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف حالت کی وجہ سے معمول میں اختلاف ہوا، آخر میں اتباع سنت کا غلبہ ہو گیا اس وجہ سے انہیں اعمال پر مدار رہا جو بہ تخصیص حدیث میں آئے ہیں اگرچہ کسی اور آیت کا پڑھ دینا خلاف حدیث نہیں ہے۔ (۵)

مولوی نجم الحسن صاحب لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ فقیر نے عرض کیا کہ ہم نماز ظہر میں اللہ

(۱) ارشاد رحمانی و فضل یزدانی ص ۲۱ (۲) ایضاً ص ۲۲ (۳) ارشاد رحمانی و فضل یزدانی ص ۲۸، ۲۹

(۴) ارشاد رحمانی و فضل یزدانی ص ۲۹ (۵) ارشاد رحمانی و فضل یزدانی ص ۵۳

الصمد پانچ سو مرتبہ پڑھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ حدیث میں قل هو اللہ احد اللہ الصمد پورے سورہ تک پڑھنے کو فرمایا ہے اور اللہ الصمد تو نہیں فرمایا کسی اور دعا کو ہم نے پیش کیا آپ نے فرمایا کہ پڑھنے کو تھوڑی منع کرتے ہیں ذکر اس کا ہے کہ سنت نہیں ہے حضرت ﷺ کو سنت کا بڑا لحاظ تھا۔ (۱)

ماثورہ دعائیں

نواب نور الحسن خاں مرحوم لکھتے ہیں حضرت نے فرمایا کہ مشائخ سے جو دعائیں منقول ہیں ان میں وہ تاثیر نہیں جو کہ آنحضرت ﷺ نے دعائیں فرمائی ہیں ان میں ہے۔ (۲)

درود شریف کی اہمیت

ارشاد فرمایا۔ ”درود بکثرت پڑھو، جو کچھ ہم نے پایا درود سے پایا۔ (۳)

اتباع سنت کا مفہوم

آپ نے فرمایا کہ اتباع سنت یہی ہے کہ جیسا آنحضرت ﷺ نے کیا ہے اسی طرح کرے گھٹائے بڑھائے نہیں اور یہ قطعہ پڑھا۔
گرد نعل اسب سلطان شریعت سرمہ کن
تا شود نور آلہی باد و چشمت مقترن (۴)

فنا فی الرسول ﷺ کا مطلب

مولانا محمد علی صاحب لکھتے ہیں کہ ارشاد ہوا کہ افعال ظاہری رسول اللہ ﷺ سہولت اور بے تکلف ہونے لگنا یہی فنا فی الرسول ہے اور کچھ نہیں۔ (۵)

ولایت کی تعریف

مولانا تحریر فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ حضرت حالتیں سب کچھ طاری ہوتی ہیں مگر وہ جو بات ہے وہ نہیں ہے، ارشاد ہوا کہ کوئی آسمان پر اڑنے نہیں لگتا ہے، ولایت

(۱) فضل رحمانی (جلد ثانی) ص ۷۰ (۲) مجموعہ رسائل تصوف ص ۴۷ (۳) فضل رحمانی ص ۳۶

(۴) انوار ابن حنفیہ ص ۱۴۱ (۵) ارشاد مولانا صاحب فضل ص ۱۴۱

سوانح علمائے دیوبند علیہ السلام ۱۸۷ حضرت مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی
 اسی کو کہتے ہیں کہ احکام شریعت بے تکلف ہونے لگیں اور افعال شریعت ایسے ہو جائیں
 کہ گویا امور طبعی ہیں۔ (۱)

رسوم کی ناپسندیدگی

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں کہ چودھری (محمد عظیم صاحب) نے یہ بھی بیان کیا کہ
 وزیر علی شاہ صاحب کے انتقال کے بعد ہم بطور تعزیت سوم روز گئے اور ہم حساب کر کے گئے
 کہ آج سوم ہے مگر وہاں کچھ نہیں تھا ان کے بیٹے نے کہا کہ شاہ صاحب کی وصیت تھی کہ سوم
 چہارم یہ سب ہمارا نہ ہو، چنانچہ ”بانگر منو“ سے ہم واپس آئے تو حضرت قبلہ رحمہ اللہ دروازے
 پر کھڑے تھے، فرمایا کہاں سے آتے ہو چودھری صاحب نے کہا میاں وزیر علی شاہ صاحب کے
 یہاں تعزیت کو گئے تھے اور آج روز سوم حساب کر کے گئے تھے مگر معلوم ہوا کہ سوم چہارم کی
 ممانعت میں وصیت کی تھی، اس پر حضرت قبلہ رحمہ اللہ خوش ہوئے اور فرمایا ہاں یہی چاہئے اور
 اس جگہ کچھ اور لفظ بھی فرمایا جس کے معنی یہ ہیں کہ شریعت کی پابندی عمدہ چیز ہے۔ (۲)

چہلم و عرس کی ممانعت

ہم نے یعنی فقیر تجمل حسین نے حضرت قبلہ رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ بدعت کی جزئیات کو
 فرما دیجئے مثلاً بعد انتقال حضور کے چہلم و چہارم ہو گا یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم
 کا فعل یہ نہ تھا، الغرض آپ کے عہد میں یہ سب نہ تھا پھر ہم نے عرض کیا کہ بعد انتقال
 حضور کے عرس مزار پر آپ کے ہویا نہیں؟ آپ نے فرمایا ہرگز عرس نہ ہو، جب کوئی سنے
 فضل رحمن کا انتقال ہوا تو چار قل پڑھ کر بخش دے بس اس سے زیادہ کچھ نہ کرے، اس پر
 جناب احمد میاں صاحب نے فرمایا کہ قل و عرس تمام بزرگان کا ہوتا ہے، یہاں بھی ہونا چاہئے
 آپ نے بہت خفا ہو کر فرمایا کہ ہرگز نہ ہو، ہماری قبر پر کوئی میلہ نہ کرے۔ (۳)

بدعات و رسوم کی مخالفت

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں۔ ارباب مونگیر نے تعزیہ کے بارے میں حضرت
 قبلہ رحمہ اللہ کی خدمت میں استفتا ارسال کیا، آپ نے اس پر یوں تحریر فرمایا ”ما امور مذکورہ

راقا کل منیم ہرچہ خلاف سنت است بدعت است (۱) "عرض کیا گیا کہ چہلم و سوم جو آج کل مسلمانوں میں مروج ہے بدعت ہے یا نہیں؟ فرمایا بیشک بدعت ہے۔ (۲)

راقم نے عرض کیا کہ حضور کے انتقال کے بعد ہم لوگوں کا اجتماع آپ کے مزار پر عرس کے لئے ہوا نہیں، یا یہ بھی بدعت ہے، آپ نے فرمایا کہ کچھ ضرور نہیں ہے ہماری قبر پر کوئی جمع نہ ہو، حضرت احمد میاں صاحب نے فرمایا کہ تمام درویشوں کا عرس ہوتا ہے، لوگوں کو فیض ہوتا ہے، آپ نے فرمایا کہ جب کوئی سنے ہم مر گئے اسی وقت الحمد اور چار قل پڑھ کر ہم کو بخش دے، اس وقت اس کو فیض پہونچے گا راقم کہتا ہے کہ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کو خیال سنت کا بہت تھا آپ نے اپنے پیر کا عرس نہیں کیا اور نہ ان کے پیر نے اپنے پیر کا عرس کیا۔ (۳)

احکام و مسائل شریعت کا احترام

ایک مرتبہ مولوی محمد شفیع صاحب بجنوری نے حج کو جانے کا ارادہ ظاہر کیا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: شرائط حج کی بھی خبر ہے یا ویسے ہی حج کا ارادہ کر لیا۔ حضرت مولانا کا مطلب یہ تھا کہ زاد و راحلہ و نفقہ اہل و عیال بھی ہے یا نہیں؟ مولوی محمد شفیع صاحب نے عرض کیا۔ حضرت جی ہاں شرائط کی خبر ہے فرمایا کیا خبر ہے؟ انہوں نے حضرت خواجہ حافظ کا یہ شعر پڑھ دیا۔

در رہ منزل لیلیٰ کی خطر ہاست بجاں

شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شعر سن کر ایک پر جوش نعرہ لگایا، لیکن فوراً ہی سنبھل گئے اور فرمایا کہ سب واہیات ہے جو شریعت نے فیصلہ کیا وہی برحق و درست ہے۔ (۴)

حدیث و فقہ کی عظمت

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں:- ایک بار کانپور کے ایک مشہور مدرس صاحب آپ کی خدمت میں پہونچے آپ نے حسب عادت پوچھا کہ کیا پڑھاتے ہو انہوں نے سب علموں کا نام بتایا معقول کو زائد بتلایا آپ نے فرمایا کہ:- منطق کے زیادہ پڑھانے سے قلب سیاہ ہو جاتا ہے، حدیث و فقہ پڑھا کر وہ دیکھو اگر کسی کے آنکھ ہو تو ہم بتادیں اور دکھادیں کہ مولوی عبدالحی مرحوم

کی قبر میں کیا حالت ہوئی کہ قبر ان کی منور ہے، ہدایہ کا حاشیہ لکھنے کے سبب سے اللہ نے ان کو اس درجہ میں رکھا ہے قاضی مبارک کو دیکھو کہ معقول کے اشتغال سے کیا حالت ہوئی (۱)

علم و علماء کا احترام

شریعت کی جو تعظیم و توقیر آپ کے دل میں تھی اس کا اثر و نتیجہ یہ تھا کہ آپ علماء شریعت کی بڑی تعظیم و توقیر فرماتے اور اگر کوئی عالم ربانی آپ کی خدمت میں آتا تو بڑی پذیرائی اور احترام فرماتے اور بڑا اہتمام کرتے اور آپ کو اس کی آمد کی بڑی خوشی ہوتی، مولوی سید تاج محل حسین صاحب فرماتے ہیں جب مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ کی ملاقات کو تشریف لائے تو اتنی بڑی خوشی آپ کو تمام عمر نہیں ہوئی تھی، آپ نے اپنی چارپائی پر بٹھایا اور تعظیم کی اور فرمایا کہ میں نے بوڑھا ہو کر تمہاری تعظیم بہ سبب تمہارے علم کے جو کی، اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعظیم کی تھی اور جناب احمد میاں صاحب کو بلا کر فرمایا کہ تم کو ان کے آنے سے خوشی ہوئی یا نواب حیدر آباد کے آنے سے، حضرت احمد میاں نے فرمایا کہ ان کے آنے سے میں خوش ہوا، حضرت نے فرمایا کہ تم اپنے نئے مکان کے دالان میں چارپائی بچھاؤ کہ یہاں مسجد میں زمین پر تکلیف ہوگی اور کھانا ان کے واسطے اچھا اچھا تیار کرو۔ (۲)

جب مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے ان کے آنے میں بھی آپ نے بہت خوشی کی اس لئے کہ آپ مولانا شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ (۳)

اسی طرح سے مولوی امیر احمد صاحب سہوانی مولوی عبدالکریم صاحب کے استاد تشریف لائے حضرت رحمۃ اللہ علیہ آپ کے آنے پر بھی بہت خوش ہوئے، چونکہ علم ادب میں ان کا زیادہ شہرہ تھا اس لئے بوقت سبق بخاری شریف کے بڑا حلقہ اہل علم کا تھا مولوی امیر احمد صاحب سے جا بجا لغت وغیرہ استفادہ فرماتے رہے مولوی صاحب موصوف بتاتے گئے مولانا نور اللہ مرقدہ آپ سے بہت خوش ہوئے اور کیوں نہ ہو یہ پرانے مدرس تھے۔ (۴)

بالآخر مولوی امیر احمد صاحب رخصت کئے گئے اس طرح پر کہ مولوی عبدالکریم صاحب کئی برس سے مسجد میں معتکف تھے اور احاطہ مسجد سے باہر نہیں ہوئے تھے مگر اس روز ان کو حکم ہوا کہ مولوی عبدالکریم صاحب بستی کے باہر تک اپنے استاد کیساتھ پہنچانے جاویں۔ (۵)

قرآن و حدیث سے عشق

قرآن و حدیث سے آپ کو ایسا شغف تھا جس کو عشق سے کم کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، آپ کے واقعات و کیفیات ہی سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

قرآن کی لذت و دولت

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں۔ ایک روز آپ تلاوت قرآن کر رہے تھے کہ آپ پر کیفیت طاری ہوئی، راقم سے فرمایا کہ جو لذت ہم کو قرآن میں آتی ہے اگر تم کو وہ لذت ذرہ بھر آوے تو ہماری طرح نہ بیٹھ سکو، کپڑے پھاڑ کر جنگل کو نکل جاؤ آپ نے آہ کی اور حجرہ میں تشریف لے گئے، اور کئی روز تک بیمار رہے۔ (۱)

مولانا سید محمد علی صاحب نے فرمایا کہ میں نے ابتداء میں حضرت عرض کیا کہ ہم کو جو مزہ شعر میں آتا ہے قرآن شریف میں نہیں آتا، آپ نے فرمایا کہ ابھی بعد ہے، قرب میں جو مزہ قرآن شریف میں ہے، کسی میں نہیں۔ (۲)

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں کہ مجھ سے فرمایا کہ قرآن شریف اور حدیث پڑھا کرو کہ اللہ میاں دل پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ (۳)

ایک روز آپ نے فرمایا کہ نسبت قرآن کی غایت سلوک ہے۔ (۴)
ایک مرتبہ فرمایا کہ ہم کو اگر قرآن شریف کے بدلے جنت ملے تو منظور نہیں، اگر قرآن شریف ہو تو کیا مضائقہ ہے، ہمارے پاس جنت میں حوریں آئیں گی تو ان سے ہم کہیں گے کہ آؤ بی بی بیٹھ جاؤ تم بھی قرآن شریف سنو۔ (۵)

شغل حدیث

مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ راوی ہیں کہ ایک بار حدیث شریف کا سبق پڑھا کر یہ شعر پڑھا۔
ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الاحادیث دوست کہ تکراری کنیم (۶)

(۱) ذکر رحمانی ص ۷ (۲) مجموعہ رسائل تصوف ص ۲۹ (۳) کمالات رحمانی ص ۵۲

(۴) مجموعہ رسائل تصوف ص ۵۵ (۵) فتاویٰ رحمانی ص ۲۳ (۶) ابواب ثلاثہ ص ۲۹

حدیث سے خوشی

مولوی سید تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں کہ بعض وقت بلکہ کتنی مرتبہ ہم نے خود رخصت ہونا چاہا آپ فرماتے تھے کہ جلدی کیا ہے ٹھہرو، حدیث ابوداؤد شروع ہوئی ہے اور کبھی پہونچنے کیسا تھ ہی آپ بہت خوش ہو کر مجھ سے فرماتے تھے کہ اچھا ہوا کہ تم آئے حدیث شروع ہوئی ہے (۱)

حدیث پڑھنے میں توجہ الہی

ایک محدث صاحب تشریف لائے، تو حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، کہ :- تم جانتے ہو کہ حدیث پڑھنے میں اللہ کو کیسی محبت ہوتی ہے، اور کیسا پیار ہوتا ہے، جیسے کسی عورت کا لڑکا مر جائے، اور اس کی کوئی کتاب پڑھنے کی ہو، اور اس لڑکے کے مرنے کے بعد اس کی ماں کسی طالب علم کو دے، کہ یہ میرے لڑکے کی کتاب ہے، اس کو پڑھو اور ہم کو سناؤ، اب اس وقت پڑھنے میں جو کیفیت اور جوش محبت اس کی ماں کو ہوتا ہے، ویسا ہی بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کی حدیث پڑھوانے سے ایک محبت کا جوش اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے۔ (۲)

حدیث کا فیضان

ایک بار آپ نے حدیث کے فیضان کو فرمایا، کہ :- شیخ عبدالحق محدث رحمۃ اللہ علیہ جہاں حدیث پڑھاتے تھے، ایک بزرگ نے دیکھا کہ وہاں انوار آسمان سے زمین تک نازل ہو رہے ہیں، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں درس حدیث ہوتا تھا، اب وہاں گنوار رہتے ہیں۔ (۳)

حدیث و قرآن کی مزاولت کے اثرات

مولوی سید تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں، کہ تعلیم امور باطنی کے باب میں جو طریقہ مروجہ ہے اس بارہ میں آپ سے عرض کیا، اس پر ارشاد ہوا، کہ :- یہی طریقہ شریعت عمدہ ہے، اسی حدیث و قرآن کی مزاولت اور اسی کی محبت کی برکت سے بڑے مراتب حاصل ہوئے ہیں، اور اصل دل کی درستگی ہے اور شریعت کی پابندی۔ (۴)

(۱) فضل رحمانی ج ۱ ص ۴۲

(۲) فضل رحمانی ج ۲ ص ۸۵۔ یہاں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی میں تمثیل مقصود ہے۔ ۱۲

(۳) فضل رحمانی ج ۱ ص ۱۳۷-۱۳۸ (۴) ایضاً ج ۱ ص ۸۳

درس حدیث کے وقت سرور و فیض

آخر عمر میں آپ کو اکثر استغراق رہتا تھا، مگر نماز کے وقت آپ کو استغراق کی کیفیت نہیں ہوتی تھی اور حدیث کے وقت آپ خوش ہوتے، اور حاضرین پر فیض کا نزول ہوتا، بعد ختم حدیث کے دعا فرماتے۔ (۱)

درس حدیث کی کیفیت

مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری اپنی حاضری کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، میں حاضر ہو کر ادب سے بیٹھنا چاہتا تھا کہ آپ نے فرمایا، کہ :- بخاری لا کر انھیں دو، میں نے پڑھنا شروع کیا، اس وقت کی کیفیت کو نہیں عرض کر سکتا ہوں، مادانیم و دل، مختصر اس کا یہ ہے کہ مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے، اور میں خاص حضرت علیؓ سے پڑھ رہا ہوں، اس وقت حضوری کی ایک ایسی لذت تھی کہ الفاظ کا بالکل خیال ہی نہ ہوتا تھا، اور حضرت ﷺ کبھی کبھی مسکراتے تھے، اور کبھی آہ آہ فرماتے تھے، کبھی کوئی اشعار پڑھتے تھے، کبھی ہندی کے گیت ارشاد فرماتے تھے، کہ پھر حضرت نے فرمایا، کہ علیؓ کا ترجمہ کرو، میں نے عرض کیا، آپ نے فرمایا نہیں، حضرت محبوب ہیں، زبان عشق سے کہو، پھر آپ نے خود فرمایا کہ علیؓ یعنی پیار کرے ان کو اللہ اور سلامت رکھے، اس جملہ پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ اور میں نے نعرہ مارا، حضرت نے فرمایا کہ مولوی ہو کر اتنا چلاتے ہو۔ (۲)

حدیث کے انوار کو کوئی نہیں پاتا

مولانا شاہ سلیمان صاحب ہی راوی ہیں :- ایک بار میں کانپور سے حضرت کے حضور میں حاضر ہوا، مولوی احمد حسن صاحب مرحوم کانپوری اور مولوی شاہ سید تجمل حسین صاحب بھی ہم سفر تھے، اس دفعہ دو تین دن ٹھہرا، مگر حضرت کو استغراق میں پایا، ہر چند استفادہ کرتا تھا، پتہ نہیں لگتا تھا، دو ایک بات بھی حضرت نے نہیں فرمائی، ہاں موطا شریف کے درس

میں کچھ مزے دار باتیں فرمادیا کرتے تھے، میں اس وقت مراقب تھا، حضرت احمد میاں صاحب نے فرمایا، باوا مولوی سلیمان صاحب موطا سننے کو نہیں آئے ہیں، یہ کچھ اور دیکھ رہے ہیں، حضرت رحمہ اللہ نے کچھ جواب نہیں دیا، بعد درس جب لوگ جانے لگے تب حضرت نے فرمایا، کہ :- حدیث کے انوار کو کوئی نہیں پاتا جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ (۱)

حدیث انتقال کے وقت

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں :- آپ نے علالت میں وصیت کی تھی کہ ہمارے مرنے کے وقت بھی حدیث پڑھی جاوے کہ روح ہماری حدیث سنتے سنتے نکل جائے۔ چنانچہ بعض آدمیوں نے حضور کی نزاع کے وقت حدیث رسول اللہ ﷺ کی پڑھی تھی۔ (۲)

حدیث دم واپس تک

حکیم عظمت حسین صاحب دم رحلت تک برابر حدیث پڑھتے رہے اور چونکہ قریب زمانہ رحلت کے حضرت قبلہ قدس سرہ کو دست آنا شروع ہو گئے تھے اسی حالت میں پانچخانہ سے آ کے آپ کو ضعف زیادہ ہو گیا تھا اس وقت حکیم صاحب سے فرمایا کہ لاؤ حدیث پڑھو، اگر پڑھتے پڑھتے جان نکل جائے تو بہتر ہے۔

غیرت از چشم برم روی تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم
گر بیا ید ملک الموت کہ جانم بہ برد
تانہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

بعد ازاں پھر صحت ہو گئی، پھر چند روز کے بعد علییل ہوئے مطابق اسی حکم کے جب آخر وقت مولانا صاحب رحمہ اللہ کا پہونچا تو حکیم صاحب حالت بے ہوشی میں بھی حدیث سناتے رہے اور قریب رحلت تک (یہ سلسلہ جاری رہا) اور سورہ یسین بھی پڑھتے تھے۔ (۳)

(۱) مکالات رحمانی ص ۴۱

(۲) فضل رحمانی ج ۱ ص ۲۳

(۳) فضل رحمانی (جلد ثانی) ص ۸۳، ۸۴

بذل و عطا

زہد و توکل کا طبعی و لازمی نتیجہ بذل و عطا اور جود و سخا ہے جس صاحب یقین پر دنیا اور دولت دنیا کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے، اور قل متاع الدنیا قلیل کا استحضار ہو جاتا ہے وہ بخل کے ہر شائبہ سے پاک ہو جاتا ہے جس کو اشرفیاں سٹکیاں اور ٹھیکریاں نظر آنے لگتی ہیں، اور مال کی محبت دل کے ہر گوشہ سے نکل جاتی ہے اس کا ہاتھ کون روک سکتا ہے، مولانا کا یہی حال تھا کہ ان کا محبوب مشغلہ مال و دولت تحائف و ہدایا کی تقسیم اور جو کچھ آئے اس کا جلد از جلد بانٹ دینا تھا، مولوی محمد حسین صاحب لکھتے ہیں، ایک مرتبہ نواب خورشید جاہ حیدر آبادی نے ہزار روپیہ کا نوٹ نذر کیا ایک بنیاد خدام خانقاہ دیر سے عرض کر رہا تھا کہ لڑکی کی شادی کے لئے چھ سو روپیہ چاہئے، نوٹ اسی کے حوالہ ہوا کہ چھ سو روپیہ لے کر چار سو یہاں دے جاوہ بھی بنیے کو جو صبح شام آٹا دال پہونچاتا تھا اس کو دے دیا، مہینہ میں ہزار ہا روپیہ نذر آتا تھا، اور سب کھانا کھلانے اور دینے لینے میں خرچ ہو جاتا تھا۔ (۱)

نفع عام اور خدمت خلق کا جذبہ

مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نے عرض کیا کہ آگ کی دھونی پر لوگ آپ پر اعتراض کرتے ہیں کہ حقہ والوں کی مدد کرتے ہیں اور یہ مکروہ ہے اور علاوہ اس کے تمام رات دن آگ جلانی ایک قسم کا اسراف بیجا ہے۔ ارشاد ہوا کہ یہ آگ جو تمام رات دن جلا کرتی ہے حقہ والوں کیلئے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ہمارے گاؤں کے غریب آدمیوں کو آگ نہیں ملتی ہے اس لئے یہ آگ روشن رہتی ہے اور اکثر نمازی پانی گرم کر کے غسل بھی کرتے ہیں۔ (۲)

تحائف اور کتابوں کی تقسیم

آپ کے پاس تحفے اور ہر ملک سے صد ہا قسم کی چیزیں از قسم ملبوس یا غیر ملبوس آتی تھیں۔ مگر

سب تقسیم ہو جاتی تھیں ایک مرتبہ فقیر کے سامنے ایک ٹوکرا مراد آبادی برتن کا آیا، آپ نے بعد مغرب سب نمازیوں کو برتن تقسیم کر دیئے، دو ایک برتن نو اسہ کھڑے ہوئے تھے ان کو دے دیئے کہ صاحبزادی کو دے اور ایک گلاس اپنے لئے رکھ لیا، اس کو بھی مسافر کو شب میں دے دیا۔ (۱)

ہمیشہ قرآن شریف یا اور کتابیں اہل مطبع بھیجا کرتے تھے، دیہات کے لوگ جو جمعہ پڑھنے کو آیا کرتے تھے ان سے استفادہ فرمایا کرتے تھے کہ تمہارا لڑکا کیا پڑھتا ہے جس نے کہا قرآن شریف پڑھتا ہے اس کو آپ دے دیا کرتے تھے شام تک کچھ کتاب وغیرہ باقی نہیں رہا کرتی تھی، اسی طرح آم کے زمانہ میں ٹوکروں آم آتے تھے اور شیرینی بکثرت آتی تھی اہل مسجد اور بستی کے لوگوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ (۲)

ایک مرتبہ جناب شاہ غلام رسول صاحب قدس سرہ کانپوری والد جناب مولوی شاہ عبدالحق صاحب کانپوری آپ کے پاس بہ نظر ملاقات تشریف لے گئے تو کسی نے ایک عبا پر تکلف بیش قیمت آپ کو نذر کی اور ایک جلد قرآن شریف مطلقاً نیز اٹھارہ سو روپیہ کی بھی نذر کی، حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ غلام رسول صاحب کو دے دیا اور فرمایا کہ آپ تکلف کا کپڑا پہنتے ہیں اسکو آپ ہی پہنئے اور قرآن شریف بھی انہیں بزرگ کو دے دیا، شاہ صاحب موصوف بھی اس سخاوت کو دیکھ کر حیران ہوئے اور فرمایا کہ بس تو کل اس کو کہتے ہیں، کپڑے صد ہا قسم کے آپ کے خدمت میں آتے تھے لٹھا، ملل شال، دو شالہ، کنو اب، سب طرح کی نذریں گذرتی تھیں مگر آپ سب تقسیم کر دیتے تھے خود دو تین آنہ گز کا کپڑا از قسم لٹھا وغیرہ کا انگر کھا پہنتے تھے (۳)

وزیر اودھ کا نذرانہ اور اس کی تقسیم

ایک بار وزیر لکھنؤ پر عتاب شاہی ہوا وہ از بس متفکر تھے سیف الدولہ مرحوم کہ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت رکھتے تھے انہوں نے وزیر صاحب سے کہا کہ اب کوئی چارہ کار نہیں، ان دنوں حضرت رحمۃ اللہ علیہ لکھنؤ میں آئے ہوئے ہیں ان سے اگر التجا کیجئے تو یہ کام ہو جائے، خلاصہ کلام وہ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض مطلب کیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بشارت فرمائی، بادشاہ نے وزیر صاحب کو بلا کر اعزاز بخشا وزیر صاحب دہ ہزار روپیہ

نذرانہ لائے حضرت نے فرمایا۔ روپیہ ہم کیا کریں گے تم اس روپیہ کے قرآن شریف چھپو اور پھر آپ لکھنؤ سے چلے آئے، اور ایک برس کے بعد پھر لکھنؤ آنے کا اتفاق ہوا وہاں قرآن شریف چھپے ہوئے تیار تھے وزیر صاحب کو خبر ہوئی ایک اونٹ پر تمام جلدیں قرآن کی لدوا کر بمزید انبساط ایک گھوڑا مع ساز و براق ساتھ لے کر آئے اور نذر کیا حضرت بہت خوش ہوئے اور وہاں سے سندیلہ کی طرف روانہ ہوئے اور سندیلہ تک سارے قرآن شریف بانٹتے آئے بلکہ اونٹ بھی دے دیا اور محتاجوں کو گھوڑے کا ساز و براق تک تقسیم کر دیا اور آخر میں گھوڑا بھی کسی کو عطا فرما دیا۔ (۱)

حق ہمسائیگی

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں آپ کا یہ بھی شغل تھا کہ بہ نظر سخاوت اکثر غریب عورتیں اپنے کھیت سے مٹی بقدر ایک بڑی رکابی کے کلوخ کے لئے لایا کرتی تھیں، آپ ایک پائی میں خرید کرتے تھے اور ایلہ یعنی گونٹھ موٹے موٹے لمبائی میں ہاتھ کے قریب تمام دن اس کی خریداری ہوتی تھی، فقیر نے عرض کیا کہ ایک بار گاڑی پر منگالیجئے کیونکہ ایک بڑی رکابی کے بقدر لاتی ہیں اور ایک پائی آپ دیتے ہیں اسی طرح گونٹھ کی قیمت بھی آپ بہت دیتے تھے، آپ نے سکوت فرمایا اشارتاً معلوم ہوا کہ پرورش ان کی منظور ہے اور حق ہمسایہ ادا کرنا مد نظر ہے۔ (۲)

ایلہ کی خریداری کے بارے میں عرض کیا کہ یہ عادت جو گیوں کی دیکھی ہے یا آتش پرستوں کی کہ تمام دن آگ جلایا کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ غریب محلہ کے لوگ آگ لے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک ایلہ بھی لے جاتے ہیں۔ (۳)

(۱) فضل رحمانی ج ۱ ص ۱۶۳

(۲) کمالات رحمانی مع ملفوظات جدیدہ ص ۸

(۳) کمالات رحمانی مع ملفوظات جدیدہ ص ۸

زہد و توکل

محبت و یقین کا طبعی خاصہ زہد و توکل ہے، جو جتنا بڑا صاحب محبت اور صاحب یقین ہے اتنا ہی بڑا زہد و متوکل ہے

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذت آشنائی

مولانا رحمہ اللہ کے زہد و توکل کے واقعات اولیائے متقدمین اور سلف صالحین کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

روپیہ کی قدر

مولوی تاجل حسین صاحب لکھتے ہیں:- آپ کا توکل محض اللہ پر تھا اگرچہ آخر زمانہ میں جناب نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم مغفور نے سو روپیہ مہینہ بھی ریاست سے کرا دیا تھا مگر کبھی آپ نے اس سے اپنا کام نہیں چلایا، بلکہ ایک مرتبہ نواب صاحب مرحوم مغفور نے کہا! بھیجا کہ سو روپیہ مہینہ آپ کے پاس ریاست سے جاتا ہے آپ کو ملتا ہے یا نہیں؟ آپ نے نہایت بے توجہی سے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ کیسا سو روپیہ آتا ہے مجھے تو کبھی ملا نہیں، اور حقیقت اس کی یہ تھی کہ چونکہ آپ کے نزدیک روپیہ کی قدر ٹھیکری کے برابر بھی نہ تھی لہذا اسکی طرف التفات نہ تھا اس لئے لڑکے گھر کے منی آرڈر لے کر اپنے مصرف میں لاتے تھے (۱)

روزمرہ کے خرچ کا قاعدہ

روزمرہ کے خرچ کا یہ قاعدہ تھا کہ بنیا مقرر تھا، آپ کو ادھار دیا کرتا تھا جب آپ کو فتوحات آتے تھے تب اس کا ادا کر دیا جاتا تھا اس کیلئے کوئی بھی کھاتا نہ تھا اس پانچ بنے دو کا انداز مقرر تھا حتیٰ کے نقد روپیہ بھی وہی قرض دیتے تھے مگر بغیر سود کے آپ کو قرض دیتے تھے، آپ کو

روپیہ قرض لینے کی اس وقت ضرورت ہوتی تھی کہ عرب یا پنجابی یا ولایتی یا اسی ہندوستان کے آدمی آتے تھے اور خرچ ان کے پاس نہیں ہوتا تھا تو حضور دس پانچ روپے دے کر رخصت کرتے تھے، ہزار ہا روپیہ ماہوار کا خرچ تھا بعض مہینہ کچھ زائد بھی ہوتا تھا، ارباب ملاواں کا خرچ اور بڑی صاحبزادی صاحبہ کا خرچ بھی یہیں سے تھا۔ قرض لے کر بنیئے سے کام کرنے میں حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی مصلحت تھی کہ اگر مال مشکوک بھی مسلمان میرے پاس بھیجیں گے تو بنیئے کافر سے تبادلہ ہو جاوے گا، تب موافق اس قول کے پاک ہو گیا یعنی تبادلہ سے تبدیل ملک کا ہو گیا، آپ نے یہ روش دہلی کی خانقاہوں سے سیکھی تھی حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ ایک گھنٹہ بھی روپیہ نہیں رکھتے تھے، جب کسی نے نذر کیا فوراً بنیئے کو بلا کر دیدیتے تھے آپ کے ذاتی مال میں سے لوٹا ایک دو گھڑے ایک چارپائی دو جوڑے کپڑے اس کے سوا کچھ نہیں تھا (۱)

فقیر کی دولت

ایک مرتبہ الہ آباد سے ہائی کورٹ کا ایک افسر اس تحقیق کیلئے آیا تھا کہ آپ کے پاس مجمع ہر ملک کے لوگوں کا اس قدر کیوں رہتا ہے کیونکہ اسی زمانہ میں حیدر آباد سے نواب خورشید جاہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے تھے آپ نے فرمایا کہ تو بہ کیلئے لوگ آتے ہیں ہم ان کے گواہ ہو جاتے ہیں تم بھی شرک سے تو بہ کرو ہم گواہ ہو جائیں گے، پھر وہ انگریز بہت خوش ہوا اور کہا کہ آپ کے خرچ خانقاہ کیلئے اگر فرمائیے تو ملکہ کے پاس لکھوں؟ آپ نے فرمایا کہ کیا ضرورت ہے ہمارے پاس خدا کے فضل سے دو جوڑے کپڑے اور دو لوٹے مٹی کے اور دو گھڑے موجود ہیں مجھے کیا ضرورت ہے وہ انگریز رخصت ہو گیا۔ (۲)

اسی طرح ایک بار کوئی حاکم آیا ہوا تھا اس نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اخلاقی تقریر سے خوش ہو کر کہا کہ اگر آپ فرمائیں تو آپ کی خانقاہ کے لئے گورنمنٹ سے کچھ مقرر کرادیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تمہاری گورنمنٹ کا روپیہ لے کر کیا کروں گا خدا کے فضل سے ایک رسی کی بنی ہوئی چارپائی اور دو لوٹے مٹی کے اور دو گھڑے مٹی کے موجود ہیں اور بعض مرید ہمارے باجرہ لے آتے ہیں اس کی روٹی ہو جاتی ہے بی بی صاحبہ کچھ ساگ یادال پکا دیتی ہیں اس سے لگا کر کھا لیتے ہیں۔ (۳)

حاتم دگراں و گدلے خوشن

مولوی محمد یحییٰ صاحب لکھنؤی نے فرمایا کہ جب آپ لکھنؤ میں تشریف لائے تو مطبع مصطفائی میں ٹھہرے ہم بھی حدیث پڑھنے کو جاتے تھے، آپ کے مکان سے بنجارہ آیا، ہم نے خبر دی کہ حضرت وطن سے آدمی آیا ہے اس سے خیریت دریافت کی جائے، آپ نے فرمایا کہ ہاں بلاؤ کہاں ہے وہ حاضر کیا گیا آپ نے اس سے پوچھا کہ کہو وطن میں کوئی مرا تو نہیں اس نے کہا کہ نہیں صاحب کوئی مرا نہیں ہے، پھر وہ جب جانے لگا تو اس نے میر صائب علی صاحب سے کہا کہ گھر میں خرچ مانگا تھا میر صائب علی صاحب نے کہا کہ حضرت! عورتوں نے کچھ خرچ مانگا ہے، آپ نے فرمایا کہ خدا کی پناہ! سولہ سیر باجرہ اور سولہ سیر جوار ہم دے کر آئے یہ سب کھا گئیں غضب خدا کا جنگ تبوک میں صحابہ کو ایک خرما روز دیا جاتا تھا، اسی پر قناعت کرتے تھے، المختصر اپنے گھر والوں کو کچھ نہیں دیا، باوجودیکہ شرف الدولہ نے کئی ہزار روپیہ آپ کو دیا تھا وہ روز تقسیم ہوتے تھے، اس میں سے ڈیڑھ سو بیج بھی گیا تھا مگر اس کو بھی لینے دینے کیلئے رکھا تھا کہ کوئی مستحق آ جاوے گا تب کام آوے گا، پہلے روز جو روپیہ آیا تو آپ نے عبد الرحمن خاں صاحب سے پوچھا کہ بخاری شریف تمہارے پاس کتنی جلد ہیں؟ انہوں نے کہا۔ بیس جلد، فرمایا قیمت کیا ہے؟ کہا تمیں روپیہ آپ نے فرمایا کہ ہم نے لے لیا، پھر پوچھا کہ مسلم شریف وغیرہ کس قدر ہے؟ غرض جتنی کتابیں حدیث و فقہ کی تھیں سب خرید لیں اور پھر تقسیم کرتے تھے، آخر بنجارہ کو میر صائب علی نے اپنے پاس سے تین روپیہ نکال کر دیئے اور اس کو رخصت کیا۔ (۱)

کیمیا اور دست غیب سے بیزاری

مولوی حکیم انوار الحق صاحب نے بیان کیا کہ ایک روز حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا گیا کہ فلاں فلاں بزرگ کو شوق کیمیا ہے دعاء فرمائیے کہ ان کو حاصل ہو جائے؟ آپ نے فرمایا اللہ کرے ان کو نہ آئے اور بھائی جس دل میں شوق کیمیا ہے نسبت الہی ہرگز قرار پذیر نہیں ہو سکتی ہے بعد اس کے مولوی صاحب موصوف سے راوی نے دست غیب کے باب میں

دریافت کیا کہ اس کے باب میں کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ یہ اس سے بھی بدتر ہے کیونکہ کسی نبی فقیر درویش کامل نے ایسے امور کی تمنا نہیں کی۔

صد تمنا درد دلست اے بوالفضول
کے بود نور خدا در دل نزول
بند بکسل باش آزاد اے پسر
چند خواہی بند سیم و بند زر (۱)

لاکھ روپیہ پر خاک

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں۔ مولوی محبت اللہ خاں صاحب امر وہہ نے بیان فرمایا کہ ہم سے نواب کلب علی خاں والی ریاست رامپور بے تکلفی رکھتے تھے اور بہت محبت کرتے تھے، ایک دن نواب صاحب نے ہم سے اپنا خیال ظاہر کیا کہ ہم کو بہت تمنا ہے کہ مولانا مولوی فضل رحمن محدث اس رامپور میں ہمارے یہاں تشریف لاویں تو خوب ہو، کیونکہ سب اہل علم ہر فن کے مجتمع ہیں مگر وہی ایک صاحب یہاں نہیں ہیں کہ جو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ کے صحبت یافتہ ہیں۔ اس پر مولوی صاحب موصوف نے نواب صاحب موصوف سے کہا کہ اگر ان کو ہم لاویں تو کیا آپ ان کے لئے نذر کریں گے؟ نواب صاحب نے کہا کہ لاکھ روپیہ مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کروں گا۔ چنانچہ مولوی محبت اللہ خاں صاحب کہتے تھے کہ ہم مراد آباد پہونچے اور مولانا سے ملے سب قسم کی باتیں توحید و غیرہ کی ہونے لگیں پھر ہم نے عرض کیا کہ رامپور تشریف لے چلئے، نواب کلب علی خاں آپ کے بہت مشتاق ہیں اور لاکھ روپیہ نذر کریں گے، آپ جس طرح سے بات کر رہے تھے اسی طرح کرتے رہے اور اس حکایت کو معمولی بات کی طرح ٹال دیا اور فرمایا کہ میاں لاکھ روپیہ پر خاک ڈالو اور بات سنو۔

جو ہم دل پہ اس کا کرم دیکھتے ہیں
تو دل کو بہ از جام جم دیکھتے ہیں

اور پھر وہی سب عشق و غیرہ کی کہانی کرتے رہے۔ (۲)

اہل حکومت و وجاہت کی بے وقعتی

جس اللہ کے بندے پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی منکشف ہو جاتی ہے اور اہل دنیا اور ان کے مال و دولت سے وہ اپنی امید قطع کر لیتا ہے اور بے طمع ہو جاتا ہے اسکی نگاہ میں اہل حکومت اور اہل ثروت کی عظمت اور اس کے دل پر ان کا رعب نہیں رہتا۔ اور بعض اوقات بڑے بڑے اہل جاہ اور ارباب حکومت اس کو مور و مگس کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔

ابتدائے عہد انگریزی میں حاکم ضلع (کلکٹر) کی بھی جو حیثیت اور رعب و داب تھا اس کو ابھی لوگ بھولے نہ ہوں گے، گورنر اور لفٹنٹ گورنر کی تو شان ہی اور تھی، لیکن اہل حقیقت اور اہل بصیرت کے یہاں ان خارجی و اضافی چیزوں (عہدوں اور حیثیتوں) کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور وہ ان سے معمولی انسان کا سا سلوک کرتے تھے، مولانا رحمہ اللہ کی خدمت میں دو مرتبہ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کا لفٹنٹ گورنر حاضر ہوا، اور مولانا اس سے بے تکلفانہ بلکہ درویشانہ ملے، ایک حاضری کا حال مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں۔

”ایک دفعہ لفٹنٹ گورنر نے مولانا فضل الرحمن صاحب رحمہ اللہ سے ملنے کی اجازت چاہی آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ: میں تو ایک فقیر آدمی ہوں، ان کے بیٹھنے کا کیا انتظام ہوگا، اچھا ایک کرسی منگالینا، لفٹنٹ گورنر کی طرف سے تاریخ اور وقت بھی مقرر ہو گیا اور آپ لوگوں سے یہ کہہ کر بھول بھی گئے یہاں تک کہ لفٹنٹ گورنر مع چند حکام کے آ موجود ہوئے، سب کھڑے تھے ایک میم بھی کھڑی تھی، مولانا رحمہ اللہ نے ایک الٹے گھڑے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ۔ بی تو اس پر بیٹھ جا (۱) لفٹنٹ گورنر نے کچھ تبرک مانگا آپ نے ایک خادم سے فرمایا کہ بھائی! دیکھو میری ہنڈیا میں کچھ ہو تو ان کو دیدو، اس میں کچھ چورامٹھائی کا نکلا بس سب کو تھوڑا تھوڑا تقسیم کر دیا سب نے ادب اور خوشی سے قبول کیا، اور تھوڑی دیر بیٹھ کر اجازت چاہی، اور رخصت ہو گئے چلتے وقت نصیحت کی درخواست کی فرمایا کہ ظلم مت کرنا (۲)“

(۱) افضل رحمانی میں ہے کہ آپ نے ایک پیڑھی کی طرف اشارہ کیا جو پاس پڑی ہوئی تھی۔

(۲) مولانا رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ظلم مت کرنا۔

فیض و تاثیر

باوجود اس سادگی و بے تکلفی کے جو مولانا کی زندگی میں نمایاں تھی آپ کی صحبت میں اتنی کیفیت آپ کی نسبت باطنی میں قوت اور کلام میں ایسی دل آویزی تھی کہ بجلی کی طرح اثر کرتا تھا اور حسب استعداد مدت تک اس کا اثر رہتا تھا یہاں اس فیض و تاثیر کے چند واقعات درج کئے جاتے ہیں۔

گریہ محبت

مولوی تاجل حسین صاحب لکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ فقیر رخصت ہونے کو حجرہ میں گیا تو میری زبان سے یہ شعر نکل آیا۔

نہ ہو دیدار میسر تو نہ ہو در جاناں کی زیارت ہی سہی
نہ ہو قسمت میں مرے ساغرے ترے میخانہ کی خدمت ہی سہی
آپ اس وقت اذکار و اشغال میں مشغول تھے آپ نے سراٹھایا کچھ آیت پڑھ کر سینہ پر دم کر دیا اور یہ شعر فرمایا۔

دیدہ سعدی و دل ہمراہ تست تانہ پنداری کہ تنہا می روی
اور فرمایا کہ اب جاؤ مجھ کو دو کوس تک غلبہ محبت الہی میں گریہ تھمتا نہیں تھا اور بخود ہی از حد طاری تھی۔ (۱)

کلام کی تاثیر

حضرت قبلہ رحمہ اللہ کے یہاں ظاہری شغل میں جس سے فیض مریدوں کو دیتے تھے یہ کتابیں تھیں، اول قرآن بعدہ حدیث بعد اس کے اشعار بزرگان مثل مثنوی وغیرہ پھر یہ احاطہ تقریر میں نہیں آسکتا ہے کہ جب آپ نے کوئی مضمون فرمایا گو معمولی بات ہو مثلاً بیع شرا

سے متعلق عبارات فقیہہ ہر چیز کے انوار طالب پر جو سامنے ہو تا طاری ہوتے تھے چونکہ وہ نسبت برقی کے طور پر ہوتے تھے طالب ناقص میں نہیں ٹھہرتے تھے مگر عقول بالغہ کو ہر کلام کے انوار جو مراقبہ و مقامات سے حاصل ہوتے تھے ان کو اسی سے حاصل تھے۔ (۱)

اسماء حسنیٰ کا بیان

مولوی محمد احسن و مولوی محمد حنیف صاحب بہاری نے فرمایا کہ ایک بار ہم لوگ مراد آباد حاضر ہوئے اس وقت بڑا مجمع اہل علم کا آپ کے پاس تھا تقریر علمی مختلف طور پر ہو رہی تھی اس میں سے اسماء باری تعالیٰ کو آپ بڑے جوش و خروش سے بیان فرما رہے تھے جس سے سامعین پر بڑی ہیبت چھا رہی تھی اور ہر شخص کو ایسا لطف آرہا تھا کہ گویا آج ہی ہم مسلمان ہوئے ہیں۔ (۲)

غیر مسلموں کا قبول اسلام

محمد خاں صاحب آپ کے ایک خادم کہتے تھے کہ جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ بنارس تشریف لے گئے تو وہاں باوجودیکہ آپ پوشیدہ اس شہر میں داخل ہوئے اور مکان میں ٹھہر گئے مگر وہاں ہنود کی بڑی کثرت ہوئی ہر چند کہ منع کئے گئے مگر سبھوں نے نہ مانا اور مسلمان ہو گئے۔ (۳)

دولار کا تھپڑ

مولوی تجمل حسین صاحب لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مرشد آباد کے ایک نواب کہ حضرت سے شاید بیعت کی تھی اور بعد عرصہ کے بصورت نصرانی یعنی ٹوپ انگریزی اور داڑھی گھوٹائے مراد آباد حاضر ہوئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جو گئے تو آپ نے اخلاق سے بٹھایا باتیں کیں پھر آپ نے بطور دولار کے ایک تھپڑ ان کے رخسار پر مار کر یہ فرمایا کہ: قیامت کے روز اس طرح سے طمانچہ لگے گا، اس مارنے کی یہ تاثیر ہوئی کہ تمام دن ان کو روتے ہوئے گذرا اور یہ کانپور کے جج ہو کر آئے تھے غالباً اڑھائی ہزار تنخواہ ہوگی، استعفا دینے کو تیار ہوئے مگر صاحبزادہ نے فہمائش کر کے روکا۔ (۴)

(۱) فضل رحمانی ج ۱ ص ۹۷

(۲) فضل رحمانی ج ۱ ص ۶۵

(۳) فضل رحمانی ج ۲ ص ۱۲۱

(۴) فضل رحمانی ج ۱ ص ۹۷

لسانی توجہ

آرہ کے ایک اسکول کے ماسٹر صاحب آپ کی خدمت میں بہ عزم بیعت پہنچے مگر وہ پریشان تھے کہ کہیں انگریزی پڑھانے کا سوال نہ ہو جائے، آخر آپ نے پوچھا کہ میاں! کیا کرتے ہو؟ انہوں نے مجبور ہو کر کہا کہ انگریزی پڑھاتا ہوں، ماسٹر صاحب کے ہوش جاتے رہے کہ دیکھئے کیا فرماتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ انگریزی پڑھاتے ہو تو بیجا کیا ہے ہاں فرنگیوں نے جمنا کا کیا حال لکھا ہے، کیونکہ سنا ہے کہ جمنا اور دریا کاپانی ملتا ہوا چلتا ہے اس کاپانی نیلا ہے اور دریا کاپانی سفید ہے اس قدرت الہی کو بیان کرو۔ ماسٹر صاحب نے پھر اچھی طرح بیان کیا اور دریا وغیرہ کا حال بیان کیا، قرآن شریف میں ہے۔ مرج الجریں يلتقيان بينهما برزخ لا يبغيان۔ ماسٹر صاحب سے بات ہوتے ہوتے فیض آنا شروع ہوا اسی کو لسانی توجہ کہتے ہیں ماسٹر صاحب پر بہت کیفیت و بخودی طاری ہوئی بعد اس کے بیعت خاص کی اور تمام تعلیمات مراقبہ وغیرہ ان کو کی، پھر وطن میں آکر یاد الہی میں مصروف رہے۔ (۱)

ایک شعر باعث توبہ و اصلاح

مولوی تجمل حسین صاحب ہی راوی ہیں کہ ایک شیعہ صاحب شہر پورنیہ کے رئیس حکیم صاحب کر کے مشہور تھے حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تشریف لائے وہاں کی بعض خواتین نے شور مچایا کہ ایک رافضی مسجد میں گھسا آتا ہے حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کہا کہ تم ہمارے حجرہ میں بٹھہرو اور فرمایا کہ یہ حضرت مرتضیٰ علیؑ کے مہمان ہیں بہت گفتگو کے بعد ان شیعہ صاحب نے فرمایا کہ آپ سے اعتقاد تو ہوا مگر ہم مرید نہیں ہوں گے۔ اور مذہب اپنا نہیں چھوڑیں گے، آپ نے فرمایا کہ، مذہب چھوڑنے کا کیا کام ہے حضرت مرتضیٰ علیؑ سے محبت رکھو، اور بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا اور امام حسین علیہ السلام سے محبت رکھو مگر ایک شعر پر عمل رکھو، اور وہ شعر یہ ہے۔

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برانہ رہا

جب وہ اپنے وطن گئے تو شب و روز پھرتے چلتے یہی شعر پڑھتے تھے اور کوئی دوسرا

شغل نہ تھا مگر اثر صحبت کا اور رنگ اسلام کا آگیا تھا (۱)

اب سنئے کہ وہ تو شب و روز وہ اشعار زبان پر تھے کہ نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر ان مجلس محرم یا کسی اور مجلس کے دن آگئے کہ ایک گروہ امامیوں کا پہونچا اور کہا کہ بغیر آپ کے مجلس سنائی ہے تشریف لے چلئے اور کہا کہ آج دن تبر اکا ہے، بس یہ کہنا تھا کہ وہ بگڑے اور یہ شعر پڑھا اور حکم دیا کہ ان بدمعاشوں کو پکڑو اور مارو کہاں ہم کہاں حضرت ابو بکر صدیق رَضِيَ اللہ عَنْہُ، رسول اللہ ﷺ کے خسر اور کہاں حضرت عمر رَضِيَ اللہ عَنْہُ اور کہاں حضرت عثمان رَضِيَ اللہ عَنْہُ رسول اللہ ﷺ کے داماد انکو گالیاں دینا شروع کیا اور کہا کہ جاؤ آج کے روز سے ہم اہل سنت والجماعت کے مذہب میں داخل ہو گئے، چنانچہ ہم سیر کرتے ہوئے ان کے مکان پر پہونچے معلوم ہوا کہ ابھی ایک سال ہوا انتقال ہو گیا ہے۔ (۲)

ایک شعر کا اثر

مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں مولوی عبد الاحد صاحب الہ آبادی مولوی عبدالحی صاحب کے شاگردوں میں بہت جید الاستعداد ایک عالم تھے میں بھی ان سے ملا حسن پڑھتا تھا، انہوں نے ایک دن اولیاء اللہ کے تذکرہ میں کہا کہ مولانا فضل رحمن صاحب رَضِيَ اللہ عَنْہُ کچھ دن ہوئے یہاں آئے ہوئے تھے مولوی علی حیدر خاں صاحب ان سے مرید ہوئے ان کے سر میں بہت دنوں سے درد تھا جو کسی صورت سے جاتا نہ تھا بیعت کے بعد حضرت رَضِيَ اللہ عَنْہُ کی زبان مبارک سے انہوں نے یہ شعر سنا:-

باد نسیم آج یہ کیوں مشکبار ہے شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلفیہار ہے
یہ شجر سننے کے بعد اور بیعت کی برکت سے درد زائل ہو گیا اور مولوی صاحب آٹھ دن تک بیعت کے بعد گریہ وزاری میں مصروف رہے۔ (۳)

بیسواؤں کی توبہ

حضرت نے فرمایا کہ میں ایک قصبہ میں جاتا تھا کسبیوں کے سامنے سے گذرا سب نے کھڑے ہو کر سلام کیا، میں نے جھڑک دیا خدا کی شان تھوڑی دور گیا تھا کہ وہ سب آکر میری مرید ہو گئیں اس کے بعد سب نے نکاح بھی کر لئے۔ (۴)

(۱) کمالات ربمانی ص ۱۶۱۵ (۲) ایضاً ص ۱۷۱۶ (۳) افادات سلیمانی مندرجہ مجموعہ رسائل تصوف ص ۲۶۷

صحبت و توجہ کی تاثیر

مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ اپنے سفر کے حالات کے ضمن میں فرماتے ہیں :- ۱۳۰۳ھ میں لکھنؤ آیا اس زمانہ میں مجھے شغل درود کی ایک عجیب لذت تھی جمال مبارک نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہر دم میری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا، وہ بات لکھنؤ میں زائل ہو گئی مجھے سخت انقباض ہوا بالآخر مولوی فتح محمد صاحب تائب اور دیگر احباب کو ہمراہ لے کر روانہ ہوا، مراد آباد پہونچا اور حضرت کی مسجد میں قدم رکھا وہ انقباض انبساط سے بدل گیا پہلے مجھے کھانا کھلایا گیا اس کے بعد میری حاضری کی خبر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو کی گئی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فی الفور بلا بھیجا میں حاضر ہو کر ادب سے بیٹھنا چاہتا تھا آپ نے فرمایا کہ بخاری لا کر انہیں دو، میں نے پڑھنا شروع کیا اس وقت کی کیفیت کو عرض نہیں کر سکتا ہوں مادانیم و دل، مختصر اس کا یہ ہے کہ مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان میں کوئی واسطہ نہیں اور میں خاص حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھ رہا ہوں، اس وقت حضوری کی ایک ایسی لذت تھی کہ الفاظ کا بالکل خیال ہی نہیں ہوتا تھا اور حضرت کبھی کبھی مسکراتے تھے اور کبھی آہ آہ فرماتے تھے کبھی کوئی اشعار پڑھتے تھے، کبھی کوئی ہندی کا گیت ارشاد فرماتے تھے، پھر جب حضرت نے فرمایا کہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ترجمہ کرو میں نے عرض کیا، آپ نے فرمایا نہیں! حضرت محبوب ہیں زبان عشق سے کہو، پھر آپ نے خود فرمایا کہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی پیار کرے ان کو اللہ اور سلامت رکھے اس جملہ سے مجھ پر ایک کیفیت طاری ہو گئی اور میں نے نعرہ کیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مولوی ہو کر اتنا چلاتے ہو ڈیڑھ ورق میں نے بخاری شریف پڑھی تھی اسکے بعد حضرت نے فرمایا کہ بس کرو، پھر آپ نے فرمایا کہ میری طرف متوجہ ہو جاؤ میں متوجہ ہو گیا پھر آپ نے فرمایا کہو کیسا رنگ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے کچھ درک نہیں ہوا آپ نے فرمایا پھر متوجہ ہو جاؤ اس بار بھی مجھے رنگ نہ آیا پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے سلطان جی (حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ) سے عشق ہے یہ کہہ کر آپ متوجہ ہو گئے اس وقت مجھے ایسا درک ہوا کہ اک آگ کا شعلہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے قلب سے نکل میرے قلب میں سما گیا اور میرے ہر رگ و ریشہ میں اس کی حرقت محسوس ہونے لگی اور بیتاب ہو کر میں نے ہائے کاعرہ لگایا اور تخت سے نیچے گر پڑا حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنی چارپائی سے اٹھے اور میرا شانہ پکڑ کر اٹھایا اور فرمایا اتنا کیوں چلاتے ہو۔ (۱)

کمال علمی

باطنی مشغولیت، استغراق اور توجہ الی اللہ کے باوجود مولانا کا علمی ذوق اور استحضار قائم تھا حدیث و فقہ پر گہری نظر تھی بعض مرتبہ ایسی غلطیوں پر تنبیہ فرماتے اور ایسی جزئیات بیان کرتے کہ اکابر اہل علم و درس کو تعجب ہوتا چند واقعات درج کئے جاتے ہیں۔

نماز قصر کا ایک مسئلہ

مولوی تجل حسین صاحب لکھتے ہیں :- آپ نے عند الملاقات مولانا عبدالحی صاحب سے پوچھا :- بھلا تم تو بڑے فقیہ ہو ہدایہ کا حاشیہ تم نے خوب لکھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے راستہ میں نماز مسافرت کی موافق مذہب حنفیہ کے کیوں نہیں پڑھی، یعنی قصر کیوں نہیں کیا؟ مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہم آٹھ نو آدمیوں کے سامنے اس حکایت کو لکھنؤ میں بیان کیا تھا اس میں کئی رئیس مونگیر مثل شاہ احمد سعید اور شاہ محمد وغیرہ بھی تھے مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ یہ سب کشف فقط سنت پر عمل کرنے سے تھا۔ المختصر مولانا عبدالحی صاحب نے مولانا نور اللہ مرقدہ کو اس مسئلہ کا یہ جواب دیا کہ میں لکھنؤ سے سندیلہ کی نیت سے چلا تھا، وہاں آکر عزم ہوا کہ آپ کی زیارت حاصل کریں، یہ دو سفر ہو گئے تین منزل نہیں ہوئیں، آپ نے اس پر ارشاد فرمایا کہ بھائی! تم بڑے محقق ہو مگر تحقیق مسئلہ یوں ہی ہے کہ فقہاء نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ جب دو سفر کو جمع کیا جائے اس پر حکم تین منزل کا ہوگا، ان دونوں سفر وں کو سفر واحد سمجھا جاوے گا، مولانا عبدالحی صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ واقعی میں نے جو کتابوں کو دیکھا تو ترجیح اسی مسئلہ کو تھی۔ (۱)

کتابوں کے اغلاط کی تصحیح

جناب مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بخاری شریف چھاپ کر بہت عمدہ خوشخط ایک جلد

سوانح علمائے دیوبند علی ۲۰۸ حضرت مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی

آپ کیلئے تحفہ لائے، چونکہ آپ کی عادت شریف تھی کہ جو کتاب مطبع سے لوگ نذر لاتے تھے اس کے آپ چند ورق ادھر ادھر کے الٹ کر غلطی بتا دیتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے پہلے دیکھ رکھا ہو، غرض اس بخاری شریف میں کئی جگہ ورق بے انداز الٹ دیئے، اور فرمایا کہ یہ غلطی ہے اور وہ غلطی ہے، استاذی حضرت مولانا احمد علی صاحب بہت متعجب ہوئے کہ میں آٹھ برس سے کتاب کو درست کر رہا ہوں غلطیاں نظر نہیں آتی تھیں، آخر پھر غور کر کے کئی ورق کا غلط نامہ بخاری شریف میں چھاپ کر لگایا گیا۔ (۱)

احادیث پر عبور

اسی طرح مولانا سعادت حسین صاحب مدرس کلکتہ (مولوی ابراہیم صاحب وغیرہ کے استاد) جب مراد آباد تشریف لے گئے، ان کے ساتھ مولوی اکرم صاحب محدث بھی ہمراہ تھے، تو حضرت قبلہ اس وقت چادر اوڑھ رہے تھے آپ نے پوچھا کہ حضرت رسول اللہ ﷺ چادر اوڑھتے وقت کون دعا پڑھتے تھے؟ کئی علماء تھے مگر کسی کو یاد نہیں تھا، ان عالموں نے کہا کہ اس وقت یاد نہیں، آپ نے فرمایا کہ مجھے ساٹھ برس ہوئے کہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ سے حدیث پڑھی تھی بعد اس کے آپ نے ڈیڑھ ورق کے قریب کئی حدیث مع راویوں کے سلسلہ وار بیان کر کے دعا چادر اوڑھنے کی پڑھی، سب لوگ حیران ہوئے، مولوی سعادت حسین صاحب نے اپنے مجمع میں بیان کیا کہ اس قدر ادعیہ اور معمولات حضرت رسول اللہ ﷺ کے کسی کو یاد نہیں ہیں بیشک مولانا فضل رحمن صاحب قبلہ کو بہت حفظ ہے، فقط محبت رسول اللہ ﷺ سے یہ بات حاصل ہے۔ (۲)

اختلاف قرأت پر نظر

بعض اہل علم سے قرأت سبعہ کے اختلاف قرأہ لفظی کو پوچھتے تھے بعض وقت مجھ سے بھی سوال فرماتے تھے کہ اس لفظ کو قرآن کے کس کس طرح پڑھنا آیا ہے۔ مثلاً ”مالک یوم الدین“ یا ”ملاک یوم الدین“ غرض کہ علم قرآن، اختلاف قرأت اور ترجمہ لفظ زبان ہندی وغیرہ سلیس اردو میں اور عجائب عجائب نکتہ قرآن شریف کا بیان آپ پر ختم تھا۔ (۳)

تفسیر و نکات قرآن

مولوی فخر الدین صاحب سے معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحق صاحب دہلوی مصنف ”تفسیر حقانی“ جب مرید ہونے گئے تو آپ نے پوچھا کہاں سے آئے ہو، اور کیا کام کرتے ہو؟ کہا کہ میں تفسیر لکھتا ہوں آپ خوش ہوئے اور حسب عادت آپ نے پوچھا کہ ”ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا، انفسنا“ میں کون سا وقف ہے؟ کیونکہ اگر وقف نہ ہو تو واو متصلہ ہو جاوے گا؟ پھر خود ہی فرمایا کہ :- اس میں واو توقیفی ہے پھر ترجمہ قرآن شریف ہونے لگا، یعنی طلبہ پڑھنے لگے حد کا بیان آگیا، مولوی عبدالحق صاحب نے عرض کیا کہ ہر جگہ شہادت میں دو گواہ ہیں اور زنا میں چار گواہ کیوں؟ ارشاد ہوا کہ زنا میں دو دو ہیں زانی اور زانیہ اس لئے چار گواہ ہیں، اس پر جناب مولوی عبدالحق صاحب بہت خوش ہوئے (۱)



قرآن و حدیث کے الفاظ کے ہندی ترجمے

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے بڑا بلند اور پاکیزہ ادبی ذوق عطا فرمایا تھا اس کا کچھ اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے جو آپ کبھی کیفیت اور ذوق میں آکر پڑھتے تھے اور جن میں سے بہت سے اوپر گزر گئے ہیں یہاں کچھ مثالیں آپ کے اردو اور ہندی ترجمہ کی پیش کی جاتی ہیں، جن سے عربی اور ہندی دونوں زبانوں کے صحیح ذوق اور ایک زبان کے مفہوم اور محاورہ کو دوسری زبان میں ادا کرنے کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس کا ذوق وہی لوگ لے سکتے ہیں، جو دونوں زبانوں کے اداسناس اور لذت آشنا ہوں۔

ایک حدیث کا ترجمہ

ایک مرتبہ جناب مولانا لطف اللہ صاحب کانپور میں ملاقات کو حضرت مولانا صاحب قبلہ قدس سرہ کے پاس تشریف لائے، آپ عبدالرحمن خاں کے مطبع میں ٹھہرے ہوئے تھے مسلم شریف دیکھ رہے تھے۔ ایک حدیث پڑھی کہ ”یضربون مشارق الارض و مغاربھا“ ترجمہ اس کا فرمایا کہ مارے مارے پھرتے تھے پورب پچھم۔ (۱)

نسبت کا ترجمہ

ہم نے معنی نسبت کے پوچھے ارشاد ہوا۔ ”نسبت کے معنی لگاؤ ہیں۔ (۲)

درود کا ترجمہ

درود کا ترجمہ فرمایا۔ ”اللہ صاحب کا دولا اور پیار محمد ﷺ صاحب پر۔ (۳)

تجلی کا ترجمہ

فلما تجلی ربہ للجبل کا ترجمہ فرمایا:۔ ”جب ان کا نور اجیالا ہوا۔ (۴)“ ایک مرتبہ ”تجلی“ کا ترجمہ کیا ”کچھ دیکھا کچھ نہیں دیکھا“

(۱) فضل رحمانی ص ۱۳۶ (۲) فضل رحمانی ص ۱۳۸ (۳) فضل رحمانی ص ۱۳۸ (۴) فضل رحمانی ص ۱۳۸

بدیع کا ترجمہ

حکیم صاحب (عظمت حسین صاحب) نے کہا کہ مولانا عبدالحی صاحب تشریف لائے تھے، کہ آپ نے ان کے سامنے اس آیت کا ترجمہ فرمایا ”بدیع السموات والارض“ انوکھے بنانے والے زمین و آسمان کے، مولانا موصوف بہت خوش ہوئے۔ (۱)

نفی اثبات کا ترجمہ

نواب نور الحسن خاں مرحوم لکھتے ہیں :- کہ آپ نے ”نفی اثبات“ کا ترجمہ ”توڑ جوڑ“ فرمایا۔ (۲)

زینۃ الحیوة

نواب صاحب لکھتے ہیں ایک صاحب نے حضرت سے یہ ترجمہ نقل فرمایا ”المال و البنون زینۃ الحیوة الدنیا۔ دھن اور پوت سنگار ہے جیتے جی کا۔ (۳)

ترجمہ قرآن کے کچھ نمونے

مولانا نے اپنے زمانہ کی بے تکلف ہندی بھاشا میں قرآن مجید کی کچھ سورتوں اور حصوں کا ترجمہ فرمایا تھا، جو ایک بار گلشن ابراہیمی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور اب نایاب ہے، یہ ترجمہ مولانا کی قرآن فہمی ادبی ذوق اور لطافت طبع کا نمونہ ہے یہاں اس کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

وسع کرسیہ السموات
والارض ولا یؤدہ حفظہما
اس کی راج چوکی میں سارے آکاش اور
دھرتی سارے ہیں۔ اور ان کی چوکی اس
کو تھکاتی نہیں۔

لا تحملنا مالا طاقة لنا بہ
واتیناہ الحکم صیا
نہ رکھ ہم پر وہ کہ جس کا ہم کو بوتا نہیں
اور ہم نے اسکو بچپن میں سوچھ بوجھ دی

(۱) فضل رحمانی (جلد ثانی) ص ۷۸ (۲) گنجینہ فقر مجموعہ رسائل تصوف ص ۷۳

(۳) وادی الفت از نواب نور الحسن خاں مرحوم، شامل مجموعہ رسائل تصوف ص ۱۸۱

وبرا بوالدیہ

و کنت نسیا منسیا

والسلام علی یوم ولدت

فاختلف الاحزاب من بینہم

قال سلام علیک

لا یسمعون فیہا لغوا

اطلع الغیب

لا یملکون الشفاعة

هل تحس منہم من احد او

تسمع لہم رکزا

یسئلہ من فی السموات والارض

اذ ذہب مغاضبا

ذلک یوم التغابن

الذی بیدہ المملک

فکیف کان نکیر

نحن خلقنا ہم وشددنا اسرہم

انا صببنا الماء صبا

ثم شققنا الارض شقا

ووجوه یومئذ علیہا غبرة ترہقہا

قترۃ

اور اپنی ماتا پتا کا سپوت پوت تھا۔

اور بھولی بسری ہو جاتی۔

اور مجھ پر جس دن سے جنم لیا سکھ چین ہے۔

پچھے کے لوگوں کے جتھے آپس میں اینچا کھینچی میں پڑے۔

(ابراہیم نے کہا) اچھا پتا جی تو سکھی رہ۔

وہاں وہ بک بک جھک جھک نہیں سنیں گے۔

کیا اس نے ان دیکھا جھانک لیا ہے۔

کوئی کسی کیلئے کہنے سننے کی سکت نہیں رکھے گا۔

کیا تو ان میں سے کسی کی آہٹ پاتا یا ان کی بھنک سنتا ہے۔

سارا سنسا اسی کے دوارے کا بھکاری ہے جب وہ جھنجھلا کر چلے۔

یہی ہار جیت کا دن ہے۔

جس کے ہاتھ میں راج پاٹ ہے۔

پھر کیسی میری مار پڑی ہے۔

میں نے ہی تو ان کو گھڑا ہے، اور ان کے پکے جوڑ جوڑے ہیں۔

ہم نے جھما جھم برکھا برسائی۔

پھر ترتر دھرتی پھاڑی۔

اور کتنی تھوڑیاں اس دن دھول بھری

ہیں، اور ان پر کلونس چڑھی ہوئی ہے۔

علالت اور وفات

مرض وفات کے حالات و واقعات صاحبزادہ احمد میاں صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ”تواریخ نامہ (۱)“ اور مولوی محمد عبدالغفار صاحب آسیونی کی کتاب ”ہدیہ عشاق فضل رحمانی“ سے ماخوذ ہیں جس میں ربیع الاول کی دوسری تاریخ سے (جس روز حضرت مولانا رحمہ اللہ کی طبیعت مبارک ناساز ہوئی) ۲۲ ربیع الاول (جس روز حضرت مولانا کی وفات ہوئی) تک کے حالات و واقعات تاریخ وار بطور روزنامہ کے درج ہیں، مصنف وفات سے دس ماہ پیشتر سے حضرت مولانا کی خدمت میں حدیث شریف کا درس لیتے تھے، ہر وقت کے حاضر باش اور علاج کے مشیر خاص تھے، اس تفصیل سے آپ کی بے نظیر استقامت، اتباع سنت اور ذوق و محبت و محویت ظاہر ہوتی ہے، اور اکابر اولیاء متقدمین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

علالت کی ابتداء

حضرت کی بیماری زکام اور بخار سے انتقال سے بیس روز پیشتر شروع ہوئی، اس درمیان میں آپ کو کسی روز صحت بھی ہو جاتی تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو کسی طرح کی بیماری نہیں، اگرچہ ابتداء میں خفیف حرارت کے ساتھ کچھ آمد زکام کی سی معلوم ہوتی تھی، لیکن بظاہر اس کا اثر کچھ نہ تھا، صرف پیاس کی شدت تھی، دن بھر میں خلاف معمول کئی مرتبہ پانی نوش فرماتے تھے، ۷ ربیع الاول سے آواز کی گرننگی میں زیادتی ہونے لگی۔ جب بلغم نکلتا، تو آپ فرماتے تھے کہ دیکھو بلا پیٹ سے نکلتی ہے، اور ضعف و نقاہت کو بھی روزانہ ترقی تھی کہ غذا بہت کم ہو گئی تھی۔

اتباع سنت کا اہتمام اور درس حدیث

مگر بایں ہمہ ضعف و ناتوانی اور کبھی کبھی ملمس میں حرارت ہو جانے کے باوجود اتباع سنت

(۱) اس کتاب میں علالت و وفات کے مختصر حالات اور مراثی اور قطعات تاریخ ہیں، یہ کتاب ۱۳۱۳ھ میں مرتب ہوئی اور اصح المطابع محمود نگر لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

اور پابندی شریعت کا وہی اہتمام تھا، اور ہمیشہ اول وقت پر تازہ وضو کر کے نماز ادا فرماتے، اور بڑے ذوق و شوق سے حدیث شریف کا درس دیتے۔ (۱)

حدیث شریف کا آخری سبق

۷ ربیع الاول کو نماز عصر ادا فرمانے کے بعد فرمایا کہ کتاب لاؤ حکیم عظمت حسین صاحب نے سبق شروع کیا، تھوڑا سا پڑھا تھا کہ مولوی عبدالغفار صاحب کتاب صحیح مسلم لے کر حاضر ہوئے، حکیم صاحب نے کتاب بند کر دی اور مولوی عبدالغفار صاحب نے پڑھنا شروع کیا، قریب تیرہ صفحہ کے پڑھا سبق ختم ہونے کے بعد یہ کلمات فرمائے ”جاؤ کتاب مسجد میں بند کر کے رکھ آؤ“ یہ سبق آخری تھا جو آپ نے بیٹھ کر درس کے طور پر پڑھ لیا، اس لفظ (بند کر کے) پر کسی کو لحاظ نہیں ہوا کہ آج سے آپ سبق بند فرماتے ہیں۔ (۲)

ایک نعتیہ شعر اور کیفیت

۸ ربیع الاول کو آنحضرت ﷺ کے کچھ فضائل بیان کر کے آپ نے اس شعر کو دو مرتبہ

پڑھا۔

سر سبز سبزہ ہو جو ترپائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

اس وقت حاضرین کی عجیب کیفیت تھی، کہ دلگدازی سے سب پر ایک حالت رقت طاری تھی۔ (۳)

ایک شعر پر رقت

بعد اس کے آپ نے یہ شعر پڑھا:-

بندۂ عیب دار کس نخرود

باہزاراں گنہ خرید مرا

آپ روئے اور عجیب کیف کی حالت تھی کہ بیان میں نہیں آتی۔ (۴)

صلحائے امت کا مرتبہ

اسی حالت کیف میں فرمایا کہ۔ امتیان محمدی ﷺ میں سے بہت ایسے لوگ ہیں کہ حوریں ان کی مشتاق ہیں، جب وہ جنت میں بلا حساب کتاب جائیں گے تو حوریں ان کے دیکھنے کو دوڑیں گی، اور وہ محو تجلیات کبریائی ہوں گے، دوزخ کی طرف سے ہو کر گزریں گے تو دوزخ ان سے پناہ مانگے گی، اور ان کے چہرے مثل ماہتاب کے درخشاں ہوں گے۔ (۱)

محویت و استغراق کی زیادتی

آج سے محویت کی کیفیت اور استغراق کی حالت بڑھتی جاتی تھی کہ بسا اوقات آپ اپنے ہر وقت کے حاضر باش خادموں کو بھی نہیں پہچانتے تھے، آپ کے معمولات سے تھا کہ بعد نماز ظہر انقض سنا کرتے تھے، فرمایا کہ آج بہت خطوط ہیں آپ نے ان پر دم کر دیا اور فرمایا کہ خدا سب کا کام پورا کر دے۔ (۲)

صبر کی فضیلت اور حضرت ابو بکرؓ کی منقبت

۹/ ربیع الاول کو فرمایا کہ اللہ پاک اپنے بندوں کو بہت پیار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں جو ان کے خاص بندے ہو جاتے ہیں، تو اگر ان کو کچھ تکلیف پہونچتی ہے اور صبر کرتے ہیں تو ملائکہ سے خطاب ہوتا ہے، کہ دیکھو مرابندہ کیسی مصیبت میں مبتلا ہے اور شکر و صبر کرتا ہے، گواہ رہو کہ میں نے بخش دیا، بعدہ حضرت ابو بکر صدیق رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کی شان میں کچھ احادیث پڑھیں اور بہت رقت طاری رہی، اور جوش و خروش کی حالت ظاہر ہوئی۔ (۳)

مرشد کی یاد

بارہویں تاریخ تک ترقی ضعف کی یہی کیفیت رہی، جو کوئی پوچھتا کہ حضور کا مزاج کیسا ہے، تو فرماتے الحمد للہ اچھا ہوں، صرف ضعف ہے، کبھی حضرت شاہ آفاق پیر و مرشد اور اولیاء اللہ کا ذکر فرماتے اور کہتے۔

اے شہ آفاق شیریں داستاں باز گوازی بے نشان من نشان
صرف و نحو منظم راسوختی آتش عشق خدا افروختی (۱)

اولیاء امت کا درجہ

۱۳ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ کو آپ نے مولوی وحید احمد صاحب سے ارشاد فرمایا کہ :-
میری چار پائی کے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور حسب ذیل ارشادات فرمائے۔
خدمت مرداں اگر یک ساعت
بہتر از صد خدمت و صد طاعت است

سلف میں ایسے ایسے اولیاء اللہ گزرے ہیں کہ جو کلمہ گو کوئی دور سے ان کی زیارت کر
کے چلا گیا اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم فرمایا اور اس کو بخش دیا، بعض ایسے گزرے ہیں کہ جس پر
انہوں نے ایک نظر ڈال دی وہ ولی ہو گیا، بعض حاضرین نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو
بھی ایسا ہی کیا ہے اس پر کوئی جواب نہ دیا۔ (۲)

دعائے تسہیل

۱۶ ربیع الاول سے آخر وقت تک یہ شعر آپ کے ورد زبان تھا۔
فسهل يا الهی کل صعب
بحرمة سيد الابرار سهل (۳)

مریدوں کو تلقین

۱۸ ربیع الاول کو قاضی نور الحسن صاحب ہاشمی ملاواں سے بغرض عیادت حاضر ہوئے
تھے، ذرا دیر کے بعد آپ نے داہنا ہاتھ دراز فرمایا کہ جیسے کسی سے مصافحہ کے واسطے
بڑھاتے ہیں، اور اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ :- آتے ہیں کیڑے تو پہن لیں۔ ان لوگوں سے فرمایا
جو مرید ہوئے تھے کہو، ”مرید ہوئے ہم حضرت شاہ آفاق صاحب رحمہ اللہ کے ہاتھ پر قادریہ
خاندان میں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، فرض ہیں دیوالی، دسہرہ، بسنت کچھ نہ ماننا۔ (۴)

رضا بالقضاء

۱۹ ربیع الاول کو ۱۲ بجے پھر پیر سرد ہوئے اور حرارت کا غلبہ ہوا، آپ حالت غشی میں نصف جسم سے اٹھ بیٹھتے تھے اور فرماتے، میں کیا کروں؟ کوئی حاضرین میں سے عرض کر دیتا کہ حضور آرام فرمائیں فوراً لیٹ جاتے اور شعر ۷

فسهل يا الهی کل صعب

بحرمة سيد الابرار سهل

پڑھتے، بخلاف زمانہ گذشتہ کی بیماریوں کے کہ آپ ان بیماریوں میں آہ آہ بہت کرتے، لیکن اس مرتبہ اُف تک بھی نہ فرماتے، خاموش لیٹے رہتے، اور جو دوا صاحبزادہ صاحب پیش کرتے، فوراً اسکو نوش فرماتے ذرا انکار نہ کرتے، سابق کی بیماریوں میں دوا سے انکار فرماتے تھے، مگر عام طور سے کسی کے ہاتھ سے دوا نہیں پیتے، صرف صاحبزادہ صاحب کو یہ شرف حاصل رہا۔ (۱)

مناقب خلفاء اربعہؓ

ساڑھے چھ بجے سہ پہر کو حرارت بہت کم ہوئی تھی، اس وقت حضرت پیرانی صاحبہ نے حکیم صاحب کو بلایا، اور دریافت حال کیا، اگرچہ حکیم صاحب نے بہت کچھ تسکین دی لیکن درجہ اجابت تک نہ پہنچی، کہ اتنے میں حضور پر نور نے یہ شعر بزبان فصیح پڑھا۔

سرم خاک رہ ہر چار سرور

ابو بکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ

اس وقت حضور کو فی الجملہ تسکین تھی، اور اس شعر کے پڑھنے سے تمام حاضرین و نیز اندورن حویلی سب کو بہت تسکین ہوئی۔ (۲)

بشارات

بیسویں کو خواب استراحت سے دفعتاً اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ: یہ بہشت یہ بہشت یہ بہشت یہ بہشت، اور چاروں سمت دست مبارک سے اشارہ کیا اور فرمایا کہ رسول مقبول ﷺ تشریف لائے ہیں۔ (۳)

فنائے کامل

اکیسویں کو دو بجے دن کو آپ نے فرمایا کہ :- ہم مر گئے ہمارے جنازے کی نماز پڑھ دو اور اگر کوئی نہ پڑھے تو میں خود پڑھے لیتا ہوں، اور تمام مقتدی کھڑے ہیں، اللہ اکبر فرما کر ہاتھ باندھ لئے سب کو اس جملہ سے بہت تردد ہوا۔ (۱)

حدیث کا تقاضا

سوا دو بجے فرمایا کہ اگر ہم کو کوئی حدیث سناتا تو بہتر تھا کہ :- ہمارا دم حدیث شریف سنتے سنتے نکلتا۔ (۲)

۲۲ ربیع الاول بروز جمعہ ۳ بجے کہ حاضرین کا مجمع کثیر تھا صاحبزادہ احمد میاں کو آنکھیں کھول کر بغور دیکھا، پھر ان کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دو تین منٹ تک خوب مضبوط پکڑے رہے، بعد اچشم خدا ہیں دوبارہ دیکھ کر ہاتھ چھوڑ دیا، اور آنکھیں بند کر لیں۔ (۳)

اہل تعلق کیلئے دعا

ساڑھے تین بجے دست مبارک اٹھا کر نہایت خضوع سے دعاء فرمائی، کہ ”اے اللہ پاک! آپ میرے جملہ مریدین و معتقدین، دوست احباب، اعزا و اقارب کو خوش و خرم کھاتا کھلاتا رکھئے گا، اور سب کا خاتمہ بخیر کیجئے گا آمین آمین آمین۔ (۴)

ذکر جلی

سوا چار بجے سے تنفس شروع ہوا، اس سے یہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ لا الہ الا اللہ فرماتے ہیں، قبل اس کے کبھی آپ نے اس طرح کا ذکر جلی نہیں فرمایا، ہمیشہ ذکر خفی فرماتے تھے، کہ دیکھنے والوں کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔ (۵)

محبین و زائرین کا ہجوم

تین چار روز سے حاضرین کا وہ مجمع تھا کہ لوگ ہٹائے جاتے تھے لیکن نہ ہٹتے تھے، ایک

کے اوپر ایک گرے پڑتے تھے، ہر شخص کی یہ تمنا تھی کہ میں شریک خدمت ہوں اور زیارت سے شرف یابی حاصل کروں، ان چار دنوں میں کئی مرتبہ مراد آباد میں مشہور ہوا کہ جناب مولانا صاحب رحمہ اللہ کا وصال ہو گیا۔ ہر شخص جہاں تھا وہیں سے دوڑا، اندر سے باہر تک ایک تلاطم برپا ہو جاتا تھا، اور جو اپنی جگہ سے ہٹا پھر اس کو وہ جگہ نصیب نہ ہوتی تھی، اس لئے کہ جگہ کی قلت تھی اور آدمیوں کی کثرت، تمام حاضرین و مریدین اطراف سے اتفاقاً فتح پور ہسودہ کے آدمی زیادہ حاضر تھے۔ (۱)

حدیث کی تلاوت بالیس پر

سو اچار بکے سے تنفس میں فرق آگیا، اور امید زیست منقطع ہو گئی، چنانچہ حسب وصیت حکیم عظمت حسین صاحب نے کتاب چہل حدیث پڑھنا شروع کیا، اور راقم سے صاحبزادہ نے ارشاد فرمایا کہ تم بھی کتاب لاؤ، میں بھی کتاب صحیح مسلم شریف کہ جس کا ایک سبق پڑھا تھا لے آیا، صاحبزادہ صاحب نے فرمایا کہ بالجہر پڑھو، تاکہ سب لوگ سنیں، لیکن حضور پر نور کی وہ حالت دیکھ کر مجھ سے بالجہر نہ پڑھا گیا صاحبزادہ صاحب نے مکرر فرمایا کہ بالجہر پڑھو تاکہ سب لوگ سنیں، میں نے کتاب الایمان کا ایک صفحہ مشکل سے بالجہر پڑھا، اور ایک حدیث آخر کتاب کی پڑھ کر بند کر دی۔ (۲)

وقت اخیر

تنفس بڑھتا گیا اور اب بلغم حلق میں آکر اٹک گیا اور تھوکنے کی قوت باقی نہ رہی، آپ اس حالت میں بار بار سر مبارک اٹھانے کا ارادہ فرماتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی روح پر فتوح تشریف لاتی ہے جس کی تعظیم کے واسطے سر مبارک جنبش دیتے ہیں، ہم کو رباطنوں کا اس میں حصہ نہ تھا، غرض کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ پڑھنے لگا کوئی یسین شریف کوئی درود شریف کوئی کلمہ کوئی بالجہر کوئی بالسر پڑھتا تھا، اگرچہ عام طور پر اس بات کا یقین نہ تھا کہ یہی آخری وقت حضرت صاحب رحمہ اللہ کا ہے، لیکن اس کرب کو ہر شخص دیکھ کر غمگین تھا، چنانچہ سواپانچ بجے سے حکماء نے کل تدبیریں چھوڑ دیں اور آب انار شیریں کیوڑہ ڈال کر دینا شروع کیا، کبھی حکیم

(۱) فتح پور ہسودہ میں حضرت مولانا کے دو خلفاء و مریدان باختصاص موجود تھے، حضرت مولانا نور محمد پنجابی صدر مدرس

مدرسہ اسلامیہ اور جناب مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتنوری (۲) مدیہ عشاق ص ۲۸۷

عظمت حسین صاحب اور کبھی صاحبزادہ صاحب اور کبھی حکیم عبد الباسط صاحب اور کبھی راقم (عبد الغفار) چمچہ سے لے کر بسم اللہ کہہ کر حضور کے دہن مبارک میں ڈال دیتے، قاعدہ یہ تھا کہ جب بسم اللہ کہتے حضور دہن مبارک کھول دیتے اور آب انار ڈال دیا جاتا۔ (۱)

غایت اتباع سنت

سب کی رائے ہوئی کہ اب تہ بند کھول لیا جائے اور پانچجامہ پہنا دیا جائے چنانچہ صاحبزادہ صاحب و غلام قادر خاں صاحب والہ دیا صاحب نے پانچجامہ پہنانا شروع کیا، غلام قادر خاں صاحب نے تہ بند جو مثل پانچجامہ کے بنا ہوا تھا دلہنے پیر سے گھبراہٹ میں اتارنا چاہا، اسی وقت پائے مبارک کھینچ لیا اور بایاں پاؤں دراز کیا، سبحان اللہ! اس وقت بھی کس قدر اتباع شریعت محمدیہ ﷺ کا خیال تھا۔ (۲)

ساعت وداع

نماز مغرب کے بعد حالت اور زیادہ قریب الوصال ہو گئی بعد نماز کے سب لوگ واپس آ گئے، اس وقت سب کی رائے ہوئی کہ چارپائی کا رخ پھیر دینا چاہئے، لیکن اس طرح کہ سب پر ظاہر نہ ہو جائے، فوراً چارپائی شمالاً جنوباً کر دی گئی اور روئے مبارک قبلہ کی طرف کر دیا گیا، قریب سات بجے کے بالکل الوداعی سامان ظاہر ہو گئے، سو اچار بجے سے جو تنفس کی حالت تھی وہ ایسی تھی کہ گویا ذکر و شغل کی حالت میں کوئی اپنی سانس بڑھاتا ہے، اور صاف مفہوم ہوتا تھا کہ حضور لا الہ الا اللہ فرماتے ہیں، اس سے قبل کبھی کسی نے شاید ایسا ذکر جلی کرتے نہ دیکھا ہو گا اس اخفاء سے آپ ذکر کرتے تھے کہ دیکھنے والے کو ہرگز معلوم نہ ہوتا تھا۔ (۳)

سکینت و رحمت

گردا گرد چارپائی کے جو لوگ موجود تھے عجب سکون سب کے دل کو تھا، اگرچہ بہت بڑے بڑے جان نثار حاضر تھے لیکن کسی پر گھبراہٹ اور یاس کا عالم نہ تھا۔ (۴)

وفات

شام کے وقت ۲۲ تاریخ راقم کو شبہ تھا کہ شاید چاند نکلا ہے، اسی کی روشنی نیم کے در

خت پر جو چھپر کے باہر ہے پڑ رہی ہے، افسوس اس وقت خیال نہ آیا کہ یہ وقت نزول رحمت الہی اور ورود برکت نامتناہی کا ہے، اور یہ اس کی تجلیات ہیں۔

بعد مغرب کے اس قدر قوت لب مبارک میں باقی نہ تھی کہ زیادہ جنبش کر سکتے، اور نہ دہن مبارک وا ہو سکتا تھا کہ چچہ سے کوئی چیز دہن مبارک میں ڈالی جاتی، یہاں تک کہ کپڑے کے پھایہ سے آب انار اور کیوڑہ، یا کیوڑہ اور پانی دیا جانے لگا، راقم (عبدالغفار) نے اس خدمت کو مغرب سے آخر وقت تک انجام دیا صاحبزادہ صاحب (احمد میاں صاحب) سرہانے بیٹھے ہوئے تھے راقم بھی سرہانے بیٹھا تھا، اسی تنفس ذکر کی حالت میں ۲۲ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ کو بعد مغرب آپ نے سانس اوپر کر لی، اور روح پر فتوح نے جسم خاکی کو چھوڑا، اور عالم بالا کی طرف پرواز کی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (۱)

آثار قبولیت و رحمت

اس وقت جسم اطہر سے اس قدر خوشبو آتی تھی کہ جس کا کپڑا آپ کے جسم سے چھو گیا اس میں خوشبو آنے لگی، لوگ ایک دوسرے پر گرتے تھے، کسی کا دل قابو میں نہ تھا سب لوگ روتے تھے مگر سبحان اللہ! کہ آپ کو جیسی پابندی شرع کی بہ حالت حیات تھی ویسی ہی بعد ممات بھی رہی، کہ جو کوئی چلا کر رویا معا بیہوش ہو گیا، کہ سروپا کی خبر نہ رہی، جو لوگ خاموش تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے وہ بھی ہوش میں نہ تھے، غرض کہ تمام ہندو مسلمان رونے میں مبتلا تھے قیامت برپا تھی، عورتیں بھی سب حویلی سے آئیں، روتی ہوئی جب قریب پہنچیں آواز موقوف ہو گئی، صرف آنسو جاری تھے، کوئی کلمہ کوئی درود پڑھنے لگا، جنازہ اطہر پر نوحہ و بکا نہیں ہوا اور کیونکر ہوتا کہ ہمارے حضرت ﷺ نے کبھی بہ حالت حیات اس بات کو جائز نہیں رکھا۔

تمام شب لوگ جنازے کے گرد حاضر رہے، خوشبوئے اگر و عود جلائی گئی، تمام شب میں اس قدر لوگ جمع ہو گئے کہ مسجد میں اور باہر کہیں جگہ نہ رہی اور انوار و تجلیات کا کیا ذکر کیا جائے کہ ایک نورانی چادر سب کو ڈھانکے ہوئے تھی، جو لوگ کہ نغش مبارک کے گرد بیٹھے تھے قرآن خوانی اور ذکر و شغل میں مشغول تھے، ہرگز اس مقام پر یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ

یہاں کوئی موت ہوئی ہے کہ جیسے اور گھروں میں موت کے بعد دیکھا گیا ہے، بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے حضور روزانہ آرام فرماتے تھے، آج بھی اسی طرح آرام فرما رہے ہیں۔ (۱)

غسل و تکفین

سب کی رائے ہوئی کہ اسی مقام پر جہاں کہ آپ تشریف فرما تھے کچھ زمین کندہ کر کے غسل دیا جائے، ٹھیک سات بجے صبح کے غسل کیلئے آپ انہیں چوکیوں پر لائے گئے۔ اس وقت ایک عالم ٹوٹا پڑتا تھا چادر مبارک جسم اطہر سے اٹھائی گئی رومال کھول کے تہبند ڈالا گیا، چہرہ مبارک درخشاں تھا، اور ہرگز تمیز نہیں ہو سکتی تھی کہ آپ کا وصال ہو گیا ہے، بہ حالت حیات رخسار مبارک پر بوجہ پیرانہ سالی و کبرسنی کے شکنیں آگئی تھیں اور دانتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے رخسار مبارک اندر کو دب گئے تھے بالکل صاف و ہموار معلوم ہوتے تھے، یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ آپ ضعیف العمر آدمی ہیں اور روئے مبارک مثل گلاب کے تروتازہ تھا، حسب قاعدہ سنت سنیہ غسل دیا گیا، بعد فراغت غسل کے لاشہ اطہر کفنایا گیا، اس وقت حاضرین کو عجیب کیف تھا بعد فراغت سب لوگ ہٹا دیئے گئے، عورتیں آمیں زیارت کر کے چلی گئیں، ایسا مجمع کثیر تھا کہ بہت لوگوں کو کندھا دینا کیسا چارپائی سے ہاتھ لگانا نہایت دشوار ہو گیا۔ (۲)

نماز جنازہ و تدفین

بدقت تمام جنازہ مبارک بیرون مسجد لایا گیا اور دروازہ مسجد کے چبوترہ پر رکھا گیا۔ حسب وصیت نماز جنازہ احمد میاں صاحب نے پڑھائی (اور تدفین عمل میں آئی) ساڑھے نو بجے پورے طور پر قبر درست ہو گئی سب لوگ اس کا ضروری سے فارغ ہو گئے، بعد فراغت پھر تو عجیب ایک عالم پیدا ہوا کوئی شخص اپنے آپ میں نہ تھا اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی، مرزا صاحبان (مرزا عنایت علی بیگ صاحب و افضل علی بیگ صاحب ساکنان بھوپال) نے تین روز تک بہت سیر چشمی سے اہل تعزیت کی مہمانداری فرمائی، اور خیرات از قسم غلہ کھانا اور نقد بھی مساکین کو تقسیم کیا۔ (۳)

خواص اہل تعلق کی آمد اور ان کا تاثر

۲۴ ربیع الاول کو جناب مولانا محمد علی صاحب مونگیری، مولانا ظہور الاسلام صاحب لکھنؤ میں اس خبر کو سن کر تشریف لائے مولانا محمد علی صاحب جس وقت تشریف لائے، اولاً مزار پر حاضر ہوئے بعدہ مسجد میں تشریف لائے، کچھ ذکر حضرت کا حافظ قاری عبد الرحمن صاحب نے فرمایا، جناب مولوی محمد علی صاحب کو ایسا کیف ہوا کہ بہت دیر تک محض بیہوش رہے پنکھا وغیرہ جھلا گیا بدیر ہوش میں آئے۔

اسی طرح آج مولوی حبیب اللہ صاحب مدرس ٹانڈہ (۱) آئے اور مقبرہ شریف میں بیہوش ہو کر گر گئے بہت دیر کے بعد ہوش آیا اور بہت ہی حالت زار رہی، حتیٰ کہ دوسرے روز واپس گئے۔ (۲)

قرض کی ادائیگی

۲۷ ربیع الاخر کو راجہ محمد ممتاز علی خاں صاحب بہادر والئی ریاست اتروہ تشریف لائے اور اعلان کر دیا کہ جس بقال کا جس قدر روپیہ حضرت مرحوم کے ذمہ ہو ہم ادا کر دیں گے۔ چنانچہ دس ہزار چار سو روپیہ یکمشت ادا کیا گیا، زر قرضہ ادا کرنے کے وقت بعض حضرات کی رائے ہوئی کہ حساب کتاب دیکھ کر دینا چاہئے، راجہ صاحب نے فرمایا کہ :- ہمارے حضرت حساب کتاب کر کے نہ لیتے تھے نہ دیتے تھے، پس ہم بھی اس طرح نہ دیں گے، ہم روپیہ مزار شریف پر رکھے دیتے ہیں جس کا جتنا ہوا اٹھالے جائے، چنانچہ ویسا ہی ہوا، دامے درمے ایک ایک کوڑی تک باقی نہ رہی۔ (۳)



(۲) بدیع عشاق ص ۳۶

(۱) والد مدجد مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

(۳) بدیع عشاق، فضل رحمانی، از مولوی غمید الغفار صاحب آسیونی ص ۴۲

اولاد و احفاد

مولانا رحمہ اللہ کا پہلا عقد اپنے ہی خاندان ملاواں میں محمد عطاء اللہ صاحب ولد مولوی غلام امام صاحب کی دختر سے ہوا، جن سے دو صاحبزادے اول شاہ عبد الرحمن صاحب بعدہ شاہ عبد الرحیم صاحب ہوئے، شاہ عبد الرحمن صاحب سے ایک صاحبزادہ ہوئے جن کا نام بھی عطاء اللہ صاحب تھا مگر ان کی اولاد سب صغریٰ میں فوت ہو گئی۔

آپ کے دوسرے صاحبزادہ مولوی شاہ عبد الرحیم صاحب کے دو لڑکے ہوئے، اول شاہ تبارک حسین دوسرے شاہ حامد حسین عرف مدے میاں، پھر ایک دختر ہوئیں جو مولوی محمد رضا صاحب سندیلوی کو منسوب ہوئیں، ان صاحبزادی کی پیدائش کے کچھ روز بعد ہی مولانا رحمہ اللہ کی حرم اول کا انتقال ہو گیا۔

آپ کا دوسرا عقد گنج مراد آباد میں ہوا۔ یہ خاتون نواب مراد شیر صاحب علوی کے خاندان سے تھیں جن کے نام پر قصبہ کانام مراد آباد ہے ان کے بطن سے دو صاحبزادے احمد میاں صاحب اور سید محمد عرف سید و میاں صاحب اور ایک صاحبزادی شفقت بی بی پیدا ہوئیں، حرم دوم کا ۱۳۰۲ھ میں انتقال ہو گیا کئی برس بعد آپ نے مسماۃ مریم بی بی سے جو عرب سے آئی تھیں نکاح کیا، وہ آپ کی وفات کی بعد ۱۴، ۱۵ سال زندہ رہیں۔

مولانا احمد میاں صاحب کے دو صاحبزادے ہیں، رحمۃ اللہ میاں صاحب سجادہ نشین بڑے صاحبزادے اور نعمت اللہ میاں صاحب چھوٹے صاحبزادے، رحمۃ اللہ میاں صاحب کی دو اولادیں ہوئیں جو صغریٰ میں فوت ہو گئیں۔ نعمت اللہ میاں صاحب کے ایک بیوی سے دو صاحبزادے افضال الرحمن اور احمد الرحمن اور دوسری بیوی سے تین صاحبزادے آفاق الرحمن ولی الرحمن اور جلیل الرحمن اور ایک صاحبزادی ہوئیں۔ (۱)

سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند

حضرت مولانا محمد مظفر حسین کاندھلویؒ

سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند

حضرت مولانا محمد مظفر حسین کاندھلوی

(ولادت ۱۲۲۰ھ وفات ۱۲۸۳ھ)

حضرت مولانا محمد احتشام الحسن صاحب کاندھلوی

۱۲۲۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حضرت مفتی الہی بخش صاحب رحمہ اللہ سے حاصل کی، لیکن تعلیم پوری نہ فرمانے پائے تھے کہ حضرت مفتی صاحب کا وصال ہو گیا، اس لئے بقیہ تعلیم ظاہری و باطنی دہلی میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ سے پوری فرمائی، جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کے نواسے اور شاگرد رشید تھے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ، مہاجر مکی رحمہ اللہ سے بھی شدید تعلق تھا اور آپ انہیں سے مرید تھے (۱) حضرت مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ نے علم طریقت اور انوار معرفت اور اسرار حکمت کو اپنے عم بزرگوار ان حضرت مفتی الہی بخش صاحب رحمہ اللہ اور مولانا شاہ کمال الدین صاحب رحمہ اللہ سے بھی حاصل کیا ہے اور آپ ان دونوں کے خلیفہ اور جانشین سمجھے جاتے تھے۔

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ کے یہاں درس و تدریس کا سلسلہ نہ تھا ایک

(۱) حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب رحمہ اللہ نے اختتام مثنوی پر جو حضرت مفتی صاحب کے حالات شائع کئے ہیں، ان میں سے میں نے یہ نقل کیا ہے۔ لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا اس لئے کہ حضرت مفتی صاحب کا وصال ۱۲۴۵ھ میں ہوا۔ اس وقت مولانا مظفر حسین صاحب کی عمر پچیس سال ہوتی ہے اور یہ بہت مستبعد ہے کہ مولانا مظفر حسین صاحب نے اس وقت تک تکمیل نہ کی ہو اور ابتدائی تعلیم میں مشغول ہوں۔ بالخصوص جبکہ مولانا سلیمان خود آخر حالات میں حضرت مولانا مظفر حسین کو حضرت مفتی صاحب کا خلیفہ اور جانشین بھی فرما رہے ہیں۔ ایک اور واقعہ بھی اس کی تردید کرتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب آخر دور میں بیشتر استغراق اور بے خودی کے عالم میں رہتے تھے اور لوگوں کو بعض عملیات اور تعویذات بتلا دیتے تھے۔ مولانا مظفر حسین صاحب کو جب معلوم ہوتا تو حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے چچا جی یہ تو جائز نہیں۔ آپ فرماتے اچھا تو پھر منع کر دو۔ جب بار بار اس کا اتفاق ہوا تو آخر میں حضرت مفتی صاحب نے یہ معمول بنالیا تھا کہ جس کو کوئی عمل بتلاتے تھے اس سے کہہ دیتے تھے کہ مولوی مظفر حسین کو پہلے دکھائے پھر کر لے۔ اس لئے میرے خیال میں صحیح یہ ہے کہ مولانا مظفر حسین نے پہلے حضرت مفتی صاحب سے علوم ظاہری اور باطنی کی تکمیل کی پھر شاہ محمد اسحاق صاحب کی طرف رجوع کیا اور آخر میں شاہ محمد یعقوب صاحب سے وابستہ ہوئے۔ اور یہ بات ذوق طالب سے بعید نہیں۔ خود حضرت مفتی صاحب نے یکے بعد دیگرے دوسروں کی طرف رجوع کیا۔ ۱۳ منہ

سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی کبھی مسجد میں اور کبھی گھر میں وعظ فرماتے تھے۔ انداز بیان سادہ ہوتا تھا مگر قلوب میں اتر جاتا تھا اور تمام شکوک و شبہات سے دل کو صاف کر دیتا تھا۔ مجلس وعظ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا رحمت خداوندی بارش کی طرح آسمان سے برس رہی ہے اور پھر مردہ قلوب کو سرسبز و شاداب کر رہی ہے۔

ریاضات و مجاہدات اور عبادات و طاعت میں مشغول اور سرگرم رہتے تھے۔ رمضان المبارک میں تمام رات عبادت میں گزارتے اور ایک لمحہ کے لئے نہ سوتے تھے اور نہ بستر پر لیٹتے تھے۔ روز حشر کے خوف سے ہر وقت آنسو آنکھوں سے جاری رہتے تھے کبھی جلال ایزدی کے خوف سے چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا تھا اور کبھی جمال رحمانی کے تصور سے گلاب کی طرح سرخ ہو جاتا تھا۔ زہد و تقویٰ خصوصی شعار تھا جو بچپن سے طبیعت میں ودیعت رکھا ہوا تھا۔ کبھی طاعت خداوندی اور اتباع سنت نبوی سے تجاوز نہ کرتے تھے اور اپنے تمام دینی اور دنیوی امور اور ظاہری و باطنی مہمات اور مشکلات کو ہمیشہ قرآن و حدیث کے موافق پورا کرتے تھے اور مخلوق کے حقوق کی ادائیگی میں ہمیشہ سرگرم رہتے تھے اور سنت نبویہ کے احیاء میں اپنی ساری مساعی اور پوری جدوجہد کو صرف کرتے تھے۔ اور کوشش کرتے تھے کہ کوئی کام اللہ اور رسول کی رضا کے خلاف سرزد نہ ہو اور کوئی قدم سنت کے خلاف زمین پر نہ پڑے۔ اسی لئے اپنی صورت و سیرت اور طلعت و طبیعت کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی مانند رکھتے تھے۔ انسانی صورت اور فرشتہ سیرت رکھتے تھے۔ بظاہر دنیوی امور میں مشغول نظر آتے تھے۔ لیکن باطن سے ہر وقت رضائے الہی اور امور اخروی میں منہمک اور مست و سرشار رہتے تھے۔ (۱)

مولانا مظفر حسین صاحب کے یہ چند حالات ہیں جن پر روشنی ان واقعات اور حکایات سے پڑتی ہے جو بزرگوں کی زبانی لوگوں میں مشہور و معروف ہیں۔ ایک مرتبہ آپ کے پیر و مرشد حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب سے کسی شخص نے سوال کیا کہ صحابہ کرام کو وضع قطع کیسی تھی؟ شاہ صاحب نے فرمایا۔ ذرا صبر کرو۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا مظفر حسین صاحب آگئے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس سائل کو طلب فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا کہ اصحاب رضی اللہ عنہم پاک کا نمونہ اس وقت دنیا میں مولوی محمد مظفر حسین موجود ہیں، جس شخص کو وضع اور لباس اور صورت و سیرت اصحاب کرام رضی اللہ عنہم سے اپنی آنکھوں کو منور کرنا منظور ہو وہ مولوی مظفر حسین کو دیکھ لے (۲)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں تین شخص نہایت متقی تھے۔ اول درجہ کے مولوی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، دوسرے درجہ کے شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، تیسرے درجہ کے نواب قطب الدین خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ نواب قطب الدین خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ مولوی محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور چند دوسرے احباب کی دعوت کی۔ شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے منظور فرمائی اور مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی۔ مگر مولوی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے منظور نہ فرمائی۔ اس سے نواب قطب الدین خاں کو ملال ہوا اور انھوں نے شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی کہ میں نے مولوی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھی دعوت کی تھی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ شاہ صاحب نے مولوی مظفر حسین پر عتاب فرمایا اور فرمایا کہ ”ارے مظفر حسین تجھے تقویٰ کی بد ہضمی ہو گئی، کیا نواب قطب الدین کا کھانا حرام ہے۔“ انھوں نے فرمایا۔ ”حاشاؤ کلا مجھے نواب صاحب پر اس قسم کی بدگمانی نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا پھر تو کیوں انکار کرتا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت! نواب صاحب نے آپ کی بھی دعوت کی ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب کی بھی اور ان کے علاوہ اتنے اور آدمیوں کی اور آپ کو پالکی میں لے جائیں گے، اس میں بھی ضرور صرف ہو گا اور نواب صاحب کو بگڑ گئے ہیں، مگر پھر نواب زادے ہیں دعوت میں ضرور نوابانہ تکلف کریں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب مقروض بھی ہیں۔ پس یہ جبکہ مقروض ہیں اور جتنا روپیہ وہ دعوت میں خرچ کریں گے وہ ان کی حاجت سے زائد بھی ہے تو یہ روپیہ وہ اپنے قرض میں کیوں نہیں دے دیتے، ایسی حالت میں ان کا کھانا کراہت سے خالی نہیں۔ یہ بات شاہ صاحب کے ذہن میں بھی آ گئی۔ شاہ صاحب نے فرمایا میاں قطب الدین اب ہم بھی تمہارے یہاں کھانا کھائیں گے۔

(فائدہ از حضرت تھانوی) ان کا کھانا کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ ادائے دین کی تاخیر میں اعانت بعید ہے۔ کیا دقیق تقویٰ ہے اور استاد کیسے مقدس کہ یا تو شاگرد کو لتاڑ رہے تھے یا انہی کا اتباع کر لیا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر اپنے پاس دلیل ہو تو محض استاد کی تقلید سے دلیل کو نہ چھوڑنا چاہئے۔

(ارواح شاد)

کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک بوڑھا ملا جو بوجھ لئے ہوئے جاتا تھا۔ بوجھ کسی قدر زیادہ تھا اس وجہ اس سے مشکل سے چلتا تھا۔ مولانا مظفر حسین صاحب نے جب یہ حال دیکھا تو آپ نے اس سے وہ بوجھ لے لیا اور جہاں وہ لے جانا چاہتا تھا وہاں پہنچا دیا۔ اس بوڑھے نے ان سے پوچھا کہ اجی تم کہاں رہتے ہو۔ انھوں نے کہا میں کاندھلہ رہتا ہوں۔ اس نے کہا، وہاں مولوی مظفر حسین بڑے ولی ہیں اور ان کی بہت تعریف کی۔ مولانا مظفر حسین صاحب نے فرمایا اور تو اس میں کوئی بات نہیں البتہ نماز ضرور پڑھ لیتا ہے۔ اس نے کہا واہ میاں تم ایسے بزرگ کو ایسا کہتے ہو، مولانا نے فرمایا ٹھیک کہتا ہوں۔ اس پر وہ بوڑھا ان کے سر ہو گیا۔ اتنے میں ایک اور شخص آگیا، جو مولانا مظفر حسین صاحب کو جانتا تھا، اس نے اس بوڑھے سے کہا۔ بھلے مانس مولوی مظفر حسین یہی تو ہیں۔ اس پر وہ بوڑھا ان سے لپٹ کر رونے لگا۔ مولانا بھی اس کے ساتھ رونے لگے۔ اس پر حضرت تھانوی نے یہ شعر تحریر فرمایا ہے۔

طریقت بحر خدمت خلق نیست بہ تسبیح و سجادہ و دلوق نیست (۱)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب کسی سواری پر سوار ہوتے پہلے مالک کو سب چیز دکھلا دیا کرتے تھے۔ پھر اگر بعد میں کوئی خط بھی لاتا تو فرماتے کہ بھائی میں نے سارا اسباب مالک کو دکھایا ہے اور یہ اس میں سے نہیں لہذا تم مالک سے اجازت لے لو۔ (۲)

نیز فرمایا کہ مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دہلی سے بہلی میں سوار ہو کر اپنے وطن کاندھلہ تشریف لارہے تھے۔ بزرگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر شخص سے اس کے مذاق کے موافق گفتگو کیا کرتے ہیں۔ اس بہلی والے سے بھی اس کے متعلق کچھ پوچھنے لگے کہ بیلوں کو رات بکتنا دیتے ہو اور کیا بچت ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں بہلو ان کی زبان سے یہ نکل گیا کہ یہ بہلی ایک رنڈی کی ہے اور میں اس کا نوکر ہوں۔ بھلا مولانا رنڈی کی گاڑی میں کیسے بیٹھ سکتے تھے۔ اب مولانا کا دقیق تقویٰ دیکھئے فوراً نہ اترے تاکہ اسکی دل شکنی بھی نہ ہو تقویٰ بھی برتنا ہر شخص سے نہیں آتا۔ ذرا دیر کے بعد بولے کہ بہلی کو روک لینا مجھے پیشاب کی ضرورت ہے۔ اس نے بہلی روکی۔ آپ نے اتر کر پیشاب کیا اور اس کے ساتھ استنجا سکھاتے چلے، لیکن کہاں تک چلتے آخر ڈھیلا پھینک دیا۔ اس نے کہا بیٹھ جائیے۔ فرمایا

ٹانگیں شل ہو گئی ہیں، ذرا دور پیدل چلوں گا۔ تھوڑی دور چل کر اس نے پھر عرض کیا۔ آپ نے پھر ٹال دیا۔ پھر کہا پھر ٹال دیا۔ پھر وہ سمجھ گیا اور کہا۔ مولانا میں سمجھ گیا کہ یہ رنڈی کی گاڑی ہے، آپ اس میں بیٹھیں گے نہیں۔ پھر لے جانے سے کیا فائدہ حکم دیجئے لوٹ جاؤں۔ فرمایا ہاں بھائی بیٹھوں گا تو نہیں لیکن تمہیں کاندھلہ چلنا ہو گا کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی اس کے پاس کرائے کو آیا ہو اور اس نے انکار کر دیا ہو تو اس کا خواہ مخواہ نقصان ہو گا۔ پس آپ کاندھلہ تک ویسے ہی پیدل آئے اور ہر منزل پر بیلوں کو گڑ اور گھی اور گھاس دانہ کا ویسا ہی انتظام کیا اور مکان پر آ کر اس کو کرایہ دے کر واپس کر دیا۔ یہاں پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب کرایہ دینا ہی تھا تو پھر کاندھلہ تک خالی بہلی کیوں لائے تو بات یہ ہے کہ بعض طبیعتیں بلا کارگزاری کے لینا گوارہ نہیں کرتیں۔ یا اس کے سوا کوئی اور وجہ ہو۔ (۱)

(ارواح ثلاثہ، منقول از اشرف التنبیہ)

مولانا مظفر حسین صاحب انتہائی سادہ اور بے تکلف رہتے تھے۔ ایک مرتبہ گنگوہ میں حضرت گنگوہی سے ملے۔ چلنے کے وقت حضرت گنگوہی نے کہا۔ کھانا تناول فرما لیجئے۔ فرمایا بھائی کا دور کا سفر ہے، میری منزل کھوٹی ہوگی، حضرت گنگوہی نے کہا جو کچھ رکھا ہے وہی سہی۔ مولانا راضی ہو گئے اور فرمایا کہ بس وہی لے آنا جو گھر میں موجود ہو۔ گھر میں پاسی روٹی اور دال رکھی تھی۔ حضرت گنگوہی وہی ہاتھ پر رکھ کر لے آئے۔ دال بھی روٹی پر رکھی تھی۔ پھر نہیں معلوم مولانا نے کھائی یا ساتھ باندھ لی۔ پھر مولانا مظفر حسین صاحب نے رام پور پہنچ کر حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب سے فرمایا۔ مولوی رشید احمد صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں حضرت بہت اچھے آدمی ہیں۔ پھر فرمایا جی تم سمجھتے تو ہو نہیں، ایسے اچھے ہیں کہ بہت ہی اچھے۔ حکیم صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ایسی کیا خاص بات ہوئی؟ فرمایا کیا کہوں انھوں نے تھوڑا سا ناشتہ کرنے کے لئے راستہ میں مجھ سے کہا۔ میں نے کہا جو کچھ گھر میں موجود ہو وہ لے آؤ۔ انھوں نے پاسی روٹی اور دال لا کر دے دی۔ سبحان اللہ کیسے اچھے آدمی ہیں۔

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ ایک مرتبہ نانوتہ تشریف لے گئے، وہاں اس وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ موجود تھے۔ فرمایا کہ بھائی ایک مسئلہ میں تردد ہے۔

میں نے سنا تھا کہ سب صاحبزادے جمع ہیں اس لئے مسئلہ پوچھنا آیا ہوں۔ وہ مسئلہ یہ

ہے کہ چلتی ریل میں نماز پڑھنے میں علماء اختلاف کرتے ہیں کہ جائز ہے یا نہیں۔ بس تم لوگ آپس میں گفتگو کر کے ایک منقح صاف بات بتلا دو کہ جائز ہے یا نہیں میں دلائل نہیں سنوں گا۔ چنانچہ سب حضرات نے گفتگو کی اور مولانا نے ادھر التفات بھی نہ فرمایا۔ گفتگو کر کے ان حضرات نے عرض کیا کہ حضرت طے ہو گیا جائز ہے۔ فرمایا اچھا تو پھر میں جاتا ہوں۔ ان بزرگوں کو حضرت مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ سے خاص عقیدت اور محبت تھی اور سب ان کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کی صاحبزادی صاحبہ بیان فرماتی تھیں کہ والد صاحب رحمہ اللہ بعض مرتبہ ایک کام کو منع فرمادیتے تھے کہ یہ رسم ہے اور جب ان سے کہا جاتا کہ کاندھلہ میں مولانا مظفر حسین صاحب کے گھر ایسا ہوتا ہے تو آپ فرماتے اگر وہاں ہوتا ہے تو پھر کوئی حرج نہیں۔ ان کے گھرانے میں خلاف شرع کام نہیں ہو سکتا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ابتداء میں امامت سے بھی گھبراتے تھے اور وعظ بھی نہ کہتے تھے۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ نے اول وعظ کہلویا اور خود بھی بیٹھ کر سنا اور بہت خوش ہوئے۔ پھر فرمایا حضرت مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ اس آخری زمانے میں قدماء کے نمونہ تھے۔ تقویٰ اللہ اکبر ایسا تھا اور اس سے وہ نسبت پیدا تھی کہ مشتبہ چیز اگر معدے میں پہنچ گئی تو اسی وقت قے ہو جاتی تھی۔ اور اتباع سنت تو نہ ایسا دیکھا اور نہ ایسا سنا۔

(سوانح قاسمی صفحہ ۱۱)

حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمہ اللہ جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کے والد اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کے استاد تھے۔ دہلی میں سرکاری مدرسہ دارالبقاء میں مدرس تھے۔ نانوتہ اور دہلی کے درمیان آمد و رفت میں راستہ میں کاندھلہ پڑتا تھا۔ حضرت مولانا مظفر حسین نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ کاندھلہ میں مل کر جلیا کرو۔ حضرت مولانا مملوک علی صاحب نے کہا تکلف نہ کرنا صرف ملنے کے لئے کچھ دیر ٹھہر جلیا کروں گا۔ چنانچہ مولانا مملوک علی صاحب ہمیشہ دہلی آتے اور جاتے جب کاندھلہ سے گزرتے تو باہر سڑک پر گاڑی کو چھوڑ کر ملنے آتے۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب اول پوچھتے کہ کھانا کھا چکے یا کھاؤ گے۔ اگر کہا کہ کھا چکا تو کچھ نہیں اور اگر نہ کھائے ہوئے ہوتے تو کہہ دیتے کہ میں کھاؤں گا۔ تو مولانا پوچھتے کہ رکھا ہوا لا دوں یا تازہ پکوا دوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ یہ فرمایا کہ رکھا ہوا لا دو۔ اس وقت ایک دفعہ صرف کچھڑی کی کھرچن

تھی اسی کو لے آئے اور فرمایا رکھی ہوئی تو یہی تھی۔ انھوں نے کہا بس یہی کافی ہے۔ پھر جب مولانا رخصت ہوتے تو مولانا مظفر حسین صاحب ان کو گاڑی تک پہنچانے جاتے تھے یہی ہمیشہ کا معمول تھا۔

(ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۱۹۵)

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب بالکل سادہ وضع قطع رکھتے تھے۔ ایک گاڑھے کا کرتہ، ایک پاجامہ، ایک نیلی لنگی، یہ آپ کا لباس اور کل اثاثہ ہوتا تھا۔ میری دادی صاحبہ یعنی حضرت مولانا کی صاحبزادی فرماتی تھیں کہ ایک بار میں نے موٹی لمبل کا کرتہ حضرت کے لئے سیاہ اول تو زیب تن کرنے سے انکار فرمایا۔ پھر میری خوشنودگی کو پہنا مگر جمعہ کی نماز پڑھ کر فوراً اتار دیا اور فرمایا کہ میرا گاڑھے کا کرتہ دے دو اس میں عجب پیدا ہوتا ہے۔ سواری پر بہت کم سوار ہوتے تھے اور اکثر پیدل سفر کرتے تھے اور سامان سفر لوٹا، لنگی، مشکیزہ ہوتا تھا۔ جہاں شام ہو جاتی تھی وہیں شب بسر فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شام ایک ایسے گاؤں میں ہوئی۔ جہاں سب ہندو تھے مسلمان کوئی نہ تھا۔ وہاں والوں سے کہا کہ رات کو رہنے کے لئے کوئی جگہ بتادو تو ایک شخص نے گاؤں کے باہر کو لھو پر بتا دیا۔ آپ کے پاس روٹی تھی اس کو تناول فرمایا اور اسی جگہ قیام کیا۔ اتفاقاً وہی شخص رات کو کسی کام کے لئے جنگل میں آیا تو حضرت کو قرآن پڑھتے سنا۔ تمام رات بے تابی سے گزاری اور صبح کو حاضر خدمت ہو کر عرض کیا۔ رات جو تو پڑھ رہا تھا وہی جلدی سے مجھے بھی پڑھا دے۔ اس کے بعد آپ کو اپنے گھر لے گیا اور اس کے بیوی بچے وغیرہ سب مسلمان ہو گئے۔

ایک مرتبہ آپ کا جلال آباد یا شاملی گزر ہوا۔ ایک مسجد ویران پڑی تھی وہاں نماز کے لئے تشریف لا کر پانی کھینچا وضو کیا، مسجد میں جھاڑودی۔ بعد میں ایک شخص سے پوچھا کہ یہاں کوئی نمازی نہیں؟ اس نے کہا جی سامنے خاں صاحب کا مکان ہے جو شرابی اور رنڈی باز ہیں اگر وہ نماز پڑھنے لگیں تو یہاں اور بھی دو چار نمازی ہو جائیں۔ آپ ان خاں صاحب کے پاس تشریف لے گئے تو وہ رنڈی پاس بیٹھی ہوئی تھی اور نشے میں مست تھے۔ آپ نے خاں صاحب سے فرمایا۔ بھائی خاں صاحب اگر تم نماز پڑھ لیا کرو تو دو چار آدمی اور جمع ہو جلیا کریں گے اور مسجد آباد ہو جائے گی۔ خاں صاحب نے کہا۔ میرے سے وضو نہیں ہوتا اور نہ یہ دو بری عادتیں چھوٹی ہیں۔

آپ نے فرمایا بے وضو ہی پڑھ لیا کرو اور یہ کام بھی کر لیا کرو۔ اس پر اس نے عہد کیا کہ

میں بغیر وضو نماز پڑھ لیا کروں گا۔ آپ وہاں سے تشریف لے گئے اور کچھ فاصلے پر نماز پڑھی اور سجدے میں خوب روئے۔ ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضرت آپ سے دو ایسی باتیں سرزد ہوئیں جو کبھی نہیں ہوئیں، اول یہ کہ آپ نے شراب اور زنا کی اجازت دے دی دوسرے یہ کہ آپ سجدے میں خوب روئے۔

فرمایا کہ سجدے میں میں نے جناب باری سے التجا کی تھی کہ اے رب العزت کھڑا تو میں نے کر دیا اب دل تیرے ہاتھ میں ہے۔

ادھر خان صاحب کا یہ حال ہوا کہ جب رنڈیاں پاس سے چلی تو ظہر کا وقت تھا اپنا عہد یاد آیا۔ پھر خیال آیا کہ آج پہلا روز ہے لاؤ غسل کر لیں۔ کل سے بغیر وضو پڑھ لیا کریں گے۔ غسل کیا پاک کپڑے پہنے اور نماز پڑھی، بعد نماز باغ کو چلے گئے۔ عصر اور مغرب باغ میں اسی وضو سے پڑھی۔ بعد مغرب گھر پہنچے تو طوائف موجود تھیں۔ اول کھانا کھانے گھر میں گئے۔ بیوی پر جو نظر پڑی تو فریفتہ ہو گئے۔ ان کی شادی کو سات سال ہو گئے تھے اور آج تک نہ کبھی بیوی کے پاس گئے اور نہ اس کی صورت دیکھی تھی۔ فوراً باہر آئے۔ رنڈی سے کہا کہ آئندہ میرے مکان پر نہ آنا۔ اور خادم سے کہا کہ بسترہ گھر میں بھیج دو۔

سنا ہے ان خان صاحب کی ۲۵ سال تک کبھی تہجد کی نماز قضا نہیں ہوئی۔ ایسے ہی ایک مرتبہ آپ گڑھی پختہ تشریف لے گئے۔ ایک خان صاحب سے نماز کے لئے کہا تو انھوں نے جواب دیا کہ مجھے ڈاڑھی چڑھانے کی عادت ہے اور وضو سے یہ اتر جاتی ہے۔ آپ نے کہا کہ بغیر وضو پڑھ لیا کرو۔ خان صاحب نے کچھ روز بغیر وضو نماز پڑھی۔ پھر خیال آیا کہ ایک مولوی کے کہنے سے تو نے بغیر وضو نماز پڑھنی شروع کر دی اور اللہ اور رسول کے حکم سے با وضو نماز نہیں پڑھی جاتی۔ اس کے بعد ہمیشہ با وضو نماز پڑھنے لگے۔ (ارواح ثلاثہ صفحہ ۱۹۶)

فائدہ:- بے وضو نماز پڑھنا یا سجدہ کرنا کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کو چونکہ اپنے نور بصیرت سے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کی ہدایت اور اصلاح کا یہی ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے انھوں نے ضرورتاً بظاہر اس کی اجازت دے دی۔ جو دوسروں کے لئے دلیل نہیں بن سکتا۔ (حاشیہ ارواح ثلاثہ صفحہ ۱۹۷)

آپ نے سات حج کئے اور پیدل۔ ایک مرتبہ حج سے واپس تشریف لا رہے تھے..... پانی پت سے چل کر شب کو کسی گاؤں میں سرائے کی مسجد میں قیام فرمایا اور اخیر شب میں وہاں سے

رانہ ہوئے۔ اتفاق سے رات کو سرائے میں چوری ہو گئی۔ بھٹیاری نے کہا کہ ایک شخص مسجد میں ٹھہرا تھا اور صبح چلا گیا۔ ضرور وہی چور ہے۔ لوگ تعاقب کے لئے آئے اور جھنجھانہ کے قریب آکر پکڑ لیا اور کہا تھانہ چلو۔ آپ نے فرمایا جھنجھانہ کے تھانہ میں نہ لے چلا اور کہیں لے چلو۔ اس پر ان لوگوں کو اور بھی شبہ ہوا۔ اور وہ جھنجھانہ ہی کے تھانہ میں لے گئے اور ایک سپاہی کے حوالہ کر دیا جس نے آپ کو حوالات میں بند کر دیا۔ تھوڑی دیر میں قصبہ کے لوگوں نے دیکھا اور تمام قصبہ میں شور ہو گیا۔ عوام بہت مشتعل ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ تھانہ دار کی بدمعاشی ہے اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ تھانیدار خواجہ احمد حسن تھے جو میرے دادا صاحب مرحوم کے دوست تھے اور حضرت مولانا سے خوب واقف تھے۔ بہت مشکل سے جان بچا کر تھانہ آئے اور آپ کو حوالات سے نکالا اور واقعہ کی تحقیق کی۔ پھر لوگ اس پانی پت والے آدمی کی جان کے درپے ہو گئے، جو آپ کو پکڑ کر لایا تھا۔ آپ نے خود خواجہ احمد حسن سے فرمایا کہ اس کی جان کے تم ذمہ دار ہو، اس کے ساتھ دو تین آدمی کر دو جو اس کو بخیرت پانی پت تک پہنچا دیں۔ اس موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ قصور میرا ہی ہے ایسی شکل و صورت کیوں بنائی جو کسی کو چوری کا شبہ ہو۔

آپ ایک مرتبہ کاندھلہ تشریف لارہے تھے۔ ایک شخص مل گیا۔ اس سے دریافت فرمایا کہ کہاں جاؤ گے۔ اس نے جواب دیا کاندھلہ مولوی مظفر حسین کے پاس۔ اس کے پاس سامان تھا اور آپ خالی ہاتھ تھے۔ آپ نے اس سے سامان لے کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ کاندھلہ آکر جب اسے معلوم ہوا کہ یہی مولوی صاحب ہیں تو بہت پشیمان ہوا۔ آپ نے فرمایا اس میں حرج کیا تھا، میں خالی ہاتھ تھا اور تم بوجھ لئے آرہے تھے۔

(ارواحِ ثلاثہ)

آپ محتاط بہت زیادہ تھے کبھی مشتبہ مال نہ کھاتے تھے اور اگر بھولے یا غلطی سے کھا لیتے تو فوراً قے ہو جاتی تھی۔

زمانہ طالب علمی کا قصہ ہے کہ آپ نے کئی سال روٹی سالن سے نہیں کھائی دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ دہلی کے اکثر سالنوں میں کھٹائی پڑتی ہے اور آموں کی بیج ناجائز طریق پر ہوتی ہے اس لئے میں سالن نہیں کھاتا۔ حالانکہ آپ کا یہ کھانا آپ کے استاد حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے یہاں سے آتا تھا حضرت شاہ صاحب کو جب معلوم ہوا تو حیران رہ

گئے اور فرمایا کہ ہمیں تو کبھی اس کا خیال بھی نہ آیا۔

آپ بجز اپنے گھر کے اور کسی کے یہاں عام دعوت میں تشریف نہ لے جاتے تھے، البتہ غریبوں کی دعوت کو بہت شوق کے ساتھ قبول کرتے تھے اور ان کے گھر جا کر کھانا کھانے میں لذت اور حلاوت محسوس کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ کسی گاؤں کی ویران مسجد میں ٹھہرے۔ وہاں مغرب کے تھوڑی دیر بعد ایک غریب آدمی آیا اور جلدی جلدی مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد جب آپ کو دیکھا تو اپنے گھر گیا اور تین روٹی روکھی لا کر آپ کو دیں۔ آپ نے ان کو تناول فرمایا اور سو گئے۔ رات کو خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی اور عجیب و غریب انوارات اور برکات ظاہر ہوئے، اس لئے آپ اگلے دن پھر وہیں ٹھہر گئے دن بھر کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ بعد مغرب وہی آدمی آیا اور آپ کو بیٹھا دیکھ کر اپنے گھر سے دو روٹی بغیر سالن کے لا کر دیں۔ یہ رات بھی پہلی رات کی طرح گزری اور حضرت رسالت مآب ﷺ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ آپ اگلے دن پھر ٹھہرے رہے۔ بعد مغرب وہی شخص آیا اور آپ کو دیکھ کر گھر سے ایک روٹی لایا اور کہا بھائی مسافر اب جاؤ کل کو یہاں نہ ٹھہرنا۔

حضرت مولانا نے فرمایا۔ میرے ٹھہرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں تمہاری روٹی میں عجیب لذت و حلاوت محسوس کرتا ہوں اور عجیب و غریب انوارات و برکات کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ تم حقیقت حال بتاؤ تب جاؤں گا۔

اس شخص نے کہا۔ میں غریب آدمی ہوں، دن بھر محنت کر کے جو پیسے ملتے ہیں اس کا تھوڑا آٹا کے آتا ہوں جس میں تین روٹی پکتی ہیں۔ ایک میری، دوسری بیوی کی اور تیسری بچے کی۔ پہلے دن ہم تینوں نے فاقہ کیا اور تینوں روٹیاں تمہیں لادیں۔ دوسرے دن بچے کی حالت نہ دیکھی گئی اس لئے ایک روٹی اس کو دے دی اور دو تمہیں لادیں۔ آج بھوک کی وجہ سے بیوی بے تاب تھی اس کے حصہ کی روٹی اس کو دے دی اور اپنے حصہ کی لے آیا اور اب کل کو مجھ میں بھی فاقہ کی طاقت نہیں اس لئے مجبوراً تمہیں کہنا پڑا۔ حضرت مولانا نے فرمایا۔ سچ ہے یہ اسی اکل حلال اور ایثار کے اثرات اور ثمرات اور برکات ہیں۔

آپ غرباء کی دعوت کو اس قدر شوق و رغبت کے ساتھ قبول فرمایا کرتے تھے کہ مولانا نور الحسن صاحب اکثر کہا کرتے کہ معلوم نہیں حجاز صاحب کو دعوت کا کیا شوق ہے،

غریبوں کی دعوت قبول کر لیتے ہیں، پھر اس کا مکان ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب ابتداء قاضی جی اور متولی جی کے گھر قرابت اور یگانگت کی بنا پر کھانا تناول فرمایا کرتے تھے۔ قاضی شیخ محمد اور متولی محمد اسماعیل کے والد کے انتقال کے بعد ان کے یہاں بھی کھانا کھانا چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ بعد پھر شروع کر دیا اور بغیر بلائے خود تشریف لے گئے۔ دریافت کرنے پر فرمایا۔ پہلے تم نابالغ تھے اس لئے میں تمہارے مال سے پرہیز کرتا تھا۔ اب تم بالغ ہو گئے اس لئے مجھے کوئی عذر نہیں۔

ایک مرتبہ آپ مولانا نور الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تشریف لے گئے (غالباً مولانا کا قیام اس وقت بسلسلہ ملازمت تحصیلداری نکوڑ میں تھا) انھوں نے کچھ دام اپنے صاحبزادے مولانا حکیم محمد ابراہیم صاحب کو دیئے کہ خود جا کر ان کا سامان کھانے کے لئے لادیں تاکہ کچھ گڑ بڑ نہ ہو، کھانا تیار ہوا۔ اس میں فیرونی بھی تھی جس کے کھاتے ہی قے ہو گئی۔ مولانا نور الحسن صاحب بہت پریشان ہوئے۔ تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ جو دودھ مولانا ابراہیم صاحب لائے وہ گر گیا تھا۔ دودھ باورچی حلوائی کے یہاں سے وار میں لے آیا تھا۔

آپ بہت منکسر المزاج تھے۔ ہر ایک کام خود کیا کرتے تھے، بلکہ دوسروں کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ عادت شریفہ تھی کہ اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا کرتے تھے اور جو جو گھر اپنے اقارب کے تھے ان میں تشریف لے جاتے۔ اگر کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہوتا تو پوچھ کر وہ لادیتے تھے۔ پیسہ اس زمانے میں کم تھا، جو شے آتی تھی وہ غلہ کی آتی تھی۔ آپ غلہ کبھی کرتے کے پلے میں لے جاتے اور کبھی لنگی میں۔

آپ ایک مرتبہ رام پور تشریف لے گئے۔ ایک عورت حاضر خدمت ہوئی اور عرض کیا کہ میرا خاوند مجھے خرچ نہیں بھیجتا۔ آپ نے اس کا پتہ دریافت فرمایا اور وہاں سے فیروز پور تشریف لے گئے اور اس کے خاوند کو تلاش کر کے ہدایت کی کہ آئندہ ہمیشہ خرچ بھیجا کرو۔

بیوہ کے نکاح کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا، آپ کو فکر ہوئی کہ اس رسم کو توڑنا چاہئے۔ اس فکر میں تھے کہ مولوی ابوالقاسم صاحب صاحبزادہ حضرت مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ان کو اولاً ترجمہ قرآن شریف پڑھنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے ترجمہ شروع کیا۔ پھر ایک موقع پر انھیں نکاح ثانی کی ترغیب دی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ تم شہید ہو گے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ اگر تم

نکاح کرو تو میں تیار ہوں، مگر میں اور تم دونوں مارے جائیں گے۔ آپ نے تھوڑی دیر سکوت فرمایا اور پھر اقرار فرمالیا۔ اور ایک موقع پر دو چار آدمیوں کے سامنے مخفی طور سے نکاح ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حمل ٹھہر گیا، کسی کو نکاح کی خبر نہ تھی۔ ہر جگہ زنا کا شور مچ گیا تھا۔ تھانہ بھون والے چڑھ کر آئے۔ لڑکی والے کی طرف سے اعلان تھا کہ جو کوئی شخص مولوی مظفر حسین کا سر اتار کر لادے گا اس کو ایک ہزار روپیہ ملے گا۔ آپ کاندھلہ سے دہلی تشریف لے گئے۔ مقدر کی بات کہ ان کی والدہ سخت علیل ہو گئیں۔ قاضی صاحب یعنی ان کے والد بہت مایوس ہو گئے تو ایک فقیر ملا اور کہا کہ حافظ ضامن صاحب سے یہ کہلا دو کہ اچھی ہو جا پھر اچھی ہونے کا میں ذمہ دار ہوں۔ سب لوگ حضرت حافظ صاحب کے سر ہو گئے وہ انکار کرتے تھے۔ قضیانی حضرت حافظ صاحب کی بہن تھیں۔ بہت اصرار پر آپ نے فرمایا کہ کاندھلہ سے اپنی لڑکی بی رحمت کو بلا لو تب کہوں گا۔ اول تو بہت پس و پیش ہوا۔ بعد میں مجبوراً بلانا پڑا۔ ان کے پہنچتے ہی خود بخود صحت شروع ہو گئی۔ اب حضرت مولانا مظفر حسین صاحب بھی دہلی سے تھانہ بھون تشریف لے گئے۔

کیرانہ میں ایک رافضی عورت تھی۔ آپ نے اسے اہل السنۃ والجماعت ہونے کی ترغیب دی۔ انھوں نے کہا اگر آپ نکاح کریں تو میں توبہ کر لوں گی۔ آپ نے منظور فرمالیا۔ یہ بھی بیوہ تھیں۔ انھوں نے کہا جب موقع ہو گا میں خط لکھوں گی تم آکر لے جانا۔ محرم کے موقع پر جب سب عورتیں قصبہ کے باہر تعزیے دیکھنے گئیں تو ان کا پرچہ مولانا کے پاس آیا جس میں یہ x نشان تھا۔ آپ نے میرے دادا مولانا محمد صادق صاحب (۱) اور چند آدمیوں کو ڈولی لے کر کیرانہ بھیجا اور یہ رات کو گیارہ بجے کیرانہ جا کر ان کو لے آئے۔ جب کیرانہ والوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے تعاقب کیا۔ یہاں سے بھی ان کی اعانت کو لوگ گئے، مگر مولانا محمد صادق صاحب ان کے ہاتھ نہ آئے اور بخیر کاندھلہ پہنچ گئے۔ ان محترمہ نے حضرت مولانا کو بہت سخت تکالیف پہنچائیں۔ مگر آپ سہتے تھے۔ اکثر رات کو دروازہ بند کر لیا کرتی تھیں اور حضرت دروازے کے پاس باہر لنگی بچھا کر نماز میں وقت گزارا کرتے تھے۔ حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی بیان فرماتے ہیں۔ بیواؤں کے نکاح کی بناء ان اطراف میں اولاً حضرت مولانا مظفر حسین صاحب سے

ہوئی اور والد صاحب مرحوم نے ان کو نہایت خوبصورتی سے اجراء فرمایا اور ان دونوں بزرگوں کے قدم بہ قدم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کو پورا اشائع کیا۔ یہ اجر ان صاحبوں کے نامہ اعمال میں تاقیامت رہے گا اور ایک یہ کیا دین کی ہزاروں باتیں ایسی ہی کیں۔ مجھے جناب مولوی مظفر حسین صاحب کی خدمت میں اس زمانے سے نیاز حاصل تھا جبکہ حضرت مولوی صاحب دہلی تشریف لاتے تو والد مرحوم کے پاس ہمارے مکان میں فروش ہوتے اور والد مرحوم جب وطن جاتے کاندھلہ ٹھہر کر جاتے اور جب وطن سے لوٹتے کاندھلہ ٹھہر کر دہلی روانہ ہوتے۔

(سوانح قاسمی صفحہ ۱۱)

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب ایک رات کے تین حصے فرمایا کرتے تھے۔ اول حصہ میں دوسری بیوی کو جو پہلے بیوہ تھیں ترجمہ قرآن شریف پڑھلایا کرتے تھے۔ دوسرے حصہ میں صاحبزادیوں کو ترجمہ پڑھلایا کرتے تھے۔ تیسرے حصہ کیرانہ والی بیوی کا تھا جس میں ان کے یہاں جا کر تہجد پڑھا کرتے تھے۔

آپ نے چھ حج پیدل کئے جس میں ایک حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مہاجر کے ساتھ اور ایک اہل و عیال کے ہمراہ تھا۔ پھر بعد میں حضرت شاہ صاحب کا خط آیا کہ تم یہاں چلے آؤ۔ اس خط کو مولانا نور الحسن صاحب نے چھپا لیا۔ جب آپ کو معلوم ہوا تو فوراً بیت اللہ کو روانہ ہو گئے۔

دادی صاحبہ فرماتی تھیں کہ تیرے دادا نے ایک مرتبہ ململ کا کرتہ سلوایا۔ اس میں گریبان میں تلمہ اور گھنڈی کے بجائے پٹھا اور سیپ کے بٹن لگوائے جس کو وہ جمعہ کے دن پہنتے تھے اور نماز پڑھتے ہی آکر اتار دیتے کہ کہیں والد صاحب کی نظر نہ پڑ جائے۔ ایک دفعہ میں اس کو رکھنا بھول گئی اور چارپائی پر پڑا رہا۔ والد صاحب تشریف لائے تو ان کی نظر پڑ گیا۔ بہت غور اور افسوس کیساتھ اس کو دیکھا اور فرمایا کہ بی اب اس گھر میں فیشن آگیا، ہمارا اب یہاں گزر نہیں ہو سکتا اور حج کا ارادہ فرمالیا۔ تب مولانا نور الحسن صاحب نے حضرت شاہ صاحب کا مکتوب گرامی بھی دکھلادیا۔ یہ روانگی روز شنبہ ۲۳ جمادی الثانیہ ۱۲۸۱ھ کو ہوئی۔ روانگی سے قبل اپنے خاندان کی سب مستورات کو جمع کیا اور فرمایا نئے نئے مولوی اور نئی نئی کتابیں ظاہر ہوں گی اور گمراہ کریں گی، تم کسی کو نہ سننا بلکہ ان چار کتابوں پر مضبوطی کیساتھ قائم رہنا اور مولویوں کی انہیں باتوں کو ماننا جو ان کے موافق ہوں اور انہیں کتابوں کو قبول کرنا جو ان کے موافق ہوں۔

وہ چار کتابیں یہ ہیں:-

(۱) تفسیر موضح القرآن تصنیف حضرت شاہ عبد القادر صاحب محدث دہلوی،

(۲) مظاہر حق ترجمہ مشکوٰۃ شریف، (۳) ترجمہ مشارق الانوار، (۴) ترجمہ ہدایہ۔

یہاں سے روانگی کے بعد ابھی آپ مکہ مکرمہ نہ پہنچے تھے کہ اسہال کا مرض لاحق ہو گیا۔ مکہ مکرمہ میں آپ نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے فرمایا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ مدینہ منورہ موت آئے، مگر بظاہر اب میری موت کا وقت قریب آ گیا۔ آپ مراقبہ کیجئے۔ انہوں نے مراقبہ کے بعد فرمایا کہ نہیں آپ مدینہ منورہ پہنچ جائیں گے۔ کچھ روز کے بعد آپ ابھی ہو گئے اور اگلے ہی روز مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے۔ مدینہ منورہ پہنچنے میں ایک منزل باقی تھی کہ آپ بھر بیمار ہو گئے اور ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء بروز جمعہ انتقال فرمایا اور نزدیک قبر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ مدفون ہوئے۔ باسٹھ سال کے قریب عمر ہوئی۔

کرتہ پاجامہ، لنگی، لوٹا مشکیزہ آپ نے چھوڑا۔ حسب وصیت لوٹا اور مشکیزہ بیت المال میں داخل کر دیا گیا۔ اور لنگی مریدین میں تقسیم کر دی گئی۔ اور کرتہ پاجامہ صاحبزادیوں کے پاس بھیج دیا جس میں پاجامہ معتقدین میں تقسیم کر دیا گیا اور کرتہ مبارک موجود ہے۔ (ادح ثلاثہ صفحہ ۲۰۱) حضرت مولانا مظفر حسین صاحب نے وہاں پہنچ کر جو خط صاحبزادیوں کے پاس بھیجا وہ میرے پاس موجود ہے تبرکاً اس کو نقل کئے دیتا ہوں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين

اما بعد اضعف العباد محمد مظفر حسین بہ برخوردار بہار احت دل بی بی امتہ السبحان و امتہ الرحمن و امتہ المنان بعافیت باشند بعد السلام علیکم و اشتیاق ملاقات کے معلوم کریں میں اس جگہ بخیریت پہنچاؤ بخیریت ہوں۔ اور حاجی امداد اللہ نے واسطے جانے میرے کے ہندوستان کو ہر چند حضرت پیر و مرشد صاحب کو کہا، لیکن اجازت نہ پائی اس واسطے میں لاچار ہوں اور تمہارا خیال اکثر ہوتا ہے اور تم کو چاہئے کہ تم خدا سے دعا کرو جو میرے حق میں دین اور دنیا میں بہتر ہو وہ ظہور میں لادے اور تم کو چاہئے کہ اللہ کی رضا مندی ہر کام میں لحاظ رکھو اور خدا کے حکم کے آگے اور اتباع سنت کے کسی کا خیال نہ کرو اور یہی بات آخرت میں کام آوے گی۔ باقی سب قصے جھگڑے سب یہاں کے یہیں رہیں گے۔ جو کام اللہ کے واسطے کیا وہی ساتھ جائے

گا۔ اور صبر اور تسلی سے رہنا کہ صبر آدھا ایمان ہے اور یہی مضمون والدہ امتہ المنان کو بھی معلوم ہوئے اور بخد مت سب صاحبوں کے سلام کہنا اور سب سے دعا کے واسطے کہنا کہ میرے واسطے دعا کریں اور بی بی حمیدن سے کہہ دینا کہ تمہارے کپڑے اور روپیہ موافق تمہارے کہے کے دی گئی، خاطر جمع رکھو۔ زیادہ والسلام

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کے یہاں بیعت و تلقین کا سلسلہ جاری تھا اور ہر جگہ بکثرت لوگ آپ سے مرید ہو کر کتاب و سنت کے شیدائی بن جاتے تھے۔ حافظ محمد یوسف صاحب (نانا شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب) اور ان کے بھائی حافظ محمد یونس صاحب فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کی یہ خاص کرامت اور برکت تھی کہ جو بھی ان سے مرید ہو گیا اس کی پھر تہجد کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔ اس ناچیز کو بھی حضرت مولانا کے جس مرید سے ملنے کا اتفاق ہوا اس کو تہجد اور نوافل مسنونہ اور اوراد مسنون کا پابند پایا جن کی صورتوں سے ایمانیت اور نورانیت عیاں نظر آتی تھی۔

مولانا عبید اللہ سندھی تحریر فرماتے ہیں:

اما الشیخ مظفر حسین الکاندھلوی فکان ورعاً تقیاً آمراً بالمعروف وناہیاً عن المنکر اخذ عن عمه المفتی الہی بخش وعن الصدر الحمید مولانا محمد اسحق واسترشد عن مولانا محمد یعقوب الدھلوی وکان نائبہ فی الہند، وهو الذی اجلس شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم الدیوبندی علی منبر الوعظ توفی ۱۰ محرم سنہ ۱۲۸۳ھ ودفن بالبقیع. (۱)

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب نے تین صاحبزادیاں یادگار چھوڑ دیں۔

(۱) بی بی امتہ السبحان، (۲) بی بی امتہ الرحمن، (۳) بی بی امتہ المنان بی بی امتہ السبحان اور بی بی امتہ المنان لا ولد فوت ہوئیں۔ بی بی امتہ الرحمن کی شادی مولانا ضیاء الحسن بن مولانا نور الحسن صاحب سے ہوئی جو اپنے والد بزرگوار کا صحیح نمونہ تھیں اور اپنے زمانہ کی رابعہ بصریہ تھیں۔

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ

فہرست

۲۴۳	ولادت اور نسب
۲۴۳	تعلیم
۲۴۴	مطبع احمدی دہلی
۲۴۵	درس و تدریس اور کتب حدیث پر حواشی
۲۴۷	تجارت اور سخاوت
۲۴۸	سہارنپور میں قیام
۲۴۹	دارالعلوم دیوبند کا سنگ بنیاد
۲۴۹	تلامذہ
۲۵۰	تواضع
۲۵۱	وفات
۲۵۱	وفات پر سرسید کا تاثر
۲۵۲	اولاد
۲۵۳	ماخذ و مراجع

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ

سید محبوب رضویؒ

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم اور نامور محدث تھے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور علامہ شبلیؒ جیسے مشاہیر اور یگانہ روزگار علماء ان کے حلقہ تلمذ میں داخل تھے۔

ولادت اور نسب

۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء سہارنپور (۱) کے انصاری خاندان میں پیدا ہوئے، ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ مولانا احمد علی بن شیخ لطف اللہ بن شیخ محمد جمیل بن شیخ محمد احمد بن شیخ بدر الدین بن شیخ صدر الدین بن شیخ الاسلام ابوسعید انصاریؒ

تعلیم

اوائل عمر میں تعلیم کا شوق نہ تھا، ۱۸ سال کی عمر میں تحصیل علم پر متوجہ ہوئے، اور میرٹھ میں قرآن شریف حفظ کیا، پھر سہارنپور میں مولانا سعادت علی سہارنپوری سے کچھ کتابیں پڑھیں، آخر میں دہلی پہنچ کر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ (وفات ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء) کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، صحیح بخاری کا اکثر حصہ شیخ وجیہ الدین صدیقیؒ سے سہارنپور میں پڑھا، شیخ وجیہ الدین، مولانا عبدالحیؒ کے واسطے سے شاہ عبد القادر دہلویؒ کے سلسلہ سند و اجازت میں شامل تھے، کتب حدیث کی تکمیل ۱۲۶۱ھ میں مکہ مکرمہ

(۱) ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں بعد غیاث الدین تغلق ایک بزرگ شاہ ہارون چشتیؒ کے قیام سے سہارن پور کی آبادی کا آغاز ہوا، چنانچہ ابتدا میں شاہ ہارون پور کے نام سے موسوم رہا، پھر رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے سہارن پور ہو گیا "شہر پرزیب" اس کا تاریخی نام ہے، سہارنپور اتر پردیش کا شمال مغربی ضلع اور نادران ریلوے کا جنکشن ہے (تاریخ دیوبند ص ۴۲)

سوانح علمائے دیوبند علیٰ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ ۲۴۲

میں حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کی خدمت بابرکت میں رہ کر کی، ان کے حدیث پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد سے ظہر تک حرم شریف میں بیٹھ کر احادیث کی نقل کرتے اور ظہر سے عصر تک نقل کی ہوئی احادیث حضرت شاہ صاحبؒ سے پڑھتے تھے، حدیث کی تمام کتابیں اسی طرح سے پڑھیں، ان کا خط نہایت پاکیزہ تھا، ابوداؤد کا ایک مکمل نسخہ جو محدث سہارنپوری کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی کے پاس موجود تھا، بذل انجہود کی تالیف کے دور ان یہی نسخہ مؤلف کے سامنے رہا ہے (۱)۔

صحیح بخاری کا جو نسخہ صحیح کے بعد محدث سہارنپوریؒ نے شائع کیا تھا، اس کے مقدمہ میں اپنی تعلیم کی نسبت لکھا ہے۔

”عبد ضعیف خادم حدیث نبوی احمد علی بحیثیت وطنیت سہارنپوری اور بحیثیت تلمذ اسحاقی ہے صحیح بخاری کا اکثر حصہ میں نے شیخ وجیہ الدین محسنی صدیقی سہارنپوری سے سہارنپور میں پڑھا، ان کو صحیح بخاری کی اجازت مولانا عبدالحیؒ سے اور انہیں مولانا عبد القادر سے اور انہیں اپنے بھائی شاہ عبدالعزیز سے اور انہیں اپنے والد شاہ ولی اللہؒ سے حاصل ہے، پھر میں نے دوبارہ شاہ محمد اسحاقؒ سے مکہ مکرمہ میں پڑھا ہے (۲)۔“

مطبع احمدی دہلی

مشہور روایت یہ ہے کہ محدث سہارنپوریؒ نے ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں حجاز سے واپس آ کر دہلی میں مطبع احمدی کے نام سے ایک پریس جاری کیا۔ اس زمانے میں پریس کا آغاز ہندوستان میں نیا نیا ہوا تھا، فرانسیسی مستشرق گارسان دتاسی کے بیان کے مطابق ممالک شمالی میں سب سے پہلا لیتھوگراف مطبع ۱۸۳۷ء مطابق ۱۲۵۳ھ میں دہلی میں قائم ہوا تھا۔ (۳) مطبع احمدی دہلی سے حدیث کی کتابوں کی اشاعت کا خوب کام ہوا، اور ہندوستان میں پہلی مرتبہ حدیث کی کتابیں طبع ہو کر عام ہوئیں اس سے پہلے یہ کتابیں ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوتی تھیں اور صرف خاص خاص لوگوں کے پاس پائی جاتی تھیں، ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۸ء میں

(۱) تاریخ مظاہر، مؤلف شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ ص ۴۰، ۴۱۔ و اجزاء المسالک جلد اول، ص ۴۵۔ مطبوعہ مکتبہ سہارنپوری۔

(۲) مقدمہ صحیح بخاری جلد اول مطبوعہ مطبع المطابع دہلی۔

(۳) ترجمہ خطبات گارسان دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ص ۱۷۸۔

سوانح علمائے دیوبند علی ۲۲۵ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری

سب سے پہلے جامع ترمذی چھپی، ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں صحیح بخاری اور پھر ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء میں مشکوٰۃ المصابیح طبع ہوئی، ہندوستان میں حدیث کی یہ پہلی کتابیں ہیں جو زیور طبع سے آراستہ ہوئیں، مطبع احمدی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس مطبع کی چھپی ہوئی کتابیں صحت کے لحاظ سے مثالی سمجھی جاتی ہیں بعد کے تمام ناشرین حدیث نے صحت کے لئے انہی کتابوں کو معیار قرار دیا ہے۔ (۱)

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مطبع احمدی کو سخت نقصان پہونچا تو محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے دہلی سے میرٹھ منتقل کر دیا، مطبع احمدی دہلی کی چھپی ہوئی صحیح بخاری اور مشکوٰۃ المصابیح کے نسخے دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں موجود ہیں ان کے حواشی کی نسبت راقم سطور کا خیال ہے کہ یہ خود حضرت محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں البتہ حدیث کا متن کاتب کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

درس و تدریس اور کتب حدیث پر حواشی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب اوجز المسالک کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:-
”علوم سے فراغت کے بعد پڑھانے میں مشغول ہو گئے، دہلی میں مطبع احمدی جاری کیا، اس میں حدیث کی کتابیں چھاپیں اور ان پر مفید حاشیے لکھے، خاص طور سے صحیح بخاری کا نہایت عمدہ حاشیہ لکھا ہے، بخاری کے آخری پانچ پاروں کے حواشی ان کی فرمائش پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھے ہیں، اس کے علاوہ انہوں نے کئی بے نظیر رسالے بھی لکھے ہیں، جن میں سے ایک رسالہ الدلیل القوی علی ترک قراۃ المقتدی ہے۔“
مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ لکھنؤی نے نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے:-

مکہ مکرمہ سے واپس آکر تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے، ذریعہ معاش تجارت تھا، حدیث میں پوری بصیرت رکھتے تھے، اپنی عمر صحاح ستہ بالخصوص صحیح بخاری کے پڑھانے میں صرف

(۱) راقم سطور کے فاضل دوست پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے، کہ مطبع احمدی دہلی ۱۲۶۲ء میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے حجاز سے واپس آکر قائم کیا تھا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں یہ مطبع ختم ہو گیا (مولانا محمد حسن نانوتوی ص ۲۱۰، ۲۱۲) مگر حقیقت یہ ہے کہ مطبع احمدی سب سے پہلے نواح کلکتہ میں سید عبداللہ ابن میر بہادر علی حسینی نے قائم کیا جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے شعبہ تصنیف و ترجمے سے وابستہ تھے، اولاً اس مطبع میں نستعلیق نائپ میں طباعت ہوتی تھی، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں تقویۃ الایمان مصنفہ مولانا محمد اسماعیل شہید کا وہ نسخہ موجود ہے جو ۱۸۳۲ء تا ۱۸۲۹ء میں کلکتہ میں نستعلیق رسم الخط کے نائپ میں چھپا ہے، اس کے بعد شاہ عبدالقادر کاترجمہ قرآن ۱۲۴۵ھ تا ۱۸۲۹ء میں اسی مطبع میں بمقام دہلی طبع ہوا ہے۔

سوانح علمائے دیوبند علیٰ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری ۲۴۶

کردی، دس سال صحیح بخاری کی تصحیح میں لگے بخاری پر مفصل حاشیہ لکھا۔ (۱)
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ :-

”کتب حدیث میں بین السطور حاشیے کے بعد جہاں جہاں ۱۲۔ مولانا کا لفظ آتا ہے اس کے لکھنے والے یہی مولانا احمد علی صاحب ہیں اور ”مولانا“ کے مصداق حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب ہیں۔ (۲)

کتب حدیث پر محدث سہارنپوری کے حواشی یکساں طور پر تمام علماء میں مقبول ہیں، انہوں نے اپنے حواشی میں مطالب حدیث کی توضیح کے علاوہ اسماء الرجال کے تلفظ یعنی صحت اعراب، روایات حدیث کی کنیتوں اور نسب وغیرہ امور پر بھی کلام کیا ہے، صحیح بخاری کی تصحیح اور اس پر حاشیہ لکھنے میں انہوں نے جو محنت شاقہ اور جگر کاوی کی ہے اس کی نسبت اپنے حاشیے کے خاتمے پر لکھا ہے :-

”اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار اور حدیث نبوی کا خادم احمد علی کہتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی مدد سے سید المحدثین شیخ الاسلام امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ کی کتاب کی طباعت کا کام اتمام کو پہونچا، جس کیلئے میں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا، دنوں کو بے آرام رہا، اور راتوں کو جاگ کر کاٹا، بخاری کے معنی کی تصحیح و توضیح، مطالب کی تنقیح، اسماء الرجال کی حرکات اور ان کے نسب اور کنیتوں اور القاب و حالات کے پیش نظر دن رات ایک کر دیئے۔“

صحیح بخاری کی طباعت کا سن مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۲۶۷ھ لکھا ہے، چنانچہ حیات شبلی میں لکھتے ہیں :-

”مولانا سہارنپوری رحمہ اللہ کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح کر کے چھاپ کر عام کیا، چنانچہ ۱۲۶۵ھ میں جامع ترمذی اور ۱۲۶۷ھ میں صحیح بخاری شائع کی۔ (۳)

مگر راقم سطور کے نزدیک صحیح بخاری کا سن طباعت ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء ہے چنانچہ بخاری کا جو نسخہ ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء میں دہلی کے مطبع مجتہبائی میں نہایت صحت و اہتمام کے ساتھ چھپا گیا ہے اس کے آخر میں مطبع مجتہبائی کی جانب سے یہ لکھا ہوا ہے :-

سوانح علمائے دیوبند علی ۲۴۷ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری

”در تصحیح اصل کتاب و تحریر حواشی نایاب کار ہا نمودند کہ رقبہ احسانش برقبہ علماء تا قیامت خوار ماند و در ۱۲۷۰ھ طبع کنانید اشاعت عام فرمودند بعد ازاں صاحب زادگان ایشاں کہ از علوم نقلیہ و عقلیہ و اخلاق محمدیہ بہرہ وافی دارند در ۱۲۸۴ھ باز ۱۳۰۸ ہجری حلیہ طبع پوشانیدند (۱) محولہ عبارت صحیح بخاری مطبوعہ مجتہبائی دہلی ۱۳۲۲ھ کے سرورق کے صفحہ ۴ پر درج ہے۔

محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری کا یہ حاشیہ مفتی صدر الدین آزرہ کو بھی دکھلایا ہے، چنانچہ مفتی صاحب نے اس پر ایک گراں قدر تقریظ تحریر فرمائی ہے جو صحیح بخاری کے آخر میں درج ہے۔

تجارت اور سخاوت

محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کا ذریعہ معاش کتابوں کی تجارت تھی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، انہوں نے کتابوں کے چھاپنے کیلئے خود مطبع قائم کیا تھا، اس سے بڑی آمدنی تھی، اور خوب فراغت اور مرفہ حالی کیساتھ زندگی گزارتے تھے، روزانہ نئی پوشاک زیب تن کرتے اور اتارے ہوئے کپڑے غریبوں کو تقسیم کر دیئے جاتے تھے، معمول یہ تھا کہ رمضان شروع ہونے سے پہلے سال بھر کے دنوں کی تعداد کے مطابق کرتے پا جامے اور ٹوپیاں سلوا لی جاتی تھیں، علی الصباح جو سائل سب سے پہلے مکان پر پہنچ جاتا اسے تینوں کپڑے دیدئے جاتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں جب مطبع احمدی تباہ ہو گیا تو کچھ دنوں تک سہارنپور میں آپ کا قیام رہا، پھر میرٹھ میں مطبع احمدی از سر نو قائم کیا، بعد ازاں کلکتہ چلے گئے، علامہ شبلی کا بیان ہے کہ:

”اللہ تعالیٰ نے دنیوی دولت سے متمتع فرمایا تھا، کتب حدیث کی طباعت و اشاعت فرمائی اس کام میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی، ۱۸۵۷ء میں سب کچھ لٹ گیا، دو برس تک اپنے مکان پر

(۱) مفتی صدر الدین آزرہ ۱۲۰۴ھ / ۱۸۹۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے علوم کی تکمیل کی، دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے صدر الصدور اور مفتی کے منصب پر فائز تھے اور بطور خود مکان پر طلباء کو بھی پڑھاتے تھے، بعد ازاں دہلی کے قدیم مدرسہ دارالبقاء کو از سر نو جاری کیا، طلباء کے جملہ مصارف کی کفالت خود کرتے تھے، عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ان کے پاس ایک بیش قیمت کتب خانہ بھی تھا جس کی مالیت کا اندازہ تین لاکھ روپے کیا گیا ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتویٰ پر دستخط کرنے کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے، جائیداد اور کتب خانہ ضبط ہو گیا، بڑی مشکل سے کئی مہینے کے بعد رہائی ہوئی، کچھ جائیداد بھی واگزار ہو گئی تھی، مگر کتب خانہ ہاتھ نہ آسکا، تقریظ کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کو عربی زبان و ادب میں اچھی دست گاہ حاصل تھی، ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء بروز پنجشنبہ دہلی میں انتقال ہوا،

بیٹھ کر درس دیتے رہے، پھر شیخ الہی بخش رئیس میرٹھ کی طرف سے کلکتہ جا کر کاروبار جاری کیا، جس سے آپ کو پانچ سو روپے ماہوار کی آمدنی تھی، اس زمانے میں صبح سے ۹ بجے تک مسجد حافظ جمال الدین میں درس دیتے تھے، تقریباً دس سال کلکتہ میں قیام رہا، یہ وہی مسجد ہے جس میں بعد میں مولانا حفظ الرحمن نے بھی کچھ عرصہ درس قرآن دیا ہے۔

قیام کلکتہ کے زمانے میں وطن میں آمد و رفت رہتی تھی، تاریخ مظاہر میں لکھا ہے کہ جب کلکتہ سے تشریف لاتے تو مدرسہ مظاہر علوم کی ہر نوع کی ہمت افزائی اور دست گیری فرماتے (۱) مظاہر علوم کے دو طلباء کا کھانا آپ کے یہاں سے مقرر تھا، سالانہ جلسوں میں طلباء کو انعام میں بخاری کے نسخے تقسیم فرمایا کرتے تھے، اور اس میں بڑی حوصلہ مندی سے کام لیتے تھے، چنانچہ مظاہر علوم کی ابتدائی عمارت اور مسجد کیلئے دس ہزار روپے کی خطیر رقم زیادہ تر انہی کی کوشش کا نتیجہ تھی۔ (۲)

دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی چند ہندوگان میں بھی ان کا اسم گرامی نظر آتا ہے۔ (۳)

سہارنپور میں قیام :-

۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء میں محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کلکتہ سے وطن چلے آئے اور مستقل طور پر سہارنپور میں مقیم ہو گئے، تاریخ مظاہر میں ۱۲۹۱ھ کے حالات میں لکھا ہے کہ اس سال اراکین مدرسہ میں ایک قابل قدر اضافہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری نے اس سال کلکتہ سے قطع تعلق کر کے سہارنپور میں مستقل قیام فرمایا، اور مدرسہ کی غیر موقت امداد فرمائی، مدرسہ کیساتھ حضرت ممدوح کی اعانت اور توجہات قیام کلکتہ ہی کے زمانے سے شروع ہو چکی تھیں، جب بھی تشریف لاتے مدرسہ کی ہر نوع کی تربیت فرماتے، حضرت مولانا سعادت علی صاحب کے وصال کے بعد سے اب تک مدرسہ کی نیابت کسی کے سپرد نہیں ہوئی تھی، حضرت ممدوح کی تشریف آوری پر مولانا مرحوم کی جگہ حضرت کا اسم گرامی لکھا جانے لگا۔ (۴)

آگے چل کر لکھا ہے کہ: حضرت مولانا مولوی حافظ احمد علی صاحب محدث سہارنپوری نے جن کے تقدس اور کمال کے آوازے سے ہندوستان گونج رہا ہے مدرسہ کی سرپرستی کا بار

(۲) تاریخ مظاہر، ص ۷۷ و ص ۸۱

(۱) تاریخ مظاہر، ص ۷۷ و ص ۸۱

(۳) روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۴ھ ص ۳۳ (۴) تاریخ مظاہر ص ۷۷

سوانح علمائے دیوبند علیٰ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ ۲۴۹
اپنے دوش پر اٹھایا اور ایک خاص بڑی جماعت کو مدرسہ کی مسجد میں بیٹھ کر بلا معاوضہ صحاح ستہ کا درس دیا۔

دارالعلوم دیوبند کا سنگ بنیاد

۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں جب دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی عمارت تعمیر ہوئی جو ”نودرے“ کے نام سے موسوم ہے تو اس کا سنگ بنیاد حضرت محدث سہارنپوریؒ کے دست مبارک سے رکھوایا گیا، روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں لکھا ہے کہ: اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا مولوی احمد علی صاحب نے اپنے دست مبارک سے رکھا، اور بعد میں جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحب اور مولانا محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی۔ (۱)

تلامذہ

محدث سہارنپوریؒ اپنے زمانے کے نامور عالم اور ممتاز محدث تھے، اس عہد میں ان کو بڑی مرکزیت و مرجعیت حاصل تھی، اکثر علماء تکمیل علوم کے بعد اجازت حدیث کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اس عہد کا مشکل سے کوئی ممتاز عالم ہو گا جس نے محدث سہارنپوریؒ سے سند و اجازت حاصل نہ کی ہو، ان کی ساری عمر خدمت حدیث میں گزری جس میں دس سال صرف صحیح بخاری کی تصحیح و تحشیہ میں صرف ہوئے (۲) ان کے تلامذہ کا بڑا وسیع حلقہ تھا، جس میں، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا اسم گرامی سرفہرست ہے، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مؤسس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور علامہ شبلی مرحوم بھی ان کے تلامذہ میں شامل ہیں، ان کے آخری دور کے ایک شاگرد مولانا محمد صدیق دیوبندیؒ (وفات ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء) تھے، (راقم سطور کو مولانا موصوف سے تلمذ کا شرف حاصل ہے)

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں محدث سہارنپوریؒ نے جن کتابوں کا درس دیا ان کی

(۱) تاریخ مظاہر، ص ۳۰۲ و ۳۰۳، روداد دارالعلوم ۱۲۹۲ھ دیوبند ص ۱۰۔ یہ دارالعلوم دیوبند کی سالانہ روداد کا بیان ہے مگر ارواح ثلاثہ کی روایت میں ہے کہ سنگ بنیاد حضرت میاں جی منے شاہ صاحبؒ نے رکھا تھا، ظاہر ہے کہ روداد زیادہ صحیح اور لائق استناد ہے۔ (۲) سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ ص ۲۶

تفہیمیل یہ ہے:-

صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، شمائل ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح، مؤطا امام محمد، جامع صغیر، جلالین، ترجمہ قرآن مجید، احیاء العلوم، درمختار، سراجی، قدوری اور شرح جامی۔

محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ مظاہر علوم کے طلباء کو اپنے مکان کے علاوہ مدرسہ میں بھی پڑھاتے تھے، تاریخ مظاہر میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب اب تک اپنے دولت کدہ پر تدریس فرماتے تھے، اس سال سے مدرسہ میں قیام فرما کر تعلیمی و تدریسی سلسلہ شروع فرمادیا، حضرت کی شہرت نواح ہند میں جیسی ہونی چاہئے تھی وہ ظاہر ہے، اس لئے طلباء حدیث میں بہت اضافہ ہوا اور پچیس طلباء حدیث کی تکمیل کر کے اطراف ہند میں مصابیح ہدایت بنے۔ (۱)

۱۲۹۵ھ میں طلبائے حدیث کی تعداد ۳۸ تک پہنچ گئی تھی، روداد میں لکھا ہے کہ ان سب حضرات نے حضرت مولانا احمد علی صاحب سے صحاح ستہ پڑھ کر سند حاصل کی (۲) ان کے درس حدیث کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں صرف پانچ طلباء دورہ حدیث میں شریک تھے، ۱۲۹۱ھ سے ۱۲۹۷ء تک آپ کا درس حدیث مظاہر علوم میں جاری رہا۔ (۳)

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں برکت بخشی تھی، سیکڑوں علماء اس فیض سے سرفراز ہوئے، اس زمانے میں علمائے حدیث میں موصوف سے بڑھ کر علم حدیث کا کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا، اس زمانے کے اکثر بڑے بڑے علماء احناف محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ دولت کی برکت بھی عطا فرمائی تھی۔ (۴)

تواضع

علامہ شبلی مرحوم کا بیان ہے کہ محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ بے حد منکسر المزاج، متواضع اور نیک تھے، کبھی مسجد میں امامت نہیں کی، چپکے سے مسجد میں جاتے اور نماز میں مشغول ہو کر واپس آجاتے، بازار سے سودا خرید کر خود لاتے تھے مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ بازار میں

سوانح علمائے دیوبند علی ۲۵۱ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری
مولانا کو میں نے دیکھا تو پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیا کہ سودا لے لوں، مگر مولانا کسی طرح اس پر
راضی نہ ہوئے، اور خود اپنے ہاتھ سے لے کر گھر آئے۔ (۱)

محدث سہارنپوری رحمہ اللہ کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ اپنے شاگردوں کا بھی ایسا احترام کرتے
جیسے شاگرد اپنے استاذ کا کرتے تھے، مولانا سید محمد علی مونگیری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ: درس سے
فارغ ہو کر اپنے مکان میں لیٹ جاتے تھے، میں حاضر ہوتا تو اٹھ کر بیٹھ جاتے، ایک دن
میں نے عرض کیا کہ: میں آپ کا ادنیٰ شاگرد ہوں، سیکڑوں علماء آپ کے شاگرد ہیں، عمر
میں بھی آپ میرے والد سے زائد ہیں، اس عمر میں آپ سارے دن پڑھا کر لیٹ جاتے ہیں،
اور پھر میری حاضری میں اٹھ بیٹھتے ہیں اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ (۲)

وفات

محدث سہارنپوری رحمہ اللہ پر آخر عمر میں فالج کا حملہ ہوا، اسی میں ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ م
۱۷ اپریل ۱۸۸۰ء بروز شنبہ داعی اجل کو لبیک کہا، ۷۲ سال کی عمر پائی، سہارنپور میں عید گاہ
کے قریب اپنے آبائی قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں۔

وفات پر سرسید کا تاثر

آپ کی وفات پر سرسید مرحوم نے اپنے دلی تاثرات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے۔
”مولوی محمد قاسم صاحب کے واقعے کی خبر ہم لکھ ہی چکے ہیں کہ دفعۃً ہم کو دوسری ویسی
ہی حسرت تک خبر جناب مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رحمہ اللہ کے واقعہ جاں کاہ کی
پہنچی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

”مولوی محمد قاسم صاحب کے واقعے کے متصل اس واقعہ کا ہونا اور بھی زیادہ حسرت و
افسوس کا باعث ہے، ایک ہی وقت میں دو ایسے بزرگان دین کا اٹھ جانا درحقیقت نہایت اندوہ
ناک واقعات ہیں، مولوی احمد علی صاحب اگرچہ اب بہت ضعیف ہو گئے تھے لیکن بایں ہمہ
بہت غنیمت تھے، انہوں نے حدیث کو اس طریق پر حاصل نہیں کیا تھا، جس طرح سے اور
اکثر علماء کا دستور ہے کہ سند کے سلسلے کو درست کرنے کی نیت سے کسی کتاب کے چند ورق یا

چند جز کسی صاحب سند عالم سے پڑھ لئے اور بے فکر ہو گئے۔

جناب مولوی احمد علی صاحب نے تمام کتب صحاح اور بعض دیگر کتب حدیث کو من اولہ والی آخرہ جناب مولوی محمد اسحق صاحب سے سبقاً سبقاً پڑھا تھا، اور جب کہ مولوی محمد اسحق صاحب نے دہلی سے ہجرت فرمائی تو مولوی احمد علی صاحب مکہ معظمہ کو تشریف لے گئے اور خاص حرم بیت اللہ میں حدیث کی کتابوں کو مولوی محمد اسحاق صاحب سے تمام کیا اور اس کے بعد ہندوستان واپس آئے، اور یہاں پہنچ کر انہوں نے حدیث کی کتابوں کو نہایت عمدگی اور صحت سے چھلپا اور ان کو مشتہر کیا، خصوصاً بخاری کو جس خوبی اور عمدگی سے انہوں نے چھلپا وہ ان کی ایک بے نظیر کوشش تھی۔

آخری عمر میں جناب مدوح نے اپنے آپ کو مدرسہ اسلامیہ سہارنپور کی خدمات کے لئے جو کچھ ان سے اس وقت ممکن تھا وقف کر دیا تھا، اور اسی شغل میں ان کا حسن خاتمہ ہوا، خدا غریق رحمت کرے، یہی راہ سب کو چلنی ہے، جو اس وقت زندہ ہیں ان کی نسبت بھی کسی وقت سنا جاوے گا کہ نہیں ہیں، کل من علیہا فان۔ (۱)

اولاد

محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے چھ صاحبزادے تھے، اور ایک صاحبزادی، مولانا حبیب الرحمن مولانا حکیم عبدالرحمن، مولانا حکیم عبدالغنی یہ تینوں حضرات حیدرآباد چلے گئے تھے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب ۱۳۰۷ھ سے ۱۳۱۳ھ تک مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں صدر مدرس رہے، ۱۳۱۴ھ میں ریاست حیدرآباد دکن میں مفتی اعظم کے منصب جلیل پر فائز ہوئے، درس و تدریس کے علاوہ ان کے علمی کاموں میں مسند امام اعظم کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۳۰۸ھ میں چھپا ہے، ترجمے کی زبان رواں دواں، سلیس اور شگفتہ ہے، مولانا حکیم عبدالغنی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے سفر نامہ میں مولانا حبیب الرحمن صاحب سے سہارنپور میں اپنی ایک ملاقات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ: میں نے پوچھا آج کل آپ کیا پڑھاتے ہیں؟ فرمایا چار برس سے اہل شہر کے اصرار سے میں نے مظاہر علوم سے تعلق پیدا کر لیا ہے آج کل صحاح ستہ و توضیح و تلویح و ہدایہ و بیضاوی وغیرہ پڑھاتا ہوں۔“

حکیم صاحب پھر آگے چل کر لکھتے ہیں، مولوی صاحب شکل و صورت کے بہت وجیہ، قد و قامت میں درست، مہذب، متین، خوش پوشاک اور شوقین ہیں، پانچ چھ روپے کا پنجابی جوتہ پہنے ہوئے، گھڑی ہاتھ میں باندھے ہوئے، پان رکھنے کی تین تین ڈبیاں جیب میں ایک جرمن سلور کی جس میں پان، دوسری ربر کی جس میں چھالیاں ہیں، تیسری بلور کی جس میں بنارس کی بسی ہوئی تمباکو کی گولیاں رکھی ہیں، (۱)

مولانا حبیب الرحمن صاحب اپنے دور میں علم و فضل اور ذہانت و ذکاوت میں بے نظیر تھے، انکی زندگی کے عجیب و غریب اور حیرت انگیز واقعات مشہور ہیں، ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، مولانا حکیم عبد الرحمن صاحب درس و تدریس کے ساتھ مطب بھی کرتے تھے، نظام دکن کے شاہی طبیب تھے ”دواخانہ رحمانی“ حیدر آباد میں ان کی یادگار ہے، ان کے ذریعے سے دکن میں علم حدیث کا فیض خاص طور سے پہنچا، ان کے ایک شاگرد مولانا عبداللہ صاحب تھے جو محدث دکن کے لقب سے مشہور تھے، جن کی تالیف زجاجة المصالح (۲) حدیث کی ایک اہم کتاب ہے، مولانا حکیم عبد الرحمن صاحب کے خلف الرشید مولانا عبدالقیوم اور مولانا عبدالحی تھے، مؤخر الذکر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں عربی زبان کے پروفیسر تھے۔ انہیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔

مولانا عبدالغنی صاحب حیدر آباد میں وکالت کرتے تھے، ان کے ایک فرزند محمود الغنی تھے، انہیں بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلافت سے سرفراز فرمایا تھا، یہ مجذوب صفت اور صاحب حال بزرگوں میں سے تھے، مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے غیر معمولی تعلق بلکہ عشق تھا، ان کو دیکھ کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مریدین میں اپنے مرشد کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ (۳)

ان حضرات کی اولاد حیدر آباد سے پولس ایکشن کے بعد پاکستان منتقل ہو گئی ہے، ایک صاحبزادہ مظہر الحق تھے جو اولد فوت ہوئے۔

چھٹے فرزند عطاء الرحمن تھے ان کا نو جوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔

محدث سہارنپوری کی ایک صاحبزادی نہیں تھیں، یہ دیوبند میں مولانا فصیح الدین عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

(۱) دہلی اور اس کے اطراف، سفرنامہ مولانا حکیم عبدالحی لکھنؤئی ص ۱۲۶

(۲) زجاجة المصالح، مشکوٰۃ المصابیح کے طرز پر حنفیہ کے لئے احادیث نبوی کا ایک جامع اور مستند ذخیرہ ہے، جو چار جلدوں پر مشتمل ہے، یہ کتاب حیدر آباد دکن کے تاج پریس میں چھپی ہے، اس کی پہلی جلد ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی ہے،

(۳) مابنامہ ”البلاغ“ کراچی بابت ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء

سے بیاہی تھیں، یہ راقم سطور کی والدہ کی نانی ہوتی تھیں۔

مولانا خلیل الرحمن صاحب بڑے پیمانے پر عمارتی لکڑی کا کاروبار کرتے تھے، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی مجلس منتظمہ کے ممبر تھے، اس کے علاوہ مدت تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم رہے، ذی علم اور باوقار علماء میں تھے، ان کے فرزندوں میں مولانا منظور النبی مرحوم تحریک آزادی ہند کے قائدین میں سے تھے، دوسرے فرزند مولانا عقیل الرحمن صاحب ندوی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دینیات کے استاذ تھے، انکے بچے بھی پاکستان چلے گئے ہیں۔ مولانا منظور النبی مرحوم کے ایک صاحبزادے ظہیر النبی ایم اے، ایل ایل بی ہیں، جو حکومت یو، پی کے محکمہ خوراک میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں، راقم سطور کا یہ ننھیالی خاندان ہے۔

ماخذ و مراجع

- (۱) اوجز المسالک : شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، مطبوعہ سہارنپور
- (۲) ارواح ثلاثہ : مجموعہ حکایات امیر شاہ خاں، مطبوعہ آزاد پریس دیوبند
- (۳) تاریخ مظاہر : شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، ناشر کتب خانہ اشاعت العلوم سہارن پور
- (۴) تاریخ دیوبند : سید محبوب رضوی، ناشر علمی مرکز دیوبند۔
- (۵) ترجمہ مسند امام اعظم : مترجمہ حبیب الرحمن سہارنپوری، مطبوعہ ۱۳۰۸ھ
- (۶) تقویۃ الایمان : مولانا محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۳۴۲ھ / ۱۸۲۶ء
- (۷) حاشیہ و مقدمہ بخاری شریف : مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مطبوعہ مطبع مجتہبائی دہلی ۱۳۲۲ھ

۲۵۵ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری

سوانح علمائے دیوبند علی

(۸) حیات شبلی

مولانا سید سلیمان ندوی،
مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ
مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۵ء

(۹) خطبات گارسان و تاسی

(۱۰) الدلیل القوی

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمہ اللہ

علی ترک قراءۃ المقتدی

سفرنامہ مولانا حکیم عبدالحی لکھنوی
مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۵۸ء

(۱۱) دہلی اور اس کے اطراف

(۱۲) روداد دارالعلوم دیوبند

شائع کردہ دارالعلوم دیوبند۔

۱۲۸۳ھ / ۱۲۹۲ھ / ۱۲۹۵ھ

مولانا سید عبداللہ،

(۱۳) زجاجة المصانح

مطبوعہ تاج پریس حیدرآباد ۱۳۷۱ھ
سید محمد حسنی،

(۱۴) سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری

مطبوعہ لکھنؤ شاہی پریس ۱۹۶۳ء

مطبوعہ ۱۸۸۰ء

(۱۵) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ،

(۱۶) موضح قرآن

مطبوعہ مطبع احمدی دہلی ۱۳۰۷ھ

محمد ایوب قادری ایم۔ اے، مطبوعہ کراچی۔

(۱۷) مولانا محمد احسن نانوتوی

محمد تقی عثمانی ۱۳۸۷ھ۔

(۱۸) ماہنامہ البلاغ کراچی

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری؛ خطوط کا یہ

(۱۹) مجموعہ مکاتیب غیر مطبوعہ

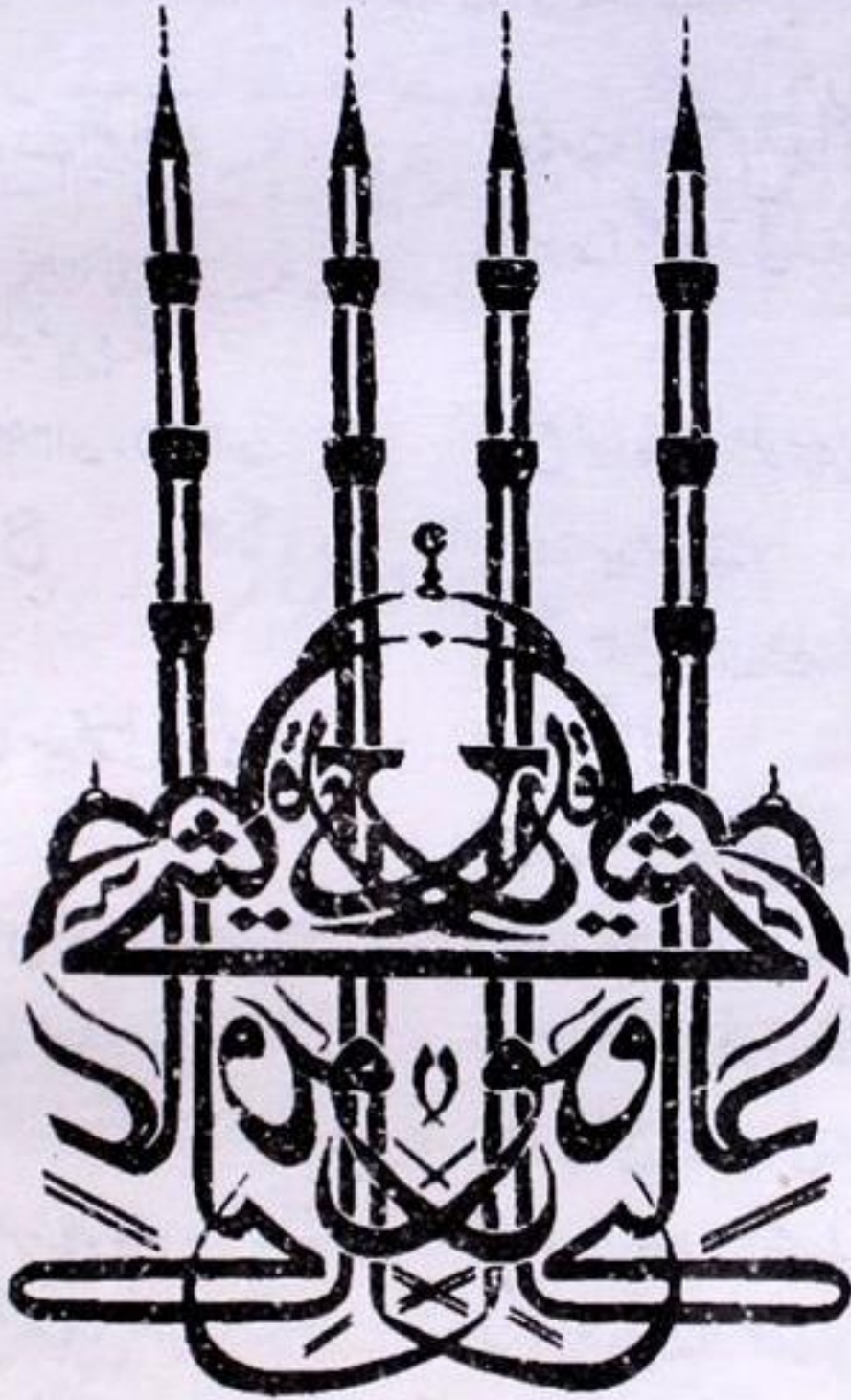
مجموعہ راقم سطور کی ماموں زاد بہن طیبہ سہیل

ایم اے مترجم حیات رفیع احمد قدوائی کے

پاس موجود ہے۔

(۲۰) مذکورہ ماخذ و مصادر کے علاوہ خاندانی یادداشتوں اور خاندان کے بزرگوں سے سنی،

ہوئی باتوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔



سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند

حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ

سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند

حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی

فہرست

۲۶۰	وطن اور خاندان
۲۶۱	پیدائش
۲۶۱	تر بیت اور والدین کے سائے سے محرومی
۲۶۱	ابتدائی تعلیم
۲۶۲	دہلی کی حالت اور شاہ ولی اللہ کا اثر
۲۶۳	تحصیل علم کی غرض سے دہلی کا سفر
۲۶۴	بالاکوٹ کا واقعہ اور حضرت شاہ محمد اسحاق کا ہجرت فرمانا
۲۶۴	دہلی سے واپسی کے بعد علمی سرگرمیاں
۲۶۵	شریعت کا احترام اور طریقت کا معیار
۲۶۶	حضرت میاں جیو نور محمد بھنجنہانوی سے بیعت
۲۶۸	بیعت کے بعد اپنے پیر بھائیوں سے تعلقات
۲۶۹	حضرت میاں جیو کی نگاہ میں حضرت مولانا شیخ محمد کا مرتبہ
۲۷۱	حضرت میاں جیو کا فیض روحانی اور وصال
۲۷۲	سفر حرمین الشریفین اور شاہ محمد یعقوب سے اخذ فیض
۲۷۳	حج سے واپسی کے بعد
۲۷۴	حضرت مولانا رشید احمد سے مناظرہ
۲۷۷	جنگ آزادی کے شروع میں تھانہ بھون کی حالت
۲۷۸	تھانہ بھون میں جہاد کے اسباب، واقعات اور نتائج
۲۸۸	روپوشی کا زمانہ
۲۸۸	ٹونک میں قیام
۲۹۰	ٹونک سے واپسی

۲۹۱	آخری پیام، مرض الوفات اور وصال
۲۹۵	انتقال کے وقت ایک عجیب واقعہ
۲۹۶	آپ کے مزار کی حالت
۲۹۶	علم و فضل اور شمائل و خصائل
۳۰۰	رباعی
۳۰۰	ازواج و اولاد
۳۰۲	تلامذہ
۳۰۳	مریدین اور خلفاء
۳۰۴	تصنیفات
۳۰۷	خطاب بجناب عشق مآب و خواستگاری وصل باری
۳۰۸	در احوال سراپا اجلال حضرت رابعہ بصری
۳۰۸	فی شرح الحدیث

حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ

ثناء الحق ایم۔ اے (علیگ)

وطن اور خاندان

تھانہ بھون، ضلع مظفرنگر (۱) (یوپی) کا ایک چھوٹا سا مگر مردم خیز قصبہ ہے۔ اسی قصبہ نے قاضی محمد علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، صاحب کشف اصطلاحات، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا فتح محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو جنم دیا اور یہیں حضرت مولانا شیخ محمد محدث رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے جو جامع شریعت و طریقت تھے۔

حضرت مولانا تھانہ بھون کے ایک ذی وجاہت فاروقی خاندان کے چشم و چراغ تھے آپ کے والد ماجد مولانا احمد اللہ (۲) رئیس شہر قاضی نجابت علی کے دوہرے داماد اور قاضی عنایت علی کے پھوپھا تھے۔ باپ کی طرف سے حضرت مولانا کا شجرہ نسب ۳۴ واسطوں (۳) سے سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے آپ کی والدہ مسماۃ بی صاحب بنت قاضی نجابت علی تھیں۔

(۱) حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں تھانہ بھون ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔

(۲) نزہت الخواطر جلد ۷ صفحہ ۴۱۲ پر مولانا کے والد کا نام احمد اللہ تحریر ہے جو یقیناً غلط ہے۔

(۳) پورا شجرہ نسب یہ ہے: (۱) مولانا شیخ محمد بن (۲) مولوی احمد اللہ بن (۳) حکیم محمد بخش بن (۴) قاضی حکیم محمد رحم بن (۵) حافظ محمد اعظم بن (۶) مکرم خان بن (۷) شیخ احمد عرف نواب فاروقی بن (۸) مولوی محمد صابر بن (۹) شیخ علی کلاں بن (۱۰) شیخ عبد اللہ بن (۱۱) شیخ سراق الدین بن (۱۲) قاضی چند بن (۱۳) محمد موسیٰ بن (۱۴) قاضی نصر اللہ خان بن (۱۵) قاضی محمد یعقوب خان بن (۱۶) شیخ نظام الدین رشتی بن (۱۷) شیخ شہاب الدین بن (۱۸) معروف کرخی بن (۱۹) فرخ شاہ کابلی بن (۲۰) محمد شاہ کابلی بن (۲۱) نصیر الدین شاہ بن (۲۲) محمود شاہ بن (۲۳) مسعود شاہ بن (۲۴) شاہ عبد اللہ بن (۲۵) شاہ واعظ الاصفہر بن (۲۶) شاہ واعظ الاکبر بن (۲۷) شاہ ابوالفتح بن (۲۸) شاہ محمد اسحاق بن (۲۹) حضرت تاج الاولیا سلطان ابراہیم بن (۳۰) ابوہم قلندر بن (۳۱) سلیمان بن (۳۲) ناصر الدین بن (۳۳) حضرت عبد اللہ بن امیر المؤمنین بن (۳۴) حضرت عمر فاروق خلیفہ دوم

پیدائش، تربیت اور والدین کے سایہ سے محرومی

حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۲۰ جمادی الاول ۱۲۳۰ھ مطابق ۲ مئی کو پیر کے دن ہوئی۔

آپ کے والد مولوی حمد اللہ جن کے آپ تنہا صاحبزادہ تھے تحصیلداری کے عہدہ پر فائز تھے۔ جدی املاک اور جائیداد بھی کافی تھی اس لئے آپ کو آنکھ کھولتے ہی ہر طرح کی آسائش نصیب ہوئی، لیکن ان آسائشوں اور ناز و نعم کے باوجود آپ کی تربیت کی جانب سے کبھی غفلت نہیں برتی گئی۔ بزرگوں کی توجہ اور اپنی پاک طینت کے سبب آپ شروع ہی سے نیکو کاری اور دینداری کی راہ پر گامزن رہے۔

بعض اور اکابر کی طرح آپ کو بھی نہایت کمسنی میں داغ قیمی برداشت کرنا پڑا۔ پانچ برس کی عمر میں آغوش مادری چھٹا۔ دس سال کا سن نہیں ہوا تھا کہ سایہ پداری سے محرومی نصیب ہوئی۔ آپ کے لئے یہ دونوں صدمے نہایت جانکاوہاں گسل تھے۔ سرپر والدین کا سایہ نہ رہنے سے آپ کی تعلیم و تربیت اور ترقی کے ذرائع بہ ظاہر منقطع ہو چکے تھے لیکن قدرت کا غیر محسوس ہاتھ جو کسی سبب اور ذریعہ کا محتاج نہیں اب بھی کشاں کشاں آپ کو بلند مقصد حیات کی طرف لے جا رہا تھا اور آپ کی فطرت سلیم جادہ علم و معرفت میں برابر آپ کے لئے شمع راہ ثابت ہو رہی تھی۔

ابتدائی تعلیم

آپ کی تعلیم کا آغاز والدین کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔ آپ کے پدر بزرگوار مولوی حمد اللہ خود عالم اور علم دوست انسان تھے۔ انھوں نے اپنے نور عین کی تعلیم کا نہایت محقوال انتظام کیا۔ قدیم دستور کے مطابق چار پانچ سال کی عمر میں آپ کی تعلیم شروع ہوئی۔ حافظہ تیز اور ذہن رسا تھا استادوں کی توجہ اور شفقت نے مل کر ان پر اور جلا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑے عرصہ میں آپ کے جوہر ذاتی کھلنے لگے اور نہایت کمسنی میں آپ نے قرآن مجید مع تجوید حفظ کر لیا۔ پھر فارسی پڑھی، بعدہ مولانا عبدالرحیم تھانوی اور مولانا قلندر بخش جلال آبادی سے عربی صرف و نحو کی تحصیل تکمیل کی۔ غرض دس گیارہ سال کے سن میں سب مرحلے طے ہو گئے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم کا معمولی سا تذکرہ نزہۃ الخواطر جلد ہفتم صفحہ ۴۱۲ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

وقراء علی مولانا عبد الرحیم تھانوی والشیخ قلندر بخش جلال آبادی یہ دونوں بزرگ کون تھے اور ان کی علمیت کا کیا مرتبہ تھا ان باتوں کا کسی ذریعہ سے پتہ نہ چل سکا۔ (۱)

دہلی کی حالت اور شاہ ولی اللہ کا اثر

حضرت مولانا کی طفلی کا دور ہندوپاکستان کی تاریخ کا وہ دور تھا جب سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹٹم رہا تھا لیکن خود دہلی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ وہاں ہر طرح کے صاحب کمال حضرات کا اجتماع تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے علم کی جو شمع روشن کی تھی اس کو آپ کے تین نامور صاحبزادوں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ، حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی رحمہ اللہ اور ان کی اولاد و احفاد نیز شاگردان و مریدان باصفانے مزید روشنی عطا فرمائی اور اس کے لمعات سے برصغیر کے تمام گوشوں کو منور کر دیا۔

اسی خانوادہ ولی اللہی سے دو ایسی مبارک ہستیوں نے جنم لیا جو علم سے زیادہ عمل کی جانب مائل ہوئیں اور جنہوں نے وہ تحریک چلائی جو خالصتاً اسلام اور مسلمانان ہندوپاکستان کے احیاء اور ترقی کے لئے تھی۔ ان میں ایک مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ بن شاہ عبد الغنی رحمہ اللہ امام ولی اللہ کے پوتے تھے۔ دوسرے حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی رحمہ اللہ شاہ علم اللہ کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو حضرت شاہ عبد العزیز محدث رحمہ اللہ سے شرف تلمذ و بیعت حاصل تھا ان دو بزرگ ہستیوں میں جوش جہاد اس قدر فزوں تھا کہ انھوں نے اپنی مقدس زندگیاں اسی کے لئے وقف کر دیں اور جان سپاری و جاں نثاری کے وہ نمونے چھوڑ گئے جو رہتی دنیا تک ان کے ناموں کو زندہ رکھیں گے۔

حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ نے جہاد سے پہلے حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ کے حکم سے شمالی

(۱) یہ دونوں حضرات حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی رحمہ اللہ کے مخصوص شاگردوں میں ہیں اور استاذ العلماء مولانا مملوک العلّی تھانوی رحمہ اللہ کے اساتذہ میں ان حضرات کا نام بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اس سے ان حضرات کی علمی منزلت و قدر اور مرتبہ عالی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ (مجموعہ تہذیبی کتب)

ہندو پاکستان کے مختلف شہروں اور قصبوں کا دورہ کر کے لوگوں سے جہاد کی بیعت لی۔ اسی سلسلہ میں ان کا ورود مسعود تھانہ بھون میں بھی ہوا۔ اس وقت حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ کا عہد طفلی تھا لیکن وہ دور ایسا تھا جب دینی حمیت مسلمانوں کے بچے میں موجود تھی۔ چنانچہ اپنے بزرگوں کے ہمراہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست پر بیعت کی اس کا ذکر کئی جگہ نہایت والہانہ انداز میں کیا ہے رسالہ وحدۃ الوجود والشہود کے خاتمہ میں مرقوم ہے۔

”قطع ازیں فقیر یاد دارد کہ عمرم ہفت سال باشد خود در مسجد پیر محمد والی، واقع وطن فقیر قصبہ تھانہ بھون ضلع سہارنپور از اضلاع میان دو آب بہ شرف بیعت از خدمت جناب سید صاحب ممدوح قدس سرہ مشرف شد اگرچہ در ایام طفلی بودم اما پر تو بزرگان کافی است و باز فیض روحی از و شاں می دارم۔“

ایک اور رسالہ ارشاد محمدی میں اسی واقعہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:-

”وجہ پیر صحبت معنوی بہ نسبت حضرت سید صاحب قبلہ مصدر المناقب قدس سرہ یہ ہے کہ فقیر کو ابتداءً بعمر ہفت سالگی اول شرف بیعت اور حاضری یک دو بار حلقہ توجہ دہی حضرت سید صاحب ممدوح ہوا۔“

تحصیل علم کی غرض سے دہلی کا سفر

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے دورہ کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ جن کو علوم دینیہ کی جانب پہلے سے خاصی رغبت تھی اب اس جذبہ سے اور بھی سرشار ہو گئے۔ ۱۰-۱۱ سال کی عمر تک تو وطن میں رہ کر علم حاصل کیا، لیکن جب اس سن کو پہنچے تو یہ دائرہ تنگ معلوم ہونے لگا اور اس چھوٹی سی عمر میں جب عام بچے گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں، آپ حصول علم کے شوق میں تنہا دہلی پہنچ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ راہی عالم بقا ہو چکے تھے اور ان کی مسند درس و تدریس کی زینت ان کے نواسے شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ (۱) اور حصول علم کی جانب اس قدر توجہ مبذول کی کہ آٹھ سال کی مدت میں علوم

(۱) نزہۃ الخواطر میں حضرت مولانا شرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مولانا نے علوم متعارفہ کی تحصیل شیخ مملوک علی ہادی رحمۃ اللہ علیہ سے منطق حکم کے تحصیل مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ سے کیا۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

متبادلہ کی تحصیل کر کے اٹھارہ سال کے سن میں شاہ صاحب سے سند فراغ حاصل کی اور علم کی دولت سے مالا مال ہو کر اپنے وطن واپس آئے۔

بالاکوٹ کا واقعہ اور حضرت شاہ محمد اسحاق کا ہجرت فرمانا

حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ کی دہلی سے واپسی کے ڈیڑھ سال پہلے (۷/ مئی ۱۸۳۱ء کو) بالاکوٹ کا خونچکاں واقعہ رونما ہو چکا تھا اور حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کی تحریک جہاد ناکامی پر منتج ہو چکی تھی۔ اس واقعہ کے بعد ملک میں جو حالات رونما ہوئے ان سے قطع نظریہ بتادینا ضروری ہے کہ حضرت شاہ محمد اسحاق جو اس تحریک کی قیادت فرما رہے تھے اس ناکامی سے اتنے برداشتہ خاطر ہوئے کہ ۱۲۵۶ھ ۱۸۴۰ء میں وہ اپنے برادر خورد حضرت شاہ محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور اس تحریک کو چلانے کے لئے ایک بورڈ بنا گئے جس کی صدارت استاذ العصر مولانا مملوک علی کو سپرد کر دی گئی۔

دہلی سے واپسی کے بعد علمی سرگرمیاں

چونکہ مولانا احمد اللہ قصبہ کے ایک ذی حیثیت فرد تھے اور اتنی املاک و جائداد چھوڑ گئے تھے کہ اس سے بآسانی زندگی بسر کی جاسکتی تھی اس لئے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو تعلیم مکمل کرنے کے بعد حصول معاش کی فکر نہیں کرنی پڑی اور آپ گھر پر رہ کر اپنی علمی قابلیت بڑھانے لگے۔ اپنے مکان کے متصل حوض والی مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے وہیں طلباء کو درس دیتے اور اکثر و بیشتر عوام و خواص کو وعظ و پند سے مستفیض فرماتے۔ (۱) تصنیف و تالیف کا شوق شروع ہی سے تھا اس جانب بھی جلد ہی توجہ مبذول ہو گئی غرض تھوڑے ہی عرصہ میں حضرت مولانا کی علمیت کا دور و نزدیک شہرہ ہو گیا۔ اور وہ ایک عالم دین کے حیثیت سے ہر جگہ متعارف ہو گئے۔

وطن میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے جتنے دوست اور ملنے والے تھے ان میں حضرت حاجی

(۱) تذکرہ اپریل ۶۲ء

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) کے الفاظ یہ ہیں۔ ثم سار الی دہلی واخذ العلوم المتعارفۃ عن الشیخ المملوک العلی التوتوی وقراء المسطق والحکمة عن العلامة فضل حق بن فضل امام الحیر آبادی ثم لزم الشیخ اسحق بن افصا العسری الدہلی واخذ عنہ الحدیث

امداد اللہ رحمہ اللہ اور حضرت حافظ ضامن شہید رحمہ اللہ کے اسماء گرامی سرفہرست ہیں۔ دہلی میں آپ کے دوستوں اور مخلصوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ غالباً انھیں دوستوں کی کشش حضرت مولانا کو تحصیل علم کے بعد بھی اکثر دہلی تشریف لے جانے پر مجبور کرتی رہی اور اس مرکز علم و ادب سے آپ کے تعلقات ایسے وابستہ رہے کہ لوگ آپ کو دہلی کے طلباء مستعدین اور علماء دین میں شمار کرتے تھے۔ ۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ء میں نواب صدیق حسن خاں بغرض حصول علم دہلی گئے تو اس وقت ان کی ملاقات جن حضرات سے ہوئی ان میں سے بعض کا ذکر مآثر صدیقی موسوم بہ سیرۃ والا جاہی حصہ دوم میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

”طلباء مستعدین میں مولوی شیخ فیض الحسن صاحب سہارنپوری، ملا نواب صاحب مقیم مکہ معظمہ، مولوی ارشاد حسین صاحب رام پوری، مولوی فضل رسول صاحب بدایونی، مولوی ثناء الدین صاحب و مولوی شیخ محمد صاحب تھانوی و مولوی فضل حق خیر آبادی کے ساتھ ربط ضبط رہا۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے بعد بھی حضرت مولانا کے تعلقات دہلی کے اہل علم حضرات سے قائم رہے اور آپ کا وہاں اکثر آنا جانا ہوتا رہا۔ دہلی سے بھی بعض دوست بغرض ملاقات آئے ہوں گے۔ لیکن اس کا کوئی زبانی یا تحریری ثبوت دستیاب نہیں ہوا تاہم حکیم مومن خاں کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ حضرت مولانا اور حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ سے ملاقات کی غرض سے کئی مرتبہ تھانہ بھون آئے اور حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کے مکان پر مقیم ہوئے۔ (۱)

شریعت کا احترام اور طریقت کا معیار

وطن میں چند سال تک حضرت مولانا رحمہ اللہ محض عالم دین کی حیثیت سے متعارف رہے۔ سوائے اس بیعت کے جو آپ نے اپنی سات سال کی عمر میں حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کے ہاتھ پر کی تھی اس وقت تک نہ آپ نے اور کسی سے بیعت کی اور نہ علم باطنی کی جانب مائل ہوئے۔ درحقیقت بعض نام نہاد صوفیوں کو دیکھ کر آپ اس کوچہ میں آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ آپ کے دل میں شریعت کا احترام اتنا تھا کہ طریقت سے اس کو فروتر کہنے یا سننے پر کسی

(۱) یہ روایت قاضی محمد مکرم صاحب مائل تھانوی سے ہم تک پہنچی ہے۔

طرح آمادہ نہ تھے اور جب بعض متصوفین کو یہ کہتے سنتے کہ طریقت کے مقابلہ میں شریعت کیا چیز ہے یا طریقت اور شریعت کی راہیں جدا جدا ہیں تو آپ کے دل میں قدرتاً ان کے لئے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ راہ طریقت سے آپ گریزاں نہیں تھے، لیکن اس کے لئے شریعت کو بنیاد بنانا ضروری قرار دیتے تھے۔ شرح حزب البحر میں ایک جگہ اپنے اسی عقیدہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:-

”..... ایسے جاہل فقیروں اور درویشوں سے جو شریعت اور طریقت کو مخالف بتلاتے ہیں دور بھاگنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی صحبت میں بہ امید حصول عرفان اور وصل خداوندی کے اصل متاع ایمان جو باعث نجات اخروی ہے ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ معاذ اللہ منہا.....“

اسی احتیاط کا اقتضا تھا کہ آپ کسی پیر طریقت کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے سے ہچکچاتے رہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو آپ کے ہم جد (۱) اور حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ جو آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ حضرت میاں نجیو نور محمد جھنجھانوی قدس سرہ کے زمرہ مریدین میں شامل ہو چکے تھے وہ دونوں ازراہ دوستی مصر ہوئے کہ۔ ”آپ بھی حضرت میاں نجیو سے بیعت ہو جائیے۔“ لیکن چونکہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو میاں نجیو کی علم شریعت سے واقفیت پر پورا بھروسہ نہیں تھا اس لئے آپ دونوں دوستوں کے مشورہ کو ہنسی میں ٹالتے رہے بلکہ ایک دو مرتبہ حضرت میاں نجیو کی شان میں یہ الفاظ بھی کہہ گزرے۔

”واہ وا! اچھا پیر تلاش کیا۔ مسجد کا میاں جی۔ میں اس سے کیا بیعت ہوں گا، جس کو علم شریعت سے بھی پوری آگاہی نہیں۔“

یا۔ ”وہ تو مسجد کے ملا ہیں۔ ان سے کیا بیعت کروں گا۔“

حضرت میاں نجیو نور محمد جھنجھانوی سے بیعت

کچھ مدت اسی طرح گزر گئی اور حضرت مولانا راہ طریقت میں قدم نہ رکھ سکے۔ آخر وہ وقت آگیا جب پیر کامل کی نظر فیض اثر نے آپ کی کیفیت قلب کو یکسر بدل دیا، اور آپ نے

(۱) حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا شجرہ نسب بارہویں پشت میں یعنی قاضی چندن پر حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ کے شجرہ سے مل جاتا ہے۔

حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی کے ہاتھ پر چشتیہ، صابریہ، نقشبندیہ اور قادریہ سلسلہ میں بیعت کر لی۔

نسیم احمد جھنجھانوی اپنی مختصر تالیف ”نور محمدی“ میں حضرت مولانا شیخ محمد کے مرید ہونے کے واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

”حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی تو برادری کے بھائی تھے، مگر حضرت حافظ محمد ضامن صاحب تھانوی حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی ایک دوسرے کے حقیقی پھوپھی و ماموں زاد بھائی تھے اور یہ تینوں حضرات فاروقی تھے۔ جب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب غیبی بشارت پا کر حضرت میانجیو سے بیعت ہو گئے، تو انہوں نے مولانا شیخ محمد صاحب کو بتلایا کہ میں لوہاری میں جو جھنجھانہ کے ایک میانجیو نور محمد صاحب ہیں ان سے بیعت ہو گیا ہوں تم بھی ان سے بیعت ہو جاؤ۔ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب نے اپنے علم کی وجہ سے حضرت میانجیو کی ایک قسم کی توہین کی کہ واہ وا! اچھا پیر تلاش کیا مسجد کامیاں جی۔“ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت میانجیو نور محمد رحمۃ اللہ علیہ اسی مسجد میں جس کو اب خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے تشریف لے آئے، حضرت حاجی صاحب نے مولانا شیخ محمد صاحب سے فرمایا کہ ہمارے شیخ آگئے ہیں جو کچھ تم کو پوچھنا ہو پوچھ لو اور آئندہ حضرت شیخ کی برائی نہ کرنا ورنہ دوستی میں فرق آجائگا، جس پر یہ دونوں حضرات میانجیو کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سورہ رحمان کے متعلق سوال کیا۔ حضرت میانجیو نے فرمایا :-

”میں تو مسجد کامیاں جی ہوں مجھے کیا خبر۔“ مگر جب ان حضرات نے

زیادہ اصرار کیا تو آپ نے شیخ محمد صاحب سے فرمایا :-

”آنکھیں بند کر کے پھر میری آنکھوں کی طرف دیکھو۔“

حضرت شیخ محمد نے جو ایک بار آنکھیں بند کر کے کھولیں اور حضرت میانجیو کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو حضرت کی آنکھوں میں ان کے سوال کا جواب لکھا ہوا تھا۔ پھر حضرت میانجیو نے فرمایا :-

”دیوار کی طرف دیکھو۔“ تو سوال کا جواب دیوار پر بھی لکھا ہوا پایا۔

حضرت میانجیو کی اس کرامت کو دیکھ کر حضرت مولانا نے فوراً بیعت کر لی۔ اس واقعہ کو نسیم احمد ایک اور طرح بیان کرتے ہیں۔ ”بعض لوگوں سے اس طرح سنا ہے کہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ۔ ”وہ تو مسجد کے ملا ہیں“ ایک جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے کہ حضرت میانجیو کی نظر ان (مولانا شیخ محمد) پر پڑی۔ مولانا تڑپ گئے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ لوگوں نے کہا۔ ”طیب کو بلاؤ“ ایک اہل دل اس مجمع میں موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا۔ ان میانجیو صاحب سے کہو یہ علاج کریں گے۔ حضرت سے درخواست کی گئی تو آپ نے فرمایا میں تو مسجد کا ملا ہوں میں کیا جانوں، دوسروں کے اصرار پر حضرت میانجیو نے پانی پڑھ کر دیا۔ ہوش آگیا اور وہ قدموں میں گر پڑے۔ اور حضرت سے بیعت کی درخواست کی حضرت نے بعد میں مرید فرمالیا۔“

بعض بزرگوں سے یہ روایت سنی ہے۔

”حاجی صاحب رحمہ اللہ اور حافظ صاحب رحمہ اللہ نے میانجیو نور محمد رحمہ اللہ سے بیعت ہونے کے بعد مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ کو مشورہ دیا کہ وہ بھی میانجیو کے حلقہ ارادت میں داخل ہو جائیں۔ مولانا نے ”مسجد کے ملا کی پھبتی کہہ کر ان کے اس مشورہ کو ٹھکرا دیا بعد تین روز تک خواب میں بشارت ہوئی تو مولانا مثنوی معنوی کے چند اشعار کا مطلب میانجیو صاحب سے دریافت کر کے ان کی علمیست اور بزرگی کے قائل ہوئے اور حلقہ مریدین میں داخل ہو گئے۔“

ان سب روایتوں میں جزوی اختلاف ہے۔ لیکن ہر ایک سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت مولانا طریقت کیلئے شریعت کو ضروری خیال کرتے تھے اور ایک ایسے رہبر کے متلاشی تھے جو جامع شریعت و طریقت ہو۔ جب حضرت میانجیو کو بخوبی جانچ اور پرکھ لیا اور آپ پر یہ امر منکشف ہو گیا کہ گو میانجیو علوم شریعت سے بظاہر بہرہ وافی نہیں رکھتے تاہم سلوک کی راہیں طے کرنے کے بعد ان کا سینہ ہر قسم کے علوم کیلئے خود بخود کھل گیا ہے تو آپ نے بغیر توقف حضرت میانجیو سے بیعت کر لی اور بہت جلد خلیفہ مجاز کے درجہ پر فائز ہو گئے۔

بیعت کے بعد اپنے پیر بھائیوں سے تعلقات

جلد تکمیل کر لی۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ اور حضرت حافظ محمد ضامن شہید رحمہ اللہ کا رجحان طریقہ چشتیہ صابریہ کی جانب زیادہ تھا۔ وہ دونوں طریقہ میں حضرت مولانا رحمہ اللہ سے سبقت لے گئے۔ اپنے پیر و مرشد حضرت میا نجیو رحمہ اللہ سے فیض حاصل کرنے کے علاوہ یہ تینوں پیر بھائی ایک دوسرے کو بھی فیض پہنچاتے تھے۔ حضرت مولانا نے رسالہ ارشاد محمدی میں اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے۔

”اور ابتدا میں فقیر نے حسب ارشاد حضرت پیر و مرشد اصلی میان جی صاحب نوالا سلام کے اپنے پیر بھائی حضرت حافظ ضامن علی شاہ صاحب تھانوی مرحوم و مغفور سے بھی کہ مجھ سے پہلے مرید حضرت میا نجیو صاحب کے تھے قدرے فیض صرف نسبت چشتیہ کا اٹھایا۔ (۱) علیٰ ہذا القیاس برادر دینی پیر بھائی میرے جناب حاجی امداد اللہ شاہ صاحب تھانوی سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے فیض اٹھایا اور بعد تکمیل نسبت نقشبندیہ مجھ سے عاجز کے حضرت حافظ صاحب مرحوم نے بعض امور نقشبندیہ کو فقیر سے دریافت فرما کر کار بند ہوئے۔“

حضرت میا نجیو کی نگاہ میں حضرت مولانا شیخ محمد کا مرتبہ

حضرت مولانا علوم ظاہری میں میا نجیو رحمہ اللہ کے تمام مریدوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ بنا بریں حضرت میا نجیو آپ کا سجد لحاظ کرتے تھے ملاقات کے موقع پر گفتگو میں اور مراسلت کے وقت خطوط میں آپ کے علمی مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہی پیرایہ اختیار کرتے تھے جو آپ کے شایان شان ہوتا تھا۔ حضرت میا نجیو کے ایک خط کا ترجمہ کر کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

مولانا (۲) مولوی شیخ محمد صاحب فضیلت مآب کی خدمت گرامی میں! اللہ تعالیٰ ان کے شوق و ذوق کو جو معرفت خداوندی میں ہے زیادہ کرے۔ سلام ہو آپ پر اور اس شخص پر جو ہدایت اختیار کرتا ہے۔ اس فضیلت مآب مولانا کا گلشن شباب طاعت ایزدی کی آبیاری سے

(۱) غالباً حضرت مولانا شیخ محمد کی اس عبارت سے ہی مولانا نسیم احمد فریدی امر وہوی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پہلے حضرت حافظ ضامن سے روحانی فیض حاصل کیا بعد ابراہ راست حضرت میا نجیو سے بیعت ہوئے۔

(۲) نثر کا ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اشعار بخندہ نقل کر دئے گئے ہیں۔

سر سبز ہو۔ داعی کے دل کا بلبل ہر طرح سے ملاقات کے پھول کے شوق میں مترنم و مشتاق ہے۔ لیکن یہ سمجھ کر کہ ملاقات اوقات معینہ پر منحصر ہے۔ اپنے مقصد اصلی کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسے وقت میں کہ سقائے سحاب نے آلام روزگار کی لو میں کھلائے ہوئے قلوب کو حیات تازہ بخشی اور نہروں اور حوضوں کے رہنے والوں کو پانی کی موجوں کی بہجت آفرینی نے مثل شب بیدار صوفیوں کے جو حلقہ عبادت ڈال کر معبود حقیقی کے قسم قسم کے اذکار و اشغال میں لگے ہوئے ہیں اور نواسنجان گلشن کو عروس بہار کی جلوہ گری سے بزم خرمی کے قوالوں کی طرح کھینچ کر انواع و اقسام کے دلفریب نغموں میں مشغول کیا ہے۔

نبات از گوشہ خود سر بر آورد

بیاد حمد ایزد بار بر خورد

زہے موسم کہ در ہر کشت زارے

شدہ آب رواں چوں نو بہارے

نامہ مسرت کے انبساط انگیز مضمون کو دیکھ کر کہ اس کے ریحان الفاظ حسن و خوبی اور طرب ریزی کی وجہ سے نو نہالاں بوستان کی طرح ناز کرتے تھے چشم دل نے طراوت تروتازہ اور تازگی بے اندازہ پائی۔

صبا رسید و دلم غنچہ خنداں شد

شمیم لطفش در دمان درد مندان شد

اگرچہ پیما نہ دل اس کی ارتیاح آیات کے بادۂ مکالمات سے خرم و شاد ہوا، لیکن عارض حال نے خوش آئند قانون کی نوازش یعنی ظاہری گفتگو کے بغیر جو نشی جان ہے اطمینان کلی نہ پایا۔ اللہ تعالیٰ جو جامع المتفرقین ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام کی طرح زلال و وصال کے متمنیوں کو ان کی مراد تک پہنچائے۔ اس استعداد و شوق کی وجہ سے جو جسمانی معانقہ و مصافحہ میسر نہ آنے کے سبب شدت اختیار کر گیا ہے۔ سورج کی تیز شعاعیں نوک قلم پر آکر اپنا اظہار کر رہی ہیں۔ مولانا غور کیجئے کہ پروانہ دیدار جمال شمع کے شوق میں پریشان رہتا ہے اور اس کی حرارت سے پرہیز نہیں کرتا۔ جس وقت بلبل کو گلزار کے حسن و لنواز کے دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے تکلیف سے نہیں ڈرتا۔ پس اس صورت میں کہ ایسی مخلوقات کا یہ طریقہ ورد یہ ہو جی نوع انسان کا کیا ذکر جس کی پیدائش و خلقت نے تخم دوستی و محبت میں نشوونما پائی ہے

حاصل کلام یہ کہ تمام امور میں غم خواری اور محبت کی ضرورت ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ رسالہ گل لالہ تصنیف کردہ اس مجمع کمالات کا (یعنی مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ) جو معارف ربانیہ کا پہچاننے والا اور حقائق کا تحقیق کرنے والا ہے۔ فن تصوف میں ہے اور اس کا نام تنقیہ لا اعتقاد و تصفیۃ الفواد من الکفر والارتداد (۱) ہے میں اس کو دیکھنے کا بے حد شائق ہوں۔ وہ دن کتنا اچھا ہو گا جب اس کے مشتاقان جمال کی آنکھیں اس کے مطالعہ کحل الجواہر سے روشن و منور ہوں گی۔

اس کے علاوہ مہربان مخلص دل حافظ صاحب، حافظ ضامن علی کو اپنے پال گوپال کی جگہ سمجھ کر اس کے حال پر شفقت و مہربانی کی نظر رکھیں۔ اگر اتفاقاً بہ تقاضائے بشریت ان سے کوئی لغزش ہو تو سوائے معافی اور مہربانی کے وجہ ضمیر (ضمیر کے چہرہ) پر کوئی نقش نہ رہے۔ دل کی کدورت اور زنجش جسمانی کو ان اور ادواشغال سے جو آپ کو بتلائے گئے ہیں صیقل توجہ سے پاک و صاف کر کے غیبی مہمانوں کے اترنے کی جگہ بنائیں (دل کو گرد کدورت سے صاف رکھیں)۔

دلت جو غنچہ بذکرش شگفتہ سر بادا لبش بہ شبنم یادش چو برگ تر بادا
مشام جان من از کوئے او شمی باید وجود نخل ز عشقش تو بارو ر بادا
زیادہ بجز شوق کیا لکھا جائے۔ حافظ جیو صاحب، حاجی امداد اللہ صاحب و حافظ رفیع الدین صاحب اور مسجد کے ارد گرد رہنے والے جملہ حضرات کو سلام مسنون الاسلام پہنچادیں اور بندہ کے پاس اس وقت جو لوگ حاضر ہیں ان میں سے حافظ محمود نانوتوی عفی عنہ کی جانب سے مولوی صاحب، حافظ محمد ضامن صاحب اور حافظ امداد اللہ صاحب کو بصد نیاز و انکساری آداب و تسلیمات پہنچے۔

حضرت میا نجیو کا فیض روحانی اور وصال

حضرت مولانا کو اپنے پیر طریقت حضرت میا نجیو نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بہت کم نصیب ہوئی لیکن بھواء ”داما پر تو بزرگاں کافی است“ پیر کی نظر فیض اثر اس پر حضرت مولانا کی ذاتی

(۱) غالباً حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس نام کا بھی کوئی رسالہ فن تصوف پر لکھا تھا۔ لیکن ہماری نظر سے نہیں گزر اس لئے آپ کی تصانیف کی فہرست میں اس کو شامل نہیں کیا گیا۔

صلاحیت دونوں نے مل کر چند ہی سال میں آپ کو کندن بنا دیا۔

۱۲۵۹ھ ۱۸۴۳ء میں حضرت میا نجو نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کا عمر ۵۸ سال وصال ہو گیا اور یہ تینوں پیر بھائی مسند ارشاد پر بیٹھے اور اپنے پر تو انوار سے ایک عالم کو منور کرنے لگے۔

سفر حرین الشریفین اور شاہ محمد یعقوب سے اخذ فیض

حضرت میا نجو کے وصال کے تقریباً چار سال بعد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے براہ (۱) ٹونک حرین شریفین کا سفر کیا اور حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ مکہ معظمہ کے دوران قیام میں حضرت شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے برادر خور د حضرت شاہ محمد یعقوب (۲) سے صحاح ستہ، تفسیر، فقہ وغیرہ کی سند حاصل کی اور ان تمام اشغال و اذکار کی اجازت پائی جو شاہ صاحب کو اپنے نانا حضرت شام عبد العزیز قدس سرہ سے پہنچے تھے۔ حضرت مولانا ارشاد محمدی کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

۱۲۶۳ھ میں فقیر کو بعد شرف بیعت و صحبت اپنے بمقام مکہ معظمہ شرفہا اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مولوی محمد یعقوب مہاجر کی، نواسہ اور خلیفہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی قدس سرہ نے اجازت عام اذکار و اشغال و اعمال جملہ ان طریقوں کے جو ان کو حضرت شاہ عبد العزیز مدوح قدس سرہ سے پہنچے تھے مع خرقة کرتہ شریف اپنے کے و معہ سند مہری علم حدیث صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث اور علم تفسیر و فقہ و اصول حدیث اور تصوف باوجود حصول سند علم موصوفہ فقیر کو پیشتر پیش گاہ حضرت استاد مولانا شیخ المشائخ آفاق مولانا مولوی محمد اسحاق محدث مہاجر کی شاہ جہا آبادی قدس سرہ سے جو برادر حقیقی کلاں ان کے ہیں عطا فرمائے اور بعد توجہ دہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ اکبر تمہاری نسبت میں بڑی فراخی اور وسعت ہے اور تم کو اب کچھ احتیاج و اکتساب باقی نہیں رہی اور ہم میں اور تمہارے پیر و مرشد اصلی میں یعنی مولانا نور الاسلام حضرت میا نجو نور محمد رحمۃ اللہ علیہ جھنجھانوی میں کسی طرح کا تقادٹ نہیں۔“

اسی سفر سعید میں حضرت مولانا کو مسئلہ وحدت الوجود و الشہود کے بارے میں بعض

(۱) نواب وزیر الدولہ نے احادیث تہذیب الاخلاق کی تالیف و تدوین کے لئے آپ کو بلایا تھا۔ آپ مکہ معظمہ جات ہوئے ٹونک تشریف لے گئے اور اس کام کو مکمل کر کے اسی سال حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔

(۲) حضرت شاہ محمد اسحاق کا انتقال ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء میں ہو گیا تھا اور اس وقت حضرت شاہ محمد یعقوب حیات تھے۔ اس لئے حضرت مولانا نے ظاہری اور باطنی علوم میں ان ہی سے فیض حاصل کیا۔

مکاشفات ہوئے جن کو آپ نے ایک رسالہ کی شکل میں مرتب کر کے اپنی قلمی بیاض میں درج فرمایا۔ اس رسالہ کا نام پرانے عربی ناموں کے انداز پر۔ ”رسالہ الہامات الوجود الودود فی تحقیق وجدة الوجود والشہود“ رکھا۔ (۱)

حج سے واپسی کے موقع پر حضرت مولانا فرقہ شاذلیہ کے سرخیل حضرت امام ابوالحسن شاذلی یمنی مزار واقع مح (۲) (یمن) پر تشریف لے گئے۔ شرح حزب البحر کی تمہید میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

”فقیر نے وقت واپسی کے حرمین شریفین سے ۱۲۶۳ھ بارہ سوتریسٹھ

ہجری علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ان کے مرقد منور کے زیارت کی۔“

بمبئی پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا فضل حق خیر آبادی نے امام فخر الدین رازی کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے۔ آپ نے اس کو پڑھا تو بے حد متاسف ہوئے اور دہلی پہنچنے سے پہلے اس کے جواب میں ایک کتاب تیار کر لی جس کا نام۔ ”مناظرہ محمدیہ“ رکھا۔ مفتی صدر الدین آزر دہ نے اس کو بہت پسند کیا اور اس پر تقریظ لکھی۔

حج سے واپسی کے بعد

سفر حج سے وطن واپس آئے تو آپ نے پیر محمد والی مسجد میں رہنا اختیار کیا۔ وہیں حاجی امداد اللہ اور حضرت حافظ ضامن شہید رحمہ اللہ کا قیام تھا۔ ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہونے کی وجہ سے اور اس لئے کہ مختلف مشائخ مثلاً حضرت محمد اعلیٰ تھانوی صاحب کشاف اصطلاحات الفنون اور حضرت مفتی الہی بخش مصنف مثنوی تکریمہ دفتر ششم نے یہیں باطنی فیوض حاصل کئے تھے یہ مسجد۔ ”دوکان معرفت“ کہلاتی تھی۔

یہاں دن رات علم و عرفان اور ذکر و فکر سے محفلیں گرم رہتی تھیں حکیم محمد عمر چر تھاولی نے نہایت مسجع و مقفی عبارت میں اس مسجد کا نقشہ پیش کیا ہے:-

”سبحان اللہ و بحمد اللہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ یہ مسجد عبادت گاہ قدسی نفساں

تھی۔ ہمپایہ نجوم یہاں کے نمازی تھے ہم مرتبہ فلک یہاں کی زمین تھی۔ ایک

(۱) یہ رسالہ ایک مرتبہ پہلے بھی طبع ہو چکا ہے۔ مگر بالکل نایاب ہے۔

(۲) یہ یامو خابین کا مشہور شہر ہے۔ بال کا قلعہ بہترین سمجھا جاتا ہے۔

طرف شمال کے حجرے میں۔ ”مثال قطب شمالی، عاشق ذوالجلال شہید لم یزلی، ولی ازلی، حافظ ضامن علیؒ عیاد الہی میں مشغول رہتے۔ ایک جانب جنوب کی سہ دری میں حضرت فیض درجت سلطان زمین ولایت و کرامت، ماہ آسمان رفعت و عظمت، درویش صاحب برکت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ سرگرم قال اللہ وقال الرسول رہتے اور مسجد کے سامنے کو گرتے پڑتوں کے تھامنے کو، مشرق کے حجرے میں ہمارے مرشد مشفق قدس سرہ الخالق..... کبھی درس و تدریس طلبہ میں..... کبھی مشاہدات ذات و سلطان الازکار میں مستغرق.....“ (۱)

یہ نقشہ تو ان حضرات کی روحانی زندگی کا تھا۔ اب آپس کی بے تکلفی کی بھی ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ فرمائیے۔ تینوں بزرگ بچپن کے دوست تھے۔ اس وقت جو تعلقات قائم ہو گئے تھے اور جس بے تکلفی کا مظاہرہ وہ عہد طفلی میں کرتے تھے مسند رشد و ہدایت پر فائز ہونے کے بعد بھی ان کے اس رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ارواح ثلاثہ کی درج ذیل حکایت ان قدسی نفوس کی پاک زندگیوں کے اسی پہلو کو اجاگر کرتی ہے فرمایا کہ :-

جب حاجی صاحب یہاں یعنی خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں تشریف رکھتے تھے تو ایک کچھالی میں کچھ چنے، کچھ کشمش ملی ہوئی رکھتے تھے۔ صبح کے وقت مولانا شیخ محمد صاحب اور حافظ محمد ضامن صاحب اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ساتھ مل کر کھایا کرتے تھے اور آپس میں خوب چھینا جھپٹی ہوا کرتی تھی۔ بھاگے بھاگے پھرتے تھے اس وقت مشائخ اس مسجد کو۔ ”دوکان معرفت“ کہتے تھے اور تینوں کو اقطاب ثلاثہ، حضرت حاجی صاحب دہلی کے شہزادوں میں اور علماء میں بزرگ مشہور تھے۔ مگر پیر بھائیوں میں چھینا جھپٹی کرتے تھے۔“ (۲)

حضرت مولانا رشید احمدؒ سے مناظرہ

حضرت مولانا رشید احمدؒ کی مکہ معظمہ سے واپسی کے چند روز بعد غالباً ۱۲۶۴ھ یا ۱۲۶۵ھ میں

آپ کے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے مابین کسی حدیث کے بارے میں کچھ اختلاف ہو گیا۔ بات معمولی سی تھی لیکن مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی نے اپنی تالیف تذکرۃ الرشید میں جو حضرت مولانا رشید احمد رحمہ اللہ کی سوانح حیات ہے اپنے ممدوح کو اوائل عمر ہی سے سلیم و حلیم اور معصوم عن الخطاء ثابت کرنے کے لئے واقعات میں اس قدر رنگ آمیزی کی کہ اس سے حضرت مولانا شیخ محمد کی شخصیت داغدار ہو کر رہ گئی۔

اس واقعہ کو صحیح خدو خال کے ساتھ پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ دونوں فریقوں کی شخصیتوں کو واضح کر دیا جائے۔

حضرت مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ کے جو حالات اب تک بتائے گئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی عمر اس بحث یا نام نہاد مناظرہ کے وقت تقریباً ۳۵ سال تھی۔ آپ کا علمی مرتبہ ہر جگہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسحق اور حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب سے آپ نے علوم ظاہری کی تکمیل کی تھی اور حضرت میا نجیو نور محمد رحمہ اللہ اور حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب رحمہ اللہ سے باطنی فیض حاصل کیا تھا۔ پھر شروع ہی سے حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت حافظ ضامن شہید کی صحبت میں رہتے تھے اور راہ سلوک میں وہ بلند مقام حاصل کر چکے تھے جہاں پہنچ کر بقول حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب۔

”تم کو اب کچھ احتیاج اکتساب باقی نہیں رہی۔“

ان کے مقابلہ میں حضرت مولانا رشید احمد رحمہ اللہ شباب کی ابتدائی منزل سے گزر رہے تھے۔ بیس اکیس سال کا سن تھا اور بقول صاحب تذکرۃ الرشید

”فارغ التحصیل اور علامہ ہونے کے علاوہ صاف گو، تحریر و تقریر میں

بیباک جو ان طبیعت، تازہ علم اور سب پر طرہ یہ کہ حق بات کے اندر مناظرہ اور

مباحثہ میں مرد لیرو نڈر اس لئے آپ کا قلم نہ رکا اور جو لکھنا تھا صاف صاف

لکھ دیا۔“

شباب اور جوان العمری کی ان غیر ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ابھی تک باطنی علم سے

بے بہرہ اور مولانا عاشق الہی کے اس فقرہ کے مصداق تھے۔

”مگر علم کا غلبہ تھا اور علم کے لئے تفقہ لازم نہیں۔“

اس پس منظر کے ساتھ اب واقعات کی کڑیوں کو ملایا جائے تو پوری داستان اس طرح

مرتب ہوتی ہے۔

حضرت مولانا شیخ محمد نے جن کا علم حدیث میں پایہ ہمیشہ بلند سمجھا جاتا رہا ہے کسی حدیث سے ایک مسئلہ کا استنباط کیا۔ قاعدہ ہے کہ نوجوان جو تازہ تازہ کسی درس گاہ سے پڑھ کر نکلتے ہیں، جاو بیجا اپنی علمیت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی وہی دور تھا انہوں نے جوش میں آکر حضرت مولانا شیخ محمد کی رائے کی تردید کر دی۔ حضرت مولانا نے اس کا نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ایک علمی بحث میں حضرت مولانا رشید احمد کا بھی وہی انداز ہونا چاہئے تھا، لیکن جوانی کی ترنگ میں جواب الجواب کے ساتھ ساتھ ثقاہت کے درجہ سے گرا ہوا یہ شعر بھی لکھ گئے۔

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے (۱)

ہر صاحب ذوق اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس شعر کو ایسی بحث میں جو حدیث اور فقہ سے متعلق تھی پیش کرنا غلط اقدام تھا یا اس کو پڑھ کر برا فروختہ ہونا تفقہ اور تورع کے خلاف تھا۔ اس بات کا اعتراف خود مولانا عاشق الہی کو بھی ہے کہ ”مولانا کا لکھا ہوا شعر چونکہ زیادہ ناگوار گزرا اس لئے خفا ہوئے اور جو کچھ زبان پر آیا کہا۔“

مگر چونکہ حضرت مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ ان کے مدوح ہیں اس لئے فیصلہ ان کے حق میں اور حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ان الفاظ میں سنا دیتے ہیں۔

”مگر علم کا غلبہ تھا اور علم کے لئے تفقہ لازم نہیں۔ غلطی و خطا سے معصومیت ضروری نہیں (۲) اس لئے حقیقتاً اس مسئلہ کے اندر چوکے اور لغزش کھائی۔“

(۱) اس قسم کے اشعار ایسے معرکوں کی رونق کو تو بڑھا سکتے ہیں۔ جیسا انشاء اور مرزا عظیم کے مابین ہوا تھا اور جس کا نقشہ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ اس معرکہ میں عظیم بیگ نے انشاء کے پھڑک پن کا جو جواب ایک مجلس کے ذریعہ دیا اس کے ایک بند کا یہی اسی شعر کا دوسرا مصرع ہے ملاحظہ ہو۔

موزونی و معانی میں پیا نہ تم نے فرق تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

(۲) مولانا عاشق الہی مرحوم نے یہ بات نہایت اصولی بیان فرمائی۔ لیکن اگر وہ اسی اصول کو سب جگہ برتتے تو وہ اصول تھا ورنہ بے اصولی کے سوا اس کو اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو یہ اصول بیان کر کے کہ غلطی و خطا سے معصومیت ضروری نہیں جگہ جگہ کے انبیاء علیہ السلام کی زبان سے اخلاط و احوال (باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال جب تحریر سے کام نہ چلا تو حضرت مولانا رشید احمد رحمہ اللہ زبانی مناظرہ کے لئے تھانہ بھون پہنچے، لیکن حضرت مولانا سے ملاقات ہونے سے پہلے ہی حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کے مرید ہو گئے۔ اور انہوں نے مناظرہ سے روک دیا۔

جنگ آزادی کے شروع میں تھانہ بھون کی حالت

اس واقعہ کے بعد سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۳ھ تک کے حالات پردہ خفا میں ہیں۔ قیاس ہے کہ یہ دور بھی حضرت مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ نے علمی مشاغل اور عبادت و ریاضت میں گزارا۔ ان ایام میں دہلی بھی آنا جانا ہوتا رہا۔ نواب صدیق حسن سے اسی زمانہ میں ملاقات ہوئی جس کا ذکر پہلے کسی موقع پر کیا جا چکا ہے۔

۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ میں وہ ہنگامہ بلاخیز رونما ہوا، جس کو برطانوی عہد میں ہمیشہ غدر کا نام دے کر بدنام کیا جاتا رہا، لیکن اب اسی کو محبان وطن کی جاں فروشی کا ایک بے بدل کارنامہ بتا کر جنگ آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ ہنگامہ کس طرح شروع ہوا اور ملک کے مختلف گوشوں میں کیسے پھیلا ان باتوں کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ اس امر کا اظہار کر دینا ناگزیر ہے کہ عام ہنگامہ کے دوران تھانہ بھون کی فضا پرسکون رہی۔ زبانی روایتوں سے اس کے دو وجوہ معلوم ہوئے ہیں (۱)

(۱) قاضی سعادت علی جو قاضی عنایت علی کے والد تھے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم رہ چکے تھے، اس لئے ان کو اور ان کے صاحبزادوں کو کمپنی کی وفاداری ملحوظ تھی۔

(۲) قاضی عنایت علی نے اپنے زمانہ میں کمپنی کے وفادار رہنے کا معاہدہ کیا تھا جس کو نباہنا وہ اپنے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

حقیقت کچھ ہو یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ تین چار ماہ تک ملک کے مختلف حصوں میں جنگ

(۱) یہ قاضی محمد مکرم صاحب مائل تھانوی کی زبانی روایت ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) خود بندہ کو یہ واقعات پیش آئے ہیں کہ جناب حضرت حاجی صاحب اور حافظ صاحب جو پہلے سے

مولوی شیخ محمد صاحب سے مسائل دریافت کر کران پر عامل تھے، بندہ کے کہنے سے کتنے ہی مسائل کے تارک ہو گئے اور وہ اللہ کہ حافظ صاحب نے یہ کلمہ میرے سامنے فرمایا کہ ہم کو بہت سے مسائل میں ہمیشہ دھوکا رہا ہے۔

حضرت مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ کو زیور علم تک سے عاری کرنا چاہتے ہیں، اور جہاں اپنے ممدوحین کا ذکر آتا ہے وہاں ان کی لغزشوں کے لئے حسین توجیہات پیش کر دیتے ہیں۔

کے شعلے بھڑکتے رہے، لیکن تھانہ بھون میں اس کی ایک ہلکی سی چنگاری بھی نہیں پہنچی۔ اس مثالی امن و امان کے قیام کا سہرا قاضی عنایت علی کے سر ہے۔ (۱)

تھانہ بھون میں جہاد کے اسباب، واقعات اور نتائج

تین چار ماہ کی مدت گزرنے کے بعد ایک ایسا تکلیف دہ واقعہ رونما ہوا جس نے تھانہ بھون کے اس مثالی امن کو ختم کر دیا اور جنگ کے جو شعلے ملک کے دوسرے حصوں میں بھڑک رہے تھے انہوں نے اس قصبہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے کر یہاں کی خوشحالی اور سکون و اطمینان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

یہ حادثہ اس طرح وقوع پذیر ہوا کہ قاضی عنایت علی کے برادر خور و قاضی عبدالرحیم جو بڑے بھائی کو باپ کے مثل سمجھتے تھے اور ریاست کے کاموں سے علیحدہ رہ کر امیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ کسی غرض سے مع چند احباب و رفقاء سہارنپور تشریف لے گئے اور وہاں سرائے میں مقیم ہوئے۔ تھانہ بھون کے ایک کانسٹبل نے جو کلکٹری میں سرشتہ دار تھا، کسی خاندانی چشمک و عداوت کی بنا پر حاکم ضلع رابرٹ اسپنکی سے شکایت کر دی کہ تھانہ بھون کا رئیس کمپنی سے باغی ہو گیا ہے اور دہلی کے باغیوں کو امداد پہنچانے کی غرض سے سامان حرب خریدنے کے لئے سہارنپور آیا ہے۔

یہ دور ایسا تھا جب معمولی سے شبہ پر دار و رسن کی تیاری ہو جاتی تھی۔ انگریز باغی اور بغاوت کے نام سے بھڑکتا تھا۔ (۲) قدرتی طور پر اسپنکی کو کچھ شک اور کچھ یقین ہوا، پھر بھی اس نے

(۱) مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند نے ”علماء ہند کا شاندار ماضی“ میں یہ بات ثابت کرنی چاہی ہے کہ علمائے تھانہ بھون نے جن کے سربراہ حضرت حاجی امداد اللہ تھے میرٹھ اور دہلی کے ہنگاموں کی خبر پاتے ہی جہاد کی تیاری شروع کر دی تھی اور حالات کا جائزہ لینے کیلئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو دہلی بھیجا تھا مگر وہ جہاد کی کوئی صورت بنتے نہ دیکھ کر واپس آ گئے۔ مولانا نے محض ظن و تخمین کی بنیاد پر یہ تمام عمارت کھڑی کی ہے ورنہ انہیں اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملا H.G. KEENE کے مرتب کردہ حالات سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ شامی کا زمیندار تحصیلدار ابراہیم خاں کا مخالف تھا، اور بادشاہ دہلی سے ساز باز کر رہا تھا۔ اسی لئے انگریزوں کو شامی کی حفاظت کے لئے کافی انتظامات کرنے اور وہاں سپاہی اور اسلحہ جات رکھنے پڑے۔ تھانہ بھون کی طرف سے کوئی خدشہ نہیں تھا اس لئے وہاں کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔

(۲) سہارنپور میں اس وقت جو حالات گزر رہے تھے ان کا مفصل تذکرہ HENRY GEORGE KEENE کی کتاب SOME ACCOUNT OF THE ADMINISTRATION OF INDIAN DISTRICTS DURING THE REVOLT OF BENGAL ARMY کے باب اول میں ملاحظہ فرمائیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا محمد میاں صاحب نے

کس بنیاد پر لکھ دیا کہ ”ہاتھی خرید کر دہلی بھیجنے کی اطلاع کچھ غلط نہیں تھی۔“

حقیقت معلوم کرنی چاہی مگر جب مقدر ہی برگشتہ تھا تو اس کی کوشش کس طرح اچھے نتائج پیدا کر سکتی تھی، خود قاضی عبدالرحیم کے بعض عزیزوں نے بے رخی اختیار کی اور کلکٹر سے مرعوب ہو کر کچھ ایسے جوابات دئے جن سے اس کے یقین میں جو تھوڑی بہت کمی تھی وہ بھی جاتی رہی اور قاضی عبدالرحیم اور ان کے رفقاء کو وقت کے قانون کے مطابق موت کی سزا دیدی گئی۔ یہ خبر وحشت اثر آنا فانا تھا نہ بھون جا پہنچی، قاضی عنایت علی اپنے عزیز بھائی کے اس مظلومی کے ساتھ مارے جانے کا حال سن کر متاع ہوش و حواس کھو بیٹھے اور جذبہ انتقام سے سرشار ہو کر انگریزوں سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اسپنکی کو اطلاع ملی تو وہ اپنے اس عاجلانہ اقدام پر بہت پشیمان ہوا، اس نے قاضی عنایت علی سے اپنے دلی تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہلوا لیا کہ :-

”یہ سب کچھ نادانستگی میں ہو گیا ہے، آپ صبر و شکیب کو کام میں لائیں اور کوئی کارروائی نہ کریں۔ ہم آپ کو مزید جائیداد عطا کریں گے اور تھانہ بھون کا مستقل نواب تسلیم کر لیں گے۔“

سنا ہے کہ بعض عزیزوں اور خیر خواہوں نے بھی قاضی عنایت علی کو سمجھایا، مگر وہ نہ مانے اور جذبہ انتقام سے ایسے مغلوب ہوئے کہ اپنے انجام پر قطعاً غور نہیں کیا۔ ان کے لئے اس وقت صبر کرنا مشکل بھی تھا، اس لئے کہ جس بھائی کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور جو بھائی ان کا صحیح معنوں میں دست و بازو تھا وہ ایک غلط فہمی کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہو گیا۔ یہ صدمہ ایسا جانکاہ تھا کہ اس کی وجہ سے قاضی صاحب جو کچھ کر گزرتے کم تھا، چنانچہ انہوں نے اسپنکی کی پیش کش اور عزیزوں کے مشورہ کو ٹھکرا دیا اور لڑائی کے منصوبے بنانے شروع کر دئے۔ یہ دیکھ کر قصبہ کے مقتدر حضرات نے جنگی مہمات کو ترتیب دینے کے لئے ایک مجلس مشاورت منعقد کی جس میں قرب و جوار کے قصبوں سے اس زمانہ کے تمام نامی گرامی علماء بلائے گئے۔ اراکین مجلس میں سے بعض کے نام یہ ہیں :-

حاجی امداد اللہ مہاجرکی، مولانا شیخ محمد، حافظ محمد ضامن علی شاہ، مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا منیر نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی اور مولانا محمد احسن نانوتوی۔ (۱)

(۱) ان ہی اکابر میں سے اکثر نے شالی کے معرکہ میں حصہ لیا تھا۔ حیرت ہے کہ سرسید احمد خان صاحب نے ان مقدس رجوہوں کے لئے مفسد کا لفظ استعمال کیا ہے۔

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں جو ہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اس مشورہ میں ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ جنگ کی جائے تو اس کو جہاد کہا جائے گا یا نہیں۔ حضرت مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کا اجتہاد یہ تھا کہ اس جنگ کو جہاد نہیں کہا جاسکتا، اس سلسلہ میں حضرت مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ کی ایک دلیل یہ تھی کہ:-

”جب قاضی عنایت علی عام جنگ کے دوران خاموش رہے اور حاضرین مجلس میں سے بھی اس وقت کسی نے اس کو جہاد سمجھ کر اس میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جبکہ انتقام کا جذبہ کارفرما ہے اس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جاسکتا ہے۔“

مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ کا اجتہاد صحیح تھا یا غلط اس کا علم تو خدا کو ہے تاہم ایک معتبر ذریعہ سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی رحمہ اللہ کی یہ رائے معلوم ہوئی۔

”نیت کا حال تو خدا ہی جانتا ہے، بظاہر تو اسکو جہاد کا درجہ نہیں دیا جاسکتا“

حکیم الامت کے اس فتویٰ سے حضرت مولانا پر سے یہ اعتراض خود بخود ہٹ جاتا ہے کہ ”آپ نے اپنے غلط اجتہاد کی بنا پر اس کو جہاد کہنے سے انکار کر دیا تھا“ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی رائے سراسر حقانیت پر مبنی تھی ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کو اپنے ماموں زاد بھائی اور برادر نسبتی قاضی عبدالرحیم کے پھانسی پا جانے کا اتنا بھی صدمہ نہیں تھا جتنا حضرت مولانا قاسم رحمہ اللہ کو تھا۔ سچ پوچھئے تو حضرت مولانا رحمہ اللہ کا یہ ذاتی معاملہ تھا، لیکن چونکہ آپ اپنے زمانہ کے ایک بڑے عالم تھے اور علمائے حق کے لئے شریعت کے مقابلہ میں ذاتی معاملات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اس لئے آپ نے جو بات حق سمجھی اس کو ظاہر کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

بہر حال حضرت مولانا کا یہ اپنا ہی اجتہاد تھا جس کو مجلس شوریٰ کے دیگر اراکین نے تسلیم نہیں کیا اور متفقہ طور پر انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمہ اللہ کے دست حق پرست پر جہاد کی بیعت کی گئی۔ اسی وقت سے انگریزی حکومت کے ختم ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا اور قصبہ میں شرعی حکومت قائم ہو گئی۔ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ اس کے امیر مقرر ہوئے۔ (۱)

(۱) مولانا عاشق الہی مرحوم نے مصلحت وقت کے پیش نظر واقعات اس انداز سے بیان کئے ہیں کہ ان کی تحریر بہت پیچیدہ ہو گئی ہے۔ اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ شرعی حکومت کا نفاذ کس وقت سے ہوا۔ مولانا محمد میاں صاحب محض قیاس کی بناء پر تحریر فرماتے ہیں کہ دہلی میں لڑائی شروع ہونے کے کچھ بعد ہی شرعی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ لیکن قرین صواب یہی روایت ہے کہ اس حکومت کا قیام مجلس شوریٰ کے بعد عمل میں آیا۔

جہاد کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ قاضی عنایت علی نے اپنے چند آدمیوں کی ہمراہی میں انگریزوں کے وہ اسلحہ اور کار توں جو بہنگیوں میں سہارنپور سے کیرانہ لے جائے جا رہے تھے چھین لئے۔ انگریز افسر جو ساتھ تھے مقابلہ میں آکر مارے گئے۔ سہارنپور اور مظفرنگر کے حکام کو اس سانحہ کی اطلاع ملی تو وہ بدلہ لینے کے لئے موقعہ کے منتظر رہے۔

اس وقت شامی تجارتی منڈی ہونے کے اعتبار سے نیز بعض اور وجوہ سے ایک اہم جگہ سمجھی جاتی تھی۔ وہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ مہر سنگھ اس قصبہ کا بڑا زمیندار اور ذی اثر رئیس تھا۔ ابراہیم خاں سب کلکٹر (تحصیلدار) سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ چنانچہ اس نے شاہ دہلی سے نامہ و پیام شروع کیا۔ انگریز حکام کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے حفاظتی تدابیر اختیار کیں۔ گرانٹ (۱) پہلے سے کچھ سواروں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اوائل ستمبر میں حاکم ضلع آر۔ ایم۔ ایڈورڈس نے کچھ پیدل فوج اور دو توپیں اس کی مدد کے لئے بھیج دیں۔ اس کے بعد ایڈورڈس خود بھی پہنچ گیا لیکن ۱۴ ستمبر کو وہ فرسٹ پنجاب کیولری کے تقریباً ۱۰۰ ہتھیار بند آدمی سب کلکٹر ابراہیم خاں کی مدد کے لئے چھوڑ کر بڈھانہ کے قلعہ کی طرف چلا گیا اور اس پر آسانی سے قابض ہو گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں مجاہدین تھانہ بھون یلغار کر کے شامی پہنچ گئے اور تحصیل پر جو ایک مستحکم قلعہ کی حیثیت رکھتی تھی حملہ آور ہوئے۔ یہ معرکہ نہایت سخت تھا لیکن مجاہدین نے دلیری و جرأت سے کام لے کر تحصیل کا پھانک توڑ دیا اور اندر گھس گئے۔ محصورین ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے۔

”انگریز و قانع نگار ہنری جارج کین کا بیان ہے کہ :-

”لڑائی تمام دن جاری رہی لیکن چونکہ حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی اور کچھ خانہ بدوش بھی ان کی طرف آئے تھے اس لئے ان کا پلہ بھاری رہا۔ انہوں نے بہت سی عمارتوں کے چھپروں میں جو احاطہ کی دیوار سے باہر نکلے ہوئے تھے

(۱) سی گرانٹ مظفرنگر کا جائنٹ مجسٹریٹ تھا، اس نے جنگ آزادی کے بعد ابراہیم خاں کے بیٹے کی درخواست پر اس کو ایک سرٹیفکیٹ دیا تھا جس میں ابراہیم خاں کی خدمات کو سراہا تھا اور اس کی وفاداری کی تعریف کی تھی اسی سرٹیفکیٹ میں گرانٹ لکھتا ہے :-

”خصوصاً شروع اس غدر سے ہم شامی کو تشریف لے گئے تھے اور دو روز ماہ جون

اور بارہ روز ماہ جولائی اور چودہ روز ماہ ستمبر ہم وہاں مقیم رہے۔۔۔۔۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماہ ستمبر میں بھی ۱۴ روز تک گرانٹ کا قیام شامی میں رہا مگر مجاہدین کے حملہ کے وقت وہ یقیناً وہاں موجود نہیں تھا، کیونکہ نہ اس نے خود اپنی موجودگی کا اظہار کیا ہے اور نہ سر سید نے اس کے متعلق کچھ لکھا ہے۔

آگ لگا دی۔ محصورین میں سے ۱۱۳ آدمی مارے گئے جن میں ابراہیم خاں سب کلکٹری بھی تھا۔“

علمائے ہند کے شاندار ماضی میں تحریر ہے کہ :-

”لڑائی تین دن تک جاری رہی، جس میں مجاہدین کا بہت نقصان ہوا، تیسرے دن حضرت حافظ ضامن علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے سرفروشی کو کام میں لا کر تحصیل کا دروازہ توڑ دیا اور خود انگریزی فوج کی گولی سے شہید ہو گئے۔“

سر سید مرحوم اس جنگ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں :-

”ستمبر ۱۸۵۷ء میں دفعتاً مسلمانان ساکنان تھانہ بھون نے جس کا افسر قاضی عنایت علی تھا فساد برپا کر دیا اور ایک بڑے گروہ نے تحصیل شاملی پر حملہ کیا۔ اس وقت تحصیل شاملی میں تخمیناً دس سو اور پنجابی رسالہ کے اور اٹھائیس سپاہی جیل خانہ کے اور پچاس سے زائد سپاہی متعینہ تھانہ اور تحصیل کے باقی آدمی اس افسر کے خاندان کے مع اکبر خاں اس کے بھائی کے جو رامپور سے گئے تھے اور وہاں موجود تھے۔ یہ افسر بہ کمال دلاوری و بہادری بمقابلہ پیش آیا، اور تحصیل شاملی کو مستحکم کرا کر اور اس میں محصور ہو کر بخوبی لڑا اور ہر دفعہ مفسدوں کے حملہ کنال کو ہٹا دیا اور بہت سے آدمی ان میں سے مارے گئے۔ آخر کو گولی و بارود تحصیل میں ختم ہو چکی اور نہایت مجبوری کا وقت آیا اور مفسدوں کو قابو ہو گیا اور وہ لوگ تحصیل کے قریب آ گئے، وہاں بھی مقابلہ ہوا اور یہ افسر نہایت بہادری سے مع اکثر آدمیوں اپنے خاندان کے کام آیا اور شرط نمک حلالی کو پورا کیا۔ یہ قتل و خونریزی شاملی میں ۱۴ ستمبر کو واقع ہوئی، جو دن کہ فتح دہلی کا تھا مگر نہایت افسوس ہے کہ اس افسر کے کان تک مرثدہ فتح دہلی جس کا وہ ہردم مشتاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا۔ اس ہنگامہ میں ۱۱۳ آدمی جن میں سو سے زیادہ مسلمان تھے کام آئے اور ہر ایک تمغہ خیر خواہی سرکار کا اپنے نام کے ساتھ لے گیا۔ یہ ہنگامہ جو تحصیل شاملی میں تھانہ بھون کے مفسدوں کے ساتھ ہوا وہ ہنگامہ ہے جس کا مفسدان تھانہ بھون نے جہاد نام رکھا تھا۔ مگر ان تمام حالات کو دیکھنے سے واضح ہو گا کہ جو لوگ ان مفسدوں کے

مقابلہ میں آئے اور دو بدو ہو کر لڑے اور بہتوں کو جان سے مارا اور مرتے دم تک مقابلہ و مقاتلہ سے باز نہ رہے وہ بھی مسلمان تھے اور نیک بخت اور اپنے مذہب کے پکے (۱)۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مفسدوں نے صرف فساد مچانے اور غلغلہ ڈالنے اور ہنگامہ کرنے کو اپنے فسادوں کو جھوٹا جہاد کے نام سے مشہور کیا تھا.....“

غرض شاملی کی فتح نے وقتی طور پر انگریزی حکومت کو دبے پر مجبور کر دیا۔

مجاہدین اس نمایاں کامیابی کے بعد تھانہ بھون لوٹ آئے اور حضرت حافظ ضامن شہید کے جسد مبارک کو لا کر آسودہ خاک کیا۔ آپ کا مزار پر انوار شہر سے ریلوے اسٹیشن جاتے ہوئے بیرون کے باغات کے درمیان واقع ہے۔ چار دیواری چھوٹی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ آج بھی خاک و خشت کے اس انبار سے طرح طرح کی کرا متوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ شاملی کی شکست نے انگریزوں کو بے انتہا مشتعل کر دیا۔ ایڈورڈس بڈھانا کے قلعہ کو فتح کر کے لوٹا تو اس کی فوج میں دو توپوں اور ۱۰۰ اسکھ سپاہیوں کا اضافہ ہو گیا تھا، وہ سمجھ رہا تھا کہ میرے شاملی پہنچنے سے وہاں کی فوج کو تقویت ہوگی، لیکن راستہ ہی میں تھا کہ اسے تحصیل پر مجاہدین کے قبضہ کی اطلاع ملی اس نے اس تاراجی کا بدلہ لینے کے لئے اسی وقت تھانہ بھون پر حملہ کرنا چاہا، لیکن یہ معلوم کر کے کہ مظفرنگر کی حالت زیادہ تشویشناک ہے وہ تھانہ بھون کو چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہو گیا۔

۱۲ ستمبر ۱۸۵۷ء ۱۲ھ کو انگریزوں کا دہلی پر مکمل قبضہ ہو گیا تھا، ادھر ایڈورڈس نے مظفرنگر پہنچ کر وہاں کے حالات درست کئے۔ جب ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو پھر تھانہ

(۱) اگر وہ نیک بخت اور اپنے مذہب کے پکے ہوتے تو انگریز کی خیر خواہی میں ان کے خلاف سینہ سپر نہ ہوتے۔ مجاہدین کا مقابلہ انگریز سے تھانہ کہ ابراہیم خاں یا اس کے رفقاء سے۔ اب یہ گورے لوگ خود اس حملہ کا جواب دینے کے لئے میدان میں نکل آئے تو اس میں مجاہدین کا کیا قصور تھا۔ ابراہیم خاں اور اس کے رفقاء میں اگر دین کا پاس و لحاظ تھا تو ان کو چاہئے تھا کہ میدان سے ہٹ جاتے مگر بقول گرانٹ :-

”جب گروہ باغیوں کا جس میں غازی دار انگریز غیرہ قصبہ جات کے کثرت سے تھے سرداری قاضی عنایت علی خاں کے تحصیل پر چڑھ آئے اور محمدی جھنڈا کھڑا کیا۔ باوجود اس کے تحصیلدار نے ان کا مقابلہ کیا۔۔۔۔۔“

ایسی صورت میں اگر مجاہدین جنگ سے دستبردار ہو جاتے تو حصول مقصد کے لئے اور کیا صورت اختیار کرتے، درحقیقت ابراہیم خاں اور اس کے ساتھیوں کے اسلام کا حوالہ دے کر لوگوں کو مغالطہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ورنہ ابراہیم خاں کا جذبہ ایمانی تو سرسید کے اسی فقرہ سے جھلک رہا ہے ”مگر نہایت افسوس ہے کہ اس افسر کے کان تک مژدہ فتح دہلی جس کا وہ ہر دم مشتاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا۔“

بھون کی جانب توجہ کی۔ ان ہی ایام میں کمشنر میرٹھ اور کلکٹر سہارنپور (رابرٹ اسپنکی) کے پاس سے کمک آگئی اور کمشنر مذکور کا اشارہ پا کر ایڈورڈس نے تھانہ بھون کی طرف کوچ کی طرف کر دیا۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس کے ساتھ کل کتنی فوج تھی۔ اتنا ضرور معلوم کے درس میں کچھ سکھ پیدل اور سوار۔ کچھ گورکھے اور دو توپیں تھیں۔ اس فوج کیساتھ دو سول افسر بھی تھے ایک سوٹسٹن میلوں اور دوسرا ملکم لوموخر الذکر کو رابرٹ اسپنکی نے آخری امدادی فوج کے ساتھ بھیجا تھا۔

ایڈورڈس نے دن اور تاریخی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن گمان غالب ہے کہ یہ حملہ ۱۶ ستمبر کے بعد ہوا تھا۔

کپتان اسمتھ اور لفٹنٹ کونیلر کی ماتحتی میں سکھوں اور گورکھوں کی ایک جمعیت نے حملہ کیا اور آبادی سے باہر کی چند عمارتوں پر قبضہ کر لیا۔ کچھ فوج شہر میں داخل ہو گئی، لیکن مجاہدین نے یہ حملہ بری طرح پسپا کر دیا۔ انگریزی فوج کے ۱۷ آدمی مارے گئے اور ۲۵ زخمی ہوئے جن میں دو افسر تھے۔ پسپائی کے وقت میلوں اور لوہے بڑی سمجھ داری سے کام لیا اور وہ اپنی فوج کو تباہی سے بچا کر نکال لے گئے۔ حالانکہ خود لو ایک معرکہ میں زخمی ہو گیا۔ اس کے زخمی ہونے کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی فوج کو لئے ہوئے ایک گاؤں کی تنگ گلیوں سے گزر رہا تھا تو ایک جتھے نے اس کو گھیر لیا، دست بدست لڑائی ہوئی جس میں اس کے تلوار کے تین نہایت گہرے زخم آئے۔

اس شکست نے انگریزوں میں کافی کھلبلی ڈال دی، کمشنر، اسپنکی کو اور اسپنکی فوجی افسروں اور کلکٹر مظفرنگر ایڈورڈس کو متہم گردانے لگے لیکن کین کی رائے ہے کہ اس سانحہ کی پوری ذمہ داری درحقیقت کمشنر پر عاید ہوتی ہے، اس لئے کہ اسی نے تھوڑی سی فوج بھیج کر ایڈورڈس کو یہ نادر شاہی حکم دیا تھا کہ :-
”فوراً بڑھو اور مفسدوں کا سر چل دو۔“

مگر جب دوبارہ غور کرنے پر اسے محسوس ہوا کہ یہ احکامات قبل از وقت نافذ کر دئے گئے ہیں تو اس نے حملہ کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دینا چاہا، لیکن کامیاب نہ ہو سکا، اس کے پہلے حکم کے مطابق حملہ کیا جا چکا تھا اور پسپا بھی ہو گیا تھا۔ بہر حال اس شکست کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مزید کمک آگئی اور ستمبر کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے انگریزی فوج نے بغیر کسی مزاحمت

کے تھانہ بھون پر قبضہ کر لیا۔ (۱) مجاہدین اپنے گھروں کو چھوڑ کر مختلف شہروں اور قصبوں کی طرف چلے گئے۔

قبضہ مکمل ہو جانے کے بعد انگریزی فوج نے تھانہ بھون کو جس بری طرح تباہ و برباد کیا اس کی صحیح تصویر مولانا عاشق الہی کے بیان میں ملاحظہ فرمائیں۔

”صبح صادق نمودار ہوئی تو بلائے بے درماں ساتھ لائی تھانہ بھون کو انگریزی فوج نے گھیر لیا اور مشرقی سمت سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ دن ہوا تو فوج قصبہ میں داخل ہوئی۔ قتل و قتال اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ رات کی تاریکی چھانے سے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے مسمار کر دیئے گئے۔ اور مکانات پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ حاکم ضلع کا وہ قول صحیح ہوا کہ اسی طرح تھانہ بھون کو مسمار کر کر چھوڑوں گا۔“

وفاداران سرکاری کو دل کھول کر انعامات سے نوازا گیا اور جن کو باغی سمجھا گیا ان کو سخت سزائیں دی گئیں۔

دیگر مجاہدین کی طرح قاضی عنایت علی نے بھی اپنے وطن کو خیر باد کہا اور نجیب آباد کی طرف چلے گئے۔ وہاں نواب محمود خاں کے ساتھ مل کئی مہینہ تک انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔

(۱) یہ واقعات کین کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ دوسرے ذرائع کو چھوڑ کر ہم نے ایک انگریز کے تحریر کردہ واقعات کو کتاب کے متن میں اس لئے شامل کرنا مناسب سمجھا کہ قارئین دیکھ لیں کہ مصنف کے تعصب کے باوجود مجاہدین کے جوش اور ان کے عظیم کارناموں کی ایک ہلکی سی جھلک اس کے بیان میں بھی موجود ہے۔

تین کا بیان اس معاملہ میں مولانا محمد میاں کے بیان کے مطابق ہے یہ دونوں مصنف حملوں کی تعداد بتاتے ہیں۔ قاضی محمد مکرم صاحب مانٹل کے بیان کے مطابق قصبہ پر کل چار حملے ہوئے۔

پہلے حملے میں ایک ہزار سپاہی اور چھ توپیں تھیں۔ جلال آباد اور تھانہ بھون کے راستہ پر مجاہدین نے اس فوج کا مقابلہ کیا اور اسے پسپا کر دیا۔

دوسرا حملہ دو ہزار فوج سے ہوا اس میں بھی چھ توپیں تھیں، مجاہدین نے بہادری سے مقابلہ کر کے اس حملہ کو بھی ناکام بنا دیا۔ توپوں سے محض دو گولے چلنے کی نوبت آئی تھی کہ مجاہدین نے ان کو ہٹا کر دیا انگریزی فوج اس مرتبہ بھی ہزیمت خوردہ واپس ہو گئی۔ تیسرا حملہ زیادہ سخت تھا۔ اس مرتبہ انگریزی فوج کی تعداد چھ ہزار تھی اور پورا توپ خانہ مع گولہ بارود ساتھ تھا۔ یہ فوج بڑھتی ہوئی حوض والی مسجد تک جہاں مولانا شیخ محمد کا مکان تھا پہنچ گئی، لیکن قاضی عنایت علی نے نہایت بہادری سے اس کا مقابلہ کیا اور اس دفعہ بھی انگریزوں کو پسپا ہونا پڑا۔ مجاہدین نے ان کا تعاقب جلال آباد سے بھی آگے تک کیا پھر لوٹ آئے۔

جب تیسرا حملہ بھی پسپا ہو گیا تو انگریزوں نے جھلا کر بارہ ہزار اور ایک راویت کے بموجب چوبیس ہزار سپاہ اور توپ خانہ کے ساتھ چوتھی مرتبہ حملہ کیا مجاہدین اس کو نہ روک سکے اور میدان کو چھوڑ دینے پر مجبور ہوئے جس کو جہاں موقع ملا چلا گیا۔

سرسید نے اپنی تصنیف سرکشی ضلع بجنور میں لکھا ہے کہ :-

”پرتاپ سنگھ کے گڑھ ملکٹیشور چلے جانے کے بعد (۱) جنرل محمود (۲) خاں چودھریوں کی جانب سے مطمئن ہو گیا۔ گنگاپار کے جو باغی تھے انہوں نے بھی اپنے لئے بجنور سے زیادہ کوئی مامن نہ دیکھا۔ چنانچہ دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوبر اور رضا حسن عرف چھٹن اور عنایت علی قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع میں آئے۔ اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا..... قاضی عنایت علی اور دلیل سنگھ گوبر اور حسن رضا عرف چھٹن دو ضرب توپ اور دو ہزار آدمی کی جمعیت سے میراں پور اتر آئے اور میراں پور کے تھانہ کو لوٹ لیا (۳) اور کئی آدمیوں کو قتل کیا اور محمود خاں کے نام کی مناد دی پٹوائی اور پھر بھاگ آئے۔“

اس کے بعد جب احمد اللہ خاں کو انتظام حکومت سپرد ہو گیا تو انہوں نے انگریزی افواج کے روکنے کے لئے مختلف مقامات پر اپنی فوجیں متعین کر دیں دارانگر میں ماڑے خاں، قاضی عنایت علی اور دلیل سنگھ کو تعینات کیا گیا ان تینوں کے زیر کمان ۴۵۰۰ پیادہ اور ۶۹۸ سوار فوج تھی۔ یہ انتظامات ماہ مارچ ۱۸۵۸ میں کئے گئے تھے۔

انگریزی افواج مختلف مورچوں پر لڑتی اور ان کو سرکرتی نجیب آباد میں داخل ہو گئیں۔ ماڑے خاں خبر پاتے ہی دارانگر سے مع اپنی افواج نگینہ آگیا اور نگینہ کے باغوں میں مورچے قائم کئے اور احمد اللہ خاں کو بلانے کے لئے سوار بھیجے اور چٹنی فوج کہ متفرق ہو گئی تھی اور جتنے باغی فرار ہو گئے تھے سب کو بلا کر جمع کیا۔ چنانچہ سب باغی یعنی ماڑے خاں، قاضی عنایت علی، دلیل سنگھ گوبر، احمد اللہ خاں، شفیع اللہ خاں، حبیب اللہ خاں، کلن خاں اور نھو خاں متعین افضل گڑھ کل اپنی جمعیت اور توپوں کو لے کر بمقام نگینہ جمع ہو گئے۔ مگر محمود خاں نگینہ نہیں آیا بلکہ

(۱) یہ واقعہ اوائل نومبر کا ہے۔

(۲) سرکشی ضلع بجنور میں اس مجاہد کے نام کو ہر جگہ نام محمود لکھا گیا ہے۔ ہم نے اپنے قومی رہنما سرسید علیہ الرحمۃ کی روح پر فتوح سے معذرت کے ساتھ نام محمود کو محمود کر دیا ہے۔

(۳) زمانہ کا انقلاب ہے کہ جن لوگوں کو ہمارے قومی رہنما اور مصلحین مفسد اور لیرے لکھ گئے ہیں ان ہی کو آج ہم مجاہدین اور مجاہدانہ کے معزز القاب سے یاد کر رہے ہیں

سیوہارہ میں جا کر مع ایک ضرب توپ اور کچھ سواروں کے مقیم تھا۔
نگینہ کی لڑائی ۲۱ اپریل ۱۸۵۸ء کو ہوئی۔ مجاہدین پسپا ہو کر شہزادہ فیروز کے پاس مراد آباد چلے گئے۔

قاضی عنایت علی بھی شہزادہ فیروز کی فوج میں شامل ہوئے یا نہیں اس کا حال ”سرکشی ضلع بجنور“ سے معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ زبانی روایتوں سے پتہ چلا ہے کہ وہ شہزادہ کے ساتھ مل کر بھی کچھ عرصہ تک انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے، لیکن جب شہزادہ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلا گیا تو قاضی صاحب مایوس ہو کر بھوپال کی طرف جہاں ان کے بعض اعزاتھے روانہ ہو گئے، بھوپال پہنچ کر نواب سکندر جہاں (۱) بیگم کی ملازمت میں منسلک ہو گئے، تقریباً چھ ماہ رہنے پائے تھے کہ وہاں کے پولیٹیکل افسروان کی موجودگی کا علم ہو گیا اس لئے وہ بھوپال چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

بھوپال سے چل کر آگرہ آئے۔ اس زمانہ میں ہائی کورٹ آگرہ میں تھی وہ نام بدل کر ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں عوام اور حکام پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھادیا، لیکن بد قسمتی نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا ایک سال بعد جج کو معلوم ہو گیا کہ یہ تھانہ بھون کے قاضی عنایت علی خاں ہیں۔ وہ بھلا آدمی تھا اور قاضی صاحب کی قابلیت سے کافی متاثر ہو چکا تھا اس لئے اس نے ان کو پہلے ہی خطرہ سے آگاہ کر دیا اور رائے دی کہ :-
”آگرہ سے کسی اور جگہ چلے جاؤ۔“

انہوں نے الور کا رخ کیا، راستہ میں مرض ضیق النفس لاحق ہو گیا، تاہم وہ الور پہنچ کر مہاراجہ کی ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ سنا ہے کہ مہاراجہ الور نے انہیں اپنا محافظ خاص مقرر کر لیا تھا۔

الور ہی کے دوران قیام میں ایک مرتبہ پوشیدہ طور پر تھانہ بھون آئے اور تین روز قیام کر کے واپس چلے گئے، الور میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں (۲) انتقال کے موقع پر مولانا شیخ محمد ﷺ کے بہنوئی حکیم شیخ احمد ریاست میں حاکم ضلع تھے، انہوں نے خفیہ طور پر تجہیز و تکفین کا

(۱) علمائے ہند کا شاندار ماضی میں حکمران بیگم کا نام قدسیہ بیگم تحریر ہے جو یقیناً غلط ہے اس لئے کہ اس زمانہ میں بھوپال کی مسند پر سکندر جہاں بیگم رونق افروز تھیں، ان کا عہد ۱۸۴۲ء تا ۱۸۶۰ء اور ۲۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء تا ۱۸۸۵ء ہے۔
(۲) ”علماء ہند کا شاندار ماضی“ میں ان کا سنہ وفات ۱۹۱۰ء تحریر ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

انتظام کیا۔ رات ہی میں چند آدمیوں نے نماز جنازہ ادا کی اور تاریکی شب میں دفنانے کیلئے لے چلے۔ اتفاق سے قبر مکمل ہونے میں دیر ہو گئی، اسی میں دن نکل آیا مسلمان سپاہیوں پر مشتمل کئی فوجی دستے ادھر سے گزرے اور انہوں نے یکے بعد دیگرے نماز جنازہ ادا کی۔ پھر کچھ میواتی آئے انہوں نے جنازے کی نماز پڑھی اور قبر تیار ہونے پر جسد خاکی کو آسودہ خاک کر دیا گیا۔ غرض جس شخص کی زندگی زیادہ تر ناکامیوں سے دوچار رہی تھی اس کا یہ شاندار انجام ہوا۔

روپوشی کا زمانہ

حضرت مولانا شیخ محمد ﷺ نے اس جہاد میں کس قدر حصہ لیا اس کے متعلق نہ کوئی زبانی راویت ملی اور نہ تحریری شہادت (۱) تاہم قصبہ پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا تو اوروں کے ساتھ آپ کو بھی نکلنا پڑا۔ رام پور منیہار ان میں آپ کے کچھ رشتہ دار تھے وہیں دو تین سال تک روپوشی کی زندگی گزارتے رہے، آپ کا قیام اس حویلی میں تھا جو محل کے نام سے مشہور ہے اور بقول آپ کے ”وہ مکان اصل میں شیخ سالار صاحب چشتی ﷺ کا تھا۔“

رام پور میں آپ ۱۲۷۷ھ تا ۱۸۶۱ء تک مقیم رہے، وہاں سے کئی مرتبہ میرٹھ بھی جانا ہوا، لیکن غالباً گرفتاری کے ڈر سے ایک دفعہ بھی تھانہ بھون نہیں آئے، حضرت مولانا ﷺ نے تھانہ بھون سے جدائی کے ان ایام کو دور جلاوطنی سے تعبیر کیا ہے (۲) لیکن جلاوطنی اور روپوشی کا یہ زمانہ علمی مشاغل کے لئے نہایت سازگار رہا۔ ان ہی ایام میں آپ نے مثنوی معنوی دفتر ہفتم مکمل کیا، اور اسی زمانہ میں حزب البحر کی شرح لکھی۔ ایک اور تصنیف ارشاد محمدی بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ اس کو آپ نے مولوی فدا علی اور منشی محراب علی انوپ شہری کے ایما پر مرتب فرمایا۔

ٹونک میں قیام

۱۲۷۸ھ تا ۱۸۶۱ء میں نواب وزیر الدولہ کے بلانے پر ریاست ٹونک تشریف لے گئے۔ اور

(۱) نسیم احمد فریدی امروہی، حکیم محمد عمر کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ آپ نے معرکہ شمالی میں حصہ نہیں لیا، اس تحریر سے بھی یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ جب انگریزوں کے حملے تھانہ بھون پر ہوئے اس وقت آپ مدافعت کے ساتھ شریک رہے یا نہیں۔

(۲) حضرت مولانا نے اس امر کا اظہار ۱۲۷۷ھ میں شرح حزب البحر کی آخری سطور میں کیا ہے۔

وہاں نواب محمد علی کے جو اس وقت ولی عہد تھے استاد مقرر ہوئے۔

ٹونک میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کئی سال مقیم رہے، آپ کے دوران قیام میں نواب وزیر الدولہ کا انتقال ہوا، ان کی جگہ نواب محمد علی مسند نشین ہوئے۔

جب تک آپ ٹونک میں مقیم رہے نواب وزیر الدولہ اور ان کے بعد نواب محمد علی نے آپ کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ مہمان رکھا، سو روپے ماہانہ وظیفہ ملتا رہا، قیام ٹونک کے دوران ایک دلچسپ اور عبرت آموز واقعہ پیش آیا جو جزئی اختلاف کے ساتھ کئی طرح بیان کیا جاتا ہے، سب سے زیادہ معتبر و مستند روایت یہ ہے۔

”ایک ہندو راجہ نواب صاحب ٹونک کا دوست تھا، وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کرتا رہتا تھا، مذہب اسلام کو اچھی طرح جانچنے کے بعد وہ اس کی حقانیت کا قائل تو ہو گیا لیکن ایک وسوسہ اس کے دل میں ایسا قائم ہوا کہ اس کی وجہ سے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے ہچکچاتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ قرآن مجید واقعی خدا کا کلام ہے تو اس کا اثر پڑھنے اور سننے والوں پر ہونا چاہئے، لیکن مسلمان رات دن اس کا ورد کرتے ہیں پھر بھی ان پر رنج و خوشی اور عید و نوید کی آیتوں کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا، ایسی صورت میں اس کو الہامی کتاب کیسے کہا جاسکتا ہے۔“

ایک مرتبہ نواب صاحب کے سامنے بھی اس نے اپنے اس وسوسہ کا اظہار کیا، نواب صاحب نے اس کو حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا آپ نے اس بات کا اس وقت کوئی جواب نہیں دیا اور اس راجہ سے جمعہ کے روز نہادھو کر اور پاک و صاف کپڑے پہن کر آنے کو کہا، آپ کے ارشاد کے بموجب جب وہ راجہ جمعہ کے دن حاضر خدمت ہوا، آپ نے اس کو سامنے بٹھا کر سورۃ بقرہ کی تلاوت فرمائی جس کو سن کر وہ لوٹے اور تڑپنے لگا، جب آپ تلاوت سے فارغ ہوئے تو وہ دوڑ کر آپ کے قدموں پر گر پڑا اور فوراً مسلمان ہو گیا، اس کے استفسار پر آپ نے فرمایا کہ:

قرآن مجید یقیناً کلام اللہ ہے، لیکن یہ ان ہی لوگوں کے دلوں پر اثر کرتا

ہے جن میں تقویٰ و طہارت ہے، فی زمانہ مسلمانوں کے قلوب دنیوی
آلائش سے ایسے ملوث ہو گئے ہیں کہ نور ہدایت کی کرنیں ان میں نفوذ
نہیں کر سکتیں۔“

ٹونک سے واپسی

حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۸۲ھ کے آخر یا ۱۲۸۳ھ (۱) کے شروع میں ٹونک سے
تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ ٹونک کے دوران قیام میں آپ کے پاس گورنمنٹ ہند نے
محال باغیان قصبہ تھانہ بھون کے نیلام کا اشتہار بھیجا تھا۔ نیلام کی زد میں آپ کی اپنی جائیداد
بھی آگئی تھی۔

حضرت مولانا نے وطن واپس آکر گھیر کا وہ محل جس میں قاضی عنایت علی کا قیام تھا اور
کچھ صحرائی جائیداد انیس ہزار روپے میں خرید لی اور زر چہارم خزانہ میں داخل کر دیا، لیکن کلکٹر
نے دوسرے دن قیمت میں تھوڑا سا اضافہ کر کے وہ پوری جائیداد ایک بنے کودے دی۔ آپ
نے مقدمہ لڑا اس میں جیت گئے۔ روپیہ کی ادائیگی میرٹھ کے ایک مہاجن سے قرض لے
کر کی گئی پھر اس مہاجن کا قرضہ نواب محمود علی صاحب رئیس چھتاری سے قرض حسنہ لے کر
اور جائیداد کو ان کے پاس مکفول کر کے ادا کر دیا۔ لیکن نواب صاحب کے کارندوں کی
سازشوں سے معاملات بگڑ گئے۔ انہوں نے فرشتہ صفت نواب کو کچھ غلط باتیں بتا کر
حضرت مولانا سے بدظن کر دیا۔ نواب صاحب نے تین چوتھائی جائیداد نیلام کر اکر خود
خرید لی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا، آخر کار نواب صاحب کی فطری
نیکی غالب آئی، انہوں نے حضرت مولانا کو چھتاری بلا کر اپنی تقصیر کی معافی چاہی اور تمام
جائیداد واپس کر دی لیکن عدالتی کارروائی کی تکمیل حضرت مولانا کے وصال کے بعد ہوئی۔

اس مقدمہ کے دوران دو مرتبہ آپ کو چھتاری جانا پڑا۔ دوسرے سفر میں آپ بیمار
ہو گئے اور یہی بیماری مرض الوفات ثابت ہوئی۔

یہ مقدمہ حضرت مولانا کے لئے طرح طرح کی آزمائشوں کی کسوٹی بن گیا، آپ ان

(۱) مولانا نسیم احمد فریدی امرہ ہوی نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ ۱۲۸۰ھ میں ٹونک سے تھانہ بھون تشریف لے آئے تھے، لیکن

اس سنہ کی صحت پر اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کے دو صاحبزادے ۱۲۸۲ھ میں ٹونک میں پیدا ہوئے تھے اور اس

آزمائشوں میں ثابت قدم رہے، نہ آپ نے روپے پیسے کی پروا کی نہ مال و املاک کے جانے کا غم کیا اور نہ خوشامد در آمد سے کبھی اپنا کام نکالنے کی کوشش کی۔ (۱)

آخری ایام، مرض الوفات اور وصال

حضرت مولانا رحمہ اللہ کے آخری ایام میں جائیداد کا قضیہ برابر چلتا رہا۔ لیکن اس کی وجہ سے آپ کے دیگر مشاغل میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی درحقیقت مقدمہ میں آپ نے عملی طور پر بہت کم حصہ لیا۔ زیادہ تر کام آپ کے مریدین ہی نے انجام دیا۔ بعض اوقات تو آپ کو محض دستخط ہی کرنے پڑے باقی کارروائی مریدین نے خود ہی پوری کر دی، اس پر بھی کئی بار آپ نے فرمایا:-

”میاں! کہاں کا قصہ ہے دور بھی کرو“

لیکن وہ خیر خواہ آخر وقت تک اس معاملہ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوئے بہر کیف حضرت مولانا رحمہ اللہ تمام نتائج و عواقب کی پروا کئے بغیر تصنیف و تالیف ذکر و فکر اور مجاہدہ و مکاشفے میں مشغول رہے۔ کئی مرتبہ مختلف مقامات کا سفر بھی کیا۔ نواب محمد علی ٹونک معزول کر کے بنارس بھیج دئے گئے تو وہاں ان سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے بارہا میرٹھ گئے۔ حیدرآباد سے بھی بعض معتقد عمائد نے آپ کو بلایا لیکن اس لئے تشریف نہیں لے گئے کہ وہاں کے بعض علماء حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کو برا کہتے تھے۔

آپ کے آخری دور کی تصنیفات ”انوار محمدی“ اور حاشیہ برسنن نسائی ہیں، سب سے آخری تحریر ایک استفتاء کا جواب تھا جو ”سماع موتی“ کی تحقیق کے بارے میں آپ نے حکیم محمد عمر سے لکھوا کر بھجولیا تھا۔

نسائی پر حاشیہ لکھنے سے پہلے ہی آپ کی طبیعت علیل ہو گئی تھی۔ رجب ۱۲۹۵ھ میں لرزہ اور بخار آنے لگا تھا، حکیم محمد عمر صاحب نے علاج کیا، افاقہ ہو گیا مگر مرض کا پوری طرح ازالہ نہیں ہوا۔ اسی حالت میں آپ نے رمضان شریف میں قرآن شریف سنایا، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ آئندہ سال ماہ صیام تک حیات مفہوم نہیں۔ حکیم صاحب نے جب فرمایا:-

”نہیں حضرت کمزوری ہے انشاء اللہ رفع ہو جائے گی“

تو آپ ہنس کر خاموش ہو گئے۔

طبیعت ذرا سنبھلی تو نہایت تیزی سے نسائی کا حاشیہ لکھا اور اسے بہت جلد مکمل کر دیا۔ پھر چرتھاول ہوتے ہوئے چھتاری تشریف لے گئے وہیں مرض الوفا لاحق ہو گیا۔ خدام نے وہاں سے لا کر چار روز میرٹھ میں رکھا۔ اور علاج کیا۔ جب افاقہ نہ ہوا تو تھانہ بھون لے آئے۔ علاج ہوتا اور مرض بڑھتا رہا۔ آخر شش ماہ و وقت آن پہنچا جس سے کسی ذی حیات کو مفر نہیں۔ ۷ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۷۹ء بروز منگل قمری سنہ کے حساب سے ۶۶ سال اور شمسی سنہ کے مطابق ۶۴ سال کی عمر میں آپ نے دار فانی سے دار باقی کی جانب رحلت فرمائی۔ آخری لمحات کا نقشہ آپ کے مرید خاص حضرت مولانا فتح محمد تھانوی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

جناب مولانا صاحب رحمہ اللہ کی روح پرواز کرنے کے وقت یہ خاکسار بھی موجود تھا، عین حالت نزع اور رحلت فرمانے میں ذکر سلطان الاذکار اور پاس انفاس زبان مبارک پر جاری معلوم ہوتا تھا، قریب نصف شب کے روح پر فتوح نے اپنے مقام اصلی کی راہ لی اور اپنے محبوب حقیقی سے جا ملی انا للہ وانا الیہ راجعون (۱)

بے محل نہ ہو گا اگر یہاں آپ کے مرض وفات اور وصال کی وہ تفصیلات بھی درج کر دی جائیں جو مولانا نسیم احمد فریدی امر وہوی نے حکیم محمد عمر چرتھاولی کے حوالہ سے بیان فرمائی ہیں :-

وسط ربیع الاول میں آپ چھتاری تشریف لے گئے۔ راستہ میں چرتھاول میں بھی ایک رات قیام فرمایا۔ چرتھاول میں جب شرح نسائی کا ذکر آیا تو کچھ اس قسم کے کلمات حسرت آیات فرمائے کہ سامعین کے قلب و جگر پاش پاش ہو گئے صبح ہی وہاں سے چھتاری کے لئے سوار ہو کر روانہ ہوئے اور شام تک وہاں پہنچے۔

چونکہ حالت ضعف میں یہ طویل سفر کیا تھا۔ اس لئے تکان کے باعث رات کو بخار آگیا، نواب صاحب کے اسماء پر پانچ چھ روز وہاں رہنا ہوا، وہاں پر بیہوش نہ تھا۔ وہ غلطی

(۱) وفات کی شب ایک بزرگ نے خواب دیکھا۔ جامع جہانگیر میں مولانا صاحب نے خواب میں حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کی بات فرمائی کہ میں نے آپ سے ملنے کی بات فرمائی ہے۔

کہنا پڑا، بخار بدستور رہا، بلکہ بڑھتا رہا، حتیٰ کہ جب آپ واپسی میں میرٹھ اترے تو طبیعت بہت ناساز ہو گئی، رات بھر نیند نہ آئی، صبح کو احباب کے کہنے سے دوا لی۔ دوپہر تک طبیعت کچھ اچھی رہی، پھر یکا یک بخار بڑھ گیا اور ساتھ ہی ذات الجنب ہو گیا اس میں خشکی و تشنگی، سوء تنفس اور کھانسی کی زیادتی ہو گئی، بے ہوشی اور غفلت بھی رہنے لگی، تین چار روز شہر میرٹھ کے طبیعوں کا معالجہ کیا گیا، پھر حکیم عبدالغفور صاحب سکندر آبادی آگئے ان کا نسخہ دیا گیا۔ ۲۶ رجب الاول کو سہ پہر کے وقت منشی غلام حسین باپوڑی کو بلا کر فرمایا کہ آج کی رات میرے پاس بیٹھے رہنا انشاء اللہ اس کے صلے میں تم کو کوئی نفع خاص پہنچے گا۔ چنانچہ وہ بسر و چشم حاضر رہے، اس کے بعد آپ کو تھانہ بھون لے جایا گیا۔ طبیعت بدستور ناساز رہی، شب وفات سے پہلے جو پیر کا دن آیا تو آپ نے کچھ سنبھال لیا۔ اسی دن مولانا محمد محمود صاحب جو ریاست ٹونک میں ناظر تھے حسب الطلب آگئے۔ حکیم محمد عمر صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میاں محمود بخیر و عافیت آ پہنچے، سنتے ہی فرمایا بس تو آج ہی تک کا قصہ تھا اتنے میں میاں محمود نے حاضر خدمت ہو کر سلام عرض کیا۔ حضرت نے حکیم صاحب سے فرمایا:-

اچھا فقیر کی چار پائی درست کرادو، اور خوب دیکھ بھال کر رو بہ قبلہ بچھا دو، سب کو سمجھا دو کہ جہاں تک فقیر کا سامنا ہے ادھر سے کوئی شخص نہ آنے پائے اور اس وقت میری مجلس میں کسی ایسی شخص کی آمد و رفت نہ ہونے پائے جو مخالف ملت حضرت شفیع محشر ہو۔“

پھر فرمایا:-

”دیکھو کھانا تیار ہو گیا ہوگا، جلد منگاؤ اور تم اور محمود مع اور سب صاحبوں

کے ایک جگہ بیٹھ کر کھاؤ۔“

المختصر بارہ بجے دن سے پہلے یہ تمام انتظام فرما چکے تھے، سب مہمانوں نے کھانا کھا لیا، چونکہ سوائے دوا لیا پانی کے سوا اٹھارہ دن سے کچھ کھایا پیا نہ تھا، نہایت لاغر و ناتواں ہو گئے تھے، مگر پاس اتفاق اس حالت میں بھی برابر جاری رہا، شروع زمانہ ذکر و شغل میں جاگتے، سوتے، سوار پیادہ، ارادہ بلا ارادہ پاس انفاس جاری رہتا تھا، اسی شدت مرض کے زمانہ میں ایک دن فرمایا کہ:- فقیر اس کے ترک کی قدرت نہیں رکھتا، دم بھر کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔“

جب دن چڑھا، ایک دورہ پڑا جس سے تنفس بڑھ گیا، آپ نے آہستہ آہستہ کچھ پڑھا اور حکیم صاحب سے فرمایا:-

”دو مونڈھے منگالو اور میری چارپائی سے جانب قبلہ اپنا مونڈھا اور جانب مشرق محمود کا مونڈھا ڈالو اور دونوں جانب تم دونوں بیٹھ جاؤ اور کچھ دیر میرا حال دیکھو۔“

تعمیل ارشاد کی گئی، اس کے بعد لمبے سانس کے ساتھ ”اللہ“ کہا اور آنکھیں بند کئے بیس منٹ تک بے حس و حرکت لیٹے رہے اور پھر آنکھیں کھول کر میاں محمود سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ”کچھ دیکھا؟“ انہوں نے عرض کیا ”شاید نیند کا اثر تھا“ فرمایا ”نہیں“ بعدہ حکیم صاحب سے فرمایا۔ ”بھلا کیا بات تھی؟“ انہوں نے عرض کیا۔ ”شاید حضرت کی توجہ خداوند قدوس کی جانب تھی۔“ فرمایا ”ہاں۔“

دن کے ایک بجے کا وقت تھا کہ سلطان الاذکار کے اندر مشغول ہو گئے ہر سانس کی آمد و شد سے لفظ ”اللہ“ صاف صاف نکلنے لگا۔ شام کے وقت مجلس حضرت میں اہل شہر کا ایک کثیر مجمع ہو گیا۔ پاس انفاس اور سلطان الاذکار کی کیفیت یہاں تک بڑھی کہ ہر واقف و ناواقف پر بھی ظاہر ہو گئی، متولی عبدالرحمان تھانوی نے بصد نالہ و فغاں کہا:-

”افسوس! آج یہ آفتاب عالم تاب چھپا چاہتا ہے“

بقول حکیم محمد عمر صاحب:- اس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا ایک میدان وسیع میں صد ہا اولیاء اللہ اور ہزاروں صوفیائے باصفا جہر کے ساتھ ذکر اللہ کر رہے ہیں اور ہر طرف سے ”اللہ اللہ۔“ کی صدا آرہی تھی۔ ”ساڑھے گیارہ بجے رات تک یہ کیفیت رہی اور جب نصف شب گزر گئی دفعۃً مغرب کی سمت سے ایک آندھی اٹھی اور بادل چھا گیا۔ اسی وقت روح پر فتوح عالم بالا کی جانب رخصت ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جیسے ہی حضرت نے انتقال فرمایا پہلے تو سخت زلزلہ آیا۔ پھر دیر تک بادلوں کا شور اور آندھی کا زور رہا۔ آپ کی وفات کی وجہ سے جہاں زمین لرزاں تھی اور آسمان گریاں وہاں تمام حاضرین کے دل و جگر بریاں تھیں، بہت سے لوگوں نے رات ہی سے قرآن مجید اور کلمہ توحید بطور ایصال ثواب پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے بہت سے ناظرہ خواں اور حافظ قرآن جمع ہو گئے اور سب تجہیز و تکفین، قرآن کی تلاوت اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہے۔ ۷ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ کو منگل کے دن دس بجے کے قریب عید گاہ کے نزدیک نماز جنازہ پڑھی گئی، شہر کے مسلمانوں کے علاوہ دور دور کے لوگ شریک جنازہ ہو گئے تھے

حالانکہ اس وقت تک ریل اس علاقہ میں جاری نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود ایک بڑا مجمع پیدل اور سواری سے شرکت جنازہ کے لئے تھانہ بھون پہنچ گیا تھا۔ اتفاقاً گورکنوں کی غلطی سے قبر کی تیاری میں دو گھنٹہ کی دیر ہو گئی اس عرصہ میں آپ کے خلیفہ مجاز حضرت قاضی سید محمد اسماعیل منگوری بھی آگئے۔ غرض دوپہر سے پہلے سپہر علم و عرفان کا یہ آفتاب نیمروز زیر زمین غروب ہو گیا۔ (۱)

تاریخ وفات کا ایک مادہ آیتہ کریمہ۔

عَسَى أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَحْمُودًا

اور دوسرا وَأُزِلَّتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ كَالْفَظ

”غیر بعید“ ہے ان کے علاوہ کئی مادے حکیم محمد عمر چر تھاولی نے نکالے تھے

(۱) کیا قطب ارشاد نے انتقال آہ (۱۲۹۶ھ)

(۲) اے عمر فکر سن رحلت مغفور ہے گر کر شمار عدد شیخ محمد مرحوم

۱۲۹۶ھ

(۳) رنج و الم شد چرا جان و جگر چوں فشرد عارف از ہستی بگو شیخ محمد نمرود

۱۲۹۶ھ

یہ تاریخ بھی حکیم صاحب نے کہی تھی:-

دیدہ صوری سے دیکھو معنوی سے خواہ عمر چھ عدد بارہ سو نوے پر پڑھے تھے آہ کے

چند اور حضرات کے مادے بھی قابل غور ہیں:-

(۱) ہائے افسوس چراغ گل ہو گیا (۱۲۹۶ھ)

(۲) قطب ارشاد رفت (۱۲۹۶ھ)

(۳) ہو غفرہ (۱۲۹۶ھ)

انتقال کے وقت ایک عجیب واقعہ

جس روز رات کو تھانہ بھون میں آپ کا وصال ہوا اسی دن ریاست جھالاوار میں ایک

عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

”کچھ لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے، دیکھتے کیا ہیں کہ بے شمار آدمی

ہاتھوں میں مشعلیں لئے نہایت تیزی سے کسی طرف جارہے ہیں، کھیت میں کام کرنے والے ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ ”اتنی تیزی سے کہاں جارہے ہو۔ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”تمہیں معلوم نہیں، تھانہ بھون میں حضرت مولانا شیخ محمد کا انتقال ہو گیا ہے ہم ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کے لئے جارہے ہیں۔“

تھوڑی دیر میں وہ مجمع آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، لیکن صبح کو دیکھا گیا کہ بہت سی مشعلیں بجھی ہوئی کھیتوں میں بکھری پڑی ہیں۔“

اس راز کو نہ اس وقت کوئی سمجھ سکا تھا اور نہ یہ معمہ اب سمجھنے یا سمجھانے کا ہے بزرگوں کی باتوں اور ان کی کرامتوں کو بزرگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

آپ کے مزار کی حالت

حضرت مولانا رحمہ اللہ کا مزار پر انوار تھانہ بھون میں شاہ ولایت صاحب کے مزار کے قریب واقع ہے قبر کا تعویذ کچا ہے، البتہ قبر کے چاروں طرف اینٹوں اور گچ کا چبوترہ بنا کر اس کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ بالیس پر کوئی کتبہ نصب نہیں، اس لئے جب تک کوئی بتانے والے نہ ہو مزار کا پتہ چلانا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

علم و فضل اور شماکل و خصائل

حضرت مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس میں علم متواتر تھا، غالباً قانون توارث کو پیش نظر رکھ کر بعض حضرات آپ کے شوق علمی کو جدی میراث کہہ دیں گے۔ لیکن جب یہ حقیقت سامنے رکھی جائے کہ کئی پشتوں تک اس خاندان میں حضرت مولانا جیسا دوسرا عالم نظر نہیں آتا تو پھر لامحالہ یہ نتیجہ نکالنا پڑے گا کہ آپ کو قدرت نے غیر معمولی طور پر فہم و ذکا اور ذہانت و فطانت سے سرفراز فرمایا تھا۔ صاحب نزہتہ اخواطر کی یہ رائے اپنی جگہ صحیح ہے۔ وکان مفروط الذکا، سریع الادراک، قوى الحفظ، حلو الکلام حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو علم و حکمت کے لئے بے پیاں صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ آپ کی زندگی میں ہی شان نظر آتی ہے جو دیگر علماء اور ائمہ کی زندگیوں میں دیکھائی

دیتی ہے، جو چیزیں عام آدمی سالہا سال کی محنت شاقہ کے باوجود نہیں سمجھ سکتے ان کو آپ کا ذہن نہایت جلد اخذ کر لیتا تھا، پھر آپ کو کسی ایک علم سے ہی مناسبت نہیں تھی بلکہ جملہ علوم معقولات و منقولات میں تبحر حاصل تھا۔ اسی کے ساتھ نہایت زود نویس اور خوش قلم بھی تھے۔ حضرت مولانا فتح محمد تھانوی کی تحریر سے آپ کی علمی قابلیت کا ایک واضح خاکہ ہماری نگاہ تصور کے سامنے آ جاتا ہے۔

”اور علم و فضل میں شہرہ آفاق ہونا ایسا نہیں کہ محتاج بیان ہو، مشتے نمونہ از خروارے عرض کرتا ہوں۔ حافظ کلام اللہ، محدث، صوفی صافی، علم حدیث میں مہارت تامہ اور علم تفسیر میں وہ ملکہ کہ کشف اور بیضاوی اور عالم بمنزلہ از برتھی اور لغت دانی کا یہ حال کہ اگر حافظ قاموس اور کنایۃ اور جمیع البحار کہا جائے تو عجب نہیں اور خود محقق ایسے ہوئے کہ جس لغت کے درپے ہوں ہندی کی چندی کو نوبت پہنچا دیں اور علم فقہ میں وہ کمال کے علاوہ اصول کے فروعات اور جزئیات پر نظر کہ مسائل کے دل کی تشفی ہو جائے اور علم و کمال میں ید طولی، علم و معانی اور بیان کا کیا بیان علم ادب میں کچھ کہا نہیں جاتا۔“

غرض علم سے فطری لگاؤ تھا، تمام عمر علمی مشاغل جاری رہے علماء کی صف میں ہمیشہ ممتاز سمجھے جاتے رہے اور ہر زمانہ کے اکابر نے آپ کی اس حیثیت کو تسلیم کیا۔

علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علم باطنی کے طرف کار حجان اوائل عمر ہی سے تھا، چنانچہ حضرت سید احمد شہید کے ہاتھ پر عمر سات سال بیعت کی، پھر جب حضرت میا نجیو نور محمد کی بزرگی کا نقش دل پر جم گیا تو ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے میں تامل نہیں کیا، حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اس ذاتی شوق ولولہ اور تڑپ کے ساتھ بزرگوں کی نظر فیض اثر نے مل کر آپ کو بہت جلد علم باطنی کے بھی اعلیٰ مدارج پر فائز کر دیا اور آپ کے مرشدوں نے آپ کے علوئے مراتب کی تصدیق کی۔ ایک طرف حضرت میا نجیو نور محمد کا آپ کا متعلق یہ ارشاد:-

”یہ معارف ربانیہ کا پیچھا سننے والا اور حقائق کا تحقیق کرنے والا ہے۔“

دوسری جانب حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب کا یہ فرمادینا:-

”تمہاری بہت میں بڑی فراخی اور وسعت ہے اور تمہیں اب کچھ احتیاج

اکتساب باقی نہیں۔“

دو ایسی وقع شہادتیں ہیں کہ ان کے بعد آپ کی تحصیل و تکمیل باطنی کے لئے مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔

دونوں قسم کے علوم کے جامع ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا کی علمی زندگی شریعت و طریقت کے امتزاج کا ایک اچھا نمونہ تھی، بعض نام نہاد صوفیوں کی طرح آپ نے کبھی شریعت کو حقیر نہیں سمجھا بلکہ طریقت کے لئے شریعت کو ضروری قرار دیتے رہے، شریعت کا احترام جیسا اور بزرگان دین کو ملحوظ تھا ویسا ہی حضرت مولانا کے دل میں بھی عمر بھر قائم رہا، سلوک کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے کے باوجود آپ نے عبادات کی جانب سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ بلکہ اس معاملہ میں اتنا اہتمام رکھا کہ نہ صرف اپنا تہجد کبھی قضا نہیں ہونے دیا بلکہ اپنے مریدین کو بھی سختی سے اس کی تاکید فرماتے رہے۔ نسیم احمد صاحب علوی جھنجھانوی نے ”نور محمدی“ میں حضرت میانجو رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کا ایک واقعہ درج کیا ہے جس میں ایک طرف حضرت میانجو رحمۃ اللہ علیہ کی کرامات کا علم ہوتا ہے تو دوسری جانب حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ و تقدس پر روشنی پڑتی ہے لکھتے ہیں:

پیر جی محمد صادق صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے کے بعد بارہ سال تک حضرت کے بتلائے ہوئے اوراد وغیرہ پر پابندی کرتے رہے، بارہ سال کے بعد ایک روز نماز تہجد قضا ہو گئی، صبح کو اس کا تذکرہ حضرت مولانا صاحب سے کیا، آپ کو نماز تہجد کا قضا کرنا بہت ناگوار گزرا اور حکم دیا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ہمارے یہاں تمہارا کوئی کام نہیں چلے گا۔ آپ حسب الحکم پیر و مرشد گھر آ گئے اور دل میں طے کر لیا کہ اپنے بڑوں کے یہاں یعنی حضرت میانجو رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس پر حاضر ہوں۔ خرچ کے لئے زرا در راہ جو دیکھا، دو پیسہ نکلے، ان میں سے ایک پیسہ کاستو اور ایک پیسہ کی شکر لے کر روانہ ہوئے۔ حضرت کے مزار پر پہنچ کر اس ستو کو پانچ وقت کیا۔ چھٹے وقت کھانے کے لئے کچھ پاس نہ رہا، آپ حضرت کے مزار مبارک سے لپٹ کر بہت روئے، شب میں حضرت میانجو رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا، فرما رہے ہیں:-

”مصدق! لے اپنے دو پیسے جو تیرے خرچ ہوئے ہیں“

آنکھ کھلی تو اٹھ میں دو پیسے تھے۔ میں کو میں حضرت میانجو رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف کی مسجد

میں تھا کہ ایک صاحب نے آکر یہ آواز دی:-

”مسجد میں کوئی محمد صادق صاحب ہیں۔“

میں پہنچا، وہ آنے والے ایک خوان میں کھانا لئے ہوئے تھے جو گرم تھا، فرمایا کہ رات خواب میں چچا صاحب نے فرمایا:-

”ہمارے یہاں مہمان تین روز سے آئے ہوئے ہیں، ان کے دو پیسے جو

خرچ ہوئے تھے وہ تم ہم نے ان کو دیدئے ہیں، لیکن وہ رات کے بھوکے

ہیں، ان کو کھانا کھلاؤ، میں کھانا کھا کر نماز چاشت پڑھ کر فارغ نہیں ہوا تھا

کہ گاڑی کے زنگولے کی آواز آئی کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مولانا شیخ محمد

صاحب تشریف لے آئے ہیں اور یہ فرمایا، ”محمد صادق! ہمارے ساتھ چلو،

رات حضرت میانجیو نے خواب میں فرمایا ہے تم اس کو لے آؤ، ہمارے

یہاں سختی نہیں بلکہ اللہ کے فضل و کرم پر بھروسہ ہے۔“

(بروایت قاضی ظفر احمد صاحب قاضی شہر سہارنپور)

غرض اتباع شریعت کا اس قدر خیال تھا کہ اس میں غیر معمولی سختی تک کو روار کھتے تھے،

لیکن عام طور پر آپ کے رویہ میں بہت نرمی تھی، شریعت و طریقت کے امتزاج نے

مزاج میں حسن اعتدال پیدا کر دیا تھا، آپ کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ جو شخص حضرت کی

خدمت میں حاضر ہوتا تھا اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ ایک لمحہ کو بھی آپ سے جدا ہو، کلام میں

ایسی شیرینی تھی کہ جو سنتا تھا اس کی طبیعت نہیں بھرتی تھی، یہی چاہتا تھا کہ گفتگو میں اور بسط

و شرح ہو، (۱) باتیں سادہ اور عام فہم زبان میں کرتے تھے، البتہ وعظ کہتے وقت مشکل الفاظ اور

دقیق اصطلاحیں استعمال کر جاتے تھے، لیکن ان کی تشریح یعنی سے کرتے جاتے تھے (۲)

حضرت مولانا فتح محمد تھانوی آپ کے شمائل و خصائل کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:-

”باوجودیکہ سن شریف ساٹھ سے متجاوز ہو گیا تھا، مگر رونق چہرہ اور جمال

صورت میں کچھ فرق نہیں آیا تھا۔ اور خوش آوازی تو غضب ہی تھی، کلام

(۱) ترجمہ شرح حزب المحر

(۲) آپ کے متعلق ارواح ثلاثہ میں ایک حکایت اس طرح درج ہے: حکایت (۲، ۳) فرمایا کہ مولانا شیخ محمد صاحب مدظلہ

میں اغات بہت بولتے تھے اور اس کی تفسیر یعنی سے کرتے تھے، ایک مرتبہ مولانا میرٹھ تشریف لے گئے تو ایک شخص کی نسبت

دریافت کیا کہ کنایہ میرٹھ سے ہیں یا جانشین میرٹھ سے ہیں۔“

انہوں نے رسول اللہ کو جس لہجہ اور اداسے پڑھتے تھے ذوق اس کا سننے والے ہی جانتے تھے اور خوش تقریری اور وعظ گوئی اور اس کی تاثیر کی وہ کیفیت میں نے دیکھی کہ ہر طرف سے آواز آہ و نالہ کی آتی تھی، اور ہاہو کا غل مچ جاتا تھا، تصوف اور سلوک میں وہ دسترس کہ بیان نہیں ہو سکتی، توجہ کی وہ تاثیر جو سامنے بیٹھا لونی اشارہ میں لوٹا اور نعرہ مار لیا سر پینٹنا شروع کیا۔“

مولانا نصر اللہ خورجوی حضرت میا نجیو نور محمد رحمۃ اللہ علیہ کے تینوں خلفاء کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

حالات سہ کس بزرگ دریا ران ایشان (میا نجیو نور محمد) حاجی امداد اللہ صاحب، حاجی مولوی شیخ محمد صاحب و حافظ غلام (۱) ضامن بانسبت و باند اق فقیر ہستند، و عالم بہ صحبت ایشان رسیدہ بہ ذوق می رسد، صحبت این بزرگواران حکم اکسیر دارد۔

رباعی

آہن کہ بہ پارہ آشنا شد فی الحال بہ صورت طلا شد
خورشید نظر چو کرد بر سنگ تحقیق کہ لال بے بہا شد
عجب مجمع این عزیزان در تھانہ است، خداوند تعالیٰ باقی وارد و جہانے
را بہ فیضان محمدی از سینہ ایشان برساند۔“

اور بھی بہت سے علماء اور اکابر نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بزرگی و برتری کا اعتراف کیا ہے چنانچہ حضرت سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:-
”ہمارے اکابر حضرات میں حضرت مولانا شیخ محمد صاحب بڑے بلند پایہ بزرگ ہوئے ہیں۔“

ازواج و اولاد

حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ نے چھ شادیاں کیں (۲) پہلی شادی حضرت میا نجیو رحمۃ اللہ علیہ کے

(۱) صحیح نام حافظ محمد ضامن علی شاد ہے۔

(۲) جن عورتوں کو آپ اپنے حوالہ عقد میں لائے ان میں چار بیوہ اور ایک نامیہ تھیں۔ ویاس معاملہ میں بھی آپ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا خیال رکھا تھا آپ کا اتباع سنت۔

وصال سے پہلے ۱۲۵۲ھ میں ہو چکی تھی، اس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ حضرت کے اس قول سے ہوتا ہے:-

تم مجرد تھے اور حافظ صاحب و شیخ محمد صاحب عیالدار۔“

آپ کی دوسری شادی ۱۲۷۲ھ میں بی حمید اے ہوئی۔ بی عائشہ بنت قاضی سعادت علی اور بی فاطمہ ۱۲۷۷ھ میں بی حمید اے کے انتقال کے بعد ایک ساتھ آپ کے حوالہ عقد میں آئیں، مؤخر الذکر قاضی محبوب علی کی بھانجی اور نابینا تھیں۔ آخر میں دو اور بیوہ عورتوں سے شادی کی، اولاد صرف تین بیویوں سے ہوئی، بی حمید اے، بی عائشہ اور بی فاطمہ سے۔

بی حمید اے ۱۲۷۷ھ تک زندہ رہیں، ان کے ایک صاحبزادہ اور ایک صاحبزادی تھیں، صاحبزادہ کا نام محمد محمود تھا، وہ حضرت مولانا شیخ محمد کے خلف اکبر تھے اور ان ہی کی نسبت سے آپ کی کنیت ابو محمود ہوئی۔ ۱۵ شوال ۱۲۷۴ھ مطابق ۲۹ مئی ۱۸۵۸ء کو پیدا ہوئے اور ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ مطابق جولائی ۱۹۳۶ء میں تھانہ بھون میں فوت ہوئے۔ ان کی پہلی شادی حضرت مولانا محمد احسن نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی صاحبزادی سے ہوئی، جن سے تین صاحبزادے محمد عانی، محمد افضل اور محمد مسعود اور ایک صاحبزادی ام فضل پیدا ہوئیں۔ ام فضل قاضی عبدالغنی صاحب منگلوری سے منسوب تھیں، مولوی محمد محمود صاحب مرحوم کی تیسری بیوی پانی پت کی ایک نیک اور سیدھی سادی خاتون تھیں۔ آشوب ۱۹۳۷ھ میں لاہور پہنچ کر فوت ہوئیں، ان کی ایک صاحبزادی ام رحم اور ایک صاحبزادے محمد احمد ہیں، دونوں پاکستان میں موجود ہیں۔

بی حمید اے کی صاحبزادی مقصود النساء تھیں وہ ۱۲۷۶ھ ربیع الثانی ۸ مطابق نومبر ۱۸۵۹ء کو قصبہ رام پور منیہار ان میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شادی مطیع مجتہائی کے موسس و مالک مولوی عبد الاحد مرحوم سے ہوئی تھی۔ ان کی اولاد میں دو صاحبزادے عزیز اور احمد اور پانچ صاحبزادیاں حمیدہ، رشیدہ، صفیری امۃ الرحمن اور محمودہ تھیں، اول الذکر صاحبزادی خان بہادر محمد ایمان سابق چیف انجینئر سے منسوب ہیں، اور اس وقت لاہور میں مقیم ہیں، صفیری امۃ الرحمن کے بعد دیگرے محمد افضل ابن مولوی محمد محمود بن حضرت شیخ محمد سے منسوب ہوئیں اور محمودہ کی شادی محمد اعلیٰ خلف مولوی محمد محمود سے ہوئی تھی۔

بی عائشہ کے صاحبزادے مولانا محمد عمر صاحب تھے، ان کی ولادت ۲۲ نومبر ۱۸۶۵ء شوال المکرم ۱۲۸۲ھ بروز شنبہ بلد و دار اسلام محمد آباد عرف ٹونک میں ہوئی وہ اپنے بزرگ

باپ کے صحیح جانشین تھے، انہوں نے بعض کتابیں حضرت مولانا فتح محمد سے پڑھی تھیں، بعدہ علوم متداولہ کی تکمیل دہلی جا کر کی۔ قاضی اسماعیل منگھوری (م ۱۲/ربیع الاول ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۳ء) سے خرقہ خلافت حاصل کیا، لیکن عمر نے وفات کی اور حیات مستعار کی محض ۷۳ بہاریں دیکھ کر ماہ رمضان المبارک ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء میں واصل رحمت حق ہوئے۔ ان کی دو شادیاں ہوئیں دوسری اہلیہ مسماۃ مبارک النساء اور چاروں صاحبزادیاں لعلۃ المنان (۱) لعلۃ الرحمن، (۲) لعلۃ الرحیم اور لعلۃ الکرم کراچی اور حیدرآباد میں مقیم ہیں۔

مولانا محمد عمر مرحوم کی حقیقی ہمشیرہ میمونۃ النساء تھیں وہ یکم شوال ۱۲۸۰ھ، ۱۰ مارچ ۱۸۶۳ء کو بلدہ دارالاسلام ٹونک میں پیدا ہوئیں، اور ۱۳۰۳ھ ۱۸۸۵ء کو تھانہ بھون میں فوت ہوئیں۔ ان کی نسبت قاضی عنایت علی کے صاحبزادہ مومن سے ہوئی تھی، لیکن ناکندہائی سے پہلے دونوں فوت ہو گئے۔ (۳)

الاسلا حضرت مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ کی تیسری اہلیہ بی فاطمہ کے صرف ایک صاحبزادے محمد صدیق تھے، وہ بھی بلدہ دارالاسلام ٹونک میں ۲۳ رمضان المبارک ۱۲۸۲ھ ۱۸۶۶ء کو پیدا ہوئے اور بعمر ۲۸ سال ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۳ء میں بمقام تھانہ بھون فوت ہو گئے، ان کی شادی متولی محمد اسماعیل کاندھلوی کی دختر ام ہانی سے ہوئی تھی، جن سے صرف ایک صاحبزادی ام کلثوم پیدا ہوئیں، وہ متولی ریاض الاسلام صاحب رئیس کاندھلہ سے منسوب ہیں اور کاندھلہ ہی میں مقیم ہیں۔

مولانا محمد عمر اور محمد صدیق مرحوم دونوں کی قبریں ریلوے اسٹیشن تھانہ بھون کے راستہ میں ایک چبوترہ پر واقع ہیں، نزدیک ہی ایک تاریخی کنواں ہے جو بائیں والے کے کنوئیں کے نام سے شہرت پذیر ہے، اس سے کسی قدر ہٹ کر عید گاہ جو ہے، ہنوز اچھی حالت میں ہے۔

تلامذہ

حضرت مولانا کے تلامذہ کی تعداد کثیر ہے لیکن محض تین حضرات کے اسماء گرامی معلوم

ہوئے :-

(۱) راقم کی والدہ (۲) اہلیہ قاضی محمد مکرم صاحب بک تھانوی

(۳) اور یہ عجیب توارد ہے کہ آج ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۱۹ء کو، یعنی پورے سو سال بعد راقم نور الحسن راشد کاندھلوی ایک

مضمون کے لئے مولانا محمد عمر پر مختصر نوٹ لکھا گیا ہے، اللہ اعلم بالصواب

- ۱۔ قاضی شیخ محمد محدث مچھلی شہری جو ریاست بھوپال میں عہدہ قضا پر فائز رہے۔
- ۲۔ نواب محمد علی خاں والئی ٹونک جو ۱۸۶۳ء میں مسند نشین ہوئے اور ۱۸۶۸ء میں معزول کر کے بنارس بھیج دئے گئے۔
- ۳۔ دیوان شمس الدین نائب وزیر ٹونک (۱)

مریدین و خلفاء

حضرت مولانا شیخ محمد کے مریدین کی تعداد بہت تھی، لیکن ان میں سے چار بہت اہم ہیں:-

- ۱۔ قاضی محمد اسماعیل منگلوری (م ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ) مولانا کے اجل خلیفہ تھے۔ صاحب باطن بزرگ اور قاضی عبدالغنی منگلوری رحمۃ اللہ علیہ کے والد تھے، قاضی عبدالغنی کا نام اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی کے مرشد کی حیثیت سے اس قدر مشہور ہے کہ مزید تعارف کا محتاج نہیں۔ خود قاضی اسماعیل صاحب نے اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر بے انتہا شہرت پائی، انہوں نے ۱۳۰۰ھ میں ایک رسالہ ”نور محمدی“ بطور سوال و جواب حضرت ابوطالب محمد بن علی عطیہ الیمنی المملکی کی کتاب سے مسائل کا استخراج کر کے لکھا۔

- ۲۔ مولانا فتح محمد تھانوی، قصبہ تھانہ بھون کی ان چند ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہیں، جن کی نسبت سے اس قصبہ کو دائمی شہرت نصیب ہوئی، علوم ظاہری و باطنی دونوں سے بہرہ وانی رکھتے تھے، صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ مولانا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ خلف الرشید حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی نے بعض کتابیں انہیں سے پڑھی تھیں، انہوں نے اپنے پیر طریقت حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی کی مرتبہ شرح حزب التحریر کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

- ۳۔ حکیم محمد عمر چر تھاولی بھی بزرگ اور ذی علم شخص تھے، انہوں نے حضرت مولانا شیخ محمد کے حالات زندگی۔ ”نشاطات محمدی“ کے نام سے مرتب کئے تھے، لیکن یہ کتاب اب نایاب ہے، دوسرا اہم کا جو حکیم صاحب نے کیا تھا وہ حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف مثنوی معنوی دفتر ہفتم کی ترتیب و اشاعت کا کام تھا، جس کو انہوں نے ۱۳۰۷ھ میں محبوب المطابع میرٹھ میں طبع کرا کر شائع کیا۔

- ۴۔ حاجی محمد صادق تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جن کا ایک واقعہ قاضی ظفر احمد صاحب کے حوالے

تے کہیں اور درج کیا جا چکا ہے، حضرت مولانا کے ان مریدین میں سے تھے جن میں پیر سے والہانہ شیفتگی ہوتی ہے، گو علوم ظاہری میں ان کو کوئی مرتبہ حاصل نہیں تھا لیکن علم باطنی میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔

تصنیفات

حضرت مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ کی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں گذرا، پھر آپ کی قوت تحریر بھی بے پناہ تھی، دنوں اور ہفتوں میں نہایت دقیق موضوعات پر کتابیں تیار کر دیتے تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی تصانیف کی تعداد بہت تھی۔ اس قیاس کو مولانا فتح محمد تھانوی کے اس فقرے سے مزید تقویت حاصل ہوتی ہے، ”حضرت کی تصانیف میں سے ہر قسم کی کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں بہت ہیں (۱)“ بعض کتابوں کے محض حوالے ملتے ہیں، مگر وہ کتابیں مفقود ہیں، بعض کتابیں ایسی ہیں جو حضرت مولانا رحمہ اللہ نے تصنیف فرمائیں، لیکن زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں، انہی کتابوں میں سے ایک رسالہ ”تنقیہ الاعتقاد و تصفیۃ الفواد من الکفر والارتداد“ ہے جس کا حوالہ حضرت میا نجیو نور محمد رحمہ اللہ نے اپنے مکتوب گرامی میں دیا ہے۔

متعدد کتابوں کے نام نزہت الخواطر میں درج ہیں، مگر ان میں سے محض چند نظر آتی ہیں۔ باقی مفقود و معدوم ہو چکی ہیں۔ مثلاً:-

(۱) دلائل الاذکار فی اثبات البحر بالاسرار (۲) القسطاس فی اثرا بن عباس (۳) المکاتبت الحمدیہ فی اثبات الذکر والجمہر (۴) المناظرۃ الحمدیہ، وہ کتابیں ہیں جن کے اب محض نام باقی رہ گئے ہیں۔

اس وقت حضرت مولانا کی محض سات تصنیفات مطبوعہ یا مخطوطہ کی شکل میں ہمیں دستیاب ہو سکی ہیں۔

(۱) حاشیہ برمن نسائی (۲) مثنوی معنوی دفتر ہفتم (۳) شرح حزب البحر (۴) ارشاد محمدی (۵) انوار محمدی (۶) بیاض محمدی (۷) رسالہ الہامات الموجود الودود فی تحقیق وحدت الوجود والشہود۔

(۱) حکیم محمد عمر چرخی نے حضرت مولانا کی تصانیف کی مجموعی تعداد بتائی ہے جن میں سے نصف سے کم زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں۔

حضرت مولانا کی تصنیفات عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں موجود ہیں۔ اکثر کتابیں نشر میں ہیں، لیکن بعض نظم میں بھی تحریر فرمائی تھیں جن میں سے مثنوی معنوی دفتر ہفتم اس وقت موجود ہے، کتابوں کے موضوعات عموماً شرعی مسائل احادیث و تفسیر اور مسائل تصوف ہیں، چونکہ بحثیں عموماً عالمانہ ہیں اس لئے عبارت میں بھی جابجا عربی کے ثقیل الفاظ اور دقیق مصطلحات استعمال ہوئی ہیں۔ نظم نسبتاً صاف اور رواں ہے، اردو عبارت پرانے انداز کی ہے اور موجودہ محاورہ کے مطابق نہیں، فارسی اور عربی الفاظ کا غلبہ ہے اکثر مواقع پر حضرت مولانا خود بھی اس بات کا احساس کر کے کہ بعض مشکل الفاظ استعمال ہو گئے ہیں۔ آسان لفظوں میں اس کی تشریح کرتے جاتے ہیں مثلاً ارشاد محمدی کی تمہید میں فرماتے ہیں:-

..... ان کی اتباع سنت ظاہری اور باطنی کا یعنی سیرت اور سریرت کا شوق دل میں لگایا۔ تاکہ تکمیل ظاہری یعنی اصلاح اعمال اور تکمیل باطنی یعنی تہذیب اخلاق بکمال شوق و اطمینان..... حاصل ہو..... ہم نمک حرام نہ ہوں اپنے منعم حقیقی اور مجازی کے یعنی خدا اور رسول کے بلکہ نمک حلال ہوں یعنی موحد اور تابع سنت.....۔“

یہی طرز بعض اوقات فارسی عبارتوں میں بھی جھلکنے لگتا ہے، لیکن اس کے نمونے بہت کم ہیں۔

حضرت مولانا کی جوچھ سات تصانیف دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں وہ بھی فی زمانہ کمیاب ہیں۔

اس لئے ان پر انفرادی طور سے کچھ لکھنا بے محل نہ ہو گا۔

۱۔ حاشیہ بر سنن نسائی، عربی میں ہے اور اس کی وجہ سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ طبقہ علماء میں متعارف ہیں۔ ۱۲۹۵ھ میں جب آپ کو علالت سے کسی قدر افاقہ ہوا تو آپ نے نسائی پر حاشیہ لکھنا شروع کیا، جب آپ اس کی تحریر میں مشغول تھے تو آپ کا معمول یہ رہتا تھا کہ اشراق کی نماز پڑھنے کے بعد لکھنے بیٹھ جاتے دوپہر تک لکھتے رہتے، نماز ظہر کے بعد پھر اس کام میں لگ جاتے، کتابیں بہت کم دیکھتے صرف قوت حافظہ سے کام چلاتے تھے۔ غرض بہت جلد اس کام کو مکمل کیا۔ سنن نسائی پر حاشیہ دوبار چھپا، دوسری مرتبہ ۱۳۱۹ھ میں طبع ہوا۔ اس میں کہیں کہیں اسماء الرجال کے اور کہیں کہیں حدیث کی شرح کے سلسلہ میں فوائد درج ہیں۔

۲۔ مثنوی معنوی دفتر ہفتم (۱) اس مثنوی کے پانچ مکمل دفتر اور چھ دفتر کا کچھ حصہ حضرت مولانا جلال الدین رومی نے لکھا تھا وہ چھ دفتر کو اتمام تک نہ پہنچا سکے تھے کہ پیام اجل آگیا۔ ان کی رحلت کے وقت ان کے فرزند نے باحسرت ویاس کہا:-

”اباجان! آپ کا یہ کام نامکمل رہا جا رہا ہے۔“

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:-

”اس کی تکمیل وہ کرے گا جس کا یہ حصہ ہے۔ زبائیم ماند و قلمم کاست۔“

عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ پیشین گوئی کئی سو سال بعد پوری ہوئی۔ حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کو خواب میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دفتر کو مکمل کرنے کا حکم فرمایا، چنانچہ حضرت مفتی الہی بخش نے اس کا تکملہ کیا اور فوت ہو گئے۔ حضرت مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:-

یا الہی بخش الہی بخش را از جلالش بود ذکر در ورا

دفتر سادس مکمل کرد و رفت عقدہ کان بود ہم حل کرد و رفت

اس اعتراف کے بعد بھی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی کو نامکمل سمجھا اور اس کو کعبہ دل کیلئے طواف گردانتے ہوئے، ساتویں دفتر کی ضرورت محسوس کی۔ ادھر حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ اور شمس تبریزی کی طرف سے اشارہ ہوا، لہذا آپ نے کمر ہمت باندھی اور ساتواں دفتر مکمل کر دیا۔ ان تمام باتوں کی تفصیل اسی دفتر ہفتم میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

لیک چوں ہر دفتر است از مثنوی کعبہ دل را طواف معنوی

تانہ طوف ہفتے گرد و ادا چوں شود ہر ہفت نظم مدعا

پس از ایمائے جلال پاک دیں وز ضیائے آل خور برج یقیں

بہر شوط سابعہ جاں چست شد چستیم در کار دنیا ست شد

خواہد از آل خالق انوار شمس گر داز ذرہ بغیر اکار شمس

ایں شر رہا چوں بجا نم رتختند شعلہ ہادر سینہ برا تلخچستند

(۱) مثنوی معنوی دفتر ہفتم کے متعلق مولانا نسیم احمد فریدی امرہوی رقمطراز ہیں۔ یہ مثنوی اعلیٰ اور معیاری فارسی میں ہے، درحقیقت یہ مثنوی آپ کے ذوق شعری کی آئینہ دار اور آپ کی فارسی انشاء کا شاہکار ہے، سوز و گداز، سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔

اندریں بودم کہ تیغ آں حسام مثل برق آمد بروں زاہر نیام
تیغ آں تیغ دکان اصفہاں غوطہ ہا خوردہ بخون عاشقاں
مثل ماہ نیم ماہ رخشاں ہلال ہیمو مہر نیمرز آتش خصال
آہنش از ہندو حداد از عجم بحر ہر جوہر عرض بر برق دم

مثنوی معنوی کا یہ دفتر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دو سال بعد ۱۸۵۹ء ۱۲۷۶ء میں بمقام
رام پور منیہار ان مکمل ہوا۔ مادہ تاریخ تصنیف
”شورش عشق“ ہے۔

۱۲۷۶ھ

مولانا کی حیات میں اس دفتر کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی اور کئی سال تک یہ گرانقدر
تصنیف مسودہ کی شکل میں رکھی رہی، جب آپ کے مرید اور سوانح نگار حکیم محمد عمر چرتھاوی کو
حضور سرور کائنات ﷺ نے خواب میں اس کی طباعت اور اشاعت کا حکم فرمایا تو انہوں نے
نظر ثانی اور حواشی کے بعد ۱۳۰۹ھ ۱۸۹۱ء میں محبوب المطابع میرٹھ میں اس کو طبع کرا کر شائع
کیا۔ خود حکیم صاحب نے اس کا مادہ تاریخ طباعت نکال کر قطعہ تاریخ لکھا اور مثنوی کے اخیر
میں شامل کیا۔

قطعہ تاریخ طباعت

ایں مثنوی مقبول الہ چوں طبع بمطبع عاطر شد
سال طبعش خوش گفت عمر بس مطبوع خواطر شد

۱۳۰۹ھ

مثنوی کا یہ دفتر محض ایک مرتبہ طبع ہوا۔ اس لئے نہ اس کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی اور
نہ اب وہ عام طور پر ملتا ہے۔ کبھی کبھی بعض کتب خانوں میں یا اہل علم حضرات کے پاس دکھائی
دے جاتا ہے، لہذا اس کے بعض حصوں کو یہاں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

خطاب بجناب عشق مآب و خواستگاری وصل باری

مرحبا اے دلبر دلبازما آخ اے آئینہ غمازما
برودہ صبر و قرار ماچو آب کردہ مارا تو رسوا و خراب

بے گماں از دست تو لے جان جان است
ہمعناں بر وی ترا سوئے عدم
گر بنو دے تو کجا بودیم ما
زانچہ جستی جستی آگاہم ز تو
کلک سرگشتہ کند چوں شرح آں
ہر چہ باشد وہ زخ و تلخ و عذب تو
متردہ بخش از وصال آں جمیل
لطف فرما لطف تا بے غم زیم
اقتدا آرد بہ کسی ز اہل زماں
ہم کلام ہم کلام معنوی است
ارمغاں آوردہ وہ ام باصاد عشق

ہر بلا و شور کاں اندر جہاں است
کاش اے غماز آں سکندر م
ہاں مگر ایں ہم درست است و بجا
آنچہ ہستی ہستی آگاہ ہم ز تو
ہر چہ ز ابرت می چکد لیکن بجاں
خوش بیا اکنوں کہ پیہنم جذب تو
تا بکے آخر جدائی اے وکیل
در سرورش تا خوش و خورم زیم
مثنویم اے محمد نیست آں
بلک آتش چوں ز جام معنوی است
آنچہ آمد براب از ایراد عشق

در احوال سراپا اجلال حضرت رابعہ بصری بمعاملہ عشق و عاشقی ذوالجلال

بود و درد روز و شب پیش کریم
بے تکلف سوز درد و زخ چو خار
کن حرامم آں گلستان و بہشت (۱)
خواں پے دیدار خود در شہر تو
باہزاراں سوز و ساز و وجد ہا
در کف آتش بصد گرمی و درد
جست از جاے و بلب راند ایں سخن
تا زخم آتش در آں آب اندراں
باز دارند از غم آں فرد من

رابعہ ایں منا جات خیم
گر پرستش کردہ ام از ترس نار
وریا ضم ہست از بہر بہشت
ہاں پرستیدم ترا گر بہر تو
روزے آں مستغرق عشق خدا
در کفے بگرفت کاس آب سرد
وزرہ شوریدگی ہانعرہ زن
اے کجاہست آں جہنم وال جنال
کیں دو در خوف و رجائے خویشتن

فی شرح الحدیث: تعبد اللہ کانک تراہ وان لم تکن تراہ انہ یراک

جا بچشم جسم و جاں وہ عابد
شاہد خود شو کہ می بیند و دود

در عبادت جلوہ معبود را
ورنہ بند و نقش ایں رنگ شہود

عاشقے کز بہر دیدن محو اوست
سوئے عاشق بنگرد معشوق گر
انفعال و اختشا دروے بود
زانکہ باشد رتبہ الفت و گر

حالتے دارد کہ طرز صحوا و ست
خوش پذیرد ز آل دل و جاں آل اثر
پس نجاشی محو ہمسر کے بود
منصب ایں خوف و عبدیت دگر

۳۔ شرح حزب البحر: حزب البحر ایک دعا ہے جو رد بلا کے لئے پڑھی جاتی ہے، اس کے مصنف حضرت امام ابو الحسن شاذلی یمنیؒ ہیں جو فرقہ شاذلیہ کے سرخیل ہیں، ان کا مزار شہرفہ میں ہے۔ حضرت مولانا رحمہ اللہ نے ۱۲۷۷ھ میں جب وہ قصبہ رام پور میں بحالت روپوشی قیام پذیر تھے، دعائے حزب البحر کی شرح فارسی زبان میں لکھی اور اس کے فوائد و خواص بیان کئے۔

تمہید میں فرماتے ہیں کہ ”میں جب ۱۲۶۳ھ میں بعد اوائے فریضہ حج حرمین شریفین سے واپس آ رہا تھا تو یمن میں رک کر امام شافعی رحمہ اللہ کے مزار کی زیارت سے مشرف ہوا۔“

اس کے بعد حضرت مولانا نے اس دعا کا شان نزول یہ بتایا ہے کہ ”ایک مرتبہ امام شافعیؒ مع اپنے مریدین حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے، ساحل سمندر پر محض ایک شکستہ کشتی ملی، حج کا زمانہ قریب تھا اس لئے مجبوراً اسی پر سوار ہو لئے، سمندر کے بیچ میں پہنچے تو کشتی ایک طوفان عظیم میں گھر گئی اور اس کے غرق ہونے کا اندیشہ ہوا، امام شافعیؒ نے اس وقت یہ دعا پڑھی اور سمندر کو مخاطب کر کے فرمایا:-

”يا بحر اسكن فان عليك بحر العلوم“

خدا کی قدرت طوفان فوراً ختم ہو گیا، اس واقعہ سے تعلق کی بنا پر اس دعا کا نام حزب البحر پڑ گیا۔ اب یہ دعا صرف طوفان ہی کے موقعہ کے لئے مخصوص نہیں رہی بلکہ ہر مشکل کے وقت پڑھی جاسکتی ہے۔

حضرت مولانا شیخ محمد کی فارسی شرح کا حضرت مولانا فتح محمد تھانوی نے حاجی محمد صادق کے ایماء سے عام فہم اور آسان اردو میں ترجمہ کیا، وہی ترجمہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ شرح حزب البحر کے خاتمہ پر حضرت مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ کی یہ عبارت مختصر ہونے کے باوجود اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس سے جنگ آزادی کے بعد کے چند واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ ”جس وقت یہ فقیر شیخ محمد تھانوی، فاروقی، عمری، مجددی، نقشبندی، چشتی،

toobaa-elibrary.blogspot.com

سے فارغ ہوا۔ ایک پہر دن چڑھا تھا اور تاریخ بائیسویں ربیع الثانی ۱۲۷۷ھ بارہ سو ستتر ہجری مقدسہ تھی، قصبہ رام پور منیہار ان ضلع سہارنپور اس حویلی میں جو محل کے نام سے مشہور ہے اور وہ مکان اصل میں شیخ سالار صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، اور جس وقت یہ فقیر اپنے وطن اور مولد اور مسکن سے جلا وطن ہو کر یہاں مقیم تھا۔“

۴۔ ارشاد محمدی اردو زبان میں تصوف کا ایک مختصر رسالہ ہے ۱۲۹۲ھ میں مطبع صدیقی بریلی میں طبع ہوا تھا، منشی غلام بسم اللہ بک منشی محمد احسان اللہ مخیر اور مولوی قاسم علی خواہان نے قطعات تاریخ لکھے، پہلے دو حضرات کے قطعے فارسی میں ہیں۔ خواہاں صاحب نے اردو میں طبع آزمائی کی ہے اور اس بات کا التزام کیا ہے کہ قطعہ سے رسالہ کا موضوع بھی معلوم ہو جائے فرماتے ہیں: —

چھپکے تیار فضل حق سے ہوا طرز اذکار اولیائے کرام
سال اس کا ہے باسر بہجت نادر اعلیٰ چھپی کتاب تمام
۱۲۹۰ھ

اس رسالہ کا موضوع تصوف کے مختلف سلسلوں کے اشغال و اذکار کے طریقوں کو بتانا ہے، مولانا نے یہ رسالہ بعض حضرات کی فرمائش سے ۱۲۷۷ھ میں لکھا تھا چنانچہ، خود تحریر فرماتے ہیں:۔

”حسب درخواست بعضے بھائیوں، اخلاص مندوں مجھ عاجز اہل میرٹھ سے خصوص مولوی فدا علی صاحب میرٹھی اور منشی محراب علی صاحب انوپ شہری چند ارشادات طریقہ علیہ چشتیہ، صابریہ، قدوسیہ اور طریقہ بیہ، نقشبندیہ، مجددیہ خصوص طریقہ ولی اللہیہ عزیز یہ سید احمدیہ نوریہ اور اندک تر طریقہ مقتدریہ کہ راضی ہو اللہ ان سے اور ان لوگوں سے جو اپنے اصلی پیر طریقت بیعت و ارادت و صحبت ظاہری و معنوی سے اغنی نور الاسلام حضرت مولانا شیخ المشائخ میا نجو نور محمد صاحب جھنجھانوی قدس سرہ اور پیر طریقت و بیعت و ارادت و صحبت مولانا و اولانا حضرت قبلہ الہدایت والارشاد کعبۃ

بریلوی قدس سرہ سے پہنچے اوپر اس روش کے جو معمول بہ مجھ عاجز کے ہیں
اردو ریختہ زبان میں ہنگام قیام میرٹھ اپنی ۱۲۷۷ھ بہ نظر نفع عام قید تحریر میں
آئے اور نام اس رسالہ کا بہ نظر فی الجملہ اسم با مسمیٰ ارشاد محمدی رکھا۔“

اس تمہید کے بعد اصل مضمون پیش کیا گیا ہے، جس کو حضرت مولانا رحمہ اللہ نے اپنی
دانست میں ”بہ نظر فیض عام“ تحریر کیا تھا، لیکن آج کل کے ماحول میں خاص لوگ ہی اس
سے فیضیاب ہو سکتے ہیں، ایک مختصر سے اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے:-

”ان لطائف میں ایک حرکت نبضیہ ہے، طالب کو چاہئے کہ اس کو خوب
دھیان کر کے بغور تمام اسم ذات مبارک سمجھتا رہے یہاں تک کہ ایسا جم
جاوے کہ جو خود مٹانا چاہے تو نہ مٹا سکے یہ اعلیٰ رتبہ مشق کا ہے، ادنیٰ رتبہ
بیداری ان لطائف کا یہ ہے کہ عین مشغولی کاروبار دنیاوی وغیرہ میں طالب کو
لطائف اپنی طرف متوجہ کر لیں، یہ انعام الہی عجیب ہے اور اس سلسلہ والوں
پر طالب کو چاہئے کہ شاکر ہو۔“

۵۔ انوار محمدی۔ یہ رسالہ مولانا کی آخری عمر کی تصنیفات میں سے ہے خود مولانا نے اس
کے سنہ تصنیف کا کہیں ذکر نہیں کیا، لیکن آخر میں جو مادہ تاریخ درج ہے اس سے اس رسالہ
کا سنہ تصنیف ۱۲۹۱ھ نکلتا ہے۔ یہ مادہ مولوی عبد الحکیم صاحب متخلص بہ حکیم نے نظم کر کے کتاب
کے آخر میں شامل کیا ہے اس قطعہ کے چار شعر ہیں۔ جن کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

انوار محمدی است برہاں	کاندردل و جاں کند تصرف
در فکر شماء مطلع سال	روداد چواند کے توقف
فرمود حکیم فیض عرفان	بے ساختہ تر رہ تکلف
تاریخ دگر کہ بود مقصود	یاب ز نسخہ تصوف

۱۲۹۱

انوار محمدی فارسی زبان میں لکھی گئی تھی، لیکن آخر میں کچھ درودوں کا ترجمہ اردو میں کر دیا
گیا ہے۔ کل رسالہ ۱۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ محمد حیات مطبع ضیائی میرٹھ نے اس عبارت کے
ساتھ طبع کیا:-

احقر باستحازت جناب مستطاب مصنف صاحب ظلہم اس کتاب طبع نموده است ہے،

حسٹ قانون ۱۸۴۷ء احادی مجاز طبع نیست۔

رسالہ کی عبارت مسجع اور دقیق ہے، شروع میں خود مصنف بھی اپنی عادت کے بموجب اپنے جملوں کو مشکل سمجھ کر اعنی سے تشریح کرتے چلے گئے ہیں، یہ رسالہ اگرچہ مجموعی طور پر شریعت اور طریقت کے بعض مسائل پر مشتمل ہے۔ لیکن موضوعات مختلف النوع ہیں۔ شروع میں سالک کے بعض تجربات اور اس کے قلب کی کیفیات سے متعلق سوالات اور ان کے نہایت تشفی بخش جوابات ہیں مثلاً:-

سوال:- روزے کہ شغل دورہ نمودم تمام شب بمشاہدہ محظوظ ماندم و ازاں ہیچ انوار قدسیہ محسوس نمی گردد۔

جواب:- افادہ مشاہد چون لطیف و صافی می شود ادراک آل بر سالک دشوار ترمی شود و گمان می برد کہ مرا ہیچ حاصل نیست و اگر مشاہدہ متکلیفہ بیکفیتہ والوان و شیون می باشد در ادراک می آید و میدانید کہ مرا مشاہدہ حاصل است حالانکہ مشاہدہ ملون ادنی و مشاہدہ بے لون اعلیٰ است کہ ذات الہی جمیع کمالات و متزہ و مبرا از جملہ کوائف و پیچ و چگول است ہر چند بے کیفیت باشد مشاہدہ کامل است پس طالب را باید کہ خواہان مشاہدہ بے کیف باشد و آن را بالیقین و بالقطع مشاہدہ ذات پاک داند و ہیچ شک و شبہ را در آن راہ نہد۔

ان سوالات اور جوابات کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد کچھ تعویذات ہیں۔ پھر صفحہ ۳۰ پر میا نجیو نور محمد صاحب کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

فقیر خاکپائے فقراء دین.... بعد اخذ بیعت سلسلہ اجازۃ حاصل شد و نعمۃ خاندان اربعہ مع شعب متفرقہ و شجرات مرحمت داشت کہ آن وقت دیگر یاران و عزیزان از خادمان آن عالی جناب و مستعالی جناب موجود بودند کہ اگر ذکر محامد و مناقب آن یاران و ناداران بر صفحہ تبیض بہ تنصیص نوشتہ آید نسخہ ہذا بطولانی انجامد لہذا باسر مادر دیگر رسالہ مستقلہ انشاء اللہ تعالیٰ منحصر داشتہ شد۔

اس عبارت کے بعد چشتیہ، صابریہ، نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ نظامیہ اور سہروردیہ کے مکمل شجرے لکھے گئے ہیں۔ پھر سید احمد صاحب شہید کا نسب نامہ دے کر کچھ خطوط نقل کئے ہیں پہلا خط حاجی شاہ عبدالرحیم صاحب ولایتی کی جانب سے میا نجیو نور محمد صاحب کے نام ہے۔

دوسرا خط حضرت سید احمد صاحب شہید کی جانب سے میا نجیو نور محمد صاحب کے نام ہے جو

حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید نے تحریر کیا تھا۔

پانچ خطوط حضرت میا نجو نور محمد صاحب کی جانب سے حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہیں، ان خطوط میں سے ایک خط کا ترجمہ گذشتہ صفحات میں درج کر دیا گیا ہے۔

ان مکتوبات کے بعد حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی بعض مسائل پر تحقیقات درج ہیں، جو سوال و جواب کی شکل میں درج ہیں پھر طریقہ مجددیہ کا مفصل بیان ہے۔

آخر میں ادعیہ ماثورہ اور ان کا فارسی ترجمہ ہے، خاتمۃ الکتاب پر ایک صد درود شریف اور ان کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے، اس حصہ کو مانتہ صلوٰۃ و صلوٰۃ محمدی سے نامزد کیا ہے۔

غرض کہ یہ چھوٹا سا رسالہ شریعت اور طریقت کے متعدد مسائل پر مشتمل اور نہایت

جامع ہے۔

۶۔ بیاض محمدی۔ یہ رسالہ عملیات پر مشتمل ہے، مولانا نے فارسی زبان میں تحریر فرمایا تھا، مگر محمد احمد اللہ صاحب مظفرنگری نے ۱۳۵۷ھ میں اردو ترجمہ کر کے ایک خاص ترتیب سے رسالہ عطاء المنان کے نام سے شائع کرایا۔ اس کے متعلق مترجم نے تمہید میں جو نوٹ دیا ہے ہم اس کو نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں:-

”عملیات اور تعویذات میں اگرچہ آپ کو زیادہ انہماک و توغل نہیں ہوا مگر چونکہ طبیعت کے ذکی و ذہین واقع ہوئے تھے محض رفاہ خلق اللہ کے لئے تھوڑی توجہ سے اس فن میں بھی کمال کر لیا، جہاں سے عملیات ہاتھ آئے تجربہ کرنے کے بعد اپنی بیاض میں درج فرمالیا۔ باوصف اس عدم توجہی کے جنات اور آسیب آپ کے نام سے کانپتے تھے۔“

نقل:- فقیر مترجم بیاض محمدی کی ایک بنگالی طالب علم سے جو دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے تھے ۱۳۵۵ھ میں ملاقات ہوئی، بریل تذکرہ حضرت مولانا کا ذکر آگیا، وہ صاحب خود عملیات کا شوق رکھتے تھے مگر مولانا سے واقف نہ تھے، آپ کا اسم گرامی سن کر تعجب و حیرت سے کہنے لگے:-

”کیا یہی وہ مولانا ہیں؟ جن کا نام ہمارے اطراف میں اب تک مشہور

ہے کہ جس وقت کوئی خبیث جن یا آسیب کسی کو ستائے اور اس سے لوگ عاجز

ہو جائیں تو شیخ محمد تھانوی ہتھیلی پر لکھ کر آسیب زدہ کو دینے سے جن و آسیب فوراً فرار ہو جاتا ہے۔“

رسالہ بیاض محمدی جو مولانا کا خزانہ عملیات ہے، مولانا کی وفات کے بعد آپ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوری قدس سرہ کے ارشاد سے حضرت قاضی صاحب کے پیر بھائی حضرت مولانا مولوی سید رحم الہی صاحب منگلوری رحمۃ اللہ علیہ نے مکمل طبع کر اکر شائع کر لیا، مگر چند ہی روز بعد حضرت قاضی صاحب کے نام خط آنے لگے کہ آپ نے غضب کر دیا لوگ حب تسخیر کے اعمال ناجائز طور پر عمل میں لا کر فتنے میں پڑ گئے۔

حضرت قاضی صاحب نے یہ معلوم کر کے جس قدر نسخے موجود تھے سب جلوا کر دریا برد کر دئے اور بقیہ بھی دو گنی چو گنی قیمت دے کر مہیا کئے اور تلف کر دئے اس کی تلافی اس طرح کی گئی کہ بیاض محمدی میں سے وہ عملیات تسخیر و حب جو تیر بہدف اور سہل الحصول تھے نکال ڈالے اور مولانا عبدالرحیم صاحب نے دوبارہ ترتیب دے کر مطبع مجتہبائی دہلی کو دیدیا جنہوں نے بحسنہ اس کو فارسی و عربی میں طبع کرا دیا، اور آج تک وہ انتخاب شدہ رسالہ مطبع مجتہبائی سے دو آنے قیمت پر ملتا ہے۔

جس زمانہ میں یہ رسالہ طبع ہوا تھا فارسی زبان کی قدر تھی، مگر عرصہ تیس سال سے فارسی قریب قریب ہندوستان سے مفقود ہو گئی ہے، عرصہ سے اہل علم و شائقین عملیات متمنی تھے کہ یہ مفید عام رسالہ اردو میں شائع ہو جائے، فقیر کو اسی زمانہ سے خیال تھا کہ کسی طرح یہ نایاب اور مفید عام رسالہ اردو میں شائع ہو جائے مگر مکروہات دنیوی سے مجبور تھا۔ آخر ۱۳۵۰ھ میں باوجود ہجوم تفکرات کمر ہمت باندھ کر یہ رسالہ اردو میں مرتب کر لیا اور مخزن عملیات محمدی (۱۳۵۰ھ) اس کا نام قرار پایا۔ (۱)

۷۔ مناظرہ محمدی (۲)۔ یہ رسالہ حضرت مولانا کی قوت تصنیف و تالیف کا ایک نادر نمونہ ہے۔ جب آپ حرمین شریفین سے لوٹے وقت بمبئی پہنچے تو پتہ چلا کہ مولانا فضل حق خیر آبادی نے امام فخر الدین رازی کے بعض اقوال کی تردید میں ایک کتاب لکھ کر شائع کی ہے، آپ نے اس کو پڑھا تو بیحد رنج ہوا، فوراً اس کا جواب لکھنے پر کمر بستہ ہو گئے۔ ایک دن

مراقبہ میں آپ کی ملاقات امام فخر الدین رازی سے ہوئی۔ اس سے آپ پر انشراح ہوا اور راستہ ہی میں قلم برداشتہ مولانا فضل حق کی کتاب کے جواب میں ایک رسالہ لکھ ڈالا۔ دہلی پہنچے تو مفتی صدر الدین آزر وہ صدر الصدور کی خدمت میں پیش کیا، وہ تمہید اور مضمون کو پڑھ کر دنگ رہ گئے۔ آپ سے گلے ملے اور اس رسالہ پر تقریظ لکھ کر اپنی مہربشت کر دی۔

حضرت مولانا کے اس رسالہ کا موضوع فلسفہ ہے، اس کے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ بانی دارالعلوم نے ایک مرتبہ فرمادیا تھا۔

یہ رسالہ اگر کتب درسیہ علم حکمت میں داخل ہو تو قاضی مبارک کے بعد صدرہ کے تحت ذہین آدمی ہی اس کو سمجھ سکتا ہے۔“

یہ رسالہ طبع ہوا تھا مگر اب نایاب ہے۔

۸۔ قسطاس (۱) فی موازنہ اثر ابن عباس۔ “یہ کتاب مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی کتاب دافع الوسواس کے جواب میں تحریر کی تھی۔

۹۔ رسالہ (۲) الہامات الوجود الودود فی تحقیق وحدت الوجود والشہود۔ یہ ایک غیر مطبوعہ فارسی رسالہ ہے، جو حضرت مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا آپ کی قلمی بیاض میں موجود ہے۔ حضرت مولانا رحمہ اللہ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو ۱۷ ذیقعدہ ۱۲۶۳ھ کو مکہ معظمہ میں خاص حرم محترم کے اندر آپ پر وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے پیچیدہ مسئلہ کے بارے میں کچھ انکشافات ہوئے جن کو آپ نے ایک ہفتہ میں ترتیب دے کر قلم بند کیا۔ یہ رسالہ اگرچہ الہامات پر مبنی ہے، لیکن بحث خالص فلسفیانہ اور منطقیانہ ہے۔ حضرت مولانا رحمہ اللہ نے فلسفہ کی اصطلاحات و اصول کو کام میں لا کر ان پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے اور آخر میں وحدۃ الوجود کی جانب اپنے میلان طبیعت کا اظہار کر کے حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب سے اس کی توثیق و تصدیق کرا دی ہے فرماتے ہیں۔

قبل از تسوید این سودا و سود

محملاً دیدیم در واقعہ کہ بود

(۱) تذکرہ اپریل ۱۹۶۲ء

(۲) یہ رسالہ حضرت مولانا کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے اس لئے اس کا ذکر سب سے پہلے ہونا چاہئے تھا، لیکن چونکہ اس وقت اصلی مقصد یہی رسالہ پیش کرنا اور اسی کے موضوع پر تفصیلی بحث کرنی ہے اس لئے اس کے ذکر کو مصلحتاً موخر کر دیا گیا

در قہم با شیخ یعقوب ام بخواب
 گفتم از تقریر من داده جواب
 یعنی تقریر آئینہ کا دل گزشت
 گفت کایں وحدۃ وجود آں خود سرشت
 حق و انصاف است کہ تو گفتی
 گوہر ناسفہ را تو سفتی
 لیک در ظاہر نمی گویم فاش
 تا بزخم عامیاں نبود خراش
 پس بہ سلطان ذکر او مشغول شد
 بردلم فیضان او مبذول شد

اس طرح ایک فتنہ کے ڈر سے دونوں نظریوں کے درمیان مفاہمت کرا دی ہے، یہی وہ مسلک ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد سے اہل تصوف نے اختیار کیا اور اسی مسلک نے اس وسیع خلیج کو ایک حد تک پاٹ دیا جو فرقہ عینیہ اور فرقہ وراہیہ کے نظریوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔



[illegible]

toobaa-elibrary.blogspot.com

حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ

فہرست

۳۱۹	سلسلہ نسب
۳۲۰	حافظ ضامن شہیدؒ کی ولادت
۳۲۰	حافظ صاحبؒ کی بیعت
۳۲۱	حافظ صاحبؒ کی خلافت
۳۲۲	حافظ صاحبؒ کی کرامات
۳۳۱	جہاد کی تیاری
۳۳۳	حافظ صاحبؒ کی شہادت
۳۳۴	شہادت سے پہلے مولانا گنگوہیؒ کو حافظ صاحبؒ کی وصیت
۳۳۵	مرکز اولیاء مسجد پیر محمد تھانہ بھون کی کیفیات
۳۳۶	حافظ صاحبؒ کی اخلاق
۳۳۷	حافظ صاحبؒ کا حلیہ
۳۳۸	حافظ صاحبؒ کے صاحبزادے
۳۳۸	حافظ محمد یوسف صاحبؒ کا حال اور وفات

حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ

مولانا امداد صابریؒ

سلسلہ نسب

حافظ محمد ضامن صاحب کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، آپ کا خاندان اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کا خاندان ایک ہی تھا، آپ کے جدا مجد شیخ محمد عبد اللہ صاحب کے دو صاحبزادے شیخ بلاتی اور شیخ عبد الکریم ثانی تھے، حضرت حاجی صاحب شیخ بلاتی کی اور حضرت حافظ ضامن صاحب شیخ عبد الکریم ثانی کی اولاد تھے۔

قاضی سراج الدین بن شیخ عبد الرحیم بن عبد الکریم بن شیخ محمد بن عبد اللہ بن شیخ عبد الکریم ثانی بن حافظ شیخ نھو بن شیخ عبد الغنی بن شیخ امام بخش بن حضرت حافظ محمد ضامن شہید رحمہ اللہ۔

قاضی سراج الدین قاضی چندین متوفی ۸۵۱ھ بن قاضی محمد موسیٰ عہد اکبری میں حیات تھے (۹۸۲ھ) بن قاضی نصر اللہ (فاح تھانیسر) بن قاضی محمد یعقوب بن شیخ نظام الدین کے تین صاحبزادے شیخ عبد اللہ قاضی محمد آدم شیخ عبد الرحیم ہوئے۔

حضرت حافظ محمد ضامن شہید رحمہ اللہ کے دادا شیخ عبد الغنی تھے۔ جن کا یہ واقعہ مشہور ہے۔ دہلی چند مشائخ کامل ہم عصر تھے۔ چشتیہ نظامیہ میں حضرت شاہ فخر الدین اور قادریہ میں حضرت میر درد صاحب نقشبندیہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اور صابریہ میں حضرت غلام سادات، حضرت غلام سادات صاحب کے تھانہ بھون میں اکثر مرید تھے جس کی وجہ سے وہ وہاں تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ آئے تمام لوگ ملاقات کے لئے گئے مگر حافظ ضامن شہید صاحب رحمہ اللہ کے دادا عبد الغنی صاحب حاضر نہ ہوئے۔ آپ نے دریافت کیا کہ عبد الغنی کیوں نہیں آئے لوگوں نے عرض کیا کہ ان کا ایک حسین و جمیل لڑکا انتقال کر گیا

ہے جس کے صدمہ سے وہ مجنوں الحواس ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا ایک دفعہ ان کو میرے پاس لاؤ۔ مگر وہ نہ گئے۔ اتفاق سے راستہ میں حضرت غلام سادات کو مل گئے۔ آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا ”عشق بامردہ نباشد پائیدار“ اسی وقت ان کا خبط جاتا رہا اور عشق حق غالب ہو گیا مسجد میں بیٹھ گئے اور خدا کی راہ میں فوت ہوئے۔ (۱)

حافظ محمد ضامن شہید کی ولادت

حضرت حافظ محمد ضامن صاحب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ سے چند سال بڑے تھے، حضرت حاجی صاحب ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ حافظ صاحب کی تعلیم کیا تھی یقیناً فارغ التحصیل عالم ہوں گے اور عالم نہ ہوں گے تو عالموں سے کم نہ ہوں گے، بعض شخصیتیں ایک ہی بات سے مشہور ہو جاتی ہیں اور ان کی باقی خوبیاں دب جاتی ہیں۔ حافظ صاحب کی خوبی ان کی تمام فضیلتوں پر غالب آگئی۔ یہ تو مسلمہ ہے کہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی رحمہ اللہ کے تین حضرات حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ، مولانا شیخ محمد محدث اور حضرت حافظ محمد ضامن شہید صاحب رحمہ اللہ مخصوص مرید تھے۔ حضرت حاجی صاحب روحانی اعتبار سے ان تینوں میں نمایاں تھے، لیکن حضرت میاں جی نور محمد صاحب نے خلافت حضرت حافظ محمد ضامن شہید کو عطا فرمائی، حافظ صاحب بھی روحانی اعتبار سے بہت بلند تھے۔

حافظ صاحب کی بیعت

شروع میں جب حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ، حضرت میاں جی نور محمد صاحب سے بیعت ہونے کے لئے گئے تو آپ نے انکار فرمایا۔ آپ کو انکار مقصود نہ تھا بلکہ دیکھنا یہ تھا کہ طلب و خواہش کتنی ہے؟ انکار کے بعد حافظ صاحب نے حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمہ اللہ کے پاس جانا بند نہیں کیا بلکہ بار بار تشریف لے جاتے رہے۔ بولتے کچھ نہیں تھے جا کر خاموش بیٹھ جاتے تھے۔ جب دو تین مہینے آتے جاتے گزر گئے، تو ایک دن حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمہ اللہ نے حافظ صاحب سے پوچھا کیا اب بھی تمہارا وہی خیال ہے یعنی بیعت چاہتے ہو؟ حافظ صاحب نے عرض کیا میں اسی خیال سے آ رہا ہوں مگر خلاف ادب ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کہتا تھا اور نہ اصرار کرتا ہوں، اس پر حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ نے خوش ہو کر فرمایا، اچھا

وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھ کر آؤ، آپ نے حضرت حافظ صاحب کو مرید فرمایا۔ (۱) اور حافظ صاحب سے فرمایا تم آیت کریمہ ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ پڑھا کرو، آپ نے آیت کریمہ بعد نماز عصر پڑھنی شروع کی اور اگلے روز عصر تک ختم فرما کر اس جگہ سے اٹھے، اور اس ایک رات دن میں بجز ضروری حاجات اور نماز وغیرہ کے کوئی اور کام نہیں کیا، اس کے بعد حافظ صاحب کو حضرت میاں جی نے دیگر اذکار و اشغال کی تلقین فرمائی تو اسی ہمت اور استقلال کیساتھ آپ نے ان کو بھی انجام دیا۔ چند روز بعد جس دم کی مشق فرمائی، ایک دم میں ذکر نفی اثبات مع شرائط پانچ ہزار مرتبہ تک پہنچا کر چھوڑ دیا، زیادہ کی ضرورت نہیں سمجھی، کئی سال تک صرف آدھ پاؤ کی مقدار میں کھانا تناول فرمایا۔ اور شیخ کے ساتھ اس قدر ربط پیدا کر لیا تھا کہ فنا فی الشیخ ہو گئے تھے۔ بلکہ اکثر صورت بعینہ حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معلوم ہوا کرتی تھی۔

حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ بیشتر وقت عبادت الہی میں گزارتے تھے، رمضان شریف میں تو رات کو سونا موقوف کر دیتے تھے۔ ۱۵ تاریخ شب برأت سے آخری رمضان تک تمام شب سر بسجود رہتے تھے اور سوائے عبادت الہی کے اور کام نہیں کرتے تھے۔ کچھ عرصہ میں آپ نے مراحل سلوک طے فرما کر اس قدر کمال پیدا کیا اور وسعت حال حاصل ہوئی کہ خارج از بیان ہے۔ اس وقت کے تمام درویش صوفی اور ولی آپ کو پیشوائے دین سمجھتے تھے۔ (۲) اور خاص و عام آپ کے حال و مقام کے معترف تھے۔

حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے شیخ حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے انتہائی محبت و عقیدت تھی، آپ اپنے مرشد کے ہمراہ ان کا جوتا بغل میں لے کر اور توبرہ (۳) گردن میں ڈال کر جھنجھانہ جاتے تھے، ان کے صاحبزادے کی سسرال بھی جھنجھانہ میں تھی، لوگوں نے آپ سے کہا آپ کا اس حالت میں جانا مناسب نہیں، وہ لوگ آپ کو حقیر سمجھ کر رشتہ نہ توڑ ڈالیں، حافظ صاحب نے فرمایا رشتہ کی ایسی تیمسی میں اس طرح جانا ہرگز نہ چھوڑوں گا۔

حافظ صاحبؒ کی خلافت

حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت میاں جی نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی

(۱) ارواح ثلاثہ صفحہ ۱۱۴ (۲) مونس مہجوراں صفحہ ۲۳

(۳) وہ تھیلا جس میں گھوڑے کو دانہ کھلایا جاتا ہے۔

خدمت میں کافی وقت گزارا اور فیض بھی بیکر پلایا، اس لئے حضرت میاں جی نے اپنی زندگی میں حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ کو اپنا خلیفہ مقرر فرمادیا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمہ اللہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ایک دفعہ میرے حضرت میاں جی نور محمد صاحب بعد نماز جمعہ وصیت کرنے لگے جس سے لوہاری والے بہت مغموم ہوئے اور عرض کیا کہ ہم تو جانتے تھے کہ ہمارے گھر میں دولت رکھی ہے جب چاہیں گے مستفید ہوں گے۔ آپ کی باتوں سے ہمارا دل پاش پاش ہوا جاتا ہے ارشاد ہوا گھبراؤ نہیں میرے بہت سے یار تمہارے پاس موجود ہیں، ان کو میرا قائم مقام سمجھو خصوصاً حافظ محمد ضامن صاحب کو، حضرت پیر و مرشد نے مجمع عام میں بالتصریح خلیفہ بنایا اور ضمناً ہم لوگوں کو بھی مجاز کیا۔ البتہ خاص لوگوں سے بالتصریح یہ بھی فرمایا کہ ہم نے فلاں فلاں کو اجازت دی، اس کے بعد حضرت بیمار ہو گئے، فرمایا کہ مجھے میرے وطن جھنجھانہ لے چلو، جب آپ تھانہ بھون تشریف لائے اور مسجد کے پاس میانہ رکھولیا۔ میں بھی حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم مجرد تھے اور حضرت حافظ محمد ضامن صاحب و مولوی شیخ محمد صاحب عمیالدار، میرا ارادہ تھا کہ تم سے مجاہدہ و ریاضت لوں گا۔ مشیت باری سے چارہ نہیں، عمر نے وفا نہ کی، جب حضرت نے یہ فقرہ فرمایا میں چارپائی کی پٹی پکڑ کر رونے لگا۔ حضرت نے تشفی دی اور فرمایا کہ فقیر مرتا نہیں صرف ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوتا ہے۔ فقیر کی قبر سے وہی فائدہ حاصل ہو گا جو زندگی میں میری ذات سے ہوتا تھا، حضرت حاجی صاحب نے فرمایا، میں نے حضرت کی قبر سے وہی فائدہ اٹھایا جو حیات میں اٹھایا تھا۔ (۱)

حضرت حافظ صاحب بیعت کرنے میں بڑے سخت تھے جو شاید اخفائے حال کا اقتضا تھا۔ آپ کے پاس اگر کوئی آتا تو سمجھتے تھے یہ یا تو مسئلہ معلوم کرنے آیا ہے یا بیعت ہونے کی خواہش کرے گا چنانچہ پہلے ہی آپ اس سے فرمادیتے۔

”اگر مسئلہ پوچھنا ہے تو مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھو اگر مرید ہونا ہے تو

حضرت حاجی صاحب کے پاس جاؤ اگر حقہ پینا ہے تو یاروں کے پاس بیٹھ جاؤ“ (۲)

حافظ صاحبؒ کی کرامات

۱۔ حافظ صاحب بڑے پرنداق تھے، باتوں باتوں میں چٹکے چھوڑتے تھے، مرنے کے

بعد بھی مذاق کی عادت نہیں گئی تھی۔ ایک صاحب کشف بزرگ ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے اور مراقب ہوئے۔ ان بزرگ نے مزار مقدس سے واپس آ کر شکایت کی کہ :

”یہ کون بزرگ ہیں میری فاتحہ پڑھنے کے بعد کہنے لگے جاؤ فاتحہ کسی مردہ

پر پڑھو یہاں زندوں پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔“ لوگوں نے بتایا کہ یہ کسی مردہ کا

مزار نہیں بلکہ ایک شہید کی آرام گاہ ہے۔ (۱)

۲۔ حافظ ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ ایسے آدمی کو سخت ناپسند فرماتے تھے جو کسی کی شرافت سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کو تنگ کرتا۔ ایک شخص حضرت حاجی صاحب کے پاس عین دوپہر کے وقت آتا تھا جس کی وجہ سے حضرت کی نیند خراب ہوتی مگر حضرت اپنی شرافت و خوش اخلاقی سے کچھ نہ فرماتے۔ ایک روز حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ کو اس کی حرکت پر بہت غصہ آیا، آپ نے اس کو سختی سے ڈانسا اور کہا بیچارے درویش رات کو تو جاگتے ہیں آخر کچھ تجھ کو لحاظ کرنا چاہئے۔ (۲)

۳۔ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ کے سمجھانے اور نصیحت کرنے کا طریقہ بڑا پیارا تھا، اگر کوئی شخص آ کر کہتا کہ حضرت میں اپنے لڑکے کو قرآن کا حافظ بنانا چاہتا ہوں، دعا فرما دیجئے تو آپ فرماتے ارے بھائی کیوں جنم روگ لگاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس کی عمر بھر حفاظت کرنی ہوگی، آپ اس کو حافظ قرآن بننے سے روکنا نہیں بلکہ سمجھانا چاہتے تھے کہ کہیں اس کو مصیبت نہ سمجھنے لگے۔ (۳)

۴۔ حضرت حافظ صاحب سلف صالحین کا سچا نمونہ تھے، کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتے تھے، سپاہی منش اور نہایت خوش مزاج بزرگ تھے۔

ایک دفعہ آپ گنگوہ تشریف رکھتے تھے، ایک شخص نے دعوت کی جو ایک غریب لکڑہارا تھا، آپ نے قبول فرمائی، کچھ دیر کے بعد حافظ محمد ابراہیم صاحب ڈپٹی کلکٹر مال کے والد نے بھی التجا کی، آپ نے وہ بھی قبول فرمائی، ایک شخص نے آپ سے کہا حضرت وہ پہلا ناراض ہو جائے گا، حضرت نے مکا بنا کر فرمایا ہم اس کا منہ توڑ دیں گے اور کہا وہ لائے گا کیا پانچ چھ روٹیاں اور پیالہ بھر دال، تو یہ اتنے آدمیوں کو کافی ہوگا، ہم اس کا لایا ہوا بھی رکھ لیں گے اور دوسرے کا لایا ہوا بھی اور پھر سب کھا لیں گے۔ چنانچہ وہ لکڑہارا آیا، پانچ چھ روٹیاں جو کی لایا

اور ایک لوٹے میں سیر بھر کے قریب دودھ، حافظ صاحب نے اسے رکھ لیا اور لکڑہارے کو رخصت کر دیا۔ جب دوسرا شخص بھی کھانا لایا وہ بھی رکھ لیا اور سب نے مل کر کھایا۔ (۱)

۵۔ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ صاحب حال بزرگ تھے، ایک مرتبہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کیؒ اور حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ تھانہ بھون سے رام پور جا رہے تھے، جلال آباد پہنچے تو حافظ صاحب کو خیال آیا اگر شاہ جمال مجذوب سے ملاقات ہو جائے تو بہت اچھا ہو، اسی وقت مجذوب صاحب ایک گلی سے نکل کر ہنستے ہوئے سامنے آگئے اور حضرت حافظ صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ (۲)

۶۔ انسان آخر انسان ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کوئی ولی ہو جائے تو انسانی خصلت نہیں چھوڑتی، کبھی نہ کبھی عود کر آتی ہیں، جب لنگوٹے یا کسی جگہ جمع ہو جاتے ہیں وہ کسی عمر کے ہوں اپنی جوانی کی حرکتیں یاد آ جاتی ہیں، چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کیؒ، حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ اور مولانا شیخ محمد محدث اپنی مسجد (جو بعد میں خانقاہ امدادیہ سے موسوم ہوئی) خانقاہ امدادیہ میں جب جمع ہو جاتے اور کھانے پینے کی چیزوں پر چھینا جھپٹی کرتے تھے اور یہ نہیں دیکھتے تھے کہ دنیا ان کو کیا سمجھتی ہے چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ :

۷۔ حضرت حاجی صاحبؒ جب خانقاہ امدادیہ میں قیام پذیر تھے تو ایک چنگیری میں کچھ چنے اور کشمش ملی جلی رکھتے تھے، صبح کے وقت حضرت مولانا شیخ محمد صاحب حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کیؒ ساتھ مل کر کھاتے پیتے اور آپس میں چھینا جھپٹی ہوا کرتی اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھرتے، اس وقت کے مشائخ اس خانقاہ امدادیہ کو دکان معرفت سمجھتے تھے ان تینوں کو اقطاب ثلثہ مانا جاتا تھا، حضرت حاجی صاحب دہلی کے شہزادوں میں علماء بزرگ مشہور تھے۔ مگر پیر بھائیوں کے ساتھ حد سے زیادہ بے تکلف تھے۔ (۳)

۸۔ بعض بزرگوں کی طبیعت جمالی ہوتی ہے اور بعض کی جلالی، حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ جلالی مزاج تھے، ان سے ہر ایک آدمی کو بات کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا، یہی حالت جنات کی تھی، نام سن کر کانپ اٹھتے تھے اور ان سے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے،

چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ ایک اسی قسم کا واقعہ سہارنپور میں پیش آیا۔ سہارنپور میں ایک مکان سخت آسیب زدہ ہونے کی وجہ سے خالی پڑا رہتا تھا اتفاق سے حضرت حاجی صاحب پیران کلیں سے واپس ہوتے ہوئے سہارنپور تشریف لائے تو مالک مکان نے حضرت کو اسی مکان میں ٹھہرایا کہ حضرت کی برکت سے جن دفع ہو جائیں گے، رات کو تہجد کے واسطے جب حضرت حاجی صاحب اٹھے اور معمولات سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص سامنے آکر بیٹھ گیا، حضرت کو حیرت ہوئی کہ باہر کا آدمی اندر کیسے آیا، حضرت نے پوچھا تم کون ہو، اس نے کہا حضرت میں وہ شخص ہوں جس کی وجہ سے یہ مکان متروک ہو گیا ہے، یعنی جن ہوں، مدت دراز سے حضرت کی زیارت کا مشتاق تھا، اللہ تعالیٰ نے آج میری تمنا پوری کر دی۔ حضرت نے فرمایا ہمارے ساتھ محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور پھر مخلوق کو ستاتے ہو، توبہ کرو، حضرت نے اس سے توبہ کرائی پھر فرمایا دیکھو سامنے حضرت حافظ صاحب تشریف رکھتے ہیں ان سے بھی ملے ہو؟ اس نے کہا نہ حضور! ان سے ملنے کی ہمت نہیں وہ بڑے صاحب جلال ہیں ان سے تو ڈر لگتا ہے۔ (۱)

یہ تینوں حضرات حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ، حضرت حاجی صاحب اور شیخ محمد محدث آپس میں بے تکلف تھے۔ ایک دوسرے کو بلا جھجک ٹوک دیتے تھے، اور غلط ہونے پر اعتراف کر لیا کرتے تھے اور کوئی برا نہیں مانتا تھا۔ چنانچہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ نے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کی ایک غلطی پر ٹوکا اور حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ نے اس کو تسلیم کیا اور ان کے لئے دعائے خیر کی۔

۹۔ ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کے ہاں مہمان بہت سے لگے، کھانا کھا تھا حضرت نے اپنا رومال بھیج دیا کہ اس سے ڈھانک دو، کھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ سب نے کھانا کھا لیا اور بچ گیا۔

حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ کو خبر ہوئی، عرض کیا حضرت آپ کا رومال سلامت چاہئے اب قحط کیوں پڑے گا۔ حضرت شرمندہ ہو گئے اور فرمایا واقعی خطا ہو گئی توبہ کرتا ہوں پھر ایسا نہ ہو گا۔ (۲)

حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ کو جو مدارج عالیہ حاصل تھے ان کے متعلق

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ صاحب میرے پیر بھائی مقام منصور میں چھ مہینے رہے۔ اپنے پیر و مرشد کی توجہ کے سبب نعرۂ انا الحق نہیں لگایا، اور کبھی کلمات شطیحات زبان پر نہیں لائے بلکہ اسم و مسلمی میں مستغرق رہتے تھے اور ذکر قلبی و لسانی دونوں ایک وقت میں فرماتے تھے، یہ اجتماع بہت مشکل ہے (۱)

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری مرتبہ فرمایا، فیضان کی تین قسمیں ہیں، فیضان حالی، جیسا کہ عبد اللہ نو مسلم حلقہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید صاحب میں آیا اور گریہ شروع کر دیا۔ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے آنسو اپنی انگلیوں میں لے کر اپنی آنکھوں کے نیچے لگائے جس سے ایک کیفیت ساری محفل پر طاری ہو گئی اور سب وجد میں آگئے یہ فیضان حالی ہے۔ (۲)

حضرت حافظ صاحب نے تھوڑے سی مدت میں تمام روحانی مدارج طے کر لئے تھے اور وہ اس درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ اپنی ہستی کو بھلا چکے تھے، حکیم ضیاء الدین صاحب اپنا چشم دید واقعہ مولنس مہجوراں میں تحریر فرماتے ہیں۔

۱۰۔ ایک روز یام حیات حضرت پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ حلقہ توجہ میں یہ نالائق بھی حاضر تھا اور حضرت پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ محراب مسجد میں جلوہ فرما تھے کہ میری نظر ناگاہ آپ کی طرف جا پڑی تو آپ کا جسم کچھ نظر نہ آیا، اس جگہ ایک شمع روشن تھی، ہر چند غور کیا کہ جسد مبارک کی جگہ شمع نظر آئی، میری بے بصری جو مجھ کو صرف شمع نظر آئی ورنہ اس نور محمدی سے ایک عالم منور تھا۔ (۳)

۱۱۔ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسے مقامات عطا فرمائے تھے کہ آپ جانوروں کی بولیاں سمجھنے لگے تھے، آپ کو قمریوں کا شوق تھا، ایک روز کھانا کھانے کے بعد ایک روٹی قمریوں کو کھلانے کے لئے لائے جس وقت قمریوں کے پنجرے کے قریب پہنچے تو ایک قمری نے صدائے حق بلندی، اس کو سن کر آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اسی وقت ایک شخص آگئے، اپنی کیفیت و حالت کو چھپانے کیلئے آپ فوراً سنبھل گئے اور کھڑے ہو کر فرمایا دیکھو اکثر آدمی راہ میں پانی گرا دیتے ہیں کہ لوگ ریٹ کر گر جاتے ہیں۔ (۴)

۱۲۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کو ولایت کے مقام پر سرفراز

(۱) امداد المشاق صفحہ ۱۱۹ (۲) امداد المشاق صفحہ ۹

(۳) مولنس مہجوراں صفحہ ۴۹ (۴) مولنس مہجوراں صفحہ ۴۴

فرمایا کہ ان پر شیطانی حربوں اور حملوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور شیطان کی پیروی کرنے والے ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت حافظ صاحب کا ایک ایسے ہی شیطان صفت سے واسطہ پڑا، بری طرح ناکام ہوا اور ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک شخص حاجی ولی محمد صاحب کے مرید تھے اور ذکر و اشغال کیا کرتے تھے، اتفاق سے کسی بد باطن نے ان کو کچھ جادو کے منتر سکھائے جس کو وہ پڑھنے لگے، تھوڑے دنوں کے بعد ان کو شیطانی عجائبات نظر آنے لگے، مبتدی تھے ان کے برے اثرات کو نہ سمجھ سکے قرآن شریف کی تلاوت چھوڑ دی، ذکر و اشغال سے منہ موڑ لیا مگر ابھی کچھ ایمان باقی تھا، نیکی کی گھڑی آگئی، ایک دن میں ذکر جبر کر رہا تھا وہ صاحب بھی اتفاقاً ذکر جبر میں شامل ہو گئے ذکر کے وقت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لے آئے اور اختتام تک تشریف فرما رہے، شیطانی کدورت اس کے قلب و دماغ سے زائل ہو گئی۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے کہا اس کو غنیمت جانو یہ بزرگوں کی عنایت من جانب اللہ ہوئی ہے، اب ان منتروں کو نہ پڑھنا، لیکن اس نے ان کی بات پر عمل نہیں کیا، ایک روز بد قسمتی سے یہ سوچا کہ دیکھوں ان خبیث منتروں کا پھر اثر ہوتا ہے یا نہیں، یہ سوچ کر پھر وہ منتر پڑھنے لگا، برے اثرات پھر ظاہر ہوئے بد حالی چھا گئی، حیران و پریشان پھر نے لگا، تھانہ بھون پہنچا، حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حاضری دی، ان سے ملاقات کی، ایک مونڈھے پر ان کے سامنے بیٹھا اور یہ خیال کیا کہ ان منتروں کا ان پر اثر ہوتا ہے یا نہیں، غرض حضرت حافظ صاحب کی طرف متوجہ ہو کر پڑھنا شروع کیا، ایک دفعہ اس کو حافظ صاحب نے باتوں میں اڑا دیا، وہ نہ مانا تو جلال چشتیہ نے جوش مارا، نظر غضب سے دیکھا اور لفظ ”ہوں“ منہ سے نکلا تو اس کو ہوش نہ رہا بے اختیار مونڈھے سے چپٹ گرا اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر جنگل کی طرف چلا گیا۔ (۱)

۱۳۔ اسی طرح ایک جن نے حافظ صاحب کے مرید میاں مولا بخش کو پریشان کیا اور ان کو راستہ چلنے نہیں دیا بلکہ راستہ بند کر دیا، آپ تشریف لائے اور وہ جن ایک فقرہ سن کر راستہ چھوڑ کر فوراً رنو چکر ہو گیا، یہ واقعہ بھی حکیم ضیاء الدین صاحب نے مولنس مہجوراں میں نقل کیا ہے۔

۱۴۔ میاں مولا بخش سے ایک روز حافظ صاحب نے نماز تہجد پڑھنے کے بعد فرمایا آج میں

گھر میں تسبیح بھول آیا ہوں تم لے آؤ وہ تسبیح لینے چلے تو دیکھا کہ محلہ میں ایک آدمی کھڑا ہے ان کو دیکھتے ہی کود کر ایک پاؤں دیوار پر اور دوسرا پاؤں دوسری دیوار پر جو شارع عام پر تھی کھڑا ہو گیا، یہ حرکت دیکھ کر مولا بخش صاحب سمجھ گئے کہ یہ جن ہے اس کی ہیبت ان کے دل پر چھا گئی اور وہ کہنے لگا چلا جا، انھوں نے کہا کہ اے موذی ایک طرف راستہ سے ہٹ جا تو جب ہی جاسکتا ہوں، اس پریشانی میں مولا بخش کھڑے تھے، حضرت حافظ صاحب نے اپنے نور باطن سے معلوم کر لیا، خود تشریف لائے اور مولا بخش کو پریشان دیکھ کر فرمایا، کیوں کھڑا ہوا ہے، انھوں نے بتایا کہ یہ خبیث راستہ روکے ہوئے ہے، حضرت حافظ صاحب نے اس سے فرمایا نا معقول اس کو کیوں روک رہا ہے، وہ جن آواز سنتے ہی فوراً غائب ہو گیا اور حافظ صاحب مسجد تشریف لے گئے۔

۱۵۔ جنات جہاں آپ سے لرزاں و ترساں رہتے تھے وہاں جانوروں کا سردار شیر بھی آپ کے حکم پر چلتا تھا۔ چنانچہ ایک ایسا ہی واقعہ مولا بخش دیوبندی اور حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ کو ایک درگاہ میں پیش آیا جو ایک جنگل میں تھی۔

کلیر شریف سے پانچ کوس کے فاصلہ پر شاہ منصور صاحب کا مزار ہے، جہاں پہلے جنگل تھا۔ ایک مرتبہ حافظ صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ مولا بخش اس مزار پر زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔ احاطہ میں پہنچے، فاتحہ کے بعد حضرت مزار کے مقابل مراقب ہوئے، ایک طرف مولا بخش صاحب بیٹھ گئے، ایک ایک کی شیر مزار کے دروازہ پر پہنچ گیا مولا بخش خوفزدہ ہو گئے۔ آپ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو کہا میرے پاس آ جاؤ، انشاء اللہ کوئی ضرر نہیں پہنچے گا، یہ فرما کر آپ پھر مراقب ہو گئے، مولا بخش آپ کے قریب ہی بیٹھ گئے، وہ شیر بھی حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ کے قریب آ کر دیر تک سر جھکائے سامنے کھڑا رہا، جس وقت حضرت حافظ صاحب نے شیر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو شیر فوراً وہاں سے نکل گیا، اس کے بعد مولا بخش صاحب کو اطمینان کلی ہوا۔ (۱) اور یہ دونوں چھ روز تک وہاں رہے، جب بھوک لگتی درختوں کے وہ پتے جو ہوا سے از خود گر کر زمین پر آپڑتے تھے ان کو حافظ صاحب رحمہ اللہ اور مولا بخش مل کر تناول فرماتے جو ان کو بے حد ذائقہ دار شیریں معلوم ہوتے۔ (۲)

۱۶۔ حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ صاحب کشف بھی تھے، ایک روز تھانہ بھون کی حوض والی

مسجد میں چبوترہ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے کہ دفعتاً اور بے اختیار کہہ اٹھے کہ غلام محی الدین رسالدار کے گھوڑے کو ولایتی کھا گئے، کسی نے اس گفتگو کو شیخ غلام محی الدین کے گھر جا کر دہرا دیا، وہ حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ سے معلوم کرنے آئے آپ نے ان کو باتوں میں لگا کر ٹال دیا اور بتایا نہیں لیکن ان کو شبہ ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے اس دن اور اس تاریخ کو انھوں نے یاد رکھا، تحقیق کی تو پتہ چلا کہ معرکہ کابل میں ایک جگہ ان کے گھوڑے زخمی ہو گئے تو ان کو ذبح کر دیا گیا اور پٹھان لوگ ان کا گوشت کاٹ کر لے گئے۔ یہ بات خدا تعالیٰ نے حضرت حافظ صاحب پر منکشف فرما کر ان کی زبان سے کہلوادی اور یہ واقعہ اسی روز اسی تاریخ کا تھا جس روز آپ نے بتایا تھا۔ (۱)

۷۔ اللہ تعالیٰ سے جو لو لگا لیتا ہے اور اس کے احکام کی پابندی کرتا ہے اس کے لئے کوئی مشکل بات نہیں ہوتی لوگوں کے دلوں کو بدلنا اور ان کو بری عادتوں سے چھڑا دینا معمولی بات ہوتی ہے، حافظ صاحب رحمہ اللہ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ ایک گویا آپ کے پاس بیعت ہونے آیا، وہ گانے بجانے کا عادی تھا اس لئے آپ نے بیعت کرنے سے انکار فرما دیا اور اس کی بری عادتوں کو چھڑانے کی کوشش شروع کر دی اور اس میں کس طرح کامیاب ہوئے ملاحظہ ہو: اللہ دیا قوال گانے بجانے کا پیشہ کرتے تھے، اپنے ہمعصروں میں استاد مانے جاتے تھے، حضرت حافظ صاحبؒ سے عقیدت ہوئی، بیعت کی درخواست کی لیکن آپ نے اس کی بعض عادات ذمہ کی وجہ سے بیعت نہیں کیا۔ باطنی طور سے اصلاح فرماتے رہے، چند سال اسی میں گزر گئے، آخر ایک دفعہ ہولی کے دنوں میں راجہ قصبہ روپڑ کی محفل گرم ہوئی، ارباب نشاط اس میں شریک ہوئے، اللہ دیا کا شمار راجہ کے گویوں میں تھا وہ بھی اس محفل میں موجود تھے، جب شیطانی رنگ رلیاں شباب پر تھیں، شراب نوشی کی ابتدا ہوئی، رفتہ رفتہ سب مست ہو گئے اور جام شراب اللہ دیا کے قریب پہنچ گیا، یہ بہت پریشان ہوئے کہ اتنے میں ان کو جناب حافظ ضامن صاحب شہیدؒ کا خیال آگیا، خیال آتے ہی ان کا دل شیر ہو گیا، انھوں نے فوراً شراب منے سے انکار کیا۔ راجہ غصہ میں پیچ و تاب کھانے لگا، حافظ صاحب کا خیال ایسا بندھا کہ اہل محفل حقیر چنے لگے اور آپ محفل سے اٹھ کر چلے آئے، کسی کو کچھ بولنے کی جرأت نہیں ہوئی، اللہ دیا کی اس وقت عجیب و غریب حالت تھی، اس کے بعد اللہ دیا حافظ صاحب کے پاس پہنچے،

انکے دل کو بڑی تسلی ہوئی، انھوں نے گانے بجانے سے توبہ کی تو حافظ صاحب نے انکو بیعت کر لیا، اللہ دیا نے تنگدستی میں زندگی گزاری اس کے باوجود کبھی گانے بجانے کا خیال نہ کیا۔ (۱)

۱۸۔ چیزوں کی ہیئت کو بدلنا ہر ایک کا کام نہ تھا، پیتل کو سونا بنانا ممکن ہے، لیکن اللہ والوں اور اللہ کے ولیوں کیلئے یہ کام معمولی بات ہے، خاک کو سونا بنانا ان کیلئے بچوں کا کھیل ہے۔

اللہ دیا جھنجھانوی نے ایک روز پڑتلہ پنجابی چپر اس کے ساتھ چار روپے میں خریدا، صرافوں نے جانچا تو وہ پیتل کا تھا لیکن حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو سونے کا کہا تو سونے کا بن گیا اور اس کو تصدیق صرافوں نے کی، یہ واقعہ بھی مولنس مہجورال میں درج ہے

حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ کرامات زیادہ تر ”مولنس مہجورال“ میں سے نقل کی گئی ہیں، اب اور دو کرامتیں ”مولنس مہجورال“ سے ہی نقل کی جاتی ہیں، حافظ صاحب کی روحانی طاقت و ولایت کا ہندوستان کے علماء و مشائخ کا ہر طبقہ معترف تھا اور ان کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

(۱) قصبہ جھنجھانہ میں سید محمود رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور درگاہ امام صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ اس چار دیواری میں حضرت میاں جی نور محمد صاحب کا مزار ہے، ایک عجیب و با برکت مرقد ہے اکثر اہل دل وہاں زیارت کے لئے جاتے ہیں اور محفوظ ہوتے ہیں، وہاں چند مجاور بھی رہتے تھے، ایک دفعہ ان مجاوروں نے اس بات کا چرچا کر دیا تھا کہ حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر و مرشد کے مزار پر صبح کے وقت حاضر ہوتے ہیں، اس کے بعد آپ کا شہر میں کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس بات پر لوگوں کو شبہ ہوا کہ اس طرح حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پر آنا کوئی کرامت ہے کیونکہ آپ جب کبھی تشریف لاتے تھے تو شہر میں کسی کے ہاں ٹھہرتے تھے اور لوگوں سے ملتے تھے اس مرتبہ ایسا کیوں ہوا، اس پر قاضی امیر علی صاحب نے چند مجاوروں کو مقرر کیا، کہ جب آپ تشریف لائیں تو ان کو مطلع کیا جائے۔ چنانچہ آپ کی تشریف آوری کے لئے، منتظر رہے، ایک روز جب حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو قاضی صاحب کو اطلاع دینے کے لئے ان کے گھر پہنچے مگر قاضی صاحب تھانہ بھون گئے ہوئے تھے، جب قاضی صاحب تھانہ بھون سے تشریف لائے تو ان سے پتہ چلا کہ فلاں روز صبح کو حافظ صاحب تشریف لائے تھے انھوں نے بتایا کہ میں اس روز حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا اور

صبح کی نماز حافظ صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ پڑھی، اور میرے سامنے حضرت حجرہ میں داخل ہوئے اور اشراق کے بعد حجرہ سے حسب معمول تشریف لائے حکیم ضیاء الدین صاحب رحمہ اللہ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

”سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو کیا ہمت اور قدرت عنایت فرمائی ہے کہ بعد مکان بھی مانع نہیں جہاں چاہیں آئیں، سیر کو جاتے ہیں“

(صفحہ ۳۶)

۲۔ ایک دفعہ حکیم رحیم اللہ صاحب نے حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ سے عرض کیا، حافظ صاحب سنا ہے اگر درویش کسی پر توجہ فرمائے تو دل پر غیر کا خطرہ ٹھہر نہیں سکتا مگر مجھ کو اس بات پر یقین نہیں آتا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جو پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہلا دیں، خطرہ کیا چیز ہے۔ حکیم صاحب نے کہا بغیر دیکھے یقین نہیں آتا، حافظ صاحب نے فرمایا یہ آپ کیا کہتے ہیں اولیاء کی بڑی شان ہے، یہ بات تو بندہ بھی کر سکتا ہے۔ حکیم صاحب نے جب زیادہ اصرار کیا تو حافظ صاحب رحمہ اللہ نے حکیم صاحب کو ایک مکان میں لے جا کر سامنے بیٹھایا اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر کھڑے ہوئے، حکیم صاحب بہت حیران ہوئے اور یہ کہا کہ میں نے ایسا زبردست عالی تصرف شیخ نہیں دیکھا نہ سنا، بہت بڑے خلیجان اور تردد و میرے دل پر نقش تھے، کھینچ کھینچ کر دل میں لاتا تھا مگر جیسے سیل دریا میں خس و خاشاک کی طرح دریا میں بھر جاتے تھے، اس طرح کوئی غیر کا خطرہ دل میں ٹھہرتا نہیں تھا خدا جانے کیا شے قلب کو خالی کر دیتی تھی۔

جہاد کی تیاری

۱۸۵۷ء کا زمانہ ہندوستانیوں کے لئے انتہائی خطرناک تھا، مغل شہزادے اور بادشاہ عیاشیوں میں منہمک تھے، ان کو آپس کی لڑائی سے فرصت نہیں تھی انگریز ملک میں جہاں نفرت کی فضا پیدا کر رہے تھے وہاں ہندوستانیوں کے مذہب اور دھرم کے بدلنے پر تلے ہوئے تھے، پادری لوگ ہی نہیں بلکہ حکام بھی اور تمام یورپ چاہتا تھا کہ ہندوستان کے تمام لوگوں کو عیسائی بنالیا جائے تاکہ ہمیشہ کی بغاوت سے نجات مل جائے۔ چنانچہ ایسے پروگراموں پر دھڑلے سے عمل ہو رہا تھا، لارڈ ولزلی نے محمود غزنوی کے مظالم کے ترانے گانے شروع

کردئے تھے اور مصنوعی دروازے بنائے گئے تھے جس کا جلوس نکالا جاتا تھا کہ ان دروازوں کو ہم (انگریز) غزنی سے دوبارہ لگانے کے لئے ہندوستان لے آئے ہیں، یہ سو منات کے دروازے ہیں (۱) اس پر آشوب زمانے میں حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ، مولانا عبدالغنی صاحب رحمہ اللہ اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ شریک کار تھے، آپ نے ان حضرات کے ہمراہ بقول حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، مولانا شیخ محمد رحمہ اللہ سے جہاد حریت کے سلسلہ میں تبادلہ خیال کیا، حضرت مولانا شیخ محمد صاحب رحمہ اللہ نے بے سرو سامانی کا ذکر فرما کر جہاد سے اختلاف کیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہم اصحاب بدر سے بھی زیادہ کمزور ہیں؟ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کی رحمہ اللہ نے طرفین کی گفتگو سننے کے بعد فرمایا کہ الحمد للہ انشراح ہو گیا ہے اور جہاد کی تیاری شروع کر دی جائے، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ نے امارت قبول فرمائی، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ سپہ سالار اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ قاضی مقرر ہوئے، اس طرح قصبہ تھانہ بھون دارالسلام بنایا گیا۔ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ نے ان جانبازوں کو ساتھ لے کر تمام ملک میں دورہ کیا، اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو صاف صاف الفاظ میں انگریزوں کی مخالفت کرنے کی تلقین فرمائی اور عوام کو بتلایا کہ انگریزوں کی حکومت ختم کرنے کا اس سے بہتر موقعہ نہیں ہے، انھوں نے دہلی کے مدرسہ کے طالب علم اور بگڑے ہوئے سرمایہ داروں سے بھی وقتی طور کام لیا۔ فتوؤں اور علماء کے احکامات سے ملک کے کونے کونے میں آگ لگائی، اپنی اپنی جگہ شخص زبردست حیثیت کا مالک تھا، عوام بیدار ہوئے علماء کے پرانے شاگردوں نے دل کھول کر حصہ لیا، نتیجہ ظاہر تھا، انگریز بھی طاقت میں دیوانہ اور نیا شکاری تھا، جہاد آزادی ۱۸۵۷ء کا آغاز ہوا، ہزاروں مسلمان اسلامی جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ (۲) ہتھیار بے ہتھیار سب مرد میدان بن گئے، بدن پر کپڑے بھی درست نہیں تھے مگر گھر کا اسباب اور بیوی کے زیور خیرات کر کے جہاد میں شریک ہوئے اور پھر زندہ و سلامت نہ آئے۔ لا تعداد نوجوانوں نے حصہ لیا، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ اور حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمہ اللہ اور ان کے ساتھی تحریروں اور تقریروں تک محدود نہیں رہے بلکہ شاملی کے جہاد آزادی ۱۸۵۷ء میں

حصہ لیا، حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ اس معرکہ میں شرکت کے لئے پہلے سے تیاری فرما رہے تھے جس کا ذکر حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف ”مونس مہجوراں“ میں فرمایا ہے۔ آپ نے ایک خط حکیم ضیاء الدین صاحب رحمہ اللہ کو اپنی شہادت سے ایک ہفتہ پہلے ملاقات کے لئے لکھا تھا جس میں غالباً آپ نے اپنا پورا پروگرام حکیم صاحب کو بتا دیا ہوگا جس کا اظہار اس خط میں بھی ہوتا ہے:

برادر دینی حکیم محمد ضیاء الدین، السلام علیکم

واضح ہو کہ تمہاری تحریر کے مطابق میرا دل متمنی ملاقات ہے لازم کہ بغور مطالعہ اس خط کے اپنے تئیں یہاں پہنچاؤ، ایسا نہ ہو کہ کہیں توقف میں حسرت ملاقات دل میں رہ جائے، عاقل کو اشارہ کافی ہے باقی حال بروقت ملاقات بیان کیا جائے گا والسلام، اس تحریر سے ثابت ہے کہ آپ کو اپنی شہادت کا حال معلوم ہو گیا تھا اور بعض باتیں مقتضائے وقت کی بنا پر لکھنا مناسب نہیں، لاچار قلم انداز کی گئیں۔

حافظ صاحب کی شہادت

حافظ صاحب کی شہادت کی تیاری کا ذکر حکیم صاحب نے دوسری جگہ بھی فرمایا ہے، ایام غدر جس سال میں حضرت پیر و مرشد رحمہ اللہ شہید ہوئے، یوں فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو حوریں پیالے لئے ہوئے مکانوں کی منڈیروں پر کھڑی ہیں جس کا جی چاہے لے لے اور برخلاف اور دنوں کے ان ایام میں حضرت پیر و مرشد رحمہ اللہ ولولہ محبت الہی میں ایسے مست اور مخمور ہوئے تھے کہ اکثر ذکر شہادت بر زبان تھا اور بہت سی باتیں اسرار کی کہہ اٹھتے تھے، ستر حال کا چنداں لحاظ نہ رہتا تھا اور جو کوئی بیعت ہونا چاہتا تھا برخلاف عادت بلا تامل بیعت کر لیتے تھے اور جس وقت ارادہ معرکہ کیا۔ غسل فرما کر لباس نیاز زیب تن شریف فرمایا اور یہ لباس بہت روز پیشتر رکھ چھوڑا تھا حالانکہ اس کے بعد کے کپڑے بنائے ہوئے استعمال فرمائے اور وہ لباس اس دن کام آیا اور نعلین شریف کچھ بوسیدہ نہ تھیں مگر وہ بھی نئی منگا کر زیب پا فرمائیں، اور یہاں تک سامان لباس وغیرہ کا اہتمام کیا تھا کہ خوشبو ملی، سرمہ لگایا، دستار پیچ دار سپاہیانہ وضع شمشیر لے کر شربت دیدار کی تمنا میں علم خواں بنا کر مردانہ اور مشتاقانہ برسر معرکہ جاں بحق تسلیم فرمائی جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

تو در کو تیو عاشقان چناں جان بد ہند
کہ آں جان ملک الموت نلنجد ہر گز

اور جس وقت نعلش مبارک لینے آئے تھے، جسم شریف سے عطر حسن اور گل کی خوشبو آتی تھی، اس نالائق کا دماغ بھی اس وقت اس خوشبو سے مشرف اور معطر ہوا اور جناب حاجی (امداد اللہ) سلمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس وقت تصدیق فرمائی، افسوس وہ نور جسم اور جسم معطریوں سبک سیر ہوا، اور میں یہاں پا بگل رہا بقول آنکہ ۷

دستگیری نے دیا ہائے ارادت در گل
آشنائی نے دیا غمت بے پایاں

شہادت سے پہلے مولانا گنگوہیؒ کو حافظ صاحبؒ کی وصیت

حافظ صاحب نے مولانا گنگوہیؒ کو وصیت فرمائی کہ بوقت شہادت میرے پاس رہنا، چنانچہ مولانا گنگوہیؒ آپ کو گولی لگنے کے بعد قریب کی مسجد میں لے گئے اور اپنے زانوں پر حافظ صاحب کا سر رکھا اسی عالم میں اپنے اللہ سے جا ملے۔ (۱)

حکیم ضیاء الدین صاحب نے معرکہ شمالی ۱۸۵۷ء میں حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ کی شرکت اور شہادت کا ذکر اپنی اس تالیف ”مونس مہجور اں“ میں دوسری جگہ فرمایا ہے، تحریر کرتے ہیں:

”دفعۃً جہاں میں ایک شور پیدا ہوا۔ ہنگامہ قتل اور غارت گری چاروں طرف سے ایسا گرم ہوا کہ شاید کبھی نہ ہوا، جو لوگ دیندار اور جری تھے، غیرت اور حمیت اسلامی سے اکثر شہید ہو کر سوائے دار البقاء رحلت فرما ہوئے یا خانہ ویران ہو کر در بدر رہے یا بیت اللہ شریف یا کسی اور دار اسلام کو تشریف لے گئے، اب ہندوستان میں گویا دنیا پلٹ گئی۔ دین و دنیا کی اچھی بات گم ہو گئی، کیا عرض کروں یہاں یہ فسانہ غیر مقصود ہے اپنا درد و غم اور قصہ حسرت و الم کچھ اور ہے

حضرت پیر و مرشد نور اللہ مرقدہ و قدس سرہ نے بھی ضرر دنیا و دین کا کچھ خیال نہ فرمایا، کمر ہمت چست باندھ کر امر حق پر جان و مال قربان کیا اور ذوق و شوق الہی میں ایسے مست ہوئے کہ کسی طرح کا تردد نہ ہوا اور تمنائے شربت شہادت اور جام کوثر میں ہماری بے بسی کا بھی کچھ

خیال نہ فرمایا، سبحان اللہ! کیا ہمت مرداں مدد خدا کا تماشا دکھلا کر مردانہ اور مشتاقانہ بتاریخ چوبیسویں محرم الحرام (۱۲۷۴ھ) بارہ سو چوہتر نبوی ﷺ بر سر معرکہ شہادت نوش فرمایا کہ خوب داد ہمت لے گئے اور داغ حسرت دے گئے۔“

یہ تمام بزرگان دین انقلابی تحریک کے کرتادھرتا تھے، حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ اس معرکہ میں شہید ہوئے اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ زخمی ہوئے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ گرفتار کر لئے گئے اور چھ ماہ بعد رہا کئے گئے۔

مرکز اولیاء مسجد پیر محمد تھانہ بھون کی کیفیات

حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ اور مولانا شیخ محمد محدثؒ کی باہم مجلسوں اور ملاقاتوں کا مرکز مسجد پیر محمد صاحب تھانہ بھون تھی۔ جس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے، یہ نقشہ کھینچنے والے حضرت مولانا شیخ محمد محدث کے ایک مرید حکیم محمد عمر چرتھا ولی صاحب ہیں:

”سبحان اللہ! وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ یہ مسجد عبادت گاہ قدسی نفساں تھی، ہمپایہ نجوم یہاں کے نمازی تھے، ہم مرتبہ فلک یہاں کی زمین تھی، ایک طرف شمال کے حجرے میں مثال قطب شمالی عاشق ذوالجلال، شہید لم یزلی حافظ ضامن صاحب شہیدؒ یاد الہی میں مشغول رہتے تھے۔ ایک جانب جنوب کی سہ دری میں حضرت فیضدرجت سلطان زمین ولایت و کرامت، ماہ آسمان رفعت و عظمت، درویش صاحب برکت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ سرگرم قال اللہ و قال الرسول رہے اور مسجد کے سامنے کو گرتوں پڑتوں کے تھامنے کو مشرق کے حجرے میں ہمارے مرشد مشفق قدس اللہ سرہ الخالق کبھی درس و تدریس طلباء میں کبھی مشاہدات ذات و سلطان اذکار میں مستغرق، ہر ڈھنگ میں زیر قدم نبی مقبول، باطن میں سب سے الگ ظاہر میں شامل رہتے، تینوں صاحب علاوہ اتحاد نسب، ایک پیرمیاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی کے مرید۔ وہ ماہ نو تو وہ بدر، وہ بدر تو وہ خورشید، جب کوئی شخص مرید ہونے کے لئے اس قافلہ میں آتا، ہفتوں بلکہ مہینوں بار بیعت نہ پاتا، جس کے پاس جاتا وہ اپنے سے بہتر دوسرے کو بتلاتا۔ دن رات پانچ سات طالب علم بحث مابعد و ما سبق میں مصروف، کوئی ذکر کلمہ بطیب سے مطیب، کوئی تلاوت کلام زیبا سے مزین، کسی کا دل پر اضطرار صورتِ سیماب، گرمی شغل ہو

سے جواب برق مضطر، کسی کا سینہ فگار ضربات اسم ذات حق سے نمونہ شق القمر کوئی آٹھوں پہر بارہ تسبیح کے ذکر میں، کوئی نفی اثبات پر نظر جمائے ہوئے، کوئی ذکر خفی کے ذریعہ دھیان لگائے ہوئے، کوئی مجرد اللہ کی ضربیں لگاتا اسم ذات پڑھتا۔ کوئی درودِ نامحود پڑھنے میں دل و جان سے متوجہ، کوئی ادائے نوافل و وظائف میں اطمینان سے متوجہ، کوئی قرآن خوانی کرتا، کوئی مراقبات میں جانفشانی کرتا، کوئی تفسیر پڑھتا، حدیث سند کرتا، کوئی فقہ و اصول میں جدوجہد کرتا کوئی منازل درویشی کی تحقیق میں کوئی مراحل و مراتب تصوف کی تصدیق میں، طرہ برآں کسی طرف تسبیح خوان کبوترانِ یاہو، کسی طرف کچھ قمریان مشغول حق سرہ، اور جب کبھی دو چار دل فگار مریدان رشید حضرت ممدوح الاذکار میں سے مثل مولانا محمد قاسم نانوتوی، میاں جی کمال الدین چرتھاؤلی غفر لہما اللہ الولی، خواجہ حکیم ضیاء الدین رامپوری یا مولوی رشید احمد گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ آتے جاتے اور ہی رنگ جماتے، جہاں گل وہاں خار، جہاں نیک وہاں نکو ہیدہ کار، جس جگہ یہ سب حضرات وہاں ہم سا بھی واہیات کم محنت، غفلت شعار، محض مشتاق دیدار، اپنے مرشد کا چہرہ دیکھنے کے مارے سب سے کنارے ٹمٹکی لگائے ہوئے ذکر سے مطلب نہ فکر سے واسطہ، دیدکی عید میں شد بدگنوائے ہوئے، ہر شب میں وقت سحر ذکر جہر کا وہ شور بڑھتا کہ دن چڑھے اٹھنے والا بھی نہایت ذوق و شوق سے اول وقت اٹھ کر صبح کی نماز جماعت سے پڑھتا، ایک طرف گوشہ جنوب احاطہ مسجد (پیر والی) میں مولوی محمد اعلیٰ کی قبر مثل پارہ سرا خضر کے پائے میں۔ یہ بزرگ مولانا صاحب (شیخ محمد محدث) کے داد بھائی ہیں، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے، معصرتھے، عالم وفا ضل، درویش کامل، صاحب نظم و نثر تھے ”اصطلاحات الفنون“ آنحضرت کی بہت بڑی کتاب ہے، فی زمانہ بہت کارآمد ہے ایک مرتبہ طبع ہوئی اب نایاب ہے۔ (۱)

حافظ صاحبؒ کے اخلاق

اپنے پیرو مرشد حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید کے عاشق زار حکیم ضیاء الدین صاحب صاحب اپنی تصنیف ”مولنس مہجوراں“ میں اپنے پیرو مرشد کے اخلاق کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے اس ذات عالی کو کیا بے نظیر پیدا کیا تھا کہ کچھ کہا نہیں جاتا اور بایں صورت و شان بے کمال ایسے بے ساختہ اور بے تکلف تھے کہ تصنع کا

گمان بھی نہ آتا اور ظاہر و باطن وہ صاف معاملہ تھا کی ریا کی بوباس نہ تھی اور ہر ایک یہ جانتا تھا کہ مجھ سے نہایت محبت رکھتے ہیں۔ ہیبت حق چہرہ پر نور سے ایسی عیاں تھی کہ ہر ایک دفعۃً آنکھ نہ ملا سکتا تھا اور مردم شناسی کا یہ ملکہ تھا کہ کبھی خطانہ ہوتا تھا اور جیسا جس کو دیکھتے ویسا ہی اس سے کلام فرمایا کرتے تھے۔ غرض کسی حال میں افراط و تفریط نہ تھی اور باوصف خانہ داری اور اہل و عیال کے نہایت آزاد اور مستغنی المزاج رہتے تھے گویا فکر دنیا پاس بھی نہ آیا تھا۔ دانائے عصر اور علماء زمانہ ہر ایک مخلص و منقاد تھا، نادان و منافق سے کچھ باک نہ تھا، ہر وقت عشق الہی میں مست و سرشار رہتے تھے، دل کی کیفیت چہرہ مبارک پر معلوم ہو ا کرتی تھی، آنکھیں ہر وقت مخمور رہتی تھیں، محبت الہی کا صورت شریف پر بین ظہور تھا اور اتباع شریعت یہ کچھ تھا کہ ادنیٰ بدعت بھی جڑ سے اکھاڑ دیا کرتے تھے اور خود مسئلہ مختلف فیہ میں احتیاط پُرل فرمایا کرتے تھے اور اوامر و نواہی میں شان فاروقیت کا عروج ہوتا تھا، زہد و تقویٰ پر ایسی کمرچست باندھی تھی کہ جان تک سے دریغ نہ فرمایا۔ اللہ اللہ کیا اوصاف بیان کروں مختصر یہ کہ ایک دریائے نور محمدی کا ظہور تھا۔

حافظ صاحبؒ کا حلیہ

آپ کا حلیہ مبارک حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی نے اپنی طویل نظم میں بیان فرمایا ہے جس کو مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے۔

حافظ صاحب کا رنگ گورا سفید تھا، چپک کے کچھ داغ چہرے پر تھے لیکن خوشنما معلوم ہوتے تھے، قد درمیانہ درجہ کا تھا اور نہایت متناسب، خوبصورت اور شہرے سے رعب نمایاں، آنکھوں میں سرخی چمکتی تھی، سینے پر سیاہ بال تھے، بھوئیں آپس میں ملی ہوئی نہیں تھیں بلکہ کشادہ تھیں، سر منڈواتے رہتے تھے، گردن بلند تھی اور چہرے پر تبسم رہتا تھا، بے تکلف سیدھے سادھے بزرگ اور ظریفانہ طبیعت کے مالک تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے جو حافظ صاحب کا منظوم حلیہ لکھا ہے اس کے کچھ منتخب شدہ اشعار یہ ہیں۔

صورت و سیرت میں وہ سب سے نبیہ
 حضرت فاروقؓ کی بالکل شبیہ
 قامت موزوں ہے جو طوبی مثال
 اس کی صفت ہو گئی لکھنی محال
 قد متوسط ہے نہ کوتاہ، نہ دراز
 سامنے جس کے کرے طوبی نیاز
 چہرہ پر نور میں یوں ہے دمک
 نور تجلی کی ہو جیسے چمک
 سرخی چشم اس کی جو یاد آئے ہے
 آنکھوں سے یاں خوں ہی بہہ جائے ہے
 ان کے محاسن میں یوں چمکے عذار
 شعلہ کے جوں دود سیہ میں بہار
 ایسی فصاحت سے وہ کرتے کلام
 جس کے ہوں الفاظ، لطیفہ تمام
 چہرے پہ چچک کے جو دیکھو نشان
 قطرہ شبنم گل تر پہ عیاں

حافظ صاحبؒ کے صاحبزادے

مولانا حکیم حافظ محمد یوسف صاحب حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ کے
 صاحبزادے تھے، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مخصوص خلفاء میں سے تھے۔ حضرت
 حاجی صاحب نے ضیاء القلوب ان ہی کی فرمائش پر لکھی تھی۔

حافظ محمد یوسف صاحب کا حال اور وفات

حافظ محمد یوسف صاحب ابتداء میں الوری میں ملازم تھے اور ریاست بھوپال میں تحصیل دار
 بھی رہے۔ (۱) حافظ محمد یوسف صاحب اپنے والد ماجد کی طرح بہت ظریف، خوش طبع اور

(۱) آپ بیتی مولفہ مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی صفحہ ۵

صاحب تصرف و کشف و کرامات بزرگ تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ نے آپ کے تصرف و کشف کے متعدد واقعات اپنی آپ بیتی میں تحریر فرمائے ہیں۔ حافظ محمود صاحب جو قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خسر۔ ان سے لڑکپن میں فرمایا کرتے تھے۔ محمود ہمارے پاس کچھ چٹکے ہیں ہم سے پوچھ لینا گھر بیٹھے دو سو ملا کریں گے۔ اس زمانہ کے دو سو آج کل کے ہزاروں کے برابر تھے۔ حافظ محمود صاحب نے اس کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی۔

عصر کی نماز کی تکبیر ہو رہی تھی۔ صف سے آگے منہ نکال کر فرمایا ارے محمود ہماری بات یاد رکھنا، کل ہمیں سفر میں جانا ہے وہ سمجھے کہ آپ کو گنگوہ یا جھنجھانہ وغیرہ جانا ہوگا، اگلے روز حافظ صاحب نے گنگوہ، تھانہ بھون، جھنجھانہ وغیرہ میں خطوط تحریر فرمائے کہ آج سفر کا ارادہ ہے، لوگ سمجھے کہ قرب و جوار میں اکثر جلیا کرتے تھے ممکن ہو کہ کسی جگہ جانے کا ارادہ ہو یہ کسی نے نہیں سمجھا کہ آپ اس دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں تشریف لے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن عصر کی نماز جماعت سے پڑھی، اس مسجد کے صحن کے سامنے ایک چارپائی پڑی تھی جس پر آپ اکثر لیٹا کرتے تھے وہاں پہنچ کر کرتا اتار اصراف لنگی بندھی ہوئی تھی، قبلہ کی طرف منہ کر کے لیٹ گئے اور یہ جاوہ جا۔ نمازی مسجد سے نکل کر محل حویلی جو مسجد کے قریب بہت مشہور و معروف مکان آپ کے اعزہ کے تھے وہاں تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ مسجد کا موزن بھاگا ہوا گیا چلو حافظ جی کو دیکھو کیا ہو گیا ہے۔ لوگ سب واپس ہوئے تو دیکھا کہ حضرت حافظ محمد یوسف صاحب ابدی سفر پر روانہ ہو چکے ہیں۔ (۱)

حضرت نانوتویؒ نے حافظ ضامن شہیدؒ کے متعلق پینسٹھ اشعار کہے جن میں سے چند یہ ہیں

نہ پوچھ ہو رہے ہیں کیوں خفا ہم جاں سے
ہمیں پالا پڑا ہے اب کے غمہائے دوراں سے
کہیں سے مول لے دے دل مجھے کچھ اور اے ہمد
کہ اٹھنے کا نہیں بار غم اس قلب پریشان سے
چھپا آنکھوں سے وہ نور مجسم خاک میں جا کر
کہ جس کا خال پا بہتر تھا اس مہر درخشاں سے

شہید راہ حق حافظ محمد ضامن چشتی
 بنایا تھا جسے حق نے ملا کر عشق و عرفاں سے
 فراق یار میں جینا تعجب ہے ولے ہمد
 اجل سے اٹھ سکے شاید نہ ہم بارگناہاں سے
 نظر آئے گی یارب پھر بھی وہ صورت کبھی ہم کو
 سنیں گے پھر بھی وہ آواز ان لبہائے خنداں سے
 کسی کا کیا گیا ہر رنج فرقت کی مصیبت کو
 کوئی جا کے مگر پوچھے ضیاء الدین نالاں سے
 ہوئی ہم سے خطا یا تھی کشش حب الہی کی
 کوئی پوچھے سبب رحلت کا اس سالار خوباں سے
 گناہوں کے سبب گر ہم نہیں تھے لائق صحبت
 تو ہم کو بخشوا لینا تھا کچھ کہہ سن کے رحماں سے
 اگر ممنوع تھا ہم سے گنہ گاروں کا لے چلنا
 تو تنہا اس طرح جانا بھی نازیبا ہے سلطان سے
 اگر قاصد مجھے کوئی وہاں تک کا بہم پہنچے
 تو کہلا کر کے بھیجوں یوں میں اس سالار نیکاں سے
 مبارک ہو تمہیں وصل خدا خلد بریں میں، پر
 ہمیں یوں چھوڑ کر تنہا تمہیں جانا نہ تھایاں سے
 غم فرقت میں یاں گزرے ہے پر کچھ بن نہیں پڑتی
 تمہیں فرصت نہیں وال لذت دیدار یزداں سے
 تمہارے ہجر میں جان جہاں کچھ بن نہیں آتا
 دل حسرت زدہ گھبرائے ہے سیر گلستاں سے
 دل مایوس کی کوئی نہیں صورت تسلی کی
 مگر ہاں سرزکا لو تم مگر گنج شہیداں سے
 تمہاری بزم پر انوار جب یاد آئے ہے ہم کو
 تو اک شعلہ سا اٹھتا ہے ہمارے قلب سوزاں سے

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

فہرست

۳۴۴	خاندان
۳۴۸-۳۴۷	پیدائش، مزید تفصیل، تعلیم
۳۴۹	بیعت
۳۵۱	سفر حج، مریدین
۳۵۲	انقلاب ۱۸۵۷ء
۳۵۳	اخلاق و عادات
۳۵۵	قیام مکہ مکرمہ کے مشاغل
۳۵۶	حاجی صاحب کے علوم
۳۵۸	ایک کشف، خداداد علوم
۳۵۹	حسنات الابرار سیات المقربین، دو حدیثوں کی مطابقت
۳۶۰	خدا کو دنیا میں دیکھنا، الدعاء مخ العبادۃ
۳۶۱	کرامات امدادیہ، قطب ارشاد، اتباع سنت و کرامات
۳۶۷	وفات
۳۶۸	تصنیفات، مثنوی مولانا رومؒ، غذائے روح
۳۶۹	جہاد اکبر، مثنوی تحفۃ العشاق، دردنامہ غمناک، ارشاد مرشد
۳۷۰	ضیاء القلوب، وحدۃ الوجود، فیصلہ ہفت مسئلہ
۳۷۱	گلزار معرفت، مرقومات امدادیہ اور مکتوبات امدادیہ
۳۷۲	تضمین
۳۷۳	تاریخی مادے، غزل کا نمونہ، تقابل اور تضاد خیالی
۳۷۴	حمدیہ غزل، ایک غزل کے پانچ اشعار
۳۷۶-۳۷۵	فارسی اشعار، اردو نثر کا نمونہ، فارسی نثر کا نمونہ

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی

مولانا عبدالرشید ارشد

انیسویں صدی عیسویں میں ملک و ملت جن ممتاز ترین اور عظیم المرتبت شخصیتوں پر فخر کر سکتی ہے ان ہی میں سے ایک مایہ ناز اور عہد آفریں شخصیت شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہ کی ہے، یہ زمانہ ہندوستان اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کا نہایت پر آشوب دور تھا، چھ سو سال کی حکومت پر انگریز رفتہ رفتہ قابض ہوتے جا رہے تھے، اس میں بہادری و جاں بازی کا دخل کم اور فریب کاری و جعل سازی کا دخل زیادہ تھا۔

حضرت شیخ المشائخ نے ان حالات سے متاثر ہو کر روحانیت اور سیاست کے امتزاج سے ایک ایسی جماعت قائم کی جو ایک طرف بزم علم و عرفاں اور رشد و ہدایت کی دوسری طرف جنگ و پیکار اور میدان سیاست کی شہسوار تھی، گزشتہ پوری ایک صدی میں اس جماعت نے اپنے علم و عمل اور اصلاح و ہدایت کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ء کے معرکہ جہاد شاملی سے لے کر ۱۹۴۷ء تک حصول آزادی کیلئے ملک و ملت کی جو زبردست خدمات انجام دیں اور سیاسی غلامی کی فضا میں ذہنی آزادی کو جس طرح برقرار رکھنے کی کامیاب جدوجہد کی ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم حضرات کے اسماء گرامی اور ان کی خدمات جو سینکڑوں میں چند مثالیں ہیں اسی ”سلسلۃ الذہب“ کی نامور ترین کڑیاں ہیں۔

خاندان

حضرت شیخ المشائخ نسباً فاروقی تھے، آپ کا سلسلہ نسب پچیس واسطوں سے سلسلہ تصوف کے مشہور بزرگ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، اس سے اوپر اختلاف ہے بعض لوگوں نے حضرت ابراہیم بن ادہم کا امام زین العابدین بن امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہونا بیان کیا ہے، مگر یہی صحیح ہے کہ وہ فاروقی النسب تھے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حافظ محمد امین ہے، مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے ہم جد تھے جن کے اجداد اورنگ زیب سے لے کر انقلاب ۱۸۵۷ء تک تھانہ بھون (ضلع مظفرنگر) میں برسر اقتدار رہے، قاضی القضاۃ کا منصب بھی اسی خاندان میں تھا اس سلسلے کی آخری کڑی قاضی عنایت علی خاں تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں شالی کے معرکے میں انگریزی فوج سے مردانہ وار جنگ کی اور اسی کی پاداش میں اس خاندان کو نہ صرف دنیوی وجاہت سے محروم ہونا پڑا بلکہ تمام خاندان منتشر ہو کر تباہی کی آخری منزل پر پہنچ گیا۔

مولانا غلام رسول مہراپنے مضمون ”بزرگان دیوبند“ میں لکھتے ہیں۔

”بزرگان دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اولین درجہ کا احترام و اعزاز حاصل ہے، وہ حضرات حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے اسماء گرامی اس سرزمین کے آسمان پر ان درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں اور سمندروں میں ملاحوں کو راستہ بتاتے ہیں وہ اپنی زندگیوں میں علم و ہدایت کے مشعل بردار تھے۔ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ عملی نمونے چھوڑ گئے جو دلوں اور روحوں میں برابر دین حقہ کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے خصوصاً مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی تو ایک یادگار دارالعلوم دیوبند ایسی ہے۔ جو تقریباً ایک صدی سے اس وسیع سرزمین پر دینی علوم کے قیام و بقاء کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے، اس کی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی ہے جن کے کارنامے دین و سیاست دونوں کے دائرے میں قابل فخر ہیں۔“

تاریخ مشائخ چشت میں جناب خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ”حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ ۱۲۳۳ھ میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد حجاز چلے گئے انہوں نے صابریہ سلسلہ کو عروج کی انتہائی منزل پر پہنچا دیا اور ان کے فیوض ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہے دیگر ممالک اسلامیہ میں بھی ان کے اثرات پہنچے۔ حضرت میاں جیونور محمد جھنجھانوی (المتوفی ۱۲۵۹ء) کے خلیفہ تھے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب حجاز سے واپس آئے تو ارشاد و تلقین کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندوستان کو منور کر دیا اللہ تعالیٰ نے انہیں دل و دماغ کی بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا وہ انیسویں صدی کی تین عظیم الشان تحریکوں کا منبع و مخرج تھے۔ مسلمانوں کی دینی تعلیم کو فروغ دینے کیلئے جو تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی، جس نے بالآخر دیوبند کی شکل اختیار کی ان ہی کے خلفاء و مریدین کی پر خلوص جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) مولانا محمد قاسم (المتوفی ۱۲۹۷ھ) مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حاجی محمد عابد حسین دیوبندی حضرت حاجی صاحب کے خلیفہ تھے، شیخ الہند رحمہ اللہ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے جانشین تھے۔ ان ہی بزرگوں کی کوشش سے دینی تعلیم کا چرچا ہوا۔

۲۔ باطنی اصلاح و تربیت کے لئے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں دو بزرگوں کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ حاجی امداد اللہ صاحب کے خلیفہ تھے، نصف صدی سے زیادہ انہوں نے ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے گوشے میں بیٹھ کر مسلمانوں کی زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاح کا کام کیا۔ لیکن مولانا تھانوی رحمہ اللہ کی تحریک میں وہ وسعت اور گہرائی پیدا نہ ہو سکی جو مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کی دینی تحریک کو حاصل ہوئی (۱)۔

(۱) فاضل مضمون نگار کی یہ عبارت معنی خیز اور مبہم ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ الحمد للہ جماعت علماء دیوبند میں خلوص و للہیت کے سبب خدمت دین اسلام میں اشتراک عمل کا عنصر غالب پایا جاتا ہے، اس لئے ہمیں قطعاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی کو فاضل اور کسی کو مفضل بنائیں، یا کسی کی خدمات کو اعلیٰ اور کسی کی سعی و عمل کو کم درجہ بتائیں، یہ موازنہ عام طور پر افراط و تفریط سے خالی نہیں ہوتا۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو علماء امت نے مجدد مائتہ اربعہ عشر تسلیم کیا ہے، اپنے دور کے مشاہیر اور یگانہ روزگار ہستیاں آپ کے دامن فیض سے وابستہ رہی ہیں۔ ۲۰ سے زائد موضوعات پر ایک ہزار سے زائد کتب و رسائل اور مواعظ و ملفوظات کی مجلدات و کتب آپ کی شائع ہوئی ہیں۔ قریب آدھا درجن رسائل آپ کے علمی و روحانی فیضان کو عام کرنے کیلئے مسلسل شائع ہوتے تھے۔ مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کی تحریک میں شائع ہونے والی کتب و رسائل کی تعداد بھی قابل ذکر ہے (۲) (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰) (۲۱) (۲۲) (۲۳) (۲۴) (۲۵) (۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) (۳۱) (۳۲) (۳۳) (۳۴) (۳۵) (۳۶) (۳۷) (۳۸) (۳۹) (۴۰) (۴۱) (۴۲) (۴۳) (۴۴) (۴۵) (۴۶) (۴۷) (۴۸) (۴۹) (۵۰) (۵۱) (۵۲) (۵۳) (۵۴) (۵۵) (۵۶) (۵۷) (۵۸) (۵۹) (۶۰) (۶۱) (۶۲) (۶۳) (۶۴) (۶۵) (۶۶) (۶۷) (۶۸) (۶۹) (۷۰) (۷۱) (۷۲) (۷۳) (۷۴) (۷۵) (۷۶) (۷۷) (۷۸) (۷۹) (۸۰) (۸۱) (۸۲) (۸۳) (۸۴) (۸۵) (۸۶) (۸۷) (۸۸) (۸۹) (۹۰) (۹۱) (۹۲) (۹۳) (۹۴) (۹۵) (۹۶) (۹۷) (۹۸) (۹۹) (۱۰۰)

مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے جو دینی بصیرت اور جذبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عنایت فرمایا تھا۔ اس کی مثال اس عہد میں مشکل سے ملے گی گزشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاس نے کیا۔

۳۔ انیسویں صدی کی تیسری اہم تحریک آزادی وطن کی تھی، اس سلسلہ میں خود حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے منسلکین نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے وہ ہندوستان کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں، جنگ آزادی کے زمانہ میں تھانہ بھون کا انتظام حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور خود دیوانی اور فوجداری کے مقدمات فیصلہ فرماتے تھے۔ آزادی وطن کے جس جذبہ نے حاجی صاحب کے قلب و جگر کو گرمایا تھا وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے پہلو میں ایک شعلہ بن گیا، انہوں نے اور ان کے رفقاء نے اور تلامذہ نے ہندوستان سے انگریزی حکومت کا اقتدار ختم کرنے کیلئے جن مصائب کا سامنا کیا، تاریخ ہند کا کوئی دیانتدار مورخ ان کو بھلانہ سکے گا۔

(تاریخ مشائخ چشت ص ۳۲، ۳۳)

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) شاہ ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم، مولانا محمد مرتضیٰ حسن چاندپوری رحمۃ اللہ علیہ، حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد مسیح اللہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ وغیرہ صد ہا اجل علماء آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں آپ کی تقاریر و مواعظ کا سلسلہ جاری تھا۔

عوام کے علاوہ بہت سے اہل علم تحقیق و فتاویٰ میں پیش آمدہ الجھنوں اور مسائل کو آپ سے حل کرتے تھے، ایک مدت تک آپ نے دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور جیسے عظیم الشان دینی اداروں کی سرپرستی بھی فرمائی۔ نیز تحریک آزادی کی مخالفت کی اور جب اس کے زور پکڑ جانے پر تقسیم ملک کا خطرہ واقعہ بنتا ہوا محسوس ہونے لگا تو آپ نے ایک عالم دین کا فریضہ انجام دیتے ہوئے محمد علی جناح سے اسلام اور مسلمانوں کے مسائل پر مراسلت بھی کی۔ گویا علمی، عملی، تدریسی، اصلاحی، صحافتی، سیاسی، تبلیغی، تحریری، تقریری، تحقیقی، تالیفی اور انتظامی سب ہی میدانوں میں آپ کی خدمات کے نقوش نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور کہیں نظر سے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کے ملفوظات میں یہ بھی گذرا ہے وہ فرماتے تھے کہ میری خواہش کے کہ تعلیم مولانا تھانوی کی ہو اور طریق میرا ہو، یعنی میرے طریقہ سے ضرورت ہے کہ حضرت تھانوی کی تعلیم کو عام کیا جائے۔ تاکہ مسلمان اس سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہو کر اپنی اصلاح کریں۔ اس کو دوسرے انداز سے مشہور اہل قلم مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس طرح تحریر کیا ہے کہ سچ یہ ہے کہ حضرت تھانوی سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا، یہ جملہ کس قدر بلیغ ہے ذرا خیال فرمائیں۔ آخر کچھ تو بات ہوگی جو علمی دنیا کے آسمان شہرت کا درخشاں ستارہ بننے اور عمل و فضل و تصنیف و تالیف کے سمندر کا گوہر نایاب تسلیم کئے جانے کے باوجود علامہ سید سلیمان ندوی جیسی شخصیت کو اپنی روحانی تشنگی دور کرنے کیلئے تھانہ بھون کے چشمہ فیض سے سیراب ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی اور حضرت تھانوی کے یہاں ایسی متعدد مثالیں ہیں۔ مشہور صحافی، فلسفی اور عالم مولانا عبد الماجد دریابادی کے قلم سے نکلی ”شاہ تھانہ بھون“ کی پر لطف روداد و مراسلت ”حکیم الامت نقوش و تاثرات“ ہی دیکھ لیجئے۔

پیدائش

حضرت شیخ المشائخ کی والدہ ماجدہ شیخ علی محمد صدیقی نانوتوی کی صاحبزادی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خاندان سے تھیں۔ آپ اپنی ننھیال نانوتہ میں دوشنبہ کے دن ۲ صفر المظفر ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے (۱)۔ والد ماجد نے امداد حسین نام رکھا تاریخی نام ظفر احمد (۱۲۳۳ھ) ہے حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی نے آپ کا نام بجائے امداد حسین کے امداد اللہ تجویز فرمایا، اور پھر یہی نام زبان زد عام ہو گیا۔ پروفیسر انور الحسن شیر کوٹی لکھتے ہیں۔

مزید تفصیل

آپ کا نام نامی آپ کے والد مرحوم نے امداد حسین رکھا تھا، لیکن حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نبیرہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے امداد اللہ کے لقب سے ملقب فرمایا۔ شاید ان کو امداد حسین نام پسند نہ آیا کہ اس میں شرک کی بو آتی ہے۔ چنانچہ اس نام کو حاجی صاحب نے بھی ترک کر دیا اور کتابوں نیز خطوط میں ہمیشہ امداد اللہ ہی لکھا کیے۔

راقم الحروف کو گلزار معرفت سے جو آپ کی غزلیات وغیرہ کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے ایک اور نام کا بھی پتہ چلا ہے اور وہ نام خدا بخش ہے یہ نام کس نے رکھا معلوم نہ ہو سکا لکھتے ہیں۔

ہم نہ شاعر ہیں، نہ ملا ہیں، نہ عالم ہیں ولے

رکھتے ہیں ہر باب میں اللہ سے امداد ہم

اے خدا بخش اس زمین میں لکھ غزل اک اور تو

تاکہ جانیں شعر گوئی میں تجھے استاد ہم

لیکن اس قافیہ اور ردیف میں دوسری غزل لکھنے کا مذکورہ بالا شعر میں جو پتہ دیا ہے اس

میں آپ لکھتے ہیں۔

ہے نہ یہ شعر و غزل، ہے اپنی مجذوبانہ بڑ

بڑ نہیں یہ عشق کو کرتے ہیں کچھ ارشاد ہم

ڈر ہے کیا فوج گنہ سے ہے خدا بخش اپنا نام

اور تفسیر رکھتے ہیں اللہ کی امداد ہم

ان اشعار میں بھی خدا بخش اور امداد اللہ دونوں ناموں کا اظہار صاف ہے آپ نے اپنے مختلف خطوط میں اپنا ایک اور نام عبد الکریم بھی ظاہر فرمایا ہے چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھتے ہیں:

”از فقیر عبد الکریم عزیز القدر۔ عالی مرتبت مولوی محمد قاسم زاد شوق و ذوقہ باللہ تعالیٰ۔“
(امداد المشاق کا حصہ مرقومات امدادیہ) ایک اور خط میں جو حکیم ضیاء الدین صاحب کو لکھا ہے تحریر فرماتے ہیں:

”از فقیر حقیر عبد الکریم عفی عنہ“ (۱)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام حاجی صاحب نے کسی مصلحت کی وجہ سے رکھا تھا، آپ کا تاریخی نام ظفر احمد تھا اور والد صاحب کا نام حافظ محمد امین بن شیخ بڈھا بن شیخ بلاتی تھا۔ (شائم امدادیہ ص ۶) (۲)

تعلیم

والدہ ماجدہ کو آپ سے بے انتہا محبت تھی اگرچہ آپ کے تین بھائی اور ایک بہن تھی مگر والد کو جو تعلق آپ سے تھا وہ دوسروں سے نہ تھا۔ اسی لاڈ و پیار کی وجہ سے آپ ابتدائی تعلیم سے بھی محروم رہے، ابھی عمر کی ساتویں منزل ہی میں قدم رکھا تھا کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا، انہوں نے انتقال کے وقت خاص طور پر وصیت کی کہ کوئی میرے بعد اس بچے کو ہاتھ نہ لگائے۔ اس وصیت کی تعمیل میں یہاں تک مبالغہ کیا گیا کہ کسی کو آپ کی تعلیم کی جانب توجہ نہ ہوئی بالآخر آپ خود ہی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے شوق سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا، مگر ہر مرتبہ کچھ ایسے موانع پیش آتے رہے کہ اس وقت حفظ کی تکمیل نہ ہو سکی، اس زمانہ میں استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جن سے آپ کا ننھیالی تعلق تھا دہلی کے عربک کالج میں مدرس تھے آپ ان کے ہمراہ تحصیل علوم کیلئے دہلی تشریف لے گئے۔ ”شائم امدادیہ“ میں لکھا ہے:

سولہ سال کے سن میں وطن شریف سے ہمراہی حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی دہلی کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اسی زمانہ میں چند مختصرات فارسی تحصیل فرمائے اور کچھ صرف و نحو اساتذہ عصر کی خدمت میں حاصل کی۔ اور مولانا رحمت علی تھانوی سے تکمیل الایمان شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت اخذ فرمائی۔

آگے چل کر لکھا ہے کہ :-

”بالہام غیبی و مجذبه لذت کلام نبوی مشکوٰۃ شریف کا ایک ربع قرأت حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی پر گزرانا۔ اور حسن حصین و فقہ اکبر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قرأت مولانا عبدالرحیم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے اخذ کیا۔ یہ ہر دو بزرگوار ارشد تلامذہ حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی کے تھے اور مفتی صاحب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔“ (شام امدادیہ ص ۱۲)

مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ آپ نے شیخ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی جو مفتی الہی بخش کاندھلوی کے ایک واسطے سے شاگرد تھے مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو تمام عمر بڑا شغف رہا۔

بیعت

دہلی اس زمانہ میں علماء و مشائخ کا مرکز تھی۔ مولانا نصیر الدین دہلوی طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کے مسند نشیں تھے، دہلی کے زمانہ قیام میں آپ کو ان سے عقیدت ہو گئی اور آپ ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی شام امدادیہ میں ہے کہ ”چند دن تک پیرو مرشد کی خدمت میں رہ کر اجازت و خرقہ سے مشرف ہوئے اور اذکار طریقہ نقشبندیہ اخذ فرمائے۔“ کچھ عرصہ بعد آپ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس آراستہ ہے شیخ المشائخ مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہونا چاہتے تھے۔ غایت ادب کی وجہ سے قدم آگے نہیں پڑتا تھا۔ اچانک آپ کے جدا مجد حافظ بلاتی تشریف لائے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر بارگاہ نبوی میں پہنچا دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میں آپ کا ہاتھ لے کر حضرت میاں نور محمد (۱) جھنجھانوی کے حوالے

(۱) حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی

ولادت اور شجرہ نسب :- جھنجھانہ حضرت میاں جی کا مولد پاک ہے اور آپ شاہ العلمین کی اولاد افتاد میں سے ہیں حضرت کا شجرہ نسب نویں پشت میں شاہ عبدالرزاق صاحب (شاہ العلمین) سے مل جاتا ہے۔ سید جمال میاں علوی حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کے والد ہیں حضرت اپنے خوش قسمت ماں باپ کے دوسرے فرزند ارجمند تھے، آپ کے برادر بزرگ کا اسم گرامی غلام ضامن ہے، آپ نجیب الطرفین ہیں اور عزت و عظمت شرافت و نجابت کے ساتھ فضیلت و بزرگی آپ کی خاندانی میراث ہے۔

ابتدائی تعلیم اور سفر دہلی :- حفظ کلام پاک آپ نے جھنجھانہ ہی کے کسی مکتب میں کیا۔ ابتدائی فارسی تعلیم بھی یقیناً دستور زمانہ کے مطابق اپنے خاندان کے کسی بزرگ یا کسی دوسرے صاحب علم سے حاصل کی ہوگی، ایک نو عمر طالب علم کی حیثیت سے اپنی عمر عزیز کے کتنے سال اپنے وطن مالوف میں گزارے اور کس سن میں پہلی بار حصول تعلیم کے غرض سے شاہجہاں آباد دہلی کا سفر اختیار کیا اس کی کوئی تفصیلی روایت کسی کی زبانی نہیں معلوم ہو سکتی۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

فرمادیا۔ شیخ المشائخ فرماتے ہیں کہ ”میں جب بیدار ہوا تو پریشانی کا عجیب عالم تھا۔ میں اس وقت جھنجھانہ سے واقف نہ تھا، کئی سال اسی طرح گزر گئے، آخر کار مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی کی راہنمائی سے گوہر مقصود ہاتھ آیا اور حضرت میاں جیو کی خدمت میں حاضری کا

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا) حلیہ مبارک :- آپ کا حلیہ مبارک یہ تھا۔ پستہ قد، نحیف الجثہ، گندمی رنگ، آنکھیں نہ چھوٹی نہ بڑی اوسط درجہ کی، لباس نیلا تہ بند، گیر واکرتہ، دوپلی ٹوپی۔

بیعت سلوک و جہاد :- سلسلہ سلوک میں آپ کے پیر مرشد شاہ عبد الرحیم صاحب ولایتی پنجتاری ہیں انہوں نے ہی آپ کو سلسلہ چشتیہ میں خلعت خلافت سے نوازا۔

آپ نے اور آپ کے مرشد نے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر تجدید بیعت (جہادی) فرمائی وہ بھی اس سلسلہ میں بڑی اہم اور دور رس نتائج و ہمہ گیر اثرات کی حامل ہے۔

بہر حال حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب نے اپنے مرید خاص قاضی حکیم مغیث الدین صاحب سہارنپوری و حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کو بھی جھنجھانہ سے بلا کر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پر بیعت کرائی، کہتے ہیں جس وقت آپ کے پیر و مرشد کا پیغام لے کر ان کا آدمی جھنجھانہ پہنچا تو حضرت اپنی گھوڑی کا رسہ ہاتھ میں لئے ہوئے اسے پانی پلا رہے تھے، یہ پیغام سنتے ہی حضرت پر ایک کیفیت طاری ہوئی اور گھوڑی بھی لوٹ پوٹ ہونے لگی یہاں تک کہ اس کی بری حالت ہو گئی۔ آپ سہارنپور پہنچے اور اپنے پیر و مرشد کی تقلید اور پیروی حکم کرتے ہوئے سید صاحب سے بیعت ہوئے۔

جب حق پرستوں کا یہ قافلہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے پنجاب بالا کوٹ پہنچا تو حضرت میاں جیو بھی اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبد الرحیم اور سید صاحب کے ساتھ تھے اور جہاد میں شریک ہوئے مگر بعد میں کسی مال اندیشی اور مصلحت کے پیش نظر خود آپ کے ہر دو مرشدوں نے واپسی وطن کا حکم دیا اور آپ لوہاری تشریف لے آئے اور ان سرفروشوں کی آخری جماعت نے بالا کوٹ کی تنگ اور سنگلاخ گھائی میں ان پتھروں اور چٹانوں کے درمیان جن میں مسافروں کا چلنا بھی آسان نہیں اپنے سے دس گنا حریف کے مقابلے میں جان دی۔

انتقال :- یہ تھے آپ کے نورانی زندگی کے چند اوراق لیکن بالآخر وہ وقت موعود آگیا جو ازل سے ہی ہر ذی روح و ذی حیات کا مقدر ہو چکا ہے اور آپ نے ۵۸ برس اس دار فانی کی سیر کر کے سفر آخرت اختیار کیا۔ آپ کی وفات حسرت آیات کی تاریخ ۱۲/۵۹ھ بروز جمعہ ہے۔

تجہیز و تکفین :- حضرت حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ جہاں میرے حضرت پیر و مرشد کا مزار شریف ہے وہاں ایک احاطہ امام سید محمود شہید سبزواری کا مشہور ہے اور اس احاطہ میں کسی نئی قبر بنانے کا حکم نہ تھا آپ وہاں اکثر جلیا کرتے تھے اور دیر تک مشغول رہتے تھے، انتقال کے وقت وصیت فرمائی کہ اگر ممکن ہو تو مجھے اسی جگہ جہاں میں اکثر جلیا کرتا ہوں دفن کرنا وہاں سے مجھے بوئے انس آتی ہے چنانچہ آپ وہیں دفن کیے گئے۔

حضرت نے مرنے سے پہلے فرمایا تھا فقیر مرنے میں صرف ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوتا ہے چنانچہ حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کی روح پر فتوح سے وہی فیضان و عرفان کا سرچشمہ جاری ہے آپ کے ارشاد عالی کے مطابق آپ کے مزار مقدس سے وہی دینی فیوض و برکات حاصل ہوتے ہیں جو آپ کی ذات بابرکات سے ہوتے تھے۔

حضرت کے مرید و خلفاء :- حضرت حاجی امداد اللہ صاحب فاروقی تھانوی، مہاجر مکی و مدنی (خلیفہ) حضرت حافظ ضامن شہید فاروقی تھانوی (خلیفہ) حضرت مولانا شیخ محمد صاحب محدث فاروقی تھانوی (خلیفہ) حضرت شیر محمد خان صاحب لوہاری (خلیفہ) حضرت شیخ امام الدین صاحب تھانوی (مرید) حضرت حافظ محمود صاحب تھانوی (مرید) حضرت حافظ ثور و صاحب جھنجھانوی (مرید) (انخص نور محمدی)

موقع نصیب ہوا، دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی صورت ہے جو خواب میں دکھائی گئی تھی۔ حضرت میاں جیو رحمہ اللہ نے مجھے دیکھ کر فرمایا! ”کیا تمہیں اپنے خواب پر کامل یقین ہے“ یہ پہلی کرامت تھی جو مشاہدہ میں آئی، میرا دل بکمال استحکام حضرت میاں جیو کی جانب مائل ہو گیا، ایک مدت پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر رہ کر ریاضت و مجاہدہ کے بعد سلوک کی تکمیل فرمائی اور خرقہ خلافت سے مشرف ہوئے۔

سفر حج

۱۲۶۰ھ میں آپ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت ﷺ آپ کو طلب فرما رہے ہیں۔ فرط شوق میں زادراہ کا بند و بست بھی نہ کر سکے اور خالی ہاتھ روانہ ہو گئے، بھائیوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے پیچھے سے مصارف بھجوائے، ۵ ذی الحجہ کو آپکا جہاز جدہ کی بندرگاہ کے نزدیک لنگر انداز ہوا آپ جہاز سے اتر کر فی الفور عرفات کیلئے روانہ ہو گئے۔ ارکان حج کی ادائیگی کے بعد مکہ مکرمہ میں آپ نے حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی رحمہ اللہ کی خدمت میں کچھ عرصہ قیام فرما کر فیوض و برکات حاصل کیے اور بعد ازاں مدینہ منورہ میں روضہ اقدس پر حاضر ہو کر سوزدروں کو تسکین بہم پہنچائی، واپسی میں پھر چند دن مکہ مکرمہ میں قیام رہا، ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں وطن مراجعت فرمائی۔

مریدین

حج سے واپسی کے بعد دن بدن لوگوں کا رجوع بڑھتا جاتا تھا اور کثرت سے آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنے کے مشتاق تھے۔ مگر آپ کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے بالآخر حافظ محمد ضامن صاحب رحمہ اللہ کے شدید اصرار پر جو آپ کے پیر بھائی تھے بیعت کرنا شروع کیا، علماء میں سب سے پہلے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، عوام الناس کے علاوہ علمائے عصر کی ایک بہت بڑی جماعت آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھی۔ چند مشہور علمائے کرام کے اسماء گرامی ذیل میں درج ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف عوام بلکہ خواص اہل علم و فضل بھی آپ کے روحانی کمالات کے معترف تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ، مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا احمد حسن کانپوری رحمہ اللہ، مولانا محمد حسین الہ آبادی رحمہ اللہ، مولوی

صفات احمد غازی پوری، مولوی محی الدین میسوی، مولوی حافظ یوسف تھانوی، حکیم ضیاء الدین رام پوری، نواب مولوی محی الدین خاں مراد آبادی، مولوی محمد شفیع، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا سید فدا حسین رضوی، مولانا محمد افضل ولایتی، مولانا عبدالسمیع بیدل رامپوری، مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا سید حسین احمد مدنی وغیرہم۔

جماعت علماء میں شیخ المشائخ کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے خاص تعلق تھا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت آپ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح مولانا روم شمس تبریزی کی زبان ہیں اسی طرح حق تعالیٰ نے مولوی محمد قاسم کو میری زبان بنایا ہے، جو میرے قلب میں آتا ہے مولوی صاحب اس کو بیان کر دیتے ہیں، میں علمی اصطلاحات نہ جاننے کی وجہ سے اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ (۱)

انقلاب ۱۸۵۷ء

ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دور میں عدل و انصاف اور رعایا پروری کے بجائے جبر و استبداد اور لوٹ کھسوٹ کا عام دور دورہ تھا، مسلمان چھ سو برس سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے مگر انہوں نے غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ ہندو مسلمان باہم ہو کر شیر و شکر کی طرح رہتے تھے مگر انگریزی عمل داری میں ہندوستان کو عیسائی بنانے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ پادریوں کو نہ صرف تبلیغ کی عام اجازت تھی بلکہ انگریزی حکام ان کی پشت پناہی کرتے، اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین عموماً پادری ہوتے تھے انجیل کا درس ضروری کر دیا گیا تھا۔ پادری عام مجموعوں میں نہ صرف عیسائیت کی تبلیغ ہی کرتے بلکہ ہندو اور مسلمانوں پر بے محابا جارحانہ حملے کئے جاتے چونکہ انگریز کی نظر میں اس کا اصلی مد مقابل مسلمان تھا اور اسی کو وہ اپنا سیاسی حریف سمجھتا تھا، اس لئے انگریزوں کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں کو پست اور ناکارہ نہ بنادیا جائے گا اس وقت تک حکومت اور سر بلندی کا نشہ ان کے دماغوں سے نہیں نکلے گا۔ اس لئے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ ظلم و جور اور تبلیغ عیسائیت کا نشانہ بنایا گیا۔ چنانچہ مولانا فضل حق خیر آبادی جن کو فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی اپنے زمانہ اسیری جزیرہ انڈمان کی تصنیف الثورة الہندیہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

انگریزوں نے تمام باشندگان ہند کو عیسائی بنانے کی اسکیم بنائی تھی ان کا خیال تھا کہ

ہندوستان کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا اس لئے انقیاد و اطاعت سے سرتابی کی جرات نہ ہو سکے گی، انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں کا باشندوں سے اختلاف تسلط قبضے کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اس لئے پوری جانفشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملت کو مٹانے کیلئے طرح طرح کے مکر و حیلے سے کام لینا شروع کیا، انہوں نے بچوں اور نا فہموں کی اور اپنی زبان و دین کی تلقین کیلئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔“ (الثورة الهندیہ ص ۳۵۶، ۳۵۷)

یہ حالات تھے جنہوں نے ارباب فکر و دانش کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ یا تو وہ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو جائیں یا اپنے تئیں انگریزوں کی عیسائی بنانے والی پالیسی کے حوالے کر دیں، ظاہر ہے کہ دوسری صورت کو قبول کرنے کیلئے وہ کسی طرح بھی آمادہ نہ ہو سکتے تھے، ادھر انگریز کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ اس لئے وہ پہلی صورت عمل پیرا ہونے کی تیاری کر رہے تھے کہ دفعۃً میرٹھ سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا آغاز ہو گیا اور پھر جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں یہ آگ بھڑک اٹھی سوانح قاسمی میں ہے کہ :-

اب وہ کون سی چیز رہ گئی تھی جو ان بزرگوں کے ارادوں میں حرکت پیدا نہ کرتی اور میدان میں آنے سے روکتی جو اس سلسلے کو بہت پہلے سے پچشتم بصیرت و عبرت دیکھ رہے تھے۔

ٹھیک اسی زمانہ میں سہارنپور میں ایک ایسا افسوس ناک واقعہ پیش آیا جس نے عام مسلمانوں کو مشتعل کر دیا، مسٹر اسپنکی SPANKIE سہارنپور میں کلکٹر تھا، تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت اللہ علی کے بھائی قاضی عبدالرحیم کسی ضرورت سے ہاتھی خریدنے سہارنپور گئے۔ کسی دشمن نے مخبری کی کہ قاضی عبدالرحیم دہلی کمک بھیجنے کیلئے ہاتھی خریدنے سہارنپور آیا ہوا ہے، اس وقت انگریز بوکھلائے ہوئے تھے اسپنکی نے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کیلئے واقعہ کی تحقیق و تفتیش کیے بغیر قاضی عبدالرحیم کو گرفتار کر کے مع ان کے ساتھیوں کے برسرعام پھانسی دے دی، اس وحشت ناک خبر سے سہارنپور کے اطراف و جوانب میں آگ لگ گئی، تھانہ بھون میں حضرت شیخ المشائخ، حضرت حافظ محمد ضامن رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا فتح محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، جامع مجاہدین تھے کہ وعظ و پندار ترغیب و ترہیب سے مجاہدین کو مختلف مواضع دیہات و قصبات سے جمع کر کے میدان میں لائیں، حضرت نانوتوی قدس سرہ امیر مقرر تھے“ (سوانح قاسمی جلد دوم ص ۱۲۷)

تھانہ بھون کے قریب ترین مقام شاملی کی تحصیل پر جس میں انگریزی فوج متعین تھی حملہ کر دیا گیا، حضرت حافظ محمد ضامنؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد نسیر نانوتویؒ نے شاملی کے میدان جنگ میں خوب دوشجاعت دی۔ حافظ محمد ضامنؒ نے عین معرکہ کے دوران جام شہادت نوش کیا، اگرچہ تحصیل پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا مگر حضرت حافظ محمد ضامنؒ کی شہادت کے بعد مجاہدین تھانہ بھون واپس چلے گئے۔ (۱) (یہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے)

ادھر مجاہدین شاملی کی تحصیل پر قبضہ کرنے میں مصروف تھے ادھر دہلی میں انگریز اپنی فتح و کامیابی کا نقارہ بجا رہے تھے۔ دہلی کی فتح سے مجاہدین کے حوصلے پست ہو گئے انگریزوں نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد بڑا سخت انتقام لیا۔ مظفر نگر کا کلکٹر فوج لے کر تھانہ بھون پہنچا، اور گولہ باری کر کے تھانہ بھون کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ گرفتار کر لئے گئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا وارنٹ گرفتاری جاری ہوا، دوسرے حضرات روپوش ہو گئے قاضی عنایت علی پہاڑوں میں مفقودالخبر ہو گئے، جماعت مجاہدین کے دوہم برہم ہو جانے پر حضرت شیخ المشائخ بھی عرصہ تک مختلف مقامات میں روپوش رہے اور جب ہندوستان کی زمین و آسمان کو اپنے اوپر تنگ دیکھا تو ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء میں ہندوستان سے ہجرت فرما کر حرم کعبہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔

۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء میں مریدین نے محلہ حارۃ الباب میں ایک مکان خرید کر عرض کیا کہ حضرت اس میں قیام فرمائیں، بڑے اصرار کے بعد آپ نے قبول فرمالیا، اس وقت نہر زبیدہ میں پانی کی بڑی قلت تھی عرصہ سے نہر کی صفائی کا کام نہیں ہوا تھا، مکہ مکرمہ میں پانی کی قلت کا یہ عالم تھا کہ ایک روپے میں پانی کی دو مشکیں ملتی تھیں اور زمانہ حج میں تو ایک مشک ایک روپے سے کم میں ہاتھ نہ آتی تھی آپ کی دعا اور برکت سے ایسا ہوا کہ نہر زبیدہ کی صفائی اور تعمیر پر لوگوں کی توجہ ہوئی اور بہت جلد پانی کے چشمے بافراط مکہ مکرمہ کے گلی کو چوں میں جاری ہو گئے۔

اخلاق و عادات

شائمہ امدادیہ میں آپ کا حلیہ اور اخلاق و عادات کی نسبت لکھا ہے کہ :-

”سرمباک کلاں اور بزرگ ہے، پیشانی کشادہ، بلند اور نورانی ہے، ابرو وسیع اور خم دار

آنکھیں بڑی اور ہمیشہ ذوق ربانی میں سرشار رہتی ہیں، رنگ گندم گوں ہے، جسم نحیف اور قد مائل بطوالت ہے، کلام میں شیرینی ہے، کثیر المروت اور عظیم الاخلاق ہیں۔ ہر ایک سے بکمال بشاشت پیش آتے ہیں اور گفتگو میں ہر وقت ہونٹوں پر تبسم کھلتا رہتا ہے، اخلاق رذیلہ سے بالبطع نفرت ہے اور اتباع سنت تو گویا عادت بن گئی ہے، طریق سلوک آپ کا جذبہ و مجاہدہ ہے، اولیائے عصر کا آپ کی ولایت پر اجماع ہے اور علمائے زماں آپ کے علوم مرتبہ کے معترف ہیں، حق تعالیٰ نے علوم اسماء و صفات اور معارف خاص طور پر آپ کو مرحمت فرمائے ہیں خلوت کو پسند فرماتے ہیں اور لوگوں سے کم ملتے ہیں البتہ جو لوگ اخلاص کے ساتھ وجہ اللہ حاضر ہوتے ہیں ان سے بکمال شفقت و اخلاق پیش آتے ہیں۔ باوجود کمالات باطنی اکثر اوقات اصحاب و مریدین سے فرماتے ہیں کہ ”میرے پاس کچھ نہیں البتہ خدا کی ذات سے امید ہے کہ تم لوگوں کے توکل سے میری بھی نجات ہو جائے گی۔“

حضرت شیخ المشائخ کے استغناء کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر مکی جن سے سلطان المعظم کو بڑی عقیدت تھی جب قسطنطنیہ سے باکرام و احترام مکہ معظمہ تشریف لائے تو آپ سے سلطان المعظم کی تعریف اور مناقب بیان کر کے درخواست کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں سلطان المعظم کے حضور میں آپ کا تذکرہ کروں۔ آپ نے فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو گا کہ سلطان المعظم معتقد ہو جائیں گے پھر آپ نے دیکھ لیا کہ آپ کے معتقد ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرب سلطانی کی وجہ سے بیت اللہ سے بعد ہو گیا البتہ آپ ان کی تعریف کرتے ہیں کہ بڑے عادل بادشاہ ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ سلطان عادل کی دعا قبول ہوتی ہے سو آپ سے ہو سکے تو آپ ان سے میرے لئے دعا کر دیجئے مگر بادشاہ وقت سے یہ کہنا کہ ایک درویش کیلئے دعا کرو یہ آداب سلطنت کے خلاف ہے اس لئے میں آپ کو اس کا ایک طریقہ بتلاتا ہوں وہ یہ کہ آپ ان کو میرا سلام پہنچادیں وہ جواب میں وعلیکم السلام ضرور کہیں گے۔ پس میرے لئے اس طرح دعا ہو جائے گی۔

(کمالات امدادیہ ص ۶)

قیام مکہ مکرمہ کے مشاغل

حضرت شیخ المشائخ نے ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء میں ۴۳ سال کی عمر میں ہجرت فرمائی ۴۱ سال مکہ مکرمہ میں مقیم رہے یہ پوری مدت مریدوں کی تربیت باطنی و افادہ میں گزری۔ آپ کے حلقہ

ارادت میں ہندوستان و عرب کے علاوہ مختلف ممالک کے بکثرت لوگ شامل تھے، مکہ مکرمہ میں ممالک اسلامیہ کے جس قدر مشائخ مختلف سلاسل کے مقیم تھے ان سب میں آپ کو نمایاں اور امتیازی مقام حاصل تھا۔ اکثر مشائخ حاضر ہو کر فیوض باطنی سے لطف اندوز ہوئے۔

تزکیہ باطن کے ساتھ ساتھ اکثر ضیاء القلوب کا درس بھی جاری رہتا۔ ضیاء القلوب فن تصوف میں آپ کی بڑی معرکتہ الآراء تصنیف ہے مثنوی شریف کے درس کا بھی التزام رہتا تھا، مثنوی شریف سے شغف کا یہ حال تھا کہ آخر عمر میں جب سیدھا بیٹھنا دشوار تھا کوئی طالب مثنوی لے کر حاضر ہوتا تو فوراً پڑھنا شروع کر دیتے، ایک دو شعر کے بعد ہی بدن میں ایسی قوت آجاتی کہ تکیہ چھوڑ کر سیدھے بیٹھ جاتے اور اسرار و حقائق کا دریا جوش مارنے لگتا۔

ایک مرتبہ قسطنطنیہ کے ایک بڑے شیخ اسعد آفندی جو مولانا روم کے خاندان اور سلسلے کے شیخ کامل اور مثنوی شریف کے زبردست عالم تھے آپ سے ملنے کیلئے تشریف لائے اس وقت مثنوی شریف کا درس ہو رہا تھا۔ حضرت شیخ المشائخ بڑے جوش کیساتھ حقائق و معارف بیان فرما رہے تھے، درس اردو میں ہو رہا تھا آپ کے ایک خادم مولوی نیاز احمد حیدر آبادی نے عرض کیا کہ اگر شیخ اسعد اردو سمجھتے تو بہت محفوظ ہوتے۔ شیخ المشائخ نے فرمایا کہ ”حظ و لطف کیلئے زبان جاننے کی کیا ضرورت ہے“ یہ فرما کر مثنوی شریف کے چند اشعار ایک خاص انداز سے پڑھے جن کو سن کر شیخ اسعد آفندی پر حال طاری ہو گیا، جب افاقہ ہوا تو انہوں نے آپ سے اشغال کی اجازت لی اور اپنی قبائش کر کے درخواست کی کہ آپ اسکو پہن کر تبرکاً مجھے عنایت فرما دیجئے“ (۱)

حاجی صاحب کے علوم

جیسا کہ تعلیم کے باب میں گزرا حاجی صاحب نے باقاعدہ تعلیم و تدریس کم حاصل کی تھی، لیکن عشق و محبت الہی اور سوز و دروں نے آپ کا سینہ کھول دیا تھا جس طرح انبیاء علیہم السلام کا سارا علم وہی ہوتا ہے کسی نہیں۔ اس طرح امتوں میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو بظاہر تو کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ لیکن اتباع سنت اور اپنی عملی زندگی کی وجہ سے ایسا روحانی مقام حاصل کر لیتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء ان سے تربیت روحانی حاصل کرتے ہیں، امت محمدیہ ﷺ میں ایسے سینکڑوں افراد گزرے ہیں لیکن آفاقی شہرت کی حامل شخصیتیں دو ہوئی ہیں،

ایک مولانا جلال الدین رومی رحمہ اللہ کے مرشد حضرت شمس تبریز رحمہ اللہ اور دوسرے ہمارے ممدوح شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ۔ (۱)

اور یہ اسی خداداد دولت کی وجہ سے تھا کہ اپنے زمانہ کے بہترین علماء آپ کے گرد جمع ہو گئے اور ان سب نے آپ سے صفائی باطن اور تزکیہ قلب حاصل کیا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے فرمایا ”عالم ہونا کیا معنی اللہ کی ذات پاک نے آپ کو عالم کر فرمایا ہے۔“ اسی کتاب میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں۔ گو ظاہری علم شریعت میں علامہ دوراں اور مشہور زماں مولوی نہ تھے مگر علم لدنی کے جامہ عنبر شامہ سے آراستہ اور نور عرفاں و ایقان کے زیورات سے سرتاپا پیرا ستہ۔ (امداد المشتاق ص ۱۵) ارواحِ ثلاثہ میں حکیم الامت کا ایک قول یوں درج ہے۔

حضرت حاجی صاحب نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا اور ہم نے اتنا پڑھا ہے کہ ایک اور کافیہ لکھ دیں مگر حضرت کے علوم ایسے تھے کہ آپ کے سامنے علماء کی کوئی حقیقت نہ تھی، ہاں اصطلاحات تو ضرور نہیں بولتے تھے۔ (س ۱۸۶)

شیخ المشائخ ”مرشدوں کے مرشد“ کا لقب حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ پر صحیح طور پر صادق آتا ہے بھلا جس آستانہ سے یکتائے روزگار انسانوں نے (جو اپنی اپنی جگہ علم کے دریا اور فضل و کمال کے سرچشمے ہوں) کسب فیض کیا ہو اور اس آستانہ کی غلامی پر انہیں فخر و ناز ہو اس کو شیخ المشائخ نہ کہا جائے تو اور اس کو کیا کہا جائے گا۔ گزشتہ کسی صفحے میں چند نامور ترین علماء و مشائخ کی ایک فہرست گزر چکی ہے جو حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ سے بیعت ہوئے اور ان کو خلافت سے سرفراز کیا گیا ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ کوہ گراں کہلانے کا مستحق ہے، اس کے علاوہ ان علماء کی فہرست سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے جو حاجی صاحب کے حلقہ ارادت میں شامل تھے، اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ پوری امت میں کسی شیخ سے علماء کی اس قدر کثرت نے بیعت نہیں کی تو بے جا نہ ہوگا۔ صاحب تذکرۃ الرشید نے ان کی تعداد سات آٹھ سو بتائی ہے اور اس کی خوشخبری (کہ علماء آپ کے مہمان ہوں گے) حضور ﷺ نے ایک خواب میں آپ کو دی تھی۔

(۱) پھر یہ بات بھی عجیب مماثلت رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا روم رحمہ اللہ جیسے انسان کو شمس تبریز رحمہ اللہ کی زبان بنادیا اسی طرح حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ کو حضرت حاجی صاحب کی زبان بنادیا بقول حکیم الامت رحمہ اللہ مؤلف (یعنی اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ) نے اکثر زبان حق ترجمان حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) سے سنا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ مولوی محمد قاسم مرحوم کو میری زبان بنایا گیا تھا جیسے مولانا روم رحمہ اللہ کو حضرت شمس تبریز قدس سرہ کی (زبان بنایا تھا)۔ (امداد المشتاق ص ۱۱)

ایک کشف

خواجہ پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ بھی مکہ معظمہ میں آپ سے تبرکاً بیعت ہوئے، خواجہ صاحب حج پر گئے اور وہیں رہنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ حاجی صاحب نے آپ کو اس سے منع فرمایا اس کا تذکرہ خود پیر صاحب مرحوم نے کیا ہے ”تاریخ مشائخ چشت“ میں ہے۔ ”مکہ معظمہ میں ایک دن وہ (خواجہ مہر علی شاہ صاحب گولڑوی) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھے حاجی صاحب نے نہایت اصرار و تاکید سے ہندوستان واپس جانے کا مشورہ دیا اور فرمایا۔

در ہندوستان عنقریب یک فتنہ ظہور کند شما ضرور در
ملک خود واپس بروید و اگر بالفرض شما در ہند خاموش نشستہ
باشید تا ہم آں فتنہ ترقی نہ کند و در ملک آرام ظاہر شود

ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ نمودار ہوگا تم ضرور
اپنے وطن واپس چلے جاؤ اگر بالفرض تم ہندوستان میں خاموش
بھی بیٹھے رہو تو وہ فتنہ ترقی نہ کریگا اور ملک میں سکون رہیگا (۱)

پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس کشف کو فتنہ نقادیانی سے تعبیر فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں انکو اس فتنہ کی مخالفت کا حکم دیا تھا، چنانچہ خواجہ صاحب نے اپنی زبان اور اپنے قلم دونوں سے نقادیانیوں کے عقائد باطلہ کی پر زور تردید کی (۲)

خدا داد علوم

جیسا کہ گزرا حاجی صاحب باقاعدہ عالم نہ تھے لیکن بمصدق من عمل بما علم علمہ اللہ مالہ یعلم“ (۳) بعض علمی اشکالات اور مسائل کو اس طرح حل کرتے تھے کہ اس کو دیکھ کر علماء حیران رہ جاتے تھے، اس کی دو چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) ملفوظات طیبہ ص ۱۲۶

(۲) تاریخ مشائخ چشت ص ۱۳، ۱۴

(۳) جو اپنے پڑھنے پر عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ایسے علوم سکھاتے ہیں جن کو وہ کسی سے نہیں پڑھتا۔

کرامت :- ایک مولوی صاحب نے ایک دن آکر پوچھا کہ الید العلیاء خیر من الید السفلی کی حدیث سے تو فقیر پر غنی کی ترجیح نکلتی ہے۔ فوراً ارشاد فرمایا کہ یہ علیا اسی لئے افضل ٹھہرا کہ مال کو علیحدہ کر کے فقیر بننا چاہتا ہے۔ اور ید سفلی اسی لئے مفضل ہوا کہ مال لے کر غنی بنتا ہے۔ (ایضاً)

کرامت :- ایک دن اللهم متعنی بالسمع والبصر اجعلهما الوارث کی تفسیر مولویوں سے دریافت فرمائی اور ارشاد ہوا کہ وارث تو وہ ہے جو مرنے کے بعد باقی رہ جائے سمع و بصر کے وارث ہونے کے معنی کیا ہیں، لوگوں کو تامل ہوا تو خود ہی ارشاد فرمایا۔ کہ یہ کنایہ ہے کہ سمع و بصر میرے سمع و بصر حق ہو جائیں غرض اس قسم کی ہزاروں باتیں ہیں جو ہر وقت حضرت کی زبان اقدس سے ارشاد ہوتی ہیں کہ ضبط ان کا دشوار ہے۔ (ایضاً)

حسانات الابرار سیات المقربین

مراتب یقین تین ہیں علم الیقین مرتبہ ادنیٰ، عین الیقین مرتبہ وسطیٰ، حق الیقین مرتبہ اعلیٰ ہے۔ عین الیقین سے علم الیقین میں جانا، حسانات الابرار سیات المقربین حق الیقین مرتبہ فنا فی الفناء ہے۔ مثال اس کی یوں ہے کہ علم حرارت آتش کا ”علم الیقین“ ہے اور جب اس پر انگلی رکھی جائے عین الیقین ہوا اور جب پورے لوہے کو خوب آگ میں سرخ کیا جائے اور اس وقت لوہا انا النار (میں آگ ہوں) کہے جاتا ہے۔ یہ مرتبہ حق الیقین ہے۔ (امداد ص ۵۲)

دو حدیثوں کی مطابقت

”فرمایا ایک دن دو طالب علم آپس میں بحث کرتے تھے ایک کہتا تھا کہ نماز بدو ن حضور قلب درست نہیں ہے کیونکہ لا صلوة الا بحضور القلب (نماز دل کی حاضری کے بغیر نہیں ہوتی) اور دوسرا حضرت عمرؓ کے قول سے استدلال کرتا تھا کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں انی اجهز الجیش وانا فی الصلوة میں نماز پڑھنے کے دوران میں لشکر کا انتظام کرتا ہوں اس سے زیادہ کون امر منافی نماز ہو سکتا ہے، آخر الامر آپ (حضرت حاجی صاحب) سے محاکمہ چاہا، ارشاد ہوا کہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہیں ہے، مقرر ہوں کہ جب بادشاہوں کی حضور کی ہوتی ہے امور لاحقہ (پیش آمدہ) عرض کرتے ہیں اور استمراج چاہتے ہیں اور بجا آوری

خدمت کی کوشش کرتے ہیں پس یہ عین حضوری ہے نہ منافی حضوری“ (۱)

خدا کو دنیا میں دیکھنا

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ حضرت حاجی صاحب سے سوال کیا کہ خدا کو اس عالم میں آنکھوں سے دیکھنا ممکن ہے یا نہیں؟ فرمایا:

”ممکن ہے معنی آیۃ لا تدركہ الابصار و هو یدرك الابصار کے یہ ہیں کہ اس بصارت ظاہری سے رویت حق تعالیٰ کی ممکن نہیں ہے اور جب نظر بصیرت (باطنیہ) حاصل ہو جاتی ہے تو بصارت (ظاہری) پر غالب آتی ہے، پس عارف حقیقت میں نظر بصیرت سے دیکھتا ہے اور اگر یہ سمجھے کہ آنکھوں سے دیکھتا ہے تو اس کی غلطی ہے، دلیل اس بات کی کہ اس نظر سے نہیں دیکھتا یہ ہے کہ آنکھ بند کرے رویت بدستور رہے، دوسرے یہ کہ دید آنکھوں کی عارضی نور آفتاب کی محتاج ہے بخلاف اس دید کے کہ محتاج نور بصیرت ہے بدون پر تو اس نور کے غیر ممکن و محال ہے مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ خطاب لن ترانی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیوں کہا گیا (حاجی صاحب نے) فرمایا کہ اس میں نفی رویت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور یہ درست ہے، عارف (خدا کا پہچاننے والا) اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا ہے بلکہ دیدہ حق سے دیکھتا ہے اور نیز اس میں نفی رویت ذات ہے کیونکہ فنائے عبد اس کو لازم ہے اور جب فنا ہوا پھر رویت کیا۔“ (۲)

الدعاء مخ العبادۃ

دعا کی چار قسمیں ہیں۔ اول دعائے فرض مثلاً نبی کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کے واسطے ہلاکت کی دعا کرے پس اس پر یہ دعا کرنا فرض ہے، دوم دعائے واجب جیسے قنوت، (وتروں میں) سوم دعائے سنت جیسے بعد تشہد (التحیات) پڑھنے کے ادعیہ مانثورہ، چہارم دعائے عبادت جیسا کہ عارفین کرتے ہیں اور اس سے محض عبادت مقصود ہے کیونکہ دعائیں تذلل ہے اور تذلل (عاجزی) حق تعالیٰ کو محبوب ہے لہذا الدعاء مخ العبادۃ (دعا عبادت کا مغز ہے) وارد ہوا ہے۔ (۳)

کراماتِ امدادیہ

قطب ارشاد

”نغماتِ مکیہ“ کے مترجم ”شائم امدادیہ“ میں لکھتے ہیں۔

اولیائے عصر آپ کی ولایت پر اجماع رکھتے ہیں اور علمائے زمان آپ کے علوم منزل کا اعتراف کرتے ہیں حضرت حق سبحانہ نے علوم اسماء و صفات سے آپ کو مخصوص حصہ عطا فرمایا ہے اور معارف خاص و خصوصیات علوم اعلیٰ سے مقامات مرحمت فرمائے ہیں۔ (۱)

آگے چل کر یہی مترجم لکھتے ہیں:

قطبوں کا ایک گروہ مامور بسکوت کلیہ نہیں ہوتا بلکہ اسرار و معارف و دقائق تصور و نکات حروف و اسماء وغیرہا سے کہ بظاہر حقیقت شریعت سے مخالف معلوم ہوتے ہیں ممنوع ہوتے ہیں ایسے لوگ تعلیم و ارشاد میں مشغول رہتے ہیں اور بندگان خدا کو منافع پہنچاتے رہتے ہیں اور داعی الخلق الی الحق رہتے ہیں اور حقیقت میں قطب ارشاد یہی ہیں حضرت (حاجی صاحب) اسی جماعت سے ہیں۔ (۲)

حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کے قطب ارشاد اور شیخ المشائخ ہونے میں کیا شبہ ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا شید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند رحمہ اللہ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا فیض الحسن سہارنپوری رحمہ اللہ، حضرت مولانا احمد حسن امروہوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، جیسے اکابر علماء اور یگانہ روزگار فضلاء جس کی غلامی پر فخر کرتے ہوں اس کی بزرگی اور ولایت میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔

اتباع سنت و کرامات

اکابر دیوبند کے سلسلۃ الذہب میں اصل چیز اتباع سنت ہے یہی وجہ ہے کہ اس مشرب

کے تمام مشائخ شریعت کے سخت پابند اور متبع سنت تھے اور اس سلسلہ کا ہر شیخ تقریباً ولی تھا جیسا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلے گا، کرامات کو برحق جانتے ہیں کہ ان کا صدور اہل کمال سے ہوتا ہے لیکن ولایت کا انحصار اس پر نہیں سمجھتے، یہی وجہ ہے کہ اکثر حضرات صاحب کرامت ہونے کے باوجود اس قسم کی چیزوں کا بہت اخفا کرتے تھے کہ عوام اس طرح کے قصوں ہی کو بزرگی سمجھنے لگ جاتے ہیں، بلکہ اس سلسلہ میں تو کرامات کو ظاہر کرنا کم حوصلگی سمجھا جاتا ہے، ایک دفعہ حاجی صاحب کے بہت سے مہمان آگئے کھانا کم تھا حضرت حاجی صاحب نے اپنا رومال بھیج دیا کہ اس کو ڈھانک دو، کھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ سب نے کھالیا اور کھانا بچ رہا۔ حضرت حافظ ضامن شہید کو خبر ہوئی تو حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ”فرمایا کہ حضرت آپ کا رومال سلامت چاہئے اب تو قحط کیوں پڑے گا۔“ حضرت حاجی صاحب شرمندہ ہو گئے اور فرمایا کہ واقعی خطا ہو گئی تو بہ کرتا ہوں پھر ایسا نہ ہوگا۔

(بحر الامداد)

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ حاجی صاحب کرامت دکھا کر شرمندہ ہوئے اور ایسا کرنے کو اچھا نہ سمجھا۔

کرامت :- آپ کی ایک کرامت ”تذکرۃ الرشید“ اور دوسری کتب میں موجود ہے کہ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدوں کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں حضرت کے بھی وارنٹ ہو چکے تھے، کسی نے ضلع انبالہ کے کلکٹر کو اطلاع دی کہ حاجی صاحب راؤ عبداللہ رئیس پنجاہ ضلع انبالہ کے اصطلبل میں مقیم ہیں، کلکٹر بذات خود اصطلبل پر آموجود ہوا اور رئیس صاحب سے کہنے لگا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس عمدہ گھوڑے ہیں ہم دیکھنا چاہتے ہیں، چنانچہ اصطلبل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ معتقدین سخت گھبرائے ہوئے تھے، انگریز کلکٹر جب اندر داخل ہوا بستر لگا ہوا اور مصلیٰ بچھا ہوا تھا اور وضو کا لوٹا بھی موجود تھا اس کے پانی سے زمین تر تھی، یہ سب کچھ تھا مگر حاجی صاحب غائب تھے، لیکن جب وہ چلا گیا تو حاجی صاحب کو مصلے پر پایا گیا۔

کرامت :- ایک روز موسم سرما میں حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب لنگوٹا کسے ہوئے اور کمبل سر پر ڈالے ہوئے آگے خود اور پیچھے قاضی نجابت علی خاں اور بہت سے ہمراہی پیر محمد ولی مسجد کے روبرو گزرے اور شارع عام سے جانب شمال میں زمین پر بیٹھ گئے، اس عرصہ میں جناب حاجی صاحب مسجد سے باہر تشریف لائے اسی وقت حافظ صاحب نے تمام بدن اپنا کمبل سے ڈھانک لیا اور ستر کو چھپا لیا۔ اور وہاں سے اٹھ کر اپنی جگہ شمالی دروازہ تشریف لے گئے۔

کرامت :- حضرت حاجی صاحب کبھی کبھی جناب غلام مرتضیٰ صاحب موصوف کی ملاقات کیلئے جنگل میں تشریف لے جاتے اور پہلے سے بہت آدمی حافظ صاحب کی تلاش میں جمع ہو کر منتظر بیٹھے رہتے اور آپ کسی سے نہ ملتے، جس وقت حاجی صاحب وہاں پہنچتے فوراً کسی جھاڑی میں سے نکل آتے اور ملاقات کرتے اور بہت نرمی اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور پھر رخصت کر دیتے۔

کرامت :- ایک روز نصف شب کے وقت ایک سفید باف آیا اور آپ کو جگا کر عرض کیا کہ حضرت میری لڑکی کو آسیب کی خلش ہے بہت تکلیف ہے، آپ تشریف لے چلیں اور اس کا علاج فرمادیں اسی وقت آپ اسکے ہمراہ ہوئے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ میاں اللہ بخش اسکے سر پر موجود ہیں انہوں نے آپ کو سلام کیا اور کہا کہ آج اس نے اپنی زبان سے ایسے ویسے کلمات ہماری نسبت کہے تھے اس لئے ہم یہاں آگئے تھے۔ آپ تشریف لے آئے ہم جاتے ہیں اور پھر کبھی یہاں نہ آویں گے۔ آئندہ آپ کسی کی درخواست پر ایسے وقت تشریف نہ لایا کریں۔ صرف ایک تحریر اس کے ہاتھ بھیج دیا کریں موافق اس کے تعمیل کیا کروں گا مجھ سے آپ کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی، پھر جب کہیں ایسی شکایت ہوتی آپ ایک پرچے پر اپنا نام نامی لکھ کر دے دیتے وہ شکایت رفع ہو جاتی۔

کرامت :- بعض لڑکے بلا اطلاع کہیں چلے جاتے اور ان کے اقارب پریشان ہوتے حضرت کے روبرو جس وقت کسی لڑکے کے چلے جانے کا ذکر آتا حضرت اسی وقت دستک دے دیتے وہ لڑکا اس وقت جس جگہ ہوتا تھا اس سے آگے نہ بڑھتا وہاں ہی سے اپنے گھر واپس چلا آتا، آپ فرمایا کرتے کہ جس وقت فرار کا حال معلوم ہوا کرے تو فوراً بیان کر دیا کریں جس قدر جلدی بیان کر دیا جائے گا اتنا ہی جلدی وہ لڑکا واپس آجاوے گا اور جس قدر دیر کی جاوے گی اتنی ہی دیر سے واپس آوے گا۔

کرامت :- (بروایت حافظ قاری مولوی احمد مکی) ۱۳۰۸ھ میں احقر جب سفر ہند کے قصد سے آگبوٹ میں سوار ہوا اور بعد گزرنے عدن کے چھ روز گزرے آگبوٹ کا کونکہ تمام ہو گیا جس کے باعث انجینئر مع کپتان معلم کے بہت حیران و پریشان ہوئے حتیٰ کہ رسیاں، تختے جلانے کی نوبت پہنچی۔ احقر نے انجینئر سے پوچھا بھلا رسیوں اور تختوں کا جلانا کچھ مفید ہے اور آگبوٹ موافق معمول کے چلتا ہے یا کم، اس نے کہا موافق معمول چلنا تو درکنار پانی کے زور

سے کسی قدر پیچھے ہٹ جاتا ہے، تب احقر نے نہایت ملول ہو کر کہا پھر رسیوں کا جلانا کیا مفید ہے؟ کہا:- فقط انجن گرم رہنے کیلئے، یہ گفتگو بعد الظہر ہوئی اور وہ باقی روز نہایت شدت سے گزرا، شب کے وقت ایک بجے نیم خوابی کی حالت میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت اعلیٰ مدظلہ العالی رؤس المسترشدین احقر کو نہایت دلجوئی سے فرما رہے ہیں کہ تو کیوں گھبرا رہا ہے کل انشاء اللہ بندرگاہ بمبئی ساتھ سلامتی کے پہنچے گا۔ اسی وقت بیدار ہوا اور اپنے وظیفہ وورد میں مشغول رہا۔ اور انجینئر پھرتے پھرتے میرے پاس آن پہنچا اور کہا کہ اس وقت آگبوٹ ان ہی رسیوں اور لکڑیوں کے زور سے کچھ آگے بڑھ رہا ہے یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک آگبوٹ نظر آیا اور روشنی صبح کی ظاہر ہوئی، اپنی اصطلاح خاص میں اس کو کچھ کہا کہ وہ آگبوٹ نزدیک آیا اور تھوڑے کوئلے ان سے لئے، کوئلے لینے کی دیر تھی کہ آگبوٹ کی رفتار ایسی ہوئی کہ وہی انجینئر کہتا تھا۔ کہ جب سے میں اس آگبوٹ پر ہوں ایسی چال کبھی نہیں چلا، پھر میں نے پوچھا اب کب پہنچے گا۔ کہا کل صبح کو، احقر متحیر ہوا کہ حضرت نے فرمایا آج کے روز اور یہ کہتا ہے کہ کل، خیر اسی خیال میں ایک عرصہ گزر گیا با امداد اللہ تعالیٰ اسی روز مع الخیر والسلامتہ بمبئی پہنچے اور شہر میں اترے۔

کرامت:- اب بالفعل اسی ماہ میں مولوی محمد شفیع الدین صاحب واسطے نماز صبح کے غسل کے وقت جا رہے تھے، راہ میں اتفاقاً گر گئے اور پسلی میں کچھ تکلیف ہوئی، حضرت اعلیٰ نے مکان پر صبح کے وقت چند بار فرمایا کہ مولوی شفیع الدین صاحب کو بہت تکلیف ہوئی اور ہنوز نہ کوئی آیا اور نہ کوئی گیا، جب مولوی صاحب تشریف لائے تب معلوم ہوا۔ (۱)

کرامت:- ایک مرتبہ یہ ناچیز بقصد حرمین شریفین وطن سے چلا، بمبئی میں سوتا تھا خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت تشریف لائے اور فرماتے ہیں کہ اس مرتبہ تو ہم ہی ہندوستان میں آگئے تم مکے نہ جاؤ، میں نے عرض کیا کہ حضور اب تو یہاں آگئے اور جہاز کا کرایہ بھی کر لیا اور کل جہاز روانہ ہو جائیگا، فرمایا نہیں جانا مناسب نہیں، میں عرض کرتا رہا۔ ارشاد ہوا کہ نہیں اس سال نہ جاؤ، آنکھیں کھلیں فی الجملہ تردد رہا مگر اس دن جہاز کی روانگی تھی میں اس بھید سے واقف نہ تھا، سوار ہوا اور جہاز روانہ ہوا، اسی دن ایسا طوفان آیا کہ جہاز میں نقصان آگیا اور جہاز واپس آیا (۲)

کرامت:- ایک دن ظہر کے بعد میں اور مولوی منور علی صاحب اور ملا محبت الدین

(۱) راوی حافظ قاری مولوی احمد مکی (کرامات امدادیہ)

(۲) راوی مولانا شاہ محمد حسین صاحب (الآبادی) (کرامات امدادیہ)

صاحب کو ضروری بات عرض کرنے کو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت حسب معمول اوپر جا چکے تھے۔ کوئی آدمی تھا نہیں کہ اطلاع کرائی جاتی آواز دینا ادب کے خلاف تھا۔ آپس میں مشورہ کیا کہ حضرت کے قلب کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جائیں یا بات کا جواب مل جائے گا یا حضرت خود تشریف لائیں گے۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی۔ کہ حضرت اوپر سے نیچے تشریف لائے، ہم لوگوں نے معذرت کی کہ اس وقت حضرت لیٹے ہوئے تھے ناحق تکلیف فرمائی ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں نے لیٹنے بھی نہ دیا، کیونکر لیٹتا ہم لوگ سخت نادم ہوئے۔ (۱)

کرامت :- باوجود پیرانہ سالی کے مجاہدہ کا حال یہ تھا کہ ایک سال رمضان شریف میں مجھے حاضری خدمت اقدس کا اتفاق ہوا، دیکھا کہ تمام رات نماز پڑھنے اور قرآن سننے میں بسر ہوتی ہے۔ حافظ عبد اللہ پنجابی ایک بزرگ تھے۔ تراویح میں ہر روز وہ حرم شریف میں محض حضرت کے سنانے کو سات آٹھ سیپارے پڑھتے، اس میں قریب نصف شب گزر جاتی، اس کے بعد حضور کبھی کبھی شیخ حسن عرب کا قرآن سننے جاتے، نصف شب سے حافظ عبد الحمید صاحب باب الرحمۃ پر تہجد میں پانچ چھ سیپارے روز پڑھتے۔ ان کا قرآن سنتے فجر تک برابر یہی کیفیت رہتی، ایک دن حضرت کی طبیعت صحیح نہ تھی کھانا تناول نہیں فرمایا۔ حافظ جی نے کم پڑھا۔ اپنے سلام کے بعد ارشاد فرمایا کہ حافظ جی طبیعت کیسی ہے آج تم نے کم کیوں پڑھا حافظ جی نے عرض کیا کہ آپ کے خیال سے، اپنے فرمایا کہ میں تو جب قرآن سننے لگتا ہوں تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا اور یہ جی چاہتا ہے کہ بس یہ آواز برابر آتی ہی جائے اور اس وقت تک ذرا ضعف نہیں معلوم ہوتا (۲)

کرامت :- میرے والد صاحب قبلہ اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ حضرت قبلہ عمومی حاجی محمد امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ نے علم عربی کم پڑھا ہے۔ ایک بار حضرت موصوف نے حجام کو کاندھلہ اپنے ماموں کے پاس واسطے منگانے کسی بڑی کتاب حدیث کے بھیجا، اس کے جواب میں حضرت رحمہ اللہ کے ماموں صاحب نے فرمایا کہ میاں امداد اللہ اس کتاب کی زیارت کیا کریں گے یا کسی سے پڑھوا کر سنیں گے؟ حجام نے واپسی میں عرض کیا کہ حضرت انہوں نے ایسے فرمایا کہ میری مجال نہیں کہ عرض کروں۔ حضور نے باصرار وہ لفظ سنا، فرمایا کہ اسی وقت واپس کاندھلہ چلا جا اور میرا خط ماموں صاحب کے حضور میں پیش کر کے عرض کرو کہ جو حدیث مشکل ہو وہ آپ تشریف لا کر دریافت فرمائیں خدا کے حکم سے جواب دوں گا۔ سنا گیا ہے کہ وہ بزرگ

تشریف لائے اور مشکل مشکل احادیث دریافت فرمائیں حکم خدا سے جواب درست پایا۔ کہ الحمد للہ علم باطنی سینہ مبارک پر کھل گیا۔ ظاہری علم اس کے سامنے کیا ہے۔ (۱)

کرامت :- میں نے ثقات سے سنا ہے کہ اس زمانے میں کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ آپ کے سامنے سے گزر کرتا اور متاثر نہ ہوتا اور اُس پر رعب نہ ہوتا پھر توجہ اور التفات کی حالت کا کیا ذکر۔ (از مولوی عبدالغنی بہاری)

کرامت :- فرمایا کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں کے حالات کی چھان بین میں رہتے ہیں، یہ امر مذموم اور ممنوع ہے قال اللہ تعالیٰ لا تَدْخُلُوا بِيُوتَا غَيْرِ بِيُوتِكُمْ بزرگوں کے حضور میں اپنے دل کی نگہداشت کرنا چاہئے۔

پیش اہل دل نگہدار ید دل

ایک دن ایک صاحب میرے پاس آئے اور اپنی نسبت سے میرا تفتیش حال کرنے لگے، میں نے کہا کہ یہ امر بہت برا ہے حامل نسبت اگر اپنی پونجی چھپانا چاہے تو پتہ بھی نہ لگنے دے یہ سن کر میرے زانو پکڑ لئے اور عذر کرنے لگے۔

کرامت :- فرمایا کہ میرے بڑے بھائی شیخ ذوالفقار علی صاحب جب ملک پنجاب سے واپس آئے اور مجھ کو اور ادکا شائق پایا فرمانے لگے، کہ مجھ کو ایک فقیر نے ایک عمل بتلایا ہے تم سیکھ لو میں نے اس کو ان سے لے لیا۔ ایک مرتبہ میرا دہلی جانا ہوا، وہاں عبداللہ مسند نشین درگاہ حضرت صابر بخش نے تقریب عرس میں مجھ کو بلوایا اور کسی اپنے مرید کا ہاتھی سواری کو بھیجا جب میں ان کے مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ لوگ بڑی شان و شوکت سے جمع ہیں میں فقیرانہ حالت سے گیا مجھ کو دیکھتے ہی تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور دست بوسی کر کے مسند خاص پر بٹھایا۔ مجھ کو بڑا تعجب تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے جب رات کو وظیفہ پڑھنے لگا تو معلوم ہوا کہ سب اسی وظیفہ کا اثر ہے، خواب میں حضرت پیر و مرشد نے فرمایا کہ اس اعزاز سے کیا حاصل! مجھے معلوم ہوا کہ آپ اس عمل سے ناراض ہیں اسی وقت ترک کر دیا پھر نہیں پڑھا۔

کرامت :- فرمایا کہ حافظ غلام مرتضیٰ مجذوب مقیم پانی پت سالک مجذوب تھے، حالت سلوک میں ان کو جذب ہو گیا تھا ہماری بستی میں اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک بار غل ہوا کہ غلام پتھر مار رہے ہیں میں ان کے پاس گیا مجھ کو دیکھ کر انہوں نے پتھر مارنا چھوڑ دئے اور مجھے قریب بلایا

میرے ہاتھ میں کوئی کتاب عشق تھی اس کے اوراق کھلوائے گئے جب یہ شعر نظر پڑا۔
عشق اول عشق آخر عشق کل عشق شاخ و عشق نخل و عشق گل!
مجھ کو اشارہ کیا اور بشارت غلبہ توحید کی دی، فرمایا کہ جو اسرار توحید میری زبان سے بے
ساختم نکل جاتے ہیں یہ اسی بشارت کا ثمرہ ہے۔

وفات

مرض وفات میں استغراق کے ساتھ ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کروٹ تک بدلنا دشوار
تھا، اشتہا بالکل جاتی رہی تھی آخر ۱۳ جمادی الآخریٰ ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء کو چہار شنبہ کے دن فجر
کی اذان کے وقت چوراسی سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا، جنت المعلىٰ میں مولانا رحمت
اللہ کیرانوی رحمہ اللہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ انا لله وانا اليه راجعون۔ حکیم الامت حضرت
تھانوی رحمہ اللہ نے مادہ تاریخ وفات نکالاحی دخل الخلد ۱۳۱۷ھ

تصنیفات

(۱) مثنوی مولانا رومؒ

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مثنوی مولانا روم سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اور اکثر اس کا درس دیا کرتے تھے۔ حاجی صاحب پر درس کے دوران میں عجیب کیفیت وارد ہوتی اور سامعین و شریک درس بھی اس کیفیت سے متاثر ہوتے۔ مکہ معظمہ میں بھی حاجی صاحب نے درس جاری رکھا۔ اس درس میں مختلف ممالک کے لوگ شریک ہوتے لیکن باوجود اردو زبان سے لاعلمی کے درس سے پورا حظ اٹھاتے اور متاثر ہوتے، حاجی صاحب کا یہ درس کیمیا اثر ہوتا، حاجی صاحب نے مثنوی پر فارسی زبان میں حاشیہ لکھا۔ اس محشی مثنوی کے دو دفتر تو حاجی صاحب کی زندگی میں چھپ گئے تھے بقیہ بعد میں چھپے۔

مثنوی مولانا روم پر حاشیہ لکھنا اور اس کی شرح کرنا معمولی کام نہیں اس سے حاجی صاحب کے علوم کا سرسری اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۲) غذائے روح

اس کتاب میں حکایات و قصص سے تعلیم و تلقین کی گئی ہے نفس کے مغالطوں۔ شیطان کے وسوسوں اور جہالت کے نتائج بیان کئے گئے ہیں۔ شروع میں حمد و نعت اور منقبت خلفاء راشدین ہے پھر اپنے مرشد کا ذکر ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے روح کی غذا کا اہتمام کیا گیا ہے اور اس بارے میں تمام متعلقہ موضوعات پر سیر حاصل مواد فراہم کیا ہے، پوری کتاب اردو نظم میں ہے چھپاسی صفحوں پر سولہ سوا شعار ہیں۔ حاجی صاحب خود ہی اس کے سن تحریر اور نام کا ذکر فرماتے ہیں:-

سال ہجری بھی ہوا جب ختم یار . یک ہزار دو صد و شصت و چہار

جب ہوئی یہ مثنوی یار و تمام . رکھ دیا اس کا ”غذائے روح“ نام

(۳) جہاد اکبر

یہ بھی اُردو نظم میں ہے اور کسی دوسرے شخص کی فارسی نظم کا ترجمہ ہے جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں:-
 غرض جب ہوا یہ رسالہ تمام ”جہاد اکبر“ اس کا رکھا میں نے نام
 یہ مضمون تھا فارسی میں لکھا کسی مردِ حق نے بصد پر ضیا
 کیا میں نے ہندی ملا کر کچھ اور کہ تا خاص و عام سمجھے بغور
 سن و سال ہجری خیر الانام تھے بارہ سو اڑسٹھ ہوا جب تمام
 اس رسالہ میں نفس کی اصلاح وغیرہ پر مشتمل مضامین ہیں اور ان کو تمثیلی اور حکایتی رنگ میں
 پیش کیا گیا ہے تیس (۲۳) صفحات میں چھ سواناسی اشعار ہیں۔

(۴) مثنوی تحفۃ العشاق

اس میں عاشقانِ الہ کیلئے مضامین ہیں کہ کس طرح اللہ کی معرفت حاصل کی جاسکتی ہے
 اس کا سن تحریر ۱۲۸۱ھ ہے۔ اس کا بھی حاجی صاحب نے شعر میں ذکر کیا ہے:-
 بارہ سو تھے اور اکاسی سال ہجر ہو چکا جب حضرت تحفہ کا ذکر
 ہو چکی جب مثنوی تحفہ تمام تحفۃ العشاق رکھا اس کا نام
 اُردو نظم کی یہ کتاب بتیس (۳۲) صفحات اور تیرہ سو چوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔

(۵) درد نامہ غمناک

یہ آٹھ صفحات پر ایک سو پچھتر اشعار کی کتاب ہے شاعر نے عشقِ حقیقی اور جذبہ بے خودی کی
 ترجمانی کی ہے کتاب اتنی موثر اور دردناک ہے کہ پڑھ کر دل چوٹ کھاتا ہے اور بے تاب
 ہو جاتا ہے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق ایک شخص یہ ”درد نامہ غمناک“ پڑھ رہا تھا
 حاجی صاحب اس پر گزرے اور پوچھا کیا پڑھ رہے ہو وہ بے رخی سے پیش آیا۔ بعد میں جب
 اس کو معلوم ہوا کہ اس کتاب کے ناظم یہی ہیں تو بہت شرمندہ ہوا اور نہایت تعظیم کی۔

(۶) ارشادِ مرشد

اُردو میں یہ سولہ صفحات کا مختصر رسالہ ہے جس میں نمازوں کے بعد وظائف و اوراد اثبات

طریق، اثباتِ مجرد، طریق اسم ذات، طریق ذکر پاس انفاس، ذکر اسم ذات ربانی اور لطائف ستہ کا ذکر ہے آخر میں چاروں سلسلوں کے شجرے تفصیل سے بیان کئے ہیں آخر میں مثلث نظم میں چشتی شجرہ ہے سب سے آخر میں نصاب ہے۔ ۲ جمادی الاول ۱۲۹۳ھ میں یہ رسالہ مکمل ہوا۔

(۷) ضیاء القلوب

یہ کتاب حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ حافظ محمد یوسف کی فرمائش پر مکہ مکرمہ میں ۱۲۸۲ھ میں فارسی میں تحریر فرمائی۔ اور اس کا تاریخی نام ”مرغوبِ دل“ ہے اس کتاب کے متعلق حاجی صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

”از وفور التماس عزیزال چارہ ندیدہ ملتجی بجناب قدس حق تعالیٰ گردیدم پس بدم القاشد کہ بنویس“

دوستوں کی کثرتِ خواہش پر کوئی چارہ نہ دیکھ کر خدائے قدوس کہ بارگاہ میں ملتجی ہوا اور میرے دل میں القا ہوا کہ لکھ۔

یہ کتاب سلوک و تصوف کا جوہر اور خلاصہ ہے۔ اس میں ہر قسم کے وظائف، اشغال اور اذکار عبادات کے تحت بیان کئے گئے ہیں، اپنے عنوان پر نہایت عمدہ کتاب ہے۔ نماز اور تلاوتِ قرآن مجید کے متعلق بیش بہا معارف بیان کئے گئے ہیں۔

(۸) وحدۃ الوجود

سات صفحات پر فارسی زبان کا طویل مکتوب ہے جس میں وحدۃ الوجود کے مسئلے پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

(۹) فیصلہ ہفت مسئلہ

بارہ صفحات کے اس رسالے میں میلاد، فاتحہ، عرس و سماع، ندائے غیر اللہ، جماعتِ ثانیہ، امکانِ نظیر اور امکانِ کذب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس رسالے کی ضرورت و اہمیت یوں پیدا ہوئی کہ حضرت حاجی صاحب کے متوسلین میں ان مسائل پر نزاع ہو رہا تھا۔ آپ نے اس نزاع کو روکنے اور اختلاف سے بچنے کیلئے یہ رسالہ تحریر فرمایا۔ مندرجات سے آگاہ ہونے کیلئے قارئین

اس کا مطالعہ فرمائیں۔

(۱۰) گلزار معرفت

یہ حاجی صاحب کا اُردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے جس کو آپ کے مرید با صفا میاں نیاز احمد نے جمع کر کے مرتب کیا ہے۔ حمد، نعت، عشق حقیقی کے متعلق غزلیات اور قیام مدینہ منورہ کے شوق وغیرہ کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ۳۱۹ اُردو کے اور ۹۳ فارسی کے اشعار ہیں۔

(۱۱) ”مرقومات امدادیہ“ اور ”مکتوبات امدادیہ“

کے نام سے ایک سو گیارہ خطوط ہیں جو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا حکیم ضیاء الدین اور حاجی عابد حسین کے نام ہیں۔ ”مکتوبات امدادیہ“ میں حکیم الامت کے نام پچاس خطوط ہیں جو تمام کے تمام اُردو میں ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام آخری خط ۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ کا تحریر کردہ ہے اس کے دو ماہ بعد حضرت کا انتقال ہو گیا بارہ خطوط حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہیں۔ ایک اور خط ”وحدۃ الوجود“ کے مسئلے پر جس کا اوپر ذکر ہوا شامل کر کے کل خطوط ایک سو چوبیس (۱۲۴) ہوتے ہیں جو منظر عام پر آچکے ہیں۔ اب ہم آخر میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نظم اور نثر دونوں کا تھوڑا تھوڑا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

مجھے آگیا جو خیال ایک رات	لگا سوچنے اپنے دل میں یہ بات
کہ افسوس غفلت میں جاتی ہے عمر	سدا کوں رحلت بجاتی ہے عمر
مجھے فکر کل کی ہوئی آج یوں	کہ کی دولت عمر برباد کیوں
نہ سویا شب اسی فکر میں ایک دم	رہا رات بھر اس سے میں چشم نم
کہا نفس کو آخرش میں نے رات	کہ کیا ہو گیا تجھ کو اے بد صفات
خبر حال کی تجھ کو اپنے نہیں	کہ آیا تھایاں کس لئے اے لعین!
بتا تجھ سے کیا حق کو منظور تھا	یہاں آ کے کیا کام تو نے کیا

(جہاد اکبر)

عاشق حق ہو کے دیکھے غیر کو	کعبہ میں چاہے بنانا دیر کو
غیر کو نظروں سے تو اپنی نکال	چشم دل سے دیکھ حق کو جمال
جو سوا حق کے ہے دے سب کو جلا	ایک دلبر سے تو دل اپنا لگا

(غذائے روح)

حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت پر جدائی کا نقشہ :-

ہم بچاروں کو تڑپتا چھوڑ کر سوئے حق راہی ہوئے منہ موڑ کر
وصل سے حق کے ہوئے وہ بہرہ ور پیتے ہیں حسرت سے ہم خونِ جگر
ناز و نعمت میں ہیں وہ مشغول واں خاکِ خوں میں لوٹتے ہیں ہم یہاں
جام کوثر سے ہوئے وہ لب بلب چاٹتے ہیں پیاس سے ہم اپنے لب
آپ تو راحت کے سامان لے گئے اور یہ رنجِ عالم یاں دے گئے

اور پھر اسی سلسلہ کے چند شعر اور :-

گرچہ ہم لائق نہ تھے درگاہ کے کفش برداری میں رہتے شاہ کے
شاہ کو زیبا ہے کب تنہا روی گو بہت خادم نہ ہوں تھوڑے سہی

اور پھر اظہارِ حسرت کرتے ہیں :-

آہ اوہلا دریغا حسرتا ساتھ والے چل دیئے میں رہ گیا
ساتھ کا اپنے ہر اک واصل ہوا مدعا دل کا اسے حاصل ہوا
پہنچا ہر اک منزل مقصود پر رہ گیا میں ہی پڑا بس دور تر (۱)

تضمین

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مشہور مناجات پر جوڑ لگا کر مخمس بنادیا ہے اس کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے :-

کر سکے گا کیا کوئی وحدت میں تیری قیل وقال
عقل و بحث و علت و معلول ہیں زار و علیل
انت کافی فی مهمات و فی رزق قلیل
خذ بلطفک یا الہی من لہ زاد قلیل
مفلس بالصدق یاتی عند بابک یا جلیل
خود بخود ہو جائیں گے یہ درد سارے دل سے دور

جتنے مقصد ہیں بر آئیں گے الہی بالضرور
یہ تڑپ یہ بے قراری فکر بے جا ہے قصور
انت شافی انت کافی فی مهمات الامور
انت حسبی انت ربی انت لی نعم الوکیل
پہلی رباعی کا تیسرا مصرعہ عربی حاجی صنا کا ہے اس سے عربی میں شعر کے ملکہ کا پتہ چلتا ہے

تاریخی مادے

عالم و عارف شہ عبدالغنی
ایں ندا آمد زہر سو غم فزا
کرد چوں جملہ مراتب عمر طے
داد جاں عبدالغنی باجلوہ مے

غزل کا نمونہ

بست و ہشتم ذی قعدہ کو
روکے کہا سب نے کہ جہاں سے
چلدے جنت کو یعقوب
ماہ ہدیٰ ہوا آہ غروب
عرش بریں پہ آپ ہیں زیر میں ہوں میں
گر تخت و حسن و ناز پہ ہیں آپ جلوہ گر
رخ سے کا کل اٹھادیا کس نے
نغمہ سرمدی سنا کے ہمیں
رات میں دن دکھادیا کس نے
مست و بے خود بنادیا کس نے

تقابل اور تضاد خیالی

عشق کے صحرا میں اپنا آپ کرتے ہیں شکار
آپ ہی ہم صید ہیں اور آپ ہی صیاد ہم
ہو گئے جب محو دلبر عشق پھر کس کا رہا
آپ ہی شیریں ہوئے اور آپ ہی فرہاد ہم

آپ ہی اچھے ہیں اور ہیں آپ ہی سب سے برے
 الغرض جو کچھ ہیں پر ہیں جامع اضداد ہم
 علم اپنا جہل ہے اور جہل اپنا علم ہے
 ہیں اسی دانش سے یارو صاحب ارشاد ہم
 اپنے دشمن آپ ہیں اور آپ ہیں اپنے دوست
 آپ کو کرتے ہیں ویران تاکہ ہوں برباد ہم
 ہے بہار ہم کو خزاں میں اور خزاں اندر بہار
 غم ہے شادی میں ہمیں اور غم میں ہیں بس شاد ہم

حمدیہ غزل

الہی یہ عالم ہے گلزار تیرا عجب نقش قدرت نمودار تیرا
 خوشی غم میں رکھی ہے اور غم خوشی میں عجب تیری قدرت عجب کار تیرا
 الہی عطا ذرۂ درد دل ہو کہ مرتا ہے بے درد بیمار تیرا
 کوئی تجھ سے کچھ کوئی چاہتا ہے میں تجھ سے ہوں یارب طلبگار تیرا
 نہیں دونوں عالم سے کچھ مجھ کو مطلوب تو مطلوب میں ہوں طلبگار تیرا
 اٹھا غم، رکھ امید، امداد حق سے
 تجھے غم ہے کیا رب ہے غم خوار تیرا

ایک غزل کے پانچ اشعار

نہ دیکھا داغ دل گلزار کو دیکھا تو کیا دیکھا
 نہ دیکھا خار میں گل، خار کو دیکھا تو کیا دیکھا
 نہ دیکھا برش تیغ نگاہ یار کو تم نے
 اگر شمشیر کی اک دھار کو دیکھا تو کیا دیکھا
 نظر جب کھل گئی اپنی جسے دیکھا اسے دیکھا
 نہ دیکھا آپ میں دلدار کو، دیکھا تو کیا دیکھا

اسے دیکھا اُسے دیکھا نہ یہ دیکھا نہ وہ دیکھا
نہ دیکھا ایک کو اغیار کو دیکھا تو کیا دیکھا
ہمارے شعر امداد الہی سے ہیں ٹک دیکھو
اگرچہ دفتر اشعار کو دیکھا تو کیا دیکھا

فارسی اشعار

اگرچہ بے خود و مستم و لے ہوشیار می گردم
بباطن شاہ کو غنیم بظاہر خوار می گردم
چو شد منظور قتل من تغافل چیست اے قاتل
کہ سر بہ کف، کفن بردوش، گردن دار می گردم
بحمد اللہ چہ راحت یافت جان بیقرار من
کہ آمدنا کہاں نامہ زکوئے شہریار من
بایں شکرانہ بردیدہ نہادم پائے قاصد را
کہ از نامہ منور کرد چشم انتظار من
لبعین گریہ من خنداں، وہم در خندہ من گریاں
بہار اندر خزاں بود و خزاں اندر بہار من

اُردو نثر کا نمونہ

طریقہ مراقبہ کا یہ ہے کہ دو زانوں نمازی کی طرح سر جھکا کر بیٹھے اور دل کو غیر اللہ سے خالی کر کے حق سبحانہ تعالیٰ کی حضوری میں حاضر رکھے۔ اول اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کے تین بار اللہ حاضری اللہ ناظری اللہ معنی زبان سے تکرار کر کے پھر مراقب ہو کر ان کے معنوں کا دل سے ملاحظہ کرے اور تصور کرے، یعنی جانے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ حاضر ناظر میرے پاس ہے اس جاننے میں اس قدر خوض کرے اور مستغرق ہو کہ شعور غیر حق کا نہ رہے یہاں تک کہ اپنی بھی خبر نہ رہے اگر ایک آن بھی اس سے غافل ہو مراقبہ نہ ہوگا۔ (۱)

فارسی نشر کا نمونہ

بداں کہ تلاوت قرآن افضل عبادت است و کد ام طریق برائے تقرب الی اللہ سوائے فرائض بہتر از تلاوت قرآن نیست، پس آداب و استحباب او آنست کہ باخلاص تمام با طہارت کامل رو قبلہ با ترتیل و خشوع و تحزن بعد از اعوذ (باللہ) و بسم اللہ بملاحظہ آنکہ کلام با خدائی کنید و گویا اور امی بیند و اگر نتواند بداند کہ او مرا بیند و باو امر و نواہی مرا حکم می فرماید و بر آیت بشارت فرحان و بر آیت وعید ترساں و گریاں باشد و بنجر و الحان خوش کہ موجب جمعیت خاطر و رفع غفلت است بخواند و ایں عام است و طریق خاص آنکہ۔

سمجھو کہ قرآن کریم کی تلاوت عبادتوں میں افضل ہے اور اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کیلئے فرائض کے سوائے قرآن کی تلاوت سے بہتر اور کوئی نہیں ہے اس لئے اسکے آداب اور مستحبات یہ ہیں کہ پورے اخلاص اور پوری طہارت کے ساتھ قبلہ کی طرف منہ کر کے ٹھہر ٹھہر کر، عاجزی کیساتھ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد اس خیال سے پڑھے کہ خدا کے سامنے باتیں کر رہا ہے گویا اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا تصور نہ کر سکے تو یہ سمجھے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے اور او امر و نواہی کا حکم دے رہا ہے اور خوشخبری کی آیت پر خوش اور سزا کی آیت پر خوفزدہ اور روتا ہوا ہونا چاہئے اور جہر خوش الحانی سے جس سے دل کو اطمینان اور غفلت دور ہو پڑھے اور یہ عام طریقہ ہے لیکن خاص طریقہ یہ ہے کہ۔

اس کے بعد حضرت رحمہ اللہ نے اس خاص طریقے کا مفصل ذکر فرمایا ہے اس کیلئے ”ضیاء القلوب“ کی طرف مراجعت فرمائی جائے۔

ہم نے اختصار کے ساتھ حضرت حاجی صاحب کے حالات پیش کر دیئے ہیں مفصل مطالعہ کیلئے شائع شدہ امدادیہ، کرامات امدادیہ، علماء ہند کا شاندار ماضی، حکایات اولیاء اور پروفیسر محمد انور الحسن شیر کوئی کی تالیف ”حیات امداد“ کی طرف رجوع فرمائیں۔ ہم نے اس مضمون کی ترتیب کیلئے سب سے زیادہ استفادہ ”حیات امداد“ اور نئی دنیا کے ”عظیم مدنی نمبر“ سے کیا ہے۔

[illegible]

مجاہد اسلام

حضرت مولانا رحمت اللہ کیمرانویؒ

سوال نمبر ۱۰۱ کے لیے دیکھیں۔
سوال نمبر ۱۰۲ کے لیے دیکھیں۔
سوال نمبر ۱۰۳ کے لیے دیکھیں۔
سوال نمبر ۱۰۴ کے لیے دیکھیں۔
سوال نمبر ۱۰۵ کے لیے دیکھیں۔
سوال نمبر ۱۰۶ کے لیے دیکھیں۔
سوال نمبر ۱۰۷ کے لیے دیکھیں۔
سوال نمبر ۱۰۸ کے لیے دیکھیں۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی

فہرست

۳۸۸	سلسلہ نسب
۳۹۰	تعلیم و تدریس و ملازمت و تصنیف
۳۹۳	تصنیف و تالیف
۳۹۶	تاریخی مناظرہ
۳۹۷	چھوٹا مناظرہ اکبر آباد
۳۹۸	بڑا مناظرہ اکبر آباد
۴۰۱	پہلے روز کے مناظرہ کی کارروائی
۴۰۱	بحث نسخ
۴۰۸	بحث تحریف
۴۱۱	دوسرے دن کے مناظرے کی کارروائی
۴۱۹	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت
۴۲۷	رحمت اللہ بیت اللہ میں
۴۳۳	حرم شریف میں مولانا کے تلامذہ
۴۳۵	مکہ میں رد نصاریٰ کی تعلیم
۴۳۶	قسطنطنیہ کا دوسرا سفر
۴۴۰	مسجد مدرسہ صولتیہ کی تعمیر
۴۴۲	قسطنطنیہ کا تیسرا سفر
۴۴۴	مولانا رحمت اللہ صاحب کا انتقال
۴۴۶	خانہ کعبہ کی مرمت میں شرکت
۴۴۶	انگریزوں کو عدن میں جگہ نہ دینے کا مشورہ
۴۴۷	نہر زبیدہ کی مرمت میں حصہ

- ۴۴۷ حجاز کے حکام کے خلاف وزیراعظم کو خط
 ۴۴۸ مدرسہ صولتیہ
 ۴۵۱ مدرسہ صولتیہ کے سرپرست حاجی امداد اللہ صاحب
 ۴۵۲ مدرسہ صولتیہ کے مہتمم مولوی محمد سعید صاحب
 ۴۵۵ مدرسہ کے دوسرے ناظم مولانا محمد سلیم صاحب
 ۴۶۱ تصنیف و تالیف
 ۴۶۱ ازالتہ الاوہام
 ۴۶۵ ازالتہ الشکوک
 ۴۷۰ تلامذہ

مجاہد اسلام مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکیؒ

آثار رحمت :- تالیف مولانا امداد صابریؒ

تلخیص :- مولانا عبدالرشید ارشد

”حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمہ اللہ کے حالات جاننے سے پہلے قارئین ان حالات کا جائزہ لیں کہ جو انگریز اور پرتگالی عیسائیوں اور پادریوں نے ہندوستان میں شروع کر رکھے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمت اللہ کا تکوینی طور پر انتظام کرتا ہے۔“ (ارشاد)

ہندوستان کے مذاہب اور خاص طور پر اسلام پر حملہ وسیع اسکیم کے تحت غیر ملکی پر تلگیزیوں اور انگریزوں نے حکومت کے زعم میں اور برطانیہ، امریکی اور جرمنی مشنری سوسائٹیوں کے ذریعے کیا تھا، اور پرتگالی و پرتگیزی دور سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت تک پر تلگیزیوں اور انگریزوں نے ہندوستان کے مذاہب کو نیست و نابود کرنے اور ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کیلئے انتھک کوششیں کیں۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد کے دور میں کامیابی حاصل کی۔ اس اسکیم کی ابتداء پرتگالی دور میں بڑے ہیبت ناک طریقہ پر ہوئی۔ چوتھی صدی عیسوی میں کچھ شامی خاندان کے عیسائی ہندوستان کے ساحل مالابار پر آباد ہو گئے تھے۔ مالابار کے راجاؤں نے ان سے بہت اچھا سلوک کیا اور یہاں تک ان کو مراعات دیں کہ شامی عیسائیوں کے تمام فوجداری اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ خود ان کے بشپ کرتے تھے۔ اس وقت پرتگالیوں کا یہ دستور تھا کہ وہ علاقہ پر قبضہ کرتے اس کے حاکم اور اس کے اہل و عیال کو اسیر کر کے عیسائی بنا کر لسبن دار السلطنت میں بھیج دیتے تھے۔ چنانچہ علاقہ پر چول کے حاکم فرمان خاں اور اس کی بیٹی کو زبردستی نصرانی بنا کر گوا کے پر تلگیزی وائسرائے دلسکودی گامانے لسبن روانہ کر دیا تھا۔

(تاریخ ہندو کاۃ اللہ)

خاص طور پر پر تلگزیوں کے پادریوں کی عجیب حالت تھی۔ مذہبی جنون میں وحشی بنے ہوئے تھے۔ وہ کسی کے مذہب میں مداخلت کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کو ادائے فرض سے جابرانہ طریقوں سے روکتے تھے۔ مسلمانوں کی مسجدیں مسمار کر دیتے تھے اور ان کو پکڑ کر قید میں ڈال دیتے تھے اور مذہب کو تبدیل کرنے کیلئے زور دیتے تھے۔ اگر وہ مذہب کو تبدیل کرنے کیلئے تیار نہ ہوتے تھے، تو انکو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے مروانے کا طریقہ کیا ہوتا تھا وہ گوا کے سیاح وزیر نامی کی صفحات میں پڑھئے وہ لکھتا ہے:-

”میں ایک دن صبح کو اس مقام پر گیا جہاں پادریوں کا دار القضا بنا ہوا تھا۔ دار القضا کیا تھا مقتل گاہ تھا۔ بازار کے بیچ میں ایک بڑا بھاری انجن سولی کی طرح کھڑا کیا تھا جس پر ایک چرچ لگا ہوا تھا۔ انجن پر بھیجنے کیلئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کو اسٹراپیڈ کہتے ہیں جس کے ذریعہ سزا پہنچانے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک بڑا شہتیر بلندی پر لگا ہوا تھا اس پر انسان کو کھینچ کر چڑھاتے تھے، اور وہاں سے اسے گر دیتے تھے جس کی ضرب سے اس کی ہڈیاں چور چور ہو جاتی تھیں۔ وہیں تھوڑے فاصلہ پر اوپر دار کو جزیرہ تھا جہاں پادری کے فتوے کے مطابق لوگوں کو زندہ آگ میں جلادیا جاتا تھا۔ جس کیلئے یہ سزا تجویز ہوتی تھی اس کو دار القضا سے خوفناک بھتنے اور شیطان کے لباس پہنا کراتے تھے اور جلاد کے حوالے کر دیتے تھے۔ بازار میں علاوہ سور کے گوشت کے دوسرے گوشتوں کی ممانعت تھی۔ جو مسلمانوں کی پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی۔“ (۱)

انگریزوں نے اکبر و جہانگیر کے درباروں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا تھا اور اپنے لئے آسانیاں بھی مہیا کر لی تھیں۔ شاہجہاں کے عہد میں انہوں نے ہو گلی کی کھاڑی کی طرف جو پر گئے تھے اس پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور وہاں کی رعایا کو زبردستی اور روپے کا لالچ دے کر عیسائی بنا کر فرنگستان بھیجنا شروع کر دیا۔ اگرچہ رعایا کے کم ہو جانے سے اجارہ کار و پیہ ان کو گرہ سے بھرنا پڑتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس فعل سے باز نہیں آتے تھے۔ ان کی یہ کارروائی دیہات تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ دریا کے کنارے پر جو آدمی ملتا اس کو پکڑ کر فرنگستان بھیج دیتے تھے (۲) مرنے والوں کا مال ضبط کرنا، متوفی کے نابالغ ہندو مسلمان بچوں کو عیسائی بنا کر غلام بنانا۔ ناواقفیت اور غلطی سے داخل ہونے پر ہندو فقیر کو تکلیف دے کر مار ڈالنا اور مسلمان فقیروں کو قبر میں دفنانا ان کا شیوہ بنا ہوا تھا۔ (۳)

اس ظلم کا انسداد آخر شاہجہان بادشاہ کو کرنا پڑا۔ اس نے ان لوگوں کو سخت سزائیں دیں۔ عالمگیر کے دور میں بھی پر تلگیزیوں کا یہی ظالمانہ طور طریقہ جاری تھا۔ منشی ذکاء اللہ صاحب نے اپنی تاریخ ہند میں اس کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

”پر تلگیزی سمندر کے کنارے نیادر ہندہ گلی کے قریب رہتے تھے۔ مسلمانوں کے لئے ایک خداپورہ آباد کیا تھا۔ نماز بلا تشویش کے کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ان کے تعلقہ میں رعایا کا کوئی آدمی مر جاتا اور اس کا کوئی نابالغ لڑکا ہوتا اور بڑا بالغ لڑکا نہ ہوتا تھا تو اس کے بچوں کو اپنی سلطنت کا بیت المال سمجھ کر اپنے گرجا میں لے جاتے تھے۔ پادری ان کو عیسائی مذہب کی باتیں سکھاتا تھا۔ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اس کو عیسائی بنالیا جاتا تھا اور غلاموں کی طرح ان سے خدمت لی جاتی تھی۔ ۱۱۰۵ھ / ۱۶۹۳ء میں کچھ مسلمان حج کو جا رہے تھے۔ ان کو گرفتار کیا۔ واپسی پر گنج سوآلی عالمگیری جہاز پر قبضہ کر کے اس کو لوٹا اور جتنے مسلمان جہاز پر تھے ان کو برہنہ کیا اور مستورات کی بے حرمتی کی جس کی وجہ سے مستورات نے سمندر کی تہ اور خنجر کی دھار کی نذر ہونا منظور کیا“ (۱)

عیسائی مذہب کو پھیلانے کیلئے پر تلگیزیوں اور انگریزوں نے بڑے رکیک ہتھکنڈے استعمال کئے۔ اپنی لڑکیوں کو بادشاہوں کے حرم میں پہنچانے سے گریز نہیں کیا جو بادشاہوں کی بیویاں بنیں۔ چنانچہ اکبر بادشاہ کی بیوی مریم زمانی، عالمگیری کی بیوی مسیح النساء شاہ عالم کی بیوی مس ہنری اور نصیر الدین حیدر شاہ کی بیوی مخدرہ عالیہ ہوئیں جو عیسائی مذہب پھیلانے کا باعث بنیں۔

مغلیہ دور میں عیسائی اپنے مذہب کی تبلیغ ہندوستان میں بڑی جانفشانی اور تندہی سے کرتے تھے لیکن اس میں ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر برنیر اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے:-

”..... کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں اس معاملہ کے شوق میں اس قدر محو ہو گیا ہوں کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جس قدر حواریوں کے ایک دفعہ کے وعظ سے ایک اثر عظیم ہوتا تھا۔ اتنا ہی اس زمانہ کے مشنری لوگوں کے وعظ سے بھی ممکن ہے کیونکہ بت پرست اور کافر لوگوں کے ساتھ ملتے جلتے رہنے کے باعث ان کے دلوں کی تاریکی سے مجھے اس قدر

واقفیت ہو گئی ہے کہ ہرگز یقین نہیں کہ دو یا تین ہزار آدمی ایک دن میں ایمان لے آئیں۔ خصوصاً مسلمان بادشاہوں اور ان کی مسلمان رعایا سے تو کسی طرح بھی تبدیلی مذہب کی امید نہیں اور چونکہ ممالک ایشیا کے وہ سب مقامات میرے دیکھے ہوئے ہیں جہاں مشنری لوگ مقیم ہیں اس لئے میں اپنے تجربہ کی رو سے کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں کی خیرات اور تلقین کا اثر مشرکوں ہی پر ہونا ممکن ہے، اور یقین نہیں کہ دس برس میں بھی ایک مسلمان عیسائی ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان انجیل کو مانتے ہیں اور مسیح علیہ السلام کا ذکر بغیر نہایت ادب و تعظیم کے نہیں کرتے اور بلا لفظ حضرت صرف عیسیٰ کبھی نہیں کہتے اور ہماری طرح اس کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ معجزانہ طور پر کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور یہ کہ وہ کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے۔ لیکن یہ امید کرنا عبث ہے کہ وہ اپنا دین جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں، چھوڑ دیں اور اپنے پیغمبر کے برحق نہ ہونے کو مان لیں مگر باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی فرنگستان کے عیسائیوں کو چاہئے کہ مشنری لوگوں کی ہر ایک طرح سے مدد کریں اور ان کی دعا ان کی طاقت اور دولت اور اپنے نجات دہندہ (عیسیٰ علیہ السلام) کے جلال میں بڑھانے میں صرف ہونی چاہے مگر اس خرچ کا متحمل اہل یورپ کو ہونا چاہئے۔ (۱)

یہ وہ دور تھا جبکہ مسلمان اقتصادی، اخلاقی، مذہبی، معاشی اور تنظیمی حالت میں بہت مستحکم تھا اور اس کی ایمانی قوت کا دشمن بھی لوہا مانتا تھا لیکن عالمگیر بادشاہ کے انتقال کے بعد مسلمانوں کا ہندوستان میں اقتدار ختم ہوتا چلا گیا۔ عوام کی اخلاقی معاشی و تنظیمی حالت بھی گرتی اور خراب ہوتی چل گئی۔ مذہب سے وہ لگاؤ نہیں رہا جو ایک مسلمان کو ہونا چاہئے۔ ذہن بہت پست ہو گئے اور بے حسی اور بے بسی طاری ہو گئی۔ انگریزوں کا ۱۱۸۱ھ / ۱۷۹۸ء میں مدراس پر قبضہ ہو گیا تھا ان کا طریقہ یہ تھا کہ جس مقام پر قبضہ کرتے وہاں برطانوی امریکی اور جرمنی عیسائی مشنریوں کی ٹڈی دل فوج شہروں قصبوں، دیہاتوں، جنگلوں، پہاڑوں اور محلوں میں پھیل جاتی تھی اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتی تھی۔ اسکول کھولے جاتے، ہسپتال قائم ہوتے، طالب علموں اور مریضوں میں نصرانیت کی حقانیت ثابت کی جاتی اور اسلام کی تکذیب و تحقیر کی جاتی تھی اور ان کاموں میں حکمران بھی حصہ لیتے تھے۔

۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۵ء میں تعلیم کے نام پر حاکم اعلیٰ (گورنر) نے نصرانیت کا پروپگنڈہ اسکولوں

میں شروع کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں کلکتہ کے اندر لوٹ مار ہوئی تو میر جعفر سے جرمانہ وصول کیا گیا۔ اس جرمانہ سے کلکتہ میں فری اسکول قائم کیا گیا۔ اس کے مہتمم گورنر مقرر ہوئے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست اس اسکول میں تھا اس مدرسہ کی تعلیم کی غرض یہ تھی کہ اس میں ہر قوم کا وہ بچہ جس کی عمر پانچ سال سے دس سال تک ہوتی داخل ہو سکتا تھا۔ اور ہر طالب علم کے لئے یہ لازم قرار دیا گیا تھا کہ وہ عیسوی دعاؤں میں شامل ہو اور بائبل کی تعلیم ضرور حاصل کرے۔ اس مدرسہ کے علاوہ اس زمانہ میں جو بھی مدرسہ قائم ہوا اس میں نصرانیت کی تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا، چنانچہ بشپ کالج کلکتہ ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۹ء میں قائم ہوا۔ اس کے ہر طالب علم کو یہ قسم کھانی پڑتی تھی کہ وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مشنری کے کاموں میں حصہ لے گا۔ مشن اسکولوں میں لڑکوں کو انجیل پڑھا کر ان سے سوال کیا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے اور نجات دالانے والا کون ہے عیسائی مذہب کے مطابق جواب دینے والوں کو انعام دیا جاتا تھا۔ مشن کے سیکڑوں اسکولوں میں داخل ہونے کے لئے حکام ضلع ترغیب دیتے تھے اور اسکولوں میں جا کر دیکھتے تھے کہ کون کون شامل ہوا۔ اگر لوگ بچوں کو شامل نہیں کرتے تھے تو مجبور کیا جاتا تھا اور حکما داخل ہونا پڑتا تھا۔ (۱)

انگریزی تعلیم دینے کی غرض ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کرنا تھی۔ چنانچہ آنرہبل مسٹر چارلس گرانٹ ڈائرکٹر کمپنی جو ہندوستان میں انگریزی زبان جاری کرنے کے حامی تھے وہ اس کی غایت یہ بیان کرتے ہیں۔ (۲)

”یہ بالکل انگلستان کے اختیار میں ہے کہ وہ ہندوؤں کو بتدریج ہماری زبان سکھائے اور بعد میں اسی کے ذریعہ ہمارے فنون و فلسفہ اور مذہب کی تعلیم دے۔ مگر بلاشبہ سب سے اہم تعلیم جو ہندوؤں کو ہماری زبان کے ذریعہ ملے گی وہ ہمارے مذہب کی معلومات ہوں گی۔ مسلمانوں نے اپنی سلطنت کے زمانہ میں ہندوستان کے کیرکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ لیکن ہمیں ہندوستانیوں کو سچے مذہب (مذہب عیسوی) سے اور بہترین اخلاق سے اور علوم و فنون کے اصول سے محروم نہیں کرنا چاہئے۔“

سابقہ ہندوستان میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی ہندو عیسائی ہوتا تھا اس کو شاستر کے مطابق

ہندو محرم الارث کر دیتے تھے جس سے پادریوں کو آسانی کے ساتھ ہندوؤں کو عیسائی بنانے میں وقت کا سامنا پڑتا تھا۔ چنانچہ لارڈ ریڈنگ نے اس پریشانی کا سدباب کرنے کیلئے ایکٹ ۱۸۵۰ء نافذ کیا۔ اگر کوئی ہندو عیسائی ہو جائے تو وہ اپنے حقوق اور وراثت سے محروم نہ ہو سکے گا۔

انگریزی حکام نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مخصوص مذہبی نشانوں کو مٹانے کی بھی کوشش کی، اور ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۸ء میں پہلی بار مقام ویلور میں سرجان کر اور ایک کمانڈر انچیف نے اپنے فوجی قوانین میں تین باتوں کا اضافہ کیا اور حکم دیا کہ ہندوستانی فوجی ماتھے پر تلک نہ لگائیں۔ ڈاڑھیاں منڈائیں اور اپنی ہندوستانی وضع کی ٹوپوں کو چھوڑ کر انگریزی ہیٹ پہنیں۔ اسی پر بس نہیں کیا جاتا تھا بلکہ حکام شہر اور افسران فوج اپنے ماتحتوں سے مذہبی باتیں کرتے تھے۔ اپنی کوٹھیوں پر بلا کر پادریوں سے مذہب کی تلقین کراتے تھے اور چھوٹی نوکریوں کے لئے یہ ضروری قرار دے دیا گیا تھا کہ سرٹیفکٹ پر دو ڈپٹی انسپکٹروں کے دستخط ہونے ضروری ہیں یہ ڈپٹی انسپکٹر زیادہ تر مشنری ہوتے تھے جن کو ہندوستانی لوگ کالا پادری کہتے تھے۔ اگر سرٹیفکٹ پر ان ڈپٹی انسپکٹروں کے دستخط نہیں ہوتے تھے تو نوکری نہیں ملتی تھی۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور ان کے علاوہ کتابیں، پمفلٹ اور اخبارات بھی شائع ہوتے تھے اور ان میں جناب رسول مقبول ﷺ اور قرآن مجید پر حسب ذیل الزامات عیسائی مشنری علی الاعلان لگاتے تھے۔

- (۱) قرآن مجید اصلی نہیں ہے اس میں تحریف و تبدیلی ہوئی ہے۔
- (۲) قرآن مجید میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ توریت و زبور سے سرقہ کی گئی ہے اس کے علاوہ اس میں جو کچھ ہے وہ یہودیوں کی (نعوذ باللہ) خرافات ہیں۔
- (۳) نبی کی نبوت کے لئے معجزے ضروری ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ سے کسی معجزے کا ظہور نہیں ہوا۔ اس بنا پر وہ (نعوذ باللہ) نبی نہیں تھے۔
- (۴) کتاب مقدس کے مطالب قرآن و حدیث کے خلاف ہیں۔ اس لئے قرآن کتاب الہی نہیں ہے
- (۵) اسلام جھوٹ کی تعلیم دیتا ہے۔
- (۶) اسلام جہاد (بزور شمشیر) کے ذریعہ پھیلا ہے۔
- (۷) محمد رسول اللہ ﷺ کو وحی نہیں آتی تھی بلکہ وہ صرع کی بیماری تھی جس میں (نعوذ باللہ) وہ مبتلا تھے۔

(۸) حضور اقدس کی ذات اقدس پر شر مناک و نازیبا الزامات و حملے۔ (۱)

(۹) ازواج مطہرات کی ذات پر ناپاک الزامات۔ (۲)

عیسائی مشنری سر بازار علی الاعلان پچیلنج کرتے پھرتے کہ ان الزامات کا جواب دو، جواب دینا تو کجا مسلمان ان ناقابل برداشت الزامات کو سنتا تھا اور خاموش ہو جاتا تھا، پہلے رسول کی عزت و آبرو کی خاطر اپنی جان و مال اور آل اولاد کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس وقت اس کو اپنی جان زیادہ پیاری تھی، اس لئے عیسائی مشنری ان پر حاوی ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے خاندان کے خاندان عیسائی بننے پر آمادہ ہونے لگے تھے۔ چنانچہ عماد الدین پانی پتی مع اپنی اولاد کے عیسائی ہو گئے اور ان کے باپ چراغ الدین اور ان کے بھائی خیر الدین نے بھی عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اور صفدر علی، رجب علی بھی اسلام کو خیر باد کہہ کر عیسائی بن گئے تھے۔ برنیر نے کہا تھا ”یقین نہیں کہ دس برس میں بھی ایک مسلمان عیسائی ہو جائے“۔ لیکن یہاں اس کے برعکس عمل ہو رہا تھا۔

مگر اس پر آشوب زمانہ میں اللہ کے نیک بندے اور مجمع توحید کے پروانے بھی تھے۔ مولانا آل حسن صاحب نے انہیں حالات میں ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۴ء میں رد نصاریٰ میں ایک کتاب استفسار شائع کی جس میں پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق کے اعتراضات کے جوابات بھی تھے اس کے بعد مولانا رحمت اللہ صاحب نے کتب رد نصاریٰ لکھیں لیکن انہوں نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ آگرہ میں پادری فنڈر کی کوٹھی پر اسلام کی حقانیت ثابت کرنے اور عیسائیت کی تکذیب کرنے کیلئے پہنچے اور اس کو مناظرہ کی دعوت دینے گئے۔ وہ نہیں ملا تو خط و کتابت سے مناظرہ طے کیا۔ چنانچہ اپریل ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء میں دوروزہ تاریخی مناظرہ آگرہ میں پادری فنڈر سے ہوا۔ جس میں پادری فنڈر کو ماننا پڑا کہ انجیل مقدس میں تحریف ہوئی ہے۔ اس مناظرہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے شریک ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب تھے۔ (۳)

اس تاریخی مناظرہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر قوم میں بیداری پیدا ہوئی۔ کروٹ لی اور یہ مناظرہ جنگ آزادی ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء کی ابتدا کا

(۱-۲) تمدن عرب نامی کتاب میں جو فرانسیسی مستشرق گستاوی بان نے لکھی اور اس کا ترجمہ اردو میں غلام علی آزاد بلگرامی نے کیا اس کے اندر یہ بات موجود تھی الحمد للہ ہم نے اس کو صرف دو تین احتجاج کر کے نکلویا۔ اسے لاہور کا ایک پبلشر شائع کرتا ہے۔ راقم نے میاں چنوں کی میونسپل لاہوریری میں اسے ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ دیکھا۔ میاں چنوں عید کے اجتماع پر تقریر کی پھر گوجرہ کی اور اخبارات نیز حکومت کو قراردادیں بھیجیں الحمد للہ پبلشر کو یہ صفحہ نکالنا پڑا (ارشاد)

(۳) ہندوستان میں اسلام کو ختم کرنے کیلئے جو دوسرا حملہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے ہوا اس کا خاتمہ مولانا رحمت اللہ

صاحب اور ان کے حامیوں نے کس قدر جوش و خروش سے کیا اس کی تفصیل ”مفت محمد امجد علی“ (امداد صابری)

باعث بنا اور مولانا رحمت اللہ صاحب بھی اس جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہیرو بنے اور انہوں نے ایک رہنما کے طور پر اس میں حصہ لیا اور اسی کے ساتھ انہوں نے جبکہ مرکز اسلام مکہ معظمہ میں علم کی شمع بجھنے لگی مدرسہ صولتہ کی بنیاد رکھی جس کا آج سعودی عرب کی مشہور درسگاہوں میں شمار ہوتا ہے اور افضلیت کا درجہ اسی کو حاصل ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے پیروکاروں مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا اشرف الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ابوالمنصور صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ حضرات کی جدوجہد اور ان کی قلم و زبان نے عیسائی مشنریوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا اور ہندوستان کے مسلمانوں پر جو دوسرا حملہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے کیا گیا تھا وہ بھی ناکام بنا دیا گیا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے حامیوں نے کتابوں کا جواب کتاب سے، اخبارات کا جواب اخبارات سے، مشنری سوسائٹیوں کا جواب تبلیغی جماعتوں سے دیا۔ اور مناظروں میں مقابلے کر کے دندان شکن جوابات دے کر ان کے غرور و تمکنت اور مکرو فریب کی قلعی کھولی۔ گارسان دتاسی جو اپنے خطبوں میں مشنریوں کی کوششوں کو براہ راست ہتھکڑیا، اور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتا تھا وہ مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے تبلیغی اثرات کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ چنانچہ اپنے خطبہ میں لکھتا ہے۔

”یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو لوگ اسلام میں شامل ہو رہے ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض عیسائی نہ معلوم کیوں اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اردو کے اخبار ”چشمہ علم“ میں ان یورپیوں کے اسلام قبول کرنے کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ لوگ مدراس کی ایک مسجد میں جمع ہوئے اور مسلمان ہو گئے، اور نماز میں مسلمانوں کے ساتھ شرکت کی۔ ایک سوزر لینڈ کے باشندے نے کمال کیا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اسلام قبول کیا بلکہ اب شرفی لباس زیب تن کئے ہوئے بندیل کھنڈ میں تبلیغ کرتا پھر رہا ہے۔ مجموعوں میں تقریریں کر رہا ہے اور قرآن مجید کے مطالب اردو میں بیان کر رہا ہے۔“ (۱)

آخر میں دتاسی کو مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے حامیوں کی مخلصانہ کوششوں کی کامیابی

اور مشنریوں کی جدوجہد کی ناکامی کا اعتراف صاف لفظوں میں کرنا پڑا۔ وہ تحریر کرتا ہے (۱)۔
”ہندوستان میں ان مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے جنہوں نے دین مسیحی قبول کیا ہو۔“

سلسلہ نسب

مولانا رحمت اللہ صاحب کا خاندان ہندوستان کا نامور خاندان ہے جس میں معروف و نامور مشائخ اور اطباء گزرے ہیں۔ جنہوں نے علمی، تاریخی، ادبی و تعلیمی اور انقلابی کارنامے انجام دیے ہیں اور سراسر امر اجماعی طاقتوں کا خاتمہ کیا اور فوجی خدمات انجام دیں، اور جنہوں نے کئی معرکے بھی سر کئے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی ان کی خدمات جلیلہ کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اس خاندان کا نسب نامہ یہ ہے۔

رحمت اللہ بن خلیل اللہ المعروف بہ خلیل الرحمن بن حکیم نجیب اللہ بن حکیم حبیب اللہ بن حکیم عبد الرحیم بن حکیم قطب الدین بن شیخ حکیم فضیل بن حکیم دیوان عبد الرحیم.....
(برادر ثواب مقرب خان) بن حکیم عبد الکریم المعروف بہ حکیم بینا الملقب بہ ”شیخ الزماں“ بن حکیم حسن بن عبد الصمد بن ابو علی بن محمد یوسف بن عبد القادر بن کبیر الاولیاء حضرت مخدوم جلال الدین محمد بن محمود بن یعقوب بن عیسیٰ بن اسماعیل بن محمد تقی بن ابی بکر بن علی نقی بن عثمان بن عبد اللہ بن شہاب الدین بن شیخ عبد الرحمن گاذرونی بن عبد العزیز سرخسی بن خالد بن ولید بن عبد العزیز بن عبد الرحمن کبیر مدنی بن عبد اللہ الثانی بن عبد العزیز کبیر بن عبد اللہ کبیر بن عمرو بن امیر المومنین ذوالنورین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔
محمود غزنوی علم دوست بادشاہ تھا جس کو علوم و فنون و ادب کا بڑا شوق تھا۔ وہ ابتدا سے اہل علم اور ارباب کمال کا دلدادہ تھا۔ جب اس نے اپنا ایک دلکش و خوشنما باغ لگوایا تو اس میں ایک دلکش مکان بھی بنوایا تھا جس کے جشن میں امراء سلطنت کے ساتھ اپنے والد ماجد امیر سنگین کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ باپ نے باغ اور مکان کو دیکھا تو بہت پسند کیا اور اپنے سعادت مند و ہونہار فرزند کو یہ نصیحت فرمائی۔ (۲)

”ایسے باغ اور مکان تو اور بھی امیر بنا سکتے ہیں۔ تجھ کو وہ عمارت بنوانی چاہئے کہ جس کی برابری کوئی دوسرا نہ کر سکے۔“ محمود نے پوچھا حضرت ایسی عمارت کون سی ہے۔ ”اس نے جواب دیا کہ وہ اہل علم و فضل کے دلوں کی تعمیر ہے جو کوئی نہال احسان ان کی دل کی زمین

میں لگائے گا اس کا ثمر ہمیشہ پائے گا۔ (۱)

چنانچہ محمود غزنوی نے باپ کی اس نصیحت عمل کیا۔ اس کے دربار میں اس قدر فضلاء علماء و شعراء حکماء جمع ہوئے جو کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئے۔ اس نے ایک وسیع و عظیم الشان دارالعلوم تعمیر کرایا جس میں ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا۔ محمود غزنوی عالموں کے وظیفوں اور پنشنوں پر سالانہ ایک لاکھ روپیہ صرف کرتا تھا۔ ایک عجائب خانہ بھی اس نے بنوایا تھا۔ جس میں سارے عالم کے عجائب جمع کئے۔ چار سو شعرا اس کے دربار میں ملازم تھے جن میں قابل ذکر فردوسی، طوسی، حکیم عنصری، عسجدی افرجی اور دقیتی وغیرہ تھے اور دربار محمودی کا درۃ التاج حکیم ابوریحان البیرونی تھا جس نے تحریر اقلیدس اور محبیطی کا ترجمہ سنسکرت زبان میں کیا۔

محمود نے ممتاز عہدوں پر علماء کرام کو مقرر کر رکھا تھا۔ چنانچہ فوج میں بھی علماء کو امتیازی حیثیت حاصل تھی اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے جد اعلیٰ شیخ عبد الرحمن صاحب گارزونی سلطان محمود کی فوج میں شرعی حاکم تھے۔ یہ عہدہ ”قاضی عسکر“ کے نام سے خلفاء آل عثمان کے زمانے میں بھی قائم رہا۔

شیخ عبد الرحمن صاحب گارزونی سلطان محمود کے لشکر کے ساتھ قاضی لشکر کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور جب محمود غزنوی نے سومنات کے مندر پر حملہ کیا تو یہ فوج کے ساتھ شریک تھے۔ پانی پت کی فتح کے بعد اس قصبہ میں مقیم ہوئے۔ اس کے بعد شاہی فرمان کے ذریعہ پانی پت کا علاقہ آپ کے سپرد ہوا۔ ان کا مزار پانی پت میں زیر قلعہ ہے۔ (۲)

حضرت مولانا رحمت اللہ کا سلسلہ نسب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے آپ کا شجرہ خاندانی نسلاً بعد نسل اس قدیم تاریخی قرطاس میں محفوظ تھا۔ جو حضرت کبیر الاولیاء مخدوم جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پانی پت میں موجود تھا۔ جس کی متعدد نقول بعض عثمانی النسب اہل پانی پت کے پاس تھیں۔ جناب عبد الرحمن صاحب مدنی مدینہ منورہ سے گارزون تشریف لائے اور جناب عبد الرحمن صاحب ثانی گارزون سے تشریف لا کر پانی پت میں مقیم ہوئے۔ حضرت کبیر الاولیاء مخدوم خواجہ محمد جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ آپ ہی کی اولاد میں ہیں۔ اسی لئے حضرت کو گارزونی کہا جاتا ہے۔ مولوی خلیل اللہ صاحب کے صاحبزادے مولوی عبد الجلیل صاحب۔ حکیم علی اکبر صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب ہوئے۔

تعلیم و تدریس و ملازمت و تصنیف

مولانا رحمت اللہ صاحب جمادی الاول ۱۸۱۸ م / ۱۲۳۳ھ کو کیرانہ ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے آپ کی ولادت سے قبل آپ کی والدہ نے یہ خواب دیکھا تھا کہ وزیر النسا ہمشیرا خورد مولوی صاحب یہ کہتی ہیں کہ بڑولی والی تیرے نام پر کیا چاند روشن نہیں ہوا۔ جس کی روشنی تمام عالم میں پھیلے گی۔ (۱)

آغاز طفولیت ہی میں آپ کی صلاحیت کا اظہار ہونے لگا تھا اور بارہ برس کی عمر میں آپ نے فارسی کی درسی کتابیں پڑھ لی تھیں بعدہ علم حاصل کرنے کے لئے اپنے خالہ زاد بھائی شیخ فرید الدین ساکن قصبہ بڑولی ضلع مظفرنگر اور مولوی احمد علی کیرانوی کے ہمراہ شہر اجمہال آباد گئے۔ مدرسہ مولوی حیات میں مقیم ہوئے اور مولانا حیات سے تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ ۱۸۳۵ء / ۱۲۵۰ھ میں آپ کے والد ماجد راجہ ہندو اور اوبہادر مرہٹہ (دہلی) کے ہاں پیشکاری پر ملازم ہوئے اور نزدیکی بیردن لاہوری گیٹ جنوب غرب متصل پہاڑی دھیرج میں مقیم ہوئے۔ جب مولانا کے والد ماجد دہلی میں اس جگہ پر آگئے تو مولانا رحمت اللہ صاحب انہیں کے ساتھ رہنے لگے۔ دن میں مدرسہ مولانا محمد حیات میں تعلیم پاتے اور رات کو اکبر نامہ راجہ موصوف کو سناتے تھے اور والد کا ہاتھ بٹا۔ نے کیلئے خطوط نویسی کی بھی ذمہ داری لے لی تھی۔ اسکو انتہائی خوبی و لیاقت کیساتھ انجام دینے جس پر راجہ صاحب نے انکی بھی تنخواہ مقرر کر دی۔ چند ماہ بعد راجہ صاحب نے مولانا کے والد کو موقوف کر دیا اور ان کی جگہ مولانا صاحب کو خطوط نویسی کیلئے رکھ لیا اور تین چار ماہ بعد ان کو بھی ملازمت سے سبکدوش کر دیا۔ لکھنؤ کی علمی شہرت آپ سن چکے تھے۔ ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد چند طلبہ کے ساتھ تحصیل علم کیلئے لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ وہاں مفتی سعد اللہ صاحب مراد آبادی سے مسلم الثبوت اور میرزا ہد پڑھی۔ اس کے بعد اپنے وطن کیرانہ چلے آئے اور حسب ذیل اساتذہ سے مختلف علوم کی تکمیل کی۔

مولانا احمد علی صاحب بڈولی ضلع مظفرنگر اور مولانا حافظ عبد الرحمن صاحب چشتی سے ابتدائی علوم عربی۔ مولانا امام بخش صاحب سے فارسی، مصنف لوکار نم سے ریاضی، حکیم فیض محمد صاحب سے طب، شاہ عبدالغنی صاحب سے دورہ حدیث پڑھا۔ ان اساتذہ کا اپنے دور میں اور علمی دنیا میں کیا درجہ تھا اور کس حیثیت و قابلیت کے لوگ تھے، اس کا اندازہ ان کے حالات زندگی سے ہو سکتا ہے۔

شاہ عبدالغنی صاحب سے آپ نے مدرسہ رحیمہ میں تعلیم پائی تھی، یہ مدرسہ اپنے زمانہ میں ایشیا کی بڑی دینی درسگاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد نے قائم کیا تھا۔ بقول مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب، یہ مدرسہ اس جگہ تھا جس مقام پر شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا مزار ہے۔ جس کو آج کل مہندیوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۱)

یہ صحیح نہیں ہے کہ یہ مدرسہ مہندیوں میں تھا بلکہ کلاں محل کے قریب تھا۔ چنانچہ وہاں کی ایک گلی کا نام مدرسہ شاہ عبدالعزیز ہے۔ اس مدرسہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب کی طرح حسب ذیل حضرات نے بھی تعلیم پائی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اس مدرسہ کی سرپرستی شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے تھے۔ اور درس و تدریس کی خدمات بھی آپ ہی انجام دیتے تھے۔

- | | |
|----------------------------------|---------------------------------------|
| (۱) مولانا شاہ رفیع الدین صاحب | (۲) مولانا شاہ عبدالقادر صاحب |
| (۳) مولانا شاہ عبدالغنی صاحب | (۴) مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب |
| (۵) مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب | (۶) مولانا شاہ عبدالحی صاحب |
| (۷) مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید | (۸) حضرت سید احمد شہید صاحب بریلوی |
| (۹) مولانا رشید الدین صاحب دہلوی | (۱۰) مولانا مفتی صدر الدین صاحب |
| (۱۱) مفتی الہی بخش صاحب | (۱۲) حضرت شاہ غلام علی صاحب |
| (۱۳) مولانا مخصوص اللہ صاحب | (۱۴) مولانا کریم اللہ صاحب |
| (۱۵) مولانا میر محبوب علی صاحب | (۱۶) مولانا عبدالحق صاحب |
| (۱۷) مولانا حسن علی صاحب لکھنوی | (۱۸) مولانا حسین احمد صاحب یلیج آبادی |
| (۱۹) مولانا رحیم بخش صاحب | (۲۰) مولانا فضل حق خیر آبادی |

- (۲۱) مولانا مملوک علی صاحب
(۲۲) مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی
(۲۳) مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی
(۲۴) مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی
(۲۵) مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی
(۲۶) مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی
(۲۷) حافظ رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ،
ان حضرات نے دورہ حدیث شاہ عبدالغنی صاحب سے پڑھا ہے اور شاہ عبدالغنی صاحب
اسی میں پڑھاتے تھے۔ (۱)

۱۲۵۶ھ / ۱۸۱۴ء میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اپنی خالہ کی لڑکی سے شادی
کی۔ ۱۲۴۷ھ میں پھر مہاراجہ ہندوراؤ نے آپ کو اور آپ کے والد صاحب کو اپنے دہلی باڑہ
ہندوراؤ میں بلا لیا اور مولانا کو اپنا میزبانی مقرر کیا اور ان کے والد ماجد کے ذمہ جائداد کی نگرانی
اور دیکھ بھال کا کام سپرد ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ان کے والد مولوی خلیل اللہ صاحب فوت ہوئے
اور بعض خانگی مجبوریوں کی وجہ سے مولانا رحمت اللہ صاحب نے مہاراجہ ہندوراؤ کے
یہاں اپنی جگہ پر اپنے چھوٹے بھائی محمد جلیل صاحب کو ملازم رکھ کر علیحدہ کی اختیار کر لی اور
کیرانہ پہنچ کر درس و تدریس کا کام شروع کر دیا۔ مولانا کا یہ معلمی کا زمانہ بہت محدود ہے۔
زمانے کے ناسازگار حالات اور خاص طور پر ہندوستان میں نصاریٰ کے بڑھتے ہوئے اثر و
اقتدار کو روکنے کی فکر نے آپ کو اس کا موقع نہیں دیا کہ اطمینان کے ساتھ تعلیم و تدریس کا
فیض عام جاری رکھتے۔ تکمیل تعلیم اور اکبر آباد کے یادگار زمانہ مناظرہ کے درمیانی عرصہ میں
چند سال تک دربار کیرانہ کی مسجد میں مولانا نے ایک دینی مدرسہ قائم کیا تھا، اس مدرسہ کے
فیضیاب طلبہ میں سے بعض اصحاب نے مکہ معظمہ میں بھی پہنچ کر حضرت مولانا سے شرف
تلمذ حاصل کیا اور اسباق میں شرکت کی جن میں سے چند قابل ذکر اسماء یہ ہیں:-

(۱) مولانا عبدالسمیع صاحب رامپوری مصنف حمد باری

(۲) مولانا احمد الدین صاحب چکوالی

(۳) مولانا نور احمد صاحب امرتسری

(۴) مولانا شاہ ابوالخیر صاحب

(۵) علامہ مولانا شرف الحق صاحب صدیقی

- (۶) مولوی قاری شہاب الدین صاحب عثمانی کیرانوی
 (۷) مولانا حافظ الدین صاحب دجالوی
 (۸) مولانا عبد الوہاب صاحب دہلوی بانی مدرسہ باقیات الصالحات۔ مدراس
 (۹) مولانا امام علی صاحب عثمانی
 (۱۰) مولانا بدرالاسلام صاحب عثمانی کیرانوی مہتمم حمیدیہ کتب خانہ شاہی قسطنطنیہ

تصنیف و تالیف

انگریز ہندوستان میں جہاں اور جس جگہ اپنے قدم جماتا وہ امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس کی نصرانیت کی تبلیغی جماعتوں کے ٹڈی دل مشنریوں اور پادریوں کو شہروں کے گلی کوچوں، بازاروں، جنگلوں اور پہاڑوں میں اسلام اور بانی اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر رکیک الزامات لگانے کے لئے بھیجتا تھا وہ قرآن مجید کی توہین و تضحیک کرتے اور ازواج مطہرات پر شرمناک الزام لگاتے اور اسی قسم کی کتابیں بھی شائع کرتے تھے اور ہندوستانیوں کو مرعوب کر کے ان کو معاشی پریشانیوں میں مبتلا کر کے عیسائی مذہب میں داخل کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی خطرناک حرکتوں کا جواب دینے کے لئے علماء نے قلم بھی اٹھایا اور قدم بھی، زبان بھی کھولی اور ردِ نصاریٰ میں مستغرق ہوئے اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ عیسائیوں کی اسلام کے خلاف کتابوں کے جواب میں کتابیں طبع کرانے لگے۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے ردِ نصاریٰ میں کتابیں لکھنے کی حسب ذیل وجوہات تحریر فرمائی ہیں:-

”جب انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کر لی اور مکمل انتظام کر لیا تو اس ۳۳ سال کے عرصہ میں ان کے علماء پادریوں، کی طرف سے کوئی تبلیغی دعوت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے رسائے کتابیں اسلام کی تردید میں لکھنے شروع کئے اور ان کو ہندوستان کے مختلف شہروں اور عوام الناس میں تقسیم کرنا شروع کر دیا اور بازاروں اور لوگوں کو مجموعوں میں اور عام گزرگاہوں پر وعظ کہنے لگے۔ مسلم عوام ایک مدت تک ان کی باتیں اور مواعظ سننے سے پرہیز کرتے رہے اور ان کی کتابوں اور ان کے رسالوں کے دیکھنے سے متنفر رہے۔ اس لئے ہندوستانی علماء نے ان

رسالوں کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن کچھ مدت کے بعد بعض عوام الناس اور جہلان کی باتوں پر راغب ہوئے اس وقت خوف پیدا ہوا کہ بے علم مسلمان ان کے پھندوں میں نہ پھنس جائیں۔ اس لئے علماء اسلام نے ان کی تردید شروع کی، میں اگرچہ گمنامی کے گوشہ میں تھا اور علماء کے زمرہ میں شمار نہ تھا۔ لیکن جب میں نے ان کی تقریروں اور تحریروں کو دیکھا اور بہت سے مطبوعہ رسالے میرے پاس پہنچے تو میں نے چاہا کہ اپنی حیثیت و قابلیت کے مطابق ان کی تردید کرنے کی کوشش کروں لہذا میں نے چند کتابیں اور چند رسالے حقیقت حال کے اظہار کے لئے لکھے۔

مولانا رحمۃ اللہ صاحب نے ان ہی حالات کے پیش نظر اپنے استاد شاہ عبدالغنی سکنہ خانقاہ غلام علی شاہ کی فرمائش پر ازالۃ الاوہام کی ترتیب شروع کر دی۔ ابھی یہ کتاب مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آپ تپ و لرزہ کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ مسہلات دینے کے باوجود مرض میں افاقہ نہیں ہوا۔ اکثر طبیبوں کی رائے سے دق کا مرض تجویز ہوا۔ چونکہ حکیم علی اکبر صاحب کا علاج ان طبیبوں کی رائے کے برخلاف تھا اور اس بیماری سے تمام خاندان میں تشویش پیدا ہو گئی تھی اس لئے ان کی والدہ سے عم کلاں اور ہر دو عم خورد اور دیگر اعزائے کہا۔ مولانا کی ذات فخر خاندان ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کا علاج کوئی اور طبیب کرے، لیکن والدہ نے ان لوگوں کی رائے سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کے بھائی کے علاج کو ہی قابل اعتبار سمجھا۔ مولانا صاحب بیماری سے اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ بیٹھنے سے معذور ہو گئے تھے اور چارپائی پر لیٹے ہوئے نماز ادا کرتے تھے۔ نماز ہی میں آپ بے ہوش ہو گئے تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آئے تو رورہے تھے۔ ان کے بھائی حکیم علی اکبر صاحب نے یہ سمجھا کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے ہیں اس لئے رورہے ہیں، اس پر مولوی صاحب نے اپنے بھائی سے کہا، خدا کی قسم اگرچہ صحت کی کوئی علامت نہیں ہے لیکن انشاء اللہ میں تندرست ہو جاؤں گا۔ میرے رونے کی وجہ زندگی سے مایوسی نہیں بلکہ یہ ہے کہ میں نے اس وقت خواب میں دیکھا ہے کہ آل حضرت ﷺ معہ شیخین رضی اللہ عنہما تشریف لائے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ رئیس المجاہدین یا رئیس المعالجین اور حضرت صدیق ﷺ نے فرمایا ”برجی لکسیا فتی رسول اللہ ﷺ قال کذا کذا“ یعنی اے جوان خوشخبری ہو کہ تیرے حق

میں رسول اللہ ﷺ نے ایسا کہا۔ اگرچہ تالیف ”ازالتہ الاوہام“ مرض کا باعث بنی لیکن یقین ہے کہ یہی شفا کا باعث بنے گی۔ چنانچہ اس خواب کے بعد آپ رو بہ صحت ہو گئے اور ازالتہ الاوہام کے جو اوراق منتشر ہو گئے تھے سات ماہ کے عرصہ میں آپ نے ان کو درست کیا (۱) ”ازالتہ الاوہام“ کی طبع ہونے سے قبل ہی دہلی میں کافی شہرت ہو گئی تھی اور اس کی تردید کرنے اور جواب لکھنے کی ماسٹر رام چندر جیسے لوگ تیاریاں کرنے لگے تھے۔ اس پر مولانا نے یہ طے کیا کہ اس کتاب کا مسودہ کسی لائق و فاضل عالم کو دکھالیا جائے تاکہ اس میں جو قسم ہوں وہ دہر ہو جائیں۔ نظر انتخاب حضرت مولانا نور الحسن صاحب بن انوار الحسن صاحب بن مفتی الہی بخش صاحب کاندھلوی پر پڑی۔ چنانچہ آپ نے اس کتاب کے جتنے مسودہ پر نظر ثاؤا کر لی تھی اتنا ہی حصہ مع ایک خط کے مولانا نور الحسن صاحب کو روانہ کر دیا تھا یہ خط فارسی میں تھا (۲)

ازالتہ الاوہام ۵۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یکم رمضان ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء میں سید المطالع، دار السلطنت، شاہجہاں آباد (دہلی) کوچہ بلانی بیگم میں سید قوام الدین کے اہتمام سے طبع ہوئی۔ اس کے حاشیہ پر کتاب استفسار مصنفہ مولانا آل حسن موہانی چھپی ہے۔ (۳)

مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے۔

”یہ کتاب میں نے پہلے اردو میں لکھی تھی لیکن اہل اسلام کے اہل علم فارسی زبان سے زیادہ رغبت رکھتے تھے۔ اس لئے مجھ پر ان کے اصرار پر اس کو فارسی زبان میں تبدیل کیا۔“

اس کتاب میں پادری فنڈر کے ”میزان الحق“ کے اعتراضات کے دندان شکن جوابات ہیں اور رد تصاری کے اکثر مباحث کا مسکت جواب بھی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں مولانا محمد علی مونگیری تحریر فرماتے ہیں۔

”باوجودیکہ اس کو چھپے ہوئے سینتیس برس ہو چکے مگر کسی نے ایک بحث کا بھی پورے طور پر جواب نہیں دیا۔“

(۱) تذکرۃ الاولیاء ہند جلد دوم ص ۳۲۱۔

(۲) حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کا یہ خط ”حالات مشائخ کاندھلہ“ نامی کتاب میں ص ۱۵۳ پر ملاحظہ کیا جاسکتا

ہے۔ (محمد عمران قاسمی) (۳) پیغام محمدی ص ۳۰۱

تاریخی مناظرہ

ہندوستان میں پادریوں کی ایک طرفہ کوشش اور بے پناہ تبلیغی جدوجہد اور خاص طور پر علماء کرام اور اہل علم کی خاموشی سے مشنریوں کے کام کا تقریباً ہر ہندوستانی پر اور خاص طور پر جہلاء کے طبقہ پر کافی اثر ہونے لگا تھا۔ پادری علماء کی خاموشی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے اور عوام میں پروپیگنڈہ کرتے پھرتے تھے کہ ہمارے مذہب کی حقانیت کا رعب اور اثر اتنا ہے کہ ہندوستانی عالم ہمارے اعتراضوں کا جواب اور اپنے مذہب کی صداقت ثابت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مولوی محمد سعید صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ لکھتے ہیں:-

”یہ وہ وقت تھا جبکہ ہندوستان میں اسلامی شان و شوکت و سلطنت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور شاہان مغلیہ کی آخری یادگار بہادر شاہ مرحوم زوال سلطنت کا پر حسرت منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جمنا کے پرسکون بہاؤ میں انقلاب زمانہ کی نیرنگیوں کو بہتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ مگر اغیار کی ان ریشہ دوانیوں کی کوئی تدبیر ان کے پاس نہ تھی اور انگریزی رسوخ و اقتدار کا سیلاب قلعہ کی سنگین دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ جس کی پر آشوب آواز سے بادشاہ مرحوم خوفزدہ تھے۔ اس پر آشوب زمانہ میں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر عصر و مغرب کے درمیان ایک مسیحی فاضل پادری فنڈر عوام الناس کے سامنے عیسائی مذہب کی خوبیوں اور بزرگم خود اسلامی کمزوریوں پر تقریر کیا کرتا تھا۔ پادری فنڈر خود تنہا نہ تھا بلکہ انگلینڈ سے اس کے ساتھ مسیحی مشنری اور پادریوں کی ایک بڑی جماعت تھی جو اس امر کا بیڑا اٹھا کر ہندوستان آئی تھی کہ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت ہندوستان میں اس طرح کرے کہ اسلامی سلطنت کے زوال اور مغلوبی کے ساتھ اسلام بھی مغلوب ہو۔ اور عیسائیوں کے غلبے اور اقتدار کے ہمدوش عیسائی مذہب بھی ہندوستان کی نرم و اثر پذیر زمین میں جڑیں چھوڑ دے۔ گو اسلامی حکومت کا چرغ ٹمٹما رہا تھا مگر اس

سیاسی اضمحلال کے باوجود زوال رسیدہ دہلی باکمال مشاہیر اور اہل علم اور اہل فن سے خالی نہ تھی، لیکن اس دور کے علماء کو اگرچہ اپنے دینی و مذہبی علوم میں کامل دستگاہ و تبحر تھا مگر دوسرے مذاہب کی مذہبی کتابوں پر نہ ان کی نظر تھی اور نہ ان کو اس کی چنداں ضرورت۔ معلوم نہیں کن وجوہ سے اس مسیحی فاضل کی طرف علماء نے توجہ نہیں کی اور علماء اسلام کے اس سکوت نے پادری فنڈر کے حوصلے اس قدر بڑھائے کہ اس نے جسارت و دلیری کیسا تھ صداقت و حقانیت اسلام پر زبردست حملے اور اعتراض شروع کر دیئے اور بباغ دہلی علماء اسلام کو مناظرہ کی دعوت دی۔ (ندائے عام ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۵ء)

انہی ایام میں مولانا رحمت اللہ صاحب دہلی میں ”ازالتہ الاوہام“ کی طباعت کے لئے پہنچے۔ اس وقت آپ کی ڈاکٹر وزیر خاں سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر خاں نے آپ کو اگرہ مدعو کیا۔ آپ اگرہ پہنچے اور سرائے جھلی میں مقیم ہوئے، اگرہ میں پادری فنڈر بھی رہتے تھے۔ انہوں نے شہر والوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ علی الاعلان کہتے پھرتے تھے کہ کوئی ہماری میزان الحق کا جواب دے اور ہم نے جو اسلام پر اعتراضات کئے ہیں اس کا رد کرے۔

جب مولانا صاحب کی آمد کی اطلاع ہوئی تو شہر کے اکثر وکلاء اور رئیس آپ سے ملاقات کرنے کے لئے آئے۔ انہوں نے آپ سے التجا کی کہ آپ پادریوں سے مقابلہ کریں۔ مولانا صاحب کی بھی پرانی خواہش تھی لیکن اجنبی شہر ہونے کی وجہ سے مولانا صاحب نے غریب الوطنی کا اظہار کیا۔ جس پر ان لوگوں نے آپ سے مکمل تعاون کرنے کا وعدہ کیا، اور ڈاکٹر وزیر خاں نے بھی مناظرہ کی آمادگی کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر وزیر خاں انگریزی زبان سے بہت اچھی واقفیت رکھتے تھے اور جب یہ ڈاکٹری کی ڈگری انگلینڈ لینے گئے تھے اس وقت وہاں سے نصرانیوں کی کتابیں لائے تھے۔ ان کو نصاریٰ کے انگریزی لٹریچر سے کافی واقفیت تھی۔ چنانچہ آپ نے مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مناظرہ کی تیاری شروع کر دی اور فیصلہ کیا کہ عیسائیوں سے مناظرہ کیا جائے۔

چھوٹا مناظرہ اکبر آباد

مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں نے دو مناظرے ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء میں

کئے۔ پہلا مناظرہ جس کو مولانا رحمت اللہ صاحب نے چھوٹا مناظرہ لکھا ہے وہ ربیع الآخر ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۴ء میں پادری فرینچ کے بنگلہ میں پادری فرینچ اور پادری کئی سے مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر محمد وزیر خاں صاحب کا ہوا۔ اس چھوٹے مناظرہ کے بارے میں ”پہلا مباحثہ مذہبی کے، ۲۹ صفحہ کے حاشیہ پر یہ عبارت تحریر ہے۔

”جاننا چاہئے کہ گفتگوئے سابق سے وہ گفتگو مراد ہے جو پادری فرینچ صاحب کے بنگلہ پر پادری صاحب موصوف اور پادری کئی اور مولوی رحمت اللہ صاحب کے ساتھ میرے اور جناب محمد وزیر خاں صاحب کے سامنے ہوئی تھی اور میں نے اس گفتگو کا ایک جد رسالہ چھپوایا ہے۔“ اس چھوٹے مناظرہ کا مطبوعہ رسالہ ناپید ہو گیا ہے جو کہیں بھی نظر نہیں آتا اور اگر مناظرہ کا ذکر مذکورہ کتاب کے حاشیہ پر نہ ہوتا اور مولانا رحمت اللہ صاحب ازالتہ الشکوہ جلد دوم میں اس مناظرہ کی کارروائی نہ چھاپتے تو اس کا نام بھی باقی نہ رہتا۔ (۱)

بڑا مناظرہ اکبر آباد

اس زبانی مناظرہ میں پادریوں کو شکست تو ہو گئی تھی اور انہوں نے اپنے طریقوں اور جوابوں سے شکست تسلیم بھی کر لی تھی۔ لیکن یہ بات گھرتک رہی۔ عوام میں نہیں پھیلی۔ عوام میں کیسے پھیلے اور وہ کیسے یقین کریں کہ پادری لوگ مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر محمد وزیر خاں کی بحث سے زچ ہو گئے تھے۔ اس لئے مولانا رحمت اللہ صاحب نے کوشش کی کہ آئندہ مناظرہ منظر عام پر پبلک میں ہو۔ تاکہ دنیا دیکھے اور سنے۔ چنانچہ مولانا صاحب ایسے مناظرہ پر آمادہ و تیار کرانے کے لئے مولوی امیر اللہ صاحب کے ہمراہ جو پادری فنڈر کے اچھے شناسائی تھے۔ پادری فنڈر کے مکان پر گئے۔ جب وہ مکان میں نہیں ملا تو آپ نے اس سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری کیا۔ جو پندرہ روز تک ۲۳ مارچ سے ۸ اپریل ۱۸۵۴ء تک جاری رہا۔ اس خط و کتابت میں ہر دو فریق کے دو اشخاص یعنی عیسائیوں کی طرف سے پادری فنڈر، پادری فرینچ، اور مسلمانوں کی جانب سے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں کے نام مناظرہ کے لئے منظور ہوئے۔ ۱۰، ۱۱، ۱۲ اپریل ۱۸۵۴ء ۱۲۷۰ھ کی تاریخ اور وقت علی الصباح طے ہوا۔ مناظرہ کے عنوانات نسخ و تحریف، الوہیت

(۱) اس مناظرہ کی کارروائی تفصیل کے ساتھ مولانا رحمت اللہ صاحب کی کتاب ”ازالتہ الشکوہ“ جلد دوم میں درج ہے

مسیح، تثلیث، رسالت محمدی ﷺ اور حقیقت قرآن مجید مقرر ہوئے۔ اجلاس کے چیرمین کی تجویز پادری فنڈر نے رکھی جس پر مولانا رحمت اللہ صاحب نے یہ اعتراض فرمایا کہ اگر عیسائی چیرمین ہو گا تو مسلمان شک کریں گے۔ اگر مسلمان چیرمین مقرر ہو تو عیسائیوں کو شبہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اس لئے چیرمین مقرر نہ ہو تو بہتر ہے اس اعتراض کو پادری فنڈر نے تسلیم کیا۔ یہ خط و کتابت جاری تھی کہ مشنریوں میں اس مناظرہ کے ہونے سے کھلبلی مچ گئی تھی۔ مناظرہ کے اسباب کیا تھے اور مناظرہ سے قبل عیسائیوں کو اپنی کتاب میزان الحق پر کیسا گھمنڈ تھا اور اس وقت کے مسلمانوں کے خیالات کی پستی اور عیسائیوں سے مرعوبیت کی کیا حالت تھی۔ اس کا نقشہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے ازالۃ الشکوک میں کھینچا ہے:-

”اب ان وجوہات کا بیان کرتا ہوں کہ جن کے سبب یہ مباحثہ واقع ہوا۔ اول۔ یہ کہ روز بروز شور و غل پادریوں کا بڑھتا چلا جاتا تھا اور زبانی فریاد کرتے تھے کہ مسلمانوں سے ہمارا جواب نہیں بن پڑتا اور اپنے رسالوں کے آخر میں ایسی ایسی باتیں بھی چھاپنے لگے تھے۔ اس پر میں نے چاہا کہ اپنے مقدور کے موافق میں بھی ہاتھ ہلاؤں۔ شاید اللہ کچھ ثمرہ نیک دیوے۔“

”دوئم۔ یہ کہ جس عیسائی سے ملاقات ہوئی اور اس سے کچھ تذکرہ آیا اس کی تقریر سے یہی معلوم ہوا کہ میزان ان کے گمان میں ایسی ہے کہ گویا الہام سے لکھی گئی ہے اور مسلمان اس کے جواب سے عاجز ہیں اور اگر ان کو کہا جاتا کہ یہ بات غلط ہے۔ میزان الحق کا کیا ذکر اسکے مصنف سے بھی مسلمانوں کو کچھ خوف نہیں سو وہ کہتے تھے، کہ جب تم کو اس سے پالا پڑے تب تم جانو۔“

”سوئم۔ یہ کہ جب میں ایک تقریب سے اکبر آباد کا اول عازم ہوا تو چلتے وقت ماسٹر رام چندر صاحب نے (کہ مجھ سے محبت رکھتے تھے اور کچھ عرصہ سے عیسائیت کا دم بھر کے پادریوں سے بھی زائد تعصب میں قدم بڑھا بڑھا کر رکھتے تھے۔ اور میزان الحق کے بڑے معتقد تھے)۔ کہا اگر اتفاق ہو تو آپ پادری فنڈر صاحب سے ملے گا۔ سوان کی تقریر سے بھی وہی بات سمجھی گئی۔ شاید انہیں یہ بھی گمان ہو کہ پادری صاحب سے کچھ اس کو بھی ہدایت ہو جائے گی۔“

”چہارم۔ یہ کہ جب میں اکبر آباد پہنچا تو بعض کو مذہب پایا۔ اگر ان کو سمجھایا گیا تو انہوں نے یہی کہا۔ اگر تمہارے پاس ہوتے ہیں تو تم ہم کو قائل معقول کر دیتے ہو۔ اور اگر کسی اچھے پادری کے پاس جاتے ہیں تو وہ بھی ہم کو لا جواب کر دیتا ہے تو اب ہم کس طرح سمجھیں کہ تم ہی حق پر ہو اور وہ باطل پر یا بالعکس۔ بلکہ ہم تو حیرت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہاں اگر مقابلہ منہ درمنہ ہو جائے تو ہماری یہ حیرانی کچھ رفع ہو جائے۔“ (۱)

اس مناظرہ سے قبل جو زبانی چھوٹا مناظرہ ہوا تھا۔ اس سے مولانا رحمت اللہ صاحب اور ڈاکٹر وزیر خاں صاحب کی عیسائیوں میں دھاک بیٹھ گئی تھی اور اس سے یہ لوگ بہت متاثر و خوف زدہ ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے تقریری مناظرہ کی تیاری بڑے زور شور سے کی اور اس کو کامیاب کرنے کے لئے تمام ذرائع استعمال کئے۔ جس کا ذکر مولانا رحمت اللہ صاحب نے ازالۃ الشکوک کے متن اور حاشیہ پر کیا ہے۔

متن کی عبارت یہ ہے۔

”اول خط کی تحریر کے دن سے مباحثہ کے جلسہ اول کے دن تک ۱۸ دن کی مدت گزر گئی اور جو وہ مسئلے جن میں بحث ہونے والی تھی پہلے ہی دن پادری صاحب کو معلوم ہو گئے تھے۔ اور پہلے مباحثہ چھوٹے کا نسخہ چھپا ہوا بھی پادری صاحب کی نظر سے گزر گیا تھا اور اس سے اور اسی طرح اپنے شریک سے ان کو نسخ اور تحریف کے مقدمہ میں ہماری اکثر باتیں معلوم بھی ہو گئی تھیں۔ سو انہوں نے اٹھارہ دن کی مدت میں اکبر آباد کے سب پادریوں اور اہل علم اپنے ہم مذہب کے اتفاق سے اپنے نزدیک خوب ہی اس امر کو ملحوظ کر لیا تھا اور جو جوڑ توڑ کرنا تھا۔ سو سب کر رکھا تھا۔“ (۲)

حاشیہ پر مولانا رحمت اللہ صاحب نے پادری فنڈر کے ایک ملازم کی گفتگو جو پادری صاحب اور ان کے ساتھی مناظرہ کی تیاری کے سلسلہ میں کر رہے تھے دہرائی۔ ”ایک مسلمان پادری صاحب کا نوکر تھا۔ وہ ہر روز مجھ سے آکر اطلاع دیتا تھا۔ رات دن پادری صاحب کی کوٹھی پر پادریوں کا مجمع رہتا ہے اور یہ صورت رہتی ہے کہ اگر ایک گیا، دوسرا آیا اور

کتابوں کو بہت دیکھتے ہیں اور آپس میں گفتگو ہوتی رہتی تھی، لیکن جو انگریزی میں ہوتی ہے سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر اس بات سے کہ اکثر اس میں لفظ محمدیوں کا، یا محمد ﷺ یا تمہارا نام سنتے ہیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً اسی بات کا چرچا ہے اور کہتا تھا کہ پادری صاحب کی میم بھی اکثر مجھ سے پوچھا کرتی ہے کہ تم کو معلوم ہے کہ یہ مولوی کہاں سے آیا ہے کہ پادری صاحب کو بڑا فکر ہے اور بڑی محنت میں پڑ گئے ہیں اور رات دن یہی مشورہ اور کونسل ہے اور اسی نیت سے انہوں نے حکام کو اس مجلس میں شریک کیا تھا کہ ان کا رعب رہے۔“

پہلے روز کے مناظرہ کی کارروائی

علی الصباح پیر کے روز ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء مطابق ۱۱ رجب ۱۲۷۰ھ کو مناظرہ کا پہلا اجلاس شروع ہوا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھی ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور پادری کے ساتھی فرینچ صاحب تھے۔ دوران جلسہ مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیانی کرپشن سکریٹری صدر بورڈ، مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر لیدی، پادری ولیم گلبن صاحب، مفتی حافظ ریاض الدین صاحب، مولوی محمد عبدالشہید کولوی، مولوی فیض احمد صاحب سررشتہ دار، صدر بورڈ جناب مولوی حضور احمد، مولوی امیر اللہ صاحب مختار راجہ صاحب بنارس، جناب سید حافظ فضل حسین صاحب، مولوی قمر الاسلام امام جامع مسجد اکبر آباد۔ حافظ ولی حسن صاحب، محمد امجد علی وکیل سرکار، جناب منشی خادم علی مہتمم مطبع الاخبار، سراج الحق صاحب، محمد جعفر قادری صاحب تشریف فرما ہوئے۔

پہلے پادری فنڈر اٹھا، اس نے کہا کہ یہ جاننا ضروری ہے کہ مناظرہ کیونکر منعقد ہوا۔ یہ مولانا رحمت اللہ صاحب کی سعی و کوشش اور خواہش کا نتیجہ ہے۔ میرے نزدیک اس سے فائدہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ اگرچہ میری تمنا یہی ہے کہ دین عیسوی کی حقیقت اہل اسلام کے سامنے رکھوں۔ مباحثہ کے عنوان نسخ، تحریف، الوہیت حیات مسیح و تثلیث اور رسالت محمد ﷺ طے ہوئے ہیں۔ اس تشریح کے بعد پادری فنڈر بیٹھ گئے۔

بحث نسخ

مولانا رحمت اللہ صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے میزان الحق کی فصل دوم باب

اول کی عبارت جو صفحہ ۱۲ میں ہے پڑھی۔ قرآن اور اس کے مفسر دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح زبور کے آنے سے توریت اور انجیل کے نازل ہونے سے زبور منسوخ ہوئی۔ اسی طرح انجیل بھی قرآن کے نازل ہونے سے منسوخ ہو گئی۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے مزید فرمایا کہ قرآن مجید اور مفسرین سے جو یہ دعویٰ منسوب کیا گیا ہے غلط ہے۔ قرآن مجید میں اور نہ تفسیروں میں ایسا کوئی ذکر ہے۔ بلکہ اس کے برعکس سورہ بقرہ کی آیت ۸۱ ”و لقد اتینا موسیٰ الكتاب“ الایہ کی تفسیر کے نیچے فتح العزیز میں اس طرح مرقوم ہے:-

”اور حضرت موسیٰ کے بعد یکے بعد دیگرے ہم نے اور رسولوں کو بھیجا جو حضرت یوشع، حضرت الیاس، حضرت یسع، حضرت شموئیل، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت شعیا، حضرت ارمیا، حضرت یونس، حضرت عزیر، حضرت حزقیئیل، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ وغیرہ چار ہزار آدمی تھے اور یہ سب موسیٰ کی شریعت پر گزرے ہیں اور ان کے بھیجنے کا مقصد موسیٰ کی شریعت کے احکام جاری کرنا تھا۔ جس میں بنی اسرائیل کی سستی اور کاہلی کی وجہ سے مندرس اور علماء بد تحریفوں کی وجہ سے متغیر ہو چلے تھے۔“

سورۃ نساء کی آیت ۱۲۱ ”و اتینا داؤد زبوراً“ کی شرح تفسیر حسینی میں اس طرح کی گئی ہے!

”ہم نے داؤد کو کتاب دی جس کا نام زبور تھا۔ وہ کتاب جو جناب الہی کی حمد و ثناء پر مشتمل اور امر و نواہی سے خالی تھی بلکہ داؤد کی شریعت وہی توریت کی شریعت تھی۔“ انتہی

اسی طرح مسلمانوں کی دوسری کتابوں میں بصراحت لکھا ہے۔ پادری فنڈر نے کہا تم انجیل کو منسوخ سمجھتے ہو یا نہیں۔ مولانا صاحب نے فرمایا بلاشبہ ہم انجیل کو ان معنوں سے جن کا اظہار کیا جاوے گا منسوخ جانتے ہیں، مگر آپ کا یہ دعویٰ دونوں جگہ غلط ہے۔ پادری نے کہا۔ میں نے یہ بات مسلمانوں سے سنی ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔ یہ انصاف کے خلاف ہے کہ کسی مسلمان کی سنی ہوئی بات قرآن مجید اور مفسرین کے ذمہ ڈال دیں۔ پادری صاحب نے کہا خیر! اس کے بعد مولانا صاحب نے کہا۔ نسخ کے وہ معنی جو اسلامی اصطلاح میں رائج ہیں اور اس کے محل کو (یعنی اس بات کو کہ وہ نسخ کہاں کہاں واقع ہوتا ہے) آپ

نے اسلامی کتاب دیکھی ہے یا نہیں۔ پادری نے کہا۔ آپ فرمائیے۔ مولانا صاحب نے کہا۔ میرے نزدیک نسخ صرف اوامر و نواہی کے لئے ہے۔ چنانچہ تفسیر معالم التنزیل میں ہے۔ ”النسخ انما يعترض على الامر والنواهي دون الاخبار“ جس کا حاصل یہ ہے وہ نسخ قصص و اخبار میں نہیں ہوتا بلکہ صرف اوامر اور نواہی میں آیا کرتا ہے سو ہم لوگ خبروں اور قصوں میں ہرگز نسخ کے قائل نہیں ہیں اور نہ امور عقلیہ قطعہ میں (جیسا یہ کہ خدا موجود ہے۔) نسخ جائز جانتے ہیں۔

مولانا صاحب نے عالمانہ و فاضلانہ طریقہ سے نسخ کی تشریح تمثیلات کے ساتھ پیش کی پادری غور سے سنتا رہا۔ آپ نے اچھی طرح ذہن نشین کرادیا۔ تو پادری صاحب نے کہا۔ آپ کے نزدیک تمام انجیل منسوخ ہے۔ مولانا نے فرمایا ذیل کے حکم کی موجودگی میں تمام انجیل کو منسوخ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ مرقس کے باب ۱۲ کے درس ۳۰، ۳۱ یہ ہے ”اور تو خداوند کو جو تیرا خدا ہے اپنے سارے دل سے اور اپنی ساری جان سے اور اپنی ساری عقل سے، اور اپنے سارے زور سے پیار کر، اول حکم یہی ہے اور دوسرا جو اس کی مانند ہے یہ ہے کہ تو اپنے پڑوسی کو اپنے برابر پیار کر ان سے بڑا اور کوئی حکم نہیں ہے۔“ پادری صاحب بولے کہ انجیل ہرگز منسوخ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ لوقا کے اکتیسویں باب کی آیت ۳۳ میں مسیح کا یہ قول ہے کہ آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن میری باتیں نہ ٹلیں گی۔ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے فرمایا۔ یہ حکم عام نہیں ہے بلکہ پیشگوئی کے بارے میں ہے جس کا ذکر سابقہ آیت میں جناب مسیح نے فرمایا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر بالفرض آسمان و زمین ضائع ہو جائیں پر میری باتیں اس پیشگوئی کی بابت ہرگز زائل نہ ہوں گی۔ پادری صاحب نے فرمایا۔ نہیں عام ہے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے ڈوالی اور رچرڈینٹ کی تفسیر کی وہ عبارت جو متی کے باب ۲۴ کے درس ۳۵ کی شرح کے ذیل میں لکھی ہے۔ ”دکھلائی کیونکہ درس مذکور لوقا کے باب ۲۱ کے درس ۳۳ کے مطابق ہے۔ اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے:-

”بشپ پیرس کہتا ہے کہ اس کی مراد یہ ہے کہ میری یہ پیشگوئیاں یقیناً پوری ہوں گی اور ڈیون اسٹائن ہو پ یہ کہتا ہے کہ اگرچہ آسمان اور زمین اور سب چیزوں کی نسبت تبدیل کے قائل نہیں ہیں تو یہ ایسی استوار نہیں ہیں۔ جیسی میری پیشگوئیاں، ان چیزوں کی بابت استوار ہیں وہ سب مٹ جائیں

گی، پر میری باتیں ان پیشین گوئیوں کی بابت ہرگز نہ بدلیں گی اور جوابات کہ اب میں نے بیان کی ہے اس کا ایک شوشہ مطلب سے تجاوز نہ ہوگا۔

پادری صاحب نے کہا کہ ان مفسرین کی تحریریں میرے دعوے کے خلاف نہیں ہیں کیونکہ مفسر یہ نہیں کہتے کہ یہ پیشین گوئیاں زائل نہیں ہوں گی اور باقی سب زائل ہو جائے گا ڈاکٹر وزیر خاں نے جواب دیا کہ یہاں اس بات کا لکھنا درس سے کیا علاقہ رکھتا تھا جو مفسر اس کی تصریح کرتا، پادری صاحب یہی کہتے رہے کہ یہ عام ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ہم اپنے دعوے کیساتھ گواہ پیش کر رہے ہیں اور آپ بغیر گواہ کے مدعی ہیں۔ پادری صاحب نے اس کا بھی جواب نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ پطرس کے پہلے خط کی فصل ۲۳ میں لکھا ہے:-
”تم نہ تخم فانی سے بلکہ اس سے جو غیر فانی ہے یعنی خدا کے کلام سے جو ہمیشہ زندہ اور باقی ہے سر نو پیدا ہوئے۔“

اس آیت کے مطابق خدا کا کلام دائمی ہے، منسوخ نہیں ہوتا۔ مولانا نے فرمایا ایسا ہی کچھ اشعیا کے باب ۴۰ کے درس ۸ میں بھی ہے اور آپ نے اس کو بھی میزان الحق میں جناب پطرس کی عبارت کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے۔

”گھاس پڑ مردہ اور پھول افسردہ ہو سکتا ہے، لیکن ہمارے خدا کا کلام ابد تک قائم ہے۔“

اس آیت کے بعد آپ پر لازم ہو جاتا ہے کہ کسی بھی امر و نہی کو منسوخ نہ سمجھیں۔ حالانکہ توریت کے سیکڑوں حکم عیسائی مذہب میں منسوخ ہو گئے ہیں۔ پادری نے کہا توریت تو منسوخ ہے لیکن ہم توریت کے بارے میں اس وقت بحث نہیں کر رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ متی کے پانچویں باب اٹھارویں درس میں اس قول کے مطابق جناب مسیح نے توریت کے حق میں یہی فرمایا ہے۔

”کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین نہ ٹل جائے ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت کا ہرگز نہ مٹے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو“ اس کے باوجود توریت کے احکام منسوخ ہو گئے۔ پادری صاحب نے کہا اب میری بحث توریت کے بارے میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کیوں آپ کی بحث کا تعلق توریت سے نہیں حالانکہ ہم توریت و انجیل کو ایک

سمجھتے ہیں اور جناب کے میزان الحق کے فصل دوم میں اس طرح لکھا ہے کہ !
”انجیل و عہد عتیق کی کتابیں کسی وقت بھی منسوخ نہیں ہوئی ہیں۔“

پادری صاحب نے کہا ہاں اس جگہ تو میں نے لکھا ہے۔ مگر اس وقت ہماری بحث صرف انجیل پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا حواریوں کے عہد میں احکام توریت کے منسوخ ہونے کے بعد چار چیزوں کو حرام کیا تھا۔ بتوں کی قربانیاں، اور خون، جانوروں کا گلا گھونٹنا اور زنا۔ اور اب زنا کے سوا ان چیزوں کی حرمت بھی باقی نہیں رہی۔ بس انجیل میں بھی نسخ ہوا ہے۔ پادری صاحب نے کہا ان چیزوں کی حرمت ہمارے علماء میں مختلف فیہ ہے۔ بعض ہالم ان چیزوں کی حرمت کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں اور بعض نہیں اور ہم بتوں کی قربانیوں کو اب تک حرام جانتے ہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔ پولوس مقدس رومیوں کے باب ۱۴ کے درس ۱۴ میں یوں فرماتے ہیں :-

”مجھے خداوند یسوع سے معلوم ہوا۔ میں نے یقین جانا کہ کوئی چیز آپ ناپاک نہیں۔ لیکن جو اس کو ناپاک جانتا ہو، اس کے لئے ناپاک ہے“ پھر طیلیس کے باب ۱ کے درس ۱۵ میں لکھا ہے۔ پاک لوگوں کے لئے سب کچھ پاک ہے۔ پر ناپاک اور بے ایمانوں کے لئے کچھ پاک نہیں اور ان سب باتوں سے ان چیزوں کا حلال ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پادری صاحب بوسلے کہ انہیں آیات کی وجہ سے بعض علماء ان اشیاء کے حلال ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ مولانا صاحب نے کہا۔ جناب مسیح کا حکم اولاً متی کے باب ۱۰ کے درس ۵-۶ میں حواریوں کی بابت یوں ہے۔ ان بارہوں کو یسوع نے یہ فرما کر بھیجا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں نہ جانا بلکہ پہلے اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیلروں کے پاس جاؤ اور پھر ان لوگوں کے حق میں مرقس کے باب ۱۶ کے درس ۱۵ میں یہ حکم لکھا ہے کہ تمام دنیا میں جا کر ہر ایک مخلوق کے سامنے انجیل کی منادی کرو۔“

گویا دوم حکم نے اول کو نسخ قرار دیا۔ پادری صاحب نے فرمایا کہ خود مسیح نے حکم اول کو منسوخ فرمایا۔ مولانا صاحب نے فرمایا یہ صحیح ہے کہ مسیح نے موقوف کیا۔ مگر یہ تو ثابت ہوا کہ نسخ کلام مسیح میں جائز ہے مولانا صاحب نے اس موقع پر پادری فنڈر کی ایک اور عبارت کا

سوانح علمائے دیوبند۔ ۲۰۶ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی
جو میزان الحق میں تھی ذکر کیا۔ جس میں مسلمانوں سے مہمل خیالات منسوب کئے گئے تھے۔ وہ عبارت یہ تھی:-

”اس دعویٰ کا باطل ہونا کہ گویا قرآن کے ظاہر ہونے سے انجیل اور پرانے عہد کی کتابیں منسوخ ہو گئیں دو وجہ سے ثابت ہے۔“

اول وجہ یہ کہ نسخ مان لینے سے دو نقص لازم آتے ہیں۔ اول یہ کہ گویا خدا کا ارادہ یہ ہوا کہ تورات کو دے کر ایک اچھا اور فائدہ مند کام کرے پر نہ ہو سکا۔ پھر اس کے بعد اس سے بھی فائدہ نہ ہوا آخر قرآن سے مقصد پورا کیا۔ خدا کی پناہ جب کبھی ایسا خیال دل میں لایا جائے تو خدا کی حکمت و قدرت باطل ہو گئی۔ بلکہ خدا ایک بادشاہ اور نا سمجھ اور ناتواں آدمی کے مانند ہو گا۔ کیونکہ ایسا امر صرف آدمی کی ناقص ذات میں ہو سکتا ہے۔ نہ کہ خدا کی کامل ذات میں ثانیاً اگر وہ بات نہیں کہہ سکتے تو منسوخ ہونے کے قاعدے سے یہ خیال لازم آتا ہے کہ خدا نے چاہا کہ ناقص چیز جو مطلب کو نہ پہنچا دے۔ دیوے اور بیان کرے۔ پھر کیونکر ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسے جھوٹے اور ناکارہ خیال خدا کی قدیم ذات و کامل صفات کے حق میں کرے۔ مولانا موصوف نے فرمایا کہ یہ دونوں نقص نسخ کے معنی اصلاحی رو سے مسلمانوں پر نہیں بلکہ عیسائیوں اور پولوس مقدس پر ہیں کیونکہ وہ عبرانیوں میں فرماتے ہیں ”بس اگلا حکم اس لئے کہ کمزور اور بے فائدہ تھا اٹھ گیا“ عبرانیوں باب ۷ آیت ۸ اس عبرانیوں کے خط ۸ باب ۷ درس ۱۳ میں یہ لکھا ہے۔

”کیونکہ اگر وہ پہلا عہد بے عیب ہوتا تو دوسرے کیلئے جگہ کی تلاش نہ ہوتی اور جب اس نے نیا کہا تو پہلے کو پرانا ٹھہرایا۔ پر وہ جو پرانا اور دنی ہے مٹنے کے نزدیک ہے۔“

پس یہاں مقدس پولوس احکام تورات کو ضعیف، بے مصرف اور منسوخ فرماتے ہیں اور تورات کو پرانا عیب دار بتلاتے ہیں۔ پادری صاحب نے سنا اور خاموش ہو گئے۔ جواب کچھ نہیں دیا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے فرمایا یہ چند صفحات نسخ کے بارے میں جو میزان الحق میں لکھے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کو اپنی اس کتاب سے نکال دیں۔ پادری فریج نے کہا ہم سابقہ گفتگو میں کہہ چکے ہیں کہ تورات کے وہی احکام جن کا تعلق حضرت مسیح کی نشانیوں سے تھا۔ منسوخ ہو گئے ہیں اور ان کا نسخ مناسب تھا۔ کیونکہ مسیح نے ان کو کامل کر دیا تھا۔ البتہ

سوانح علمائے دیوبند علیہ السلام حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ۲۰۷
 مسیح کے حق میں جو پیشین گوئیاں تھیں وہ منسوخ نہیں ہوئیں یہ کہہ کر پادری فرنیچ نے انجیل اٹھا کر عبرانیوں کے باب ۱۰ کی یہ عبارت پڑھی۔

”شریعت جو آنے والی نعمتوں کی پرچھائیں ہے اور ان چیزوں کی حقیقی صورت نہیں۔ ان قربانیوں سے جو وہ ہر سال ہمیشہ گزارتے ان کو جو وہاں آتے ہیں کبھی کامل نہیں کر سکتی، نہیں تو وہ قربانی گزارنے سے باز آتے کیونکہ عبادت کرنے والے ایک بار پاک ہو کے آگے کو اپنے تئیں گنہگار نہ جانتے، پر قربانیاں ہر سال گناہوں کی یاد دلاتی ہیں۔ کیونکہ ہو نہیں سکتا کہ بیلوں اور بکریوں کا لہو گناہوں کو مٹا دے اس لئے وہ دنیا میں آتے ہوئے کہتا ہے کہ قربانی اور نذر کو تو نے نہ چاہا، پر میرے لئے ایک بدن تیار کیا سوختی قربانی اور ان قربانیوں سے جو گناہ کے لئے بھی تو راضی نہ ہوا۔“

توریت کی اس آیت اور دوسری کتابوں کے اشارات حضرت مسیح سے متعلق تھے مسیح کے آنے کے بعد تمام کی انہوں نے تکمیل کردی اور انجیل میں کسی شخص کی طرف اشارہ نہیں ہے جس کے آنے سے انجیل منسوخ ہو جاوے۔ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے فرمایا اگر ہم تسلیم کر لیں کہ مسیح کی آمد سے احکام توریت مکمل ہو گئے تو وہ احکام جو مسیح سے قبل موقوف ہو گئے ہیں ان کو تا ابد منسوخ کہنا پڑے گا۔ پادری فرنیچ نے کہا کہ وہ کون سا حکم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ مثل حکم ذبح جو قوانین کے سترھویں باب میں لکھا تھا، استثنا کے باب ۱۲ آیت ۱۵، ۲۰ اور ۲۲ کی وجہ سے منسوخ ہو گیا۔ ہارن صاحب ان آیتوں کی تفسیر جلد اول مطبوعہ ۱۸۲۲ء میں لکھتے ہیں۔ یہ حکم منسوخ ہے اس کے بعد ہارن صاحب کی عبارت پیش کی جس میں لکھا ہے کہ فلسطین کے داخلہ سے قبل مصر میں جانے سے چالیسویں برس یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ پادری فرنیچ صاحب سن کر خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے فرمایا۔ اس وقت یہ ثابت ہوا کہ کلام الہی میں نسخ محال نہیں۔ چنانچہ تمام پادری علی الخصوص۔۔۔۔۔ میزان الحق کے مصنف پادری فنڈر کا دعویٰ تھا کہ نسخ کلام الہی میں محال ہے۔ جب اس صورت میں نسخ کا امکان پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ نسخ کا وقوع انجیل میں آنحضرت کی رسالت کے ثابت ہونے کے بعد آشکارا ہو جائے گا۔ پادری فنڈر نے کہا کہ نسخ کی گفتگو ختم ہوئی اب تحریف پر بحث کی جائے۔ اس کے بعد تحریف پر بحث کا آغاز ہوا۔

بحث تحریف

مولانا رحمت اللہ صاحب نے تحریف کی شکل متعین کرنی چاہی کہ لفظی ہو یا معنوی، طے نہ ہو سکا تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ جسٹن شہید کا جب طریقوں سے مناظرہ ہوا تو اس نے چند پیشین گوئیوں کا ذکر کیا اور دعویٰ کیا کہ یہودیوں نے کتب مقدس سے خارج کر دیا ہے اس سلسلہ میں مولانا نے عیسائیوں کے مستند مفسرین و محققین اور مستند کتب و اٹسن سبلر جیس، ہارن جسٹن، وائٹیکر صاحب اور ڈاکٹر اے اے کلارک وغیرہ کی کتابوں کے حوالے مذکورہ جسٹن کے دعوے کی تائید میں پیش کر کے فرمایا تو جسٹن کے دعوے کو سچا مانے یا جھوٹا۔ اگر سچے ہیں تو ہماری بات درست ہے۔ اگر جھوٹے تھے تو افسوس کا مقام ہے کہ عیسائیوں کے بڑے بڑے مقتدر رہنما اس قدر دروغ گو تھے کہ خود اپنی طرف سے چند پیشین گوئیوں کو گھڑ کر ان کو کلام الہی کا جزو قرار دیا۔ پادری صاحب نے فرمایا کہ جسٹن بھی ایک آدمی تھا۔ اس سے سہو ہوا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ اس سے سہو نہیں بلکہ قدیم جمہور علماء اس سے متفق ہیں۔ پادری صاحب نے کہا عہد عتیق کے بارے میں مسیح نے گواہی دی ہے۔ دوسری گواہیوں کے مقابلہ میں ان کی شہادت زیادہ معتبر ہے اور وہ یہ ہیں۔

(۱) ”کیونکہ اگر تم موسیٰ پر ایمان لاتے تو مجھ پر بھی ایمان لاتے اس لئے کہ اس

نے میرے حق میں لکھا ہے۔“ (یوحنا باب ۶ آیت ۴۶)

(۲) ”موسیٰ اور نبیوں کی وہ باتیں جو سب کتابوں میں اس کے حق میں ہیں۔

شروع سے ان کے لئے بیان کیں۔“ (لوقا باب ۲۴)

(۳) اس نے اس سے کہا کہ وہ موسیٰ اور نبیوں کی نہ سنیں گے تو اگر مردوں میں

سے کوئی اٹھے اس کی نہ مانیں گے۔ (لوقا باب ۱۶ آیت ۳۱)

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آیتوں سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتابیں اس وقت موجود تھیں نہ یہ کہ لفظ بہ لفظ درست تھا۔ پہلی صاحب کی سند پادری فنڈر نے حل الاشکال میں لکھی ہے اور اس کو اسناد کی کتابوں میں شمار کیا ہے۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ شہادت مسیح سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتابیں اس زمانہ میں موجود تھیں۔ اس سے ہر لفظ اور ہر جملہ کی تصدیق نہیں سمجھی جاسکتی۔ پادری صاحب نے فرمایا۔ میں پہلی کو اس وقت نہیں مانوں

گا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ تعجب ہے کہ آپ اس کی کتاب کو معتبر کتاب تسلیم کرتے ہیں اگر اس کو مستند نہیں مانتے تو ہم آپ کی بات یہاں تسلیم نہیں کرتے اور یہاں وہی پہلی کا قول ہمارا قول ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا دیکھئے یعقوب اپنے خط کے پانچویں باب میں یوں لکھتا ہے کہ تم نے ایوب کے صبر کو سنا ہے اور خداوند کے مطلب کو جانتے ہو۔ اس پر بھی کسی نے اس کتاب کے الہامی اور صادق ہونے کو نہیں مانا ہے بلکہ سارے اگلے پچھلے اہل کتاب کے علماء تو اسی امر پر نزاع رکھتے ہیں کہ ایوب محض ایک فرض نام تھا یا کوئی شخص سابقہ زمانہ میں ہوا بھی ہے۔ ”رب ممانی ڈیز“ جو یہودیوں کے بڑے علماء میں ہے اور لیکٹرک، میکالس، سملر، اور بشب اسٹاک وغیرہ عیسائیوں کے عالم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایوب صرف فرضی نام ہے اور اس کی کتاب محض ایک فسانہ ہے۔ پادری صاحب بولے ہمارے نزدیک ایوب ایک شخص ہے اور اگر مسیح کی شہادت میں اس کی کتاب بھی داخل ہے تو الہامی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ پولوس تمہاری کے دوسرے خط میں باناس اور بمبر اس کا موسیٰ سے مخالفت کر کے ان کے ساتھ مقابلہ کرنے کا حال لکھتا ہے۔ معلوم نہیں اس نے یہ بات کون سی جعلی اور غیر الہامی کتاب سے لکھی ہے۔ صرف کسی کتاب سے کچھ نقل کر دینا منقولہ عنہ سے الہامی ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ پادری صاحب بولے جعلی کتاب میں ہمارا کلام نہیں ہے ہم نے تو پرانے عہد کی کتابوں کی تصدیق کے لئے مسیح کا قول بیان کیا۔ جب تک انجیل محرف قرار نہ پائے۔ مسیح کی گواہی اس بات کے لئے کافی ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا ہمارا کلام ساری بائیسبل پر ہے۔ یہ بات منصفانہ نہیں ہے کہ آپ اس کے ایک جزو کو مسلمانوں کے سامنے بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ اول تو آپ کا مطلب سچ کی گواہی سے نہیں نکلتا۔ دوسرے اس سے استدلال کرنا لغو اور بیجا ہے۔ جب تک اس مجموعہ میں تحریف کا نہ ہونا اور دلیلوں سے ثابت نہ ہو ہم اس کی بات کو سند نہیں مانیں گے۔

پادری صاحب نے فرمایا۔ ہم نے پرانی عہد کی کتابوں کے متعلق مسیح کی گواہی بیان کر دی۔ اب تم کو چاہئے کہ انجیل میں تحریف ثابت کرو۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اگرچہ آپ کا یہ کہنا درست نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ انجیل میں تحریف دیکھنے کے مشتاق ہیں تو ملاحظہ کیجئے اور انجیل اٹھا کر متی کے پہلے باب کا درس پڑھئے۔

سب پشتیں ابراہام سے داؤد تک چودہ پشتیں ہیں اور داؤد سے بابل کے اٹھ جانے تک

چودہ پشتیں ہیں اور بابل کے اٹھ جانے سے مسیح تک چودہ پشتیں ہیں۔ پادری صاحب کو مخاطب کر کے ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ فرمائیے دوسرے طبقہ میں کون سے نام پر چودہ پشتیں ہوتی ہیں۔ پادری صاحب بولے ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں ہے۔ آپ یہ بتلائیے کہ تمام نسخوں میں ایسا ہی پایا جاتا ہے۔ یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ اب کے نسخوں میں تو موجود ہے اور خدا جانے اگلے نسخوں میں تھیا نہیں۔ لیکن اس کے غلط ہونے میں تو شک نہیں ہے۔ پادری صاحب نے فرمایا غلط ہونا اور بات ہے اور تحریف اور، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے کہا۔ اگر الجیل الہامی ہے اور الہام میں غلطی ممکن نہیں تو اس صورت میں بیشک پیچھے تحریف ہوئی اور اگر الہامی نہیں ہے تو ایک اور مطلب نکلا۔ پادری صاحب نے کہا۔ تحریف اس وقت ثابت ہوگی جب تم کوئی ایسی عبارت دکھلاؤ جو اگلے نسخوں میں نہ ہو اور اب کے نسخوں میں پائی جاتی ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے یوحنا کے پہلے خط کے پانچویں باب کا درس ۷ و ۸ پیش کیا۔ پادری صاحب نے بتایا کہ یہاں دو ایک جگہ اور تحریف ہوئی ہے۔ اس موقع پر مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی نے جو پادری فریچ صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ پادری فریچ سے انگریزی میں معلوم کیا۔ کیا بات ہے۔ پادری فریچ نے جواب دیا کہ یہ لوگ ہارن اور دوسرے مفسروں کی کتاب سے چھ سات مقام جن میں تحریف کا اقرار ہوا ہے نکال کے سند کے طور پر دکھلا رہے ہیں۔ پادری فریچ نے ڈاکٹر وزیر خاں صاحب سے کہا کہ پادری فنڈر بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ سات آٹھ جگہ تبدیلی اور تحریف ہوئی ہے۔

مولوی قمر الاسلام صاحب، امام جامع مسجد اکبر آباد نے منشی خادم علی خاں صاحب مہتمم مطبع الاخبار سے فرمایا کہ تم لکھو کہ پادری صاحب آٹھ جگہ تحریف ہونے کے اقراری ہیں۔ پادری فنڈر نے جب یہ بات سنی تو کہا ہاں بہت اچھا ہے لکھئے۔ اور کہا اتنی تعداد میں تحریف ضروری ہے لیکن کتب مقدسہ میں اس سے نقصان نہیں ہوا ہے۔ پادری فنڈر نے کہا کہ دو مسلمان اور دو معزز عیسائی انصاف کریں اور پھر مفتی ریاض الدین کی طرف متوجہ ہو کر بار بار فرما رہے تھے کہ آپ انصاف کیجئے۔ آپ نے آخر میں فرمایا کہ جس وثیقہ میں ایک جگہ جعل ثابت ہو جائے تو وہ وثیقہ قابل اعتبار نہیں رہتا۔ کجا کہ آٹھ سات جگہ۔ وقت کافی ہو چکا تھا۔

پادری صاحب کے ایما پر پہلے روز کے مناظرہ کی کارروائی دوسرے دن کیلئے ملتوی کر دی گئی۔

دوسرے دن کے مناظرے کی کارروائی

دوسرے روز پیر کو مناظرہ ۱۱، اپریل ۱۸۵۴ء، ۱۲، رجب ۱۲۷۰ھ کو علی الصباح مقررہ مقام پر منعقد ہوا جس میں مسٹر اسمتھ صدر دیوانی مسٹر ریڈ حاکم صدر بورڈ، مسٹر ولیم مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر کشیش ولیم گلین، پادری ہرنلے اور جناب حافظ مفتی ریاض الدین، مولوی اسد اللہ قاضی القضاات، مولوی فیض احمد سرشتہ دار صدر بورڈ، مولوی حضور احمد، جناب مولوی امیر اللہ صاحب مختار راجہ بنارس، جناب مولوی قمر الاسلام امام جامع مسجد آگرہ، جناب مولوی امجد علی وکیل سرکار کمپنی، جناب مولوی سراج الحق اور جناب منشی خادم علی مہتمم مطبع الاخبار، مولوی امیر علی شاہ، مولوی قمر الدین خاں مہتمم اسعد الاخبار، مولانا مظفر علی شاہ جعفری القادری، سید صفدر علی شکوہ آبادی، پنڈت جنگل کشور، مولوی فیض احمد بدایونی، امیر اللہ وکیل، مولوی معین الدین، سید باقر علی ناظم محکمہ دیوانی، مولوی کریم اللہ خاں کچھرا یونی، سید حافظ حسین، حافظ خدا بخش، ڈاکٹر الہام اللہ گوپا موی، مفتی افہام اللہ ساحر، قاضی باقر علی خاں ہمدانی، راجہ بلوان سنگھ کاشی، مولوی سید مدد علی تپش، مرزا زین العابدین عابد، عبدالشہید کولوی، ڈاکٹر مکند لال، حکیم فرخند علی گوپا موی، مفتی اکرام گوپا موی، سید فضل حسین، ڈاکٹر وزیر الدین فرخ آبادی، حکیم جواہر لال، غلام محمد خان، خلیفہ گلزار علی اسیر، غلام قطب الدین خاں باطن، مولوی سراج الاسلام امام جامع مسجد پیشہ کار وغیرہ موجود تھے۔

پہلے دن کے مناظرہ کا قدرتی طور پر چرچا خوب ہو گیا تھا جس کی وجہ سے دوسرے دن کی حاضری پہلے دن سے دگنی تھی۔ یعنی ہزار کے قریب حاضرین کی تعداد تھی۔ ساڑھے چھ بجے کارروائی شروع ہوئی۔ پادری فنڈراٹھے۔ ہاتھ میں میزان الحق تھی۔ فصل اول میں سے قرآن مجید کی چند آیات پڑھنی شروع کیں۔ چونکہ آیات درست الفاظ میں نہیں پڑھ رہے تھے۔ اس لئے قاضی القضاات نے فرمایا کہ حضرت ترجمہ پر اکتفا فرمائیں لفظ کی تبدیلی سے معنی بدل جاتے ہیں۔ پادری صاحب نے فرمایا مجھ کو معاف فرمائیں۔ یہ میری زبان کا قصور ہے۔ اس کے بعد یہ آیات پڑھیں:

”وقل آمنت بما انزل اللہ من کتاب وامرت لاعدل بینکم“ آپ کہہ دیجئے اللہ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں، میں بیشک ایمان لاتا ہوں اور

اللہ ربنا و ربکم لنا
اعمالنا و لکم اعمالکم
لا حجة بیننا و بینکم“

(سورہ الشوری)

”ولا تجادلوا اهل الکتاب الا
بالتی هی احسن الا الذین ظلموا
منهم و قولوا امنا بالذی انزل
الینا و انزل الیکم و الہنا و
الہکم واحد و نحن له مسلمون“

(سورہ العنکبوت)

”الیوم احل لکم الطیبات و طعام
الذین اوتوا الکتاب حل لکم و
طعامکم حل لہم“ (سورہ مائدہ)
”وہم یتلون الکتاب“ (سورہ البقرہ)
”انزلت التوراة والانجیل من قبل
ہدی للناس“ (آل عمران)

ان آیتوں میں کتاب اور اہل کتاب کا ذکر ہے۔ اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ محمد ﷺ کے زمانہ میں توریت و انجیل موجود تھی اور مسلمان اس کو تسلیم کرتے تھے اور اس کو دین کا ہادی سمجھتے تھے۔ محمد ﷺ کے زمانہ میں اس کے اندر تحریف نہیں ہوئی تھی۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے فرمایا۔ ان آیتوں سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ سابقہ زمانہ میں خدا کا کلام نازل ہوا تھا اس پر ایمان لانا چاہئے۔ توریت انجیل میں سابقہ نازل شدہ کتابیں ہیں اور محمد ﷺ کے زمانہ میں موجود تھیں۔ اگرچہ محرف تھیں۔ ان آیات سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی بلکہ جا بجا قرآن میں اہل کتاب کے تحریف کرنے کا ذکر ہے اور حدیث شریف میں ہے ”لا تصدقوا اهل الکتاب و

لا تکذبوا“ یعنی اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔ پادری صاحب نے فرمایا۔ احادیث کا حوالہ مت دیجئے بلکہ قرآنی آیات دلیل میں پیش کیجئے۔ مولانا صاحب نے فرمایا۔ قرآن سے ہی یہ چیزیں ہمیں معلوم ہوئیں۔ جس کا اقرار آپ نے میزان الحق میں صاف طور پر کیا ہے۔ پادری صاحب نے کہا۔ سورہ بینہ کی آیات سے مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ محمد ﷺ کے زمانہ سے قبل انجیل میں تحریف نہیں ہوئی اس کے بعد میزان الحق کے پہلے باب کی تیسری فصل کی یہ عبارت پڑھی۔ چنانچہ سورہ بینہ میں لکھا ہے۔

”لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكُتُبِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتِبَ قِيمَةٌ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَةُ“

جو لوگ اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کافر تھے وہ باز نہ آنے والے تھے جب تک کہ ان کے پاس واضح دلیل نہ آتی یعنی اللہ کا رسول جو ان کو پاک صحیفے پڑھ کر سنادے۔ جس میں درست مضامین لکھے ہوئے ہوں اور جو اہل کتاب تھے وہ اس واضح دلیل آنے کے بعد مختلف ہو گئے حالانکہ ان لوگوں کو بھی یہی حکم ہوا تھا۔

(سورہ البینہ)

پادری صاحب نے فرمایا کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے حضور اقدس ﷺ کے ظہور کے بعد اپنی کتابوں میں تحریف کی ظہور سے قبل نہیں کی۔ اس کے بعد کہا کہ مصنف کتاب استفسار جو انتہائی مشہور ہیں اور ان کو شخص جانتا ہے کہ وہ مولوی آل حسن ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۷۴۴ میں آیت مذکور کی اس طرح شرح کی ہے۔ نبی سابق الانتظار کے اعتقاد رکھنے سے جدایا اس کے اعتقاد رکھنے میں مختلف و متفرق نہیں ہوئے مگر جب یہ نبی آیا۔ ان معنوں کی راہ سے البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ نبی آخر الزماں کی بشارتوں میں اس کے ظہور کے زمانہ تک کچھ تحریف و تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے جواب میں فرمایا، ان آیات کا ترجمہ جمہور مفسرین نے اس طرح کیا ہے اور شاہ عبد القادر نے خود بھی یہی طرز اختیار کیا ہے۔ ”نہ تھے وہ لوگ جو منکر ہوئے کتاب والے (یعنی اپنے دین اور بری رسموں اور برے عقیدوں سے مثل عدم اعتقاد نبوت جناب مسیح کے جیسا یہود کو تھا اور اعتقاد تثلیث کے جو عیسائیوں کو تھا اور مانند ان

کے) جب تک نہ پہنچی ان کو کھلی بات ایک رسول اللہ ﷺ کا پڑھنا ورق پاک اس میں لکھی کتابیں (یعنی سورتیں مضبوط) اور نہیں پھوٹے وہ جن کو ملی کتاب یعنی اپنے دین اور رسموں اور عقیدوں سے اس طور پر کہ بعضوں نے ان کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا اور بعضے تعصب سے انہیں پر قائم رہے مگر جب کہ آچکی ان کو کھلی بات (یعنی رسول اللہ ﷺ اور قرآن) شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ پہلی آیہ کے ترجمہ کے آخری حاشیہ میں لکھتے ہیں:-

”حضرت محمد ﷺ سے پہلے سب دین والے بگڑ گئے تھے۔ ہر ایک اپنی غلطی پر مغرور، اب چاہئے کہ کسی حکیم یا کسی والی یا کسی بادشاہ عادل کے سمجھائے راہ پر آویں ممکن نہ تھا جب تک ایسا رسول نہ آوے عظیم القدر ساتھ کتاب اللہ کے اور مدد قوی کے کئی برس میں ملک کے ملک ایمان سے پھر گئے۔“ ان آیات کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ مشرکین اہل کتاب اپنے افعال شنیعہ سے باز نہیں آئے۔ جب تک ان کے پاس عظیم القدر رسول نہیں آیا۔ ان کے آنے کے بعد بھی اہل کتاب کی مخالفت محض تعصب بجا اور عناد کی وجہ سے ہوئی۔ رہی صاحب استفسار کی عبارت اس کو غلط طریقہ اور بد نیتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے انہوں نے خود اس ترجمہ و خیال کا جواب دیا ہے!

جواب ملاحظہ ہو:-

”اس استدلال سے ”در صورت کہ صحیح اور درست، کیا جائے“ اتنا ہی ثابت ہے۔ الخ۔ صرف نبی کے لئے جو بشارتیں تھیں ان میں تحریف و تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ مگر بعد ظہور اس نبی کے نہ یہ کہ بائیسبل میں اور کہیں کسی طرح کی خرابی نہیں ڈالی گئی۔“

اس جواب کے بعد مولانا آل حسن کی عبارت کو اپنی تائید میں پیش کرنا غلط ہے۔ مولانا آل حسن نے اپنی تمام تصنیف میں اس تحریف کا بھانڈا پھوڑا ہے اور تحریف کی کافی مثالیں اس میں دی ہیں۔ پادری صاحب نے کہا کہ آپ یہ بنائیے کہ جس انجیل کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے وہ کوئی انجیل تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ قرآن مجید سے صرف اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ پر انجیل نازل ہوئی۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کوئی انجیل تھی اور اس زمانہ میں بہت سی کتابیں انجیل کے نام سے عیسائیوں میں مشہور تھیں جیسے ”برنباہ“

اور بر تو لیا وغیرہ کی انجیل یہ خدا ہی جانتا ہے کہ ان میں کون سی مراد ہے اور اس زمانہ میں ایک فرقہ ”منی کنیر“ بھی تھا، جو اس مشہور انجیل کے کل مجموعہ کو نہیں مانتا تھا اور اسی زمانہ میں عرب میں ایک فرقہ ایسا تھا جو کہتا تھا کہ تین خدا ہیں۔ باپ، بیٹا اور مریم، شاید ان کے نسخے میں یہ بھی تحریر ہو کیونکہ قرآن مجید نے ان کو جھٹلایا ہے بس یہ بات کہیں سے ثابت نہیں ہوئی کہ اس انجیل میں حواریوں کے اعمال نامے اور مشاہدات بھی داخل ہیں۔

فرینچ صاحب نے کہا کہ تم عیسیٰ کے قول کے سوا اور کتابوں کو جو انجیل میں ہیں نہیں مانتے، حالانکہ چوتھی صدی میں لوڈلیسیا کی کونسل نے ایک کتاب، یعنی مشاہدات کے سوا سب کو تسلیم کیا ہے اور ہمارے بڑے بڑے عالم جن کو ہم نہایت معتبر جانتے ہیں جیسے کہ کلیمنس اسکندریانوس، ار جن اور سائی پر ن وغیرہ نے مشاہدات کی کتاب کو تسلیم کیا ہے، لیکن اگلے زمانے کے فتنے و فساد اور لڑائیوں کی وجہ سے ہمارے پاس قریب کی سند نہیں ہے اس پر ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا۔ کلیمنس کس زمانہ میں تھا؟ پادری صاحب نے بتایا کہ دوسری صدی کے آخر میں۔

ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے فرمایا اگر کلیمنس نے مشاہدات کے متعلق دو فقرے لکھ دیئے تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صدی کے آخر میں کلیمنس نے مشاہدات کی کتاب کو یوحنا کی تصنیف جانا ہے۔ گویا اس کی سند اس زمانہ سے پہلے کی نہیں ہے۔ لہذا دو فقروں سے ساری کتاب کا تواتر لفظی ثابت نہیں ہو سکتا اور ٹریٹلین وغیرہ تو اس کے بعد گزرے ہیں اور ”کیس پر سیٹر“ روم نے تو اس کو سرن تھیس ملحد کا کلام کہا ہے اور اسی طرح ڈیونیسس نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ ہم سے پیشتر بعضوں نے اس کو سرن کا کلام کہا ہے، پادری صاحب نے کہا ڈیونیسس نے ان بعضوں کا نام نہیں لیا ایک دو آدمی کی مخالفت سے کیا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر خاں صاحب نے فرمایا ہم ایک یا دو آدمی کا نام نہیں لیتے بلکہ سیکڑوں آدمیوں کے نام گنوا سکتے ہیں۔ مثلاً یوسی بیس اور سرل اور اس زمانہ میں یروشلم کی تمام کلیسا اور کونسل لوڈلیسیا نے بھی اس کتاب کو رد کیا ہے اور عہد جیروم میں بھی بعض کلیسا اس کو نہ مانتے تھے۔ اس پر پادری فنڈر صاحب نے اعتراض کیا۔ یہ گفتگو بحث سے خارج ہے اور اس انجیل پر گفتگو ہو جو محمد ﷺ کے زمانہ میں موجود تھی۔ اسکے بعد مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے ارشاد فرمایا۔ ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ خدا کا کلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا لیکن اس بات سے منکر ہیں کہ وہ کلام یہی بائیسبل کا مجموعہ ہے اور اس میں کچھ تغیر و تبدل نہیں ہوا اور حواریوں کا کلام ہمارے نزدیک انجیل نہیں ہے بلکہ انجیل صرف اسی قدر ہے جو مسیح پر نازل ہوئی تھی۔ چونکہ کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں آیا اس لئے ہم اس بات کا تعین نہیں کر سکتے کہ مسیح کی وہ باتیں کونسی کتاب میں لکھی ہوئی ہیں اور جو کچھ ان چار کتابوں میں منقول ہے اس کا درجہ حدیث کا سا ہے۔ اہل اسلام کے قبل کے لوگوں میں کوئی معتمد روایت اس سلسلے میں نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں پوپ کا تسلط اس قدر تھا کہ اس فرقہ کے لوگوں میں اصل انجیل پڑھنے کی عام اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اس بنا پر اس کے نسخے مسلمانوں کو دیکھنے میں کم آئے اور غالباً عرب کے اطراف و اکناف میں اسی قسم کے عیسائی یا فرقہ نستوریہ کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس پر پادری فرینچ صاحب نے تیز ہو کر کہا۔ تم نے ہماری انجیل پر بڑا الزام لگایا ہے۔ پوپ صاحب نے اس میں کوئی خرابی نہیں کی۔

اس کے بعد پادری فنڈر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن شریف کے بعض نسخوں کو جلا دینے والا قصہ سنا شروع کیا، مولوی صاحب نے کہا جب یہ بات بحث سے خارج ہے تو آپ اس کا ذکر درمیان میں کیوں لاتے ہیں۔ اس کا جواب بھی سن لیجئے۔ پادری صاحب نے جواب دیا۔ چونکہ آپ نے انجیل پر اعتراض کیا تھا۔ اس لئے میں نے یہ بات کہہ دی، اب آپ اصل موضوع پر آئیں۔

مولانا رحمت اللہ صاحب نے فرمایا، ہمارا اعتراض ساری بائیسبل پر ہے نہ صرف انجیل پر اس لئے ہم بعضی کتابوں کی سند قریب کی مانگتے ہیں۔ پادری صاحب بولے انجیل پر بحث کیجئے۔ مولانا صاحب نے فرمایا، ہمارا اعتراض کل بائیسبل کے مجموعہ پر ہے۔ انجیل کی تخصیص بے جا ہے۔ اس پر پادری صاحب خاموش ہو گئے۔ پادری فرینچ اپنے ساتھ ایک تحریری جواب لائے تھے، انہوں نے اس کو پڑھنا شروع کیا جس کا خلاصہ یہ تھا انجیل میں ہمارے علماء تیس چالیس ہزار اختلاف عبارت بیان کرتے ہیں، لیکن یہ اختلاف ایک نسخہ میں نہیں بلکہ بہت سے نسخوں میں تھے۔ چنانچہ حساب سے فی نسخہ چار یا پانچ سو اختلاف ہوتے ہیں۔ بعض غلطیاں بدعتوں کی وجہ سے ہوئیں چنانچہ ڈاکٹر گریریک نے انجیل متی

میں تین سو ستر غلطیاں آیتوں اور لفظوں میں نکالی ہیں ان تمام میں بڑی غلطیاں ستر ہیں ان سے چھوٹی غلطیاں ۳۲ ہیں اور بقایا بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ہمارے علماء نے ان غلطیوں کو صحیح کیا ہے جس کتاب کے نسخے زیادہ ہیں اس کی درستگی میں آسانی ہوتی ہے اور جس کے نسخے کم ہیں اس کی تصحیح میں دشواری ہوتی ہے۔ ہمارے علماء کا کہنا ہے کہ ان اغلاط کے علاوہ اور کوئی غلطیاں نہیں ہیں اور مسیحی دین کو ان غلطیوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر کنی کاٹ کہتا ہے۔ بالفرض اگر یہ ساری محرف عبارتیں نکال ڈالی جائیں تو دین عیسوی کے کسی عمدہ مسئلے میں نقصان لازم نہ آئے گا اور اگر ساری بنائی ہوئی عبارتیں داخل کر دی جائیں تو دین کے معتبر مسئلوں میں کچھ زیادتی نہ ہو جائے گی۔ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اس تقریر کا جواب دینا چاہتے تھے تو پادری فنڈرنا، نا کر کے ٹال دیتے اور منع کرتے اور مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ اس پر مفتی ریاض الدین صاحب نے فرمایا۔ اول تحریف کے معنی بیان کیجئے۔ مولانا صاحب نے تحریف کے معنی بیان کئے۔ ہمارے نزدیک تحریف کے معنی تغیر کے ہیں خواہ تغیر کچھ بڑھ جانے یا گھٹ جانے سے ہوا ہو۔ خواہ بعض الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ آنے کا باعث ہوا ہو۔ خواہ یہ تحریف از راہ خباثت اور شرارت سے ہوئی ہو یا غلبہ و ہم کی وجہ سے اصلاح کے طور پر عمل میں آئی ہو۔ چنانچہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ان صورتوں میں کتب مقدسہ میں تحریف ہوئی ہے۔ اگر آپ اس سے انکاری ہیں تو ہم اس کو ثابت کرنے کیلئے تیار ہیں۔ ان غلطیوں کو پادری صاحب نے سہو کاتب ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن بعد میں مولانا صاحب کی تشریح قبول کی۔ لیکن اس کا نام سہو کاتب رکھا اور اس کے بعد ”سہو کاتب متن میں نہیں ہے“ کا عذر پیش کیا جس کو مولانا صاحب نے ماننے سے انکار کیا تو اس وقت جناب مولوی فیض احمد سرشتہ دار نے پادری صاحب کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا۔ تعجب است کہ در کتاب تحریف واقع شود و در متن قباحتہ نیفتد۔ اس کے بعد مناظرہ ختم ہو گیا۔

مولانا امام بخش صہبائی شہید فرنگ نے فارسی میں ایک عمدہ تاریخ اس مناظرہ کے بارے میں کہی تھی۔ جس کا مطالعہ از التہ الشکوک جلد دوم میں کیا جاسکتا ہے۔ اس مناظرہ سے جہاں مسلمانوں میں جان آئی وہاں عیسائیوں اور خاص طور پر عیسائی مشنریوں کا غرور ٹوٹا۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس کا بھی ذکر از التہ الاوہام میں

کیا ہے اور ساتھ ہی حکومت برطانیہ کے خاتمے کی تمنا اور اس کے لئے دعا بھی کی ہے :-

”مباحثہ کا فائدہ یہ ہوا کہ پادریوں کا بالکل وہ زور شور گھٹ گیا اور کتابیں جو کثرت سے بانٹتے تھے اسی کثرت سے موقوف کر دیں اور مسلمانوں سے الزام اٹھ گیا اور عیسائیوں کا وہ تکبر اور اعتقاد فاسد مٹ گیا اور مذہبوں کا وہ تذبذب ہٹ گیا۔ و الحمد للہ علی ذالک مجھ کو اس مباحثہ سے نہ کچھ نام منظور تھا۔ نہ منصب حاصل کرنا تھا بلکہ محبت اسلامی سے خدا پر بھروسہ کر کے اس بات پر قدم رکھا تھا۔ اور اللہ سے امید رکھتا ہوں کی مجھ سے دین احمدی کی تائید مقابلے لسانی میں کرا دی۔ اس سے ہزار ہا درجہ مقابلہ ستانی بھی کرا دے اور جیسا کہ ان کا زور شور مذہب کے مقدمے میں مدھم پڑا اور اس میں پھیکے پڑ گئے ویسا ہی ان کا زور شور حکومت کا بھی ٹوٹے اور ان کا تکبر و غرور خاک میں ملے اور مسلمان اس میں بھی غالب آویں اگرچہ ان دنوں میں جو رجب کا مہینہ اور ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء بارہ سوا کہتر ہجری میں ان کی حکومت کے زور شور کا ملاحظہ کر کے جاہلوں کا اعتقاد یہ ہے کہ قبل خروج مہدی رَضِیَ اللہ عَنْہُ کے یہ تسلط ان کا نہ جائے گا، اور ان کے ان قوانین محکمہ، اور تدابیر مضبوط سے ترقی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا، پر اللہ کی قدرت کے لحاظ سے کچھ بعید نہیں کہ نمرود اور شداد اور فرعون اور بخت نصر کی طرح ان کے اس زور کو بھی ملیا میٹ کر دے اور ان کے تنزل کو ہماری زندگی میں ہماری آنکھوں سے دکھادے آمین ”اللہم انصر من نصر دین محمد وجعلنا منهم و اخذل من خذل دین محمد ولا تجعلنا منهم“۔ (ازالۃ الشکوک دو نمبر ۴۷، ۴۸، ۴۹)

اس مباحثہ کے بعد ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء سے مولانا رحمت اللہ صاحب اور پادری فنڈر کے درمیان اس امید پر کہ دوبارہ مناظرہ کیا جائے گا۔ خط و کتابت شروع ہوئی لیکن دوبارہ مناظرہ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تو ۲۳ اپریل ۱۸۵۴ء کے بعد سے خط و کتابت بھی بند ہو گئی۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شرکت

مولانا رحمت اللہ صاحب کی کتب ردِ نصاریٰ کی تالیف جہاد بالقلم اور ۱۸۵۴ء کا آگرہ کا مناظرہ جو جہاد باللسان تھا وہ جہاد بالسیف جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ دہلی کے علمی طبقے اور خصوصاً لال قلعہ کے شہزادوں پر مولانا رحمت اللہ صاحب کی علمی قابلیت اور ردِ نصاریٰ میں وسیع معلومات اور حاجی امداد اللہ صاحب کی روحانیت کا اثر تھا اور یہ لوگ ان حضرات کے معتقد و مرید تھے اور جس طرح ہر ہندوستانی عیسائی مشنریوں کی ان حرکتوں کو قوم و ملت کے لئے خطرناک سمجھتا تھا اسی طرح دہلی والے اور لال قلعہ کے شہزادے ان سے پریشان تھے۔

چنانچہ جب مرزا فخر ولی عہد بہادر شاہ ظفر کو معلوم ہوا کہ مولانا رحمت اللہ صاحب ردِ نصاریٰ میں ایک کتاب ”ازالتہ الشکوک“ تصنیف فرما رہے ہیں تو اس وقت انہوں نے ان کے پاس دہلی کے عیسائیوں کے چھ سوالات روانہ کئے کہ آپ ان کا جواب بھی اس کتاب میں شائع فرمائیں۔ چنانچہ مولانا صاحب نے ان کے کہنے کے مطابق ازالتہ الشکوک میں ان چھ سوالات کے جوابات شائع کئے۔ اس کے بعد مرزا فخر ولی کے حکم سے آگرہ کے مناظرہ کی روئیداد ”البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف“ طبع ہوئی اور انہی کے حکم سے ہندوستان کے اطراف و اکناف میں ان کی اشاعت ہوئی۔ من وعن یہی پوزیشن دہلی میں حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی تھی۔ ان کے مریدوں میں دہلی کے شہزادے بھی تھے۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں۔

”اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب جب بھی دہلی تشریف لاتے تو حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمہ اللہ کے پاس قیام فرماتے اور استاد الكل مولانا مملوک علی کے شاگرد سید نا امام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ بھی زیارت سے بہرہ یاب ہوتے۔ خلاصہ یہ کہ دہلی سے نانوتہ، نانوتہ سے دہلی جاتے ہوئے بھی حضرت حاجی صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضری

کے مسلسل مواقع آپ کو ملتے رہتے اور یوں بھی جب کبھی حاجی صاحب دہلی تشریف لاتے تو قدرتی تائید ہی کی اس کو ایک شکل سمجھنا چاہئے کہ دہلی جہاں عرض کر چکا ہوں شاہی خانوادے کے بھی بعض ارکان حاجی صاحب سے بیعت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے اسی دلی میں بجائے کسی اور جگہ فروش ہونے کے اسی گھر کو قیام گاہ بنانے کا شرف بخشا جاتا تھا۔ جہاں سیدنا امام الکبیر کو حاجی صاحب کیساتھ تعلقات کے تروتازہ کرنے کے مواقع بہ آسانی مل جاتے تھے“ (۱)

۱۸۵۴ء کے اکبر آباد کے مناظرہ کے دوسرے ہیر و ڈاکٹر وزیر خان صاحب تھے اور اس مناظرہ میں شریک ہونے والوں میں مولوی فیض احمد رسوا بدایونی بھی تھے۔ ان حضرات کے یہ تعلقات جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مدد ثابت ہوئے اور انہوں نے متفق ہو کر اس جنگ آزادی میں بہت نمایاں اور اہم پارٹ ادا کیا۔ جب میرٹھ کے مجاہدین نے دہلی میں جنگ آزادی کا بگل بجایا۔ چونکہ مولانا رحمت اللہ صاحب کا دہلی کے علمی طبقے اور لال قلعہ کے شہزادوں پر اثر تھا اور ان سے تعلقات بھی تھے، اس وقت بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مجاہدین کے ساتھ مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی جنگ آزادی کا نقشہ بنانے میں حصہ لیا اور جنگ میں شمولیت فرمائی اور ڈاکٹر محمد وزیر صاحب اور مولوی فیض احمد بدایونی کے ساتھ دہلی کی جنگ آزادی میں شریک ہوئے۔ اور شاملی اور کیرانہ کا معرکہ بھی مولانا رحمت اللہ صاحب اور حاجی امداد اللہ صاحب نے باہمی مشوروں سے سر کیا اور ان میں سے ہر شخص نے حتی الامکان جنگ آزادی کو کامیاب کرنے کی کوشش کی۔ مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں جو انقلابی کارنامے انجام دیئے ہیں وہ ان حضرات کے باہمی مشوروں اور پروگرام کے مطابق پایہ تکمیل تک پہنچے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کی وہ دوراندیش ہستی تھی جنہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انگریزی حکومت جب تک قائم رہے گی ہندوستانیوں کے مذہب، تمدن اور معاشرت کا خاتمہ کرتی رہے گی اور اپنی تہذیب و تمدن ہندوستانیوں پر مسلط کر کے عیسائی مذہب پھیلانے کی، اس لئے اس حکومت کا زور ہر میدان میں خواہ وہ قلمی ہو، لسانی ہو، اور میدان جنگ ہو اس میں توڑنا چاہئے۔ ایسے باشعور اور خوددار انسان سے جبکہ ملک میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہو گیا ہو۔ یہ توقع کرنا کہ وہ اس جنگ آزادی کو ایک تماشا سمجھے گا اور اس میں شامل نہ ہو گا انتہائی غلط

ہے۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا اور وہ دہلی میں جنگ آزادی کے ابتدائی زمانہ میں آئے جس کا ذکر مولانا ذکاء اللہ صاحب نے اپنے محتاط انداز میں کیا ہے:-

”سب سے اول مولوی رحمت اللہ کیرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ بڑے فاضل تھے عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی حیات کی مسجد میں اترے اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامہ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن کو چلا گیا۔“ (۱)

دہلی کے ان ابتدائی ایام میں جبکہ میرٹھ کے مجاہدوں نے دہلی پر حملہ کیا تھا اور انگریزوں کا قلع قمع کر دیا تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر کوئی انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ بہاد کے حالات نہیں تھے۔ اس سے بہتر اور کیا حالات ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انہی حالات کو دیکھ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ جس کی تصدیق و تائید روزنامہ عبد اللطیف سے ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

۳۰ جون کمتر روز برآمدہ بود کہ آویزش
دلنشین سپاہ نصیر آباد آمد۔ آئین سپاہ گری
بجا آورد و بکوچہ ملاقی شد و لے ہر میت
خورد و ہم امروز کہ بیشتر از روز رفتہ بود کہ
مردم نجیب آباد کہ بشمار دو صد میرسیدند
باقندائے مولوی رحمت اللہ کیرانہ نژاد بمنا
زعت برآمدند و مراجعت درآمدند (۷۸)

۳۰ جون کچھ دن چڑھے نصیر آباد کے
لشکر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور سپہ گری کا
حق ادا کیا۔ لیکن شکست کھائی اور آج ہی
دن ڈھلے دو سو اہل نجیب آباد مولوی
رحمت اللہ کیرانوی کی قیادت میں پہنچے
اور آمادہ پیکار ہوئے لیکن پھر واپسی اختیار
کی۔

اس عبارت سے اندازہ لگائیے کہ جو شخص ۳۰ جون ۱۸۵۷ء کو مرد میدان بنا ہو اس نے ابتدائی زمانہ میں جبکہ بغاوت کے شباب کا زمانہ تھا شمولیت نہ کی ہوگی؟ اور جبکہ وہ دہلی میں ایسے وقت آ بھی گیا ہو۔

دہلی کی جنگ آزادی کے ایام میں مولوی رحمت اللہ صاحب کے ساتھ دہلی میں ڈاکٹر

محمد وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی تھے اور یہ دونوں بھی دہلی کے معرکہ آزادی میں حصہ لے رہے تھے۔ ڈاکٹر محمد وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی دونوں آگرہ سے دہلی میں ساتھ آئے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب نے کسی قدر تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے:-

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا مولانا رحمت اللہ صاحب اور ان کے رفقاء نے کیرانہ میں اور حاجی امداد اللہ صاحب اور ان کے رفقاء نے شاملی (تھانہ بھون) میں آپس میں مل کر ایک محاذ قائم کیا اور باہمی مشوروں سے یہ دونوں جنگیں لڑی گئیں جس کے بارے میں مولانا محمد سلیم صاحب نبیرہ مولانا رحمت اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

”پرگنہ کیرانہ و شاملی میں زمیندارہ شیوخ اور مسلمان گوجروں کے ہاتھوں میں تھا جن میں دیانت داری کے ساتھ جوش بھی موجود تھا۔ تھانہ بھون اور کیرانہ کا ایک محاذ قائم کیا گیا۔ مجاہدین کی جماعت مدافعت اور مقابلہ کرتی رہی۔ شاملی کی تحصیل پر حملہ کیا گیا۔ پرگنہ کے چاروں طرف اس مجاہدانہ تحریک کا اثر عام ہو چکا تھا۔ تھانہ بھون میں حاجی امداد اللہ صاحب اور مولوی عبدالحلیم تھانوی مع رفقا اور نواح کیرانہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ مرحوم گورہ فوج کا مقابلہ کر رہے تھے“ (۱)۔

کیرانہ کے لوگوں نے بھی شاملی کی تحصیل کو لٹوانے میں برابر کا حصہ لیا تھا اور کیرانہ میں بھی انگریزی فوج سے ان لوگوں نے مقابلہ کیا۔ جس میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ چودھری عظیم الدین، مولانا کے بھائی حکیم اکبر علی صاحب حکیم محمد امین الدین انصاری صاحب، شیخ فرید الدین صاحب عرف پیر جی فدو اور شیخ حمید الدین صاحب عرف پیر جی مدو وغیرہ نے حصہ لیا۔ کیرانہ میں چونکہ مسلمان گوجر زیادہ تھے اس لئے ان کی قیادت چودھری عظیم الدین صاحب نے مولانا رحمت اللہ صاحب کے ہمراہ کی۔ اس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم و تربیت کے لئے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا اور اعلان ہوتا تھا ”ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا“۔

اس جملہ کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا اور پروگرام بنانا ہوتا وہ عوام کو بتایا جاتا۔ کیرانہ کے محاذ پر بظاہر شکست کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ مگر بعض ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں کی

سازش نے حالات کا رخ بدل دیا۔ کیرانہ میں انگریزی فوج اور توپ خانہ داخل ہوا۔ محلہ دربار کے دروازہ کے سامنے توپ خانہ نصب کیا گیا اور فوج نے محلہ دربار میں محاصرہ کرنے کے بعد قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس میں شیخ حمید الدین عثمانی عرف مدو وغیرہ شہید ہوئے۔ ہر گھر کی تلاشی لی گئی اور عورتوں، بچوں، بوڑھوں، کو فرداً فرداً گھر سے نکالا گیا (۱)۔

مولانا رحمت اللہ صاحب پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے تحصیل شالی کو لٹوانے میں حصہ

لیا۔ (۲)

ان کے بھی وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ منجر نے اطلاع دی کہ مولانا صاحب دربار میں روپوش ہیں۔ اس وقت آپ دربار والی مسجد کے بالائی حصہ کی ایک کوٹھی میں جو جنوبی حصہ میں ہے تشریف فرما تھے۔ جب آپ کو فوج کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس حجرہ کی کھڑکی سے چھلانگ لگائی۔ مسجد میں آپ کے ساتھی موجود تھے، ان کیساتھ پنجیٹھ گاؤں میں پہنچے۔ یہاں بھی آپ کی تلاش کے لئے کثیر تعداد میں فوج پہنچ گئی اور اس نے چاروں طرف سے گاؤں کا محاصرہ کر لیا اور گاؤں کے ذمہ دار لوگوں سے کہا کہ مولانا رحمت اللہ کو ہمارے حوالے کر دو، ورنہ ہم تمہارا گاؤں جلا کر خاک کر دیں گے۔ گاؤں والوں نے انکار کیا کہ ”ہم مولانا کو جانتے نہیں اور نہ ہی وہ ہمارے گاؤں میں ہیں۔ گاؤں کی تلاشی لی گئی۔ مگر مولانا کا ان کو پتہ نہ چلا اور نہ وہاں سے دستیاب ہوئے۔ پنجیٹھ کے مکھیا نے جب گاؤں میں فوج دیکھی تو اس نے مولانا کو مشورہ دیا کہ کھرپالے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں۔ انگریزی فوج اسی کھیت میں پگڈنڈی سے گزری حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب فرمایا کرتے تھے۔ میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں اور میں ان کو اپنے پاس سے گزرتا ہوا دیکھتا تھا۔ جب مولانا رحمت اللہ صاحب گاؤں سے گرفتار نہیں ہوئے تو انگریزی فوج نے گاؤں کے حسب ذیل چودہ اشخاص کو گرفتار کیا۔ الہی داد صاحب، شہداد، علی بخش، نعمت، نہار، بہار، کرم علی، بھوپ، چتر، کریم الدین، شہید الدین عرف سہی، وہدارہ، صندل، محمد تقی۔

جب مولانا رحمت اللہ صاحب کو ان چودہ آدمیوں کی گرفتاری کا علم ہوا تو آپ نے چودھری عظیم الدین صاحب سے فرمایا، ان چودہ آدمیوں کو اور ان کے رشتہ داروں کو میری

وجہ سے تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دوں، تاکہ ان لوگوں کی تکلیف اور پریشانی دور ہو جائے اور یہ چودہ آدمی رہا ہو جائیں۔ چودھری حاجی عظیم صاحب نے جواب میں کہا مولوی صاحب یہ تو چودہ آدمی ہیں، اگر پورا گاؤں بھی گرفتار ہو جائے گا اور ان کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا تو ایسے وقت بھی آپ کو فوج کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ ان چودہ آدمیوں کی رہائی کے بارے میں مولانا رحمت اللہ صاحب پیشگوئی فرما چکے تھے کہ چھ مہینے کے بعد یہ لوگ فلاں تارخ کو رہا ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہ لوگ چھ مہینے گزرنے کے بعد اسی تارخ کو رہا ہوئے۔

جب تنے دن مولانا رحمت اللہ صاحب اس گاؤں میں رہے وہ گاؤں والوں کو وعظ و نصیحت اور تلقین کرتے رہے اور ان کے عقائد و خیالات کو بھی درست کیا۔ اس گاؤں کی میتیں پہلے گاؤں سے دور کیرانہ میں دفن کی جاتی تھیں۔ یہ لوگ گاؤں میں میتوں کو دفن کرنا برا سمجھتے تھے۔ آپ نے ان لوگوں کو سمجھایا اور گاؤں میں میتوں کو دفنانے کی تلقین کی تو اس وقت سے گاؤں کی میتوں کے دفنانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ انہی یام میں مولانا رحمت اللہ صاحب نے چودھری عظیم سے فرمایا ”اب میں ہندوستان میں نہیں رہوں گا۔ تمہارا مجھ پر ہی نہیں بلکہ تمام قوم پر احسان ہے، میری طبیعت چاہتی ہے کہ میں دو کنوئیں تمہارے نام کر دوں“ چودھری صاحب نے کہا مولوی صاحب مجھ کو اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دیا ہے، اگر میں آپ سے اپنے نام دو کنوئیں کرالوں گا تو خدائے تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا کہ قوم کی آزادی کے لئے بھی لالچ میں پھنس گیا۔ چودھری عظیم نے اپنے گاؤں میں مولانا رحمت اللہ صاحب کو ایک روایت کے مطابق چھ سات روز اور دوسری روایت کے مطابق ایک مہینے تک پوشیدہ رکھا، اس گاؤں کے قریب جنگل ہی جنگل تھے۔ دن میں اکثر مولانا جنگل میں چلے جاتے تھے اور رات کو گاؤں میں رہتے تھے۔ چودھری حاجی عظیم صاحب اس پریشان کن زمانے میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے ہمراہ رہے اور جب تک مولانا کو انہوں نے جہاز پر سوار نہیں کرا دیا اس وقت تک ان سے علیحدہ نہیں ہوئے (۱)

عجیب اتفاق کی بات ہے کہ چودھری عظیم صاحب کے خلاف اس جنگ آزادی کی شرکت کے سلسلہ میں انگریزوں کو کوئی اطلاع نہیں پہنچی۔ اس لئے ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا

گیا۔ چودھری عظیم ایک نیک دل اور خدا ترس زمیندار تھے۔ پنجیٹھ کی مسجد انہوں نے ہی بنوائی تھی۔ چودھری عظیم صاحب مسلمان گوجر تھے جن کے اجداد غالباً حضرت نظام الدین کے زمانہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ چنانچہ کیرانہ میں شاہ نجم الدین صاحب خلیفہ حضرت نظام الدین کا مزار ہے۔ چودھری عظیم صاحب مولانا رحمت اللہ صاحب کی ہجرت کرنے کے ایک یا دو سال بعد حج بیت اللہ کے لئے گئے اور مکہ میں مولانا رحمت اللہ صاحب کے ہاں مقیم ہوئے۔ انہوں نے ایک سال تک چودھری حاجی عظیم صاحب کو وہیں رکھا اور آنے نہیں دیا اور بڑی تکریم و عزت کے ساتھ دو حج کرنے کے بعد حاجی عظیم صاحب کو ہندوستان روانہ کیا۔ پنجیٹھ میں ان کا انتقال ہوا وہ اپنے خاندانی قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ ان کی قبر کی چار دیواری پختہ تھی لیکن اب شکستہ حالت میں ہے۔

چودھری عظیم صاحب کے والد کا نام بارہ اور ان کے بھائی کا نام باقر تھا۔ عظیم صاحب کے تین بیٹے نعمت، نورنگ، تقی تھے۔ نورنگ اور تقی لا ولد فوت ہوئے نعمت کے دو صاحبزادے رحمت اور فتح ہوئے۔ فتح کے دو لڑکے شہباز عرف باچہ دوسرے شمیرا ہوئے۔ شہباز اور شمیرا حیات ہیں، شہباز کی عمر اسی سال کی ہے اور شمیرا کی عمر ساٹھ سال ہے۔ (۱)

شہباز کے تین لڑکے مکھن، علی نواز اور محمد ہوئے، محمد کے ایک صاحبزادے بشیر الدین اور بشیر الدین کے دو لڑکے صافہ اور سادہ ہوئے۔

شمیرا کے دو لڑکے علی جنگ دوسرے کلاء ہوئے۔ علی جنگ کے تین فرزند لیاقت، نواب اور اصغر ہوئے۔ کلاء کے تین لڑکے حسن، عباس اور جمشید علی ہوئے۔ باقر صاحب کے اولاد کے نام نہیں معلوم ہو سکے۔ پنجیٹھ گاؤں میں تقریباً چھ سو کے قریب مسلمان رہتے ہیں جن میں چودھری عظیم صاحب کی ہی اولاد چار سو کے قریب ہے۔ (۲)

جب مولانا رحمت اللہ صاحب کو انگریزی فوج گرفتار نہ کر سکی تو ان پر مقدمہ چلایا گیا اور مفروضہ باغی قرار دے کر گرفتاری کے لئے ایک ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا۔ اس پر آشوب دور میں جبکہ علماء ہند کا ممتاز اور باوقار طبقہ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب جیسے مجاہد ہجرت فرما رہے تھے۔ انہی ایام میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب بھی اپنا نام مصلح الدین

(۱) کتاب ”آثار رحمت کے وقت زندہ تھے، اب علم نہیں۔ ارشد

(۲) فرنگیوں کا جال ص ۲۳۴۔

رکھ کر دہلی سے روانہ ہوئے اور جے پور، جودھپور کے مہیب اور خطرناک جنگلوں کو پیادہ پاٹے کرتے ہوئے سورت پہنچے۔ سورت سے حج کیلئے روانہ ہوئے، اس وقت جہاز کا سفر آسان نہ تھا۔ بادبانی جہاز چلا کرتے تھے سورت سے جدہ تک تین مہینے میں بحری سفر طے ہوتا تھا اور سال بھر میں صرف ایک جہاز ہوا کی موافقت کے زمانہ میں سورت سے چلتا اور اسی طرح جدہ سے آیا کرتا تھا۔ ایک خط کا محصول چار روپیہ تھا۔ جو لوگ ہجرت کے ارادہ سے ترک وطن کرتے تھے وہ دنیاوی تعلقات اور باہمی علاقہ زندگی کو دل سے نکال دیا کرتے تھے، یہ حقیقت ہے کہ ان ہی بزرگوں اور مجاہدین کا جگر تھا جو یہ سفر برداشت کرتے تھے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی روانگی اور فوجداری مقدمہ کے بعد آپ کی اور آپ کے چچا تایا شیخ امین الدین صاحب، شیخ ولی اللہ صاحب اور شیخ شکر اللہ صاحب کی جائیداد ضبط ہو کر نیلام ہوئی۔ خاص طور پر پانی پت میں کمال الدین مخبر کی شناخت پر جو جائیداد قرق کر کے نیلام کی گئی، وہ ڈپٹی کمشنر کرنال کے فیصلہ مورخہ ۳۰، جنوری ۱۸۶۲ء کے مطابق حسب ذیل تھی۔

(۱) سرائے کھجور، جس کی قیمت سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کرنال کے کاغذات میں پانچ سو روپے ہے۔

(۲) سرائے چوڑھے، جس کی قیمت سرکاری طور پر ڈپٹی کمشنر کرنال کے کاغذات

میں پانچ سو روپے ہے۔ (۳) سرائے شیخ فضل الہی

(۴) سرائے قصابان۔ (۵) سرائے لوہ آباد

(۶) سرائے مالیان یہ سب سرائیں اور وسیع قطعات زمین اور مکانات ایک ہزار چار سو بیس روپے میں نیلام ہوئے جن کی قیمت لاکھوں روپے کی تھی۔ مزروعہ علاقے اور زراعتی زمین اس سکنائی جائیداد کے علاوہ ہیں، جو بحق سرکار ضبط ہوئیں۔ مذکورہ بالا سرائیں جس قیمت پر نیلام ہوئیں وہ بھی ملاحظہ ہو۔

سرائے کھجور ۴۲ روپے، سرائے لوہ آباد ۵۱ روپے، سرائے چوڑھے ۵۶ روپے اور سرائے

قصابان ۱۴ روپے۔ کاغذات جائیداد نیلام شدہ انڈکس مشمولہ کا یہ عنوان ہے (۱)۔

”انڈکس مشمولہ مثل فوجداری مقدمہ عرضی کمال الدین ساکن کیرانہ حال پانی پت مولوی رحمت اللہ باغی“۔

رحمت اللہ بیت اللہ میں

ایک طویل اور آلام و مصائب سے بھرے سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے اللہ پہ شاکر توکل پر تکیہ کئے صبر کے مجسمے اور سر بکف مجاہد اسلام مرکز اسلام مکہ معظمہ میں پہنچے تاکہ اللہ رب العزت کے گھر کے زیر سایہ خدمت اسلام کی کوئی سبیل نکال سکیں۔ اس انقلابی جماعت کے اکثر افراد نے مکہ معظمہ کو اپنی آماجگاہ بنایا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکہ معظمہ پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ رباط داؤدیہ جو باب العمرہ کے متصل ہے۔ حجرہ میں سکونت پذیر تھے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب علی الصباح مکہ معظمہ پہنچے، طواف کرتے ہوئے حضرت حاجی صاحب سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ سعی میں بھی حضرت حاجی صاحب کے آپ شریک رہے۔ ان ہردوارکان سے فارغ ہونے کے بعد یہ دونوں حضرات رباط داؤدیہ میں آئے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سلطان عبدالعزیز کی خلافت کا دور تھا اور مسجد حرم میں سید احمد دحلان شیخ العلماء مرجع عوام اور ان کا حلقہ درس عام تھا اور امیر مکہ معظمہ شریف عبداللہ بن عون محمد تھے۔

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب اکثر حرم میں تشریف لے جاتے تھے اور سید احمد دحلان کے درس میں بھی شریک ہوتے تھے۔ سید صاحب چونکہ شافعی المذہب تھے۔ ایک روز دوران سبقت کسی مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے اپنے مذہب کی ترجیح کے ساتھ دلائل احناف کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی، درس کے اختتام پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب سید احمد دحلان سے پہلی مرتبہ ملے اور ایک طالب علم کی حیثیت سے اس مسئلہ کے متعلق اپنی تشفی چاہی۔ تھوڑی دیر کے تبادلہ خیالات کے بعد ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص طالب علم نہیں ہے۔ انہوں نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں۔ آپ نے مختصر طور پر اپنے حالات بتائے جس پر سید صاحب نے آپ کو دوسرے روز دعوت کے لئے اپنے گھر پر بلایا۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے ہمراہ سید صاحب کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب کا تعارف کر لیا اور جنگ آزادی

۱۸۵۷ء کے تمام واقعات اور خاص طور پر ردِ نصاریٰ کی جدوجہد اور مناظرہ اکبر آباد کے حالات بیان کئے۔ جن کو سن کر یہ بہت مسرور ہوئے اور حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب سے بہت دیر تک بغلگیر رہے۔ اسی ملاقات میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو انہوں نے مسجد حرم میں درس کی اجازت دی اور علماء مسجد حرم کے دفتر میں آپ کا نام درج کرایا۔ (۱)

پادری فنڈر ہندوستان سے ۱۸۵۸ء/۱۲۷۵ھ میں قسطنطنیہ پہنچا۔ سلطان عبدالعزیز صاحب کا عہد تھا۔ ترکی اور انگلستان کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ پادری فنڈر نے سلطان سے بیان کیا کہ ہندوستان میں میرا ایک مسلمان عالم سے مناظرہ ہوا تھا جس میں عیسائیت کی فتح اور اسلام کی شکست ہوئی تھی۔ علمائے اسلام لا جواب ہوئے جن کی وجہ سے مسلمان عیسائی دین قبول کر رہے ہیں۔ ان باتوں سے سلطان کو بڑی تشویش ہوئی ان کی خواہش ہوئی کہ پادری فنڈر کی باتوں کی اصلیت معلوم کی جائے۔ سلطان نے شریف مکہ کو فرمان جاری کیا کہ حج کے زمانہ میں ہندوستان سے جو علماء اور باخبر و معتبر اصحاب آئیں ان سے پادری فنڈر کے مناظرہ اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات معلوم کر کے ہم کو مطلع کیا جائے۔ امیر مکہ نے شیخ العلماء سید احمد دحلان سے فرمان کا ذکر کیا، انہوں نے بتایا کہ جس عالم سے پادری فنڈر کا مناظرہ ہوا ہے وہ عالم خود یہاں موجود ہیں۔ چنانچہ دوسرے دن شیخ الاسلام، مولانا رحمت اللہ صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر امیر مکہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس ملاقات کے بعد امیر مکہ نے فوراً بارگاہ شاہی میں مناظرہ اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات اور مولانا رحمت اللہ صاحب کی موجودگی کے بارے میں لکھ کر بھیج دیا۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب خاص اعزاز و اکرام کے ساتھ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں شاہی مہمان کی حیثیت سے روانہ ہوئے۔ جب وہاں پہنچے تو شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائے گئے۔ سلطان عبدالعزیز بکمال التفات شاہانہ روزانہ آپ کو بعد نماز عشاء شرف باریابی عطا فرماتے۔ اس مخصوص صحبت میں اکثر خیر الدین پاشا تونسوی صدر اعظم اور شیخ الاسلام وغیرہ اکابر سلطنت بھی شریک ہوتے تھے۔ جب پادری فنڈر کو مولانا رحمت اللہ صاحب کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ قسطنطنیہ سے چلا گیا۔ سلطان نے ان ملاقاتوں میں مناظرہ کے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پورے حالات نہایت دلچسپی کے ساتھ سنے اور مناظرہ

کے نتیجہ سے بہت خوش ہوئے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کی اس جلیل القدر دینی خدمت کی یہ قدر افزائی فرمائی کہ آپ کی واپسی کے وقت خلعت فاخرہ کے ساتھ تمنغہ مجیدی درجہ دوم اور گراں قدر وظیفہ کی امداد سے سرفراز فرمایا۔ (۱)

مولانا رحمت اللہ صاحب کی ملاقات کے بعد سلطان عبدالعزیز خان صاحب نے عیسائی مشنریوں کے فتنہ و فساد کو روکنے کیلئے سخت قدم اٹھائے جس کا ذکر پنجاب ریلیجس بک ڈپو سوسائٹی انارکلی لاہور کی مطبوعہ کتاب صلیب کے علمبردار مولفہ پادری برکت اللہ میں ہے ”قسطنطنیہ میں کتب مقدسہ اور دیگر مذہبی کتابیں اس جگہ فروخت کی جاتی تھیں۔ جہاں مقدس کرسمس نے کلیسائی ابتدائی صدیوں میں وعظ کی منادی کی تھی اور جو اب مسجد بنادی گئی تھی ایک روز یک لخت بغیر اطلاع سلطان ترکی کے حکم سے ترکی مسیحی قید کر دیئے گئے اور مسیحی کتب مقدسہ ضبط کی گئیں اور مسیحیوں کی عبادت گاہوں اور دکانوں پر جہاں ان کتب کی فروخت ہوتی تھی قفل لگا دیئے گئے۔ ترکی گورنمنٹ نے ذیل کے احکام صادر کر دیئے۔

”ترکی گورنمنٹ اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ اسلام پر کسی طرح کا حملہ بر سر بازار یا نجی کے طور پر کیا جائے وہ مشنریوں کو یا ان کے کارندوں کو اسلام کے خلاف منادی کرنے کی اجازت نہیں دیتی اور اس طرح کی ہر کوشش ترکی گورنمنٹ کی نظر میں قومی مذہب پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ وہ کسی مباحثہ کی کتاب کو بر سر بازار یا نجی طور پر تقسیم کرنے یا فروخت کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ برطانوی سفیر نے ان ذلت آمیز احکام پر رضامندی ظاہر کر دی گو بعد میں بصد مشکل دکانیں کھلوائی گئیں۔“ (۲)

اس کتاب ”صلیب کے علمبردار“ سے پادری فنڈر اور مولانا رحمت اللہ صاحب کا قسطنطنیہ میں مباحثہ کرانے کی تیاری کی تصدیق ہوئی ہے۔ پادری برکت اللہ لکھتا ہے ”قسطنطنیہ میں اس کی (پادری فنڈر) کی بیوی کی حالت نہایت خراب ہو گئی اور وہ ۱۸۶۵ء میں اپنے بیوی بچوں کو انگلستان چھوڑنے چلا گیا۔

۱۸۷۰ء میں جب فریج ملتان گیا تو وہاں کے ایک مولوی نے جو مولوی رحمت اللہ اور

ڈاکٹر وزیر خاں کا دوست تھا اسکو بتایا کہ جب قسطنطنیہ میں ڈاکٹر فنڈر کی وعظ کی منادی اور کتابوں کا شہرہ ہوا، تو سلطان نے مولوی رحمت اللہ کو بلوا بھیجا تا کہ ڈاکٹر فنڈر سے مباحثہ کرے لیکن مولوی رحمت اللہ کے دار الخلافہ میں پہنچنے سے پہلے ڈاکٹر فنڈر وفات پا چکا تھا“ (۲۲) مؤلف ”صلیب کے علمبردار“ کا یہ کہنا کہ مولانا رحمت اللہ صاحب قسطنطنیہ پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ اس سے قبل پادری فنڈر کا انتقال ہو گیا تھا۔ صحیح نہیں ہے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب ۱۸۶۴ء میں قسطنطنیہ پہنچے ہیں اور بقول مؤلف صلیب کے علمبردار پادری فنڈر نے ۱۸۶۵ء میں قسطنطنیہ چھوڑا اور انتقال یکم دسمبر ۱۸۶۵ء کو ہوا۔ گویا پورے ایک سال کا فرق ہے۔ سلطان عبدالعزیز صاحب کی خواہش اور خیر الدین پاشا کی تحریک پر رجب ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اظہار الحق مرتب کرنی شروع کی جو آخر ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ میں چھ ماہ کی قلیل مدت میں لکھ کر سلطان کی خدمت میں پیش کی اور اس کتاب میں سلطان کا ذکر کرنے کے بجائے حسب ذیل الفاظ میں شیخ العلماء سید احمد دحلان کا ذکر آپ نے فرمایا (۱)۔

”سیدی و سندی مولانا السید احمد بن زینی

دحلان ادام الله فيضه الى يوم القيام فامرني ان

اترجم باللسان العربي هذه المباحث الخمسة من

الكتب التي الفت في هذه الباب لانها كانت اما

بلسان الفرس واما بلسان مسلمي الهند“.

شیخ العلماء کے ذکر پر خیر الدین پاشا نے مولانا رحمت اللہ سے کہا کہ آپ نے امیر المومنین کی خواہش پر یہ کتاب تحریر کی ہے، مگر اس کے مقدمہ میں آپ نے شیخ العلماء کا ذکر کیا ہے حالانکہ ان کی جگہ پر امیر المومنین سلطان عبدالعزیز کا نام آنا چاہئے تھا۔ مولانا نے بلا تکلف اور بلا جھجک یہ جواب دیا۔ ”اس خالص مذہبی خدمت میں کسی دنیاوی غرض و مقصد کا کوئی شائبہ نہ آنا چاہئے۔ اس کے علاوہ مکہ معظمہ میں خود شیخ العلماء مجھ سے ان حالات کے قلمبند کرنے کی خواہش کر چکے تھے اور میں نے ابتدائی مواد کی ترتیب کا کام بھی شروع کر دیا تھا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا اصل سبب شیخ العلماء ہیں کسی وجہ سے اگر وہ مجھے

امیر مکہ تک نہ پہنچاتے تو میری رسائی یہاں تک نہ ہوتی اور اس خدمت کا موقع نہ ملتا“ (۱) مولانا صاحب کی اس صاف گوئی اور قدر شناسی کا خیر الدین پاشا پر بہت اچھا اثر ہوا اور یہ دلائل سن کر قائل ہو گیا۔ قیام قسطنطنیہ کے زمانہ میں اکثر علماء و فضلاء اور مختلف الخیال و مختلف العقائد و مذاہب کے لوگ شاہی مہمان خانہ میں اکٹھے ہوتے تھے جن سے مولانا رحمت اللہ صاحب کا مذہبی و سیاسی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ یورپ کی سائنسی معلومات و تعلیم کے اثرات یہاں تک بھی پہنچ چکے تھے۔ اسی کی روشنی میں آپ نے بعثت و نبوت، حشر و نشر، نزول وحی وغیرہ امور کو عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے اور ”تنبیہات“ کے نام سے ان امور پر ایک رسالہ لکھا جس کی تالیف ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۵ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی اور یہ رسالہ خیر الدین پاشا تونسوی صدر اعظم کے حکم سے چھپا تھا۔ یہ رسالہ مصری عربی اظہار الحق جلد اول کے صفحہ ۲۱۷ سے ۳۵۰ تک اور جلد دوم کے صفحہ اول سے صفحہ ۳۴ کے حاشیہ میں شائع ہوا۔ جسکی تنبیہ اول کی وضاحت آپ نے فرمائی!

”وهذا الرسالة مشتملة على اثني عشر تنبيهاً (وسميتها بالتنبيهاً) وما توفيقى الا بالله عليه توكلت واليه انيب (التنبیه الاول) في اثبات الاحتياج الى البعثة و النبوة على رأى المحققين من الفلاسفة قد ثبت بالضرورة ان نوع الانسان يحتاج الى المصالح الضرورية الكثيرة التى لا بقاء له بدونها مثل الغذاء و اللباس و المسكن والآلات وغيرها“ (۲۲۱)

مولانا رحمت اللہ صاحب نے مسجد حرم میں قسطنطنیہ سے واپس آنے کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے مولانا صاحب نے معقول سے طلبہ کو واقفیت کرائی اور علی الخصوص ریاضی میں علم ہیئت کا درس جاری کیا جو حجاز کی تعلیم میں غیر معروف تھا۔ مستقل طور پر صرف کا علم درس میں داخل نہیں تھا۔ بلکہ نحو کے ساتھ صرف کی ابتدائی معلومات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مولانا صاحب نے صرف کی تعلیم کو نحو سے علیحدہ کیا۔ اسی کے ساتھ یہاں آپ نے درس و تدریس کے طریقے اور مقامی اہم ضرورتوں پر کافی غور کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ یہاں ایسے مدرسہ کی بنیاد رکھی جائے جو مرکز اسلام مکہ

معظمہ کی شان کے مطابق ہو۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے جاننے والے علماء ان کے مدرس ہوں اور ایسا نصاب تعلیم رائج کیا جائے جو دینی اور دنیاوی ضروریات کا کفیل ہوتا ہو۔ اگرچہ حکومت عثمانیہ ان حرم کے علماء و فضلاء کی حوصلہ افزائی میں لاکھوں روپے صرف کر رہی تھی جو مسجد حرم میں درس دے رہے تھے مگر ان میں جو نقائص پائے جاتے تھے وہ یہ تھے۔

(۱) علماء اپنے درس کو کسی نظام اور کام کو ضابطہ کے تحت انجام نہیں دے رہے تھے۔

(۲) کوئی مخصوص نصاب تعلیم رائج و مقرر نہیں تھا اور جو کچھ پڑھایا جاتا تھا وہ طلبہ میں

کسی قسم کی قابلیت و استعداد پیدا نہیں کر سکتا تھا۔

(۳) طریقہ تعلیم نہایت ابتر و خراب حالت میں تھا اور سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ

کتاب کی عبارت کو خود استاد پڑھتا اور خود ان کے مطالب بیان کرتا تھا۔ شاگرد

اس کو استاد کا ایک وعظ سمجھتے اور ذہن و دماغ سے کام نہیں لیتے تھے۔ استاد سے

کسی مسئلہ کو سمجھنے یا کسی شبہ کو دور کرنے کو معیوب سمجھا جاتا تھا اور اس کو بے ادبی

تصور کیا جاتا تھا۔

(۴) جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی ان میں تفسیر و حدیث، فقہ اور نحو پر تمام عمر صرف

ہونے کے باوجود قابلیت و لیاقت کا فقدان رہتا تھا۔ ہندوستان میں تفسیر جلالین

جو سال بھر میں پڑھائی جاتی ہے وہاں اس کی مدت سات سال تھی۔ دیگر علوم

و فنون کے حصول کا کوئی رجحان یا شوق بالکل نہیں تھا۔

(۵) مہاجرین کی اولاد کا جو ممالک اسلامیہ سے ہجرت کر کے آتے تھے، کسی قسم کی تعلیم

و تربیت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ان کی اولاد جہالت کا شکار بنتی تھی نہ وہ دنیا کے کسی

کام کے تھے اور نہ دین کے۔

(۶) ہر سال اسلامی دنیا کے دور دراز مقامات سے بڑی تعداد میں متلاشیانِ علوم مکہ

معظمہ کو سرچشمہ دین سمجھ کر علوم دینیہ کے حصول کے شوق میں آتے تھے کہ

اس سرچشمہ سے سیراب و فیضیاب ہوں۔ مگر یہاں اس زمانہ میں ایسے لوگوں

کے لئے کوئی بندوبست نہیں تھا، نہ قیام و طعام کا انتظام تھا، نہ درس و تدریس

کے لئے کوئی سبیل تھی۔ (۱)

ان تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد مولانا رحمت اللہ صاحب نے حضرت عبد اللہ ابن عباس رَضِيَ اللہ عَنْہ کی مٹی ہوئی درس گاہ کے زمین حرم پر پھر احیاء کا ارادہ کیا اور مہاجرین کی اولاد اور اہل عرب کے بچوں کو تعلیم دینے اور دستکاری سکھانے کے لئے ایک صنعتی اسکول کے قیام کا خاکہ اپنے ذہن میں رکھاتا کہ یہ لوگ ابتدائی تعلیم پانے کے بعد بھکاری نہ بنیں اور افلاس و تنگدستی کی پریشانیوں کا شکار نہ ہوں۔ اس اہم ضرورت کی طرف مولانا صاحب نے مکہ معظمہ کے ہندوستانی مہاجرین اور مخیر حضرات کی توجہ مبذول کرائی۔ اس سلسلے میں متعدد نشستیں بھی ہوئی اور یہ طے پایا کہ جناب نواب فیض احمد خاں صاحب رئیس ضلع علی گڑھ جو مکہ معظمہ کے ہندوستانی مہاجرین میں مان اعتبار سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے سکونتی مکان میں مدرسہ کھولا جائے۔ جس کو ہندوستانی مہاجرین کے با اثر اور معزز لوگوں کی حمایت حاصل ہو۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں اس مدرسہ کو قائم کرنے اور تعلیمی کاموں کو چلانے کے لئے پہلی اپیل یہ کی گئی:-

”حمد و نعت کے بعد یہ عرض ہے کہ اکثر ہندیوں اہل توفیق کی ہمت سے حرمین شریفین زاد ہما اللہ شرفاً میں بعضے بعضے خیر کے کام جیسے رباطین اور سبیلین تیار ہو گئیں ہیں پر اب تک کوئی مدرسہ ان کی طرف سے یہاں نہیں ہے۔ حالانکہ اور کاموں سے یہ کام بھی بڑا خیر کا کام ہے۔ اس لئے یہ عرض ہے کہ جو اس امر میں شریک ہوں وہ اپنا نام مع اس رقم کے جو انہیں ماہانہ دینا منظور ہو لکھ دیں، اور تھوڑے بہت کا خیال نہ کریں کہ تھوڑا تھوڑا اکٹھا ہو کے بہت ہو جاتا ہے اور اس مدرسہ کی تدریس اور خرچ کے فوائد ان لوگوں کی رائے سے مقرر ہوں گے جو اس امر کے لئے بمشورہ مقرر کئے جائیں گے۔“

فقط المرقوم یکم ماہ رمضان ۱۲۹۰ھ

حرم شریف میں مولانا کے تلامذہ

مسجد حرم میں مولانا کے حلقہ مدرس مرجع خواص و عوام بنا، مسجد حرم میں تدریس کے زمانہ میں اور مدرسہ صولتبیہ کے ابتدائی عہد میں جن اصحاب کو حضرت مولانا رحمت اللہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا، ان کی فہرست تو کافی طویل ہے لیکن چند ممتاز علماء کے نام حسب ذیل

درج کئے جاتے ہیں۔

- ۱۔ شریف حسین بن علی سابق امیر مکہ و بانی حکومت ہاشمیہ
- ۲۔ شیخ احمد عبداللہ مرداد۔ شیخ الائمہ والخطباء مسجد حرم
- ۳۔ عبدالرحمن سراج مفتی احناف و شیخ العلماء مکہ معظمہ
- ۴۔ عبدالرحمن حسن عجیمی
- ۵۔ عبداللہ العمری مدرس مسجد حرم
- ۶۔ حسن عبدالقدیر طیب۔ مدرس مسجد حرم
- ۷۔ اسعد احمد دہاں۔ قاضی مکہ معظمہ
- ۸۔ امین محمد مرداد۔ نائب قاضی مکہ
- ۹۔ عبدالرحمن دہاں۔ مدرس مسجد حرم و صدر مدرس مدرسہ صولتہ
- ۱۰۔ حسن کاظم۔ مدرس مسجد حرم
- ۱۱۔ مولوی عبدالستار دہلوی۔ مدرس مسجد حرم
- ۱۲۔ شیخ عبداللہ احمد ابوالخیر قاضی مکہ و مدرس مسجد حرم
- ۱۳۔ عبدالحمید بخش فلکی
- ۱۴۔ سید حسن دحلان، مدرس مسجد حرم
- ۱۵۔ شیخ عبدالرحمن۔ شیبی کلید بردار خانہ کعبہ
- ۱۶۔ محمد حسین خیاط۔ بانی مدرسہ خیریہ مکہ معظمہ
- ۱۷۔ عابد حسین مالکی۔ مفتی مالکیہ مکہ معظمہ
- ۱۸۔ احمد نجار مرحوم، قاضی طائف
- ۱۹۔ شیخ محمد حامد مرحوم، قاضی جدہ
- ۲۰۔ محمد سعید باصیل، مدرس مسجد حرم
- ۲۱۔ مولانا بدرالاسلام، مدرس مدرسہ صولتہ و مہتمم کتب خانہ حمیدیہ قصر یلدز قسطنطنیہ
- ۲۲۔ شیخ عبداللہ زوادی مرحوم مفتی شافعیہ، مکہ مکرمہ
- ۲۳۔ حسب اللہ مرحوم، مدرس مسجد حرم
- ۲۴۔ محمد علی زین العابدین مرحوم، مدرس مسجد حرم

- ۲۵۔ صالح کمال مرحوم، مدرس مکہ معظمہ
- ۲۶۔ محمد علی کمال مرحوم، مدرس مکہ معظمہ
- ۲۷۔ درویش نجفی مرحوم مدرس مکہ معظمہ
- ۲۸۔ بکر رفیع مرحوم مدرس مکہ معظمہ
- ۲۹۔ مولوی نذیر احمد صاحب بنگالی، مہاجر مکہ معظمہ
- ۳۰۔ مولوی عبدالرحمن صاحب، مہاجر مکہ معظمہ
- ۳۱۔ مولوی ضیاء الدین بن عبد الوہاب صاحب مرحوم
مہتمم مدرسہ باقیات الصالحات مدراس
- ۳۲۔ مولانا قاری عبداللہ صاحب صدر مدرس شعبہ تجوید قرآن، مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ
- ۳۳۔ شیخ القراء مولانا قاری عبدالرحمن صاحب الہ آبادی
- ۳۴۔ مولانا عبداللہ قاضی صاحب مرحوم مورخ مکہ معظمہ
و مہتمم کتب خانہ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ
- ۳۵۔ حکیم محمد اسماعیل نواب صاحب مرحوم، مکہ معظمہ کے مشہور طبیب و عالم
- ۳۶۔ مولانا محمد سعید صاحب مرحوم، سابق ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ
- ۳۷۔ عبداللہ سراج مرحوم، مفتی احناف و قاضی القضاۃ و وزیر اعظم حکومت ہاشمیہ (حجاز)
- ۳۸۔ سلیمان حسب اللہ مرحوم، مدرس مسجد حرم
- ۳۹۔ مولوی عبدالحق اسلام آبادی، بانی مدرسہ اسلامیہ دار الفائزین مکہ معظمہ
- ۴۰۔ شیخ محمد صالح مبینی مرحوم، مورخ مکہ و از مقررین شریف عدن امیر مکہ۔

مکہ میں ردِ نصاریٰ کی تعلیم

ابتداءً زندگی سے مولانا رحمت اللہ صاحب نے ردِ نصاریٰ کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ زندگی بھر جاری رہا۔ چنانچہ آپ نے مکہ معظمہ میں ہجرت کرنے کے بعد یہی سلسلہ جاری رکھا جس کا ذکر میرے والد ماجد مولوی شرف الحق صاحب صدیقی نے اپنے حج کے سفر نامہ میں کیا ہے۔ یہ حج انہوں نے ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء میں کیا تھا۔

”حاجی امداد اللہ صاحب نے حافظ عبداللہ سے فرمایا مولوی شرف الحق

کو مولوی رحمت اللہ کے یہاں پہنچا دو، ان کے ہمراہ مولوی صاحب کے مدرسہ میں پہنچا۔ مولانا ایک چھوٹے سے تہ خانہ میں بیٹھے تھے۔ پہلے سلام کیا خط دیا۔ مولانا نے پڑھوایا بہت مہربانی اور شفقت سے پیش آئے اور خط سن کر فرمایا کہ تم اپنا اسباب یہاں لے آؤ۔ میں نے عرض کیا کہ میرے ہمراہ اور لوگ ہیں غرض کھانا اس روز مولانا صاحب کے ہمراہ کھایا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کے ہاں بھی لوگ حافظ عبد اللہ صاحب کی معرفت امانتیں رکھتے ہیں، مولانا کی بصارت جاچکی ہے اس وجہ سے یہ کام سے معذور ہیں۔ کتب ردِ نصاریٰ ہندوستان سے بڑی تعداد میں ان کے پاس پہنچتی ہیں۔ مولانا محمد علی مونگیری کی دو کتابیں میرے سامنے آپ کے پاس آئی تھیں۔ مولانا رحمت اللہ صاحب مغفور کتب ردِ نصاریٰ کے بہت شائق تھے۔ مجھ سے ان کتب کے بعض مقامات مولانا نے سنے تھے، مولوی دین خاں صاحب اور حاجی احسان اللہ نے ”ازالتہ الاوہام“ شروع کر رکھی تھی وہ تہ خانہ میں پڑھائی جاتی تھی۔ اظہار الحق بھی مولانا کے ہاں ہوتی تھی۔ اکثر واقعہ آگرہ کے مناظرہ کے خوب وضاحت اور تفصیل سے فرماتے تھے، اور مولانا صاحب اپنے پوتے کو بھی سبق دیتے تھے۔ ان صاحبزادے کا نام سعید ہے، نام کا بھی سعید ہے بلکہ افعال سے بھی سعید ہے۔ اپنے ماں باپ کا ایک لڑکا ہے۔ مشن کے مدرسہ انبالہ میں پڑھتا تھا مولانا کے بھائی کا بیٹا ہے۔ مولانا نے مشن کے اثرِ نصرانیت کی تعلیم سے بچانے کیلئے ہند سے حجاز بلا لیا ہے، محنتی اور نیک بخت ہے خدا اس کی عمر میں برکت عطا فرمائے کتب ”اظہار الحق“ اور ”ازالتہ الاوہام“ کا سبق مولانا کے ہاں صبح و شام ہوتا تھا۔ علمی گفتگو ہوتی تھی۔ ان کے کلام سے مستفید ہوتا تھا۔ مسلمانوں کی بہبودی اور بہتری کی باتیں ہوتی تھیں مولانا صاحب اب بھی کتب ردِ نصاریٰ کے مشتاق ہیں۔ اگر ان کی بصارت پھر آجائے وہ اب بھی ایک کتاب جامع لکھنے کو تیار ہیں۔

قسطِ ظنیہ کا دوسرا سفر

عثمان نوری پاشا دولت عثمانیہ کی طرف سے ۱۸۸۲/۱۲۹۹ھ میں حجاز کے گورنر مقرر ہوئے

چونکہ یہ فوجی آدمی تھے دورانِ دلش زیادہ نہیں تھے۔ اس لئے بعض مفسدین اور فتنہ انگیز لوگوں نے ان کو مدرسہ صولتیہ سے بدظن کر دیا تھا، اور وہ اس مدرسہ کے قیام کو غیر ملکی تحریک سمجھ کر مخالفت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس مخالفت کی خبر قسطنطنیہ تک پہنچی اور طرفین کے اختلافات کے واقعات سلطان عبدالحامد یحیٰی کے دربار تک پہنچائے گئے جو مولانا صاحب کے دوسرے سفر قسطنطنیہ کے باعث بنے، جس کی بناء پر نوری پاشا کی منشاء کے خلاف مولانا صاحب کی سلطان کی طرف سے طلبی کا حکم ملا۔ اس سفر کے ابتدائی حالات حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے یہ تحریر کئے تھے:-

”۲۰، ربیع الاول ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء ہفتہ کے دن مغرب کے وقت مکہ معظمہ سے جدہ کو روانہ ہوئے، آٹھویں کے آگٹ میں چلنے کی تجویز موقوف رہی پھر بابو جہاز مصری میں ۱۵، ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ بروز بدھ کو سوار ہوئے اور اس نے جمعرات کے روز صبح کے وقت لنگر اٹھلایا۔ پیر کی رات کو ۵ بجے سویز پہنچے اور صبح کو جو پیر کا دن اور ۲۰، ربیع الثانی کی تاریخ تھی بابو جہاز سے اترے، اور محمد علی دیدی صاحب کے مکان پر اترے وہاں سے منگل کے دن ۲۱، تاریخ اسکندریہ کو ریل پر گئے، تین بجے اسکندریہ پہنچے۔ سعد اللہ بے کے مکان پر اترے ۲۹، تاریخ ربیع الثانی جمعرات کے دن تک وہاں رہے۔ پھر آٹھویں دن جو بدھ کا دن اور ۳۰، ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ تھی بابو مصری پر سوار ہو کے روانہ استنبول ہوئے، از میر سے جو ہفتہ کا دن اور تاریخ ۳، جمادی الاول کی تھی تاریخ برقی جناب نسیم بے اور جناب شریف عبد اللہ اور جناب خیر الدین پاشا کے نام عصر کے وقت روانہ کئے اور جمادی الاول کی پانچویں پیر کے دن استنبول میں پہنچے ادھر جہاز نے لنگر ڈالا۔ اس وقت فی الفور مصطفیٰ ذہبی بے یاور (اے، ڈی، سی) اور بیس باشی حضرت سلطان کے جہاز پر چڑھے اور مل کے کہا کہ حضرت سلطان نے بہت بہت سلام فرمایا ہے اور کشتی خاص اپنی بھیجی ہے چلئے، وہاں سے چل کر سرائے (محل) قصر شاہی سلطانی تک جو بنائے سلطانی مرحوم عبد المجید خاں غازی کے ہے آئے وہاں کشتی سے اتر کر دو گھوڑوں کی بگی میں سوار ہو کے محل سرائے سلطانی میں آئے اور محل سرائے کے ایک کمرہ

میں اترے اس روز ملاقات کو جناب کمال پاشا اور جناب عثمان بے اور جناب علی بے اور جناب نسیم بے تینوں قرناء (مشیروں) حضرت سلطانی کے ہیں اور جناب سید احمد اسعد مدنی جو مصاحب حضرت سلطان ہیں دن کو اور رات کو نصرت پاشا آئے، اور اگلے دن منگل کو جناب عثمان پاشا غازی آئے اور بدھ کو ساتویں تاریخ جناب شیخ حمزہ ظافر اور جناب سید احمد اسعد مدنی اور جناب کمال پاشا آئے اور رات کو جناب علی بے قرنا درجہ دوم نے حضرت سلطان کی طرف سے مزاج پرسی کر کے کلمات عواطف شاہانہ پہنچائے۔

آٹھویں تاریخ جمعرات کے روز شیخ محمد ظافر صاحب تشریف لائے اور جمعہ کو جناب حسنی پاشا داماد سلطان عبد المجید مرحوم اور جناب صفوی پاشا اور جناب اسماعیل حقی اور جناب سید فضل پاشا آئے اور اسی دن مغرب کے وقت خلعت سلطانی میرے اور بدر الاسلام (حضرت کے بھتیجے) اور مولوی حضرت نور (صدر مدرس مدرسہ صولتیہ) کے لئے آئے اور ہفتہ کے دن دسویں تاریخ کو جناب درویش پاشا اور جناب شریف عبد اللہ پاشا اور جناب سید احمد اسعد اور جناب اسحاق آفندی اور جناب ناظر اوقاف (وزیر اوقاف) تشریف لائے اور عصر کے وقت نشان (تمغہ) مجیدی درجہ چہارم کا حضرت سلطان کی طرف سے آیا اور بارہویں تاریخ اتوار کے دن رضا پاشا باش کاتب (چیف سکریٹری سلطان) مغرب کے بعد آئے اور بارہویں تاریخ پیر کے دن مغرب کے بعد بحکم سلطانی جناب شیخ الاسلام احمد اسعد عریانی زادہ کی ملاقات کو جانا ہوا۔ بہت تعظیم سے پیش آئے اور فرمایا کہ حضرت سلطان نے فرمان بھیجا ہے کہ اچھی تعظیم کرنا کہ اب تک ایسا مہمان عزیز میرے پاس نہیں آیا ہے سو اس کے موافق مجھے ضروری ہے کہ تعظیم کروں، اور ۱۳، تاریخ منگل کے ”دن سندروس“ محکمہ شیخ الاسلام سے حاصل ہوئی۔ ۱۱، تاریخ جمعرات کے دن مکان علیحدہ میں آئے عصر کے وقت ۱۷، تاریخ ہفتہ کے دن وہی بے نے حضرت سلطان کی طرف سے حکم پہنچایا کہ ”مرضی حضرت سلطانی یہ ہے کہ تم اپنے اہل و عیال کو بلوالو، موسم ربیع قریب آ پہنچا اب عرصہ تک آب و ہوائے استنبول بہت اچھی رہے گی۔“ نرمی سے اس امر میں عذر کیا گیا پیر کے دن دوسری تاریخ جب کے ۱۳۰۱ھ حضرت سلطان کے جیب خاص سے پانچ ہزار قرش صاغ (تقریباً پانچ ہزار روپیہ) عطا فرمائے۔ منگل

کے دن کیسہ مفتاح کعبہ اور ایک تسبیح عقیقہ لحر کی اور ایک تسبیح سنگ مقصود کی بھجوائی گئی، اور فرمایا کہ اسکے شکریہ میں میں نے تم کو رتبہ پایہ حرین شریفین کا عطا کیا اس کا لباس بھی پہنچے گا، اور چھٹی تاریخ رجب جمعرات کے دن کو عصر کے بعد سرائے سلطانی (محل) کو جانا ہوا۔ مغرب کے بعد ملاقات ہوئی۔ غایت عنایت شاہانہ سے پیش آئے۔ مسند سے اٹھ کے ایک دو قدم بڑھ کر ہاتھ میرا قوت سے اپنے ہاتھ میں پکڑ کے فرمایا کہ ”کثرت شغل کے سبب اب تک میں نے ملاقات نہیں کی تھی اور تاخیر کا سبب اس کے سوا دوسرا نہیں“ پھر ہم بیٹھ گئے۔ جب میں اٹھا اور سامنے آیا (ترکی آداب شاہی کے مطابق) پھر دوبار اکمال خوشی سے اٹھ کے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کے کہا کہ تمہارا حال سننے کا میں مشتاق تھا اسی لئے میں نے تم کو بلایا ہے اور فرصت میں میں اور ملاقات اچھی طرح کروں گا، اور کچھ دیر تک باتیں کروں گا۔ دونوں بار میں نے بھی دعا اور کلمات شکریہ اور مناسبہ کہے۔ ۱۱، رجب ۱۳۰۱ھ کو مولوی حضرت نور روانہ مکہ معظمہ ہوئے اور ۱۲، رجب روز پنجشنبہ کو فرمان سلطانی ”پایہ حرین شریفین کے عطا کی بابت حضرت سلطان نے بھجولیا، اور ۱۴، رجب دوشنبہ کو شیخ الاسلام کی ملاقات کو گیا۔ مثل اول کے تعظیم و محبت سے پیش آئے۔“

قسطنطنیہ کے قیام کے دوران حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو سلطان عبدالحمید خاں نے متعدد بار شرف باریابی بخشا اور مختلف مسائل و واقعات پر گفتگو کی۔ سلطان نے مدرسہ صولتیہ کو امداد دینے کا خیال ظاہر فرمایا۔ لیکن آپ نے اس کو قبول نہیں کیا۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کے پاس سلطان سے الوداع ہونے کے وقت دوسرے دن مصطفیٰ وہبی بے یاور، اور خیر الدین پاشا اور نسیم بے اور سید احمد اسعد مدنی یہ چاروں اشخاص تشریف لائے اور سلطان کی جانب سے ایک مرصع تلوار مولانا صاحب کو بطور ہدیہ دی اور سلطان عبدالحمید خاں نے آپ کے بارے میں جو الفاظ کہے تھے وہ دہرائے۔ ”ہتھیار ہر مجاہد فی سبیل اللہ کی زینت ہے۔“

جب مولانا صاحب قسطنطنیہ سے مکہ معظمہ پہنچے تو وہی عثمان پاشا جو مخالفت میں پیش پیش تھے سب سے پہلے مولانا صاحب سے بغلگیر ہوئے اور اپنی غلطی پر نادم ہوئے اور معافی مانگی۔

مسجد مدرسہ صولتیہ کی تعمیر

۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء میں عثمان نوری پاشا گورنر کے عہد میں، صحن حرم میں بیرزمزم کے سامنے باب النبی ﷺ کے محاذ میں ایک خوبصورت عمارت میں سلطانی کتب خانہ تھا، جو لیا م جج میں حجاج کی تکلیف اور اقامت نماز میں پریشانی کا باعث بنتا تھا۔ عثمان نوری پاشا نے وزارت اوقاف استنبول کی توجہ ان پریشانیوں کی طرف دلائی اور بتایا کہ اگر کتب خانہ سلطانی کی عمارت یہاں سے ہٹادی جائے گی تو زائرین کعبہ کی سہولت کا باعث ہوگی۔ وزارت اوقاف نے یہ مسئلہ سلطان عبدالحمید خان صاحب کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے اس کو منظور کر لیا، کتابیں کثیر تعداد میں ایک دوسری ملحقہ عمارت میں منتقل کر دی گئیں اور کتب خانہ کی عمارت کو منہدم کر دیا گیا۔

کتب خانہ کے ملبے کے متعلق جب حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے سنا کہ یہ ملبہ بیع ہوگا تو بے چین ہو گئے کہ جو ملبہ کئی سو سال تک جو رکعبہ اور صحن حرم میں رہا ہو، اس کو لوگ خرید کر اپنے سکونتی مکان میں لگائیں گے۔ مولانا فوراً عثمان نوری پاشا کے پاس پہنچے اور ملبہ کے متعلق انہوں نے اپنے خیال کا اظہار کیا، نوری پاشا نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا، اور معلوم کیا کس مصرف میں لایا جائے گا۔ مولانا نے فرمایا اس ملبہ سے مدرسہ صولتیہ سے ملحق ایک مسجد بنوادی جائے گی جہاں مدرسہ کے طلباء نماز ادا کیا کریں گے اس تجویز کو نہ صرف نوری پاشا نے بلکہ افسران ترکی نے بھی پسند کیا۔ ملبہ کی قیمت کے تعین پر رد و کد ہوئی۔ جس پر گورنر نے کہا کہ میں وزارت اوقاف کو لکھتا ہوں مجھے امید ہے کہ وہ آپ کو اس کار خیر کے لئے یہ ملبہ مفت دیدے گی۔

مولانا رحمت اللہ صاحب جانتے تھے کہ وزارت کے محکمہ میں جو معاملات جاتے ہیں ان کے طے ہونے میں بہت دیر لگتی ہے، اس عرصہ میں یہ ملبہ صحن حرم سے نکل کر باب ابراہیم کے سامنے شارع عام پر ڈالا جائے گا اور اس کی بڑی بے حرمتی ہوگی۔ اس لئے مولانا صاحب نے فرمایا کہ میں اس ملبہ کا ڈیڑھ ہزار ریال دیتا ہوں۔ گورنر نے بخوشی منظور کر لیا۔ مولانا صاحب مدرسہ میں واپس آئے۔ مدرسہ کے خازن سے پوچھا کہ مدرسہ کے خزانہ میں کتنی رقم ہے اس نے بتایا کہ پندرہ سو سے زیادہ ریال نہیں ہیں۔ آپ نے فوراً وہ رقم گورنر کو روانہ کر دی

اور کتب خانہ کا تمام ملبہ مدرسہ میں لا کر ڈالا جانے لگا۔ مدرسہ کے اساتذہ اور طلباء میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ مہینہ ختم ہونے والا ہے مدرسین کو تنخواہ کہاں سے ادا کی جائے گی اور جو ضروری کام ہیں وہ بغیر پیسے کے کیسے پایہ تکمیل کو پہنچیں گے، طلبہ کے وظیفے کیسے دیئے جائیں گے۔ مخالفین نے سنا تو بہت خوش ہوئے کہ اب مدرسہ میں خلفشار پیدا ہو گا۔ تیسرا دن گزرنے بھی نہ پایا تھا، کہ ایک میمن تاجر اسی زمانہ میں مکہ معظمہ میں آیا ہوا تھا، اس نے جب یہ سنا کہ مولانا صاحب مسجد تعمیر کرنے کے لئے حرم شریف کا ملبہ اٹھوا کر لے گئے ہیں تو وہ آپ کی خدمت میں آیا اور دس ہزار ریال ان الفاظوں کے ساتھ پیش کئے ”آپ نے بڑا کام کیا، خدا قبول فرمائے۔“

مولانا رحمت اللہ صاحب کے رگ وریشے میں ہندوستانیت سمائی ہوئی تھی اسلامی ممالک مثلاً حجاز، بیت المقدس، فلسطین، بغداد، اور کربلا وغیرہ میں مسجدوں میں صوفیہ کی تقلید میں ایک گنبد بنایا جاتا ہے اور ہندوستانی مساجد میں کثرت کیساتھ تین گنبد بنوائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فیصلہ کیا کہ اس مسجد میں بھی تین گنبد بنوائے جائیں گے، مگر گنبد کا بنانا آسان کام نہیں تھا، اور خاص طور پر ہندوستان کی وضع قطع کے گنبد ہندوستانی معماروں کے علاوہ کوئی اور معمار نہیں بنا سکتا تھا۔ چنانچہ مسجد کی تعمیر کا کام جاری تھا، کہ اسی سال حج میں پانی پت کے دو معمار حج کرنے کیلئے آئے، اتفاقہ طور سے مولانا صاحب نے تین گنبدوں کے بنانے کا خیال کا اظہار کیا۔ وہ فوراً تیار ہو گئے۔ چنانچہ خود مولانا صاحب، مدرسہ کے اساتذہ، مدرسہ کے طلبہ اور مہاجرین حرم اینٹ، پتھر، گارہ ذوق شوق اور ولولہ کے ساتھ اٹھا کر ان معماروں کو دینے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس متبرک ملبہ سے مدرسہ صولتیہ کی مسجد ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۷ء میں تیار ہو گئی۔

اسی زمانہ میں ہرات کے ایک بزرگ مکہ معظمہ میں حج کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے، مولانا رحمت اللہ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی، مدرسہ کی مسجد کا ذکر سن کر مسجد میں آئے نماز پڑھی اور نماز پڑھنے کے بعد ایک طالب علم سے قلم دوات اور کاغذ کا ایک پرزہ لے کر قلم برداشتہ فی البدیہہ مسجد کی تاریخ کا قطعہ لکھا جو آج بھی بطور یادگار مسجد کی محراب پر نمایاں اور جلی حروف میں کندہ ہے۔

بسکہ خوش منظر است ایس مسجد
گشت تاریخ، ۱۳۰۴ھ خانہ رحمت
مارائی العین مثلہ الثانی
رحمت اللہ قل علی البانی

قسطنطنیہ کا تیسرا سفر

قسطنطنیہ کے دوسرے سفر کی واپسی کے بعد مولانا صاحب کا اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ خیر الدین پاشا، علی بے، اور شیخ الاسلام وغیرہ اور مقربین سلطان سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور بعض کاموں کیلئے اکثر براہ راست سلطان المعظم سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی، اور ضعیف العمری میں موتیابند کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے آپ مجبور ہو گئے تھے۔ آنکھوں کی اس خرابی کی اطلاع جب سلطان عبدالحمید خان صاحب کو پہنچی تو انہوں نے مولانا صاحب کو فوراً قسطنطنیہ طلب کیا۔ ایسی حالت میں اتنا طویل سفر ان کیلئے انتہائی پریشان کن تھا۔ لیکن اس خیال سے کہ آنکھوں کا صحیح علاج ہو جائے گا، آپ اس سفر کیلئے تیار ہو گئے، آپ کے ہمراہ مولوی عبداللہ عرف عبداللہ جی آپ کے شاگرد و خادم تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس سفر کے ابتدائی حالات قلمبند کئے تھے جو حسب ذیل ہیں:-

”پورٹ سعید میں روز شنبہ ۲، شعبان ۱۲۸۷ھ / ۱۳۰۴ھ استنبول کو دو تار روانہ کئے ایک بنام میاں بدرالاسلام صاحب کے اور ایک بنام علی بے کے، اور اس تار میں ایک جی عثمانی الادو فرنگ خرچ ہوئے، اور اسی روز شنبہ بعد عصر آگبوٹ پورٹ سعید سے روانہ ہوا، اور چہار شنبہ کی رات کو چاند رمضان شریف کا نظر آیا اور روز چہار شنبہ پہلی رمضان المبارک بحساب ہماری روایت کے صبح کے وقت تین بجے چناق قلعه میں پہنچے۔ اور وہاں کمندار (فوجی افسر اعلیٰ) تمام قلعوں چناق قلعه کا آگبوٹ پر آیا اور مولوی صاحب سے ملا اور کہا سر اے (محل شاہی) سے حکم آیا کہ مولوی رحمت اللہ صاحب چناق قلعه میں پہنچے یا نہیں۔ اس سے اطلاع دو تو میں اس بات کے واسطے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بعد ایک ساعت کے پھر آگبوٹ چلا اور پنجشنبہ ۲، رمضان المبارک ۱۲۸۷ھ / ۱۳۰۴ھ استنبول میں پہنچے اور سر اے یلدر (قصریلدر) میں ”چادر کشک“ میں اترے اور بعد ایک ساعت کے جناب سید احمد اسعد مدنی تشریف لائے، اور کہا کہ حضرت سلطان آپ کو بلاتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک آغا (خواجہ) آیا تو جناب مولوی صاحب حضرت سلطان کے پاس

تشریف لے گئے۔ حضرت سلطان بڑی تعظیم سے پیش آئے، اور بعد دو ساعت کے پھر جناب مولوی صاحب خست لے کر مکان (چادر کشک) میں تشریف لائے اور کہا کہ حضرت سلطان بلاتے ہیں، تو مولوی صاحب تشریف لے گئے اور وہیں افطار کیا اور تراویح بھی وہیں پڑھی حضرت سلطان نے اس وقت فرمایا کہ آنکھوں کے علاج کے واسطے کل میں ڈاکٹروں کو جمع کروں گا۔ پھر وہاں سے مولوی صاحب مکان پر تشریف لائے، اور روز جمعہ بعد عصر حضرت سلطان نے اپنے ایک مصاحب کے ساتھ پانچ ڈاکٹروں عمدہ کو بھیجا، انہوں نے آکے مولوی صاحب کی آنکھوں کو خوب تحقیق سے دیکھا اور کہا انشاء اللہ تعالیٰ آنکھیں اچھی ہو جاویں گی، پر علاج دو مہینہ کے بعد کریں گے، کیونکہ اب تک پانی آنکھوں میں کامل نہیں اترتا اور روز پنجشنبہ میں حاجی علی بے قرنائی ثانی بھی بعد ظہر تشریف لائے اور انہوں نے مولوی صاحب سے ملاقات کر کے مولوی بدرالاسلام سے کہا، کہ مولوی صاحب کے واسطے کپڑے بازار سے لے آویں اور جا کے کپڑے بازار سے خریدے اور لیتے آئے اور روز جمعہ بعد نماز جمعہ جامع حمیدیہ میں پڑھی اور روز شنبہ ۵، رمضان المبارک بعد ظہر جناب عبداللہ پاشا نجدی واسطے ملاقات جناب مولوی صاحب کے آئے اور روز دو شنبہ ۷، رمضان شیخ محمد طاہر مع اپنے بڑے بیٹے کے واسطے ملاقات کے تشریف لائے اور بعد اس کے اور چند بار حضرت سلطان نے بلایا اور ۱۵، رمضان روز سہ شنبہ زیارت چادر شریف میں جانے کے واسطے لگے عمدہ بھیجی اور سید احمد اسعد آفندی کو بسبب ضعف بصر کے ساتھ کیا، اور وہاں جائے زیارت میں اسحاق آفندی اور اکثر قضاة عسکر ملے اور ۳۰، رمضان المبارک کو جناب سید احمد اسعد کو حضرت سلطان نے مولوی صاحب کی خیرت دریافت کرنے کو بھیجا اور پہلی شوال روز چہار شنبہ کو ہوئی اور نماز عید کی جامع حمیدیہ میں پڑھی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو سلطان عبدالحمید خان اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے، ایک مرتبہ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا، لیکن مولانا صاحب نے موثر انداز میں یہ جواب دیا:-

”اعزاً اور اقارب کو چھوڑ کر ترک وطن کر کے خدا کی پناہ میں اسکے دروازہ پر آکر پڑا ہوں، وہی لاج رکھنے والا ہے آخری وقت میں امیر المومنین کے دروازے پر مروں تو قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤں گا۔“ مولانا رحمت اللہ صاحب قسطنطنیہ میں زیادہ دیر رہنا نہیں چاہتے تھے وہاں رہنا بہت شاق گزر رہا تھا۔ عمر کا آخری حصہ خدا کے گھر میں اور مدرسہ کی درس و تدریس میں گزارنا چاہتے تھے اس دور میں آپریشن کے نام سے لوگ لرز جاتے تھے۔ بہت ہیبت ناک سمجھا جاتا تھا، اس لئے مولانا صاحب باوجود تقاضوں کے شاہی اطبا سے آپریشن کرانے کیلئے تیار نہیں ہوئے، سلطان نے بھی جب یہ دیکھا کہ مولانا صاحب تیار نہیں ہیں تو خاموش ہو گئے۔ چنانچہ مولانا صاحب سلطان سے اجازت لے کر ذیقعدہ میں مکہ معظمہ میں تشریف لے آئے، اور وہاں آکر موتیابند کا آپریشن ایک مقامی معالج سے کرایا، جو کامیاب نہ ہوا۔“

مولانا رحمت اللہ صاحب کا انتقال

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی قوت بصارت ۱۸۸۸ء/ ۱۳۰۵ھ میں زائل ہو چکی تھی۔ اس وقت سے آپ بہت کمزور رہنے لگے تھے۔ مدرسہ صولتیہ کا کام بڑے انہماک کے ساتھ فرماتے تھے۔ ہر وقت اسی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ نہ دن دیکھتے اور نہ رات کی پرواہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ایک سال بیمار رہ کر ۷۵ سال کی عمر میں مکہ معظمہ میں ۲۲، رمضان المبارک ۱۸۹۱ء/ ۱۳۰۸ھ کو بروز جمعہ فوت ہوئے۔ آپ کے انتقال کی خبر ہندوستان کے ہر ایک اخبار میں چھپی۔ چنانچہ ہم شحنہ ہند میرٹھ ۲۴، جون ۱۸۹۱ء سے آپ کے فوت ہونے کی خبر نقل کرتے ہیں:-

”اپنیج کے نامہ نگار مکہ معظمہ نے لکھا ہے کہ مولوی رحمت اللہ صاحب مہاجر ہندی جو یہاں معزز مدرسین میں سے تھے ایک برس علیل رہ کر ۲۲، رمضان شریف بروز جمعہ کو انتقال کیا اور جنت المعلىٰ میں محمود پاشا کے قریب مدفون ہوئے۔“

مولانا رحمت اللہ صاحب کی خواہش تھی کہ وہ مدرسہ صولتیہ کے احاطہ میں دفن ہوں۔

چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے مدرسہ کے اسی مقام پر اپنی قبر بنوائی تھی۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو اعزاز اور مقربین نے آپ کی میت کو اسی قبر میں دفنانا چاہا لیکن حکام مانع ہوئے۔ چنانچہ اس واقعہ کا ذکر حضرت مولانا محمد سعید صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ نے مدرسہ کی روئیداد ۱۳۲۶ھ / ۱۹۱۹ء میں کیا ہے :-

”ہماری مشکلات کا اندازہ صرف ایک ادنیٰ بات سے ہو سکتا ہے کہ حکماً مجبور کیا گیا کہ کوئی سالانہ جلسہ یا اہل علم کا کوئی اجتماع مدرسہ میں نہ ہو سکے، اس قسم کے لغو اور بیکار احکامات اور سختیوں سے اس زمانہ کے حکام کا دلی منشاء اور مقصود یہ تھا کہ ارکان مدرسہ کی ہمتیں پست ہوں اور حامیان مدرسہ آخر مجبور ہو کر اپنی توجہ اس کام سے ہٹالیں، اور یہ بنا بنایا کام جو روز بروز ترقی پر کہے کسی طرح برباد ہو جائے۔ بانی مدرسہ مولانا رحمت اللہ کی تمنا اور آرزو تھی کہ وہ اس مستعار اور محدود زندگی سے جب ابدی حیات اور دائمی مستقر کی طرف سفر کریں تو ان کا مرقد مدرسہ کے احاطہ میں ہو۔ جس کو انہوں نے اپنی زندگی میں بڑے شوق سے خود تیار کر لیا تھا۔ آہ یہ خیال کس قدر درد انگیز ہے کہ مولانا کی دلی تمنا اور مدت العمر کی وہ دیرینہ آرزو دور سابق کے حکام کی بدولت ہمیشہ کے لئے پائمال ہو گئی اور مولانا اپنی بنائی قبر میں جو مدرسہ کے احاطہ میں خاص اسی دن کیلئے تیار کی تھی دفن نہ ہو سکے۔ جن مقامی حکام نے مولانا کو مدرسہ کے احاطہ میں دفن نہ ہونے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد اس محسن قوم اور خادم ملت کی قبر پریکٹروں وہ ہندوستانی جن کو مرحوم سے عقیدت اور خاص تعلق تھا۔ فاتحہ کی غرض سے آتے رہیں گے اور مرحوم کی اس علمی یادگار کو عظمت و محبت کے ساتھ دیکھنے کا ذریعہ یہ قبر بنے گا۔ اس مصلحت نے ان حاکموں کو مجبور کیا کہ وہ بغیر کسی وجہ اور قانونی حجت کے مرحوم کو مدرسہ میں دفن نہ ہونے دیں۔“ (ص ۵۴)

جس احاطہ میں مولوی رحمت اللہ صاحب دفن ہوئے اس میں حسب ذیل حضرات کی بھی قبور ہیں۔

۱۔ محمود پاشا ۲۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب ۳۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب

سوانح علمائے دیوبند ۱۔ ۴۴۶ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی

۴۔ نواب عبدالعلی خاں رئیس چھتاری بلند شہر ۵۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین الہ آبادی کے والد ماجد، ۶۔ مولانا عبدالحق صاحب شیخ الدلائل مصنف اکیلی شرح مدارک التنزیل، ۷۔ مولوی عزیز بخش صاحب بدایونی، ۸۔ مولانا حضرت نور صاحب صدر مدرس مدرسہ صولتیہ، ۹۔ مولوی عبد اللہ غازی صاحب سابق مہتمم کتب خانہ مدرسہ صولتیہ شاگرد مولانا رحمت اللہ صاحب، ۱۰۔ شیخ عبد الحکیم صاحب سابق خازن مدرسہ صولتیہ۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کی اہلیہ بروز دو شنبہ ۶، رجب ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۶ء میں فوت ہوئیں (۱)

مولانا رحمت اللہ صاحب کی پوری زندگی رد نصاریٰ، مذہب کی خدمت، اور خلق کے ساتھ ہمدردی میں گزری۔ صحیح بات کہنے سے آپ کبھی نہیں چوکے بلا جھجک کہی، مشورہ بھی کبھی غلط نہیں دیا اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت نیک کام کرائے۔

خانہ کعبہ کی مرمت میں شرکت

سلطان عبدالحمید کے عہد میں خانہ کعبہ اس وقت کھولا جاتا تھا جب اس میں مرمت کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلطان عبدالحمید کو معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ کے اندرونی حصہ میں مرمت کی ضرورت ہے، انہوں نے اس کام کے لئے چھ علماء کو منتخب کیا جن میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب بھی تھے۔ اس مرمت کے لئے انجینئروں نے مخصوص مسالہ بنایا تھا جو جلد خشک ہو جاتا تھا اور علماء کے لئے ایک خاص قسم کا عمامہ تیار کیا گیا جس کو پہن کر وہ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور اس کی درستگی کی۔

انگریزوں کو عدن میں جگہ نہ دینے کا مشورہ

سلطان عبدالحمید کے دور میں انگریزوں نے حکومت ترکی سے عدن میں جہازوں کے کوئلہ رکھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ مانگی تھی، جب مولانا صاحب کو اس بات کا علم ہوا تو آپ نے سلطان کو خط لکھا کہ بحری اعتبار سے عدن بڑی اہم جگہ ہے اگر آپ نے انگریزوں کو یہ جگہ دے دی تو بہت خطرناک ثابت ہوگی اور اس طرح پورے عدن پر انگریز قبضہ کر لے گا اور اس کا اثر دوسرے ممالک اسلامیہ پر بھی پڑے گا۔ اس مشورہ پر سلطان نے توجہ نہیں دی اور جگہ

دے دی جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ انگریز عدن پر قابض رہے اور عرب ممالک کے لئے پریشانی کا باعث بنے رہے۔

نہرز بیدہ کی مرمت میں حصہ

ملکہ بغداد خلیفہ ہارون رشید کی بیوی زبیدہ خاتون کا دائمی صدقہ جاریہ نہرز بیدہ کافی خراب و خستہ ہو گئی تھی۔ جس کی مرمت کی ضرورت پیش آئی۔ اسی زمانہ میں سیٹھ عبدالواحد صاحب عرف ”واحد سیٹھ“ مکہ معظمہ آئے ہوئے تھے، اس سلسلہ کی ایک مشاورتی مجلس مدرسہ صولتیہ میں منعقد ہوئی۔ سیٹھ عبدالواحد صاحب باہمت و مخیر دولت مند تھے۔ اس مجلس میں طے ہوا کہ نہرز بیدہ کی از سر نو اصلاح اور مرمت ہونی چاہئے، چنانچہ مرمت کرانے اور حکومت سے اجازت لینے کیلئے ایک بورڈ قائم کیا گیا۔ جس میں مہاجرین مکہ معظمہ کے ہر طبقہ سے نمائندے لئے گئے اور اس کی صدارت کیلئے مولانا رحمت اللہ صاحب کا نام تجویز ہوا مگر آپ نے اپنے شاگرد رشید مولانا شیخ عبدالرحمن سراج مفتی احناف شیخ العلماء مکہ معظمہ کو اس بورڈ کا صدر مقرر کیا اور خود نائب صدر کی حیثیت سے اس کام کی ذمہ داری لی۔ سیٹھ عبدالواحد نہرز بیدہ کے خزانچی اور تجویدار مقرر ہوئے اور یہ صدقہ جاریہ ان بزرگوں کی کوششوں سے دوبارہ جاری ہو گیا۔ (۱)

حجاز کے حکام کے خلاف وزیراعظم کو خط

مولانا رحمت اللہ صاحب کے زمانہ میں حجاز پر ترکی حکومت کا قبضہ تھا۔ یہاں کے حکام کی بدعنوانیوں کو دیکھ کر مولانا نے وزیراعظم ترکی کو ایک خط لکھا تھا کہ ان کی غفلت شعاری کی وجہ سے یہاں کی آراضی سے جو پیداوار ہونی چاہئے تھی وہ نہیں ہو رہی ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں مدینہ منورہ کی آراضی کا غلہ باشندگان مدینہ منورہ کی ضروریات پوری کرنے کے بعد شام و فارس کے لشکروں کے پاس بھیجا جاتا تھا، لیکن اب یہ حالت ہے کہ مدینہ منورہ کا غلہ مدینہ منورہ کیلئے پورا نہیں ہوتا۔ اس خط میں دوسرے مسائل کا بھی ذکر مولانا نے فرمایا ہے۔

(۱) ایک مجاہد معمار ص ۵۳۔

(نوٹ) اردن صاری میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے معرکہ الآراء کتابیں لکھیں اور مناظرہ کے میدان فتح کئے، ان کے ان قابل فخر کارناموں کی گونج آج تک علمی حلقوں اور اسلامی تاریخ میں پائی جاتی ہے اور مشاہیر علماء نے آپ کی کوششوں کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ”حیات شبلی“ کے مقدمہ میں مولانا سید سلیمان ندوی، مراءۃ الیقین میں مولانا سید محمد علی مونگیری اور مولانا الطاف حسین حالی وغیرہ متعدد علماء نے اپنی تحریروں میں آپ کی جدوجہد کو بھرپور سراہا ہے۔ (محمد عمران قاسمی)

مدرسہ صولتنبہ

۱۸۷۴ء/۱۲۹۰ھ میں حج بیت اللہ کیلئے کلکتہ کی ایک مخیر و باہمت اور خدا ترس خاتون صولت النساء بیگم اپنی صاحبزادی اور داماد کے ساتھ مکہ معظمہ آئیں۔ ہمدرد قوم اور نیک انسان کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ حرمین میں ایسا کام کر جائے جو صدقہ جاریہ کے طور پر قائم رہے۔ صولت النساء صاحبہ کا مکہ معظمہ میں ایک رباط (سرائے) تعمیر کرانے کا ارادہ تھا۔ ان کے داماد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے مسجد حرم کے درس میں شرکت کرتے تھے۔ ایک روز آپ نے اپنی خوش دامن صاحبہ کے اس ارادہ کا ذکر کر کے مشورہ لیا۔ مولانا نے فرمایا۔ مکہ معظمہ میں رباطیں تو کافی ہیں۔ یہاں ایک مدرسہ کی سخت ضرورت ہے، کوئی مستقل مدرسہ نہیں ہے۔ صولت النساء صاحبہ دوسرے روز مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئیں، انہوں نے آپ کے مشورہ کو پسند کیا اور مدرسہ کے واسطے زمین خریدنے کے بارے میں گفتگو کی۔ اللہ تعالیٰ کو یہ عظیم کام ان سے لینا تھا۔ چنانچہ محلہ خندریہ میں زمین خریدی گئی اور مدرسہ کی تعمیر بھی شروع کر دی گئی۔ تعمیر کے دوران صولت النساء صاحبہ بھی ہوتی تھیں اور تعمیر کا کام دیکھ کر تشریف لے جاتی تھیں۔ اس مدرسہ کی زمین کی رجسٹری کی ابتدائی عبارت حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے یہ تحریر فرمائی تھی۔

”حمد و نعت کے بعد یہ ہے کہ اگرچہ مدرسہ ہندیہ حضرات اہل ہند کی ہمت اور توجہ سے مکہ معظمہ ادا م اللہ شرفہا میں ۱۲۹۰ء رمضان کے مہینے میں قائم ہوا تھا، پر اسباب چند در چند سے جو اس سنہ کے چار مہینوں میں کئی طرح سے ہرجا پیش آئے۔ سو اس لحاظ سے ہم ان چار مہینوں کو نظر سے گرا کے اس مدرسہ کے قیام کو محرم الحرام ۱۲۹۲ء گنتے ہیں اور سب امور متعلقہ اس مدرسہ کو اسی سال سے لیتے ہیں۔ اللہ! خیر سے ان امور کو انجام دیجو۔“

۱۸۷۴ء مطابق ۱۲۹۱ھ میں مدرسہ کی عمارت تعمیر ہوئی، مدرسہ کا نام صولت النساء صاحبہ

کے نام کی مناسبت سے رکھا گیا۔ اس اولین وسیع عمارت میں پانچ بڑے کمرے اور تین چھوٹے کمرے اور ایک وسیع صحن ہے۔ جب اس مدرسہ کی تکمیل ہو گئی، تو ۱۲ شعبان ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۵ء روز چہار شنبہ مدرسہ صولتیہ میں سب مدرسوں اور طالب علموں کو لایا گیا۔ یکم شعبان ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء سے نواب محمود علی خاں بہادر والی چھتاری نے سو روپیہ ماہوار اس مدرسہ کے لئے مقرر کئے۔ (ان دنوں دس بارہ روپے حج کا کرایہ تھا۔ ارشاد)

جو بھی کام شروع کیا جاتا ہے، اس میں ابتدا میں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ مولانا رحمت اللہ صاحب کے سامنے بھی پریشانیاں آئیں جن کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ایک پریشانی کا باعث غیر بنے اور دوسری پریشانی اپنوں نے پیدا کی جو یہ تھیں:-

(۱) انگریزی کونسل جدہ میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مولانا رحمت اللہ صاحب نے جس طرح ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کو پریشان کیا اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور اس جنگ میں وہ خود بھی شریک ہوئے۔ اسی طرح یہ مکہ معظمہ میں اپنی درس گاہ قائم کر کے انگریزوں کے خلاف پروپیگنڈہ کریں گے اور باغیانہ تحریک کی بنیاد ڈالیں گے۔

(۲) مقامی ترکی حکام کو یہ خطرہ تھا کہ مکہ معظمہ میں ہندوستانی ہاتھوں سے مدرسہ کا قیام کیا جا رہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مدرسہ آئندہ بیرونی اقتدار اور اغیار کی مداخلت کا کسی وقت بھی ذریعہ بن جائے۔ ترکوں کی یہ بدگمانی کسی حد تک صحیح تھی کیونکہ ان کو غیر ملکی مشنریوں کی تکلیف دہ حرکتوں کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ ان دقتوں کے باوجود مولانا رحمت اللہ صاحب کے ارادہ میں کمزوری نہیں آئی۔ انہوں نے بڑی ہمت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور مدرسہ کا کام جاری رکھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا شک و شبہات کے بادل چھٹ گئے اور مدرسہ صولتیہ کا راستہ ہموار ہوتا چلا گیا۔ جب مدرسہ صولتیہ کی تعمیر ہو گئی تھی اس وقت تک مکہ معظمہ میں نہر زبیدہ تیار نہیں ہوئی تھی اور پانی کی بڑی قلت تھی۔ مکانات میں بارش کا پانی جمع کرنے کے لئے یہ انتظام کیا جاتا تھا کہ چشموں کو پختہ بنوا کر تہ خانوں اور سردابوں کی طرح زمین دوز درجے بنوا لیتے تھے، تاکہ بارش کا تمام پانی چھتوں سے جمع ہو کر آتا رہے۔ پانی کا مخزن مدرسہ میں تیار نہیں ہوا تھا۔ جس کے لئے صولت النساء بیگم سے کہا گیا تھا۔ ان کے جانے کے دن قریب آگئے تھے۔ چنانچہ جب ایک روز ان کے جانے کا رہ گیا اور وہ دوسرے روز جانے

کا ارادہ کر رہی تھیں تو اسی شب کو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کو جنت الفردوس میں عالیشان مکان ملا ہے مگر اس میں کوئی حمام یا جگہ پانی رکھنے کے لئے نہیں ہے۔ صبح کو بیگم صاحبہ نے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو بلایا اور مدرسہ میں پانی کا مخزن بنانے کے لئے روپیہ دیا اور انہوں نے تاحیات مدرسہ کیلئے پچاس روپیہ ماہانہ مقرر کئے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کے سامنے مسلمانوں کے مذہبی حالات کا پورا نقشہ تھا وہ مسلمانوں کو اختلافات کی گندگی سے نکالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مدرسہ صولتیہ کو اختلافات کا اکھاڑہ بنانے سے باز رکھا اور اس کے لئے یہ مسلک اختیار کیا۔

(۱) قطعی طور پر سیاست اور سیاسی دلچسپیوں سے ہر کارکن و مدرس و طالب علم کو بے تعلق رہنا ضروری ہے۔

(۲) اختلافی امور اور مختلف فیہ مسائل سے کلی طور پر احتراز کیا جائے۔

(۳) تفریق اور گروہ بندی سے ہر طرح بچنا چاہئے۔

چنانچہ ان ہدایات پر مدرسہ صولتیہ کے مہتمموں نے پورے طور پر عمل کیا، اور ان کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ پچاس سال کے بعد مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ حجاز پہنچے اور مدرسہ صولتیہ کا معائنہ کیا، اس کی پچاس سالہ زندگی کا جائزہ لیا، تو آپ نے اس کی پالیسی کے بارے میں تحریر فرمایا۔ ”مدرسہ کی خوش نصیبی اور مولانا مرحوم کی نیک نیتی کا ایک عمدہ ثمرہ یہ ہے کہ اس کے تمام مدرسین اور طلباء اس وقت کی آفتوں سے علیحدہ ہیں ان کے خیالات میں نہ افراط و تفریط ہے اور نہ جدال و نزاع کا انہیں شوق ہے اور نہ کسی مسلمان کی تکفیر و تفسیق کا انہیں خیال ہے۔ الحمد للہ اس نازک اور فتنہ کے وقت میں اس بلا سے بچنا ہی خدا کا بڑا فضل ہے وہ اس مدرسہ پر ہے۔“

مولانا رحمت اللہ صاحب نے مدرسہ صولتیہ کے قائم کرنے کے بعد مدرسہ کے انتظامات کو چلانے کے لئے مہاجرین حرم میں سے با اثر اور اہل علم حضرات کی ایک منظمہ یا مشاورتی کمیٹی قائم کر لی تھی، یہ بات تو ظاہر ہے کہ جو لگن اور تعلق مولانا کو مدرسہ صولتیہ سے ہو سکتا تھا وہ اور ممبران کو نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی، جب مولانا نے مدرسہ کے کام کو چلانے کے لئے مشاورتی کمیٹی میٹنگ میں یہ تجویز رکھی، کہ پہلے معزز ارکان حصول قرض میں امداد فرمائیں، تو ان لوگوں نے بجائے مدد کرنے کے مدرسہ کو ایک درد سری سمجھ کر اور نہ چلنے والا

جان کر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور تحریری استغفے دے دیئے۔ اس نازک موقع پر ان لوگوں کی مدرسہ سے علیحدگی بڑی پریشان کن چیز تھی۔ لیکن اس کے باوجود مولانا نے تنہا اپنے کندھوں پر تمام ذمہ داری کا بار گراں اٹھایا اور زمانہ حیات میں مولانا صاحب نے مدرسہ کا انتظام خود ہی کیا، اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی ہی ذات مدرسہ کے قیام کا واحد ذریعہ تھی (۱)

مدرسہ صولتیہ کے سرپرست حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ، حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب رحمہ اللہ کے تقریباً ہر ایک اہم کام میں شریک رہے حتیٰ کہ بقول سید شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواری حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور حاجی امداد اللہ صاحب نے جب ہندوستان سے ہجرت کی ہے تو یہ تینوں حضرات ساتھ تھے اور ایک ہی جہاز میں حجاز پہنچے چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں۔ (۲)

”حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ نے غدر کے زمانہ میں انگریزوں سے جہاد کیا تھا مولوی رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر رحمہ اللہ بھی حضرت کے ساتھ تھے۔ ایک بڑی جماعت ان لوگوں کے ساتھ تھی، مگر شکست ہوئی اور یہ تینوں حضرات راجپوتانہ کے راستے فرار ہو کر بمبئی پہنچے اور وہاں سے بادبانی جہاز پر سوار ہو کر حجاز گئے۔“ چنانچہ حجاز پہنچنے کے بعد مولانا رحمت اللہ صاحب اور حاجی امداد اللہ صاحب ایک جان اور دو قالب تھے۔ مدرسہ صولتیہ کو ترقی دینے کے لئے یقیناً مولانا رحمت اللہ صاحب کا بہت بڑا ہاتھ تھا، اور وہ ہی اس کے بانی تھے، لیکن ان کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب کا دوسرا درجہ تھا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب ان سے مدرسہ کے ہر کام میں مشورہ لیتے تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب بھی مدرسہ کی کامیابی کے لئے کوشاں رہتے تھے، اور چاہتے تھے جو بھی ہندوستان سے آئے وہ اس مدرسہ میں داخل ہو، اور ہندوستان کے علمی طبقے سے بھی رجوع کرتے تھے کہ وہ بھی اس مدرسہ میں ہندوستان کے لوگوں کو تعلیم کے لئے روانہ کریں۔

چنانچہ حاجی امداد اللہ صاحب نے مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دارالعلوم دیوبند کو مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب کے انتقال کے بعد جبکہ دارالعلوم دیوبند قائم ہو چکا تھا مولانا محمد قاسم نانوتوی کے صاحبزادے مولوی احمد صاحب کے بارے میں ایک خط میں لکھا کہ ان کو مکہ معظمہ بھیج دو وہ مولانا رحمت اللہ صاحب کے مدرسہ میں تعلیم پائیں گے۔ خط کی عبارت ملاحظہ ہو:-

”از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ۔“

بخدمت بابرکت عزیزم مولوی رفیع الدین صاحب دام مجدہ معرفتہ باللہ تعالیٰ بعد سلام مسنون و دعائے خیر کے معلوم فرمادیں، خط تمہارا مورخہ یکم رجب عین انتظار میں پہنچا اور سب حال وہاں کا معلوم ہوا۔

حال واقعہ جانکاہ کا خطوط بمبئی اور بھوپال اور میرٹھ وغیرہ سے معلوم ہوا تھا۔ اس صدمہ نے فقیر کو ضعیفی میں بہت گرا دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

رضا بقضائندہ ہیں اس کے، جو چاہے کرے۔ ہم سب کو چاہئے جان و دل سے اس کی رضا پر رہیں ہمارے نفع نقصان کو وہ خوب جانتا ہے اس پر سوئپ کر اپنے کام میں مصروف رہیں۔ جس سے رضامندی اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ کی حاصل ہو۔ عزیز من جو تم میں بڑے سرپرست مدرسہ کے تھے وہ جنت الفردوس کو سدھارے اگرچہ میں چاہتا ہوں کہ تم سب صاحب بدل مدرسہ کی بہبودی میں مصروف ہوں گے۔ فقیر بھی تم کو لکھ کے داخل ثواب ہوتا ہے عزیز من! خصوصاً تم کو کہ مدرسہ کے مہتمم ہو چند امور کا لحاظ چاہئے اول تو مدرسہ کے کام میں کسی کی رورعایت نہ کرنی چاہئے بہ امانت و دیانت رہنا چاہئے اگر کسی کے ساتھ بے وجہ رعایت و مروت کرو گے کل کو جواب دینا ہوگا۔ دوسرے مدرسہ کا مال بیت المال ہے۔ اس سے قرض دام پیشگی مت دیا کرو۔ تم کو اس میں تصرف نہیں پہنچتا۔ تیسرے یوں تو سارے مدرس اور اہل مدرسہ فقیر کے عزیز اور پیارے ہیں مگر عزیزم مولوی محمد یعقوب صاحب کا چند وجوہ سے زیادہ واسطہ ہے، لہذا اگر وہ مدرسہ کے کسی کام میں کوتاہی کیا کریں تو ان سے بحیر کام لیا کرو۔ انشاء اللہ وہ اس سے ناراض نہ ہوں گے، کیونکہ دانا ہے، چوتھے عزیزم مرحوم کے جو شاگرد اور مرید ہیں اور دوست ہیں سب مدرسہ کی طرف توجہ رکھیں اور عزیزم رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عمدہ یادگاری مدرسہ ہے اس سے غفلت نہ کریں۔ پانچویں عزیزم مرحوم

کی اولاد کے ساتھ رعایت اور مروت رکھیں خصوصاً تعلیم علم اور تربیت امور خیر میں لحاظ رکھیں۔ فقیر چاہتا ہے کہ برخوردار احمد کو یعنی فرزند عزیز مرحوم کو اپنے پاس بلا کر رکھوں، اور یہاں مدرسہ میں مولانا مولوی رحمت اللہ کی خدمت میں تحصیل علم کرے اور جب تک فقیر جے اس سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھے، مگر اس کی والدہ شاید جدائی گوارا نہ رکھیں۔ فقیر کو اس کی خاطر بھی منظور ہے، اس واسطے اس امر میں سکوت کیا۔ بہر حال دعا پر اکتفا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو برائیوں اور تکلیفوں سے محفوظ رکھے اور علم نافع اور عمل صالح نصیب کرے آمین..... فقط از حافظ عبد اللہ و حافظ احمد حسین و مولوی رحمت اللہ، سلام مسنون۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کے انتقال کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب مدرسہ صولتیہ کے سرپرست بنے اس وقت بھی آپ نے مدرسہ کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ آپ کے زمانہ میں مدرسہ صولتیہ کی ایک شاخ تھی وہ کیا خدمت انجام دے رہی تھی اس کا ذکر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے ۱۲، رجب ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۳ء کے خط میں ہے جو آپ نے مولانا اشرف علی صاحب کو لکھا تھا (۱)

”اکثر احباب یہ دریافت فرماتے ہیں کہ عزیزم مولوی قاری احمد کی صاحب کا مدرسہ کس قسم کا ہے اس لئے واسطے اطلاع لوگوں کے یہ تحریر لکھی گئی۔ یہ مدرسہ..... جناب مولوی رحمت اللہ صاحب کی شاخ ہے۔ جناب مولانا مرحوم کی ہمت اور توجہ سے یہ مدرسہ قائم ہوا، اور اس کا اہتمام قاری حافظ احمد کی صاحب موصوف کے ذمہ ہوا۔ اس میں علوم دینیات پڑھائے جاتے ہیں۔ لیکن مدرسہ میں مولانا مرحوم کی زیادہ تر توجہ تجوید و حفظ قرآن کی طرف ہے کیونکہ علم تجوید کا رواج بہت کم ہو گیا خصوصاً ہندوستان میں بہت کم ہے ماشاء اللہ مدارس سے فائدہ عظیم ہوئے ہیں۔ ہندیوں کو اس فن میں عرب وغیرہ بہت حقیر سمجھتے تھے بلکہ بعض عرب ہندی علماء کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے مگر بفضلہ تعالیٰ ان مدارس کے ذریعہ سے بہترین کامل قاری ہو کر نکلے ہیں اور حریم شریفین میں بعض ہندی قاری تعلیم یافتہ ان مدرسوں کے اب استاد عرب میں ہیں۔ قاری حافظ احمد کی صاحب کا مدرسہ محلہ جیاد

میں ہے۔ پینسٹھ طلبہ بالفعل عرب ترک ہندی وغیرہ مختلف قوموں کے پڑھتے ہیں۔ حافظ صاحب نے اپنے حب ایمانی و تدین و تورع کی وجہ سے اس کا انتظام بہت عمدگی کے ساتھ کر رکھا ہے بالفعل اس میں ایک قاری اور ایک حافظ مقرر ہیں اور مولوی حافظ صاحب موصوف خود ایسی محنت و مستعدی سے دینیات و علم تجوید پڑھاتے ہیں جو کئی مدرس کے برابر ہے۔ ہر مسلمان پر مدد دین فرض ہے خصوصاً تعلیم قرآن مجید جو اصل دین اسلام ہے خاص کر مکہ معظمہ ایسا مقدس مقام ہے جو دین کا مرکز و ما من و ماوائے مسلمانان ہے، جہاں کی خیرات میں ایک لاکھ ثواب ہے اور مکہ معظمہ میں مدد علم دین کا تو کچھ حد و حساب ہی نہیں مسلمان آخرت ہی کے واسطے پیدا ہوئے ہیں۔ تھوڑا سا خرچ کر کے بحساب منافع آخرت اور زاد عقبی حاصل کریں۔ ”وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب“ از مکہ معظمہ حارۃ الباب۔ مکرریہ ہے کہ یہ مضمون آپ مہربانی فرما کر اخبار نور الانوار میں یا جس اخبار میں مناسب سمجھیں طبع کرادیں اور اس بارہ میں ایک مضمون آپ بھی اپنی طرف سے تحریر فرما کر درج کر دے ویں، کہ سب شریک حساب ہوں اور ممکن ہو تو ایک پرچہ مندرجہ مضمون فقیر کے پاس روانہ کر دے ویں۔“

مدرسہ صولتبیہ کے مہتمم مولوی محمد سعید صاحب

مولانا رحمت اللہ کے ہاں چونکہ کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے آپ نے اپنے بڑے بھائی مولانا حکیم علی اکبر صاحب کے پوتے مولانا محمد سعید صاحب کو وطن سے بلایا تھا۔ ان کے والد مولوی محمد صدیق صاحب انبالہ میں سرشتہ دار تھے اور مکان کے قریب ایک مشن اسکول تھا جس میں منشی نہال الدین صاحب فارسی پڑھاتے تھے۔ مولوی صدیق صاحب اور منشی نہال الدین کے گہرے تعلقات تھے۔ اسی بناء پر مولوی محمد صدیق صاحب نے اپنے صاحبزادے مولانا محمد سعید صاحب کو مشن اسکول میں داخل کر دیا تھا۔ اس کی اطلاع جب مولانا صاحب کو ملی تو آپ کو بہت افسوس ہوا، اور بڑی خفگی کے ساتھ لکھا کہ تم نے یہ کیا کیا ہے محمد سعید کو مشن اسکول سے نکال کر مکہ معظمہ فوراً روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد سعید صاحب بارہ

برس کی عمر میں مکہ معظمہ گئے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کی نگرانی میں ان کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ ضعف بصارت کے بعد تحریر کا کام اور خاص طور پر خطوط کے جوابات کا کام ان ہی کے ذمہ تھا بلکہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے فرمانے پر آپ مغرب و عشاء کے درمیان حاجی صاحب کے بھی خطوط گوش گزار کرتے اور ان کے جوابات بھی لکھتے تھے۔ چنانچہ مولوی محمد سعید صاحب ان دونوں بزرگوں کی صحبت کی وجہ سے کافی تجربہ کار ہو گئے تھے اور مولانا صاحب کے انتقال کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے برادر زادہ حافظ احمد حسین امین الحجاز کو مدرسہ کے حساب و کتاب اور مال کا نگران مقرر کیا گیا اور مولانا محمد سعید صاحب کو نظامت کی ذمہ داری دی گئی جس کو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا۔

مدرسہ کے دوسرے ناظم مولانا محمد سلیم صاحب

مولانا محمد سعید صاحب کی حیات میں ہی مولانا محمد سلیم صاحب مدرسہ کے نائب ناظم مقرر ہو گئے تھے یہ ذمہ داری انہوں نے اپنے والد ماجد مولانا محمد سعید صاحب کی وفات تک نبھائی۔ مولانا محمد سعید صاحب کا انتقال ۱۹۳۹ء / ۱۳۵۷ھ میں ہوا۔ اس کے بعد آپ کو ناظم مدرسہ مقرر کیا گیا۔ آپ نے دینی تعلیم کے ساتھ زراعت، صنعت اور بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری کیا جو بڑی کامیابی کے ساتھ چلا۔ ابھی ان نئے سلسلوں کو جاری ہوئے نو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ مدرسہ صولتیہ ایک عظیم پریشانی میں مبتلا ہو گیا ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا۔ تقسیم آبادی کے ساتھ تباہی و بربادی اور قتل غارتگری کی گرم بازاری ہوئی جس سے مدرسہ کے نظام میں بڑا فرق پڑا۔ آمدنی کی راہیں ختم ہونے لگیں۔ جس کا ذکر مولانا محمد سلیم صاحب نے مدرسہ کی ۱۳۶۸ھ کی ایک مختصر سی روئداد میں کیا ہے۔

”دارالعلوم حرم صولتیہ اپنی عمر کے ہر دور میں جن دشوار گزار مراحل سے گزرا ہے ان میں یہ آخری افتاد شاید سب سے زیادہ سخت اور بہت زیادہ صبر آزما ہے جسے دنیا کی تاریخ انقلاب ۱۹۴۷ء کے نام سے یاد رکھے گی، اس بر اعظم کی تقسیم کے ضمن میں لا تعداد انسانوں کی خونریزی، شہروں اور آبادیوں کی ویرانی، لاکھوں بے خانماں افراد کی تباہ حالی اور انسانی درندگی و بہیمیت کے ہوشربا واقعات نے نہ صرف وقتی طور پر عام سکون و دلجمعی کا خاتمہ کر دیا بلکہ

ما بعد کی صورت حال سے جو مشکلات پیدا ہوئیں اور ہر قدم پر دقتوں کا جو غیر
مختتم سلسلہ قائم ہے ان کی وجہ سے ہر شخص اپنے ماحول میں غیر مطمئن اور مستقبل
کی طرف سے پریشان نظر آ رہا ہے۔“

”دہلی کی بربادی کا تصور سب کے لئے اگر عام طور پر افسوسناک ہے تو
خصوصیت کے ساتھ دارالعلوم حرم کے ہر خادم و کارکن کے لئے صدر دفتر
دہلی کا چند لمحات کے اندر وحشیانہ غارتگری کی نذر ہونا ایک ایسا اندوہناک
حادثہ ہے جس کی یاد ہمیشہ زندہ رہے گی اور یہ المناک اثر مشکل سے اہل حرم
کے قلوب سے زائل ہو گا۔ صدر دفتر دہلی ملک کے طول و عرض میں مکہ
معظمہ کا ایک امدادی مرکز تھا جس کی غیر متوقع طور پر تباہی نے اس مرکزی
دارالعلوم کو موت و حیات کی کشاکش میں مبتلا کر دیا۔ ملک کے ہر گوشہ میں
دارالعلوم حرم صولتیہ کے مخلص معاونین اور سراپا خیر و برکت محسنین کی الحمد للہ
کمی نہیں، اس قیامت صغریٰ سے قبل ان میں سے ہر شخص اطمینان کے ساتھ
اپنی جگہ موجود تھا۔ مگر آج ہزاروں پرانے معاونین لاپتہ ہیں بہت سے محسن
ہمدردوں کی کوئی خبر نہیں۔ یہ دارالعلوم حرم کا وہ مایہ ناز سرمایہ تھا جس پر خدا کے
بعد تمام کارکنان و خادمان دارالعلوم حرم صولتیہ کو پورا اعتماد تھا۔ دائرہ معاونین
کا یہ وسیع حلقہ گردش زمانہ سے جس قدر محدود و مختصر ہو گیا۔ آج اسی قدر اہل
حرم کی مشکلات اور ذمہ داریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ افراد کے تعاون اور
شخصی امداد اور اعانت سے محرومی کا گلہ ہی نہیں بلکہ افسوس اس امر کا ہے کہ
صولتیہ ان مقررہ عطیات سے بھی محروم ہوتا جا رہا ہے جن کو بظاہر مستقل سمجھا
جاتا تھا۔ دولت آصفیہ حیدر آباد کن کی مقررہ ماہانہ امداد بند ہو چکی، اگرچہ سرکار
نظام کے خزانہ سے دارالعلوم کی کوئی بیش قدر امداد معین نہ تھی دو سو روپیہ ماہانہ
اور وقتاً فوقتاً دیگر عطیات کی بندش معنوی حیثیت سے پریشان کن ہے۔ بہار
کے بعد خزاں کا یہ دور مستقبل کے لحاظ سے یقیناً سب کے لئے ایک مستقل
اندیشہ کا باعث ہے۔“ تعلیم کے ساتھ خدمت خلق میں بھی کمی واقع نہیں
ہوئی۔ دارالعلوم حرم صولتیہ خدا کے گھر میں مسلمانان پاکستان و ہند کا ایک قومی

مشترک ادارہ اور مرکز ہے اس لئے حضرت مولانا رحمت اللہ مرحوم و مغفور بانی مدرسہ کے عہد سے آج تک وہ مکہ معظمہ میں مختلف صورتوں سے ابنائے ملک کی ہر ممکن خدمت کرنے، آرام و راحت اور سہولتیں پہنچانے اور مفید مشوروں سے رہنمائی کرتا رہا ہے۔ کارکنان دارالعلوم حرم صولتہ حسب ذیل خدمات کو اپنے لئے سعادت سمجھتا ہے جواب تک جاری ہیں۔“

(۱) ڈاک: اس طویل سفر میں ہر شخص اپنے اعزہ و احباب کی پرست خبر، خیریت کا منتظر رہتا ہے اپنی ڈاک اور خطوط قابل اطمینان صورت سے مکہ معظمہ میں حاصل کرنی چاہتا ہے۔ یہ کام کارکنان مدرسہ خود انجام دیتے ہیں، ٹکٹ لفافے دفتر سے ملتے ہیں اور اس دفتر ہی سے روزانہ ڈاک جنرل پوسٹ آفس میں روانہ کی جاتی ہے اور ڈاک مرکزی دفتر مدرسہ صولتہ مکہ معظمہ، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، مکہ معظمہ سعودی عربیہ، کے پتہ پر آتی ہے جہاں سے زائرین خود لے جاتے ہیں۔

(۲) امانت: اس غیر ملک میں روپیہ کی حفاظت اور اس کی طرف سے بے فکری ایک اہم چیز ہے۔ مکہ معظمہ میں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے رقم مرکزی دفتر مدرسہ میں محفوظ کر کے ناظم صاحب سے رسید امانت حاصل کی جاتی ہے اور دفتر کے اوقات میں جتنی رقم امانت میں سے لینی چاہے وہ بہ آسانی مل جاتی ہے۔

(۳) طبی خدمت: دوران قیام مکہ معظمہ میں اگر طبی امداد یا علاج کی ضرورت پیش آتی ہے تو مدرسہ صولتہ کا طبی مرکز (صولتہ دارالشفاء) زائرین کی خدمت کیلئے تیار رہتا ہے۔ یونانی، اور ہو میو پیتھک دوائیں بلا قیمت اور بغیر فیس و معاوضہ دارالشفاء کے اطباء کی خدمات حاضر رہتی ہیں، اور خاطر خواہ علاج ہوتا ہے۔

(۴) قیام کا انتظام: حج کی سالانہ تعطیل کے زمانہ میں مدرسہ صولتہ میں حجاج کرام کے قیام کیلئے وقف کر دیا جاتا ہے۔ معقول معاوضہ کے ساتھ قیام کا انتظام ہوتا ہے۔ مدرسہ کی تمام عمارتیں اس زمانہ میں خالی رہتی ہیں قبل از وقت مرکزی دفتر کو اگر مطلع کر دیا جاتا ہے تو عین وقت پر دقت نہیں ہوتی، حجاج کرام کا سامان محفوظ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ مدرسہ صولتہ حرم شریف کے قریب ہے، حرم شریف پہنچنے میں کم وقت لگتا ہے۔

(۵) مسائل حج: حجاج کرام کیلئے اصل میں پانچ روز ہی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ منی، عرفات، مزدلفہ، قربانی، شیطانوں کی کنگریاں مارنے کے ارکان و طریقے ان کے لئے جاننا انتہائی ضروری ہوتے ہیں۔ مدرسہ صولتیہ کی طرف سے ان چیزوں کی واقفیت کرانے کے لئے ایک چھوٹا پمفلٹ بعنوان ”حج کے پانچ روز“ تقسیم کیا جاتا ہے۔ جس سے ان لوگوں کو بڑا فائدہ ہوتا ہے اور غلطیوں سے کافی محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جو زائر مدرسہ صولتیہ میں مقیم ہوتا ہے اس کو مذکورہ سہولتوں کے علاوہ جو بھی ضرورت پیدا ہوتی ہے اس کا مفید مشورہ دیا جاتا ہے تکمیل کی سبیل نکالی جاتی ہے جس کیلئے مولوی محمد شمیم صاحب (۱) نائب ناظم مدرسہ صولتیہ ہر وقت مستعد و تیار رہتے ہیں (۲) حضرت مولانا رحمت اللہ کے عہد کے بعد بھی اس مرکزی درس گاہ سے فیض اور دینی خدمت کا سلسلہ جاری ہے آج سے ۹۲ سال قبل فن تجوید و قرأت پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی، اور اس بناء پر یہ قابل قدر فن برائے نام تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پاکستان و ہند کے طول و عرض میں جہاں کہیں فن تجوید کا سلسلہ اور قرأت سب سے کا چرچا دکھائی دیتا ہے۔ یقیناً بالوسطہ یا بلا واسطہ وہ مدرسہ صولتیہ کا فیض ہے۔ مدرسہ صولتیہ کے تعلیم یافتہ طلباء جنہوں نے ہندوستان (قدیم) میں تجوید و قرأت کی ترقی و تعلیم میں خاص حصہ لیا ان میں خصوصیت کے ساتھ ذیل کے قاری صاحبان قابل ذکر ہیں۔

- ۱ مولوی قاری محمد سلیمان صاحب مرحوم بھوپال
- ۲ قاری سید حسن صاحب دجلہ ضلع ریتک
- ۳ قاری عبد الرحمن صاحب مرحوم احیاء العلوم الہ آباد
- ۴ قاری عبد الخالق صاحب مدرسہ تجوید القرآن سہارنپور
- ۵ قاری ابراہیم رشید صاحب خطیب مکہ مسجد حیدر آباد
- ۶ قاری عبد الوحید خان صاحب مرحوم دارالعلوم دیوبند

(۱) مولانا محمد مسعود شمیم صاحب بہت فعال متحرک اور بااخلاق انسان تھے۔ مولانا محمد سلیم رحمہ اللہ کے بعد وہ مہتمم رہے لیکن ان کا انتقال ہو گیا ان کے تین صاحبزادے مولانا محمد شمیم، مولانا محمد زعیم اور مولانا محمد حلیم سلمہم اللہ ہیں۔ آج کل مولانا محمد شمیم مہتمم ہیں۔ (ارشاد)

- ۷ قاری عبد المالك صاحب مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ
 ۸ قاری فیض عالم صاحب گولڑا راولپنڈی
 ۹ قاری محمود یار صاحب بھوپال
 ۱۰ قاری مطیع اللہ صاحب ملتان
 ۱۱ قاری میران شاہ صاحب مرحوم معلم تجوید دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
 ۱۲ مولانا قاری ضیاء الدین صاحب مہتمم مدرسہ باقیات الصالحات مدراس
 ۱۳ قاری حمید الدین صاحب بانی مدرسہ تجوید سنہیل ضلع مراد آباد
 ۱۴ مولوی قاری سید مرتضیٰ حسینی صاحب بمبئی

۱۳۵۳ھ / ۱۹۲۵ء میں مشرقی جزائر (ملک جاوا سماترا) کے مسلمانوں میں علمی و تعلیمی ضرورت کا جو احساس پیدا ہوا تھا۔ یہ تمام فرزند ان مدرسہ صولتہ کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مدرسہ کے قدیم طلباء نے ملک جاوا کے مختلف مقامات میں پہنچ کر مسلمانان جاوا سماترا کے جمود و سکوت میں خاص حرکت اور جوش عمل پیدا کیا۔ جس کی بناء پر دینی اور دنیوی تعلیم کا بہترین انتظام ہوا۔ مدارس کے علاوہ کئی مفید اور کارآمد انجمنیں اور جماعتیں ملک بھر میں قائم ہوئیں۔ جاوا میں فرزند ان مدرسہ کی اس کثیر جماعت کے روح رواں اور ممتاز افراد حسب ذیل ہیں جن کی علمی اور عملی خدمات کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں (۱)

- ۱ شیخ محمود زیدی مشیر ریاست سلانگور
 ۲ شیخ راج عثمان مفتی شہر کلاغ
 ۳ شیخ عبد المجید مہتمم مدرسہ جوہرین شہر جمبی
 ۴ شیخ حسن یحییٰ، مہتمم مدرسہ نور الایمان شہر جمبی
 ۵ کما س عبد الصمد۔ بانی مدرسہ نور الایمان جمبی۔
 ۶ شیخ عبد المجید ابوالحسن مدرس اول مدرسہ نور الایمان جمبی
 ۷ شیخ عبد اللہ مغزلی، مہتمم مدرسہ اداریہ کوالہ شہر فیرا
 ۸ شیخ محمد علی منصور صدر مدرس مدرسہ اداریہ کوالہ فیرا
 ۹ شیخ ابو بکر مکرین۔ صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ فلمبان

- ۱۰ شیخ محمد مرزوقی مفتی فلمبان
- ۱۱ شیخ حامد قاری مہتمم مدرسہ عربیہ بنجر
- ۱۲ قاری علاؤ الدین بانی مدرسۃ التجوید شہر فیرا
- ۱۳ شیخ زین الدین اپنان مدرس مدرسۃ العلم اپنان
- ۱۴ شیخ عبدالغنی موارے۔ بانی مدرسہ عربیہ شہر موار
- ۱۵ شیخ عبدالرشیدین محمد طیب مہتمم مدرسہ فولو
- ۱۶ شیخ محمود میدان شیخ عبدالخلیم خطیب بانیال مدرسہ عربیہ قدح

سعودی عرب میں مدرسہ صولتیہ ہی ایک ایسا مدرسہ ہے جس کو قدیم مدرسہ کہا جاسکتا ہے اور اس کو اولیت کا درجہ حاصل ہے اس مدرسہ سے قبل سعودی عرب میں کوئی دینی مدرسہ ۱۸۷۴ء میں نہیں تھا۔ جس کو سعودی عرب کے مشہور و معروف مورخ و صحافی نے اپنی مشہور کتاب ”من تاریخنا“ میں سعودی صحافت کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔

لم یکن غریبا ان یكون هذا
حال الصحافة في بلادنا لم
یکن فیہا مدارس للتعلیم سوی
مدرسة واحد للحكومة
یتلقى التلاميذ فیہا مسومراً
من المعلومات الأولية.
باللغة التركية وسوی مدرسه
اهلية دينية هي المدرسة
الصولية

اگر اس زمانہ میں ہمارے ملک کی صحافت
اس قدر ابتدائی حالت میں اور نہ ہونے
کے برابر ہو تو اس پر تعجب نہیں کیا جاسکتا
کیونکہ جب ملک میں مدارس ناپید ہوں
تو صحافت کا کیا ذکر۔ صرف ایک سرکاری
ابتدائی مدرسہ تھا۔ جس میں طلباء صرف
ابتدائی معلومات ترکی زبان میں حاصل
کرتے تھے۔ البتہ اس دور میں صرف
باقاعدہ پبلک کا دینی ”مدرسہ صولتیہ“ تھا۔

تصنیف و تالیف

ازالتہ الاوہام

”ازالتہ الاوہام“ کا اردو ترجمہ ”دافع الاستقام“ کے نام سے مولانا نور محمد صاحب مہتمم مدرسہ حقانی لدھیانہ بالا قسماط اخبار منشور محمدی بنگلور میں شائع فرماتے تھے جس کا حسب ذیل اشتہار ۲۵، رجب ۱۸۸۶ / ۱۳۰۳ھ کے منشور محمدی کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ بطور ضمیمہ۔

ازالتہ الاوہام ”یہ کتاب عالم اجل و فاضل اکمل جناب مولوی محمد رحمت اللہ صاحب کی تصنیف ہے جو ۱۲۶۹ھ میں چھپ چکی ہے اس کتاب کو دیکھنے کے لئے وہی شخص بے چین ہوگا جس نے کبھی مولانا کی دوسری تصنیفات کے ایک آدھ ورق پر بھی نظر دوڑائی ہو، اس کے تمام کمال و خوبی کے عرض مختصر یہ ہے کہ مولانا نے ہر ایک مسئلہ کی دلیل اور ہر ایک سوال کا جواب اس بسط اور تفصیل سے لکھا ہے کہ بیس بیس اور چالیس چالیس حوالے دے کر بھی بس نہیں کی۔ اچھی طرح سے دروغ گو کو اس کے گھر تک پہنچا دیا ہے، اس خوبی اور اس بسط اور تفصیل سے اب تک کوئی تصنیف نہیں دیکھی گئی اس کتاب کے ۵۷۲ صفحہ ہیں اور تقطیع اخبار منشور محمدی کے برابر ہے۔ مگر یہ کتاب اب نہیں ملتی اور اتنی بڑی کتاب کا چھاپنا بھی ہر وقت ممکن نہیں یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اب جناب مولانا مولوی نور محمد صاحب مہتمم صاحب مدرسہ حقانی لدھیانہ نے اس کتاب کا ترجمہ سلیس اردو میں کر کے اخبار منشور محمدی میں چھپوانا شروع کیا، اور اس کا نام ”دافع الاستقام“ رکھا۔ چنانچہ اسی صفحہ تک ہدیہ ناظرین ہو چکا ہے اس کی خوبی اور عمدگی دیکھ کر علاوہ خریداران اخبار منشور محمدی کے اور صاحبوں نے بھی اس کتاب کی خریداری کی درخواست کی مگر چونکہ زاید نسخے نہ تھے اس لئے اس کی محرومی دیکھ کر یہ

خیال ہوا کہ یہ کتاب از سر نو علیحدہ چھپوائی جائے تاکہ ہر ایک شائق اس سے فیض یاب ہو اور کوئی محروم نہ رہے اور نیز مولانا ممدوح مترجم کتاب ہذا نے اس پر جو اور حاشیہ چڑھایا ہے وہ بھی شامل کیا جائے اور صحت میں بھی حتیٰ الوسع کوشش ہو۔

منشور محمدی کے وہ شمارے جن میں ازالۃ الاہام کا ابتدائی حصہ چھپا ہے میرے پیش نظر ہیں ان میں سے حسب ذیل اقتباس پیش کرتا ہوں۔

کید سویم :- عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ اہل اسلام یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ محمد ﷺ کو معراج ہوئی حالانکہ یہ محال ہے کیونکہ آسمان خرق والتیام کو قبول نہیں کرتا یعنی آسمان کا پھٹنا اس میں کھڑکی، دروازہ اور سوراخ وغیرہ ہونا اور پھر جڑ جانا یہ سب باتیں غیر ممکن ہیں پس وہاں کوئی کیونکر جاسکتا ہے علاوہ اس کے اس قدر مسافت کا طے کرنا اور ایک ہی رات میں لوٹ آنا کیونکر یقین آسکتا ہے۔

جواب : یونانی حکما جو خرق التیام کے غیر ممکن ہونے کے قائل ہیں ان کی دلیلیں کامل نہیں چنانچہ اپنی جگہ پر ظاہر ہے علاوہ ازیں ان لوگوں کے قواعد سے سند پکڑنی محض لغو ہے۔ پولوس قرنتیوں کے پہلے خط کے تیسرے باب ۱۹ میں لکھتا ہے کہ اس جہان کی حکمت خدا کے آگے بیوقوفی ہے کہ لکھا ہے وہ حکیموں کو انہیں چترائیوں میں پھنساتا ہے اور یہ کہ خداوند حکیموں کے قیاس کو جانتا ہے کہ باطل ہیں انتہی، اور اس سے قطع نظر اگر ان کی دلیلوں کے نتائج سچ ہوں تو لازم آئے گا کہ عالم قدیم ہو اور قیامت اور حشر اور نشر کا آنا بالکل باطل ہووے، اور تعجب ہے کہ ان کے قواعد کو حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے میں کیوں لحاظ نہیں کرتے، اور شریعتوں میں سے کسی شریعت میں خرق والتیام کا ممتنع ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کا ثبوت سمجھا جاتا ہے اور متی کی انجیل کے تیسرے باب ۱۶ اور مرقس کے پہلے باب ۱۰ اور لوقا کے تیسرے باب ۲۱ و ۲۲ میں لکھا ہے کہ یسوع ہتسمہ پا کے انہیں پانے سے نکل کے اوپر آیا اور دیکھا کہ اس کے لئے آسمان کھل گیا اور اس نے خدا کی روح کو کبوتر کے مانند اترتے اور اپنے اوپر آتے دیکھا انتہی۔ عبارت متی اور مرقس کے سولہویں باب ۱۹ میں لکھا ہے کہ خداوند انہیں ایسا فرمانے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا اور خدا کے داہنے ہاتھ بیٹھا انتہی، اور یوحنا کے مکاشفات کے چوتھے باب میں لکھا ہے کہ بعد اس کے جو میں نے نگاہ کی تو دیکھا کہ آسمان

پر ایک دروازہ کھلا ہے پھر کتاب پیدائش کے ساتویں باب ۱۱ میں طوفان کے حال میں لکھا ہے کہ بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ انتہی، اور پھر اس کتاب پیدائش کے آٹھویں باب اور ۲ میں لکھا ہے کہ پانی ٹھہر گیا اور گھراؤ کے سوتے اور آسمان کی کھڑکیاں بند ہوئیں، اور اسی کتاب پیدائش کے اٹھائیسویں باب میں لکھا ہے کہ اس نے (یعقوب علیہ السلام نے) خواب میں دیکھا کہ ایک سیڑھی زمین پر دھری ہے اور اس کا سر آسمان کو پہنچا ہے اور دیکھو خدا کے فرشتے اس پر سے چڑھتے اترتے ہیں، اور وہ ہر اسان ہو اور بولا کہ یہ کیا ہے ڈراؤنا مقام ہے سو کچھ اور نہیں مگر خدا کا گھر اور آسمان کا آستانہ ہے۔ انتہی، اور سلاطین کی دوسری کتاب کے دوسرے باب ۱۱ میں ایلیا پیغمبر کے آسمان پر چڑھنے کے حال میں لکھا ہے کہ ایک آتش رتھ اور آتش گھوڑوں نے درمیان آ کے ان دونوں کو جدا کر دیا اور ایلیا بگولے میں ہو کے آسمان پر آتا جاتا رہا انتہی۔ اور بنی اسرائیل پر خدا تعالیٰ کی مہربانیوں کے حال میں اٹھترویں زبور کے درس ۲۳ میں لکھا ہے کہ اس نے اوپر سے بدلیوں کو حکم دیا اور اس نے آسمان کے دروازے کھولے انتہی، ازالۃ الاوہام کی عبارت یوں ہے کہ ”افلاک را از بالا فرمان داده بود و درہائے آسمان را باز کرده بود“ چونکہ آج کل کے نئے تعلیم یافتہ آسمان کے وجود کے منکر ہیں رفتہ رفتہ کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ آسمان کا ترجمہ کہیں بدلیوں اور کہیں بلندی کا کرتے جائیں گے۔

پس اگر خرق والتیام محال ہووے لازم آئے گا کہ آسمان کا پھٹ جانا اور اس کے دروازوں کا کھلنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر روح القدس کا اترنا اور ان کا اور ایلیا کا آسمان پر چڑھنا سب جھوٹ ہووے، اور طوفان کے بارے میں توریت کی خبریں اور زبور کی خبر اور یوحنا کا مکاشفہ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا خواب بھی باطل ہووے، نعوذ باللہ من امثال ہذا الخرافات، علاوہ ازیں پولوس قرینٹون کے دوسرے خط کے بارہویں باب میں اپنے رسول ہونے کے بارے میں لکھتا ہے کہ بے شبہ اپنا فخر کرنا مجھے مناسب نہیں میں خداوند کی روایتوں اور مکاشفوں کا بیان کیا چاہتا ہوں کہ چودہ برس گزرے ہوں گے کہ وہ تیسرے آسمان تک یکا یک پہنچایا گیا اور میں ایسے شخص کو جانتا ہوں اس نے وہ باتیں سنیں جو کہنے کی نہیں اور جن کا کہنا بشر کا مقدور نہیں وہ یا تو بدن کے ساتھ کہ یہ مجھے معلوم نہیں یا بغیر بدن کے کہ یہ بھی مجھے معلوم نہیں خدا کو معلوم ہے انتہی، پس عیسائی لوگ جبکہ بعض عیسائی شخصیتوں کے حق

میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں پھر نہیں معلوم کہ اہل اسلام پر کیوں اس قسم کا طعن کرتے ہیں ظاہر اس کا منشاء محض تعصب ہے

کید چہارم: عیسائی کہتے ہیں کہ اہل اسلام دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد ﷺ نے معجزہ سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا اور اس کا یقین نہیں آتا کیونکہ اگر یہ بات سچ ہوتی تو تمام فرقوں مثلاً ہندوؤں اور عیسائیوں وغیرہ کی کتابوں اور توارینخوں میں لکھا ہوتا نہ کہ فقط اہل اسلام کی کتابوں میں، اور سارے جہاں میں دکھائی دیتا اور تفسیروں سے ”اقتربت الساعة وانشق القمر“ کے معنوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند کا پھٹنا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے جو اس دن ظہور میں آئے گا۔ اس لئے بیضاوی اس کی تفسیر میں ”ینشق القمر يوم القيمة“ کہتا ہے یعنی قیامت کو چاند پھٹے گا پس اسکو محمد ﷺ کا معجزہ جاننا قرآن شریف کا جھٹلانا ہے۔

جواب: اگر یہ معجزہ عیسائیوں کے دفتر میں عناد کے باعث سے موجود نہ ہو اور علی ہذا القیاس ہندوؤں کے دفتر اس سے خالی ہوں تو اس خبر کا جھوٹ ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ حضرت مسیح کے تمام معجزے یہودیوں کی کتابوں میں کہاں لکھے ہیں بلکہ مخالف لوگ ایسی خبروں کے چھپانے اور باطل کرنے میں کوشش کرتے ہیں اور عناد کی جہت سے اگر بہ چشم خود بھی دیکھیں انکار کرتے ہیں اور اسے جادو وغیرہ کہتے ہیں، کیا دیکھتے نہیں ہو کہ باوجود معجزوں کے دیکھنے کے یہودیوں نے کس قدر حضرت مسیح کے انکار کرنے میں کوشش کی اور جنوں، دیوؤں کے نکالنے کو پریوں دیوؤں کے بادشاہ کی مدد سے جانتے تھے اور اب تک کہتے ہیں کہ بلاشبہ حضرت مسیح علیہ السلام کے خوارق عادات ناپاک روحوں کے وسیلے سے تھے اور جو تکلیفیں آذات مصدر حسنات کو پہونچائیں اور ایسا ہی آنجناب کے حواریوں کو بھی جو اذیتیں اور تکلیفیں دیں حواریوں کے اعمال ناظرین پر پوشیدہ نہیں پس کسی خبر کا سچا ہونا مخالفوں کے دفتر میں درج ہونے پر موقوف نہیں۔

ایک مثال: یہ کہ جناب مسیح کے مصلوب ہونے کے حال میں انجیل متی کے ستائیسویں باب ۵۱ اور مرقس کے پندرہویں باب اور لوقا کے تیسویں باب ۴۴ میں لکھا ہے کہ چھٹے گھنٹے کے قریب تھا کہ ساری زمین پر اندھیرا چھا گیا اور پون گھنٹے تک رہا اور سورج تاریک ہو گیا انتھی، بلفظ لوقا اور دیکھو ہیکل کا پردہ وہ اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا اور زمین کانپی اور پتھر تڑک گئے اور قبریں کھل گئیں اور بہت لاشیں پاک لوگوں کی جو آرام میں تھیں

اٹھیں اور قبروں میں سے نکل کر اور مقدس شہر میں جا کر بہتوں کو نظر آئیں۔ انتہی، اور ان خبروں میں سے پہلی تین خبریں تمام یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک اور کچھلی تین خبریں تمام عیسائیوں کے نزدیک ثابت اور صحیح ہیں، حالانکہ ان چھ خبروں میں سے کوئی سی بھی ہند کے کفاروں اور چین کے خطا کے کفاروں اور آتش پرستوں کے دفتر میں ثابت اور مرقوم نہیں، بلکہ کچھلی تین خبروں کا یہودیوں کے دفتر میں بھی کوئی اثر اور نشان نہیں اور ہند کے کفار حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے منکر ہیں حالانکہ طوفان نوح ایسا بڑا حادثہ ہے کہ برس روز کے قریب تک رہا۔۔۔۔۔ اور وہ جو اعتراض کرتے ہیں کہ سارے جہاں میں دیکھا جاتا میں کہتا ہوں اول تو سارے جہاں میں دکھائی دینا کچھ ضروری نہیں کیونکہ احتمال ہے کہ بعض جگہ بادل ہوں اور کبھی چاند بعض جگہ ظاہر ہوتا ہے اور بعض جگہ ظاہر نہیں ہوتا، بعض لوگوں کو نظر نہیں آتا اور ایسا ہی کہیں بعض شہروں میں دیکھا جاتا ہے بعض شہروں میں نہیں بعض شہروں میں پورا کہیں نظر آتا ہے اور بعضوں میں تھوڑا۔ بعض شہروں میں جانتے بھی نہیں مگر جو لوگ علوم نجوم میں دخل رکھتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے کوئی قطعی اور یقینی دلیل سارے جہاں میں نظر نہ آنے کی نہیں بلکہ مسافروں نے ابو جہل کو خبر دی تھی اور ایسا ہی ملیبار کا راجہ اس زمانہ میں اسی معجزے سے ایمان لایا۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ کے گیارہویں مقالے میں اس کا حال لکھا ہے، اس کی عبارت کا یہ ترجمہ ہے کہ سامری نے جناب رسالت پناہ ﷺ کے زمانے میں اپنے ملک میں چاند کا پھٹنا دیکھا اس امر کی تحقیق کے لئے معتبر آدمی اطراف و جوانب میں بھیجے۔ بعدہ جب معلوم ہوا کہ محمد ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کر کے شق قمر کو من جملہ اور معجزات کے ایک معجزہ ٹھہرایا ہے تب سامری کشتی پر سوار ہو کر ملک حجاز میں گیا اور حضرت محمد ﷺ سے ملاقات کر کے مسلمان ہو گیا اور خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوا۔

(۲) ازالۃ الشکوک

یہ کتاب عیسائیوں کے انتیس سوالوں کا جواب ہے رمضان المبارک ۱۲۶۹ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس کی دو جلدیں ہیں جو ۱۳۱۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔

پہلی جلد حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے شاگرد شمس العلماء مولانا عبد الوہاب صاحب ویلوری بانی مدرسہ باقیات الصالحات مدراس نے اپنے اہتمام اور اپنے صرفہ سے

مطبع مجید یہ واقع آڈیہ پاڈم گلی نمبر ۱۴ اور مطبع احسن المطابع مدراس میں ۱۳۲۶ھ میں چھپوائی جس کے ۸۰۶ صفحات ہیں۔ دوسری جلد مولانا عبد الوہاب صاحب کے خلف ارشد مولانا ضیاء الدین محمد صاحب مہتمم پدرسہ نے اپنی نگرانی میں طبع کرائی اس جلد کے ۵۰۸ صفحات ہیں۔ ان دونوں جلدوں کی تصحیح وغیرہ خود مولانا عبد الوہاب صاحب نے شعبان ۱۲۸۸ھ میں مکمل کر دی تھی۔ اس کتاب کے تالیف کے اسباب و وجوہات کیا تھے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے ان کو اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرمائے ہیں:-

”بھائی مسلمانوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء اٹھارہ باون عیسوی میں ایک قطعہ بتیس سوالوں کا جو دلی اور آگرہ وغیرہا میں مشتہر ہوا تھا میری نظر سے گزرا اور پھر انہیں سوالوں کو ایک ہندی رسالے کے آخر میں مندرج پایا اور معلوم ہوا کہ مسیحیوں کی علت غائی اشتہار سے یہ ہے کہ کوئی ان کا جواب لکھے اس پر میرے دل میں آیا کہ میں لکھوں۔ لیکن جب دیکھا کہ وہ سوال نئے نہیں بلکہ سائل نے انہیں قدیم سوالوں کو جو میزان الحق اور پادریوں کے رسالوں میں مندرج ہیں نقل کر لیا ہے اور ان کے جواب بخوبی ادا ہو چکے ہیں تو یہ دیکھ کر ان کے علیحدہ جواب لکھنے کو فضول سمجھ کر چپ ہو رہا۔ مگر ۱۲۶۹ھ میں دو اوامر باعث ہوئے کہ ان کا جواب لکھوں۔ ایک یہ کہ بعض عیسائیوں نے ان سوالوں میں اصلاح دے کے اور چھ سوال اور بڑھا کے ان کو جناب مستطاب مرزا محمد فخر الدین ولی عہد بہادر کی خدمت بابرکت میں بھیجا اور جناب مفخم الیہ نے مجھ سے درخواست کی کہ ان کا جواب لکھوں اور ان کا امر ماننا پڑا۔ دوسرا یہ کہ میں نے سنا کہ وے حضرات پادری جو اس امر کی تنخواہیں پاتے ہیں اور اسی بات کی روٹی کھاتے ہیں کہ جاہلوں کو بہکاویں اور بھولے بھالوں کو پھسلاویں شور و غل مچاتے ہیں کہ مسلمان لوگ جواب نہیں دے سکتے۔ پس ان دو اوامر کا لحاظ کر کے جواب کے لکھنے پر مستعد ہوا، لیکن اس لحاظ سے کہ جناب ولی عہد بہادر کا ایمان تھا کہ میں انتیس سوالوں کا جواب لکھوں جن کو بعض عیسائیوں نے ان کی خدمت میں بھیجا ہے اور حقیقت میں ان کا جواب جو ان تیس سوالوں مشتہرہ کا بھی بلا

تفاوت جواب تھا تو انہیں انتیس کا جواب لکھا اور جو وہ سوال بے ترتیب تھے تو میں نے ان کی ترتیب اس طرح کر دی کہ جو معجزات سے تعلق رکھتے تھے ان کو ایک جا اور جو قرآن سے متعلق تھے ان کو ایک جا۔ اور اسی قیاس پر اور جا ذکر کیا۔ لیکن مسائل کی عبارت میں کچھ تبدیلی عمل میں نہیں آئی بلکہ جیسی تھی ویسے ہی حرفاً حرفاً منقول ہوئی، اور خدا کے فضل سے اسی ۱۲۶۹ھ میں رمضان کے مہینے میں اس کی تحریر سے فراغت ہوئی اور فراغت کے بعد دلی میں اس کا چھپنا شروع ہوا، لیکن جو اسی عرصہ میں میرا جانا اکبر آباد ہوا اور مہتمم کی کچھ سستی کے سبب اور کچھ اس سبب سے کہ مسودہ سے کاتب بعض جا اچھانہ پڑھ سکا اکثر غلط چھپتا تھا میں نے یہ معلوم کر کے وہاں سے لکھ کر چھپنا اس کا ملتوی اپنی مراجعت پر رکھا اور اکبر آباد میں مجھ کو دو سبب سے کچھ عرصے تک رہنا پڑا ایک یہ کہ اس جا میں نے کتاب اعجاز عیسوی کو کہ تحریف کے اثبات میں بہت ہی اچھی کتاب ہے اور ناظر کو بڑا فائدہ بخشی ہے تالیف کی۔ وجہ دوم یہ کہ اسکی تالیف کے بعد میرا مباحثہ پادری فنڈر صاحب میزان الحق کے مؤلف سے مجمع عام میں ٹھہر گیا اور یہ قرار پایا کہ جناب ڈاکٹر وزیر خاں صاحب میرے شریک اور پادری فریج صاحب میزان الحق کے مؤلف کے شریک رہیں۔ اور دو روز متواتر مجمع عام میں وہ مباحثہ ہوا اور خدا کے فضل سے غلبہ ہماری طرف رہا جیسا کہ یہ حال ان لوگوں کے رسالوں سے جو مباحثہ کے جلسوں میں شریک تھے اور انہوں نے مباحثہ کی تقریر کو اپنے کانوں سے سن کر ضبط کیا ہے اکثر خلق پر ظاہر بھی ہو گیا ہے، اور جب میں اکبر آباد سے دلی میں پھر آیا اور جواب کا چھپنا جو ملتوی تھا پھر مقرر ٹھہرا تو بعض احباب نے درخواست کی کہ ہمارے نزدیک یوں مناسب ہے کہ تم ابطال التشریث کو جو اس کے مقدمہ کے امر تیسرے میں مبین ہے نکال کر اس کو رسالہ جدا گانہ کر دو اور مواضع میں بقدر مناسب کے کچھ کچھ بڑھادو اور پھر از سر نو اول سے چھپواؤ۔ پس ان کی درخواست کے موافق میں نے اس ابطال التشریث کو اس سے نکال کر کچھ اس میں اور بسط کر کے اس کو رسالہ جدا گانہ کر دیا اور نام

اس کا احسن الاحادیث فی ابطال التشلیث رکھا اور جواب میں کہیں کہیں بقدر مناسب کے کچھ بڑھا کر از سر نو چھپوایا اور نام اس جواب کا از التہ الشکوہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو سب عام و خاص کی خاطر کامقبول کی جیو۔

عیسائیوں نے جو انتیس سوال قائم کئے تھے اور ان کا اس کتاب میں جواب دیا گیا ہے، وہ

یہ ہیں۔

۱ معجزات محمد ﷺ کس طور سے ثابت ہوں گے آیا قرآن شریف سے یا اور کتب سے
۲ ثبوت ان کا قرآن ہی سے ضروری ہے کیونکہ معجزات اور انبیاء کے ان کی کتابوں سے ثابت ہیں۔

۳ وہ معجزات جو قرآن میں مذکور ہیں آیا وہ معجزات ہیں یا بطریق اظہار عظمت الہی کے مرقوم ہیں، اگر بطریق اخیر لکھے ہیں تو ان کو پیغمبر صاحب سے کیا تعلق ہے۔

۴ کوئی کتاب پیغمبر کے اصحاب کی تصانیف میں سے ایسی موجود ہے جس میں درباب معجزات کے کچھ لکھا ہو، اگر ہے تو نام اس کا اور مصنف کا، اور یہ امر کہ فلانی جگہ وہ کتاب موجود ہے اور کتنے اشخاص نے اس بات میں تحریر کی ہے بتاؤ۔

۵ اگر اور راویوں نے اصحاب کے اقوال میں سے کچھ لکھا ہے تو یہ سن کر لکھا ہے یا ان کی کتب میں سے، اگر نفس الامر میں ایسا ہی ہے تو ان کا لکھو کہاں ہے اور زمانہ راوی اور اقوال مذکورہ میں کیا تفاوت ہے۔

۶ اگر شق القمر کو معجزہ قرار نہ دو تو کوئی اور معجزہ جو چند اشخاص کے رو برو واقع ہوا ہو قرآن یا حدیث سے ثابت کر دو مگر اس میں یہ بات بھی ہو کہ راوی اس کا فلانے زمانے کا ہے یا یہ امر منقول ہے اور شہادتیں اس کی فلانے امور ہیں۔

۷ قرآن میں لکھا ہے کہ پیغمبر کو معجزات کے اظہار کیلئے نہیں بھیجا بلکہ محض وعظ کیلئے، اس صورت میں باوجود بے اختیاری کے ان سے اظہار معجزات کا کیونکر ہوا۔

۸ یہ جو لکھا ہے کہ روز ولادت پیغمبر کے آتش کدہ منطفی ہو گیا بت سب واژگوں ہو گئے یہ تحریر آیا کسی مخالف کی ہے یا موافق کی۔

۹ شق القمر کس نے دیکھا اور جنہوں نے دیکھا آیا انہوں نے اپنی شہادت کو آپ قلمبند کیا یا وہ ناقل محض تھے اور اوروں نے ان سے روایت کی ہے۔

- ۱۰ اس کا کیا باعث ہے کہ انہوں نے خود نہ لکھا آیا وہ بے علم تھے۔
- ۱۱ راوی اس کے کس عصر میں بعد پیغمبر کے تھے اس کے جواب میں زمانہ اس کا تحقیق کر کے لکھ دو۔
- ۱۲ ان کی روایت کس طرح کی ہے کیا محض سنی ہوئی بات کو لکھا ہے۔
- ۱۳ جامع قرآن فقط حضرت عثمانؓ ہیں یا ان سے سابق حضرت ابوبکرؓ بھی جامع ہوئے۔
- ۱۴ قرآن میں منسوخ آیتیں کیوں ہیں۔
- ۱۵ نسخ کا وعدہ کون سی آیت میں پایا جاتا ہے۔
- ۱۶ قرآن اگلی کتب سماوی کے مخالف کیوں ہے۔
- ۱۷ توریت اور انجیل کی تحریف کی دلیل کیا ہے۔
- ۱۸ یہ تبدیل کب ظہور میں آیا۔
- ۱۹ قرآن سے ثابت ہے کہ پیغمبر کے وقت تک کلام مجید سابق میں کچھ تحریف نہ ہوئی تھی بعد ان کے اگر ہوئی تو ثابت کرو۔
- ۲۰ کسی نے پچشم خود دیکھا کہ جبریل پیغمبر کے پاس وحی لاتا تھا۔
- ۲۱ کتب تاریخ کی جن کا تواتر قرآن کی طرح ثابت ہو اصلیت کو مانو گے یا نہیں۔
- ۲۲ کتب مذکورہ کی اصلیت میں شبہ کرنے سے کیا تم پر لازم نہ آوے گا کہ قرآن کی اصلیت پر شبہ کرو۔
- ۲۳ کتب مذکورہ اور قرآن کے اختلاف کی صورت میں کسے غلط کہو گے۔
- ۲۴ جب قرآن اور تواتر نسخ دونوں تواتر سے ثابت ہیں تو اب بتلائیے کہ دونوں میں شک کیا جائے گا یا تواتر نسخ میں، یا اقرار کیجئے گا کہ قرآن کے مصنف حالات قدیمہ سے آگاہ نہ تھے۔
- ۲۵ اگر کوئی قرآن کو کلام اللہ تو مانے لیکن قرآن مروج کو جعلی اور محرف بتلاوے۔
- ۲۶ کیونکہ اس میں نامعقول باتیں پائی جاتی ہیں تو اس کا جواب کیا دیا جائے گا۔
- ۲۷ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے اور ایک کتاب بنا کر کلام اللہ قرار دے اور کتب سابقہ متواترہ کو محرف کہے تو صد ہا سال کے بعد اس کے معتقد کس وجہ سے تحقیق کریں گے کہ ان کی نبی والی کتاب اصلی ہے یا جعلی۔

۲۷ اب نبی کے قول سے معتبر تاریخوں کا اعتبار جاتا رہے گا یا قائم رہے گا، یاد ہریت پھیلے گی یا خدا پرستی۔

۲۸ انبیاء اور کلام الہی کا انکار اس پر مبنی ہے کہ کتب سابقہ متواتر جعلی ہیں یا اس پر کہ ایسی کتابیں اصل اور درست ہیں۔

۲۹ ایک شخص بہت سی کرامات دکھلاتا ہے اور کہتا ہے کہ دوسو برس سے ہندوؤں میں ذاتوں کا رواج پڑا ہے اس صورت میں تاریخ اور تواریخ کو باطل کہو گے یا اس شخص کو کاذب۔
مولانا صاحب نے پہلے سوال کے جواب میں قرآن مجید سے بیس تفصیلی اور دس اجمالی معجزوں کا ثبوت، ان پر عیسائیوں کے اعتراضات اور ان کے جوابات بڑی تفصیل و شرح و بسط کے ساتھ تین سو صفحات میں دیئے ہیں۔

تلامذہ

حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے سامنے ہندوستان اور مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں جن حضرات نے زانوئے ادب تہ کیا تھا، ان کے نام پچھلے صفحات میں آچکے ہیں، اور جن اشخاص نے مدرسہ صولتیہ میں تعلیم پائی ہے ان ابنائے قدیم کی فہرست بڑی طویل ہے۔
خواہشمند حضرات مولانا امداد صابری صاحب کی آثار رحمت ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔



سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند
سوانح علمائے دیوبند

toobaa-elibrary.blogspot.com

حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ

فہرست

- ۴۷۳ خاندانی حالات، ولادت و تحصیل علوم
- ۴۷۴ ملازمت
- ۴۷۵ دارالعلوم دیوبند کا قیام
- ۴۷۸ اہلیہ محترمہ کی وفات
- ۴۷۹ دارالعلوم میں تدریسی فرائض
- ۴۸۰ تواضع و انکساری
- ۴۸۲ علماء و صلحاء سے عقیدت
- ۴۸۳ مظاہر العلوم کی سرپرستی
- ۴۸۴ وفات
- ۴۸۵ اولاد و احفاد، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ
- ۴۸۶ مولانا حامد حسن صاحبؒ، مولانا الحاج الحافظ حکیم محمد حسنؒ
- ۴۸۷ مولوی حافظ محمد محسن صاحبؒ، علمی یادگار
- ۴۸۸ التعليقات اردو شرح سبعة معلقة،
- ۴۸۸ تسہیل البیان اردو شرح دیوان متنبی
- ۴۸۸ تسہیل الدراسة اردو ترجمہ و شرح دیوان حماسہ
- ۴۸۸ الارشاد اردو ترجمہ قصیدہ بانٹ سعاد
- ۴۸۸ عطر الوردہ شرح اردو قصیدہ بردہ، تذکرۃ البلاغہ
- ۴۸۹ تسہیل الحساب
- ۴۸۹ الہدیۃ السنیۃ فی ذکر المدرستہ الاسلامیۃ الیدیوبندیۃ
- ۴۸۹ ادب سے خاص شغف

حسان الہند حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ

محمد عمران قاسمی بگیا نوی ایم لے (علیگ)

خاندانی حالات

دیوبند کے عثمانی شیوخ میں ایک صاحب شیخ فتح علی نام کے گذرے ہیں۔ شرافت نسبی اور خوشحالی کے علاوہ جو ایک اور عظیم نعمت اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی وہ ”اولاد صالح“ ہے، ان کے تین فرزندوں (جناب مولانا مہتاب علیؒ، مولانا ذوالفقار علیؒ اور جناب مسعود علی صاحبؒ) میں سے دو آسمان علم و فضل پرشس و قمر بن کر جلوہ آرا ہوئے اور علوم کی سلطنتوں پر ایک عرصہ تک ان کی حکمرانی رہی۔

شیخ فتح علی صاحبؒ کے بڑے صاحبزادے کی علمی رفعتوں اور بلند مقام کے لئے اتنا ذکر کافی ہے کہ دیوبند میں دارالعلوم کے قیام سے پہلے بھی وہ عربی درسیات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے اور ان کے اس سمندر علم سے فیضیاب ہونے والوں میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا ذوالفقار علیؒ جیسے اساطین علم و فضل شامل ہیں۔

ولادت و تحصیل علوم

مولانا ذوالفقار علیؒ کی ولادت ۱۲۳۷ھ میں ہوئی صراحت سے تو کہیں نہیں ملتا تاہم اندازہ یہی ہے کہ آپ کی ابتدائی تعلیم دیوبند ہی میں ہوئی اور بعد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے دہلی کا رخ کیا، اس علاقے کے شیوخ کیلئے مولانا مملوک العلی نانوتویؒ خصوصی طور پر باعث کشش تھے۔ ان کی وجہ سے نہ صرف باسانی دہلی کالج (۱) میں داخلہ مل جاتا تھا بلکہ ان کے بحر علم سے سیرابی کی سعادت بھی نصیب ہو جاتی تھی۔ آپ کو تقریباً تمام اسلامی علوم

(۱) مختلف کتابوں میں یہ ذکر تو ملتا ہے کہ شیخ فتح علی کے تین صاحبزادے تھے مگر نام دو کے ہی ملتے ہیں یہ تیسرا نام محمد اکرام چغتائی صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر کیا ہے ملاحظہ ہو مضمون ”ایک نادر مجموعہ مکاتیب“ سہ ماہی اردو شمارہ نمبر (۳) ۱۹۸۵ء

میں مکمل دستگاہ اور مہارت حاصل تھی، دہلی کے علماء و مشائخ کے علاوہ فرنگی حکام کے یہاں بھی آپ کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مولانا مہتاب علی اور مولانا ذوالفقار علی دونوں ہی بھائیوں نے شوق و محنت سے علم حاصل کیا اور بعد فراغ جہاں مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ نے سرکاری ملازمت کے ذریعہ علوم کی خدمت کی وہیں دوسری طرف مولانا مہتاب علی صاحب نے تشنگان علوم اسلامیہ کی پیاس بجھانے اور ایک نئی نسل کو اس نہج پر اٹھانے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر ڈالی اور بالآخر اللہ رب العزت نے ان کے اس اخلاص و محنت اور جانفشانی و جدوجہد کو ضائع نہیں فرمایا۔ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے گوہر آب دار کو ان کے دامن میں ڈال کر دونوں جہاں کی فلاح و نیک نامی ان کا مقدر بنادی۔

ملازمت

مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ کی ذہانت و قابلیت طالب علمی ہی کے زمانے میں ظاہر و ہویدا تھی اس لئے تعلیم سے فراغت کے بعد حصول ملازمت میں کوئی خاص دشواری پیش نہ آئی اور تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ جن دنوں آپ بریلی میں اپنی خدمات پر مامور تھے وہیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کی ولادت ہوئی۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۸ھ میں آپ بریلی میں قیام پذیر تھے۔ اس لئے کہ سن مذکور ہی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت کا سال ہے) اپنی صلاحیتوں، اعلیٰ کارکردگی اور جوہر شناسی حکام کے سبب جلد ہی آپ نے ترقی کی منازل طے کر لیں اور محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ کتابوں میں تو یہ ملتا ہے کہ آپ نے اس محکمہ میں میرٹھ کے اندر کام کیا اور کسی جگہ کا ذکر نہیں ملتا تاہم دارالعلوم دیوبند کی رودادوں میں آپ کے نام کے ساتھ ڈپٹی انسپکٹر مدارس سہارنپور لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ وقت کے بعد آپ کا تبادلہ میرٹھ سے سہارنپور ہو گیا ہو یا پھر اس زمانے میں سہارنپور میرٹھ کے محکمہ تعلیم ہی کے تحت آتا ہو اور آپ کو علاقہ سہارنپور کا ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر کر دیا گیا ہو۔

(۱) مولانا ذوالفقار علی کے استاذوں میں مولانا رشید الدین کانام بھی شامل ہے یہ اور مولانا مملوک علی دونوں ہی شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ دہلی میں اجیری گیٹ پر واقع کالج پہلا کالج تھا جس میں مشرقی زبانوں اور اسلامیات کے ساتھ انگریزی کی کلاسیں بھی لگتی تھیں اور علم جدید کو نصاب میں شامل کیا گیا تھا، پہلے اسے مدرسہ غازی الدین کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسے غازی فخر الدین فیروز جنگ نے ۱۷۱۰ء میں اپنی وفات سے کچھ قبل کھولا تھا۔ ۱۸۳۵ء میں اسے دہلی کالج میں تبدیل کر دیا گیا اور اب اس کانام ڈاکٹر حسین کالج ہے۔ ("مولانا محمود الحسن" از غفران احمد ایم اے)

دارالعلوم دیوبند کا قیام

علماء کرام کی ایک بڑی جماعت اور انگریز فوج کے درمیان شمالی کے میدان میں جو محاربہ و مقابلہ ہوا اور بمشیت و حکمت خداوندی جماعت مجاہدین کو کامل فتح حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے بعد یاس و محرومی اور حزن و ملال دامن گیر ہوا اور حفاظت دین کا جذبہ و فکر بہ قوت ابھرا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور میں یہ فکر علماء کے اندر عام تھی کہ اب سلطنت مغلیہ کے سقوط کے بعد ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت دینی و تہذیبی کے لئے کیا تدبیر اور راہ عمل اختیار کی جائے، متعدد اہل اللہ اور اصحاب علم کے دلوں پر بقاء دین اسلام اور حفاظت مسلمین کے سلسلہ میں الہام خداوندی ہوا مگر اس کی صحیح نوعیت و تعبیر حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھی اور آپ پر حقیقت آشکار ہوئی اور سرزمین دیوبند کے حصہ میں اس کام کو بننا مقدر ہوا جس کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ ”دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانمایہ کو یہ سرزمین لے لے اڑی (۱)“ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ عالم اسلام کی اس عظیم الشان دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی تاسیس و ترقی میں بھی شیخ فتح علی کے خانوادے کی قربانیاں قابل رشک اور ناقابل فراموش ہیں اس اجمال کی قدرے تفصیل یہ ہے۔

جہاد شمالی میں ناکامی کے بعد افسردگی ورنجیدگی کے جو بادل اہل علم اور اصحاب معرفت کے ذہنوں پر چھائے اور مزید براں یہ کہ اس جماعت کے سرخیل و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی جدائی و مفارقت برق صاعقہ بن کر دلوں پر پڑی تو ایسے میں مختلف حضرات کو مختلف احوال پیش آئے۔ کچھ ہجرت کے عازم ہوئے تو بعض نے گوشہ نشینی اختیار کر لی، بعض مسلمانوں کے مستقبل کی فکر میں لگ گئے تو بعض سرگرداں و حیراں، کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔

چنانچہ حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب پر ایک حالت طاری ہوئی، انہوں نے اپنی کل املاک، گھر، زمین، باغ وغیرہ سب فروخت کر کے راہ خدا میں دیدیا اور محض اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے بیٹھ گئے۔ (۱)

مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا فضل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دونوں ہی سرکاری ملازم تھے یہ ذکر تو کہیں نہیں ملتا کہ ۱۸۵۷ء کے جہاد میں انہوں نے شرکت کی لیکن ناکامی کے نتائج و اثرات سے متاثر ہوئے بغیر وہ بھی نہ رہ سکے، اور اس افسردگی اور ناکامی کی تلخیوں کو بھلانے کا یہ سامان کیا کہ اکثر وقت چھتہ مسجد میں عبادات اور یاد خدا کے اندر گزارنے لگے، ساتھ ہی ساتھ حکومت اسلامی کے سقوط سے لگے اس کاری زخم کے اندمال کی کوشش پیہم اور تلافی مافات کی تدابیر بھی سوچتے رہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی رشتہ داری و تعلقات کے سبب اکثر دیوبند آنا جانا لگا رہتا تھا جو ان دنوں مطبع مجتہبی میرٹھ میں مقیم تھے اور انفرادی طور پر سلسلہ درس و تدریس بھی جاری تھا، بالآخر مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور چھتہ مسجد کی ”مجلس انس“ کے متبرک نفوس حاجی محمد عابد صاحب، مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمن صاحب حالات کی نزاکت و ضرورت سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ دیوبند میں ایک مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے ان حضرات کے اس جذبہ مبارک کا ذکر یوں کیا ہے ”وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی اور مولوی فضل الرحمن اور مولوی ذوالفقار اور حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں (۲)“ اور پھر تجویز پر اتفاق رائے ہو گیا اور حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مبارک ساعت میں اس مقدس کام کا بیڑہ یوں اٹھایا کہ ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ بروز جمعہ آپ کے دل میں ایک خیال آیا اور آپ نے فوراً اسے عملی جامہ پہنانے کا منصوبہ بنایا، بہتر ہو گا کہ انہی حضرات میں کے ایک فرد کی زبانی اس مبارک عمل کے آغاز کی روح پروردستان سنی جائے۔ سوانح قاسمی اور تاریخ دارالعلوم دیوبند دونوں ہی میں مذکور ہے کہ۔

”ایک دن بوقت اشراق سفید رومال کی جھولی بنا اور اس میں تین روپیہ اپنے پاس سے ڈال، چھتہ کی مسجد سے تن تنہا مولوی مہتاب علی مرحوم کے پاس تشریف لائے مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ روپے عنایت کئے اور دعا کی، اور بارہ روپیہ مولوی فضل الرحمن صاحب نے اور چھ روپے اس مسکین (صاحب روایت) نے دیئے۔ وہاں سے اٹھ کر مولوی ذوالفقار علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آئے مولوی صاحب ماشاء اللہ علم دوست ہیں فوراً بارہ روپے دیئے اور حسن اتفاق سے اس وقت سید ذوالفقار علی ثانی دیوبندی وہاں موجود تھے،

(۱) سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۴۱

(۲) سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۴۲ بحوالہ سوانح عمری مولانا محمد قاسم از مولانا محمد یعقوب صاحب ص ۳۹

ان کی طرف سے بھی بارہ روپے عنایت کیے، وہاں سے اٹھ کر یہ درویش بادشاہ صفت (یعنی حاجی محمد عابد صاحب) محلہ ابوالبرکات پہنچے.... اور شام تک تین سو روپے جمع ہو گئے۔ (۱) اور بالآخر یہ عظیم درس گاہ وجود پذیر ہو گئی جو عالم اسلام کے لئے عموماً اور ملت اسلامیہ کیلئے خصوصاً روشنی و ہدایت کا ایک مینار ثابت ہوئی۔ (خدا کرے اس کا فیض و تاقیامت جاری و ساری رہے آمین) مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب ہی لکھا ہے کہ ”واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے کے لحاظ سے ان بزرگوں نے بڑا بھاری کام انجام دیا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے عربی الفاظ میں دیوبند کے مدرسہ کے افتتاح اور اس وقت کے ماحول کا ذکر ان الفاظ میں پایا جاتا ہے۔

وان لم یساعده الزمان
والمكان ولم یوافقہ الحین
والاوان۔

اگرچہ اس مدرسہ کے قیام کیلئے نہ زمانہ کے
حالات ہی سازگار تھے اور نہ وہ جگہ جہاں
مدرسہ قائم ہوا اسکا ماحول ہی مناسب

تھا الغرض وقت بالکل ناموافق تھا۔

ایسی صورت میں اس کام کو اٹھانے والے، اس تحریک کو قبول کر کے اسے عملی شکل میں لانے والے، مالی امداد میں پیش قدمی کرنے والے۔ الغرض اس راہ میں دامے، درمے، قدمے، سخنے، جس منزل میں بھی جن سے جو بن پڑا حد سے زیادہ ناموافق حالات میں کر گزرنے والے سچ تو یہ ہے کہ اس سنت حسنہ کی راہ کھولنے میں جو بھی جس منزل میں بھی شریک ہوئے وہ صرف اپنے ہی عمل کی حد تک نہیں بلکہ ”دارالعلوم دیوبند“ کے وجود کے سارے ثمرات و نتائج جو اس وقت تک سامنے آچکے ہیں اور آئندہ جب تک خدا کی مرضی ہو سامنے آتے رہیں گے ہر ایک میں ان کے اجر و صلہ کا حق نبوی و شیقہ کی بنا پر وہاں محفوظ ہو چکا ہے جہاں وہ پہنچ چکے ہیں (۲)“

بات ذرا طویل ہو گئی مگر مقصد بے غبار ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی بناء و تاسیس کی تجویز میں مولانا ذوالفقار علی پیش پیش تھے، اور نہ صرف تجویز میں بلکہ نہایت خوشی سے چندہ بھی دیا، اور یہ جوش و جذبہ وقتی نہ تھا بلکہ رودادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر بھر نہ صرف دائمی معطیان چندہ میں آپ کا نام شامل رہا بلکہ ایک دو طالب علموں کا کھانا بھی عمر بھر اپنے یہاں سے جاری

رکھا، ان کے دسترخوان کریم سے فیضیاب ہونے والوں میں مولانا محمد فاضل پھلتی (۱) جیسے عالموں کے نام شامل ہیں۔ آپ کے انتقال کے بعد بھی کئی سالوں تک حضرت شیخ الہندؒ نے اُن کی طرف سے اس سلسلہ کو جاری رکھا۔

مولانا مہتاب علی صاحب رحمہ اللہ (۲) بھی دارالعلوم کو ہر طرح کا تعاون دیتے رہے۔ ذمہ داران کی جانب سے اکثر ممتحن بھی آپ کو بنایا جاتا تھا اور آپ اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دیتے تھے جس کا دارالعلوم کی رودادوں میں متعدد جگہ تذکرہ ملتا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً ایک دو مقام کا ذکر کر دیا جائے۔

”ماہ شعبان ۱۲۸۳ھ میں فاضل کامل مولوی محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے بشمول مولوی مہتاب علی و مولوی ذوالفقار علی صاحب نہایت مستعدی اور سرگرمی سے امتحان لیا۔ اور جلسہٴ اخیر بحضور اکثر رؤسائے دیوبند ہوا، کتب انعام قیمتی ۲۷ روپے تجویز ممتحنان صاحبان نے اپنے پاس سے طلبہ کو تقسیم کیں (۳)“

قیام دارالعلوم کے بعد قریب دس سال تک مولانا مہتاب علی حیات رہے اس مدت میں دارالعلوم کی شوریٰ کی رکنیت کے علاوہ متعدد مرتبہ آپ کو ممتحن مقرر کیا گیا۔

اہلیہ محترمہ کی وفات

مولانا ذوالفقار علی کی اہلیہ محترمہ دیوبند ہی کے ایک معزز شخص شیخ بوعلی بخش کی صاحبزادی تھیں۔ مفتی عزیز الرحمن صاحب رقم طراز ہیں کہ: یہ بی بی نہایت سخی اور نیک بخت خاتون تھیں۔ حضرت شیخ الہندؒ فرمایا کرتے تھے کہ ”میری والدہ کو مجھ سے اس قدر محبت تھی کہ اب کوئی کتنی ہی محبت کرے انکے مقابلے میں قدر نہیں ہوتی۔ میں اپنے درس و تدریس میں مشغول رہتا، گھر میں کھانا پک جاتا سب کھاپی لیتے، لیکن میری والدہ کسی قدر آنا بچا کر میری منتظر رہتیں، گرمی کی دوپہر میں جب بارہ بجے میں جاتا فوراً خود تازہ روٹی پکا کر کھلاتیں“ (۱) ان کی دینداری، اخلاص

(۱) ملاحظہ فرمائیں روداد دارالعلوم ۱۲۸۳ھ

(۲) آپ مولانا ذوالفقار علی کے بڑے بھائی تھے تیرہویں صدی کے اوائل میں دیوبند کے خاص استادوں میں سے تھے، دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین کے دیوان خانے میں جو مدرسہ قائم تھا اس میں عربی پڑھاتے تھے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی عربی تعلیم کا آغاز بھی اسی مدرسہ سے ہوا تھا، قیام دارالعلوم کیلئے پہلا چندہ حاجی محمد عابد حسین صاحب کا اور دوسرا انہیں مولانا مہتاب علی نے دیا تھا، قیام دارالعلوم کے بعد اسکی مجلس شوریٰ کے رکن قرار پائے (تاریخ دیوبند طبع دوم ص ۲۳۱-۲۳۲)

(۳) تاریخ دیوبند طبع اول ص ۱۶۰

اور حسن انتظام کا ثمرہ بھی یوں ملا کہ ”گھر میں ہر طرف خیر و برکت کا ظہور تھا، مال و عزت کے علاوہ جیسی قابل رشک اولاد خدا تعالیٰ نے حضرت مولانا کے والدین کو عطا فرمائی تھی، ایسی دنیا میں شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتی ہے، دونوں صاحبزادیاں نہایت عقیفہ صالحہ، دیندار منظمہ، چاروں صاحبزادے عالم، صالح، دین و دنیا کے اعتبار سے معزز، پھر ان سب میں حضرت مولانا (شیخ الہند) جیسا فخر اسلام و مسلمین، چودھویں صدی کا شہر مشاہیر، خاتم المحدثین جو ہر یکتا (۲)“ ان کی وفات کے روز ایک عجیب اتفاق پیش آیا، مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمہ اللہ کی پٹنن کا عرصہ سے انتظام ہو رہا تھا پٹنن کا باضابطہ حکم ان مخیرہ بی بی کے انتقال سے صرف نصف گھنٹہ بعد پہنچا مولانا ذوالفقار علی رحمہ اللہ نے اپنے صاحبزادوں سے فرمایا کہ ”تمہاری والدہ کی وفات سے نصف رزق کم ہو گیا“ (۳) اس نیک بخت خاتون کی وفات ۱۳۰۰ھ میں ہوئی۔

(۱۲۹۷ھ میں) دارالعلوم دیوبند کے روح رواں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی وفات نے علمی دنیا، دارالعلوم، آپ کے احباب و رفقاء، شاگردوں، متعلقین اور اہل دیوبند کو غمگین و محزون کر دیا تھا۔ آپ کی وفات پر مولانا ذوالفقار علی نے عربی اور فارسی میں جو مرثیہ قلم بند کیا وہ حضرت کے تئیں ان کی عقیدت و محبت اور ان کے فضل و کمال کا مظہر تو ہے ہی ساتھ ہی مولانا ذوالفقار علی رحمہ اللہ کی بے قراری دل، غم انگیزی، وارفتگی، شکستگی اور افسردگی کا بھی شاہد و غماز ہے۔

(ان مرثیوں کے اقتباسات مناسب موقع پر نقل کیے جائیں گے)

اہلیہ کی وفات نے دل کی اس افسردگی میں اور اضافہ کیا ایسے میں آپ نے دارالعلوم کی خدمت کی طرف خود کو زیادہ متوجہ کر لیا۔

دارالعلوم میں تدریسی فرائض

دارالعلوم دیوبند کے داخلی ریکارڈ سے ناواقف حضرات کے لئے یہ ایک انکشاف ہوگا کہ جو شخص دارالعلوم کے بانیین میں سب سے زیادہ معمر تھا اور جس کی رائے کو نہایت احترام سے قبول کیا جاتا تھا، جس کی تحویل میں مدرسہ کا خزانہ تھا، جس کو امتحان لینے کی غرض سے خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا تھا، جس کا صاحبزادہ دارالعلوم میں مدرس دوم کے عہدہ پر تدریس

(۱) حیات شیخ الہند رحمہ اللہ، ص ۹ (از حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ)

(۲) حیات شیخ الہند رحمہ اللہ، ص ۹، (۳) حیات شیخ الہند رحمہ اللہ، ص ۱۰

کے فرائض انجام دے رہا تھا، اس نے دارالعلوم کے تئیں اپنی خدمات میں ہمہ گیریت لاتے ہوئے مسند درس بھی سنبھالی اور اب وہ بیک وقت دارالعلوم کے دائمی معطی چندہ، ایک یا دو طلباء کے طعام کے متکفل، خزانچی، مدرس ہفتم بلا تنخواہ، رکن مجلس شوریٰ اور بانیین میں سے تھے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

دارالعلوم کی روداد متعلقہ ۱۳۰۱ھ تا ۱۳۰۳ھ میں آپ کو ”مدرس ہفتم بلا تنخواہ“ تحریر کیا گیا ہے جبکہ ۱۳۰۲ھ کی روداد میں آپ کا نام ”مدرس ششم بلا تنخواہ“ کی حیثیت سے درج ہے۔ یہ تو صراحت رودادوں میں نہیں کہ آپ سے متعلق کن کتابوں کے اسباق تھے۔ تاہم یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عربی ادب کے اسباق کی تدریس ہی آپ کے سپرد کی گئی ہوگی، اس طرح قریب چار سال تک آپ نے دارالعلوم میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کا مستقل قیام دیوبند ہی میں تھا۔ جیسا کہ گذرا کہ اہلیہ محترمہ کی وفات کے آدھا گھنٹہ بعد ہی آپ کی پنشن کا حکم نامہ آیا۔ گویا آپ اسی روز محکمہ تعلیم کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے، یوں بھی اس وقت آپ کی عمر ۶۳ برس تھی۔

بعد پنشن حکومت نے آپ کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے دیوبند ہی میں آپ کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا، دیوبند کے اس مستقل قیام کو آپ نے غنیمت سمجھتے ہوئے ہی غالباً دارالعلوم میں تدریسی خدمات کی خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

تواضع و انکساری

دینی عظمت، علمی فضل و کمال اور دنیوی وجاہت کے باوجود طبیعت میں سادگی و انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، خصوصاً اہل علم اصحاب و طلبہ کی بہت قدر کرتے تھے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہم کے والد محترم مولانا سید عبدالحی حسنی نے نوجوانی میں دہلی اور اس کے نواحی علاقوں کا سفر وہاں کے علماء سے ملاقات و استفادے اور اس خطے کے مقامات خیر کی زیارت اور حصول تبرک کے لئے کیا، یہ رجب و شعبان ۱۳۱۲ھ (جنوری و فروری ۱۸۹۵ء) کی بات ہے۔

وہ جب دیوبند پہنچے تو بارش ہو رہی تھی ایک سرائے میں قیام کیا، ذاتی طور پر کسی سے تعلقات و شناسائی نہ تھی، یہ تو معلوم تھا کہ ان کے جدا مجد حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے ان علاقوں کا

دورہ کیا ہے اور ان کے معتقدین و مریدین بھی یہاں موجود تھے، لیکن ان کو غالباً یہ گمان نہ تھا کہ سید صاحب رحمہ اللہ کے مریدین کے متعلقین بھی ان سے اس قدر وابستگی رکھتے ہیں کہ اس خاندان کے ایک عام اور غیر مشہور فرد کو بھی مخدومیت کا درجہ دیتے ہیں، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ صاحب سفر ہی سے اس موقع کے تاثرات کو سنا جائے فرماتے ہیں کہ۔

”..... حاجی محمد عابد صاحب کے پاس آیا، تھوڑی دیر بیٹھا رہا اسی اثناء میں مولوی صاحب کا آدمی بلانے آیا، وہیں سے میں اور بھائی جی اٹھ کر مولوی محمود حسن کے مکان پر آئے۔ مولانا ذوالفقار صاحب اور اکثر بزرگان دیوبند بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب نے نہایت فراخ دلی سے ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا، اور مل کر صدر مقام میں باوجود ہم لوگوں کی معذرت کے بیٹھایا، اسکے بعد فرمایا کہ جس وقت میں نے سنا کہ رائے بریلی سے کوئی صاحب آئے ہیں تو میں سمجھ گیا تھا کہ صاحبزادے ہوں گے کیونکہ علم سے ان لوگوں کو ہمیشہ سے مناسبت ہے، پھر انہوں نے ایسی باتیں شروع کیں جن کو سن کر شرم و ندامت سے ہمارے سر جھکے جاتے تھے، اور جتنے وہاں بیٹھے تھے، انہوں نے ایسا اظہار عقیدت کیا کہ ہم کو ان بزرگوں کے حسن ظن پر حیرت ہے، ہم لوگوں کی مخدومیت اور اپنی خادمیت کا اظہار ہر ہر بات پر فرماتے تھے، سب سے زیادہ شکایت اس بات کی تھی کہ آپ سرائے میں کیوں ٹھہرے، کیا آپ ہم کو اپنا خادم نہیں سمجھتے، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ سرائے میں رہیں، مولوی محمود حسن صاحب نے کہا کہ کل میں نے بہت اصرار کیا لیکن انہوں نے مانا نہیں، مولانا ذوالفقار علی صاحب نے کہا کہ آپ نے انکے اقرار کو تسلیم ہی کیوں کیا، آخر کو آدمی سرائے بھیجا گیا، اور اسباب اٹھوا کر منگولیا۔

اس عرصہ میں کھانا آیا۔ نہایت اہتمام کے ساتھ پکویا گیا تھا، کھانے کے بعد مولوی ذوالفقار علی صاحب نے اپنے ہاتھ سے اور مولوی محمود حسن صاحب نے بستر بچھا کر کہا کہ آپ قیلولہ فرمائیں۔ (۱)

ان سب بزرگوں نے نہایت افسوس کے ساتھ ذکر کیا کہ آپ دو دنوں سے آئے ہوئے ہیں بارش کی وجہ سے ہم لوگوں کو اطلاع نہیں ہوئی، ورنہ ہم سرائے میں حاضر ہوتے، اور آپ نے باوجود اس بات کے جاننے کے کہ دیوبند میں سب ہمارے خادم ہیں یہاں فروکش ہونے سے گریز کیا“ (۱)

(۱) اس وقت مولانا ذوالفقار علی کی عمر ۷۵ سال تھی جبکہ مولانا عبدالحی کل ۲۶ سال کے نوجوان تھے اس تواضع و فنائیت کا ذرا اندازہ کیجئے۔ (عمران)

علماء و صلحاء سے عقیدت

مولانا ذوالفقار علی صاحب نہ صرف خود صاحب علم و فضل اور علم دوست تھے بلکہ علماء و صلحاء سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے، اس کی ایک جھلک سابق عنوان میں آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ محض صاحبزادگی کی بنا پر ایک نوجوان کے سامنے کس طرح بچھے بچھے جاتے تھے۔ اس کی ایک جھلک ان مراٹھی میں بھی نظر آئیگی جو مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر آپ کے قلم سے نکلے ہیں جن کے کچھ اقتباسات ابھی ہدیہ ناظرین کئے جائیں گے۔ مولانا سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے اس سفر نامہ میں ہے کہ ان حضرات کی مجلسیں بزرگان سلف کے تذکروں سے معمور ہوتی تھیں یہ حضرات ”حضرت سیدنا (سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ) کے قصص اس شیفٹگی سے بیان کرتے تھے، جیسے عاشق اپنے معشوق کے حالات بیان کرتے وقت مزے لیتا ہے۔“ (۲)

ان بزرگان دیوبند نے بہت سے واقعات حضرت سید احمد شہید کے بیان کئے جن کو کسی قدر تفصیل کیساتھ مولانا عبدالحی صاحب نے اپنے سفر نامے میں بیان کیا ہے لکھا ہے کہ ”مولانا ذوالفقار علی صاحب فرماتے تھے کہ سید صاحب اس نواح کے اکثر قصبات میں تشریف لے گئے ہیں لیکن جہاں جہاں تشریف لے گئے ہیں وہاں اب تک خیر و برکت ہے، اور دو ایک گاؤں اور قصبے ایسے ہیں جہاں نہیں گئے۔ وہاں اب تک وہی نحوست اور شامت باقی ہے، چنانچہ منگلور میں نہیں گئے وہاں لوگوں میں وہی جہالت اور قسامت ہے، اور ایک مختصر گاؤں ہے جہاں مسلمانوں کے دو چار گھر ہیں اتفاقاً سید صاحب کسی ضرورت سے وہاں بھی گئے ہیں وہاں بھی خیر و برکت پائی جاتی ہے، گویا ایک نور مستطیل ہے کہ جدھر گئے ادھر وہ بھی پھیل گیا۔“ (۳)

غرض مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بزرگان دیوبند نے حضرت سید احمد شہید کے اتنے واقعات و کرامات بیان کئے کہ مولانا عبدالحی صاحب حیران رہ گئے، اور ہو سکتا ہے کہ انہوں نے محسوس کیا ہو کہ ”صاحب البیت ادری بما فیہ (صاحب خانہ ہی جانتا ہے کہ اس کے گھر میں کیا ہے) کی واقعیت و تحقق کیلئے صرف نسبی علاقہ سے کوئی بھی صاحب البیت نہیں بن جاتا۔“

مظاہر العلوم کی سرپرستی

مظاہر العلوم سہارنپور کے بعض ممبران کے غیر سنجیدہ اور نامناسب طرز عمل سے دل برداشتہ ہو کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۹ رجب ۱۳۱۹ھ کو مظاہر العلوم کی سرپرستی سے استعفاء دیدیا، حالات بڑے ہی سنگین تھے۔ ممبران کا ایک گروہ مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مخالفت میں سرگرم تھا، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے استعفاء کے بعد ان کیلئے راہ عمل اور بھی آسان ہو گئی اور انہوں نے مولانا کو صدر مدرس سے جبراً سبکدوش کر دیا، میرا مقصد اس واقعہ کی تفصیل بیان کرنا نہیں (۱) غرض یہ ہے کہ انتہائی کشیدہ اور ناموافق حالات میں سہارنپور میں تعینات ایک انسپکٹر صاحب علی (جو اپنی سخت گیری اور حسن انتظام میں معروف تھے) اور مجسٹریٹ نعیم اللہ خاں صاحب نے مصالحت و رضا مندی کی راہ ہموار کرتے ہوئے مظاہر العلوم کیلئے مندرجہ ذیل حضرات کو سرپرست مقرر کرنے کی تجویز پیش کی، (مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب اور مولانا اشرف علی صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ) جسے منظور کر لیا گیا، اور بالا خر ۲۶ ذی قعدہ ۱۳۲۰ھ کو ان نئے سرپرستوں نے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

۲۷ / محرم ۱۳۲۱ھ کو مظاہر العلوم میں جو عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نہایت معرکہ الاراء، موثر اور دلنشین تقریر فرمائی اس جلسہ کی صدارت کا اعزاز مولانا ذوالفقار علی ہی کو حاصل ہے۔

مولانا ذوالفقار علی مظاہر العلوم کے کاغذی یا خانہ پری کے سرپرست نہ تھے بلکہ نہایت توجہ و انتہاک سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے اور معاملات میں باریک بینی سے کام لیتے تھے۔ مولانا محمد ثانی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے حیات خلیل میں جو یہ جملہ تحریر کیا ہے مجھے تو اس سے کم از کم یہی سمجھ میں آتا ہے ”مولانا ذوالفقار علی صاحب کی سرپرستی کے زمانے میں ان کی بزرگی اور بڑائی کی وجہ سے بقیہ سرپرست اور ارکان ان کا ادب و احترام کرنے پر مجبور تھے“ (۲) ظاہر ہے کہ یہ ادب و احترام شخصی اور ذاتی نہیں بلکہ مشوروں اور فیصلوں ہی کا ہو گا مولانا ذوالفقار علی صاحب سے مولانا خلیل احمد صاحب بھی مشورہ کرتے رہتے تھے لکھا ہے کہ ”آپ کے انتقال سے جہاں مدرسہ (مظاہر العلوم) کو نقصان پہنچا وہاں حضرت مولانا (خلیل

(۱) تفصیل کیلئے تاریخ مظاہر جلد اول تذکرۃ الخلیل و حیات خلیل وغیرہ کتب ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) حیات خلیل ص ۱۹۵ (از مولانا محمد ثانی حسنی ندوی)

احمد صاحب) کو بے حد قلق و افسوس ہوا کہ ان کے نیک مشوروں سے آپ مستفید ہوتے رہتے تھے، اور مدرسہ کو ترقی ہو رہی تھی، ان کی ذات گرامی آپ کیلئے بڑا سہارا اور ان کی شخصیت آپ کیلئے محسن کا درجہ رکھتی تھی“ (۱) آپ قریب ۳۱ سال مظاہر العلوم کے سرپرست رہے۔

وفات

مولانا ذوالفقار علی نے ۸۵ سال کی عمر میں ۱۵ رجب ۱۳۲۲ھ بروز دوشنبہ کو دیوبند میں وفات پائی جس کی قدرے تفصیل مولانا سید محبوب رضوی نے یوں بیان فرمائی ہے۔
 ”حضرت مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ (والد ماجد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) ان اکابر میں سے تھے جو دارالعلوم کی بناء و تاسیس میں شروع ہی سے شریک رہے تھے۔ دارالعلوم کے قیام کے بعد تمام عمر مجلس شوریٰ کے رکن رہے، دارالعلوم کا خزانہ انہیں کی تحویل میں رہتا تھا، نہایت امانت و دیانت کے ساتھ انہوں نے اس خدمت کو انجام دیا، علم و فضل، تدین، وجاہت دنیوی اور خوش خلقی میں یگانہ روزگار تھے، تحصیل علوم دہلی کالج میں کی تھی استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت تلمذ حاصل تھی، محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے عربی ادب سے خاص شغف تھا۔..... ۱۵ رجب ۱۳۲۲ھ

بروز دوشنبہ پچاسی سال کی عمر میں انتقال فرمایا، قبر کی نشاندہی کے لئے حضرت مولانا فضل الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر بڑا دلچسپ ہے۔

آلِ بخشِ آسودہ تر، مابینِ دیوارِ ان خویش

قاسم (۲) بزمِ مودتِ احسن (۳) شائستہ خو (۴)

آپ کی وفات پر مظاہر علوم سہارنپور کے ذمہ داران نے اپنے سرپرست کو جن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا اور آپ کے اخلاص نفس اور علمی و عملی کارناموں کو سراہا وہ یہ ہیں۔

”حضرت مولانا موصوف مولانا مملوک الاعلیٰ صاحب کے خاص الخاص شاگردان میں سے تھے، آپ نے تمام عمر علوم دینیہ کی خدمات کے لئے وقف کر دی، اگر بقائے نفس کے لئے ملازمت بھی کی تو علوم ہی کی خدمت کیلئے یعنی مدت دراز تک سررشتہ تعلیم مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر رہے اور ان ایام ملازمت میں بھی اپنی دستگاہ علمی کو ترقی دیتے رہے، چنانچہ اس

(۱) حیات خلیل ص ۱۹۵، (۲) مولانا محمد قاسم نانوتوی (۳) مولانا محمد احسن نانوتوی (۴) تاریخ دارالعلوم جلد اول ص ۲۱۰

زمانہ میں بہت سی کتابیں علوم ادب و فصاحت و بلاغت کے متعلق تصنیف کیں، اور اکثر کتب عربیہ کا با محاورہ سلیس ترجمہ کر کے خادمان و طالبان علوم دینیہ پر بہت بڑا احسان کیا، جن میں حماسہ، مثنوی قصیدہ بردہ، بابت سعاد و غیرہ شامل ہیں، یہ تمام کتب حضرت مولانا مرحوم کی حسن لیاقت اور علوم عربیہ کے ساتھ خاص دلچسپی ظاہر کر رہی ہیں، اللہ تعالیٰ مرحوم و مغفور کو اپنے جوار رحمت اور زمرہ صالحین میں داخل فرمائے آمین ثم آمین، (۱)

اولاد و احفاد

وفات کے وقت مولانا ذوالفقار علی کی اولاد و احفاد کی تعداد ساٹھ سے متجاوز تھی، آپ کے چار صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں، اہلیہ محترمہ کی وفات کے بیان میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ آپ کی دونوں صاحبزادیاں عقیفہ، صالحہ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی مالک اور نہایت دیندار تھیں، دیوبند کے معزز خاندانوں میں ان کے نکاح ہوئے اور سلسلہ اولاد جاری ہوا، مختصراً آپ کے چاروں صاحبزادوں کا تعارف سپرد قلم ہے۔ (۲)

(۱) شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب

۱۲۶۸ھ میں بمقام بریلی پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ایک بزرگ ”میانجی منگلوری“ اور میاں جی عبداللطیف صاحب سے پائی، پھر اپنے عم محترم (مولانا مہتاب علی رحمۃ اللہ علیہ) سے ابتدائی عربی و فارسی کی کتب پڑھیں، انجھی آپ تہذیب و قدوری وغیرہ پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا اور کاتب تقدیر کا یہ نوشتہ پورا ہوا کہ آپ اس عظیم الشان درس گاہ کے ”طالب علم اول“ بنے جہاں آپ نے مولانا محمود صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے تحصیل علوم کیا اور بعد ازاں بعض انتہائی کتب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔

درسیات سے فراغت کے بعد ۱۲۹۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں معین مدرس بنائے گئے، ایک سال بعد ۱۲۹۲ھ میں آپ کو مدرس چہارم کے طور پر مقرر کیا گیا، اور پھر مولانا سید احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے استعفیٰ کے بعد صدارت تدریس آپ کو سپرد ہوئی، یہ ۱۳۰۸ھ کی بات ہے،

(۱) تاریخ مظاہر العلوم جلد اول ص ۱۰۱ (از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب)

(۲) ان معلومات کی فراہمی میں حیات شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ (از حضرت مولانا اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ) اور تاریخ دارالعلوم

دیوبند (از مولانا سید محبوب رضوی) سے مدد لی گئی ہے۔

اس عہدے پر آپ ۱۳۳۳ھ تک فائز رہے۔

تحریک استخلاص وطن میں آپ نے قائدانہ کردار ادا کیا، متعدد موقع علمی تصانیف چھوڑیں، آپ کے شاگردوں میں بڑے بڑے مجاہد، محقق، علامہ و فہامہ، مصنف، محدث، مفسر، داعیان حق، متکلمین اسلام اور بحر ذخار علماء شامل ہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس میں بھی آپ پیش پیش تھے۔

جدوجہد آزادی میں پانچ برس کے قریب قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، زمانہ اسارت ہی میں ترجمہ قرآن کا اکثر حصہ تالیف فرمایا جس کو من جانب اللہ زبردست مقبولیت حاصل ہوئی، جس پر علامہ شبیر احمد عثمانی کے حواشی نے اس کی افادیت کو دوچند کر دیا ہے، چند سال قبل سعودی حکومت نے بھی اس ترجمہ کو لاکھوں کی تعداد میں شائع کر کے ہدیہ تقسیم کیا۔ آپ کی وفات ۱۳۳۹ھ میں ہوئی قبرستان قاسمی دیوبند میں آرام فرماہیں۔

(۲) مولانا حامد حسن صاحب

ان کی ملازمت کا اکثر حصہ ضلع بجنور میں گذرا اور اپنے والد محترم سے صرف سات سال بعد ۱۳۲۹ھ میں انتقال فرمایا۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو ان کے انتقال سے بڑا صدمہ پہنچا تھا۔

(۳) مولانا الحاج الحافظ حکیم محمد حسن صاحب

آپ نے برادر اکبر حضرت شیخ الہند کے علاوہ گنگوہ قیام فرما کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے علوم کی تحصیل کی، دارالعلوم میں اور بھی بعض اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ حضرت گنگوہی سے شرف بیعت بھی حاصل ہے طب کی تعلیم دہلی میں حکیم عبد المجید خاں صاحب سے حاصل کی۔ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم سے فراغت پائی اور ۱۳۰۲ھ میں مولانا محمد یعقوب صاحب کی وفات کے بعد مدرس عربی و طبیب کی حیثیت سے تقرر ہوا، طلباء دارالعلوم کو طب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کے علاج و معالجہ کی خدمت بھی آپ کے سپرد تھی اسی کے ساتھ ساتھ تفسیر و حدیث اور فقہ کی اعلیٰ کتابیں بھی ان کے اسباق میں رہتی تھیں۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے حالانکہ عمر میں چھوٹے تھے مگر آپ ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے، جن دنوں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ مالٹا میں اسیر تھے تو خطوط میں پورے خاندان

کو ان کی تعظیم و اطاعت کی تاکید فرماتے تھے۔

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رقم طراز ہیں۔

”حکیم صاحب بھی عجیب جامع الکملات عالم ہیں ایام تلمذ و حاضری میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی سعادت شفقت و امتیاز حاصل فرمائی، متعدد حج بٹمانیت ادا کیے، دارالعلوم دیوبند کی مدرسہ و طبابت اور اپنا مطب اور اہل شہر کا معالجہ کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اپنے والد ماجد کے اموال و جائیداد کا انتظام و تکفل سب آپ ہی کرتے ہیں اور مشغلہ سیر و شکار بھی ہاتھ سے نہیں جاتا“۔ (۱)

۴۳ سال تک دارالعلوم دیوبند میں علمی و طبی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ کو وفات پائی، قبرستان قاسمی میں استراحت فرما ہیں، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(۴) مولوی حافظ محمد محسن صاحب

یہ سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چھوٹے بھائی ہونے کے سبب ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور بزرگانہ شفقت و پدرانہ برتاؤ فرماتے تھے، ان کو بھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے غایت الفت و محبت تھی، سوانح شیخ الہند میں مولانا سید اصغر حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ”اسیری کے زمانہ میں حضرت (شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) کو یاد کر کے زار زار روتے تھے اکثر عمر میں مشغلہ ملازمت رہا“

علمی یادگار

مولانا ذوالفقار علی صاحب کی آٹھ شائع شدہ تصانیف دستیاب ہوئیں، ان کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ تو مطالعہ کے بعد اہل علم و فن ہی کر سکتے ہیں، اس ناکارہ نے جو بعض کتابوں کی ورق گردانی کی تو محسوس ہوا کہ محققانہ انداز کی تصانیف ہیں۔ آپ کو عربی ادب سے خصوصی لگاؤ اور از حد شغف تھا، اسلئے زیادہ تر کتابیں عربی دواوین کی شروحات ہیں، طرز یہ ہے کہ اولاً شعر میں آئے کسی مشکل لفظ کی تحقیق فرماتے ہیں اور پھر اس کا با محاورہ ترجمہ قلم بند فرماتے ہیں، آپ کی یہ کتابیں نہ تو تبصرے کی محتاج ہیں اور نہ ہی راقم الحروف اس کا اہل، لہذا تفصیل سے احتراز کرتے ہوئے اور ان کے نام و پتہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) التعلیقات اُردو شرح سبہ معلقہ

یہ کتاب مولانا عبد الاحد کے اہتمام سے ۱۳۱۲ھ میں مطبع مجتہائی سے شائع ہوئی کل صفحات ۱۲۸ ہیں عمدہ شرح ہے۔

(۲) تسہیل البیان اُردو شرح دیوان متنبی

یہ کتاب آپ نے مولانا عبد الاحد مالک مجتہائی دہلی کی خصوصی فرمائش و اصرار پر مرتب فرمائی جس کا جا بجا اشتہار میں مولانا موصوف نے ناظر ہار کیا ہے۔ شعر میں آئے مشکل الفاظ کے حل و تحقیق کے بعد با محاورہ عمدہ ترجمہ و شرح ہے، یہ کتاب بڑے سائز کے ۸۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور شائقین کیلئے ایک ذخیرہ نایاب ہے، دسمبر ۱۸۹۳ء میں مطبع مجتہائی سے شائع ہوئی۔

(۳) تسہیل الدراسة اُردو ترجمہ و شرح دیوان حماسہ

یہ کتاب بھی مطبع مجتہائی ہی نے شائع کی، دستیاب نسخہ پر سن اشاعت ۱۹۱۱ء درج ہے بڑے سائز کے ۶۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۴) الارشاد اُردو ترجمہ قصیدہ بانٹ سعاد

کتب خانہ دارالعلوم میں جو نسخہ موجود ہے اس پر ۱۳۱۷ھ سن طباعت درج ہے اس کتاب کے صفحات کی تعداد ۴۸ ہے۔

(۵) عطر الوردہ شرح اُردو قصیدہ بردہ

اس کتاب کی طباعت کا شرف بھی مطبع مجتہائی ہی کے حصہ میں آیا، کتاب پر سن اشاعت ۱۹۱۱ء (مطابق ۱۳۲۹ھ) درج ہے اس کتاب کے کل صفحات ۱۲۸ ہیں۔

(۶) تذکرۃ البلاغہ

یہ کتاب علم معانی میں ہے، مطبع نول کشور اور مطبع مجتہائی دونوں ہی جگہ سے شائع ہوئی تعداد صفحات ۱۸۰ ہے۔

(۷) تسهیل الحساب

یہ رسالہ علم ریاضی میں ہے، محمد اکرام چغتائی کا خیال ہے کہ یہ پر بیٹ کی الجبرا پر انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جو بریلی سے ۱۸۵۲ء میں طبع ہوا جس کو مولانا ذوالفقار علی نے ایچ سی رائنڈ کے ایما پر کیا تھا، ہمیں دو نسخے دستیاب ہوئے ایک مطبع نظامی کانپور کا شائع شدہ ہے (۱۲۹۳ھ میں) اور دوسرا مطبع مجتبائی دہلی کا شائع کردہ ہے (۱۳۱۱ھ میں) اس رسالے کے صفحات کی تعداد ۱۰۸ ہے۔

(۸) الهدية السنية في ذكر

المدرسۃ الاسلامیۃ الدیوبندیۃ

یہ قصبہ دیوبند اور دارالعلوم کی مختصر تاریخ ہے، جس میں آپ نے دارالعلوم اور دیوبند کی عمارتوں، آب و ہوا، صنعت و حرفت، جنگل و پیداوار، باشندوں کی مزاجی کیفیات اور یہاں پائی جانے والی اہم اشیاء ضرورت و خوردنی کا پر تکلف اور ادیبانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔

ادب سے خاص شغف

یوں تو آپ کو تینوں ہی زبانوں (عربی و فارسی اور اردو) کے ادب سے دلچسپی اور اس میں مہارت تھی تاہم عربی ادب سے خاص شغف تھا، چنانچہ آپ نے اکثر عربی ادب کی ہی کتابوں کو جو لانی طبع کامیدان بنایا اور متعدد عربی ادب کی کتابوں اور دواوین کی شرح و تراجم لکھے، جس کی قدرے تفصیل آپ تصانیف عنوان کے تحت ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

نثر و نظم دونوں ہی صنفوں میں آپ نے طبع آزمائی کی اور سادگی و سلاست کے ساتھ ساتھ بعض تحریروں کو مقفی و مجمع بنا کر آراستگی بخشی، قارئین کی تسکین ذوق کی خاطر ہم تینوں ہی زبانوں سے آپ کی تحریرات کے چند مختصر اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

چونکہ عربی ادب سے آپ کو خصوصی لگاؤ اور دلچسپی تھی اس لئے اولاً اسی سے چند جواہر پارے ملاحظہ فرمائیں۔

دارالعلوم اور دیوبند کے احوال کے متعلق جو رسالہ آپ نے الهدیۃ السنیۃ کے نام سے

تالیف فرمایا اس میں دیوبند کے متعلق رقم طراز ہیں۔

کورة قديمة وقصبة عظيمة، مدينة كريمة وبلدة فخيمة، كانها اول عمران
عمر بعد الطوفان، ذات المعاهد الوسية، والمساجد الرفيعة، والمعالم المشهورة،
والمقابر المزورة، والاثار المحموده، والاخبار المسعوده، وابنية مرصوة
وامكنة مخصوصة.

پھر یہاں کی ارضی خصوصیت کو اس طرح واضح کرتے ہیں، طينها اللاذب احکم من
الجص وحماءها المسنون اثبت من الرصاص في الرص۔ (۱)

اس وقت میں چینی مل (Sugar Factory) تو یہاں نہ ہو گا تاہم جس چیز کی چینی
تیار ہوتی ہے اس کی فصل تو بہر حال زوروں پر تھی، اس لئے گنے کے اس مزید اذائقہ اور اس
سے تیار کھانڈ (شکر) کو بھلا کیسے فراموش کر دیتے! فرماتے ہیں واما قصب السكر
والقند فقلما يوجدان في البلاد مثل ديوبند في الذوق كالعسل وفي الريح كالرند
فاين منها سمرقند۔ (۲)

اسی طرح یہاں کے آم کی جب تعریف کرنے پر اترے تو دوسرے علاقوں کے بہت
سے لوگوں کے منہ میں ضرور پانی بھر آیا ہو گا اور شاید بہت سے یہ سوچ کر عازم دیوبند ہو گئے
ہوں گے کہ وہاں مدرسہ و علماء کی زیارت و استفادہ کا تو موقع ہا تھا آئے گا ہی ساتھ میں ایسے
لذیذ آم بھی میسر آجائیں گے۔ گویا ”آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام“ فرماتے ہیں۔

من طعامها في قلب شهوة فكانها مجموعة الشهوات

يا حسن حمرتها وخضرتها وصف رتها على الاشجار في الروضات

فكانها الوان وجنات الحبا ئب مسها العشاق في الخلوات

جل القدير الفرد من في ثمرة بالصنع يجمع سائر الثمرات (۳)

اشعار تو آم کی تعریف کے اور بھی ہیں لیکن نمونہ کیلئے ان سے بھی کام چلایا جاسکتا ہے
اور ممکن ہے کہ قاری ان کے ذریعہ ہی دیوبندی آم کے ذائقہ معنوی سے محفوظ ہو سکے۔ سلطان
عبد الحمید خاں کی مدح میں آپ نے ایک طویل قصیدہ تحریر فرمایا تھا جسکے بعض اشعار یہ ہیں۔

عبد الحمید امان خائفین فید الظالمین سدید القول والعمل

العاذل الباذل مرهوب سطوته
شهم همام امیر المومنین و سلطان
اغناکم اللہ بالنصر المبین لکم
فالكفر فی خطر والدين فی ظفر
وقد دعانی الی الانشاد یجدکم
عبارت کی روانی و سلاست، تخیل کی رفعت، زور بیان، الفاظ کا حسن استعمال، تعریف و مدحت اور دعاء و خیر خواہی بھی کچھ تو ان اشعار میں سمویا ہوا ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات پر جو عربی مرثیہ آپ کے قلم سے نکلا وہ بھی ایک ادبی شاہکار اور دل مضطر کی ایک پکار ہے، نہ جانے دل کی کن گہرائیوں، درد و غم اور اضطراب و بے قراری سے یہ اشعار زبان پر آئے ہیں کہ پڑھنے والے کا کلیجہ بھی منہ کو آتا ہے، اس دل کا کیا حال ہو گا جس کے سمندر غم سے نکل کر یہ الفاظ خشکی قرطاس پر آئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

یا قاسم الخیر من للعلم والدين
یا قاسم الخیر من للطارقین ومن
یا قاسم الخیر اسمع من لکربتنا
من للمدارس من للوعظ من لهدی
رحلت عنا ولم یوجد عدیلک وفي
لقد مضى صاحبی من فی مصیبتہ
وکیفما ستروه فی التراب ولا
اذا ارتحلت و ارشاد و تلقین
للضارعین مکروب و محزون
یا قاسم الضیر قل من للمساکین
من للنکات توضیح و تبیین
العلوم والفضل من عرب الی الصین
برئت من ذکر اسلاء و تسکین
یکون للشمس من سترو تدفین (۲)

ان اشعار میں جہاں ادبیت اپنے عروج پر ہے وہیں مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کا مقام و مرتبہ اور مولانا ذوالفقار علی کی ان سے عقیدت و محبت بھی ظاہر و باہر ہے، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ہی کے انتقال پر آپ نے فارسی زبان میں بھی مرثیہ لکھا تھا جس سے آپ کی فارسی زبان و ادب پر دسترس و مہارت نمایاں ہے۔ نمونہ کے لئے چند اشعار حاضر ہیں۔

مرشد و ہادی ما شاہ محمد قاسم رہ نمائندہ گمراہ محمد قاسم

(۱) قصائد قاسمی (مطبوعہ ۱۳۰۹ھ) ص ۱۶

(۲) سوانح قاسمی جلد سوم ص ۱۶۹-۱۷۰ (از مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

بادل روشن و آگاہ محمد قاسم رفت زیں دار فنا آہ محمد قاسم

حالیاز یستم مشکل و مردن مشکل

ہر نفس خوردن ز خمی و نخوردن مشکل

جامہ علم و عمل برقد تو زیبا ہے تو راست خلعت فقر ببالائے نکویت زیباست

چوں تو سرورے گلستاں غنم کم برخاست خود ازیں است کہ از رفتن تو حشر بپاست

مردماں اشک خود از بہر تو کردند سبیل

حالیا غیر جمیل است مگر صبر جمیل (۱)

ان اشعار سے جہاں ان کے دل کی تڑپ و بے قراری ظاہر ہے وہیں یہ بھی صاف واضح

ہے کہ فارسی زبان پر مولانا کو زبردست تسلط اور قدرت کلام حاصل تھی، آخری شعر میں کس

خوبصورتی سے دل کے اضطراب کیساتھ ساتھ ”صبر جمیل“ کو فٹ کیا ہے دیکھنے کی بات ہے۔

اخیر میں ایک مختصر اقتباس آپ کی اردو نثر کا بھی سپرد قلم ہے، یہ ایک خط سے ماخوذ ہے جو

آپ نے بریلی قیام کے دوران ڈاکٹر اشپرینگر (پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ و ناظم کل مدارس کلکتہ)

کے نام لکھا ہے، یہ صاحب اس وقت دہلی کالج کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے جب مولانا

ذوالفقار علی وہاں زیرِ تعلیم تھے لکھتے ہیں۔

”لعل فہرست بدشواری ہاتھ آئی، اور اصل فہرست بہت حراب اور بے ترتیب اور غلط تھی۔ اس لئے کہ نقل اچھے نہیں ہو سکا، اور اس کے علاوہ کتب خانہ بخوبی روشن نہیں

ہی اس لئے اس کی شکل اچھی نہیں ہے، اور اس کے ملاحظہ سے حال لب حانہ خوبی رون میں
 متاثر ہو سکتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ بعد انتقال

ہوتا اس لئے بندہ اس کے نیچے میں مٹاں تھا..... اساء اللہ تعالیٰ بعد اسٹان
مقدمہ حتی المقدور ترتیب فہرست مطلوب میں سعی کی جائے گی۔ (۲)

مندرجہ بالا نثری و شعری اقتباس سے مولانا کا ادبی ذوق نمایاں ہے اور عربی ادب سے

خصوصی شغف تو اظہار من الشمس ہے، اب میں ان سطور کو یہیں ختم کرتا ہوں۔

والله الموفق وهو المستعان ربنا اغفر لنا ذنوبنا و كفر عنا سيئاتنا وتوفنا

مع الابرار امين.

(۱) سوانح قاسمی جلد سوم ص ۱۶۲-۱۶۳، (از مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

toobaa-elibrary.blogspot.com

حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ

toobaa-elibrary.blogspot.com

حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ

فہرست

- | | |
|-----|--|
| ۴۹۶ | مظاہر علوم میں آپ کی آمد اور اس کی خدمات جلیلہ |
| ۴۹۸ | درس و تدریس |
| ۴۹۹ | بیعت و ارشاد اور اجازت و خلافت |
| ۵۰۰ | مشہور تلامذہ |
| ۵۰۱ | معمولات، عادات اور خصوصیات |
| ۵۰۲ | وفات |

حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ

مولانا محمد شاہد سہارنپوری

آپ کے والد ماجد کا نام حافظ لطف علی اور جد محترم کا نام حافظ محمد حسن تھا، مولانا موصوف کی پیدائش ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء میں نانوتہ میں ہوئی۔ محمد مظہر تاریخی نام بھی تھے۔ (مشہور عالم دین اور کثیر التصانیف مولانا محمد احسن صاحب نانوتوی آپ کے چھوٹے بھائی تھے) حفظ قرآن پاک اور ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ پھر استاذ المشائخ حضرت مولانا مملوک علی صاحب کی خدمت میں چلے آئے، اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ شیخ صدر الدین اور شیخ رشید الدین دہلوی بھی آپ کے استاذ تھے۔

علم حدیث حضرت شاہ عبدالغنی صاحب اور حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے حاصل (۱) کیا۔ فراغت کے بعد اجمیری کالج اور پھر آگرہ کالج میں تقرر ہوا حضرت مولانا محمد مظہر صاحب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدین میں سے ہیں۔ آزادی کی اس لڑائی میں آپ نے مردانہ وار حصہ لیا۔ شمالی کے مشہور جہاد میں آپ بھی شریک تھے۔ اسی موقعہ پر پیر میں گولی لگی۔ اسکے بعد آپ کچھ عرصہ روپوش ہو رہے۔ جب عام معافی کا اعلان ہوا تو ظاہر ہوئے۔ مولانا الحان جمفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی سرپرست مدرسہ عالیہ مظاہر علوم و مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند بیان کرتے ہیں کہ :-

مجھ سے ہردوئی میں ایک شخص نے بیان کیا کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب زبان بہت کثرت کے ساتھ اپنے ہونٹوں پر پھیرتے رہتے تھے،

(۱) پروفیسر انوار الحسن صاحب شیرکوٹی نے اپنی تالیف انوار قاسمی میں محدث سہارنپوری کو حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کے اساتذہ حدیث میں شمار کیا ہے۔

کسی کے اصرار کے ساتھ دریافت کرنے پر فرمایا کہ ۱۸۵۷ء میں میں بھی جہاد میں شریک تھا۔ میرے گولی لگی میں گر گیا، اسی حال میں دیکھا کہ حواریں شربت کے گلاس لئے ہوئے آئیں اور شہداء کو پلانا شروع کر دیا۔ ایک گلاس میرے سامنے بھی لایا گیا۔ میں نے جس وقت اس کو منہ لگایا اور میرا لب تر ہوا تو دوسری نے یہ کہہ کر وہ گلاس ہٹا لیا کہ ابھی اس کی حیات باقی ہے۔ یہ ان میں سے نہیں وہ لذت ہونٹوں پر اب تک باقی ہے جو مجھے چین نہیں لینے دیتی۔

مظاہر علوم میں آپ کی آمد اور اس کی خدمات جلیلہ

مولانا محمد مظہر صاحب کی آمد مدرسہ مظاہر علوم میں ماہ شوال ۱۲۸۳ھ میں ہوئی اس طور پر مولانا اس جماعت کے ایک فرد اعلیٰ بنے جن کی مخلصانہ مساعی اور جدوجہد کی بناء پر مظاہر علوم ایک تابندہ یادگار بن گیا۔ مظاہر علوم میں مولانا کی آمد کا ذریعہ حضرت مولانا سعادت علی صاحب تھے کہ وہی موصوف کو بذات خود لے کر آئے تھے۔

مولانا محمد مظہر صاحب مظاہر علوم کی تمام تر تعلیم کے ذمہ دار اور مدرس اعلیٰ تھے۔ اس وجہ سے آپ کی تمام تر توجہ مدرسہ کے معیار تعلیم کو بلند تر کرنے کی طرف رہتی جس میں آپ پوری طرح سے کامیاب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مدرسہ کے امتحانات ہوتے تو ذمہ داران مدرسہ قاضی فضل الرحمن صاحب، مولانا سعادت علی صاحب، مولانا ذوالفقار علی صاحب (والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ) اس کا کھلے طور پر اعتراف کرتے، چنانچہ ۱۲۸۵ھ میں ہونے والے امتحان اور طلباء کی علمی استعداد کی پختگی کی کیفیت تحریر کرنے کے بعد یہ حضرات لکھتے ہیں۔

”یہ سب نتیجہ کارگزاری اور محنت مولانا محمد مظہر صاحب کا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ دوسرے مدرس بھی ایسی ہی محنت کریں گے جیسی کہ مولوی صاحب نے فرمائی ہے۔ (۱)“

روداد کے اس اقتباس بالا سے مولانا کی تعلیمی محنت پر روشنی پڑتی ہے جب کہ درج

ذیل سطریں مولانا کی مجموعی خدمات کا اظہار کر رہی ہیں۔

مجد الاماثل فخر الافاضل مولانا مولوی محمد مظہر صاحب سلمہ مدرس اول۔
کارروائی مدرسہ کی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے کار متعلقہ اور امور
کلیہ اور جزئیہ انتظام مدرسہ میں ایسی توجہ فرما رہے ہیں کہ جو حالت موجودہ
مدرسہ کی بنظر تفصیل معائنہ کرتا ہے تو ممنون و مشکور مولانا مدوح کا ہوتا ہے
اور ایک رکن اعظم قیام مدرسہ کا تصور کرتا ہے۔ الحمد للہ علی ذلک (۱)

۱۳۰۱ھ میں قطب عالم حضرت اقدس مولانا گنگوہی نور اللہ مرقدہ نے بھی مظاہر علوم کے
طلباء کا امتحان لیا ہے، جو طلباء حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کے پاس پڑھتے تھے۔ ان کا
امتحان بھی حضرت اقدس مولانا گنگوہی نے لیا تو مولانا کی جماعت کو ان الفاظ میں سراہا اور
تعریف فرمائی!

یہ احقر العباد جو چوبیسویں جمادی الثانی ۱۳۰۱ھ میں مدرسہ عربیہ
سہارنپور میں حاضر ہوا تو چند جماعت کا امتحان خواندگی لیا۔ ازاں جملہ دو
شخص درمختار خواں کہ جماعت اولی مدرس اعلیٰ مولوی محمد مظہر صاحب مد فیضہم
کی تھی قابل اجازت و ذی استعداد پایا کہ پڑھنے میں فکر و فہم کو حاضر کرتے تھے۔
لہذا ان کو مجمع عام جامع مسجد میں روز جمعہ اجازت دے کر دستار باندھی گئی۔

مولانا محمد مظہر صاحب کے حادثہ انتقال کے بعد کافی مدت تک ارباب مدرسہ مولانا جیسی
کسی موزوں شخصیت کو تلاش کرتے رہے، تاکہ مولانا مرحوم کی ذمہ داریاں اس کو سونپی جائیں
مگر ایسی ہمہ جہت شخصیت نہ مل سکی، بالاخر ماہ محرم الحرام ۱۳۰۴ھ میں مجلس شوریٰ نے فیصلہ
کر دیا کہ کسی مزید تقرر کے بجائے موجود اساتذہ ہی کے عہدوں میں مختصر سا تغیر و تبدل کر
دیا جائے۔ مجلس شوریٰ کی اس قرارداد کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں!

اگرچہ بعد رحلت جناب مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم مدرس اول مدرسہ
اسلامی شہر سہارنپور کے مد نظر یہ امر رہا کہ کوئی بزرگ قائم مقام بصفات مختص
مرحوم و مغفور کے تشریف لاویں مگر یہ امید حسب مراد پوری نہیں ہوئی۔
(اس کے بعد عہدوں کا تغیر و تبدل لکھا ہوا ہے)

درس و تدریس

مولانا کا قیام مدرسہ میں کچھ کم و بیش انیس سال رہا۔ اس عرصہ میں مولانا موصوف نے علم حدیث میں بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ شریف، موطا امام مالک، سنن دارمی، شمائل ترمذی۔

فقہ میں ہدایہ، درمختار، قدوری، کنز الدقائق، شرح وقایہ

اصول فقہ میں نور الانوار، اصول الشاشی

تفسیر میں ترجمہ قرآن پاک، جلالین، بیضاوی، تفسیر کشاف

معانی میں مختصر المعانی

ادب میں دیوان متنبی، مقامات حریری، حماسہ، سبۃ معلقہ، نعتہ الیمین اور مختلف علوم و فنون میں .. تاریخ یمینی، قصیدہ ہمزہ، تاریخ تیموری، جبر و مقابلہ و مساوات، حصن حصین، نخبۃ الفکر، خطبہ قاموس وغیرہ کتابیں پڑھائیں۔

اس فہرست میں اکثر و بیشتر کتب وہ ہیں جن کو مولانا بسا اوقات سال بھر میں دو مرتبہ پڑھا دیا کرتے تھے۔

مولانا کی تعلیم کا طرز متوسط کتابوں اور انتہائی کتابوں میں یکساں نہ تھا۔ بلکہ متوسط کتابوں میں عبارت کے بعد مولانا تفصیلی مطلب بیان فرماتے اور پھر طالب علم ترجمہ کرتا، اور پھر اجمالی مطلب دوبارہ بیان فرماتے تھے، اور انتہائی کتابوں میں عبارت کے بعد اجمالی مطلب بیان فرماتے تھے مطلب بیان فرما کر ترجمہ کرادیا کرتے تھے۔ طلباء اگر کچھ دریافت کرتے تو بتلا دیتے درس کے دوران عربی عبارت پر گہری نظر رکھتے۔ اگر قاری بے موقعہ جگہ پر عبارت ختم کرتا تو ناراض ہو جاتے۔

مدرسہ کے معاملات بالخصوص اوقات مدرسہ میں بے جا تصرف سے حزم و احتیاط کے متعلق حضرت شیخ زادہ مجددہ تحریر فرماتے ہیں!

حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی قدس سرہ کا یہ معمول میری جوانی

میں عام طور سے مشہور اور لوگوں کو معلوم تھا کہ مدرسہ کے اوقات میں جب

کوئی مولانا قدس سرہ کا عزیز ذاتی ملاقات کیلئے آتا تو اس سے باتیں شروع

کرتے وقت گھڑی دیکھ لیتے اور واپسی پر گھڑی دیکھ کر حضرت کی کتاب میں ایک پرچہ رکھا رہتا تھا، اس پر تاریخوار ان منٹوں کا اندراج فرما لیتے تھے اور ماہ کے ختم پر ان منٹوں کو جمع فرما کر اگر نصف یوم سے کم ہوتی تو آدھے روز کی رخصت لے لیتے اور اگر نصف یوم سے زائد ہوتا تو ایک یوم کی رخصت مدرسہ میں لکھوادیتے۔ البتہ اگر کوئی فتویٰ وغیرہ پوچھنے آتا تھا یا مدرسہ کے کسی کام آتا تو اس کا اندراج نہیں فرماتے۔ (۱)

مظاہر علوم کے زمانہ قیام میں آپ حضرت قطب عالم گنگوہیؒ کے زیر سایہ شروع سوال ۱۲۹۴ھ میں چھ ماہ کی رخصت لے کر حج کے لئے تشریف لے گئے۔ یہی وہ تاریخی سفر ہے جس میں حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب، مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی شامل تھے۔ ماہ ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں یہ قافلہ ہندوستان واپس آیا۔

آپ کی غیبت میں صدارت تدریس کے فرائض محدث سہارنپوری حضرت مولانا احمد علی صاحب نے انجام دیئے۔

بیعت و ارشاد اور اجازت و خلافت

آپ نے بیعت و ارشاد کا تعلق حضرت اقدس گنگوہیؒ سے قائم کیا اور حضرت ہی کی جانب سے اجازت بیعت و خلافت ملی۔

حضرت مولانا عاشق الہی میرٹھی تذکرۃ الرشید میں حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ !

مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ عمر میں حضرت امام ربانی سے بڑے تھے مگر عقیدت کے اعتبار سے گویا حضرت کے جاں نثار خادم اور عاشق جان باز تھے۔ جب تشریف لاتے بے اختیار حضرت کے قدموں پر بوسہ دیتے اور آنکھوں میں آنسو بھرا لیا کرتے۔

حضرت امام ربانی شرماتے اور یوں فرمایا کرتے کہ مولانا آپ مجھے کیوں

نادم فرمایا کرتے ہیں۔ آپ میرے بڑے ہیں مجھ پر آپ کا ادب ضروری ہے
آپ ایسا کام کرتے ہیں تو مجھ کو بڑی شرم آتی ہے۔

مولوی محمد مظہر صاحب بصیرت تھے۔ حضرت کے علو شان اور مرتبت اور
اپنی فرط محبت کے سبب جو کچھ کرتے تھے وہ ان کا طبعی تقاضا تھا۔ مگر حضرت
امام ربانی کبرسنی کے پاس ولحاظ اور جناب رسول اللہ ﷺ کے ارشاد من
لم یرحم صغیرنا ولم یؤقر کبیرنا فلیس منا کے امتثال کو بھول
نہیں سکتے تھے۔ (۱)

اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے قلب مبارک میں آپ کا ایک خاص
مرتبہ و مقام تھا جس کا اندازہ ”مرقومات امدادیہ“ کی ان سطور سے ہو سکتا ہے کہ !
اگر مولوی محمد مظہر نانوتہ میں تشریف رکھتے ہوں تو بعد سلام شوق فرما کر یہ پیام دیں کہ
اس یکتائے زمانہ کو اپنی جماعت میں اپنے دوستوں میں سے شمار کرتا ہوں اور دعائے خیر
سے غافل نہیں ہوں۔ خاطر جمع فرمادیں۔
اور جو کچھ ذکر و شغل کے متعلق دریافت کرنا منظور ہو تو بذریعہ احقر یا مولوی رشید احمد
صاحب کہ ان کو بجائے احقر جانیں معلوم کریں۔

مشہور تلامذہ

آپ کے باکمال شاگردوں کی تعداد بہت بڑی ہے ان میں سے چند مشہور شخصیتوں کے
اسماء بطور نمونہ یہاں لکھے جاتے ہیں۔ مولانا امیر باز خاں سہارنپوری، مولانا راغب اللہ
صاحب پانی پتی، مفتی شاہ دین لدھیانوی، مولانا عبد المنان وزیر آبادی، مولانا مقیم الدین کوٹی،
مولانا نور احمد امرتسری، مولانا معین الدین ابن حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی،
حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، مولانا فخر الدین صاحب گنگوہی، حضرت مولانا
محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند بھی آپ کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں۔ چنانچہ
حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب زاد مجددہ مقدمہ او جز المسالک میں مولانا
ثابت علی استاذ مدرسہ مظاہر علوم کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ !

ومن مفاخره ان الشيخ العلامة بحر العلوم حضرت مولانا
محمد قاسم النانوتوی اخذ عنه بعض الكتب الابتدائية كما

اخبرني مولانا ثابت علي المدرس مظاهر علوم.

مصنف انوار قاسمی کی تحریر کے مطابق حضرت اقدس نانوتوی نے حضرت مولانا سے شرح
ماتہ عامل، ہدایۃ النحو، علم الصیغہ وغیرہ پڑھی ہیں۔

یہاں اس چیز کا اظہار بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ منشی نول کشور (مشہور مطبع کے مالک)
حضرت مولانا کے شاگرد تھے۔ داڑھی رکھتے تھے اور عمامہ باندھتے تھے۔ مولانا کا بے حد
اکرام و احترام کرتے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا کی خدمت میں ملنے کی غرض سے مظاہر علوم
میں آئے تو بالکل مسلمانوں کی شکل و شباهت میں تھے۔ پہچاننا مشکل تھا کہ مسلمان ہیں
یا غیر مسلم۔

۱۲۹۷ھ میں جب کہ مظاہر علوم میں تعمیرات کا سلسلہ چل رہا تھا اپنے اسی تعلق کی بنیاد
پر منشی صاحب موصوف نے بطور امداد ایک سو پینتالیس روپے مدرسہ میں دیئے تھے۔

معمولات، عادات اور خصوصیات

آپ کے اوصاف جمیلہ اور محامد حسنہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت شیخ زاد مجددہ مقدمہ
اوجز المسالک میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب بکثرت قرآن پاک کی
تلاوت فرماتے تھے۔ اور آپ کی زبان پر عام طور سے اسم ذات ”اللہ“ جاری رہتا تھا،
فضول تکلفات سے دور رہتے۔ خداداد رعب آپ پر طاری رہتا۔ بہت کم لوگ آپ کے
رو برو گفتگو کر پاتے، زہاد علماء اور کبار صالحین میں آپ کا شمار ہوتا تھا، علوم عالیہ اور آلیہ
کے آپ جامع تھے، تراویح میں تلاوت قرآن شریف کے وقت خوشبو لگانا آپ کا
خاص معمول تھا۔ (۱)

آپ کی عادت شریفہ نماز جمعہ سہارنپور کی جامع مسجد میں پڑھنے کی تھی جس کے لئے
آپ بڑا اہتمام فرمایا کرتے تھے، وہاں پر حسب موقعہ عوام میں مظاہر علوم کا تعارف بھی
کراتے اور اس کی امداد و اعانت کی طرف متوجہ کرتے۔ میرے جدا مجد حضرت مولانا الحاج حکیم

محمد ایوب صاحب زاد مجدہ اپنے والد محترم مولانا الحاج حکیم محمد یعقوب صاحب کے ساتھ پیش آیا ہوا ایک قصہ نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نماز جمعہ پڑھ کر جامع مسجد سے لوٹ رہے تھے، گرمی کا زمانہ تھا سخت دھوپ میں پیدل آرہے تھے، والد محترم پیچھے چلے آرہے تھے۔ ان کا کئی مرتبہ جی چاہا کہ چھتری کھول کر مولانا پر سایہ کر لیں تاکہ دھوپ کی تمازت سے کچھ بچاؤ ہو سکے، مگر حضرت مولانا کے رعب و جلال کی وجہ سے وہ اس کی ہمت نہ کر سکے اور جامع مسجد سے مدرسہ تک اسی شش و پنج میں راستہ ختم ہو گیا۔

آپ کا معمول تھا کہ رمضان المبارک کی تعطیلات اپنی سسرال قصبہ لکھنوتی میں گزارا کرتے تھے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے آپ سے ابو داؤد شریف لکھنوتی جا کر ہی پڑھی ہے۔

وفات

مولانا درگزرہ کے مریض تھے اور گاہ بگاہ اس اذیت ناک تکلیف میں مبتلا ہوتے رہتے تھے جس کی بناء پر مدرسہ سے طویل رخصت لینا پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ مکمل دو ماہ تک مدرسہ میں تشریف نہ لاسکے اور صاحب فراش رہے۔ آخر کار یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا اور ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ شب یک شنبہ میں آٹھ بجے انتقال فرمایا۔ انتقال کے وقت بمقتضائے حدیث شریف المومن یموت بعرق الجبین آپ کی پیشانی پر ثرت کے ساتھ پسینہ آ رہا تھا۔ عمر تقریباً ستر سال ہوئی، حضرت اقدس گنگوہی نور اللہ مرقدہ کو آپ سے جو تعلق تھا اس کا اندازہ مکاتیب رشیدیہ کی ان سطور سے ہو سکتا ہے جو محدث گنگوہی نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی کو تحریر فرمائی تھیں کہ!

اب حادثہ جدیدہ یہ ہوا کہ مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم ۲۴ شب ذی الحجہ یک شنبہ کو فوت ہوئے، عالم میں اندھیرا ہوا۔ اب سب رفیق رخصت ہوئے دیکھئے کب تک میری قسمت میں اس دنیا کے دھکے لکھے

ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط (۱)

حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی کی قدر و منزلت اور رفعت مرتبہ کا اندازہ اس

سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب ماہ جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ میں حضرت اقدس سہارنپوری علیل ہوئے اور علالت کا سلسلہ طویل ہو گیا تو آپ نے وصیت نامہ تحریر فرمایا جس میں لکھا تھا کہ !

”مجھے استاذی مولانا محمد مظہر نانوتوی کے پہلو میں دفن کریں۔“
آپ کے حادثہ انتقال پر رواد مظاہر علوم میں جو تعزیتی مضمون شائع ہوا وہ یہ تھا!
جناب مولانا مولوی محمد مظہر صاحب مدرس اول جن کے اوصاف بیرون از بیان ہیں۔ وقت آٹھ بجے شب ۲۴ ذی الحجہ کو بمرض درد گردہ سہارنپور میں اس جہان فانی سے رحلت فرما کر عالم جاودانی جنت الفردوس میں جاگزیں ہوئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط اس صدمہ جانکاہ سے ہندوستان کے اہل اسلام کو عموماً اور اس مدرسہ کے خیر خواہوں کو خصوصاً جس قدر رنج و غم ہوا وہ کم ہے۔ ایسے عالم باعمل اور فاضل اکمل جملہ علوم مروجہ میں فائق اور ترویج دینیات میں شائق کا اس جہاں سے اٹھ جانا پسماندگان کی نہایت کم نصیبی ہے۔ بعد انتقال مولوی سعادت علی صاحب مرحوم بانی، اس مدرسہ کی نگرانی جملہ کاروبار انتظامی و خبرگیری مدرسہ بھی مولانا صاحب موصوف نے علاوہ تدریس کے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ جو کچھ عزل و نصب بابت انتظام مدرسہ ہوتا تھا بدوں صلاح و صواب دید مولانا ممدوح کے نہ ہوتا تھا۔

علاوہ اس کے فراہمی چندہ میں بھی از حد سعی فرماتے تھے۔ اور تدریس کا یہ حال کہ علاوہ دیگر کتب دینیات کے اکثر ہر سال صحاح ستہ کا درس ختم ہوتا رہا۔ ————— الغرض مولانا مرحوم کا اس جہان فانی سے رحلت فرمانا اس شہر و مدرسہ کے واسطے کمال حسرت و اندوہ کا واقعہ ہے۔ خدائے تعالیٰ ان کو غریق مغفرت کرے اور درجات عالیہ غایت فرماوے۔ (۱)

سر سید احمد خاں بہادر علیہ الرحمہ نے آپ کی تعزیت میں جو شذرہ تحریر کیا تھا وہ یہ ہے۔
مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم۔ افسوس ہے کہ مولوی محمد مظہر صاحب نے جو عربی مدرسہ

سہارنپور میں مدرس تھے اور ان ہی کی ذات بابرکات سے اس مدرسہ کو رونق اور عزت تھی بروز شنبہ تین اکتوبر ۱۸۸۵ء کو انتقال فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ ط مولوی صاحب ممدوح بہت بڑے عالم تھے جس زمانہ میں دہلی میں طالب علم تھے اسی زمانے میں ان کی ذہانت مشہور تھی۔ تقویٰ و ورع میں بھی نہایت اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ بیس برس سے انہوں نے اپنے ہم قوموں کو علوم دینی کی فیض رسانی پر کمر ہمت چست باندھی تھی۔ اور عربی مدرسہ سہارنپور میں پاشکتہ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

آمدنی مدرسہ سے صرف پچیس روپیہ ماہوار بقدر گذر اوقات لیتے تھے، اور علوم کی تعلیم میں مصروف تھے، بہت لوگ ان سے فیض یاب ہوئے۔ مگر افسوس ہے کہ اجل نے لوگوں کو اس فیض سے محروم کر دیا۔ (۱)

صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ علی گڑھ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۸۵ھ ص ۱۱۳ بحوالہ سیرت مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۱۵۷

حضرت مولانا محمد احسن نانوتوی

فہرست

۵۱۰	خاندان
۵۱۲	پیدائش
۵۱۵	تعلیم
۵۲۱	قیام بنارس
۵۲۲	قیام بریلی
۵۲۳	انقلاب ۱۸۵۷ء
۵۲۴	حلقہ احباب بریلی
۵۲۵	حج
۵۲۵	مطبع صدیقی بریلی
۵۲۷	مطبع صدیقی بریلی کی مطبوعات
۵۲۷	احسن الاخبار بریلی
۵۲۸	کتب خانہ مطبع صدیقی
۵۲۸	مدرسہ مصباح التہذیب بریلی
۵۲۹	دور مخالفت
۵۳۲	ترک سکونت بریلی
۵۳۵	قیام نانوتہ
۵۳۶	احسن المدارس نانوتہ
۵۳۷	وصال
۵۳۹	علم و فضل
۵۴۱	بیعت

۵۴۳	اعزہ کی خوشنودی
۵۴۴	اعزہ اقرباء کی فرمائشیں
۵۴۴	خانگی معاملات
۵۴۵	حلقہ تعلقات
۵۴۶	زمینداری
۵۴۶	تجارت
۵۴۷	خریداری حویلی بنگلہ والی
۵۴۷	حلیہ
۵۴۷	لباس
۵۴۸	تصانیف و تراجم
۵۴۸	تحفۃ المحسنین
۵۴۸	اصول جرقیل
۵۴۸	نافعہ خریداران
۵۴۹	قواعد اردو حصہ چہارم
۵۴۹	رسالہ عروض
۵۴۹	زاد المخرجات
۵۴۹	مفید الطالبین
۵۴۹	مذاق العارفین
۵۴۹	تہذیب الایمان
۵۴۹	احسن المسائل
۵۵۰	غایۃ الاوطار
۵۵۰	عمایت الاسلام
۵۵۰	کشاف
۵۵۰	سلک مروارید
۵۵۰	خیر متین

۵۵۰	نکات نماز
۵۵۱	حواشی تصحیح
۵۵۱	شفاء قاضی عیاض
۵۵۱	کنوز الحقائق
۵۵۱	نقحۃ الیمن
۵۵۱	خلاصۃ الحساب
۵۵۱	قرۃ العینین فی تفصیل الشیخین
۵۵۲	فتاویٰ عزیز
۵۵۲	جواہر القرآن
۵۵۲	رسالہ نیچرل فلاسفی
۵۵۲	مجموعہ مثنویات
۵۵۲	تنبیہ الرقیق علی مغالطۃ ثبوت الحق الحق
۵۵۲	قلمی بیاض
۵۵۳	اولاد و احفاد
۵۵۳	مولانا فضل الرحمن
۵۵۳	منشی محمد اسماعیل
۵۵۴	مولانا محمد ابراہیم
۵۵۴	مولانا محمد مظہر نانوتوی
۵۵۶	مولانا محمد منیر نانوتوی
۵۵۸	مولانا عبد الاحد، مالک مطبع مجتہبائی دہلی

حضرت مولانا محمد احسن نانوتویؒ

”محمد احسن نانوتوی“ از۔ پروفیسر ایوب قادری

تلخیص:۔ اشرف عثمانی دیوبندی

برصغیر ہند میں مسلمانوں کا اقتدار حکومت کم و بیش آٹھ نو سو سال رہا، اس مدت میں انہوں نے بڑے بڑے شہر و قصبے آباد کئے، مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں بنائیں خاص خاص مرکزی مقامات دہلی، لاہور، ملتان، ٹھٹھہ، آگرہ، بدایوں، جوینپور وغیرہ جیسے مقامات کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قصبے و قریات بھی علماء فضلاء کی سکونت کی وجہ سے علوم و معارف کے مراکز بن گئے۔ دہلی سے قریب دامن کوہ کے علاقہ میں کئی ایسے قصبے کلیں، گنگوہ، انبیٹھہ، جھنجھانہ، تھانہ بھون، دیوبند، کاندھلہ، منگلور، کیرانہ، پھلت (۱)، رامپور منہار ان اور نانوتہ وغیرہ وہ مسلم آبادیاں ہیں جو مسلمانوں کے قیام و سکونت کے باعث ایک خاص اہمیت کی حامل ہو گئیں۔ ان قصبے میں شاہ علاء الدین صابر مخدوم (م ۶۹۰ھ ۱۲۹۱ء) شاہ عبدالقدوس (م ۹۲۵ھ ۱۵۳۸ء) شاہ ابو المعالی (م ۱۱۱۲ھ ۱۷۱۱ء) میاں نجو نور محمد (م ۱۲۵۹ھ ۱۸۲۳ء) حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (م ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء) مولانا ذوالفقار علی (م ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء) مفتی الہی بخش (م ۱۲۲۵ھ ۱۸۲۹ء) قاضی محمد اسماعیل (م ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۲ء) مولانا رحمت اللہ (م ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۰ء) شاہ محمد عاشق (تلمیذ رشید حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی) مولانا عبدالسمیع بیدل (م ۱۹۰۱ء) اور مولانا مملوک العلّی (م ۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ء) وغیرہ آسمان شریعت و طریقت کی وہ نامور ہستیاں گزری ہیں جن کے نام برصغیر کی اسلامی تاریخ میں بقائے دوام کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں ہمیں ان ہی مردم خیز مقامات میں سے قصبہ نانوتہ کے ایک نامور عالم مولانا محمد احسن نانوتویؒ کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جن کی تمام زندگی ترویج اشاعت علم اور اسلام کے لئے وقف رہی اور جنہوں نے دین و مذہب کی ناقابل فراموش اور گر انداز خدمات انجام دیں۔

(۱) قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر کوٹھیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ ۱۷۶۲ء) کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

خاندان

سکندر لودی کے عہد میں خلیفہ اول حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ایک بزرگ قاضی مظہر الدین دہلی آئے اور جہاں آباد کے قاضی مقرر ہوئے ان کے بیٹے میران بڈھے نہایت جری اور بہادر تھے، انہوں نے نانوتہ کے قرب و جوار کے سرکش راجپوتوں کو سلطنت دہلی کا مطیع و منقاد بنایا، جس کے صلہ میں قاضی میران بڈھے علاوہ املاک و جاگیر عہد قضا پر سرفراز ہوئے۔ دور شاہ جہانی میں ان ہی قاضی میران بڈھے کی اولاد میں ایک بزرگ مولانا محمد ہاشم ہوئے، جو دربار شاہی میں مقرب تھے، ان کو بھی چند دیہات جاگیر میں ملے تھے۔ نانوتہ میں مولانا محمد ہاشم کی اولاد خوب پھولی پھلی مولانا احسن ان ہی مولانا محمد ہاشم کی اولاد میں ہیں۔ (۱)

مولانا محمد ہاشم کے پرپوتے شیخ ابوالفتح تھے، جن کے تین بیٹے ہوئے، (۱) حکیم عبداللہ (۲) شیخ محمد عاقل (۳) شیخ علاؤ الدین۔ حکیم عبداللہ کی اولاد علم و امارت کے اعتبار سے ممتاز رہی۔ شیخ محمد عاقل کی اولاد کو دنیوی اعزاز ملا، شیخ علاؤ الدین کی اولاد علم و امارت میں حکیم عبداللہ اور شیخ محمد عاقل کی اولاد کی برابری کو نہ پہنچ سکی۔ ان ہی شیخ علاؤ الدین کے پرپوتے شیخ اسد علی تھے جن کے نامور فرزند مولانا محمد قاسم نانوتوی ہوئے اور اس طرح اس شاخ کو خصوصی شرف و امتیاز حاصل ہوا۔ شیخ محمد عاقل کی اولاد دولت و امارت کے اعتبار سے خاندان میں ممتاز تھی مگر اس شاخ نے شیعیت اختیار کر لی (۲) اور وہ شیخ تفضل حسین (ابن شیخ علی محمد) تھے۔ شیخ تفضل حسین بعض خاندانی نزاعات کی وجہ سے مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ماموں فصیح الدین ولد وجیہ الدین کے ہاتھ قتل ہوئے۔

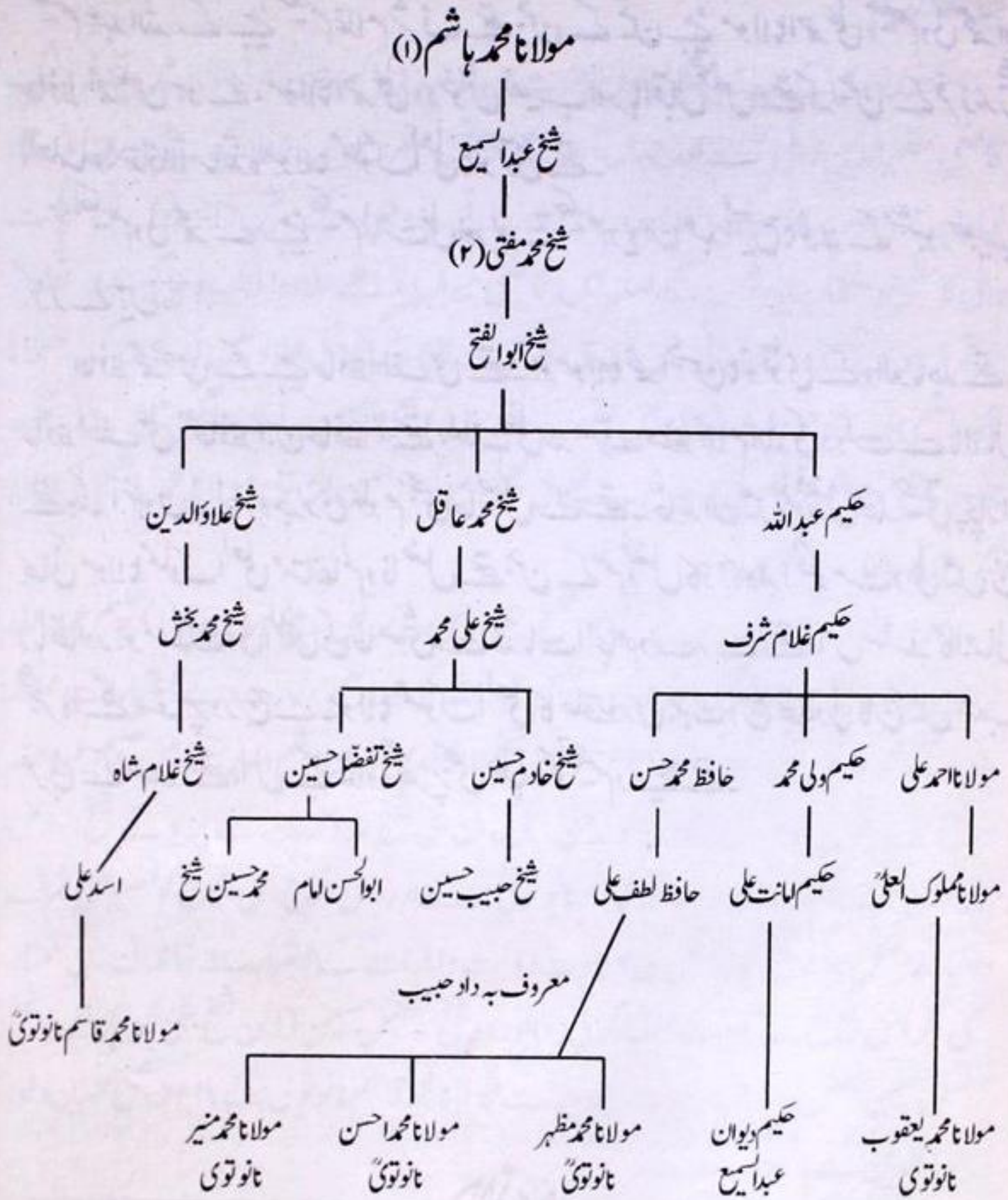
(۱) یہ تمام اترخاندانی روایات ہیں تفصیل کے لئے دیکھئے، مکتوبات مولانا محمد یعقوب ا۔ ۳ (مطبع احمدی، علی گڑھ ۱۳۲۷ھ)
(۲) مغلوں کے عہد زوال میں دربار دہلی میں ایرانیوں کا اقتدار خاص طور سے بڑھ گیا تھا، سادات بارہہ چھائے ہوئے تھے اور اودھ میں نوابان لکھنؤ کا طوطی بول رہا تھا اس زمانہ میں شیعیت کی خوب اشاعت ہوئی نوابان اودھ نے ان سینکڑوں علماء مشائخ کے روزینے اور معافیات ضبط کر لیں جنہوں نے شیعیت اختیار نہ کی میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں ان امور کی طرف اشارہ کیا ہے، روہیلکھنڈ میں خاص طور سے نوابان لکھنؤ کے عہد میں شیعیت کو فروغ حاصل ہوا۔ سادات امر وہ اور نوابان رام پور نے نوابان لکھنؤ کے اثر سے لامیہ مذہب اختیار کر لیا بدایوں میں حمیدی خاندان کے ایک حصے نے شیعیت اختیار کر لی۔ حالانکہ یہ خاندان خلیفہ اول سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اولاد میں ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ”فضائل صحابہ و اہل بیت“ از شاہ عبدالعزیز دہلوی کا مقدمہ، مرتب محمد ایوب قادری جو پاک اکیڈمی کراچی ۱۸

حکیم عبداللہ کی اولاد نہ صرف خوش حال تھی بلکہ علم و حکمت کی دولت سے بھی مالا مال تھی حکیم عبداللہ کے بیٹے حکیم غلام شرف تھے جن کے تین بیٹے مولانا احمد علی، حکیم ولی محمد اور حافظ محمد حسن ہوئے، مولانا احمد علی وہ خوش نصیب اور با اقبال شخص تھے کہ جن کے فرزند شیخ العلماء استاذ الاساتذہ مولانا مملوک العلی نانوتوی تھے۔

حکیم ولی محمد کے بیٹے حکیم امانت علی اور پوتے حکیم دیوان عبدالسمیع نانوتہ کے مشہور طبیب گزرے ہیں۔

حافظ محمد حسن کے بیٹے حافظ لطف علی تھے۔ جو مولانا محمد احسن نانوتوی کے والد ماجد تھے۔ حافظ لطف علی ”حافظ ابن حافظ“ تھے، لطف علی نہ صرف حفظ کلام اللہ کی دولت سے مالا مال تھے بلکہ انہوں نے مروجہ رسمی علوم بھی حاصل کئے تھے۔ خاندان میں علم و فضل تھا۔ حقیقی چچا زاد بھائی مولانا مملوک العلی ممتاز عالم و فاضل تھے جن کے علم و فضل کا ذکر کا دار الحکومت دہلی میں بجا رہا تھا اور جو مسلک ولی اللہی کی خاموشی سے خدمات انجام دے رہے تھے، اس سلسلہ کا اجمالی شجرہ اگلے صفحہ پر درج ہے۔ مولانا مملوک العلی کا حلقہ درس بہت وسیع تھا، دلی کالج میں شعبہ عربی کے صدر تھے، اس کے علاوہ گھر پر بھی طلباء کو تعلیم دیتے تھے۔





(۱) مولانا محمد ہاشم سے حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ تک مکمل سلسلہ "مکتوبات مولانا محمد یعقوب" (تائیل پشت صفحہ ۱) میں درج ہے۔

(۲) نانوتہ کے صدیق شیخ زادوں کا ایک "نسب نامہ" مرتبہ مفتی محمود احمد نانوتوی، قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے شائع کر لیا تھا اس میں مرتب شجرہ نے محمد مفتی کو محمد معین بغیر حوالہ کے لکھ دیا ہے حالانکہ مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتوی، سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا محمد یعقوب نانوتوی صفحہ ۳ (مطبوعہ مکتبہ امدادیہ دیوبند) سوانح قاسمی جلد اول از مولانا مناظر احسن گیلانی جلد اول صفحہ ۷۱ (دیوبند ۱۳۷۳ھ) اور شجرہ شیخ زادگان نانوتہ (قلمی) مملوکہ مشی ظفر احمد نانوتوی میں ان کا نام مفتی تحریر ہے۔

اس خانوادہ صدیقی کے اراکین علم و امارت کے ساتھ ساتھ دینداری، اتباع سنت اور پابندی شرع جیسی صفات حسنہ سے بھی متصف تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی جو تحریک ولی اللہی کے ایک سرگرم کارکن اور مشہور صاحب نسبت بزرگ تھے کی نانہال بھی اس صدیقی خاندان میں تھی (۱) جس کے ایک رکن مولانا محمد احسن نانوتوی رحمہ اللہ بھی تھے نانوتہ میں حاجی صاحب رحمہ اللہ کی بہن بھی بیاہی تھیں اس لئے حاجی صاحب اکثر نانوتہ تشریف لاتے تھے نانوتہ میں حاجی صاحب کے مرید بھی تھے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔ (۲)

”جناب مخدوم العالم حاجی امداد اللہ صاحب سے جو ربط نسب تھا، حضرت مخدوم (حاجی صاحب) کی نانہال اور ہمارے خاندان میں تھی اور بہن ان کی یہاں بیاہی تھیں اکثر نانوتہ تشریف لاتے تھے (ہم) ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور (وہ) نہایت محبت و اخلاص فرماتے جزو بندی کتاب کی حضرت سے ہم دونوں (مولانا محمد یعقوب و مولانا محمد قاسم) نے سیکھی۔“

مولانا محمد احسن کے خاندان سے حضرت حاجی صاحب کی نہ صرف رشتہ داریاں تھیں بلکہ خود مولانا محمد احسن کی والدہ اور خالہ بھی حضرت حاجی صاحب سے بیعت تھیں ایک دفعہ مولانا محمد احسن کے چھوٹے بھائی مولانا محمد منیر بیمار ہوئے اطباء نے پرہیز کا سخت حکم دیا بہت دنوں تک پرہیزی کھانا کھاتے کھاتے تنگ آ گئے، اتفاق سے حضرت حاجی صاحب نے نانوتہ ورود فرمایا مولانا محمد منیر کی والدہ نے ان کی دعوت کی، حاجی صاحب نے مولانا محمد منیر کو بھی دعوت میں شرکت کا حکم دیا اور کہا کہ جی بھر کر کھاؤ، دوسرے دن ان کی خالہ کے گھر بھی حاجی صاحب کا یہی حکم رہا اور اس طرح مولانا محمد منیر پرہیز سے چھوٹ گئے۔ (۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد احسن صاحب کے خاندان میں حاجی صاحب کی نہ صرف مختلف رشتہ داریاں تھیں بلکہ خاندان کے اکثر حضرات حاجی صاحب کے حلقہ بیعت و

(۱) حضرت حاجی امداد اللہ کے والدہ کا نام ”حسینی“ تھا جو شیخ علی محمد صدیقی نانوتوی کی صاحبزادی تھیں نانوتہ کے صدیقی شیوخ کی تمام شاخوں کے شجرے منشی ظفر احمد وکیل نانوتوی مرحوم کے ذخیرہ علمی میں (مؤلف کو) دیکھنے کا اتفاق ہوا جس سے معلوم ہوا کہ شیخ علی محمد تفضل حسین کے والد اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے نانا ہیں، قلمی شجرہ کے علاوہ ملاحظہ ہو امداد المشتاق ان اشرف الاخلاق مرتبہ مولانا اشرف علی تھانوی صفحہ ۵ (تھانہ بھون ۱۹۲۹ء)

(۲) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی از مولانا محمد یعقوب نانوتوی صفحہ ۴

(۳) کرامات امدادیہ مرتبہ مولانا اشرف علی تھانوی صفحہ ۲۴-۲۵ (مطبع انتظامی کانپور ۱۳۱۷ھ)

ارادت میں بھی منسلک تھے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے نانوتہ میں ورود کی شہادتیں بھی ملتی ہیں۔

مولانا عاشق الہی میرٹھی لکھتے ہیں (۱)

”سید صاحب نانوتہ بھی تشریف لے گئے تھے وہاں بھی بہت سے لوگ مرید ہوئے، ایک مرید نے بیان کیا کہ میری آنکھوں میں پھر رہا ہے کہ سید صاحب جامع مسجد کے وسطی دروازہ میں کھڑے ہیں نہایت شکیل و جمیل تھے اور آپ نے اپنی پگڑی اتار کر اپنے ہاتھ میں لے کر باقی بیعت کرنے والوں کو پکڑادی لوگ برابر دوسرے سرے تک اس کو پکڑے ہوئے تھے اور پگڑی کنگھورے کی شکل کی معلوم ہوتی تھی کیونکہ دونوں طرف اس کو تھامے ہوئے تھے۔“

نانوتہ میں شیعوں کے عالم، مولانا غلام حسین بھی سید صاحب سے ملے تھے (۲) سید احمد شہید کے دورہ سے نانوتہ وغیرہ قصابات میں تبلیغ و اصلاح کے مفید اثرات ظاہر ہوئے۔

پیدائش

مولانا محمد احسن کی تاریخ پیدائش صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکی۔ البتہ ارواح ثلاثہ میں مولانا محمد احسن کے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر نانوتوی کے سلسلہ میں ایک روایت ہے کہ ”مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی دونوں سے بڑے تھے۔“ (۳)

مولانا محمد قاسم نانوتوی کا سال پیدائش ۱۲۲۸ھ ۱۸۳۲ء اور مولانا رشید احمد گنگوہی کا سال پیدائش ۱۲۲۲ھ ۱۸۲۸ء ہے، مولانا محمد مظہر کا سال پیدائش ۱۲۳۷ھ ۱۸۲۱ء ہے کیونکہ ”محمد مظہر“ تاریخی نام ہے اور خاندانی روایت کے مطابق مولانا محمد احسن مولانا محمد مظہر سے تین چار سال چھوٹے تھے اس طرح مولانا محمد احسن کا سال پیدائش تقریباً ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۵ء ہوتا ہے۔

(۱) تذکرہ الرشید جلد دوم از مولانا عاشق الہی میرٹھی صفحہ ۲۷۲ (میرٹھ ۱۹۰۵ء)

(۲) تذکرہ الرشید جلد دوم صفحہ ۲۷۳

(۳) ارواح ثلاثہ (ترتیب و اصلاح مولانا اشرف علی تھانوی) صفحہ ۳۲۵ نظام العلوم سہارنپور ۱۳۷۰ھ

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کا سال وفات ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۵ء ہے، نانوتہ کے اسی خاندان شیخ زادگان کے ایک ذی علم بزرگ اور شجرہ شیخ زادگان نانوتہ کے واقف و ماہرشی ظفر احمد وکیل نانوتوی (۱) ایک ایسے شخص سے ملے جنہوں نے مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تھا ان کے بیان کے مطابق مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی عمر قریب ستر اکہتر سال کی ہوئی اس طرح بھی مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کا سال پیدائش تقریباً ۱۲۴۱ھ ۱۸۲۵ء قرار دیا جاسکتا ہے۔

تعلیم

مولانا محمد احسن کے سال پیدائش کے سلسلے میں جس طرح معلومات محدود ہیں اسی طرح تعلیم و تدریس کے باب میں بھی ہماری معلومات تشنہ ہیں۔

مولانا محمد احسن کے خاندان کے علم و فضل کا چرچا تھا۔ دادا اور والد حافظ قرآن تھے۔ مولانا کہ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ مولانا نے اپنے والد حافظ لطف علی مرحوم سے حفظ قرآن فرمایا۔ مولانا کے والد کے حقیقی چچا زاد بھائی ”استاذ العلماء مولانا مملوک العلی“ اس وقت دارالحکومت دہلی میں مجلس علوم و معارف کے صدر نشین تھے۔ مولانا محمد احسن ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی میں مولانا مملوک العلی کے پاس تحصیل علم کی غرض سے پہنچے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم سوانح قاسمی جلد اول میں لکھتے ہیں۔ (۲)

”نانوتہ کے لئے تعلیمی راہ کا دروازہ مولانا مملوک العلی کے وجہ سے کھل چکا تھا وہ دہلی میں مقیم تھے اور دہلی کی سب سے بڑی مرکزی درس گاہ دہلی کالج کے استاد تھے نہ صرف نانوتہ بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری اطراف و جوانب کی جن قصبات میں پھیلی ہوئے تھی وہاں تک کے بچے مولانا مملوک العلی کے ان خاص حالات سے کافی استفادہ کر رہے تھے۔“

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اس کی تشریح حاشیہ میں ان الفاظ کے

(۱) منشی ظفر احمد ۷ ارذی الحجہ ۱۳۰۳ھ ۱۸۸۶ء کو نانوتہ میں پیدا ہوئے والد کا نام شیخ مشتاق احمد بچپن میں والد کا انتقال ہو گیا ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء میں اپنے چھوٹا دادا احمد مرحوم کی وجہ سے بھوپال پہنچے وکالت کا امتحان پاس کیا نہایت کامیاب وکیل تھے ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے گئے۔ نہایت خلیق اور بامروت تھے۔ قیام پاکستان کے زمانہ میں نانوتہ اور شیوخ نانوتہ کے حالات دور جسرول میں تحریر کئے ۲۰ مئی بروز شنبہ ۱۹۵۷ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۲) سوانح قاسمی جلد اول صفحہ ۲۱۰ (۳) ایضاً صفحہ ۲۱۰

ساتھ کرتے ہیں۔ (۱)

”میرا یہ مطلب ہے کہ نانوتہ میں مظاہر العلوم کے مدرس اول مولانا محمد مظہر نانوتوی احياء العلوم وغیرہ جیسی مشہور کتابوں کے مترجم مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی دیوبند میں مولانا ذوالفقار علی (حضرت شیخ الہند کے والد ماجد) مولانا فضل الرحمن (مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد ماجد) اور اسی قسم کے بیسیوں بزرگ جو ہم پاتے ہیں علم و فضل کیساتھ مشہور ہیں ان میں بعض حضرات انگریزی حکومت کی طرف سے محکمہ تعلیمات کے انسپکٹر بھی تھے۔ مثلاً شیخ الہند کے والد ماجد اور مولانا شبیر احمد کے والد ماجد دونوں حضرات کا جو حال ہے جہاں تک میرا خیال ہے اس علاقہ کی اس جدید علمی روشنی میں بہت زیادہ دخل مولانا مملوک اعلیٰ کے وجود باوجود کو ہے دلی پہنچنے اور وہاں کی تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہونے کا موقعہ ان بزرگوں کو بظاہر مولانا مملوک اعلیٰ کی وجہ سے میسر آیا۔“

مولانا محمد مظہر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ دونوں حقیقی بھائی اور مولانا مملوک اعلیٰ کے قریبی عزیز تھے ہر دو نے تحصیل علم حضرت مولانا مملوک اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے دہلی میں کی، مولانا ذوالفقار علی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا فضل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ بھی مولانا مملوک اعلیٰ کے شاگردوں میں تھے اور ان ہر دو حضرات سے مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کے خاص تعلقات تھے بلکہ جب مرض الموت میں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ دہلی سے واپس ہوئے تو دیوبند میں مولانا ذوالفقار علی نے ٹھہرایا اور دیوبند ہی میں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا۔

یہ تمام تعلقات اس زمانہ کے تھے جب یہ حضرات مولانا مملوک اعلیٰ سے دہلی میں تحصیل علم کرتے تھے اور زمانہ ملازمت میں یہ تعلقات اور بھی پختہ ہو گئے تھے بعض آثار اور قرآن کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی کالج میں بھی تعلیم پائی۔ مولانا محمد احسن کی قلمی بیاض میں ۱۸۵۲ء کی ایک یادداشت میں دہلی کالج کے مشہور استاد ”ماسٹر رام چندر دہلوی (۲) م ۱۸۸۰ء“ کے تعلقات کا بھی ایک جگہ ذکر ہے، ماسٹر رام چندر دہلوی سے تعلقات زمانہ طالب علمی ہی کے ہوں گے۔ مولانا محمد احسن نے دہلی کالج

(۱) سوانح قاضی اجداد صفحہ ۲۱۰ (۲) ماسٹر رام چندر دہلوی کے حالات کے لئے دیکھئے مرحوم دہلی کالج از مولانا

عبدالحق صفحہ ۱۵۹-۱۶۳ (انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۳۵ء)

میں انگریزی بھی پڑھی تھی ان کے قلمی بیاض میں خود مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ کی بعض انگریزی تحریریں ہیں۔ مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے سرسید احمد خاں کی فرمائش پر گاڈ فری ہیکنس کی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا دہلی کالج کے ایک استاذ مولانا سبحان بخش شکار پوری کے تلمذ کا بھی ذکر مولانا محمد احسن نے کیا ہے۔ مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے نیچرل فلاسفی پر ایک مضمون لکھا تھا جو مسٹر ٹیلر پرنسپل دلی کالج کی نگرانی میں دو مرتبہ طبع ہوا۔ (۱)

ہمارا خیال ہے کہ مولانا محمد احسن کے علاوہ ان کے دونوں بھائی مولانا محمد مظہر اور مولانا منیر اور دوسرے حضرات مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمن، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے بھی دہلی کالج (۲) میں تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ تمام حضرات بقول مولانا مناظر احسن گیلانی (۳)، مولانا مملوک العلی سے تعلق کی وجہ سے دہلی پہنچے اور تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہوئے باستثنا مولانا محمد قاسم نانوتوی کے دوسرے تمام حضرات نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔

مولانا محمد احسن، مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد منیر تو بنارس کالج آگرہ کالج اور بریلی کالج میں ملازم ہوئے اور مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمن اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر بھی رہے۔

ذکر تھا مولانا محمد احسن نانوتوی کی تعلیم اور دہلی کالج کے طالب علم ہونے کا بہر حال مولانا محمد احسن نانوتوی نے مولانا مملوک العلی اور مولانا سبحان بخش کے علاوہ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے بھی تعلیم حاصل کی حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلی میں حدیث کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دے رہے تھے مولانا احمد علی محدث

HISTOIRE DE LA LITTÉRATURE HINDOUE ET HINDOUSTANIE BY M. GARCIN DE TASSY. VOL. 1 P 146 (PARIS 1870) (۱)

(۲) دہلی کالج، دراصل مدرسہ غازی الدین کا نام ہے یہ مدرسہ غازی الدین خاں فیروز جنگ المتوفی ۱۲۱۲ھ والد نظام الملک آصف جاہ اول نے اجمیری دروازہ کے پاس قائم کیا تھا مدرسہ کی عمارت کے ساتھ ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اور پاس ہی مقبرہ بنویا، جہاں وہ خود دفن ہوئے اس مدرسہ کا دوسرا دور ۱۷۹۲ء میں شروع ہوا اور ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی کی مشہور درسگاہ تھی مولانا عبدالحق صاحب نے ”مرحوم دہلی کالج“ میں مدرسہ غازی الدین کا بانی فیروز جنگ ثانی خلف نظام الملک آصف جاہ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے ملاحظہ ہو ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں از ابوالحسنات ندوی صفحہ ۲۳ (اعظم گڑھ ۱۹۳۶ء) مرحوم دہلی کالج از مولانا عبدالحق صفحہ ۲، جلی ۱۹۳۵ء۔ (۳) سوانح قاسمی جلد اول صفحہ ۲۱۰

سہارنپوری دہلی میں سکونت پذیر تھے قبل انقلاب ۱۸۵۷ء دہلی میں آپ کا مشہور مطبع احمدی تھا۔
 حصن حصین کا اردو ترجمہ مولانا نواب قطب الدین دہلوی (م ۱۲۸۹ھ ۱۸۷۲ء) شاگرد
 حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی (م ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء) نے ظفر جلیل کے نام سے ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء
 میں کیا تھا اسی ترجمہ کو ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۲ء میں مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عبد الاحد
 مالک مطبع مجتہبائی دہلی کی درخواست پر درست کی اسکے شروع میں مولانا محمد احسن لکھتے ہیں۔ (۱)
 ”میری اس تصحیح اور ترجمہ کو لوگ یہ سمجھیں کہ میں نے مترجم کو اصلاح دی
 ہے تو چھوٹا منہ اور بڑی بات کے قبیل سے ہے بلکہ یوں تصور کرنا چاہئے
 کہ ”پدر نتواند پسر تمام کند“ کیونکہ جس خاندان سے مترجم کو فیض ہوا اسی
 خاندان کا یہ فقیر بھی زلہ رہا ہے میری سند اس کتاب کی یہ ہے کہ مجھ کو اس کی
 اجازت تین شخصوں سے حاصل ہوئی اول مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری
 دوم مرشدی شاہ عبدالغنی صاحب مجددی سوم مولانا سبحان بخش شکارپوری۔
 اور ان تینوں حضرات کو اجازت یگانہ آفاق مولانا محمد اسحاق دہلوی سے ہے“
 مولانا محمد حسین مراد آبادی مولف انوار العارفین مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کو ان الفاظ سے یاد
 کرتے ہیں۔ (۲)

”مولانا محمد احسن حافظ قرآن واعظ خوش بیان عالم فروع واصول و
 دانندہ باریکی ودلائل معقول و مدرس علم معانی و کلام و درس کنندہ بفصاحت و
 بلاغت تمام مفسر کلام اللہ و محدث حدیث رسول و جامع جمیع علوم مترجم احیاء
 العلوم و متصف باخلاق حسن ہستند“ (۳)

آگے چل کر مولف انوار العارفین پھر لکھتے ہیں۔ (۴)

”تخصیل علوم ظاہر در شاہجہاں آباد حاصل کردہ بوند“

یہ وہ زمانہ تھا کہ قلعہ دہلی آباد تھا آخری مغل بادشاہ ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ زینت و
 تخت و تاج تھے۔ ہر فن کے علماء و فضلاء، ادباء و شعراء دہلی میں موجود تھے، غرض ثقافت و

(۱) خیر متین ترجمہ حصن حصین ترجمہ مولانا محمد احسن مقدمہ (دہلی ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۲ء)

(۲) انوار العارفین از محمد حسین مراد آبادی صفحہ ۷۷-۷۸ (بریلی ۱۲۹۰ھ)

(۳) مولانا محمد احسن کا جو ترجمہ مولانا محمد حسین مراد آبادی نے انوار العارفین میں درج کیا ہے اسی کا خلاصہ آفتاب الابرار

(جلد پنجم صفحہ ۱۲۲) (دہلی ۱۳۲۲ھ) انوار العارفین (۴) مولانا محمد احسن کا جو ترجمہ مولانا محمد حسین مراد آبادی نے انوار العارفین میں درج کیا ہے اسی کا خلاصہ آفتاب الابرار

شائستگی کی شمع سنبھالا لے رہی تھی، مولانا محمد احسن اسی دہلی میں تکمیل و تحصیل علم کی۔
 مولانا محمد احسن کے تعلیمی حالات کے صرف اس قدر نشان دہی ہو سکی، خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن نانوتہ میں کیا پھر حضرت مولانا مملوک العلّی کے پاس دہلی پہنچے اور دہلی کالج میں پڑھا اس وقت کے ممتاز علماء مولانا مملوک العلّی نانوتوی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، شاہ عبدالغنی مجددیؒ، اور مولانا سبحان بخش شکارپوری وغیرہ سے تحصیل علم کیا یہ تمام حضرات حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے خاندان کے فیض یافتہ تھے اور ان حضرات کا مسلک بھی وہی تھا۔ مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کو بھی اسی خاندان سے علمی فیض حاصل ہوا مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کے یہ الفاظ کس کسی قدر تاکید ہیں۔ (۱)

”جس خاندان سے مترجم کو فیض ہوا اسی خاندان کا یہ فقیر بھی زلہ رہا ہے“

علم حدیث کی تکمیل و تحصیل حضرت شاہ عبدالغنی مجددی (م ۱۲۹۶ھ ۱۸۷۹ء) سے کی شاہ عبدالغنی مجددی شاہ محمد اسحاق دہلوی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے نہایت متقی و پرہیزگار بزرگ و عالم تھے نقشبندیہ سلسلہ کے مشہور شیخ اور خانقاہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمہ اللہ کے مسند نشین تھے شاہ صاحب ہی سے مولانا محمد احسن رحمہ اللہ بیعت ہوئے۔

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمہ اللہ بھی حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے علم حدیث کی انہوں نے بڑی گرانقدر خدمات انجام دیں ان کے مطبع احمد دہلی سے حدیث کی مشہور کتابیں جامع ترمذی ۱۲۶۵ھ ۱۸۴۸ء میں اور صحیح بخاری ۱۲۶۷ھ ۱۸۵۰ء میں شائع و طبع ہوئیں (۲) ان کے علاوہ دیگر مطبوعات اسلامی بھی اس مطبع سے شائع ہوئیں مولانا محمد احسن نے دور ان ملازمت تجارت کتب کا بھی سلسلہ قائم رکھا تھا مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے مطبع احمدی کی مطبوعات خاص طور سے منگاکر فروخت کرتے تھے۔ مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کی تعلقات مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کیساتھ ان کے انتقال ۱۲۹۷ھ ۱۸۷۹ء تک رہے مولانا مملوک العلّی سے مولانا محمد احسن کے خاندان، ربط نسب اور استادی و شاگردی کے تعلقات تھے مولانا محمد احسن کو بعد فراغ علم زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ء کو حضرت مولانا مملوک العلّی کا دہلی میں انتقال ہو گیا، مولانا محمد احسن صاحب کی

(۱) مرحوم دہلی کالج صفحہ ۱۵۳

(۲) مولانا مملوک العلّی نانوتوی کے حالات ضمیمہ میں شامل کر دئے گئے ہیں۔

قلمی بیاض میں مولانا مملوک العلی کے متعلق دو تین جگہ ”جناب اعلیٰ حضرت مولانا صاحب“ اور ”حضرت مولانا صاحب مرحوم“ جیسے تعظیمی الفاظ نظر سے گزرے مولانا مملوک العلی کے انتقال کے بعد بعض معاملات و حسابات مولانا محمد احسن نے بنائے۔

مولانا محمد احسن کی کوئی سند علیحدہ ہمیں دستیاب نہ ہو سکی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی سند ”حیات شبلی“ (۱) میں اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے اسانید ”الیانع الجنی“ (۲) میں شامل ہیں، یہی اسانید مولانا محمد احسن کی بھی ہوئیں لیکن ہم ان کو یہاں درج کر کے مضمون کو طوالت نہیں دیں گے، حصن حصین کی جو سند خود مولانا محمد احسن نے نقل کی ہے اس کو نقل کیا جاتا ہے۔ (۳)

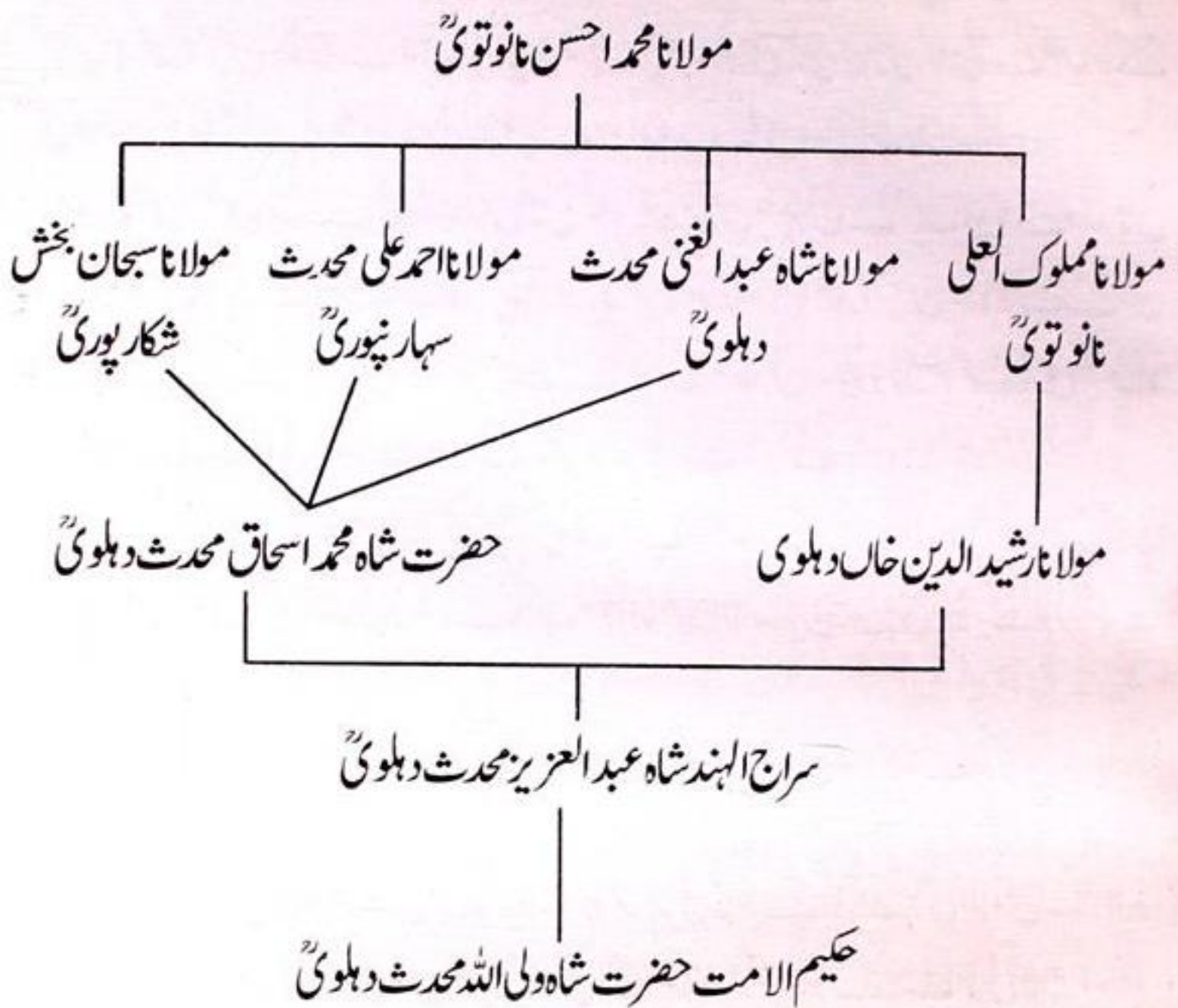
”(مولانا) محمد احسن نانوتوی کو مولانا احمد علی سہارنپوری، شاہ عبدالغنی مجددی اور مولانا سبحان بخش شکارپوری سے حصن حصین کی سند ملی اور ان حضرات کو شاہ محمد اسحاق سے اور ان کو حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی سے اور ان کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے اور ان کو شیخ ابوطاہر مدنی سے اور ان کو شیخ ابراہیم کروڑی سے اور ان کو شیخ احمدی تاشی سے اور ان کو شیخ احمد بن قدوس شنادی سے ان کو شیخ شمس الدین محمد بن احمد بن محمد رملی سے اور ان کو شیخ زین الدین زکریا انصاری سے اور ان کو حافظ وقت تقی الدین محمد بن محمد بن فہم ہاشمی مکی سے اور ان کو مولف کتاب ابوالخیر محمد بن محمد بن جزری شافعی سے“

مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ عبدالغنی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک سند شیخ محمد عابد سندھی کے ذریعہ سے بھی اپنی قلمی بیاض میں نقل کی ہے۔ آخر میں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کے ہر چہار اساتذہ کرام کا سلسلہ درج کیا جاتا ہے کہ کس طرح امام الہند حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ پر منتہی ہوتا ہے۔

(۱) حیات شبلی صفحہ ۸۵-۸۶

(۲) الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی از محمد محسن مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۷ھ ۱۸۷۰ء

(۳) ختمین حصن حصین ”مقدمہ کتاب“



قیام بنارس

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء میں بنارس کالج میں بحیثیت مدرس اول فارسی ان کا تقرر ہوا۔ یعنی ان کی ملازمت کا آغاز بنارس سے ہوا۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کے بعد بنارس ہی سے مولانا محمد احسن صاحب کی ملازمت کا آغاز ہو ورنہ یہ الفاظ نہ ہوتے بلکہ تبادلہ وغیرہ کا ذکر ہوتا۔ بنارس کے قیام کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے بنارس کے قیام میں اپنے احباب کا ایک حلقہ قائم کر لیا تھا۔ ایک شفیق کی درخواست پر مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ ”تحفۃ المحسنین“ لکھا، مولانا صاحب بحیثیت ایک عالم دین لوگ فتاویٰ اور مذہبی مسائل پوچھتے تھے آپ کے کئی فتوے تحفۃ المحسنین میں شامل ہیں۔

بنارس میں مولانا ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء میں پہنچے اور جمادی الاول ۱۲۶۷ھ مطابق مارچ ۱۸۵۱ء

میں مولانا محمد احسن کا تعلق بنارس سے یقیناً ختم ہو چکا تھا کیونکہ یہی زمانہ بریلی میں آنے کا ہے مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کے اس چار پانچ سالہ قیام بنارس میں بنارس کالج کے طلباء نے تعلیمی فائدے حاصل کئے مسلمانان بنارس نے مولانا سے مذہبی و دینی خدمات لیں۔

مولانا محمد احسن صاحب رحمہ اللہ بنارس میں مقیم تھے جہاں انہوں نے ایک بیوہ سے عقد ثانی کیا اس بیوہ کے ایک لڑکی زینب اور شیرخوار بچہ بھی تھا۔ مولانا محمد احسن صاحب نے ان ارکان ثلاثہ کی دست گیری کی اور شریعت کے حکم کے مطابق ”بیوہ غلام محمد بناری“ کے ساتھ نکاح کر لیا اور شرعی طور سے ان کے کفیل و سرپرست بن گئے۔

اس شیرخوار بچے کا نام مولانا محمد احسن صاحب رحمہ اللہ نے ”عبدالاحد“ رکھا۔ یہ کون عبدالاحد ہیں؟ یہی مطبع مجتہبائی دہلی کے مالک مولانا عبدالاحد ہیں جو بڑی حیثیت اور شہرت کے مالک ہوئے۔

قیام بریلی

مولانا محمد احسن رحمہ اللہ بنارس سے تبادلہ ہو کر بریلی پہونچے اور جمادی الاول ۱۲۶۷ھ مطابق مارچ ۱۸۵۱ء وہ بریلی کالج میں شعبہ فارسی کے صدر مقرر ہوئے جب عربی کا اجراء ہو تو دونوں شعبوں کی صدارت ان ہی کو تفویض ہو گئی جیسا کہ احسن القواعد کی تقریظ سے معلوم ہوتا ہے صوبہ شمالی و مغربی کے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن (ناظم تعلیمات) نے نصاب کی اکثر کتابیں مولانا محمد احسن رحمہ اللہ سے لکھوائیں جن میں رسالہ عروض، قواعد اردو حصہ چہارم مشہور ہیں زادالمحذرات تعلیم نسواں کے بیان حقوق میں لکھی گئی۔ مولانا کالج کے طلباء کی تعلیم کا خاص خیال رکھتے تھے، مولانا کی قلمی بیاض میں چند تلامذہ نجف علی، فضل رسول، کرامت حسین، کالی چرن، چھوٹے لال، سوہن لال، بھوانی پرشاد اجودھیا پرشاد، کشن پرشاد، بختاور سنگھ، کیدار ناتھ وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ مولانا نجف علی ساکن مراد آباد متوطن بریلی مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کے خاص شاگرد تھے جنہوں نے فارسی زبان کی مشہور قواعد ”احسن القواعد“ تالیف کی اور اپنے استاد مولانا محمد احسن کے نام پر اس کا نام رکھا۔ یہ بریلی کالج میں ملازم بھی رہے۔ جب سرسید احمد خاں نے علی گڑھ کالج قائم کیا تو وہ ان کو علی گڑھ لے گئے۔ (۱)

اس زمانہ میں بریلی میں بیرونی علماء کا خاص اجتماع تھا مولانا مملوک العلّی کے تلامذہ میں اور مولانا محمد احسن کے احباب وہم وطن حضرات میں کئی اشخاص بریلی میں مقیم تھے۔ خود مولانا محمد احسن کے چھوٹے بھائی مولانا محمد منیر بھی بریلی کالج میں بصیغہ تدریس ملازم تھے۔

شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (۱) بریلی کالج میں پروفیسر تھے، مولانا ذوالفقار علی کابریلی میں کئی سال قیام رہا یہ فخر سرزمین بریلی (روہیل کھنڈ) کو حاصل ہے کہ ۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن بریلی میں پیدا ہوئے۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی بھی بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے مولانا محمد احسن کی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۵ء میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی بریلی میں تھے۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد مولانا فضل الرحمن دیوبندی بھی ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء میں بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ جب مولانا محمد احسن نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں بریلی کو چھوڑا تو بعض معاملات و انتظامات ضروری مولانا فضل الرحمن ہی کے سپرد کئے تھے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مسلمانان ہند کی منظم اور ہمہ گیر تحریک تھی کہ جس کے ذریعہ انہوں نے غیر ملکی اقتدار سے ملک و قوم کو آزاد کرانے کی پوری پوری کوشش کی روہیل کھنڈ کا صدر مقام بریلی روہیلوں کا دار الحکومت رہ چکا تھا۔ لہذا یہ مقام جلد ہی تحریک آزادی کا خاص مرکز بن گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہل روہیل کھنڈ پیش پیش رہے۔ ہندوستان کے بیشتر مقامات پر جنگ آزادی کی آگ بھڑک چکی تھی۔

مئی ۱۸۵۷ء کے دوسرے ہفتہ میں جب دیگر مقامات کی وحشت ناک خبریں بریلی پہنچیں تو انگریزی حکام بہت خوف زدہ ہوئے اور انہوں نے احتیاطی طور پر اپنے اہل و عیال

(۱) مولانا ذوالفقار علی (مخلص کے والد مولانا راشد حسن عثمانی مرحوم کے حقیقی دادا) ولد شیخ فتح علی دیوبند (ضلع سہارنپور) وطن ہے مولانا مملوک العلّی نانوتوی سے دہلی کالج میں بھی پڑھے بریلی کالج میں پروفیسر اور شعبہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام میں مولانا کی کوششیں شامل تھیں۔ قریب ۴۰ سال مجلس شوری کے رکن رہے پنشن پانے کے بعد دیوبند آکریری مجسٹریٹ رہے عربی زبان، پر بڑی دسترس تھی دیوان حماسہ کی شرح تسہیل الدراستہ، دیوان منبئی کی شرح تسہیل البیان، قصیدہ بردہ کی شرح عطر اوردہ، قصیدہ بانس سعادت کی شرح الارشاد اور قصائد سبعہ معلقات کی شرح علی السبع المعلقات تحریر فرمائیں فن معانی و بیان میں تذکرۃ البلاغت اور ریاضی میں تسہیل الحساب بھی یادگار ہیں ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں عمر ۸۵ سال انتقال ہوا۔

کو ۲۰ مئی ۱۸۵۷ء کو نینی تال پہنچا دیا۔ (۱)

۲۲ مئی کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بریلی کی مسجد نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے۔ (۲)

اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگادی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہو گئے۔ اگر کو تو ال شہر شیخ بدر الدین کی فرمائش پر مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو ان کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ (۳)

اس تقریر کے رد عمل میں ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو بروز عید نو محلہ کی مسجد میں مولانا رحیم اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی، اس موقع پر بخت خاں بھی موجود تھے۔ مسلمانوں میں بہت جوش پیدا ہو گیا تھا مگر کو تو ال شہر نے اپنی حکمت عملی سے اس جوش کو ٹھنڈا کر دیا (۴) ۲۲ مئی ۱۸۵۷ء کو مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے بریلی چھوڑ دی مولانا نے بریلی چھوڑتے وقت مولانا فضل الرحمن صاحب کیلئے بعض ہدایات و اشارات قلمی بیاض میں لکھے ہیں۔ مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ بریلی سے آنولہ آئے حکیم سعادت علی خاں رئیس اعظم آنولہ مدار المہام ریاست رام پور کے صاحبزادے حکیم ولایت علی صاحب کے پاس ٹھہرے اور پھر وہاں سے رام پور (افغانان) ہو کر نانوتہ (سہارنپور) پہنچے۔

مولانا محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ آخری ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۸ء میں دوبارہ بریلی پہنچ گئے کیونکہ انکی قلمی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ یکم ذی الحجہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۸۵۸ء بروز سہ شنبہ کو انہوں نے بریلی میں مکان کرایہ پر لیا اور دوبارہ ملازمت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

حلقہ احباب بریلی

مولانا محمد احسن نے ایک وسیع اخلاق پایا تھا ہر ایک کے ساتھ محبت سے پیش آتے بریلی

(۱) محاربہ عظیم از کنہیالال صفحہ ۲۸۷ (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۶ء)

(۲) مولانا محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس جامع مسجد کی تقریر اور آنولہ میں قیام کے متعلق حالات (مؤلف کتاب نے) حکیم معظم علی خاں عرف مکہ میاں مرحوم رئیس اعظم آنولہ (ضلع بریلی) سے سنے بعد کو تحریریں شہادتیں بھی مل گئیں۔ حکیم معظم علی خاں (ابن حکیم واحد علی خاں) حکیم سعادت علی خاں مدار المہام ریاست رام پور کے پوتے تھے بڑے وضعدار رئیس تھے ۱۱ مارچ

۱۹۵۳ء کو ان کا انتقال ہوا۔

کے مسلمانوں میں مولانا کا خاص اثر و نفوذ تھا باشندگان بریلی خصوصاً عمائد شہر کہنہ (بریلی) مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ پر بڑا اعتماد فرماتے تھے۔ بعض خاص معاملات میں مولانا کے مکان پر اکثر بریلی کے عمائدین اکابر کی مجلس مشورت منعقد ہوتی ایک موقع پر بریلی میں امساک بارال کی وجہ سے جب سخت پریشانی ہوئی تو مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے ”وہو الذی یبذل الغیث..... الخ کا ختم کرایا وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری تھا لوگ مذہبی مسائل دریافت کرتے مولانا نہ صرف اپنے محلہ کی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے بلکہ عیدین کی نماز بھی عید گاہ میں پڑھاتے تھے۔ گویا مسلمانان بریلی مذہبی قیادت مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں میں تھی مولانا کی قلمی بیاض میں اکثر ایسے حضرات کے نام ملتے ہیں جن سے مولانا کے تعلقات تھے مگر افسوس کہ آج ان حضرات کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

حج

مولانا محمد احسن ۱۵ دسمبر ۱۸۶۶ء کو بریلی سے حج کے لئے روانہ ہوئے پانچ مہینے اس مقدس سفر میں لگے چنانچہ قلمی بیاض میں ایک جگہ تحریر ہے۔

”تاریخ ۱۵ دسمبر (۱۸۶۶ء) سفر حج افتاد و پنج ماہ در آمد رفت صرف شد

آنچہ کہ بود دریں مدت صرف گردید۔“

فریضہ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں روضہ بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری دی۔

مولانا محمد احسن اپنے شیخ طریقت حضرت شاہ عبدالغنی مجددی اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے خاص طور سے ملے حضرت حاجی صاحب نے اپنے ایک مکتوب بنام مولانا رشید احمد گنگوہی میں مولانا محمد احسن کے مدینہ پہنچنے اور موجودگی کا تذکرہ کیا ہے۔
مولانا محمد احسن صاحب سفر حج سے ۱۳ مئی ۱۸۶۷ء کو بریلی واپس پہنچے چنانچہ بیاض میں تحریر ہے۔

”آمد و خرچ بعد مراجعت از سفر حج از ابتدا تا تاریخ ۱۳ مئی ۱۸۶۷ء تا

آخر جولائی ۱۸۶۷ء۔“

مطبوع صدیقی بریلی

انگریزی حکومت کے قیام اور مغربی علوم و فنون کی اشاعت کے ساتھ ہندوستان میں

پریس بھی قائم ہوئے اور جلدی ہی ملک میں پریسوں کا ایک جال پھیل گیا۔ بریلی (روہیل کھنڈ) میں سب سے پہلا مطبع ۱۸۴۷ء میں قائم ہوا (۱) یہ مطبع مدرسہ بریلی (کالج) سے متعلق تھا یہ گویا گورنمنٹ پریس تھا۔ مراد آباد اور بدایوں کا سرکاری کام بھی اسی مطبع میں ہوتا تھا۔

اس ”مطبع عمدۃ الاخبار“ کا ایک اخبار بھی نکلتا تھا (۲) جس کے پہلے ایڈیٹر مولانا عبدالرحمن تھے۔ بریلی کالج کے شعبہ فارسی کے مدرس مولانا قطب شاہ نے مطبع بہادری کے نام سے ایک پریس قائم کیا تھا جس میں انقلاب ۱۸۵۷ء کا لٹریچر اور اشتہار و اعلان چھپتے تھے۔ (۳)

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے بریلی میں مطبع صدیقی قائم کیا، اس مطبع کا صحیح سال قیام تو معلوم نہ ہو سکا مگر مولانا کی قلمی بیاض سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ مطبع صدیقی کا قیام ستمبر ۱۸۶۲ء سے قبل ہوا تھا۔ یہ مطبع مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بھائی مولانا محمد منیر کی شرکت میں تھا مطبع کے مہتمم مولانا محمد منیر تھے، مطبع صدیقی بریلی کی مطبوعات پر مولانا محمد منیر ہی کا نام بطور مہتمم چھپتا تھا مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کا قیام محلہ خواجہ قطب (بریلی) میں تھا اور اسی محلہ میں مطبع صدیقی بھی تھا۔ مطبع میں دوستی مشینیں تھیں جس مکان میں مطبع تھا وہ ایک مدت تک ”چھاپہ خانہ والا مکان“ مشہور رہا ہے۔ شروع میں یہ مطبع بازار درزی چوک میں قائم ہوا تھا۔ مطبع صدیقی بریلی میں مستقل کاتب ”منشی مٹھو والا بریلوی“ تھے۔ انہوں نے ازالۃ الخلفاء عن خلافت الخلفاء وغیرہ کی کتابت کی ہے۔

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کا ”مطبع صدیقی“ کا مقصد صرف تجارت کتب نہ تھا بلکہ دراصل یہ ”ولی اللہی اکیڈمی“ تھی اس مطبع سے ولی اللہی حکمت و فلسفہ کی خوب نشر و اشاعت ہوئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی اکثر معرکتہ آراء تصنیفات حجتہ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخلفاء عن خلافت الخلفاء وغیرہ جیسی کتابیں اسی مطبع سے طبع و شائع ہوئیں ان کتابوں کی اشاعت میں منشی جمال الدین مدار المہام ریاست بھوپال نے مولانا محمد احسن کی بڑی مدد کی۔ خود منشی جمال الدین

(۱) تواریخ ضلع بریلی از منشی گلزاری لال (قلمی) (مخزنہ نیشنل میوزیم آف پاکستان، کراچی)۔

(۲) مطبع عمدۃ الاخبار بریلی کی ایک مطبوعہ کتاب ”تاریخ پنجاب مسمیٰ بہ گلشن پنجاب مولفہ پنڈت دہی پرشاد و طالب علم سابق مدرسہ سرکاری بریلی“ (۱۸۵۰ء) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے کتب خانہ (کراچی) میں موجود ہے۔ مشہور مستشرق گار سان دتاسی کا یہ بیان درست نہیں کہ ۱۸۵۲ء تک بریلی میں صرف ایک ہی مطبع تھا۔ جیسا کہ خطبات گار سان دتاسی صفحہ ۳۰ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ء) میں تحریر ہے۔

بھی ولی اللہی خانوادہ سے مستفید تھے منشی صاحب کی بدولت ریاست بھوپال میں تبلیغ دین و سنت کا خوب کام ہوا اور مولانا نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء) نے تو اس کام کو اور بھی آگے بڑھایا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی تصانیف کے علاوہ بہت ساندھیں علمی اور تاریخی لٹریچر مطبع صدیقی سے طبع و شائع ہوا۔ مطبع صدیقی بریلی میں جو کتاب چھپتی تھی، اس پر حسب ضرورت مولانا محمد احسن رحمہ اللہ حاشیہ لکھتے تھے اسکی تصحیح فرماتے، اس طرح کتاب کی افادیت بڑھ جاتی تھی، مطبع صدیقی بریلی مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کے قیام بریلی تک جاری رہا۔

ہماری معلومات کے مطابق یہ مطبع کم و بیش سولہ سال رہا اور اس عرصہ میں اس مطبع نے علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت میں بڑا کام کیا اس مطبع صدیقی بریلی کی شاخ ”مطبع مجتہبائی دہلی“ نے بھی علوم اسلامیہ کی بڑی خدمت انجام دی کیونکہ مطبع مجتہبائی دہلی مولانا محمد احسن کے ربیب مولانا عبدالاحد نے قائم کیا تھا۔

مطبع صدیقی بریلی کی مطبوعات

اس مطبع سے درج ذیل مشہور زمانہ کتابیں شائع ہوئیں۔
 سرانج السالکین، خلعة النہود (جواب تحفۃ الاسلام)، خفی علانی، حجتہ اللہ البالغہ،
 ازالۃ الخفاء عن خلافتہ الخلفاء، سوط الجبار علی متن الکفار (کامل)، ریاض الحسنات
 عقائد نظامیہ، شفاء قاضی عیاض، ہدیہ اسنی ترجمہ ہدایۃ الاعمی، انتصار الحق مع معیار الحق
 انوار العارفین، ارشاد محمدی، سعادت دارین، تحذیر الناس، ظفر مبین علی جمیع الشیاطین
 رفاہ المسلمین، تحفۃ العجم فی فقہ الامات الاعظم، رسالہ اصل الاصول،
 غایۃ الکلام فی حقیقۃ التصدیق عند حکماء والامام، حکایت الصالحین فی احوال الصادقین
 یہ مختصر ترین فہرست مطبوعات مطبع صدیقی بریلی کی صرف ان کتابوں کی ہے جو ہمارے
 مطالعہ و علم میں آئیں ورنہ ان تمام مطبوعات کی فہرست مرتب کرنا بہت مشکل ہے
 جو تقریباً سولہ سال کے عرصہ میں اس مطبع سے شائع ہوئی ہیں۔

احسن الاخبار بریلی

مطبع صدیقی بریلی سے ایک ہفتہ وار اخبار ”احسن الاخبار“ کے نام سے ۱۷ ستمبر ۱۸۶۲ء

سے نکلنا شروع ہوا۔ اس اخبار کے مالک و مدیر مولانا محمد احسن تھے اور اس کا دفتر رزی چوک بریلی میں تھا۔ یہ اخبار بالعموم جمعہ کو شائع ہوتا تھا سالانہ چندہ سات روپے دس آنے تھا۔

کتب خانہ مطبع صدیقی

بریلی میں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کا ایک تجارتی کتب خانہ بھی تھا جس میں ہر قسم کی کتابیں رہتی تھیں مطبع صدیقی بریلی کی مطبوعات کے علاوہ ونول کشور پریس لکھنؤ، احمدی پریس دہلی، نظامی پریس کانپور، حسینی پریس بمبئی نیز دیگر مطابع کی مطبوعات بھی فروخت ہوتی تھیں۔

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ جملہ حسابات نہایت احتیاط اور ذمہ داری سے رکھتے تھے کیا مجال کہ حساب میں کسی قسم کی گڑبڑ ہو جائے باہر کے تاجروں کے معاملات نہایت دیانتداری اور حسن معاملہ کے ساتھ طے ہوتے تھے جیسا کہ قلمی بیاض سے معلوم ہوتا ہے مولانا محمد احسن کے کتب خانہ سے مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا سبحان بخش شکار پوری، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی (۱) مولانا محمد حسن سہارنپوری، مولانا عبدالقیوم بھوپالی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا فضل الرحمن دیوبندی وغیرہ حضرات کتابیں منگواتے تھے۔ ان جلیل القدر علماء سے مولانا محمد احسن کے خصوصی تعلقات تھے۔ اور چونکہ ان حضرات کا علقہ نہایت وسیع تھے، اسی لئے مطبع صدیقی کی مطبوعات تمام برصغیر میں مشہور و مقبول تھیں۔

مدرسہ مصباح التہذیب بریلی

بریلی میں مختلف علماء کرام انفرادی طور سے مذہبی تعلیم دیتے تھے جن میں مولانا ہدایت علی فاروقی، مولانا لائق علی، مولانا یعقوب علی اور مولانا محمد احسن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس وقت بریلی میں مسلمانوں کی کوئی مرکزی درس گاہ نہ تھی اس لئے مولانا محمد احسن نے بریلی کے اکابر و عمائد کے مشہور اور معاونت سے ایک مدرسہ با اسم تاریخی ”مصباح التہذیب“ ۱۲۸۹ھ ۱۸۷۲ء میں قائم کیا۔ باشندگان شہر کہنہ (بریلی) نے اس مدرسہ کے قیام میں خاص طور سے حصہ لیا (۲) اس مدرسہ کے پہلے مہتمم مرزا غلام قادر بیگ تھے۔

(۱) مولانا رشید احمد گنگوہی نے ہدایت الشیعہ میں خود کو کتب فروش کی حیثیت سے ظاہر کیا ہے اور اپنی کنیت ابو محمد لکھی ہے۔
(۲) مولانا ملک ظفر الدین بہاری مرحوم نے ”حیات اعلیٰ حضرت“ (سوانح عمری مولانا احمد رضا خاں بریلوی) جلد اول صفحہ ۲۱۱ (طبع کراچی ۱۹۵۵ء) میں مدرسہ مصباح التہذیب بریلی کا بانی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے والد مولانا نقی علی خاں کو لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے تفصیل تنبیہ الجہاں (صفحہ ۳۴-۳۹) میں موجود ہے۔

مدرسہ میں پانچ مدرس درس دیتے تھے۔ جس سے طلباء کی تعداد اور مدرسہ کی کامیابی کا اندازہ ہو سکتا ہے مدرسہ نے یہاں تک ترقی کی کہ اس کی دو شاخیں شہر کہنہ (بریلی) میں قائم ہوئیں باشندگان شہر کہنہ (بریلی) اس تعلیمی ترقی میں خاص طور سے دلچسپی لیتے تھے۔ مدرسہ میں مولانا سخاوت حسین، سید کلب علی شاہ، مولانا شجاعت علی، حافظ احمد حسین اور مولانا حافظ حبیب الحسن درس دیتے تھے مگر جلد ہی بعض مسائل میں اختلاف کی وجہ سے اس مدرسہ کی مخالفت شروع ہو گئی اور اس مخالفت میں مولانا نقی علی خاں پیش پیش تھے، انہوں نے اس مدرسہ کے جواب میں ایک دوسری درس گاہ ”مدرسہ اہل سنت“ قائم کیا۔

مدرسہ مصباح التہذیب ختم ہو گیا۔ مولانا محمد احسن نے مصباح التہذیب کا نام بدل کر مصباح العلوم کر دیا (۱) علوم مشرقی کی یہ درس گاہ مقام مداری دروازہ بریلی میں قائم ہوئی۔ شاید یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۴ء میں مولانا محمد یسین مرحوم (۲) نے سرانے خام بریلی میں ایک اور مدرسہ اشاعت العلوم قائم کیا ان دونوں درس گاہوں سے علوم و افکار ولی اللہی کی خاص طور سے نشر و اشاعت ہوتی رہی۔

دور مخالفت

مولانا محمد احسن رحمہ اللہ بریلی میں علوم اسلامی کی گرانقدر خدمات انجام دے رہے تھے۔ مولانا کے مطبع صدیقی سے اسلامی و تبلیغی لٹریچر خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے علوم و افکار کی خوب نشر و اشاعت ہو رہی تھی۔ مولانا بریلی کالج کے علاوہ طلباء کو گھر پر بھی درس دیتے تھے، تصنیف و تالیف کا سلسلہ قائم تھا، مدرسہ مصباح التہذیب بریلی کے ذریعہ اسلامی علوم و فنون کی تعلیم جاری تھی مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کی یہ مذہبی و علمی خدمات بعض مسائل میں

(۱) حکیم عبدالرشید (بازار کتب خانہ بریلی) کا بیان ہے کہ مدرسہ مصباح العلوم بریلی کا افتتاح مولانا محمد قاسم نانوتوی کے دست مبارک سے کر لیا گیا تھا۔

(۲) مولانا محمد یسین کا اصل وطن بسی متصل سرہند (پنیاہ) تھا راج پوت برادری سے تعلق رکھتے تھے، مولانا احمد حسن کان پوری سے تحصیل علم کی دورہ حدیث اور آخری فنون کی کتابیں مولانا غلام رسول سرحدی سے دارالعلوم دیوبند میں پڑھیں اور دورہ حدیث شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے کیا مولانا محمد یسین سند حدیث حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی سے بھی حاصل تھی۔ عنفوان شباب میں مدرسہ فیض عام کانپور میں درس دیا ۱۳۱۲ھ میں بریلی میں مدرسہ قائم کیا اور تا وفات اسی مدرسہ میں علوم دینیہ کا درس دیتے رہے۔ ۷ صفر ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء کو انتقال ہوا۔ مدرسہ اشاعت العلوم (سرانے خام بریلی) میں دفن ہوئے ان کے حلقہ تلامذہ میں مولانا خیر محمد جاندھری جیسے اکابر علماء داخل ہیں۔

اختلاف کی وجہ سے بعض علماء کو ناگوار ہوئیں۔ جن میں مولانا نقی علی خاں (۱) بریلوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ صورت یہ ہوئی کہ ۱۲۸۸ھ ۱۸۷۱ء میں شیخوپور ضلع بدایوں میں مسئلہ امرکان و امتناع نظیر پر مولانا عبدالقادر بدایونی (م ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء) اور شمس العلماء امیر احمد سہسوانی کے درمیان ایک مناظرہ منعقد ہوا مولانا محمد نذیر سہسوانی (م ۱۲۹۹ھ ۱۸۸۱ء) نے ہر دو فریق کے مفصل حالات و تحریرات پر مشتمل ایک کتاب ”مناظرہ احمدیہ“ کے نام سے طبع کرا دی تحریرات مناظرہ میں اثر ابن عباسؓ

”ان الله خلق سبع ارضين في كل ارض آدم کا آدمکم
ونوح کنو حکم و ابراهيم کا ابراهيمکم و موسى 'کمو سکم
وعيسى 'کعیسکم و نبی 'کنبیکم۔“ بھی زیر بحث آیا مرتب رسالہ
مولانا محمد نذیر سہسوانی نے آخر کتاب میں ایک جملہ یہ بھی لکھ دیا۔ (۲)
”مولانا محمد احسن صدیقی نانوتوی بھی اسی (صحت اثر ابن عباسؓ) کے
معتقد ہیں اور اسی مضمون پر ان کی مہر ثبت ہے اور اسی کے اور علمائے دین
قائل اور معتقد ہیں۔“

صحت اثر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق مولانا عبدالحمیٰ فرنگی محلی نے ایک فتویٰ مرتب کیا
تھا جس پر مفتی سعد اللہ مراد آبادی کی تصدیق تھی مولانا عبدالحمیٰ فرنگی محلی نے اس فتویٰ پر
مولانا محمد احسن رحمہ اللہ سے بھی تصدیق و تصویب کے لئے، مہر ثبت کرائی تھی اسی کا حوالہ
محمد نذیر سہسوانی نے مندرجہ بالا اقتباس میں دیا ہے۔

محمد نذیر سہسوانی کے نقل کردہ اقتباس پر مولانا محمد احسن کی تکفیر کی گئی۔

رجب ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء میں مدرسہ مصباح التہذیب ختم ہو گیا۔ مخالفت کا سلسلہ یہیں ختم
نہیں ہوا بلکہ نماز عید الفطر (شوال ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء) کے موقع پر مولانا نقی علی خاں نے
عید گاہ میں مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کے نماز پڑھانے کو بھی پسند نہیں کیا اگرچہ مولانا محمد احسنؒ
ایک مدت سے عیدین کی امامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مولانا محمد احسن رحمہ اللہ نے

(۱) مولانا نقی علی خاں بن مولانا رضا علی خاں بھڑچ ۱۲۳۶ھ ۱۸۳۰ء میں بریلی میں پیدا ہوئے ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۷ء میں شاہ

آل رسول مارہروی سے بیعت ہوئے یہ عمر کا آخری زمانہ تھا ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء میں انتقال ہوا، مولانا نقی علی خاں کی تالیفات میں

مرور القلوب فی ذکر المحبوب اور جواہر البیان فی اسرار الارکان مشہور ہیں (تذکرہ علمائے دیوبند صفحہ ۵۳۰)

(۲) مولانا محمد نذیر سہسوانی نے ”مناظرہ احمدیہ“ کے نام سے طبع کیا (طبع ۱۳۰۹ھ ۱۸۹۲ء)

اس صورت حال کو دیکھ کر درج ذیل تحریر لکھنی ضروری سمجھی (۱)

”اگر سید احمد شاہ صاحب نماز عید گاہ میں پڑھاویں گے تو کسی طرح کا نزاع اور تکرار پیش نہ ہوگا۔ نہ ہمارے دوستوں کی طرف سے اور در صورت نہ ہونے یا انکار کرنے سید صاحب کے قاضی غلام حمزہ صاحب کا امام ہونا مناسب ہے اس پر بھی کچھ تکرار نہ ہوگی اگر انہوں نے بھی قبول نہ کیا تو ہم کو کچھ بحث نہیں کسی کی امامت سے ہماری طرف سے نزاع نہ ہوگی۔“

مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو پھر مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا نقی علی خاں کو عید گاہ سے یہ پیغام بھجوایا کہ (۲)

”میں نماز پڑھنے کو آیا ہوں پڑھانا نہیں چاہتا آپ تشریف لائے جسے چاہئے امام کیجئے میں اس کا اقتدار کر لوں گا۔“

مگر عید گاہ میں نماز مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ ہی نے پڑھائی۔ چونکہ دوسرے لوگوں نے مولانا نقی علی خاں کے اقتداء میں حسین باغ (بریلی) میں نماز عید ادا کی۔ نماز عید کے بعد مولانا نقی علی خاں نے اثر ابن عباس رضی اللہ عنہ کی صحت تسلیم کرنے کی وجہ سے مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی تکفیر کی مولانا محمد احسن نے آخر میں مولانا نقی علی خاں کے ایک ساتھی رحمت حسین کو یہ لکھا۔ (۳)

”جناب مخدوم و مکرم بندہ دام مجاہد۔ پس از سلام مسنون التماس یہ ہے کہ واقع میں جواب مرسلہ مولانا نقی علی خاں صاحب میری تحریر کے مطابق ہے میں نے یہ جواب اس جواب کا خلاصہ لکھا تھا جو مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے لکھا تھا اور اس پر تصدیق مفتی سعد اللہ صاحب کی بھی ہے اور مطبع علوی علی بخش خاں (لکھنؤ) میں یہ چھپا ہے۔ اور زبانی سامنے شاہ نظامی حسین صاحب کے میں نے یہ اقرار کیا کہ مجھ کو اس تحریر پر اصرار نہیں جس وقت علماء کے اقوال ہا کتب مستندہ سے آئیں غلطی ثابت ہوگی میں فوراً اس کو مان لوں گا مگر مولانا صاحب نے براہ مسافر نوازی کوئی غلطی تو ثابت نہ کی اور نہ مجھ کو اس کی اطلاع دی بلکہ اول ہی کفر کا حکم شائع فرمایا اور تمام بریلی میں لوگ اس طرح کہتے پھرے خیر میں نے خدا کے حوالے کیا اگر اس تحریر سے میں

عند اللہ کافر ہوں تو توبہ کرتا ہوں خدا تعالیٰ قبول کرے زیادہ نیاز۔۔۔۔۔
عاصی محمد احسن عفی عنہ

مولانا نقی علی خاں اس تحریر سے بھی مطمئن نہ ہوئے ان کی رائے میں اثر ابن عباس رضی اللہ عنہ کی صحت قبول کرنے کے بعد مولانا محمد احسن منکر ختم النبیین ٹھہرتے تھے اس لئے مولانا نقی علی خاں نے رام پور سے ایک فتویٰ منگولیا جس کی رو سے میری تکفیر مشہور کی وہ استفتاء میری نظر سے بالتفصیل نہیں گزرا بعد تشریف آوری مولانا محمد یعقوب علی خاں صاحب کے اس کی نقل میں نے مفصل دیکھی اور اس عقیدہ والے کی تکفیر پر میں بھی علماء کے ساتھ متفق ہوں یعنی جو شخص خاتم النبیین سوائے آنحضرت ﷺ کسی دوسرے کو جانے اور آپ کی نبوت کو مخصوص کسی طبقے کے ساتھ مانے وہ شخص میرے نزدیک بھی خارج از دائرہ اسلام اور کافر ہے لہذا بر نظر دور کرنے مظنہ عوام کے یہ اشتہار دیتا ہوں کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سوا نہ کوئی بنی خاتم النبیین ہوا نہ ہوگا پس خلاف اس عقیدہ کے غیر صحیح اور غلط تصور کیا جائے۔
المشہر محمد احسن صدیقی

مولانا محمد احسن رحمہ اللہ نے مندرجہ ذیل استفتاء ”اثر ابن عباس رضی اللہ عنہ“ کے متعلق مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی کو بھیجا (۱)

”کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس باب میں کہ زید نے بہ تتبع ایک عالم کے جس کی تصدیق ایک مفتی مسلمین نے بھی کی تھی دربارہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ جو در منشور وغیرہ میں ہے ان اللہ خلق سبع ارضین فی کل ارض آدم کا آدمکم و نوح کنو حکم و ابراہیم کا ابراہیمکم و عیسیٰ کعیسکم و بنی کنیسکم کے یہ عبارت تحریر کی کہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ حدیث مذکور صحیح اور معتبر ہے اور زمین کے طبقات جدا جدا ہیں اور ہر طبقہ میں مخلوق الہی ہے اور حدیث مذکور سے ہر طبقہ میں انبیاء کا ہونا معلوم ہوتا ہے، لیکن اگرچہ ایک ایک خاتم کا ہونا طبقات باقیہ میں ثابت ہوتا ہے مگر اس کا مثل ہونا ہمارے خاتم النبیین کے ثابت نہیں اور نہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ وہ خاتم مماثل آنحضرت ﷺ کے ہوں اس لئے کہ اولاد آدم جس کا

ذکر لقد کرنا بنی آدم میں ہے اور سب مخلوقات سے افضل ہے تو بلاشبہ آپ تمام مخلوقات سے افضل ہوئے پس دوسرے طبقات کے خاتم جو مخلوقات میں داخل ہیں آپ کے مماثل کسی طرح نہیں ہو سکتے انتہی اور باوجود اس تحریر کے مزید یہ کہتا ہے کہ اگر شرع سے اس کے خلاف ثابت ہوگا تو میں اس کو مان لوں گا۔ میرا اصرار اس تحریر پر نہیں پس علماء شرع سے استفسار یہ ہے کہ الفاظ حدیث ان معنوں کے متحمل ہیں یا نہیں اور زید بوجہ اس تحریر کے کافر یا فاسق یا خارج اہل سنت و جماعت سے ہو گیا نہیں بینوں و توجرو۔“

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں ایک مکمل رسالہ ”تخذیر الناس“ تحریر فرمایا۔ تخذیر الناس کے آخر میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا جواب بھی شامل ہے اور اس پر مفتی محمد نعیم کی بھی تصویب ہے۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی (ف ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۶ء) نے اس موضوع پر (۱) زجر الناس علی انکار اثر ابن عباس (۲) الآیات النبویات علی وجود الانبیاء فی الطبقات (۳) دافع الوساوس فی اثر ابن عباس تین مستقل رسالے لکھے ہیں (۱) آخر الذکر رسالہ ہمارے پیش نظر ہے یہ رسالہ مولانا عبدالحی نے کشف الالتباس فی اثر ابن عباس کے رد میں لکھا ہے (۲) اس موضوع پر مولانا عبدالحی فرنگی کے مجموعۃ الفتاویٰ جلد اول میں تین فتوے بھی شامل ہیں۔ جن پر مولانا عبدالحی فرنگی کے علاوہ دوسرے علماء مفتی محمد سعد اللہ، محمد لطف اللہ، محمد نعیم، محمد ابراہیم بن مولانا بن مولانا علی محمد، مولانا محمد عبد اللہ حسینی، ابوالخیر محمد معین الدین، مولانا امیر احمد سہوانی، مولانا محمد حسین، حفیظ اللہ، شریف حسین، محمد عبد العلی، محمد عبد العزیز شہاب الدین غزنوی، عبد الغفور لاہوری اور محمد عبد الغفار ٹونکی کی تصدیق و تصویب موجود ہیں (۳) اس مسئلہ کی تائید میں ایک رسالہ نصر المومنین فی رد قول الجاہلین بھی لکھا گیا مگر اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی (۴) اثر ابن عباس کے بحث اور مناظرہ احمدیہ اور تخذیر الناس کے جواب میں کئی رسالے لکھے گئے۔ ہمارے مطالعہ و علم میں درج ذیل رسالے آئے ہیں۔

(۱) مقدمہ عمدۃ الرعاہ فی حل شرع الوقایہ از مولانا عبدالحی فرنگی محلی صفحہ ۲۹-۳۲ (مطبع یوسفی لکھنؤ)

(۲) دافع الوساوس فی اثر ابن عباس از مولانا عبدالحی صفحہ ۲ (مطبع علوی لکھنؤ ۱۹۲۲ء)

(۳) مجموعۃ الفتاویٰ از مولانا عبدالحی فرنگی محلی جلد اول صفحہ ۱۰۷-۱۱۲، صفحہ ۹۹-۱۳۱-۱۳۵ (۴) تنبیہ الجہال صفحہ ۶۱

(ب) الکلام لا حسن

(۳) قول الفصحیح

(۵) رد رسالہ قانون شریعت

(۷) فتاوائی بے نظیر در نفی آنحضرت بشیر و نذیر

(۹) قسطاس فی موازنۃ اثرا بن عباس

(۱) تحقیقات محمدیہ حل اوہام نجدیہ

(۲) تنبیہ الجہال بالہام الباسط المتعال

(۴) افادات صمدیہ

(۶) ابطال اغلاط قاسمیہ

(۸) کشف الالتباس فی اثرا بن عباس

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اثر بن عباس کے مسئلہ میں علماء بریلی اور بدایوں نے مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی شد و مد سے مخالفت کی، بریلی میں اس مجاذ کی قیادت مولانا نقی علی خاں کر رہے تھے و بدایوں میں مولانا عبدالقادر بدایونی بن مولانا فضل رسول بدایونی سرخیل جماعت تھے، یہی بریلی اور دیوبند کی مخالفت کا نقطہ آغاز تھا جو بعد کو ایک بڑی وسیع خلیج کی شکل اختیار کر گیا۔

ترک سکونت بریلی

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے بریلی کالج سے کب پنشن حاصل کی اور کب بریلی چھوڑی۔ اس کے متعلق کوئی صحیح تاریخ نہیں ملتی شاہجہانپور میں پہلا میلہ خدا شناسی ۷/ مئی ۱۸۷۶ء کو منعقد ہوا تھا، اس میں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد منیر ہی کی تحریک پر مولانا محمد قاسم نانوتوی بلائے گئے اور واپسی میں مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، بریلی میں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ ہی کے یہاں مقیم ہوئے، مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد ابوالمنصود دہلوی کو اپنے ایک خط مورخہ ۳۰/ محرم ۱۲۹۴ھ (مطابق ۱۴/ فروری ۱۸۷۷ء) میں لکھتے ہیں (۱)

”پرسو بندہ کترین نواح بریلی سے لوٹ کر آیا اور کل آپ کا عنایت نامہ بعد واپسی یہیں مجھ کو ملا اور مطالعہ سے مشرف ہوا مہر درخشاں کے دونوں پرچے اور رسالہ تبیان آپ کے عنایت کئے ہوئے بریلی ہی رہے مہر درخشاں کے پرچے تو مولانا محمد منیر (برادر مولانا احسن) نے رکھ لئے۔“

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴/ فروری ۱۸۷۷ء تک مولانا محمد منیر اور مولانا محمد احسن بریلی میں تھے۔ ۱۸۷۷ء بریلی کالج ناقابل برداشت مصارف کی وجہ سے بند کر دیا گیا (۲) لہذا

(۱) عین الیقین مرتبہ مہدی حسن صفحہ ۲۳-۲۴ (۲) بریلی کالج، بریلی صفحہ ۱

معلوم ایسا ہوتا ہے ۱۸۷۷ء کے تعلیمی سال کے اختتام کے بعد مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے بریلی چھوڑی ہوگی۔ اس کے بعد بھی مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی بریلی آتے رہے۔

قیام نانوتہ

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے بریلی سے آکر نانوتہ قیام کیا مولانا کے ہمراہ ان کے بھائی مولانا محمد منیر بھی نانوتہ آگئے یہاں بھی اصلاح و تبلیغ اور تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو گیا۔ مولانا کے مکان کی عمارت بہت وسیع تھی یہ مکان ”بنگلہ والی حویلی“ کے نام سے مشہور تھا۔ اس مکان کے دروازہ کے بیضوی گنبد میں صبح کو درس قرآن و حدیث ہوتا تھا۔ باقی اوقات میں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔ زیادہ تر کام مولانا عبدالاحد کے مطبع مجتہبائی کی کتابوں کی صحت و درستی وغیرہ کا ہوتا تھا اسی زمانے میں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور رسائل انصاف اور عقد الجید کا ترجمہ کشف اور سلک مردار بد کے نام سے کیا حصن حصین کے ترجمہ کو درست اور با محاورہ بنایا قرۃ العینین فی تفصیل الشیخین فتاویٰ عزیزی اور جواہر القرآن (اعمال وادعیہ) کی ترتیب و تصحیح کی۔

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی زیر نگرانی ان کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمن بھی ترجمہ وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا فضل الرحمن نے ۱۳۰۹ھ ۱۸۹۱ء میں انیس الواعظین (فارسی) مولفہ ابو بکر سندھی کا اردو ترجمہ نافع المسلمین کے نام سے کیا۔ جو بعض موانع کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء میں مولانا محمد بیگ نے اسے مکمل کیا اور ۱۳۰۹ھ میں مولانا فضل الرحمن نے ”کلمات طیبات“ کو مرتب کیا۔

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے منشی محمد اسماعیل قانون گو کی اہلیہ صدیقہ بیگم فرمایا کرتی تھیں کہ خدا کی قدرت ہے کہ شیخ تفضل حسین (شیعی) کے جس مکان میں تعزیہ و علم رکھے جاتے تھے۔ وہیں قرآن و حدیث کے درس و تحریر کا کام ہوا یہ خاتون محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی شاگرد تھیں، اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب وہ بیاہ کر آئیں تو پڑھنا بالکل نہ جانتی تھیں تمام گھر میں دین کا چرچا تھا۔ صبح کے وقت گھر کے سب لوگ قرآن شریف کی تلاوت کرتے تھے، ہر طرف سے کلام ربانی کی روح پرور آوازیں آتی تھیں اس صورت حال سے ان کو اپنے حال پر سخت شرمندگی ہوئی آخر ایک روز ہمت کر کے اپنے خسر مولانا محمد احسن سے درخواست کی کہ

”مولانا صاحب! مجھے بہت ندامت ہے کیا ہی اچھا ہو کہ آپ مجھے قرآن شریف پڑھا دیا کریں۔“

مولانا نے نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا

”اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے میں ضرور پڑھا دیا کروں گا۔“ چنانچہ انہوں نے قرآن شریف مولانا محمد احسن سے پڑھا ان ہی کا بیان ہے کہ

”مولانا صاحب اتنی شفقت و محبت سے کلام پاک کا درس دیا کرتے تھے کہ اگر میں حقیقی والدین کے پاس بھی پڑھنے بیٹھتی تو وہ بھی اتنی شفقت سے نہ پڑھاتے کیا مجال کہ کبھی ترش رو ہو کر کچھ کہا ہو حالانکہ سبق دیر سے یاد ہوا کرتا تھا۔“

قصبہ نانوتہ کی بہت سی بچیاں صدیقہ بیگم کی شاگرد تھیں۔ مولانا نے وصیت کی تھی کہ قرآن مجید کی تعلیم کا سلسلہ بلا معاوضہ جاری رکھا جائے کیونکہ یہ صدقہ جاریہ ہے یہ خاتون اس پر تاحیات قائم رہیں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم سے ان خاتون کو اس قدر دینی مسائل یاد ہو گئے تھے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی شائد اتنے یاد نہ ہوں۔

احباب نانوتہ میں شیخ اسد علی (والد مولانا محمد قاسم نانوتوی) شیخ خادم حسین، ملا محمد اسماعیل، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، عمول امانت علی، احمد حسین، محمد حسین، حکیم نصیر الدین، منشی حسین بخش، منشی لطف علی، مولانا غلام حیدر، مولانا محمد صالح، مولانا سخاوت علی، دیدار بخش، مولانا محمد رضا، محمد جان، شیخ نصیر الدین، قادر علی، ابوالحسن، حاجی علی محمد، میر امام علی، مولانا عبدالحی، محمد حنیف، مولانا امام بخش، شاہ کبیر الدین اور مولانا جعفر حسین وغیرہ کے نام نمایاں ہیں افسوس کہ ان حضرات میں سے چند کے سوابق کے حالات پردہ خفاء میں ہیں۔

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ اپنے محلہ کی مسجد (نانوتہ) کے مہتمم تھے اس کی مرمت و درستی وہی کراتے تھے۔ عید گاہ نانوتہ کا انتظام بھی مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ ہی کے سپرد تھا۔

احسن المدارس نانوتہ

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے جب نانوتہ میں قیام کیا تو وہاں بھی ایک مدرسہ قائم کیا جو مولانا ہی کے نام پر ”احسن المدارس“ موسوم ہوا۔ نانوتہ میں جاری رہا راست بھوپال سے اس

کو امداد ملتی تھی یہ امداد منشی جمال الدین مدار الہمام کی معارف پروری اور مولانا کے تعلقات کے نتیجہ میں ہوگی منشی ظفر احمد نانوتوی وکیل، اس مدرسہ کے متعلق لکھتے ہیں۔ (۱)

”میرے سامنے آپ (مولانا محمد احسن) کے نام پر مدرسہ موسومہ ”احسن المدارس“ مسجد میں قائم ہوا چٹڑ کے ایک تختہ پر شیخ ابوالحسن صاحب (۲) عرف امام جی نے جو خوشنویس تھے مدرسہ کا نام میرے سامنے لکھ کر لٹکا یہ مدرسہ جنوبی سہ دری مسجد (واقع محلہ شیخ زادگان) میں قائم ہوا۔ مدرسہ میں کلام مجید چراغ دین صاحب پیش امام اور ابتدائی کتابیں فارسی کی امام جی (مولانا ابوالحسن) پڑھاتے تھے برسوں یہ مدرسہ چلتا رہا۔ مدرسہ کے ختم ہونے کے اسباب میرے مشاہدہ میں نہیں سماعت میں ہیں کہ باہمی شیخ زادگان کی رسہ کشی اس کا باعث ہوئی“

۱۹۳۷ء تک نانوتہ میں یہ مدرسہ قائم رہا۔

وصال

مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کی عمر تقریباً ۷۰ ستر سال ہوئی شروع ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۴ء میں بیمار ہوئے علاج کی غرض سے دہلی گئے۔ لیکن افاقہ نہ ہوا رمضان میں دہلی سے واپس آئے راستہ میں مولانا ذوالفقار علی نے دیوبند میں ٹھہرنے کے لئے اصرار کیا۔ مولانا محمد منیر بحیثیت مہتمم دارالعلوم اس وقت دیوبند میں مقیم تھے مولانا محمد احسن اپنے برادر عزیز مولانا محمد منیر کے یہاں ٹھہر گئے۔ زمانہ مرض الموت کا ایک خاص واقعہ یہ ہے کہ جب مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کے صاحبزادے منشی محمد اسماعیل گرد اور قانون گو جو قصبہ باغپت یا سردھنہ میں تعینات تھے کو اطلاع ملی تو انہوں نے رخصت لے کر دیوبند آنا چاہا۔ حاکم ضلع نے رخصت دینے سے انکار کر دیا۔ جس پر منشی محمد اسماعیل نے استعفیٰ دے دیا اور اس کی منظوری یا عدم منظوری کا انتظار کئے بغیر دیوبند

(۱) مکتوب منشی ظفر احمد وکیل نانوتوی بنام محمد ایوب قادری مورخہ یکم دسمبر ۱۹۵۶ء

(۲) شیخ ابوالحسن ابن شیخ تفضل حسین شیعہ نانوتوی، شیخ ابوالحسن کی ایک کتاب علی نامہ مطبوعہ ”مطبع اختر بند“ (۱۳۰۶ھ) ہمارے کتب خانہ میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابوالحسن نانوتوی نے شیخین السیدین کے دور خلافت کی فتوحات کے حالات کو فارسی میں ”شمسیر اسلام“ کے نام سے نظم کیا جس میں سارے تیرہ ہزار اشعار ہیں۔ فتوحات عثمانیہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی شیخ ابوالحسن کا ندھب اہل سنت و جماعت تھا۔

چلے آئے جب مولانا محمد احسن کو محمد اسماعیل صاحب کا یہ واقعہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا۔
 ”یاد رکھو روزگار بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے قیامت میں جہاں
 اللہ تعالیٰ اپنی دیگر نعمتوں کے متعلق سوال کرے گا وہاں بندے سے روزگار کے
 متعلق بھی پوچھے گا کہ میں نے تجھے روزگار کی نعمت دی اور تو نے اسے ٹھکریا تو
 اس وقت کیا جواب دو گے یہ کفر ان نعمت ہے ویسے جاؤ میں تم سے بے حد
 خوش ہوں“

مولانا محمد منیر نے دیوبند کے اس مختصر سے قیام میں مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کی ہر قسم کی خدمت
 کی مگر موت کا وقت معین ہے غشی محمد اسماعیل کی واپسی کے دو روز بعد آخر ہفتہ رمضان ۱۳۱۲ھ
 ۱۸۹۵ء میں مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کا انتقال ہو گیا۔

قریب نصف صدی مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کی ذات بابرکات سے علم و فضل کی شمع روشن
 رہی۔ دارالعلوم دیوبند کے قبرستان میں اس مجسمہ فضل و کمال کا جسد خاکی سپرد خاک کر دیا گیا۔
 انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد احسن نانوتوی رحمہ اللہ، قبرستان قاسمی میں آسودہ خواب ہیں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ
 کے برابر میں جانب مشرق ایک قبر چھوڑ کر ان کی قبر ہے درمیانی قبر مولانا ذوالفقار علی (والد
 ماجد شیخ الہند) کی ہے، مولانا فضل الرحمن (والد ماجد مولانا شبیر احمد عثمانی) نے ذیل کے شعر میں
 اس کی نشان دہی فرمائی ہے۔

ہاں! نجسپ آسودہ ترما بین دو یاران خویش

قاسم بزم مودت، احسن شائستہ خو

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کی خبر وصال حضرت امداد اللہ صاحب

کو مکہ معظمہ بھیجی حضرت حاجی صاحب ۱۲/ ذیقعدہ ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۵ء کے خط میں لکھتے ہیں (۱)

”خط آپ کا مورخہ ۲۱/ شوال بذریعہ ڈاک موصول ہوا..... مولانا

محمد احسن صاحب نانوتوی رحمہ اللہ..... کے انتقال سے بہت صدمہ ہوا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون خدا مغفرت نصیب کرے اور پس ماندوں کو صبر

عطا فرماوے۔“

علم و فضل

مولانا محمد احسن رحمہ اللہ جامع فضائل و کمالات تھے، انہوں نے علوم متداولہ کی باقاعدہ تحصیل کی تھی۔ تصنیف و تالیف سے ان کو خاص شغف رہا۔ انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی معرکہ آراء تصانیف حجتہ اللہ البالغہ اور ازالتہ الخفاء عن خلافتہ الخلفاء کی تصحیح و ترتیب بہت محنت سے کی اور حسب ضرورت حاشیے بھی لکھے۔

مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے رسالہ عقد الجید پر مفید اور تنقیدی حاشیے لکھے ہیں۔ مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کے شغف علمی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ امام غزالی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب احیاء العلوم کا اردو ترجمہ منشی نول کشور آنجہانی کی فرمائش پر چار ضخیم جلدوں میں کیا اسی ماہ میں صرف سات ماہ کے اندر ابن قیم کی مشہور کتاب اغاثنی اللہ فان کا ترجمہ و خلاصہ تہذیب الایمان کے نام سے کیا یہ کتاب ۶۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور مطبع صدیقی بریلی سے طبع ہوئی ہے۔ علامہ سلیمان ندوی مرحوم نے برسبیل تذکرہ ایک مرتبہ فرمایا

”مولانا محمد احسن مرحوم رحمہ اللہ نے احیاء العلوم کے ترجمہ میں بڑا کام یہ

کیا ہے کہ موضوعات کی نشاندہی کرتے چلے گئے ہیں۔“

اسی طرح درمختار کا بقیہ ترجمہ کتاب الاذان کے بعد ایک قلیل عرصہ میں کیا ان ضخیم اور اہم کتابوں کے تراجم کا کام مولانا محمد احسن نے بڑی قابلیت اور حسن و خوبی کیساتھ انجام کو پہنچایا۔ مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کے پاس اکثر فتوے آتے تھے مولانا ان کے جوابات نہایت مدلل تحریر فرماتے ان کے فتاویٰ میں طویل تمہیدات و مقدمات نہیں ملتے بلکہ وہ نفس جواب اور صریح سند پر اکتفا کرتے ہیں۔ بریلی کالج میں وہ حضرات بھی جن کو مولانا سے اختلاف رائے تھا فتاویٰ پر مولانا محمد احسن کی مہر ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ ”تنبیہ الجہال“ سے اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا محمد احسن صاحب رحمہ اللہ نے انگریزی زبان کی بھی باقاعدہ تحصیل کی تھی آپ کی قلمی بیاض میں اکثر یادداشتیں انگریزی میں تحریر ہیں۔ سرسید احمد خان بہادر کی تحریک پر گاؤ فری ہیگنس کی کتاب کا ترجمہ حمایت الاسلام کے نام سے کیا۔

مولانا کے تراجم کے متعلق مؤلف مظہر العلماء تحریر فرماتے ہیں (۱)

”مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، فرید العصر، وحید الدہر، مترجم لاثانی،

یگانہ مشہور ہر دیار و امصار، ایک دفتر عظیم کتب دینیات عربیہ کا ترجمہ نہایت

دلچسپ پیرایہ میں تا قیام قیامت آپ سے یادگار رہے گا۔

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا احسن تخلص فرماتے تھے۔ مولانا کی

تصنیفات میں اکثر قطعات تاریخ ان کے اپنے لکھے ہوئے ہیں، رسالہ عروض میں مثالوں

میں بعض جگہ خود مولانا کے اشعار ہیں اغاثۃ اللہفان اور احیاء العلوم کے ترجمہ میں اشعار کا

ترجمہ اشعار میں کیا ہے مولانا خود لکھتے ہیں (۱)

”اس ترجمہ (احیاء العلوم) میں اشعار کا ترجمہ اشعار میں کیا ہے اور یہ

التزام نہیں کہ اشعار اردو ہی ہوں بلکہ بعض جا فارسی بھی ہیں جہاں بندش

فارسی کے الفاظ کی بن پڑتی ہے اور یہ ترجمہ سب اس طرح لکھا ہے کہ نوبت

مسودہ کی نہیں آئی فکر اول ہی میں جو عبارت ذہن میں گزری قلم برداشتہ لکھ

دی اور بہ ہمیں وجوہ جو اشعار کتاب میں مکرر واقع ہوئے ہیں ان کا ترجمہ ہر

جگہ مختلف ہوا ہے۔“

چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں (۲)

تم نے بات نہ میری مانی کس کام آئی یہ نادانی

غرض کیا کہوں کیا ہے میرا حال کہ ظاہر ہے دل پہ ترے سب کا حال

الہی کروں کس سے جا التجا عنایت نہ ہو تجھ سے گرم دعا

کہتی ہے گل سے یوں صبا کیوں خندہ بجا کیا اسکی عوض میں چاک ہے تیری بقا کا پیرہن

ہر چند ظاہر تھیں تری خلق میں بے باکیاں لیکن نہ تھیں مجھ سے کبھی اس طور کی چالاکیاں

ہے برا تو ہی اگر تکتا ہے تو سب کی خطائیں تو ہی چھا ہے تری نظروں میں گر خوب سب آئیں

ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے کیسی نخی کا داماں جو مثل تار زر ہے ٹکڑے میرا گریباں

(۱) مذاق العارفین (ترجمہ احیاء العلوم) از مولانا محمد احسن نانوتوی جلد اول مطبوعہ لکھنؤ

(۲) آخر کی اور میں مذاق العارفین میں آئی اور بقا قیام اشعار و شاعری میں ہے۔

غم کے عالم میں پڑا رہتا ہوں جو کچھ گزرے اسے سدا سہتا ہوں
اس غم میں یاں نہیں جو کوئی مونس دل ہی دل میں خدا خدا کہتا ہوں

گر کیسا ہی پیدا کرو طاعت میں کمال دن رات رہے ذکر و عبادت کا خیال
کچھ فائدہ احسن نہ ہوا اس محنت سے کھانے کے لئے گر نہ ہو مال حلال

احسن غفلت میں کٹے دن رات لاتعلم ان ماضی یس مات
کھوتا ہے خرافات میں کیوں عمر عزیز فاعبد مولاک فی جمیع الاوقات
مولانا محمد احسن رحمہ اللہ تاریخ گوئی میں بھی بہت مہارت رکھتے تھے، مولانا نے اپنی
تصنیفات نیز اکثر مطبوعات مطبع صدیقی بریلی پر قطعات تاریخ خود لکھے ہیں جن کی تفصیل
حسب موقعہ درج ہے۔ اس کے سوا ایک خاص بات یہ ہے کہ مولانا محمد احسن صاحب
مطبوعات مطبع صدیقی کی لوح کی عنوان سطر ایسی عبارت سے ترتیب دیتے تھے جس سے سنہ
طباعت نکلتا تھا۔ یہ بڑے کمال کی بات تھی۔ ازالۃ الخفاء کی سطر لوح عنوان۔

”اللہ لطیف بعبادہ یرزق من یشاء هو القوی العزیز“

(۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء) غایتہ الاوطار کی ”فقیہہ واحد اشد علی

الشیاطین من الف عابد“ (۱۲۸۸ھ ۱۸۷۱ء) اور عقائد نظامیہ کی

”بعون ایزد متعال احد بے مثال“

(۱۲۸۷ھ ۱۸۷۰ء) جس سے سال طباعت ظاہر ہوتا ہے۔

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی رحمہ اللہ نے ان کی شان میں ایک طویل عربی

قصیدہ بھی لکھا اس کے اشعار خوف طوالت سے پیش نہ کرنے کے لئے

معذرت خواہ ہیں۔

بیعت

مولانا محمد احسن رحمہ اللہ علوم ظاہری کے ساتھ علم باطن کا بھی ذوق رکھتے تھے اور کسی صاحب
نظر شیخ کے متلاشی تھے کہ شیخ کی صحبت اور اثر سے بے قرار طبیعت کو سکون حاصل ہو۔ چنانچہ
اس زمانے کے دو تین ممتاز اہل طریقت کی طرف ان کا خیال گیا بالآخر اپنے استاد علوم ظاہری

حضرت شاہ عبدالغنی مجددی نقشبندی کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ بیعت کا شرف بخشا جائے۔ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی، مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فضل سے خوب واقف تھے، کیونکہ علم حدیث کی تحصیل مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ عبدالغنی ہی سے کی تھی لہذا حضرت شاہ عبدالغنی نے فرمایا کہ جماعت درویشاں میں دعویٰ علم و فضل کی گنجائش نہیں یہاں تو ”انا“ کو مٹا کر بقا کی منزل ملتی ہے۔ مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ، عقیدت و ارادت کے ساتھ خدمت شیخ میں حاضر ہوئے تھے۔ لہذا حضرت شاہ عبدالغنی کے دست حق پرست پر نقشبندی سلسلہ میں بیعت ہو گئے۔

جب مولانا محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں حج بیت اللہ کو گئے تو اپنے شیخ طریقت حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اس موقع پر مولانا محمد احسن شرف اجازت و خلافت سے بھی سرفراز ہوئے۔ صاحب انوار العارفین لکھتے ہیں (۱)

”و در صحبت شیخ خود از کیفیت نسبت لطیف اثر بلیغ برداشتند و اجازت یافتند و نازاں گردید۔“

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر اللہ کا یہ عالم تھا کسی وقت یاد الہی سے غافل نہ ہوتے جب عشاء کی نماز کے بعد مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ لیٹ جاتے تو گھر کے لوگ سمجھتے کہ مولانا سو رہے ہیں۔ مگر مولانا ذکر الہی میں مشغول ہوتے تھے اور سینہ معارف گنجینہ ہلتا ہوا معلوم ہوتا۔ مولانا اکثر شب بیداری کرتے تھے۔ جب ۱۲۸۷ھ ۱۸۷۰ء میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے حج بیت اللہ کو جانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اپنے مرید شی محمد قاسم نیا نگری (اجمیری) کی اصلاح و تربیت کے لئے مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کو تجویز کیا مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے میں اپنے ایک مکتوب مورخہ ۳ صفر ۱۲۸۷ھ ۱۸۷۰ء میں لکھتے ہیں (۲)

”انشاء اللہ جب میں روانہ ہوں گا تم کو اطلاع دوں گا اور جو امور اس وقت کے مناسب ہوں گے عرض کروں گا مولانا محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد منیر صاحب بریلی کالج میں نوکریں اور ان کا ایک چھاپہ خانہ ہے یہی ان کے لئے نشان ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ اگر میری صورت روانگی ہوئی تو مولانا محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تمہارے باب میں لکھ دوں گا۔“

جب مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا حج جانے کا ارادہ کچھ پختہ ہوا تو انہوں نے منشی محمد قاسم نیا نگری (اجمیری) کو ۱۸ جمادی الاول ۱۲۸۸ھ ۱۸۷۱ء کے ایک مکتوب میں، ان علمائے باعمل کا تعارف کرایا جن سے مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی عدم موجودگی میں فیض حاصل کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں (۱)

”یہاں چند عالم باعمل صاحب کمال تھے ان سے ملاقات ہوئی تو امید نفع کی تھی۔ مگر ہر کام وقت پر منحصر ہے ان بزرگوں میں سے یہ نام یاد رکھو جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی..... جناب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمد مظہر صاحب پہلے اجمیری میں مدرس رہ گئے ہیں احقر کے بھائی اور وطن دار ہیں۔ سہارنپور کے مدرسہ (مظاہر العلوم) میں مدرس اول ہیں اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بریلی کے انگریزی مدرسہ میں مدرس ہیں۔“

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ مرید بہت کم کرتے تھے، آپ کے صاحبزادے منشی محمد اسماعیل کی اہلیہ نے ایک مرتبہ مولانا سے کہا کہ ”مولانا صاحب! آپ بھی تو عالم بزرگ ہیں جس طرح مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید کثرت سے ہیں آپ بھی لوگوں کو مرید کیجئے گھر بیٹھے آمدنی ہوگی۔“

مولانا محمد احسن نے ہنس کر جواب دیا۔

”بی صاحبہ! مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کیا ذکر ہے وہ تو بادشاہی احدی ہیں (۲)۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ محنت کر کے کھاؤ اسی لئے ملازمت کرتا ہوں۔“

اعزہ کی خوشنودی

مولانا نہایت حلیم، بردبار اور سلیم الطبع تھے فتنہ و فساد سے سخت تنفر تھا۔ گھر میں ہمیشہ خوش رہتے اور بچوں سے محبت کرتے تھے اپنے گھر والوں کی خوشنودی کا خاص طور سے خیال

(۱) مکتوب یعقوبی مکتوب ۷۱ مطبوعہ دہلی پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۲۹ء (۲) بے تکلفانہ اظہار خیال ہے۔

رکھتے تھے جس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ خاندان میں کسی کی شادی تھی گھر والوں نے مولانا کی وجہ سے کوئی ایسی رسم وغیرہ نہیں کی جس سے تقریب شادی کا اندازہ ہوتا مولانا نے جب یہ کیفیت دیکھی تو مستورات سے مخاطب ہو کر فرمایا (۱)

”لڑکیو! تمہارے گھر میں شادی ہے اور تم کوئی خوشی کی بات نہیں کر رہی ہو جس سے معلوم ہو کہ اس گھر میں شادی ہے“

اعزہ واقرباء کی فرمائشیں

جب مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نانوتہ سے بریلی آتے تھے تو ان کے اعزہ واقرباء اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں بریلی سے منگواتے تھے، مولانا احمد علی محدث سہانپوری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد مظہر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، عموں امانت علی، شیخ اسد علی کے علاوہ زیادہ تر فرمائش خاندان اور برادری کی مستورات کی ہوتی تھیں۔ مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ ان فرمائشوں کو بالتفصیل اپنی ڈائری میں لکھتے تھے اور ان چیزوں کو خریدنے کے بعد ان سے متعلق ضروری یادداشتیں بھی لکھتے تھے۔

مولانا کی قلمی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد احسن کی والدہ ۱۸۶۵ء تک زندہ رہیں کیونکہ اس کے بعد ان کی فرمائشیں بیاض میں درج نہیں ہیں۔ مولانا محمد احسن قرض کی مکمل تفصیلات درج کرتے تھے اور اس باب میں بڑی احتیاط فرماتے تھے۔

خانگی معاملات

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کے دو بیویاں تھیں پہلی شادی گنگوہ میں متولی نصیر الدین کی بہن ”امانت النساء“ کے ساتھ ہوئی تھی جن سے ایک لڑکی کلثوم، اور دو لڑکے مولانا فضل الرحمن اور منشی محمد اسماعیل پیدا ہوئے، مولانا ان کو ”والدہ فضل الرحمن“ کہتے تھے۔ دوسری بیوی بنارس والی تھیں ان کو ”والدہ عبد الاحد“ کہتے تھے، خاندان کے سب لوگ انہیں ”بنارس والی“ کہتے تھے مولانا کی خانگی زندگی ہمیشہ خوشگوار رہی دونوں اہل خانہ کو علیحدہ علیحدہ خرچ دیتے تھے۔ یہاں

(۱) مکتوب مشہور عزیز حسن نانوتوی بنام (مؤلف کتاب) مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۵۶ء

سوانح علمائے دیوبند ع۔ ۵۴۵ حضرت مولانا محمد احسن نانوتوی

تک کہ دونوں بیویاں کافی رقم پس انداز کر لیتی تھی اور بسا اوقات مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ ان سے قرض لیتے تھے۔

مولانا ضبط اور نظم کے بہت پابند تھے تمام مصارف روزانہ قلم بند کرتے تھے مہینہ کے آخر میں آمد و خرچ کا میزان دیتے تھے مولانا کی آمدنی عام طور سے دو سو روپیہ ماہانہ سے زائد ہوتی تھی لیکن خرچ ہمیشہ آمدنی کے قریب رہتا تھا مشکل سے دس پانچ روپے باقی بچتے تھے مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نہایت خوش خوراک اور خوش پوشاک تھے۔ زندگی بہت فراغت اور خوش حالی سے بسر ہوتی تھی۔ مولانا محمد احسن اپنی سوتیلی اولاد مولانا عبدالاحد اور بی زینب کی ضروریات کا بہت خیال رکھا کرتے تھے۔

حلقہ تعلقات

مولانا محمد احسن کا سلسلہ احباب نہایت وسیع تھا علماء کرام اور مشاہیر ملک سے خاص تعلقات تھے۔ بریلی، بدایوں اور نانوتہ کے احباب کے ناموں کے ساتھ اس فہرست کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

(۱) حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی المتوفی ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء

(۲) مولانا نور الحسن کاندھلوی المتوفی ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء

(۳) مولانا عبدالحمیٰ فرنگی محلی المتوفی ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۶ء

(۴) مولانا شیخ محمد تھانوی المتوفی ۱۲۹۶ھ ۱۸۷۹ء

(۵) مولانا رشید احمد گنگوہی المتوفی ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء

(۶) مولانا محمد قاسم نانوتوی المتوفی ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء

(۷) مولانا محمد یعقوب نانوتوی المتوفی ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۴ء

(۸) مولانا عالم علی مراد آبادی المتوفی ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء

(۹) مولانا عبدالقیوم المتوفی ۱۲۹۹ھ ۱۸۸۲ء

(۱۰) مولانا احمد حسن مراد آبادی المتوفی ۱۲۸۸ھ

(۱۱) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی المتوفی ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء

(۱۲) مولانا فضل الرحمن دیوبندی المتوفی ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۱ء

- (۱۳) مولانا محمد حسین مراد آبادی مولف انوار العارفین
- (۱۴) مولانا محمد ریاض الدین کاکوروی المتوفی ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء
- (۱۵) مفتی سعد اللہ مراد آبادی المتوفی ۱۲۹۲ھ ۱۸۷۵ء
- (۱۶) مولانا ارشاد حسین مجددی رام پوری المتوفی ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۴ء
- (۱۷) مولانا غلام امام شہید المتوفی ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء
- (۱۸) مولانا محمد حسن سہارنپوری
- (۱۹) مولانا حکیم سعید اللہ (۱) ساکن قصبہ آنولہ (ضلع بریلی) المتوفی ۱۹۰۷ء
- (۲۰) حکیم سعادت (۲) علی خاں رئیس اعظم آنولہ و مدار المہام ریاست رام پور المتوفی ۱۹۰۷ء
- (۲۱) سر سید احمد خاں بہادر المتوفی ۱۸۹۸ء
- (۲۲) عبد الرحمن خاں مالک نظامی پریس کانپور
- (۲۳) منشی نول کشور پریس لکھنؤ المتوفی ۱۸۹۵ء
- (۲۴) شیخ نہال احمد دیوبندی
- (۲۵) منشی جمال الدین مدار المہام ریاست بھوپال المتوفی ۱۲۹۹ھ ۱۸۸۱ء
- (۲۶) مولانا فیض الحسن سہارنپوری ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۷ء

زمینداری

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق نانوتہ کے ایک ایسے قدیم خاندان سے تھا جس کو شاہان دہلی سے معافیات حاصل تھیں مولانا بھی موروثی زمینداری و معافیات کے مالک ہوئے ہر سہ برادران مولانا محمد مظہر، مولانا محمد احسن اور مولانا محمد منیر (پسران شیخ حافظ لطف علی قوم شیخ زادگان ساکن نانوتہ) کا مشترکہ کھاتہ تھا اور کل زمین ۷۹۷۲ بیگہ تھی مولانا محمد احسن کے تین باغ بھی تھے۔

تجارت

مولانا محمد احسن کتابوں کی تجارت ہمیشہ کرتے رہے مطبع صدیقی بریلی کے قیام کے بعد تو تجارت کتب کا یہ سلسلہ اور بھی وسیع ہو گیا تھا مگر محرم ۱۲۷۵ھ ۱۸۵۸ء میں مولانا نے شیخ علی بخش و محمد حسین سوداگران بریلی کے ساتھ کپڑے اور اناج کی بھی تجارت کی تھی ۱۲۷۵ محرم ۱۲۷۵ھ ۱۸۵۸ء کو دو سو روپے ان حضرات کو دیئے اور مال کانپور و فرخ آباد سے آیا تجارت ۵ نومبر

۱۸۵۸ء سے شروع ہوئی اور ۲۰ جنوری ۱۸۵۹ء تک یہ سلسلہ جاری رہا ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں ”نقشہ تجارت کہ احقر البریہ شروع نمود خداوند کریم بحق محمد ﷺ و آل اصحاب محمد ﷺ نفع دہد و بیج نوع ضرر عائد نگرداند آمین“

مولانا اقتصادیات میں تجارت کو ایک خاص مقام دیتے تھے اور ان کی مرفہ الحالی کا یہ ایک خاص سبب تھا۔

خریداری حویلی بنگلہ والی

”بنگلہ والی حویلی“ یا ”محل“ نانوتہ میں بہت وسیع اور عالی شان حویلی ہے اس کے دروازہ پر اک بیضوی گنبد ہے۔ جس کے چاروں طرف کھڑکیاں کھلتی ہیں یہ حصہ تاج کہلاتا ہے یہ حویلی ۱۰۶۰ درعہ (مربع گز) ۳ گرہ زمین پر مشتمل تھی۔ جس کا ایک حصہ شیخ تفضل حسین و خادم حسین پسران شیخ علی محمد کی ملکیت تھا اور بقیہ حصے کے مالک شیخ اسد علی (ابن غلام شاہ قوم شیخ زادگان ساکن نانوتہ) تھے اور دو حصہ جداگانہ طور سے تعمیر تھے۔ شیخ تفضل حسین کے مارے جانے کے بعد ان کے دو صاحبزادے محمد حسین و ابوالحسن اور بھائی شیخ خادم حسین اس حویلی کے مالک ہوئے، جب ان لوگوں کی مالی حالت خراب ہو گئی تو انہوں نے اپنی حویلی مولانا محمد احسن نانوتوی رحمہ اللہ کے ہاتھ فروخت کر دی۔

مولانا محمد احسن نانوتوی رحمہ اللہ نے بیعنامہ کا ایک مسودہ اپنی ڈائری میں نقل کیا ہے جس پر ۲۰ جنوری ۱۸۵۷ء مطابق ۲۲ جمادی الاول ۱۲۷۳ھ روز شنبہ تحریر ہے۔

حلیہ

اوسط قد، گورے چٹے، گھنی گوں داڑھی، ناک ستواں، خوبصورت چہرہ کسی قدر گولائی لئے ہوئے، آواز خوش گفتار و شیریں، چہرہ سے متانت اور سنجیدگی کا اظہار ہوتا تھا علم و بردباری طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

لباس

لباس میں کرتہ، پاجامہ اور عبا پہنتے تھے صدری اور انگرکھا بھی زیب تن کرتے تھے موسم سرما میں لحاف، توشک، رضائی، دوہر اور چادر کا اہتمام ہوتا تھا، کپڑوں میں خاصہ ململ، چھینٹ،

جامدانی، گٹھی، ہافتہ، نینو اور اطلس کے کپڑے مولانا کے گھر میں استعمال ہوتے تھے ”امید“ خیاط کا ایک مستقل کھاتہ تھا (۱)

تصانیف و تراجم

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف سے عبارت ہے مطبع صدیقی بریلی کی وجہ سے اس سلسلہ کو اور بھی وسعت ہوئی کیونکہ مطبع اپنا تھا مولانا نے زیادہ تر ضخیم اور اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے ہیں بریلی کے قیام میں تصنیف و تالیف کا کام زیادہ ہوا آخر زمانہ میں جب نانوتہ قیام رہا تو اس وقت مطبع مجتہبائی دہلی کا صحیح و حواشی کا کام ہوا اس زمانے میں بعض ترجمے کئے ہیں، ان کی زبان، بامحاورہ، صاف اور سلیس ہے، مولانا بڑی حد تک قواعد اور صحت عبارت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مولانا لفظی ترجمہ کے بجائے بامحاورہ ترجمہ کو ترجیح دیتے تھے اس وقت نثر اردو ابتدائی حالت میں تھی اس لئے نثر اردو کے ارتقاء میں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کے تصانیف و تراجم خاص توجہ کے مستحق ہیں اب ہم ذیل میں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کارنامے پیش کرتے ہیں۔

(۱) تحفۃ المصننین

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کی غالباً یہ سب سے پہلی تصنیف ہے انہوں نے یہ مختصر سا رسالہ باشندگان بنارس کی درخواست پر ان عورتوں کے بیان میں لکھا ہے جن سے مرد کو نکاح کرنا حرام ہے یہ رسالہ ۱۲۶۵ھ ۱۸۴۹ء مابین عیدین لکھا گیا۔

(۲) اصول جر ثقیل

نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے۔ ۱۸۵۴ء میں بنارس میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے (۲)

(۳) نافع خریداران

یہ رسالہ مولانا محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیع و شراء کے مسائل کے بیان میں لکھا ہے کہ جیسا کہ آغاز رسالہ میں خود تحریر فرماتے ہیں (۳)

(۱) یہ تمام تفصیل قلمی بیانیہ میں درج ہیں۔ (۲) تاریخ داستان اردو از حامد حسن قادری صفحہ ۱۹۰ (آگرہ ۱۹۳۱ء)

(۳) نافع خریداران از مولانا محمد احسن صفحہ ۲ مطبع نظامی کانپور ۱۲۷۵ھ

(۴) قواعد اردو حصہ چہارم

ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن صوبہ شمالی و مغربی (یوپی) کے حسب الحکم نصاب کی غرض سے قواعد اردو کو چار حصوں میں ترتیب دیا گیا اس سلسلہ کا چوتھا مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کیا ہے۔۔ شروع کے تین حصے دوسرے حضرات نے لکھے، مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ آغاز رسالہ میں لکھتے ہیں (۱)

(۵) رسالہ عروض

فن عروض میں مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔

(۶) زاد المحذرات

یہ کتاب تعلیم نسواں کے بیان میں تالیف کی گئی۔

(۷) مفید الطالبین

عربی کے ابتدائی طلباء کے لئے نصاب کی ضرورت سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ ادیب شہیر مولانا اعزاز علی امر و ہوی المتوفی ۱۳/ رجب ۱۳۷۴ھ ۱۹۵۵ء نے اس پر حاشیہ لکھا ہے۔

(۸) مذاق العارفین

حجتہ الاسلام امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء العلوم کا اردو ترجمہ مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے منشی نول کشور (مالک مطبع نول کشور لکھنؤ) کی فرمائش پر (۱۲۸۱ھ ۱۸۶۴ء تا ۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء) چار ضخیم جلدوں میں کیا مذاق العارفین تاریخی نام ہے ترجمہ با محاورہ اور سلیس ہے۔

(۹) تہذیب الایمان

حافظ ابن قیم کی مشہور کتاب اغاثۃ الہفان کا اردو ترجمہ و خلاصہ ہے۔

(۱۰) احسن المسائل

فقہ کی مشہور کتاب کنز الدقائق کا فارسی ترجمہ شاہ اہل اللہ دہلوی (برادر حضرت شاہ ولی اللہ

دہلوی) نے کیا تھا، مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بھائی مولانا محمد منیر کی فرمائش پر فارسی سے اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔

(۱۱) غایت الاوطار

فقہ حنفی کی مشہور و متداول کتاب در مختار کا اردو ترجمہ ہے۔

(۱۲) حمایت الاسلام

اب سرسید احمد خاں ۱۸۶۹ء میں لندن گئے تھے تو ان کے پیش نظر مشہور مصنف ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب لکھنا بھی مقصود تھا چنانچہ انہوں نے لندن میں کافی مواد جمع کیا۔ انگلستان کے ایک معروف مصنف گاڈ فری ہیگینس GODFREY HIGGINS کی کتاب اپالوجی APOLOGY جو اس نے تائید و حمایت اسلام اور عیسائیوں کے اعتراضات کی تردید میں لکھی تھی سرسید احمد خاں نے بہت تلاش و جستجو کے بعد کسی جرمن کتب فروش سے دس گنی قیمت دے کر حاصل کی اور خطبات احمدیہ کی تالیف میں اس سے مدد لی سرسید احمد خاں کو خیال ہوا کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی ہونا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے مولانا محمد احسن کو یہ کام سپرد کیا۔ مولانا نے اس کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

(۱۳) کشف

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مشہور رسالہ الانصاف فی بیان سبب الاختلاف کا اردو ترجمہ ہے

(۱۴) سلک مروارید

حضرت شاہ ولی دہلوی کے مشہور رسالہ عقد الجید فی احکام الاجتہاد و تقلید کا اردو ترجمہ ہے

(۱۵) خیر متین

حصن حصین کا اردو ترجمہ ہے۔

(۱۶) نکات نماز

حواشی و تصحیح

مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اکثر کتابوں کو اپنے مفید حواشی اور ضروری تصحیح کے ساتھ مرتب کیا۔ مولانا عبدالاحد مالک مطبع مجتہائی دہلی نے اکثر کتابیں مولانا محمد احسن کے حواشی اور تصحیح کے ساتھ شائع و طبع کیں ہمیں جو کتابیں معلوم ہو سکیں وہ درج ذیل ہیں۔

(۱۷) حجتہ اللہ البالغہ (۱۸) ازالۃ الخفا

(۱۹) شفاء قاضی عیاض

شفاء قاضی عیاض کو ۱۲۸۷ھ ۱۸۷۰ء میں مولانا محمد احسن نے تصحیح کے بعد اپنے مطبع صدیقی بریلی سے شائع کیا۔

(۲۰) کنوز الحقائق

مولانا عبدالاحد، مالک مطبع مجتہائی دہلی کے فرمائش پر مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے کنز الدقائق پر نہایت جامع حاشیہ کنوز الحقائق کے نام سے عربی میں لکھا۔

(۲۱) نفحۃ الیمن

عربی کے مشہور ادیب احمد بن محمد الشروانی الیمنی المتوفی ۱۸۵۶ھ ۱۸۴۰ء کی عربی ادب کی معروف کتاب نفحۃ الیمن ضیمایزول بزکرہ الشجن پر مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی میں حاشیہ لکھا ہے۔

(۲۲) خلاصۃ الحساب

نصاب کی کتاب خلاصۃ الحساب پر مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے حاشیہ لکھا ہے جو مطبع مجتہائی دہلی میں چھپا ہے

(۲۳) قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین سب

فرمائش مولانا عبدالاحد مالک مطبع مجتہائی دہلی مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تصحیح تمام مرتب کی ضروری حواشی لکھے۔

(۲۴) فتاویٰ عزیزی

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کہ فتاویٰ مولانا عبدالاحد کی درخواست پر مولانا محمد احسن نے نہایت محنت سے تصحیح و درست کر کے مرتب کئے۔

(۲۵) جواہر القرآن

اعمال و اوراد کی یہ کتاب امام علی بن نجف علی کی تالیف ہے چند اعمال خواجہ ضیاء الدین صاحب نے اضافہ کئے ہیں یہ کتاب مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عبدالاحد مالک مطبع مجتہائی کی درخواست پر مرتب کی کتاب ہے۔

(۲۶) رسالہ نیچرل فلاسفی

گارسن و تاسی لکھتا ہے کہ محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نیچرل سائنس پر ایک سو بیس صفحے کا ایک مضمون اردو زبان میں لکھا ہے یہ رسالہ مسٹر ٹیلر کی نگرانی میں شائع ہوا ہے (۱)

(۲۷) مجموعہ مثنویات

مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف مثنویوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا (۲)

(۲۸) تنبیہ الریفق علی مغالطۃ ثبوت الحق الحقیق

(۲۹) قلمی بیاض

اگرچہ کوئی تصنیف نہیں ہے مگر مولانا محمد احسن نانوتوی کی تحریری یادداشتوں کا مجموعہ ہے لہذا اس کا ذکر بھی ضروری ہے مولانا کی یہ بیاض منشی عزیز حسن صاحب نانوتوی نبیہ منشی محمد اسماعیل ابن مولانا محمد احسن نانوتوی کے گھرانے میں محفوظ ہے۔

اس میں مولانا محمد احسن کے آمد و خرچ کے اندارج مختلف یادداشتیں، داد و ستد کے

حسابات، طبی نسخے، اقلیدس کی شکلیں، احباب کی فرمائشیں، فتاویٰ کے مسودے نیز دیگر تحریریں بطور اجمال درج ہیں۔

اولاد و احفاد

مولانا محمد احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی بیوی امانت النساء (خواہر متولی نصیر الدین گنگوہی) سے دو لڑکے مولانا فضل الرحمن، منشی محمد اسماعیل اور ایک لڑکی کلثوم تھیں۔

مولانا فضل الرحمن

مولانا فضل الرحمن نے کتب درسیہ کی تحصیل اپنے والد مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ سے کی۔ فضل الرحمن حافظ قرآن تھے۔ قرأت و تجوید سے بھی واقف تھے۔ مولانا فضل الرحمن کی شادی مولانا محمد منیر کی صاحبزادی ام فضل سے ہوئی تھی، مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے بریلی سے آکر جب نانوتہ قیام کیا تو ان کی زیر نگرانی مولانا فضل الرحمن تالیف و ترجمہ کا کام کرتے تھے انہوں نے انیس الواعظین کے کچھ حصہ کا ترجمہ کیا بقیہ مولانا محمد بیگ نے مکمل کیا۔ کلمات طیبات (مکتوبات حضرت مرزا مظہر جانجاناں وغیرہ) کی تصحیح و ترتیب کی یہ دونوں کتابیں مطبع مجتہبائی دہلی میں طبع ہوئی ہیں۔ مولانا فضل الرحمن کے صرف ایک صاحبزادے محمد افضال تھے جن کا عین شباب میں دہلی میں انتقال ہو گیا۔ مولانا فضل الرحمن لا ولد فوت ہو گئے۔

منشی محمد اسماعیل

منشی محمد اسماعیل گرد اور قانون گو تھے ان کی شادی ان کے مامو متولی نصیر الدین کی صاحبزادی صدیقہ بیگم کے ساتھ ہوئی تھی جن سے صرف ایک صاحبزادی نعیمہ خاتون تھیں۔ نعیمہ خاتون نذیر حسن صاحب (ولد نور الحسن گنگوہی) سے منسوب تھیں۔ ان کے دو صاحبزادے منشی عزیز حسن اور منشی خورشید حسن ہیں دونوں بھائی ہمدرد و واخانہ (ناظم آباد کراچی) میں ملازم ہیں۔ منشی محمد اسماعیل کا انتقال ۱۶ صفر ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو ہوا۔

مولانا محمد احسن کی صاحبزادی کلثوم کی شادی تھانہ بھون میں احمد (ولد مولانا مشتاق احمد) سے ہوئی تھی۔ شادی کے تقریباً پانچ چھ ماہ بعد کلثوم بیوہ ہو گئیں۔ مولانا محمد احسن کی دوسری بنارس والی بیوی سے ایک لڑکے محمد ابراہیم اور تین لڑکیاں عصمت، آمنہ اور فاطمہ پیدا ہوئیں۔

مولانا محمد ابراہیم

مولانا محمد ابراہیم نے اپنے والد سے تحصیل علم کی طبیعت موزوں تھی کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ تمام عمر محکمہ تعلیم میں ملازم رہے۔ آخر میں پنشن پائی ان کی شادی مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی پھوپھی زاد بہن امت المنان، بنت مولانا عبداللہ انبیٹھوی (پروفیسر دینیات علی گڑھ کالج) کے ساتھ ہوئی تھی۔ جن سے چار لڑکے محمد اسرائیل، محمد الیاسین، محمد یامین اور محمد سموئیل اور چار لڑکیاں نعیمہ، حسینہ، سیدہ وارطیبہ ہوئیں، محمد الیاسین، محمد یامین اور سیدہ فوت ہو گئے، محمد الیاسین ڈاکٹر تھے باقی اولاد موجود ہے۔ نعیمہ خاتون اور طیبہ کراچی میں ہیں۔ عصمت بی بی کی شادی مولانا شیخ محمد تھانوی کے صاحبزادے مولانا محمود صاحب سے ہوئی تھی ان کے تین صاحبزادے اعلیٰ، افضل مسعود اور ایک صاحبزادی ام فضل تھیں۔ ام فضل کی شادی عبدالغنی منگلوری (ابن محمد اسماعیل منگلوری المتوفی ۱۳۱۰ھ ۱۸۹۲ء) کے ساتھ ہوئی تھی جن کے صاحبزادے عبدالولی صاحب ہیں۔

آمنہ کی پہلی شادی مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہوئی تھی مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ان کا نکاح ثانی گنگوہ کے قدوسی خاندان میں محمد عثمان صاحب گنگوہی سے ہوا۔ ان کے دو صاحبزادے محمد نعمان اور محمد سلیمان اور ایک صاحبزادی زبیدہ ہوئیں۔ محمد نعمان عین جوانی میں گھوڑے سے گر کر فوت ہو گئے۔ خان بہادر محمد سلیمان صاحب بی۔ ایس۔ سی چیف انجینئر آج کل ناظم آباد (کراچی) میں مقیم ہیں۔ محمد سلیمان صاحب کی بہن زبیدہ کی شادی محمد اسرائیل ولد مولانا محمد ابراہیم کے ساتھ ہوئی تھی۔ زبیدہ کا انتقال ہوا گیا۔ فاطمہ کی شادی ایک صاحب نور احمد سے ہوئی تھی جو پولیس میں تھانیدار تھے ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

مولانا محمد مظہر نانوتوی

مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بڑے بھائی تھے ۱۸۲۳ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم و حفظ قرآن اپنے والد لطف علی سے کیا ”دہلی کالج“ دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا مملوک اعلیٰ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا حدیث کی سند حضرت شاہ محمد اسحاق

سے حاصل کی۔ مفتی صدر الدین اور مولانا رشید الدین سے بھی استفادہ علمی فرمایا (۱)۔
 مولانا محمد مظہر رحمۃ اللہ علیہ تحصیل علم کے بعد اجمیری کالج میں ملازم ہو گئے وہاں سے آگرہ کالج
 تبادلہ ہوا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔ جس کا ذکر مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ
 کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ مولانا محمد مظہر کے پیر میں گولی لگی تھی جہاد شامی کے بعد تمام شرکائے
 مصائب (آلام میں مبتلا رہے مولانا محمد مظہر نانوتوی بھی روپوش ہو گئے اس زمانے میں کچھ
 دنوں بریلی بھی رہے جب معافی عام ہوئی تو ظاہر ہوئے ملازمت سرکاری سے قطع تعلق ہو گیا۔ گھر
 پر طلباء کو درس دینا شروع کر دیا۔ مولانا کی شرکت جہاد کا حال، اخفاء پوشیدگی کی نظر ہو گیا (۲)

رجب ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۶ء میں مولانا سعادت علی سہانپوری نے ایک مدرسہ سہارنپور میں
 جاری کیا مولانا سخاوت علی انبیٹھوی، مولانا عنایت علی اور حافظ قمر الدین مدرس مقرر ہوئے۔ تین
 مہینے کے بعد شوال ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء میں مولانا مظہر نانوتوی اس مدرسہ کے شیخ الحدیث اور
 صدر مدرس مقرر ہوئے جب مدرسہ کو ترقی ہوئی تو حافظ فضل حق نے اپنے مکان کو مدرسہ کے
 لئے وقف کر دیا۔ مکان کی عمارت توڑ کر مدرسہ کی عمارت تعمیر کی گئی۔ حافظ فضل حق (ف
 ۱۳۰۳ھ) مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور مولانا مظہر صاحب کے مخلص دوست تھے۔
 مدرسہ تعمیر ہونے کے بعد مدرسہ کا نام مظاہر العلوم تجویز ہوا۔ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری
 بھی اس مدرسہ کے معین مددگار رہے تھے۔ مدرسہ مظاہر العلوم ہندوستان کی مشہور اسلامی
 درسگاہ ہے ان نے مذہب و علوم اسلامی کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ بڑے
 بڑے نامور علماء اس درسگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور برصغیر پاک و ہند میں دین و ملت
 کی خدمات میں مصروف ہیں۔ ۱۲۷۷ھ ۱۸۸۱ء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب
 نانوتوی کے ہمراہ مولانا محمد مظہر نے پہلا حج کیا۔ ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء میں دوسرا حج کیا مولانا محمد مظہر
 کے تعلقات مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے بہت خصوصیت کے تھے (۳)

مولانا محمد مظہر حدیث و فقہ میں بڑا درک رکھتے تھے۔ مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے
 جب مولانا خرم علی بلہوری کے ورثاء سے در مختار کا رد و ترجمہ اشاعت کی غرض سے خرید اتو

(۱) تذکرہ مشائخ دیوبند از عزیز الرحمن صفحہ ۱۶۳ (بجنور ۱۹۵۸ء)

(۲) مفتی عزیز الرحمن مؤلف تذکرہ مشائخ دیوبند (صفحہ ۱۶۲) کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ مولانا محمد مظہر نانوتوی نے کچھ
 دنوں مطبع نول کشور لکھنؤ میں کتابت بھی کی۔

(۳) ملاحظہ ہو مذہب منصور از مولانا منصور العلی خاں مراد آباد (جلد دوم) صفحہ ۱۸۰ (حیدر آباد کن)

اس کتاب کے بقیہ ترجمے اور صحت و درستی میں مولانا محمد مظہر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پورے پورے شریک رہے جیسا کہ مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے (۱) مولانا محمد مظہر نانوتوی نہایت متقی، پرہیزگار منکسر المزاج اور نیک نفس بزرگ تھے ۱۳۰۲ھ ۱۸۵۸ء میں سہارنپور میں لا ولد فوت ہوئے آپ کے تلامذہ میں بڑے بڑے ممتاز علماء مثل مولانا خلیل احمد انبیٹھوی وغیرہ تھے مولانا محمد مظہر نانوتوی کے انتقال پر سرسید احمد خاں بہادر (ف ۱۸۹۸ء) نے ایک شذرہ لکھا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے (۲)

”مولانا محمد مظہر صاحب مرحوم: افسوس ہے کہ مولانا محمد مظہر صاحب نے جو عربی مدرسہ سہارنپور میں مدرس تھے اور ان ہی کی ذات بابرکات سے اس مدرسہ کو عزت اور رونق تھی بروز شنبہ تیسری اکتوبر ۱۸۸۵ء کو انتقال فرمایا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولوی صاحب ممدوح بہت بڑے عالم تھے جس زمانے کے دہلی میں طالب علم تھے اسی زمانے میں ان کی ذہانت مشہور تھی۔ تقوی و ورع میں بھی نہایت اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ بیس برس سے انہوں نے اپنے ہم قوموں کو علوم دینی کی فیض رسانی پر کمر ہمت چست باندھی تھی۔ اور عربی مدرسہ سہارنپور میں پاشکستہ ہو کر بیٹھ گئے تھے آمدنی مدرسہ سے صرف پچیس روپیہ ماہواری بقدر گزر اوقات لیتے تھے اور علوم کی تعلیم میں مصروف تھے بہت لوگ ان سے فیض یاب ہوئے مگر افسوس ہے کہ اجل نے لوگوں کو اس فیض سے محروم کر دیا۔“ (سرسید احمد خاں)

مولانا محمد منیر نانوتوی

مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے ۱۸۳۱ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی پھر دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا مملوک اعلیٰ نانوتوی، مفتی صدر الدین آزرہدہ اور شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادہ علمی کیا۔ مولانا محمد منیر صاحب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک سرگرم کارکن اور مجاہد تھے۔ وہ جنگ شامی میں دوسرے اکابر کیساتھ شریک رہے اور بقول مولانا مناظر احسن

(۱) ملاحظہ ہو غایت الاوطار صفحہ ۶ (مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۹۳ء)

(۲) علی گڑھ میں شذرہ لکھی گئی، مولانا محمد مظہر نانوتوی ۱۸۸۵ء

گیلانی رحمہ اللہ، مولانا محمد منیر حربی سیکریٹری تھے اور خوب داد شجاعت دی جیسا کہ سوانح قاسمی سے اندازہ ہوتا ہے جنگ شامی کے بعد مولانا محمد منیر بھی روپوش ہو گئے۔ معافی عام کے بعد مولانا محمد احسن نانوتوی رحمہ اللہ کے پاس بریلی پہنچے ۱۳ مئی ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج میں ملازم ہو گئے (۱) مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم رہے اور اس کا نظم و نسق زیادہ تک ان ہی سے متعلق رہا۔ بریلی سے پنشن پائی۔ ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء کے بعد بریلی سے تعلق ختم ہو گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بہت گہرے تعلقات اور دونوں بچپن کے ساتھی تھے (۲)

مولانا محمد منیر صاحب قریب دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے ایماندار و دیانت داری میں جواب نہیں رکھتے تھے ایک مرتبہ مولانا محمد منیر نانوتوی دارالعلوم دیوبند کی سالانہ روادا چھپوانے کے لئے ڈھائی سو لے کر دہلی گئے اتفاق سے وہاں روپے چوری ہو گئے۔ مولانا محمد منیر اس حادثہ کی کسی کو اطلاع کئے بغیر نانوتہ آئے اپنی زمین فروخت کر کے روپیہ فراہم کیا اور اس سے روادا چھپوا کر لائے کچھ عرصہ کے بعد جب مجلس ارکان شوری کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ سے اس کے متعلق مسئلہ دریافت کیا مولانا گنگوہی کے پاس سے جواب آیا کہ مہتمم صاحب امین تھے اور روپیہ چونکہ بلا تعدی کے ضائع ہوا اس لئے ان پر تاوان نہیں آسکتا۔ ارکان مجلس نے مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتویٰ دکھا کر مولانا محمد منیر سے درخواست کی کہ اپنا روپیہ واپس لے لیں۔ مولانا محمد منیر نے فرمایا کہ فتوے کی بات نہیں ہے اگر خود مولانا رشید احمد صاحب کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپیہ لے لیتے چنانچہ اصرار کے باوجود روپیہ لینے سے انکار کر دیا (۳) مولانا محمد احسن رحمہ اللہ کے انتقال کے بعد دارالعلوم کی مہتممی سے مستعفی ہو کر ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۴ء میں نانوتہ واپس آ گئے۔ خارج اوقات میں دارالعلوم میں مولانا محمد منیر عربی ادب کی کتابیں طلباء کو پڑھایا کرتے تھے۔

مولانا محمد منیر کی صورت نہایت نوانی تھی۔ قد بڑا چہرہ لمبا، داڑھی گھنی قدرے لمبی تھی بلا ضرورت بات چیت نہیں کرتے تھے۔ اکثر خاموش رہتے ہر موسم میں بڑے پانچوں کپا جامہ پہنتے تھے۔ جب ہر مہینے پنشن لینے سہارنپور جاتے تو اپنے اعزہ کے گھروں پر جا کر دریافت کرتے کہ کچھ منگاتا تو نہیں ہے ان کی فرمائشیں لکھ کر لے جاتے اور خرید کر لاتے محکمہ کے تمام لوگ

(۱) ملاحظہ قاسمی بیاض مولانا محمد احسن نانوتوی (۲) مذہب منصور جلد دوم صفحہ ۱۸۸

(۳) ملاحظہ ہو رواج ثلاثہ صفحہ ۲۳۰-۲۳۱ تاریخ دیوبند از مولانا محبوب رضوی صفحہ ۱۶۳-۱۶۴ (دیوبند ۱۹۵۳ء)

مولانا محمد منیر کا نہایت احترام کرتے تھے۔ مولانا نقشبندیہ سلسلہ میں بیعت تھے۔ آخر میں مطبع مجتہبائی دہلی سے بھی تعلق رہا۔ مولانا محمد منیر نے امام غزالی کی کتاب منہاج العابدین کا اردو ترجمہ سراج السالکین کے نام سے کیا جو مطبع صدیقی بریلی سے ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۴ء میں طبع ہوا، مولانا کی ایک دوسری تصنیف فوائد غریبہ ہے جو مطبع مجتہبائی دہلی میں چھپائی ہے یہ رسالہ تین ابواب پر مشتمل ہے پہلا باب توحید و رسالت سے متعلق ہے دوسرا باب نفس کے بیان میں ہے تیسرا باب قرآن شریف کی تلاوت کے متعلق ہے۔ کتاب نہایت مدلل ہے اس مختصر سے رسالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا منقولات کے علاوہ معقولات میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے افسوس کہ تاریخ انتقال معلوم نہ ہو سکی ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۴ء تک وہ زندہ تھے۔ کیونکہ اس زمانہ کی ایک تحریر ہماری نظر سے گزری۔ ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء میں حج ادا کیا۔

مولانا محمد منیر کے ایک صاحبزادے حافظ محبوب الرحمن اور ایک صاحبزادی ام فضل تھیں ام فضل مولانا محمد احسن نانوتوی رحمہ اللہ کے صاحبزادے مولانا حافظ فضل الرحمن صاحب کو منسوب تھیں حافظ محبوب الرحمن صاحب کے تین صاحبزادے حافظ مقبول الرحمن حافظ مطلوب الرحمن اور عطاء الرحمن ہوئے۔ حافظ مقبول الرحمن کے ایک لڑکے محمد طاہر اور ایک لڑکی طاہرہ خاتون ہیں، محمد طاہر لاہور میں ہیں۔ حافظ مطلوب الرحمن صاحب اولاد ہیں اور نانوتہ میں سکونت پذیر ہیں اور عطاء الرحمن ملیہر (کراچی) میں رہتے ہیں یہ بھی صاحب اولاد ہیں۔

مولانا عبدالاحد، مالک مطبع مجتہبائی دہلی

مولانا عبدالاحد مرحوم (م ۲ دسمبر ۱۹۲۰ء) مالک مطبع مجتہبائی دہلی کا ذکر اس مضمون میں برابر آتا رہا ہے مولانا صاحب مرحوم، مولانا محمد احسن نانوتوی رحمہ اللہ کے ربیب تھے اور وہ ۱۸۵۰ء میں بنارس میں پیدا ہوئے، مولانا عبدالاحد کی تمام تر تعلیم و تربیت مولانا محمد احسن رحمہ اللہ نے کی۔ مولانا محمد احسن رحمہ اللہ، مولانا عبدالاحد رحمہ اللہ کا بہت خیال رکھتے تھے ان کے لئے کپڑے اکٹھے سلوائے جاتے تھے۔ روزانہ جیب خرچ ملتا تھا۔ بیماری کی حالت میں نہایت توجہ اور غور سے علاج کر لیا جاتا تھا۔ رمضان شریف میں مولانا عبدالاحد کے ختم قرآن پر اہتمام کے ساتھ شیرینی تقسیم ہوتی تھی۔ مولانا عبدالاحد چودہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کریم سے فارغ ہوئے مولانا محمد احسن رحمہ اللہ سے درس نظامی کی تکمیل کی اور ۱۸۶۹ء میں بریلی کالج سے

انٹرنس پاس میں بدایوں میں کوچہ عباسیان میں قیام رہا ۱۸۷۵ھ میں الہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان درجہ اولم میں پاس کیا۔ اسی سال انبالہ میں ”رسالہ نمبر ۱۵ بنگال“ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں ملازمت کا سلسلہ منقطع کر دیا اور میرٹھ میں وکالت کرنے لگے (۱)

۱۸۸۶ء میں مولانا عبدالاحد نے منشی ممتاز علی بن شیخ امجد علی سے مطبع مجتہائی دہلی پانچ سو روپے میں (۲) خریدا کیونکہ منشی ممتاز علی حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے۔ مولانا عبدالاحد مرحوم نے مطبع مجتہائی کو بہت ترقی دی اور دراصل یہی مطبع ان کی شہرت و نیک نامی اور دولت و امارت کا سبب بنا پہلے یہ ایک معمولی سا مطبع تھا مولانا صاحب مرحوم نے اس کو بہت ترقی دی اور جلد ہی یہ مطبع برصغیر کے مشہور مطابع میں شمار ہونے لگا اور ایسا شہرت پذیر ہوا کہ آج تک اس کی ساکھ قائم ہے اور لوگ مطبع مجتہائی دہلی کی مطبوعات تلاش کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات کئی گنا قیمت ادا کر کے مطبع مجتہائی کی مطبوعات حاصل کی جاتی ہیں۔

مولانا عبدالاحد مرحوم کا نام مطبع مجتہائی دہلی کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس مطبع عربی، فارسی اور اردو کی ہزار ہا کتابیں طبع و شائع ہوئیں، اس طرح اس مطبع نے علوم اسلامی کی بڑی خدمت انجام دی ہے مولانا عبدالاحد مطبع کا ہر کام خود دیکھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔ مطبع کے ملازمین کا خاص طور سے خیال رکھتے تھے ان کی ضرورت کی اشیاء فوراً فراہم کی جاتیں۔ مطبع مجتہائی میں ایک شخص کالے خال کا تقرر ہوا۔ مولانا عبدالاحد نے اپنے صاحبزادے عبدالعزیز کو تحریری ہدایت کی کہ یہ شخص ضعیف العمر ہے اس سے وزنی چیز نہ اٹھوائی جائے اور نہ دوڑ دھوپ کا کام لیا جائے (۳)

مطبع مجتہائی دہلی میں نہایت مستند علماء تصحیح و تالیف اور حواشی کا کام انجام دیتے تھے، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا فضل الرحمن، (پسر مولانا محمد احسن نانوتوی) مولانا نظام الدین کیرانوی، مولانا خلیل الرحمن برہان پوری، مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد بیگ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ماہر دہلوییت یوسف بخاری لکھتے ہیں (۴)

”مطبع نول کشور لکھنؤ کے بعد اگر کسی مطبع نے لازوال شہرت پائی تو وہ واحد

(۱) یادگار دہلی از سید احمد ولی اللہی صفحہ ۸۲-۸۳

(۲) اس مطبع کا بیعتنامہ حاجی عبدالتمین صاحب کی عنایت سے ہمیں دیکھنے کو ملا۔

(۳) قلمی بیاض مولانا عبدالاحد مرحوم، --- مرحوم حاجی عبدالتمین

(۴) یہ دہلی ہے از سید یوسف بخاری دہلوی صفحہ ۱۰۲ (کراچی ۱۹۶۳ء)

مطبع مجتہبائی دہلی تھا..... انہوں نے اپنے حسن انتظام سے اس مطبع کو ایسی خوبی سے چلایا کہ سینکڑوں مذہبی، تاریخی اور بعض ادبی کتابوں کے درجنوں اڈیشن اور لاکھوں نسخے چھاپ ڈالے، ان دونوں بزرگوں کی تنہا یہ ایک خدمت ہی ایسا عظیم کارنامہ ہے کہ صدیوں ان کا نام زندہ اور باقی رہے گا یہ انہیں بزرگوں کا صدقہ جاریہ ہے کہ آج ہمارے کتب خانے مختلف علوم و فنون کی نایاب کتابوں سے معمور نظر آتے ہیں۔“

مولانا عبد الاحد نہایت نیک نفس، منکسر المزاج، ملنسار اور خلیق تھے، نقشبندیہ سلسلہ سے بیعت تھے حضرت مجدد الف ثانی کے حالات میں مولانا عبد الاحد نے ایک کتاب ”حالات و مقامات مجدد الف ثانی“ مرتب کی جو ۱۳۲۹ء میں مطبع مجتہبائی میں چھپی ہے۔

مولانا عبد الاحد مرحوم اعزہ نانوتہ کی ہمیشہ مدد کرتے تھے قومی کاموں میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ دہلی کے عمائد میں ان کا شمار ہوتا تھا مولانا بشیر الدین احمد (ف ۲۵ اگست ۱۹۲۷ء) مؤلف واقعات دارالحکومت دہلی لکھتے ہیں (۱)

”دلی کے نہایت سربرآوردہ اشخاص میں آپ کا شمار ہے قومی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی ہیں۔ آنریری مجسٹریٹ ہیں اسی سال (۱۹۱۸ء) آپ بوخان بہادر کا خطاب ملا ہے۔ دہلی میں ایسا کوئی قومی جلسہ یا اہم کام نہ ہوگا جس میں آپ سب سے آگے نہ ہوں، دل کھول کر قومی کاموں میں جان و مال سے شرکت کرتے ہیں، جامع مسجد، مسجد فتح پوری، عربک اسکول، یتیم خانہ وغیرہ کی ممبر ہیں“

مولانا عبد الاحد کی دو شادیاں ہوئیں، پہلی بیوی سکیہ دیوبند کی تھیں ان سے سات لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں، لڑکوں میں عبد اللطیف، عبد العظیم، عبد الحمید، عبد المجید، عبد الحفیظ، عبد المتین اور عبد الوحید اور لڑکیوں میں نام رابعہ بیگم اور خدیجہ بیگم (امت العزیز) کے نام آتے ہیں۔ مولانا عبد الاحد کی دوسری شادی مسماۃ بنت مولانا شیخ محمد تھانوی سے ہوئی ان سے دو لڑکے عبد الرحیم اور عبد العزیز اور پانچ لڑکیاں محمودہ، صغریٰ، امت الرحمن، حمیدہ خاتون اور رشیدہ خاتون ہوئیں۔

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی از بشیر الدین احمد جلد دوم صفحہ ۱۹۱ (شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء)

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

فہرست

۵۶۶	ولادت، سلسلہ نسب
۵۶۷	والدین
۵۶۸	والدہ ماجدہ، حضرت مولانا کا بچپن
۵۶۹	تصویر سے نفرت، خدا اور رسول پر پختہ یقین
۵۷۰	بچپن ہی میں عبرت و نصیحت آموزی
۵۷۰	بچپن میں قناعت و استقلال
۵۷۱	راستبازی و غیرت مندی
۵۷۱	نماز کا شوق اور غیبی حفاظت
۵۷۳	تعلیم و ذہانت، ورودِ ہلی
۵۷۴	ذہانت و ذکاوت، اساتذہ کرام
۵۷۵	تعلیمی مدت
۵۷۶	ایام طالب علمی
۵۷۷	پہلے شاگرد دارالعلوم کے پہلے مدرس، نکاح
۵۷۸	حفظ قرآن، سلوک و تحصیل معرفت
۵۷۹	حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے دربارِ دُربار میں
۵۸۰	حاجی صاحب کی کرامت، تیسری ملاقات
۵۸۱	چوتھی ملاقات، تھانہ بھون حاضری اور بیعت
۵۸۵	چالیس دن میں خلافت
۵۸۷	گنگوہ واپسی
۵۸۸	شیخ کی گنگوہ آمد، معاش
۵۸۹	ربن زمینوں کی واپسی

۵۹۱

قدوسی حجرہ میں خلوت نشینی

۵۹۳

طب

۵۹۵

تحریک آزادی اور حضرت گنگوہی، شیخ کی محبت

۵۹۶

رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا

۵۹۶

ایک اشکال اور اس کا حل

۵۹۷

اعلیٰ حضرت وعدہ خلاف نہ تھے

۵۹۷

گرفتاری اور زنداں

۵۹۹

ثابت قدمی اور رہائی

۶۰۰

رہائی کے بعد خفیہ نگرانی

۶۰۱

درس و تدریس، طریقہ تدریس

۶۰۳

کسر نفسی اور تواضع

۶۰۳

طلبہ کے جوتے اٹھائے

۶۰۴

طلبہ پیارے پیغمبر کے مہمان ہیں

۶۰۴

طلبہ کے عقائد و اعمال کی نگرانی

۶۰۵

فراست ایمانی، ہدایہ کی تعلیم

۶۰۶

سہ دری کا قصہ

۶۰۷

پہلاج

۶۰۸

رویائے صالحہ

۶۰۹

دوسرا حج

۶۱۰

حضرت نانوتوی کی وفات، تیسرا حج

۶۱۱

مدارس کی سرپرستی

۶۱۱

دارالعلوم کا جلسہ دستار بندی

۶۱۳

جامع الصفات

۶۱۶

شیخ کا امتحان

۶۱۷

مجھے اس کی تمنا نہیں

- ۶۱۷ بدعت اور ضلالت سے نفرت
 ۶۱۸ اس میں تیسرے تم تھے
 ۶۱۹ عمل پر مداومت اور استقامت
 ۶۱۹ بائیس برس کے بعد تکبیر اولیٰ فوت
 ۶۲۰ شب بیداری و تہجد گزاری
 ۶۲۰ او مردود تو اللہ ہے؟
 ۶۲۰ گنگوہ بھی دیکھتا چلوں
 ۶۲۱ جانب اولیٰ کو بھی ترک نہ فرماتے
 ۶۲۱ بدعات کو دیکھ کر آنسو بھراتے
 ۶۲۲ مجھے تحقیق نہیں
 ۶۲۲ حوادث اور صدمات پر صبر
 ۶۲۳ جوابات میں جلدی، دلجوئی اور تسلی
 ۶۲۳ حریم اور اس کے متعلقات سے محبت
 ۶۲۴ جناب آداب
 ۶۲۵ منطق و فلسفہ سے نفرت
 ۶۲۵ بیٹے کو گھر سے نکال دیا
 ۶۲۶ حسن صورت، حلیہ مبارک
 ۶۲۷ لطافت طبع اور ادراک حواس
 ۶۲۸ سواد تحریر
 ۶۲۹ تقریر تحریر کے مثل تھی
 ۶۲۹ روزانہ کے معمولات
 ۶۳۰ لباس غذا وغیرہ
 ۶۳۱ نماز سے شغف
 ۶۳۱ خدا کے وعدوں پر یقین
 ۶۳۲ عوام کے لئے سہولت

۶۳۳	نظر کی تیزی
۶۳۳	ذکر پر ترغیب و ترہیب
۶۳۶	بیعت و ارشاد
۶۳۷	تصوف کے سلاسل اربعہ
۶۳۹	حضرت گنگوہیؒ ایک مرشد کامل
۶۴۰	صدق و طلب کا امتحان
۶۴۳	بیعت کا طریقہ
۶۴۴	قبول ہدیہ
۶۴۵	متوسلین و ممتاز خلفاء
۶۴۷	حسی کرامات
۶۴۷	ہاتھ جھٹک دیئے
۶۴۸	ابھی چائے موجود تھی
۶۴۹	آفتاب کے منہ پر سے ابرہل گیا
۶۴۹	جا جا پہاڑ پر چڑھ جا، تم گنگوہی جاؤ
۶۵۰	دو رکعت پڑھو
۶۵۰	ورنہ گمراہی کا احتمال ہے
۶۵۱	اچھا جلدی کیا ہے
۶۵۱	شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کے حکم سے بیعت
۶۵۲	خواب میں مرشد کی اطلاع
۶۵۲	وصال
۶۵۳	تاریخ ہائے وفات
۶۵۳	تصنیفات و تالیفات

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی

مولانا عبد الرشید ارشد

شاد باش اے خستہ ہجرانِ بلا
تازہ باش اے تشنہ وادی غم
در دل افسردہ روحے میدد
دور شوائے ظلمتِ شام فراق
شوق کن اے بلبَلِ گلزارِ عشق
بہر رُشد خلق می آید رشید

کز پئے درد تو درماں میرسد
کز برایت آبِ حیاں میرسد
مردہ تن را مژدہ جاں میرسد
کافقاب وصلِ تاباں میرسد
کاں گل نواز گلستاں میرسد
قطبِ عالم بحرِ عرفاں میرسد

(از تذکرۃ الرشید ص ۱۳)

ولادت

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ۶/ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۹ء بروز سوموار چاشت کے وقت اس دنیائے آب و گل میں تشریف لائے۔ گویا سوموار کی ولادت میں غیر اختیاری سنت نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شرف حاصل کیا۔ آپ کی پیدائش مشہور تاریخی مقام گنگوہ میں حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک سے مشرقی جانب تقریباً تیس قدم دور اپنے جدی مکان میں ہوئی۔

سلسلہ نسب

آپ والد ماجد اور والدہ ماجدہ دونوں کی جانب سے شریف النسب اور نجیب الطرفین شیخ زادہ انصاری اور ایوبی النسل تھے، اور آپ کا نسبی سلسلہ جدہ کی جانب سے گیارہویں پشت پر قطب العالم شیخ المشائخ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے جاملتا ہے اور روحانی

سلسلہ بھی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا حضرت شیخ موصوف رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، گویا آپ نسبی اور روحانی دونوں طور پر گنگوہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین ہوئے کہ آپ کی ذات گرامی قدر سے گنگوہ کا نام دوبارہ چار دانگ عالم میں پھیلا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گنگوہ کی گذشتہ عظمت و شہرت کو چار چاند لگا دیئے، حضرت مولانا عاشق الہی میرٹھی تذکرۃ الرشید میں رقم فرماتے ہیں۔

شیخ عبد القدوس رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۳ جمادی الآخر ۱۲۵۵ھ کو اس عالم جسمانی سے انقطاع فرمایا اور تیسری صدی کا آخری سال ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اس خاندان ایوبی کا نام باقی رکھنے والے اور قدوسی مسند کی عزت سنبھالنے والے نو نہال نے اپنے وجود مسعود سے خانہ عالم معمور اور وہی قصبہ گنگوہ آباد کیا جس میں قدوسی خانقاہ اپنے شیخ کے سچے جانشین کی تلاش میں تین سو برس سے پریشان حال و ویران پڑی ہوئی تھی، یعنی تیسری صدی کے پورے اختتام پر شیخ عبد القدوس کے وصال کمال اور مہینہ اور دن یعنی ۲۳ جمادی الآخر ۱۲۵۵ھ کا روز جب آیا ہے تو ہمارے حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ پورے سات ماہ اور سات دن کی عمر پا چکے تھے فالحمد للہ علی احسانہ۔ (تذکرۃ الرشید ص ۱۵)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دادھیال دراصل قصبہ رام پور ضلع سہارنپور میں تھی، مگر حضرت کے داد قاضی پیر بخش صاحب مرحوم نے گنگوہ کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ اس لئے آئندہ نسل کا انتساب گنگوہ کی جانب ہوا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح جانشین نسبی، روحانی اور وطنی طور پر ان کا جانشین ہو۔

والدین

حضرت مولانا کے والد ماجد ہدایت احمد صاحب گنگوہی میں پیدا ہوئے۔ یہیں تربیت ہوئی اور پھر یہیں انصاری خاندان میں مولانا محمد تقی صاحب کی ہمشیرہ سے شادی ہوئی۔ مولانا محمد تقی صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی محمد شفیع صاحب ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں شہید ہوئے (۱) مولانا محمد تقی صاحب حضرت گنگوہی کے خسر بھی ہیں اور ماموں بھی کیونکہ ان کی صاحبزادی خدیجہ حضرت مولانا کے عقد میں آئیں (۲)، حکیم مولانا مولوی مسعود احمد گنگوہی اور مولانا مولوی محمود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (صاحبزادگان حضرت گنگوہی) اسی عفت مآب خاتون سے پیدا ہوئے۔

حضرت مولانا کے والد ماجد اپنے زمانہ میں مقدس عالم اور بڑے دینی مقتدا تھے۔ آپ نے تعلیم شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے خاندان کے علماء سے حاصل کی، اور روحانی تربیت حضرت مولانا شاہ غلام علی مجددی دہلوی (۱) سے۔ حضرت شاہ صاحب کی توجہ کامل سے مولانا ہدایت احمد مرحوم سلوک و تصوف سے بھی خاصا حصہ پائے ہوئے تھے۔ نہایت خوشنویس اور زود نویس تھے۔ عملیات اور تعویذ گنڈے بھی کیا کرتے تھے اور بروایت مولانا حبیب الرحمن عثمانی رحمہ اللہ اپنے مرشد سے مجاز بھی تھے (۲) اللہ تعالیٰ نے انہیں ۳۵ سال کی عمر میں ۱۲۵۲ھ میں اس جہاں سے اٹھالیا جبکہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی عمر صرف سات سال کی تھی اور حضرت مولانا صرف والدہ ماجدہ ہی کی تربیت میں رہ گئے اور سرپرستی جدا مجد قاضی پیر بخش صاحب نے کی۔

والدہ ماجدہ

حضرت کی والدہ ماجدہ نہایت پارسا اور عابدہ زاہدہ تھیں۔ باوجودیکہ عورت ذات تھیں اور ان کے شوہر تعویذ گنڈے بھی کیا کرتے تھے مگر یہ ٹونے ٹونکوں سے طبعاً متنفر اور خائف تھیں۔ حضرت مولانا رحمہ اللہ اپنی والدہ ماجدہ سے سنا ہوا ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ میری والدہ ماجدہ بیان فرمایا کرتی تھیں کہ :-

رشید احمد جب تو بچہ تھا مجھ کو اللہ بخش جن نظر آیا تھا میں نے دیکھا کہ وہ تیری چارپائی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے کہا کہ تو فلاں مزار پر عطر کے پھوئے چڑھاؤ ورنہ میں تیرے لڑکے کو مار ڈالوں گا۔ والدہ فرماتی تھیں کہ میں نے اس سے کہا کہ اچھا مار ڈال تیرے سامنے لیٹا تو ہے والدہ فرماتی تھیں کہ جب کبھی اللہ بخش نظر آتا اور یہ دھمکیاں دیتا اور ڈراوے دکھاتا تھا میں تو اس کو یہی جواب دیتی تھی کہ میں تو ہرگز بھی نہ چڑھاؤں گی اگر تجھ سے مارا جائے تو مار ڈال، اس کو رے اور صاف جواب پر بھی تیرا بال بیکانہ کر سکا اور مارنا تو مارنا تجھے ڈرا بھی نہ سکا۔ (۳)

حضرت مولانا کا بچپن

جن لوگوں کو آگے چل کر بڑا آدمی بننا اور لوگوں کی اصلاح و فلاح میں اپنی زندگی بسر

(۱) تذکرۃ الرشید ص ۱۷ (۲) مولانا شاہ غلام علی مجددی دہلوی پیدائش ۱۱۵۶ھ مطابق ۱۷۴۳ء وفات ۱۲۲۲ھ

۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء مارف کامل اور جامع علوم ظاہر و باطن تھے۔ (۳) تذکرۃ الرشید ص ۲۳

کرنا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ انہیں شروع ہی سے بیکار باتوں، لایعنی حرکتوں اور فضول کھیل کود سے دور بلکہ متنفر رکھتا ہے۔ اور جن لوگوں کو تجدید احیائے دین کا کام سرانجام دینا ہوتا ہے وہ بچپن ہی سے اپنی فطرت میں متبع سنت و شریعت ہوتے ہیں، یہ نہیں کہ بڑے ہو کر محض لوگوں کے دکھاوے کیلئے یا طعن و تشنیع سے بچنے کیلئے شرعی شکل و صورت بنالی تاکہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں۔

لَمْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (القرآن) کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں

یہ لوگ اگرچہ تعلیم و تدریس حاصل کرتے ہیں لیکن وہی طور پر سلیم الفطرت ہوتے ہیں کہ اگر ان کی تعلیم و تربیت نہ بھی ہوتی تو اپنی سلامتی طبع سے بہر حال صراطِ مستقیم پر چلتے چاہے شیخ و مرشد نہ ہوتے، حضرت مولانا گنگوہی بچپن ہی سے ۷

بالائے سرش زہوشمندی می تافت ستارہ بلندی

چنانچہ اس سلسلہ میں انکے بچپن کی بیسیوں حکایات میں سے دو چار پیش کی جاتی ہیں

تصویر سے نفرت

حضرت مولانا قدس سرہ چونکہ بچپن ہی سے بالطبع سلیم القلب اور شیدائی سنت تھے۔ اس لئے کبھی آپ نے اپنے مکان میں کوئی تصویر نہیں رہنے دی۔ حضرت ﷺ سے ساڑھے چار برس چھوٹی آپ کی صرف باپ شامل علاقہ بہن بچپن میں گڑیاں کھیلتی تھیں، حضرت قدس سرہ جس وقت باہر سے تشریف لاتے تو گڑیوں کو توڑ مروڑ کر پھینک دیا کرتے تھے (۱)

خدا اور رسول پر پختہ یقین

ایک مرتبہ اثنائے وعظ میں فرمایا:-

”میں اپنے آپ کو کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے طفولیت ہی میں مجھے وہ یقین عطا فرمایا تھا کہ لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتا اور جمعہ کا وقت آجاتا تو کھیل چھوڑ کر چلا آتا اور لڑکوں سے کہہ دیتا تھا کہ ہم نے اپنے ماموں صاحب سے سنا ہے کہ تین جمعہ کا چھوڑنے والا (جہاں جمعہ فرض ہو) منافق لکھا جاتا ہے، لوگوں کو کہتا ہوں آخر مسلمان ہیں خدا اور رسول پر تو یقین ہو گا ہی پھر ایسے غافل کیوں ہیں“ (۲)

اندازہ کیجئے کہ جس فرمان رسول اللہ ﷺ پر لوگ بڑے ہو کر عمل نہیں کرتے حضرت مولانا بچپن میں اس کا کتنا خیال کرتے اور کیسا پختہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ آدمی منافق ہو جائے گا جو مسلسل تین جمعے چھوڑ دے گا۔ اور بچوں کے ساتھ کھیلنے وغیرہ میں اکثر ایسا ہوتا کہ اکثر ان کے ساتھ شریک نہ ہوتے بلکہ۔

”ایک طرف بیٹھ جاتے اور یوں کہہ دیا کرتے تھے کہ بھئی تم سب کھیلو۔ میں تمہارے کپڑوں کی حفاظت کروں گا“ (۱)

بچپن ہی میں عبرت و نصیحت آموزی

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ آپ کی عمر چار یا پانچ سال کی تھی کہ والدہ ماجدہ نے آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی عنایت احمد کو دودھ بانٹ دیا، آپ بتقاضائے عمر ضد کرنے لگے کہ مجھے دودھ کم دیا ہے۔ بڑے بھائی نے دونوں جگہ کا دودھ پی لیا۔ مولانا کو زیادہ تو کیا ملتا اپنا حصہ بھی گیا، بس اسی عمر میں یہ سبق حاصل کر لیا کہ بے جاد کرنا یا ہٹ کرنا اپنا نقصان اور حق کا ضائع کرنا ہے چنانچہ اسکے بعد پھر کبھی ضد نہیں کی۔ فرمایا کرتے کہ ”مجھے دودھ کے قصہ سے یہ تجربہ حاصل ہو چکا ہے کہ ضد کرنے کا نتیجہ اپنے اصل حصہ سے محروم ہو جانا ہے۔“

ایک تمغائے جو انمردی ہے ناسخ ترکِ حرص
عمر بھر میں ہے دم آب اکتفا تلوار کو

بچپن میں قناعت و استقلال

جس عظیم ہستی نے لوگوں کو قناعت و استقلال اور صبر و شکر کی تلقین کرنا تھی اور لوگوں کے دلوں سے حرص و طمع اور غرض و جاہ اور دنیا کی محبت کو نکال کر ان میں خدا اور رسول کی محبت پیدا کرنا تھی ضروری تھا کہ وہ خود اس پر بچپن ہی سے عامل ہو، صبر و قناعت اور استقامت کا یہ جوہر بچپن میں کس قدر تھا اس کی مثال تذکرۃ الرشید سے پڑھے:-

”ایام طفولیت میں حضرت مولانا رحمہ اللہ بخار میں مبتلا ہوئے اور مرض کو اس قدر امتداد ہوا کہ کامل چار سال تک بخار نے پیچھا نہ چھوڑا، ایام مرض اور اثنائے معالجہ میں طبیب نے

صرف مونگ کو غذا بنادیا اور تمام اشیاء سے پرہیز کرارکھاتھا، چنانچہ حضرت نے اس طویل مدت تک مونگ ہی پر اکتفا فرمایا۔ اور متواتر چار سال تک مونگ کی دال اور مونگ کی روٹی یا مونگ کی کھجڑی تناول فرمائی، نہ کبھی اکتائے نہ گھبرائے، نہ شکایت کی نہ روئی صورت بنائی، نہ دوسری چیز کی خواہش کی اور نہ اس ایک قسم کے کھانے سے جی پر میل لائے۔ “ ایک طعام پر گذران جوان اور پختہ عمر کے لوگوں کو چاہے وہ کتنا لذیذ ہی کیوں نہ ہو کس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ ہر ایک کر سکتا ہے مگر یہاں ایک بچے کے صبر اور حوصلہ کو دیکھئے کہ کس طرح چار سال ایک کھانے پر اکتفا کیا ہے۔

راستبازی و غیرت مندی

آپ چھ یا سات سال کے تھے کہ آپ کے چچا زاد بھائی عبداللہ اور محمد حسن کھیلتے اور باتیں کرتے پانچ چھ میل دور انبیٹھ (ایک مقام) لے گئے، چچا زاد بھائیوں کی ہمراہی اور طفولیت نے یہ سفر تو معلوم نہ ہونے دیا لیکن جب وہاں پہنچے تو خیال آیا کہ بھائی تو اپنی خالہ کے پاس جا ٹھہریں گے مگر اے طفلی تو کہاں جائے گا (حالانکہ ان کی خالہ ان کی بھی خالہ تھی مگر دور کی) اور کس غیرت کے تقاضا سے کھانا کھائے گا اور رات ٹھہرے گا۔ اس خیال سے آپ اس قدر پریشان اور نامدم ہوئے کہ پسینہ میں نہا گئے۔ خیر رات گزری جس طرح گزری، اگلے دن واپسی پر جب والدہ نے غیر حاضری اور گمشدگی کی وجہ پوچھی تو سب کچھ صحیح بتادیا کہ میں تو جانتا تھا بھائی عبداللہ ضد کر کے لے گئے اور مجھے دوسرے گھر روٹی کھلائی، بلا تعلق مجھے اجنبی جگہ روٹی کھاتے جیسی شرم آئی ہے میرا ہی دل خوب جانتا ہے، میں نے روٹی کیا کھائی روٹی نے مجھے کھایا۔

نماز کا شوق اور غیبی حفاظت

ساڑھے چھ سال کی عمر تھی کہ آپ سے ایک ایسی کرامت حسیہ اور استقلال و توکل کا ظہور ہوا کہ جس سے آپ کے مقبول بارگاہ خدواندی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ آپ بچپن ہی میں نماز کے پابند تھے جمعہ کا قصہ تو گزر ہی چکا۔ عام نمازوں کے اوقات کا بھی خیال رکھتے ایک دن شام کو ٹہلتے ٹہلتے قصبہ سے باہر نکل گئے وہاں غروب آفتاب ہو گیا تو

احساس ہوا کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا، عباس کے پھولوں کی دو چھڑیاں ہاتھ میں لئے سرعت پلٹے پہلے گھر آئے اور والدہ کو چھڑیاں پکڑائیں کہ یہ رکھو میں نماز پڑھنے جاتا ہوں جھپٹتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے تو جماعت کھڑی تھی، وضو کیلئے لوٹوں کی طرف بڑھے تو خالی تھے دیر میں دیر اور ہوئی، گھبرا کر پانی کھینچنے کیلئے کنویں میں ڈول ڈالا۔ ڈول وزنی تھا گھبراہٹ میں رسی پاؤں میں الجھ گئی تھی ہاتھ پاؤں جماعت فوت ہونے کے خدشہ سے پھولے ہوئے تھے ذرا سا جھٹکا لگا اور دھڑم سے کنویں میں گر گئے، نمازیوں کو نماز میں احساس ہوا کہ کوئی کنویں میں گر گیا امام صاحب نے جلدی نماز پوری کرائی اور تمام نمازی جلد کنویں کی طرف لپکے اب ہر ایک کنویں میں جھانکنے لگا اندر سے آواز آتی ہے..... ”گھبراؤ نہیں میں آرام سے بیٹھا ہوں“..... قدرت حق تعالیٰ یہ ہوئی کہ ڈول الٹا پانی میں گرا آپ جب گرے تو جو اس مجتمع کر کے فوراً اس پر بیٹھ گئے، جب آپ کو باہر نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ پاؤں کی چھوٹی انگلی میں خفیف سی خراش آئی ہے اور بس، اب اس قصہ سے استقامت و استقلال اور مصیبت سے نہ گھبرانا اطمینان سے نماز کے ختم ہونے تک بیٹھے رہنا، کشائش و فرج من اللہ کا انتظار، دوسروں کو اطمینان دلانا، خدا پر توکل و اعتماد اور مقدمات نماز میں تکلیف کا ایسا تحمل کہ کلمہ شکایت زبان پر نہ آئے، یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ابتدا ہی سے آپ اللہ کی حفاظت و رہنمائی میں فطرت کی راہوں پر چلتے ہوئے عمدہ خصائل و عادات کے حامل تھے غرضیکہ بقول صاحب تذکرۃ الرشید:

حق تعالیٰ شانہ نے علمائے زمانہ کے مقتدا بننے والے امام کو ابتدا ہی سے عادات حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کے ساتھ سنوارا اور آراستہ فرمایا تھا۔ بچپن ہی میں ایک خدا ترس، رحمدل، عابد، خوش خلق، متین و سنجیدہ، غیور و باحیا، صابر و مستقل مزاج، حلیم و بردبار، مہذب و باادب اور نہایت درجہ سلیم الطبع ثابت ہو چکے تھے آپ کو ضد اور اصرار، ہٹ دھرمی و شرارت، چھچھوراپن اور بے تہذیب و غیر تربیت یافتہ بچوں کی عادتوں سے طبعاً نفرت تھی، آپ کا چھ سات سال تک ناز پروردگی اور لاڈ پیار کا زمانہ اور آٹھویں سال یتیمی یعنی سرپرست و مربی کا سایہ سر سے اٹھ جانا جن عادات کو مقتضی ہے ان بد خصلتوں کا آپ میں نام بھی نہ تھا۔

تعلیم و ذہانت

آپ کے قرآن پاک ناظرہ پڑھنے کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ کہاں سے پڑھا غالباً گھر ہی میں والدہ ماجدہ سے یا والد ماجد سے پڑھ لیا ہو گا آپ کے سوانح میں آپ کے پہلے استاد کا اسم گرامی میاں جی قطب بخش صاحب مرحوم ہے، آپ نے ان سے چند دن بعد ہی اپنی ذہانت و ذکاوت کا اعتراف کر لیا۔ میاں جی مرحوم حضرت کے ننھیال کی طرف سے رشتہ دار بھی تھے لہذا غایت شفقت کے ساتھ ساتھ استادانہ سختی و ڈانٹ ڈپٹ بھی رکھتے تھے، ان کے بعد فارسی آپ نے کرناٹل میں اپنے منجھلے ماموں مولوی محمد تقی مرحوم سے پڑھی جو فارسی کے مسلم الثبوت استاذ تھے، اسی طرح فارسی کا کچھ حصہ مولوی محمد غوث مرحوم سے پڑھا، فارسی پڑھنے کے بعد عربی کا شوق ہوا اور آپ نے ابتدائی صرف و نحو کی کتابیں جناب مولوی محمد بخش صاحب رامپوری سے پڑھیں۔ رامپور حضرت کی دادھیال اور آپ کے دادا قاضی پیر بخش کا اصل مسکن تھا لہذا آپ کی روحانی تربیت کا سلسلہ بھی ادھر منتقل ہوا، مولوی محمد بخش موصوف آپ کے نہایت شفیق استاد تھے آپ کو حزب البحر اور دلائل الخیرات کی اجازت اپنے استاد مولوی محمد بخش صاحب ہی سے ملی۔ مولوی صاحب نے ابتدائی کتب پڑھانے کے بعد مشورہ دیا کہ آپ تکمیل تعلیم کیلئے دہلی چلے جائیں۔ وہاں بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ موجود ہیں یہ قصہ ۱۲۶۱ھ کا ہے جب کہ آپ ہدایت النخو پڑھتے تھے چنانچہ آپ نے استاد کے صائب مشورہ پر دہلی کا سفر کیا۔

ورودِ دہلی

ان دنوں دہلی میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب، مولانا شاہ احمد سعید صاحب رحمہما اور حضرت مولانا مملوک علی صاحب (۱) کی بہت شہرت تھی آخر الذکر عربک اسکول میں صدر

(۱) مولانا مملوک علی رحمہما آپ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر مدرس اول دارالعلوم دیوبند کے والد ماجد تھے آپ نے درسیات کا اکثر حصہ بلکہ یوں کہیے کہ جملہ علوم و فنون جناب مولانا رشید الدین خاں سے پڑھے جو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد ارشد الاستاذ ہیں۔ مولانا کریم الدین اپنی کتاب ”طبقات الشعراء دیوبند“ میں لکھتے ہیں:-

”بندے کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہو گا۔ اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہا جائے تو بجائے، کوئی کتاب کسی فن کی مشکل سے مشکل ان کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھائیں گے گویا ان کو حفظ ہے۔“ الخ

حضرت نانوتوی رحمہما، مولانا محمد قاسم رحمہما، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہما، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہما، اور سر سید احمد خاں مرحوم جیسے مشاہیر نے اکثر درسی کتابیں حضرت مولانا مملوک علی بی سے پڑھی ہیں۔ ۱۲۶۷ھ میں وفات پائی۔

مدرس تھے اپنی علمی قابلیت اور فکری صلاحیتوں کی وجہ سے آفاقی شہرت کے مالک مولانا مملوک علی نانوتہ کے رہنے والے تھے، ۱۲۶۰ھ کو ایام تعطیل گزارنے گھر گئے تو واپسی پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو تعلیم کیلئے اپنے ساتھ لے آئے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۶۱ھ کو دہلی پہنچے ادھر ادھر پھر پھرا کر درسگاہوں کو جانچتے رہے لیکن کہیں تسلی نہ ہوئی، ایک دن مولانا مملوک علی کے ہاں پہنچے تو آتے ہی دل لگ گیا اور فیصلہ کر لیا کہ یہیں پڑھوں گا، اللہ کو منظور تھا کہ اپنے زمانہ کے شمس و قمر ایک جگہ تعلیم حاصل کر کے برصغیر میں اشاعت کتاب و سنت کی ایسی تحریک چلائیں کہ قیامت تک اس کا سلسلہ چلتا رہے، چنانچہ محمد قاسم کو نانوتہ سے رشید احمد کو گنگوہ سے لا کر ایک استاد کے دامن سے باندھ دیا، جس طرح ذہین شاگرد کو لائق استاد کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح قابل استاد کو ذہین شاگردوں کی۔ اپنے دور کے دو سب سے ذہین لڑکے مولانا مملوک علی جیسے نادرہ روزگار استاد کو مل گئے اور انہوں نے ان کو ایسی تعلیم دی کہ ان کی وجہ سے پورا ہندوستان علم دین سے جگمگا اٹھا۔

ذہانت و ذکاوت

دونوں ساتھی مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی میرزا ہد، قاضی، صدر، شمس بازغہ ایسے پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے، کبھی کہیں کوئی لفظ پوچھنا ہوتا تو پوچھ لیتے ورنہ ترجمہ تک نہ کرتے فر فر پڑھتے جاتے۔ دوسرے شاگردوں کو خیال ہوتا کہ یو بھی عبارت پڑھے جاتے ہیں سمجھتے کچھ نہیں، کتابوں کے ختم کر لینے کا نام چاہتے ہیں چنانچہ ایک دفعہ استاد سے شکایت کی، استاد نے فرمایا کہ ”میرے سامنے طالب علم بے سمجھے نہیں چل سکتا۔“

اساتذہ کرام

مولانا مملوک علی کے علاوہ آپ نے بعض علوم عقلیہ مولانا مفتی صدر الدین (۱) سے بھی پڑھے اور حدیث قدوة العلماء حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی (۲) سے پڑھی۔

(۱) مولانا مفتی صدر الدین صاحب :-

آپ کی اصل کشمیر سے ہے۔ پیدائش ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۸۸۹ء مقام دہلی۔ تلمیذ مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، مولانا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ و مولانا شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ انگریز کی جانب سے دہلی کے صدر الصدور اور مفتی تھے، ۱۸۵۷ء میں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

نانو تو ی و گنگوہی دونوں شاگرد یہاں بھی (یعنی حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمہ اللہ کے پاس) اپنی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے استاد کی خصوصی عنایات کے مستحق ٹھہرے۔

مریدوں میں حضرت شاہ صاحب کی توجہ کا مرکز زیادہ تر حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی مہتمم مدرسہ عالیہ دیوبند تھے، حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ نے حضرت شاہ احمد سعید صاحب قدس سرہ سے بھی تلمذ کا شرف حاصل کیا تھا، خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے معقولات کی اکثر کتب اور تفسیر، اصول فقہ و معانی وغیرہ کی اکثر کتابیں مولانا مملوک علی سے اور صحاح ستہ کی کئی کتابیں حرفاً حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمہ اللہ سے پڑھیں۔ تھوڑا بہت تلمذ جو دوسرے اساتذہ سے رہا ان میں مفتی صدر الدین صاحب مولانا شاہ احمد سعید صاحب اور قاضی احمد دین صاحب پنجابی ہیں رحمہم اللہ اجمعین۔

تعلیمی مدت

آپ کی دہلی میں تعلیمی مدت تقریباً چار سال بنتی ہے اس مدت کو ملاحظہ کیجئے اور پھر

(صفحہ گذشتہ کا) ”فتویٰ جہاد“ کے الزام میں جائداد ضبط ہو گئی، چند ماہ کی نظر بندی اور تحقیق کے بعد رہائی ہوئی اور کچھ جائداد واپس مل گئی، اردو، فارسی، عربی کے اشعار لکھتے اور آزر دہ تخلص کرتے تھے ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء بروز پنج شنبہ وفات پائی ”چراغ دو جہاں بود“ سے تاریخ نکلتی ہے نواب یوسف علی والی رامپور، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی اور سر سید احمد خاں وغیرہ ان کے شاگردوں میں سے ہیں (قاموس المشاہیر ج ۲ ص ۳۷)

(۲) شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی رحمہ اللہ۔ آپ علم ظاہری و باطنی میں شہرہ آفاق۔ علماء صلحاء میں زبدہ و خلاصہ و فقیہ اور معروف محدث تھے، ابن ماجہ، کاشیہ بنام ”انجام الحاجت“ آپ ہی کا ہے۔ اپنے وصال سے چند سال قبل ۱۸۵۷ء کے قصہ میں مدینہ منورہ ہجرت کر گئے تھے، اکثر حرم اطہر میں مستغرق و مراقب رہتے، ادب سے خائف و ترساں، روضہ اطہر سے کچھ دور بیٹھتے۔ اور زائرین کے شور و غل پر کانپ اٹھتے اور نہایت آہستہ آہستہ فرماتے..... ”صاحبو شور نہ کرو دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں“..... آپ وہاں حدیث کا درس بھی دیتے تھے، حجازی اور اطراف عالم کے علماء آپ کے علمی پایہ اور فن حدیث کے تبحر اور علوم مرتبت کے قائل و معترف تھے۔ جو ار رسول میں بتاریخ چھ محرم الحرام ۱۲۹۵ھ ہجر ساٹھ سال انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں قبہ عثمانی کے متصل مدفون ہوئے۔ شاہ عبدالغنی کے دادا شاہ صفی القدر اپنے جد امجد کے مزار سرہند سے ہجرت فرما کر (سکھوں کے غلبہ میں) مع اہل و عیال مصطفیٰ آباد ریاست رامپور میں قیام گزیرے ہو گئے تھے یہیں شاہ عبدالغنی ۱۵ شعبان ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ علمی و روحانی استفادہ کے لئے اکثر دہلی آتے۔ حضرت شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا، ان کے انتقال کے بعد علماء و فضلاء کے اصرار پر حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ کو آباد کرنے کے لئے دہلی تشریف لے آئے۔

شاہ عبدالغنی صاحب اپنے جد بزرگوار حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے طریقہ نقشبندیہ کے متمسک اور اپنے والد ماجد شاہ ابو سعید قدس سرہ سے مجاز تھے، آپ کا سلسلہ نسب و سلوک آنھویں پشت پر حضرت مجدد صاحب سے جا ملتا ہے۔ (منفصل مطالعہ کے لئے تذکرۃ الرشید ص ۲۹ دیکھئے)

آپ کے مبلغ علم اور استعداد کو دیکھتے کہ جس کا مخالفین بھی اعتراف کرتے ہیں، دونوں طرف کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے کہ علم کا اتنا سمندر آپ نے اس تھوڑی مدت میں کیسے پی لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بہت ذہین ذکی اور فطین تھے شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں بمشکل سونے کھانے اور دیگر ضروریات میں سات آٹھ گھنٹے صرف کرتے ہوں گے باقی سارا وقت مطالعہ کتب بنی میں صرف ہوتا تھا اور مطالعہ میں آپ اس قدر منہمک ہوتے کہ پاس پڑا ہوا کھانا کوئی دوست اٹھا کر لے جاتا مگر آپ کو خبر نہ ہوتی۔ بارہا ایسا ہوا کہ مطالعہ کرتے کرتے سو گئے صبح اٹھے تو معلوم ہوا کہ کھانا شام کا اسی طرح پڑا ہے رات کھایا نہیں ہے، مدرسہ کو آتے جاتے ادھر ادھر کبھی نہ دیکھتے۔

ایام طالب علمی

ایام طالب علمی میں آپ نے خورد و نوش کا کسی پر بار نہ ڈالا تین روپے ماہوار آپ کے ماموں بھیجا کرتے تھے اس میں روکھی سوکھی روٹی اور دال ترکاری جو وقت پر مل جاتی کھا لیتے، اور انہی تین روپے میں صابن تیل اصلاح خط وغیرہ ہوتا۔ آپ کے علمی ذوق اور انہماک کا خاصا شہرہ تھا اسی بنا پر کئی بڑے لوگ آپ سے محبت سے ملتے اور ان لوگوں میں ہر طرح کے ہوتے، کئی مہندس اور کیمیا گر ملے انہوں نے فراست سے آپ کو پہچان کر بہ نیت محبت آپ کو کیمیا کا نسخہ بتانا اور سکھانا چاہا مگر آپ نے صاف انکار کر دیا، آپ کی زاہدانہ اور قانع طبیعت نے ایسی چیزوں کی طرف مطلق توجہ نہ کی یہی وجہ تھی کہ آپ ایسی جگہ پر پہنچے کہ جس کے متعلق شاعر کہتا ہے ۔

آنانکہ خاک راہ بنظر کیمیا کنند

فرماتے تھے کہ ایک شخص نے کیمیا بنا کر دکھلا بھی دی اور ایک نے نسخہ دے دیا، فرمایا کہ وہ میری ترمذی میں پڑا رہا۔ گنگوہ آنے پر دیکھا تو کتاب سے نکل آیا، لیکن یہاں بھی اسے آزمانے کا شوق نہیں چرایا، ایک شخص کا نام لے کر فرمایا کہ وہ پاس بیٹھے تھے انہوں نے نسخہ کی نقل مانگی ہمیں بخل کی کیا ضرورت تھی نقل دے دی اور اصل کو اسی وقت پھاڑ ڈالا اس کے بعد غالباً فرمایا کہ اس شخص نے نسخہ آزمایا تو صحیح نکلا۔

زمانہ طالب علمی میں اساتذہ کی دونوں حضرات پر جو شفقتیں تھیں ان کو اگر بیان کیا جائے

تو ایک دفتر درکار ہے۔ آپ کے استاد مفتی صدر الدین صاحب مولود قیام وغیرہ کو جائز کہتے تھے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ طالب علمی کے زمانے ہی سے ایسی رسوم و رواج اور بدعات سے سخت مجتنب تھے، مفتی صاحب کو بھی پتہ تھا لیکن اس کے باوجود شفقت فرماتے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک دفعہ دہلی آنا ہوا اور مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی، بڑی محبت سے ملے سب حالات پوچھے اور کہا کہ میاں قاسم کیا کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا مطبع میں آٹھ دس روپے ماہوار پر صحیح کا کام کرتے ہیں تو مفتی صاحب نہایت تعجب کیسا تھا بار بار ہاتھ مارتے تھے کہ ”قاسم ایسا سستا قاسم ایسا سستا“ پھر فرمایا کہ ”فقیر ہو گئے فقیر ہو گئے“ اس کے بعد نہایت محبت اور شفقت سے پوچھا ”میاں رشید یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اور تم دونوں کھانا ایک جگہ کھالیں“ حضرت نے مناسب طرز پر جواب دیا اور آخر مفتی صاحب کے اصرار سے کھانا وہیں تناول فرمایا، مفتی صاحب فرمانے لگے کہ ”میاں رشید تم ہی اچھے ہو کہ تارک دنیا ہو گئے ہماری نوکری جائز نہیں تھی اور ہم خوب سمجھتے تھے کہ جائز نہیں مگر بزور علم اس کو جائز رکھتے تھے (۱)“

پہلے شاگرد دارالعلوم کے پہلے مدرس

زمانہ طالب علمی میں اپنی کتابوں کو پڑھانے کا بھی شوق رکھتے تھے فارغ اوقات میں پڑھاتے تاکہ حرج نہ ہو چنانچہ سب سے پہلی جماعت جو آپ سے پڑھنے لگی وہ ہے جس میں ملا محمود دیوبندی بھی شریک تھے جو دارالعلوم دیوبند میں سب سے پہلے مدرس مقرر ہوئے، اور جن کے پہلے شاگرد شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے گویا حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے شاگردوں میں سے ایک دارالعلوم دیوبند کے پہلے مدرس ہوئے۔

نکاح

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے چار حقیقی ماموں تھے جن میں بڑے ماموں مولانا محمد تقی صاحب کی صاحبزادی مسماۃ خدیجہ خاتون سے آپ کی منگنی ہو چکی تھی۔ مولوی محمد تقی صاحب سلسلہ قادریہ میں شاہ سیف اللہ نرنولی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و مجاز تھے جو نہایت پابند شرع اور عاشق سنت شیخ تھے، مولانا محمد تقی کی یہ بات مشہور ہے کہ جس چیز کے متعلق علم ہو گیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) تذکرۃ الرشید ص ۳۲، مفتی صاحب دہلی میں انگریز حکومت کی طرف سے صد الصدور تھے اور کافی تنخواہ پاتے تھے۔

کو اس سے رغبت تھی مولانا اس کو بلا تامل اپنے ہاں کھانے کا معمول بنا لیتے چاہے مضر ہی کیوں نہ پڑے مولانا ممدوح ریاست جھجر میں فوجی ملازم تھے اور اپنے آقا کے جان نثار خیر خواہ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

حضرت جب اکیس برس کے ہوئے تو ماموں نے آپ کے دادا سے تقاضا کیا کہ نکاح کر دیا جائے اس لئے دہلی سے واپس آنے پر آپ کے نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی، آپ جب کپڑے پہنا کر گھر لائے گئے تو ایک اندھی میراثن چندیا نامی نے دنیا کی رسم کے مطابق بے تکا مصرعہ ”گوندھ لائی مالن سہرا“ منہ سے نکالا حضرت جو کہ متبع سنت و شریعت تھے اس کے سننے کی کہاں تاب رکھتے، بے اختیار جلال میں آکر ایک دھول رسید کی اس کا تو منہ بند ہو گیا مگر گھر کے چھوٹے بڑے اس میراثن پر روپے پیسے بچھاؤ رکرنے لگے کہ خدا کے لئے دولہا کو کو سیے مت جو ہونا تھا سو ہو اب دشگونی کا کوئی لفظ منہ سے نہ نکلے۔

مردانہ جائے نکاح میں تشریف لائے تو مہر پانچ ہزار سکہ چہرہ شاہی سکر دولہا بننے کی حالت ہی میں صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس مقدار کا متحمل نہیں ہو سکوں گا، آپ کے خسر اتفاق سے موجود نہ تھے بالآخر بڑے بوڑھوں کے اصرار پر راضی ہوئے۔ لیکن نکاح کے متصل ہی آپ کی زوجہ محترمہ نے سارا قصہ سکر مہر معاف کر دیا، اس طرح حضرت کے صفائش قلب کو کلی راحت حاصل ہوئی، حضرت کی اہلیہ کی عمر پندرہ سال اور آپ کی اکیس سال تھی۔

حفظ قرآن

جوانی میں شادی کے دن ایسے ہوتے ہیں کہ ادھر ادھر کے تمام مشاغل بالائے طاق رکھ دیئے جاتے ہیں لیکن حضرت نے عین ان دنوں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا، اپنے جدی مکان میں ایک کوٹھری میں سارا دن قرآن پاک یاد کرتے رہتے، نماز کے اوقات میں کلام مجید پر رومال ڈال کر اٹھ کھڑے ہوتے اور مسجد میں نماز باجماعت ادا کر کے پھر اسی جگہ آ بیٹھتے، آخر اس لازوال دولت سے مالا مال ہوئے اور رمضان المبارک کی تراویح میں قرآن پاک سنایا۔

سلوک و تحصیل معرفت

خدا طلبی اور معرفت خداوندی کا شوق ازل سے آپ کے قلب مبارک میں ودیعت تھا

چنانچہ تحصیل علم اور نکاح کے بعد اب مرشد کامل کی تلاش ہوئی جو آپ کو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر لے آئی اور اس نعمت عالی سے سرفراز ہوئے کہ جس کی طلب میں سلاطین دنیا کو تخت و تاج کا چھوڑنا آسان معلوم ہوتا ہے۔

بازار عشق و شوق محبت کے جان فروش لپکیں کہ چل چلاؤ ہے دنیائے دون کا
سیکھیں طریق وصل و لقاء خدائے پاک دل بیچ کر خرید لیں سودا جنون کا

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے دربارِ دربار میں

دہلی میں تعلیم کے دوران میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ چار سال اس طرح ایک جان دو قالب رہے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ازل سے ایک دوسرے کے ساتھی چلے آ رہے ہیں، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نانوتہ کے تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ننھیال نانوتہ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں تھی، اس طرح آپس میں خاندانی ربط بھی تھا۔ اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہمیشہ بھی نانوتہ بیاہی ہوئی تھیں اس لئے حضرت حاجی صاحب اکثر نانوتہ تشریف لاتے تو حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا محمد یعقوب دونوں حاضر خدمت ہوتے، حاجی صاحب کا ان دونوں نو نہالان چمنستان علم کے ساتھ بچپن ہی سے غایت شفقت و محبت اور اخلاص کا معاملہ تھا، کتاب کی جز بندی دونوں بزرگوں نے حضرت حاجی صاحب سے سیکھی، حضرت نانوتوی جب وطن سے دہلی اور دہلی سے وطن جاتے تو تھانہ بھون ضرور حاضری دیتے یہ ہمیشہ کا معمول تھا اور اعلیٰ حضرت حاجی صاحب جب دہلی جاتے تو مولانا مملوک علی کے پاس قیام فرماتے۔ اس طرح شاگرد رشید مولانا مملوک علی حضرت نانوتوی کو حاجی صاحب کی زیارت ہوتی رہتی، حضرت نانوتوی تمام ساتھیوں سے عموماً اور خصوصی رفیق و محبت حضرت گنگوہی سے خصوصاً حاجی صاحب کا تذکرہ کرتے رہتے۔

اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی جو پہلی زیارت حضرت گنگوہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کی وہ یہیں دہلی میں مولانا مملوک علی کے یہاں کی، دونوں بزرگ دہلی میں جب پڑھتے تھے تو مولانا مملوک علی سے عرض کیا کہ سلم پڑھا دیجئے انہوں نے فرصت نہ ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا، آخر شاگردوں کے اصرار پر ہفتہ میں دو دن مقرر ہوئے ایک دن سبق ہو رہا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے یہ کون تھے یہ قصہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے بڑا لطف آئے گا۔

ہفتہ میں (سَلَم کے) دو سبق ہونے لگے تو اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی ایک روز یہی سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے ہوئے آنکے اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحب معہ تمام مجمع کے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ ”لو بھائی حاجی صاحب آگئے۔“ حاجی صاحب آگئے اور (حضرت مولانا سے) مخاطب ہو کر فرمایا کہ ”لو بھائی رشید اب سبق پھر ہو گا“ مجھے سبق کا بہت افسوس ہوا اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے کہا کہ ”بھئی یہ اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی رہ گیا“ مولوی محمد قاسم نے کہا ہا ہا ایسا مت کہو یہ بزرگ ہیں اور ”ایسے ہیں ایسے ہیں“ ”ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈ لیں گے“ ”اول زیارت مجھے اس وقت ہوئی تھی، اس کے بعد حضرت حاجی صاحب ہم دونوں کا حال دریافت فرمایا کرتے اور یوں کہا کرتے تھے کہ سارے طالب علموں میں وہ دو طالب علم (مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی رحمہما اللہ) ہوشیار معلوم ہوتے ہیں اور بس (۱)

حاجی صاحب کی کرامت

دوسری ملاقات تھانہ بھون میں ہوئی جبکہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ اور دیگر کئی طالب علموں کے ساتھ تھانہ بھون گئے اور سب طلبہ نے مسجد میں قیام کیا، حضرت گنگوہی کا جو تا بد لا گیا اتنے میں حاجی صاحب آگئے اور فرمایا کہ جو تا (بدلا ہوا) دکھاؤ اور چراغ کے سامنے دیکھ کر فرمایا کہ ”یہ تو حبیب حسن کا ہے“ حالانکہ حاجی صاحب حبیب حسن کو بھی نہ جانتے تھے جو تا تو کیا پہچانتے۔ حضرت گنگوہی نے یہ ماجرا دیکھا تو کوشش سی پیدا ہوئی کہ حاجی صاحب صاحب کشف آدمی ہیں۔ (ان کی پہلی تعریفات ان کے ذہن میں تھیں) ویسے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا خیال یہ تھا کہ حضرت شاہ عبدالغنی رحمہ اللہ سے بیعت ہو نہ گا کیونکہ آپ صحاح کی کتب پڑھنے کے دور ان ان کے تقویٰ وزہد اور اخلاص عمل کا خوب مشاہدہ کر چکے تھے مگر دل کی بات زبان پر نہ لاسکے اور بغیر کسی سے بیعت ہوئے تکمیل علوم کر کے گنگوہ آگئے۔

تیسری ملاقات

ایک مرتبہ گنگوہ مسجد میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور پاس آکر کھڑے ہو گئے، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے نظر اوپر اٹھائی تو ایک نورانی صورت نظر پڑی لیکن

پہلی نظر میں پہچان نہ سکے اور پوچھا کون؟ جواب ملا امداد اللہ۔ حضرت فوراً اٹھے اور تعظیم و تکریم سے پیش آئے اور اس سے زیادہ شفقت و محبت کا مظاہرہ حاجی صاحب کی جانب سے ہوا (۱)

چوتھی ملاقات

حاجی صاحب رحمہ اللہ کبھی کبھی گنگوہہ بالقصد آتے یا کہیں آتے جاتے گنگوہہ اتفاقاً قیام ہوتا تو مولوی سراج الدین کے مکان پر قیام فرماتے تھے جو سرکاری ملازم ہونے کے باوجود نہایت پارسا اور متقی انسان تھے، کبھی رشوت یا اس قسم کا کوئی پیسہ کسی سے نہیں لیا یہ حضرت گنگوہی کے رشتہ دار تھے۔ ایک ملاقات ان کے ہاں ہوئی اسی ملاقات یا کسی اور ایسی ہی ملاقات میں حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی سے پوچھا کہ ”میاں رشید اللہ کا نام سیکھنے اور کہیں مرید ہونے کی تمنا ہے کہ نہیں؟“ مولانا نے جواب دیا کہ ”حضرت جی تو بہت چاہتا ہے“ حاجی صاحب نے پوچھا کہ ”کہاں اور کس طرف میلان ہے؟“ مولانا نے جواب دیا کہ ”اب تک جتنا غور و فکر کیا دو حضرات میں سے ایک کا غلام بنوں گا یا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کا یا آپ کا“ اعلیٰ حضرت مسکرائے اور یہ فرمایا کر ٹال دیا کہ ”ہاں صاحب شاہ عبدالغنی صاحب عالم بھی مشہور ہیں، محدث ہیں، علماء تو علماء ہی کی طرف جھکتے ہیں مجھے کیوں شامل کرتے ہو میں بے چارہ پڑھانہ لکھا۔“ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت نے بظاہر تو اپنی طرف سے رغبت کم کی مگر اندر ہی اندر دل کھینچ لیا۔ اس گفتگو کے بعد آپ کا ارادہ حاجی صاحب کے متعلق پختہ ہو گیا۔ (۲)

تھانہ بھون حاضری اور بیعت

تھانہ بھون میں ایک بڑے عالم حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کے پیر بھائی مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے، ان کی ایک تحریر کسی نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کو بھیجی جس میں لکھا تھا کہ ”روضہ سرور کائنات ﷺ میں جو جگہ ایک قبر کے لئے چھوٹی ہوئی ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مدفون ہوں گے اور یہ امر قطعی ہے اس کا منکر ایسا ہے اور ویسا ہے۔“ حضرت مولانا نے بجائے تصدیق و تصویب کرنے کے لکھ دیا کہ ”سارا ثبوت باحادیث و اخبار احاد ہے اس لئے علم ظنی حاصل ہو گا قطعیت کا ثبوت دشوار ہے“ حضرت شیخ محمد

صاحب کی نظر سے یہ تحریر گزری تو غضب میں آگئے کہ ایک طفل مکتب نے میرا رد کرنا چاہا اسی حالت میں ایک رسالہ اپنے موقف کی تائید میں لکھ کر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیج دیا، مولانا نے دیکھا تو سوائے ان احادیث و آثار کے ذکر اور اسناد کی تفصیل کے جن میں یہ مضمون وارد ہے اور کچھ نہ تھا اور اس کا اقرار مولانا نے اپنی پہلی تحریر میں ہی کر لیا تھا، مولانا نے اس رسالہ کے پشت پر لکھ دیا کہ میں نے نہ احادیث کا انکار کیا نہ اس کا دعویٰ کہ یہ مضمون ثابت نہیں، ہاں میں نے یہ لکھا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ اس بحث کی جملہ اخبار واردہ احاد ہیں ان سے مضمون کی قطعیت کیونکر ثابت ہو جائے گی، جو میرا شبہ ہے اس کا رسالہ میں جواب نہیں اور جو احادیث مذکور ہیں ان کا میں منکر نہیں۔ (۱)

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے
حضرت مولانا شیخ محمد صاحب اگرچہ بہت نیک صالح اور فاضل شخص تھے، علم کا غلبہ تھا اور علم کے لئے تفقہ لازم نہیں اس مسئلہ میں چوک گئے تھے، مگر اپنی غلطی سمجھ میں نہ آئی، لیکن چونکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بات مدلل تھی لہذا جواب بھی پھر نہ دے سکے البتہ دو چار جگہ کہا کہ کل کا بچہ مجھے طفل لکھتا ہے۔ حضرت مولانا نے جواب دیا کہ نہیں میں نے تو آپ کی اس شعر میں تعریف کی ہے کہ شہ سوار ہونے کے باوجود گر گئے، بچہ کیا گرے گا اور کہاں گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلتا ہے۔ بہر حال بات چل نکلی تھی حضرت مولانا کا علمی جوش جسے حمیت دین کہئے آپ کو تحریک کرتا تھا کہ آپ بالمشافہ تھانہ بھون جا کر حضرت مولانا شیخ محمد سے بات کریں، ایک سفر برات کا پیش آیا اس سفر میں حضرت مولانا سے بات چیت اور حضرت حاجی صاحب سے درخواست بیعت کا ارادہ کر لیا۔ رسالہ ساتھ لے لیا اور برات کی واپسی پر تھانہ بھون چلے گئے۔ جلدی واپس آنے کا خیال تھا لہذا جو کپڑے پہنے ہوئے تھے ان کے علاوہ کوئی اور جوڑا ساتھ نہ تھا اور اس بات چیت کرنے کے لئے کئی دفعہ تصحیح نیت کی، استخارہ کیا اور غور و فکر کے بعد ارادہ کیا کہ حق کے اظہار کے لئے جا رہا ہوں۔

ظہر کی نماز کے بعد تھانہ بھون پہنچے حضرت حاجی صاحب سردی میں تلاوت قرآن کر رہے تھے حضرت مولانا حاضر ہوئے سلام مسنون کر کے بیٹھ گئے۔ حاجی صاحب نے تلاوت قرآن کے بعد پوچھا کہ کیسے آئے، آپ نے فرمایا مناظرہ کے لئے آیا ہوں، اعلیٰ

حضرت نے فرمایا! ”ہا ہا! ایسا ارادہ نہ کرنا میاں وہ ہمارے بزرگ ہیں“ بس مباحثہ کا تو یہیں فیصلہ ہو گیا، مولانا نے عرض کیا کہ ”حضرت اگر آپ کے بڑے ہیں تو میرے بھی بڑے ہیں“ اسکے بعد گفتگو ہوتی رہی اور مناسب الفاظ میں بیعت ہونے کی درخواست کی، حضرت حاجی صاحب نے تامل ہی نہیں کیا بلکہ طلب صادق دیکھنے کیلئے انکار فرما دیا۔ مولانا نے بہت اصرار کیا مگر آپ انکار کرتے رہے، مولانا کے ہاں علمی غرور و نخوت نام کو بھی نہ تھی سرپا شوق و اخلاص بن کر آئے تھے، حاجی صاحب استغناء ظاہر کرتے تھے اور یہ احتیاج و اقتدار ظاہر کرتے رہے۔ دو تین دن گزر گئے کہ حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ (۱) نے آنے

(۱) حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ :- حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، اور حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ، ہم زمانہ اور باہم رفیق تھے، یہ تینوں حضرات عام طور پر اکٹھے رہتے۔ حافظ ضامن صاحب کی تاریخ پیدائش حاجی صاحب سے چند سال قبل ہوگی صحیح معلوم نہیں ہو سکا۔ حافظ صاحب میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے اور سلوک و معرفت میں بہت اونچے، مگر کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے اگر کوئی بیعت ہونے کے لئے آتا تو فرماتے۔

”بھائی اگر بیعت ہونا ہے تو حاجی صاحب کے پاس جاؤ وہ خانقاہ میں اندر بیٹھے ہیں اور اگر کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہو تو مولانا شیخ محمد محدث کے پاس جا کر پوچھو اور اگر حقہ پینا ہے تو میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“

آپ کا حلیہ و رنگ :- گورا سفید رنگ، چچک کے کچھ داغ چہرے پر تھے لیکن خوشنما معلوم ہوتے تھے قدر درمیانہ درجے کا تھا اور نہایت مناسب خوبصورت اور چہرے سے رعب نمایاں، آنکھوں میں سرخی چمکتی تھی، سینے پر سیاہ بال تھے بھوس کشادہ سرمندائے رہتے گردن بلند چہرہ متبسم رہتا، بے تکلف سیدھے سادھے بزرگ اور ظریفانہ طبیعت کے مالک تھے اور عادات و اخلاق یہ تھے کہ ظاہر و باطن بالکل ایک تھا نادان و منافق سے کچھ باک نہ تھا۔

باوصف خانہ داری :- اور اہل و عیال سے نہایت آزاد اور مستغنی رہتے تھے گویا فکر دنیا پاس بھی نہ آیا تھا، دانائے عصر اور علمائے زمانہ ہر ایک آپ کا مخلص و منقاد تھا، ہر وقت عشق الہی میں مست و سرشار رہتے تھے، دل کی کیفیت چہرہ مبارک پر معلوم ہوا کرتی تھی، محبت الہی کا صورت شریف پر ہر آن ظہور تھا میاں جی سے بیعت ہوئے تو آپ کے ارشاد پر کہ سوا لاکھ آیت کریمہ پڑھو عصر سے لے کر دوسری عصر تک ورد پورا کر لیا اور تمام اشغال بہت جلد پور کر لئے، کئی سال تک آدھ پاؤ کے قریب روزانہ کھانا کھاتے رہے فنا فی الشیخ ہو گئے تھے۔ ۱۵ شعبان سے آخر رمضان تک ہر رات مشغول رہتے شب کو سونا یا لیٹنا موقوف کر دیتے تھے، چند ہی دن میں کمال جذب کے ساتھ سلوک کی تمام منازل طے کر لیں اور اس قدر کمال توحید اور وسعت حال حاصل ہوئی کہ خارج از بیان ہے، اس وقت تمام درویش اہل حال فن تصوف میں پیشوا سمجھتے اور خاص و عام دریافت حال و مقام میں حیران تھے، مولانا شیخ محمد محدث تھانوی نے پہلے حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ سے کسب فیض کیا آپ مولانا کے ماموں بھی تھے، آپس میں ہم عمر تھے بعد ازاں میاں جی سے بیعت ہوئے حضرت حافظ صاحب اتباع شریعت اور زہد و تقویٰ میں بہت بڑھے ہوئے تھے ادنیٰ بدعت کو بھی اکھاڑ پھینکتے تھے۔ مختلف فیہ مسائل میں احتیاط پر عمل کرتے اور امر و نہی میں شان فاروقی عروج پر ہوتی تھی کہ نہا فاروقی تھے۔ اخفائے حال کو پسند کرتے تھے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت پر ان کو تنبیہ کی جیسا کہ حاجی صاحب کے ذکر میں گزر چکا۔

شہادت اور کشف شہادت :- ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شامی کے جہاد میں حصہ لیا، آپ کو اپنی شہادت کا کشف ہو چکا تھا، چنانچہ آٹھ دس روز پہلے اپنے ایک مرید حکیم ضیاء الدین صاحب کو خط لکھا (فارسی میں) (باقی اگلے صفحہ پر)

کا سبب اور حال دل پوچھا تو آپ نے بے اختیار فرمایا کہ ”جدھر دل کا میلان ہے وہ قبول نہیں کرتے دوسرے اپنی طرف کھینچتے ہیں“۔ حافظ صاحب نے دلا سہ دیا کہ ”ابھی جلدی

(بقیہ گذشتہ کا) کہ ”لازم کہ بغور مطالعہ اس خط کے اپنے تئیں یہاں پہنچاؤ ایسا نہ ہو کہ توقف میں حسرت ملاقات کی دل میں رہ جائے۔ عاقل کو اشارہ کافی ہے باقی حال بروقت بیان کیا جائے گا۔“

شہادت کا دولہا:۔ میدان شہادت میں جانے سے پہلے آپ نے خوب زیب و زینت کی، غسل کر کے نیا لباس زیب تن کیا جو کئی دن سے تیار کر رکھا تھا، نعلین اگرچہ بوسیدہ نہ تھیں مگر وہ بھی نئی پہنیں، خوشبو ملی سرمہ لگایا ستارہ تپسدار، سپاہیانہ وضع شمشیر لے کر شربت دیدار کی تمنا میں علم جو انمردی اٹھا کر مردانہ اور مشتاقانہ برسرِ معرکہ جان بحق تسلیم فرمائی۔ شہادت کے سال اکثر فرمایا کرتے۔ ”دیکھو حوریں پیالے لئے ہوئے مکانوں کی منڈیروں پر کھڑی ہیں جس کا جی چاہے لے لیوے“..... حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو وصیت فرمائی تھی کہ بوقت شہادت یعنی نزاع کے وقت میرے پاس رہنا، چنانچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو گولی لگنے کے بعد قریب کی مسجد میں لے گئے اور اپنے رانوں پر سر رکھا اور اسی عالم میں یہ شہید الفت اپنے محبوب حقیقی سے جا ملا جس سے ملنے کے لئے بے حد بے چین تھا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

ان کے محاسن میں وہ چمکے عذار

شعلے کی جو دو دیہ میں بہار

سینے پہ کچھ بال سیہ ہیں نمود

ہیں یہ اسی آتش سوزاں کے دود

اور یہ سب شہادت کے وقت کا ہے گویا حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سینہ اور داڑھی کے بال اس وقت سیاہ تھے۔

تاریخ شہادت:۔ آپ نے ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو سوموار کے دن ظہر کے وقت شہادت پائی۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق پینسٹھ اشعار کہے جن میں سے چند یہ ہیں:-

نہ پوچھ ہو رہے ہیں کیوں خفا ہم جاں سے

کہیں سے مول لے دے دل مجھے کچھ اور اے ہدم

چھپا آنکھوں سے وہ نور مجسم خاک میں جا کر

شہید راہ حق حافظ محمد ضامن چشتی

فراق یار میں جینا تعجب ہے ولے ہدم

نظر آئے گی یارب پھر بھی وہ صورت کبھی ہم کو

کسی کا کیا گیا ہر رنجِ فرقت کی مصیبت کو

ہوئی ہم سے خطایا تھی کشش حب الہی کی

گناہوں کے سبب گر ہم نہیں تھے لائق صحبت

اگر ممنوع تھا ہم سے گنہ گاروں کا لے چلنا

اگر قاصد مجھے کوئی وہاں تک کا بہم پہنچے

مبارک ہو تمہیں وصل خدا خلد بریں میں، پر

غمِ فرقت میں یاں گزرے ہے پر کچھ بن نہیں پرہی

تمہارے ہجر میں جان جہاں کچھ بن نہیں آتا

دلِ مایوس کی کوئی نہیں صورت تسلی کی

تمہاری بزم پر انوار جب یاد آئے ہے ہم کو

ہمیں پالا پڑا ہے اب کے غمہائے دُوراں سے

کہ اٹھنے کا نہیں بار غم اس قلب پریشان سے

کہ جس کا خال پا بہتر تھا اس مہر درخشاں سے

بنایا تھا جسے حق نے ملا کر عشق و عرفاں سے

اجل سے اٹھ سکے شاید نہ ہم بار گناہاں سے

سینس گے پھر بھی وہ آواز ان لبہائے خنداں سے

کوئی جا کے مگر پوچھے ضیاء الدین نالاں سے

کوئی پوچھے سببِ رحلت کا اس سالارِ خواہاں سے

تو ہم کو بخشوالینا تھا کچھ کہہ سن کے رحماں سے

تو تنہا اس طرح جانا بھی نازیبا ہے سلطان سے

تو کہلا کر کے بھیجیوں یوں میں اس سالارِ نیکاں سے

ہمیں یوں چھوڑ کر تنہا تمہیں جانا نہ تھا یاں سے

تمہیں فرصت نہیں وال لذت دیدارِ یزداں سے

دلِ حسرت زدہ گھبرائے سے سیرِ گلستاں سے

مگر ہاں سرِ نکا لو تم مگر گنجِ شہیداں سے

تو اک شعلہ سا اٹھتا ہے ہمارے قلب سوزاں سے

کیا ہے چند روز ٹھہر وہاں کے حالات دیکھو“ آخر جب آپ کی پختگی ہر طرح ظاہر ہو گئی تو حافظ صاحب نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں سفارش کا اجر حاصل کیا اور دو تین روز بعد اعلیٰ حضرت نے آپ کو سلاسل اربعہ میں بیعت فرمایا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ علماء میں سے پہلے آدمی تھے جنہوں نے حضرت حاجی صاحب سے بیعت کی تھی، اس کے بعد تو اس کثرت سے علماء بیعت ہوئے کہ اس کی مثال شاید دنیا میں ایک آدھ ہی مل سکے۔ سات آٹھ سو کے قریب علماء حاجی صاحب کے مرید تھے عوام کا تو پوچھنا ہی کیا اور اس چیز کی بشارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاجی صاحب کو ایک خواب کے ذریعے دے چکے تھے اور یہ اسی بشارت کا ثمرہ تھا اور بشارت حاجی صاحب کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے تھی۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ابھی تک بیعت نہیں ہوئے تھے یہ عجب قصہ تھا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے تعریف کرنے سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان ہوا لیکن حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے سفارش کر کے بیعت کرایا۔

چالیس دن میں خلافت

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن کے ارادہ سے تھانہ بھون گئے تھے لیکن حضرت حاجی صاحب کے دربار میں پہنچ کر کچھ ایسے شیخ کی محبت میں گرفتار ہوئے کہ خود ہی ایک دفعہ فرمایا کہ ”پھر تو مر مٹا“ ظاہر ہے کہ جو محبوب محبوب حقیقی سے ملا دے اس سے زیادہ محبوب اور کون ہو گا اور بقول صاحب تذکرۃ الرشید حقیقت میں حضرت مولانا اس کے بعد مر مٹے، آپ نے اپنے نفس کو مار دیا۔ ہوئے نفس کو ملیا میٹ کر دیا، جس پاک نام کو سیکھنے کا قصد کیا تھا اس میں کھپ گئے، فنائیت حاصل کی اور اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ فناء عن الفنا پر پہنچے کہ اپنی فنائیت سے بھی بے خبر اور فانی محض بن گئے“..... حاضری کے وقت مختصر قیام کا خیال تھا مگر یہ خیال کرتے کرتے کہ آج نہیں کل چلا جاؤں گا پورا ایک چلہ یعنی چالیس دن وہیں گزار دیئے۔ چالیس کے عدد کو تزکیہ قلب کے باب میں خاص دخل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا مگر دس راتیں اور ملا کر چالیس راتیں پوری کیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال کی عمر میں نبوت کے مقام پر سرفراز کیا گیا،

مدینہ منورہ کے قیام پیغمبر کو خلافت راشدہ کے تیس سال میں جمع کیا جائے تو چالیس کا عدد حاصل ہوتا ہے۔ چالیس سال کے بعد انسان کو اعمال و کردار کے لحاظ سے مثالی شخصیت بن جانا چاہئے، اسی طرف شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے۔

چہل سال عمر عزیزت گذشت مزاج تو از حال طفلی نگشت

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی ہی رات ذکر کیا تو صبح کو حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ”تم نے تو ایسا ذکر کیا جیسے کوئی بڑا مشاق کرنے والا ہو۔“

اگرچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت کے وقت کہا تھا کہ ”حضرت مجھ سے ذکر و شغل اور محنت و مجاہدہ کچھ نہیں ہو سکتا“

اعلیٰ حضرت نے تبسم کے ساتھ فرمایا تھا کہ ”اچھا کیا مضائقہ ہے۔“ اور مولانا نے جواب دیا تھا کہ ”پھر تو مر مٹا“ لیکن حاجی صاحب جب آخر شب بیدار ہوئے تو مولانا کی آنکھ بھی کھل گئی دو چار کروٹیں بدلیں کہ نیند آجائے مگر اعلیٰ حضرت کی توجہ کام کر چکی تھی، مضطربانہ اٹھے، وضو کیا، مسجد کے ایک گوشے میں اعلیٰ حضرت نوافل تہجد کے بعد ذکر و شغل میں مصروف تھے اور دوسرے گوشے میں ہمارے مدوح حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس کام میں مصروف تھے کہ جس کام کے نہ کرنے کی اجازت شیخ سے لی تھی، ایک ہی رات میں ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ بقول حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ”تم نے تو ایسا ذکر کیا جیسے کوئی بڑا مشاق کرنے والا ہو۔“

اور پہلی ہی شب محبوب کے ذکر سے ایسے لطف اندوز ہوئے کہ پھر ساری عمر کا وظیفہ بن گیا خود فرماتے ہیں۔

”اس دن سے ذکر جہر کے ساتھ مجھے محبت ہو گئی پھر کبھی چھوڑنے کو جی نہیں چاہا اور نہ کوئی وجہ شرعی اس کی ممانعت کی معلوم ہوئی“

یہ تو پہلی شب کا صلہ تھا ایک ہفتہ گزرنے کے بعد آٹھویں دن ہی حضرت شیخ کی جانب سے دوسری خوشخبری یہ سنائی گئی کہ ”میاں مولوی رشید احمد جو نعمت حق تعالیٰ نے مجھے دی تھی وہ آپ کو دے دی، آئندہ اس کو بڑھانا آپ کا کام ہے۔“ کپڑوں کا جوڑا ایک ہی تھا میلا ہونے پر خود ہی دھو لیتے۔ آخری دنوں میں بخار ہو گیا اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس خیال سے کہ شیخ کو تیمارداری کی تکلیف دینا گستاخی ہے اور گھر سے تقاضے بھی شروع ہو گئے

تھے۔ اعلیٰ حضرت نے بخوشی اجازت دے دی اور آپ کو شیخ نے مع متعلقین دور تک مشایعت کر کے الوداعی کے وقت ایک طرف کر کے کہا کہ۔

”اگر تم سے کوئی بیعت کی درخواست کرے تو اس کو بیعت کر لینا۔“

حضرت امام ربانی مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا..... مجھ سے کون درخواست کرے گا..... اعلیٰ حضرت نے فرمایا..... تمہیں کیا جو کہتا ہوں کرنا،..... یہ تیسرا انعام تھا جو اس پہلی حاضری کی آخری ملاقات کے وقت عطا ہوا۔ لوگ برسوں مشائخ کی خدمت میں رہ کر مجاہدہ و ریاضت کی زندگی بسر کرتے ہیں پھر بھی کچھ ملا ملانہ ملا، لیکن بمصداق

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں

ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ دولت ایک چلہ میں مل گئی۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ گویا ایک صاف شفاف آئینہ تھے جو آفتاب کے مقابل رکھ دیا گیا ”صاحب تذکرۃ الرشید“ فرماتے ہیں۔ کیا خدا کی دین ہے کہ جس وہلہ میں بیعت ہوئے اسی وہلہ میں صاحب نسبت بنے۔ خلیفہ ہوئے اور چلتے چلتے اصرار و تقاضہ کے ساتھ اعلیٰ حضرت کی زبان سے یہ مبارک ارشاد و حکم سنا کہ دیکھو جو درخواست کرے اس کو ضرور بیعت کر لینا۔ یہی سفر سفر بیعت تھا اور یہی سفر حصول خلافت، یہی قلیل زمانہ زمان سعی تھا اور یہی چند یوم ظفرو کا میابی۔ روانہ ہوئے تھے مولانا شیخ محمد صاحب سے مباحثہ کرنے اور تبعاً و ضمناً انجان و ناواقف بن کر اللہ کا نام سیکھنے کے لئے، اور آئے پڑھے لکھے، عالم طریقت، مجاز حقیقت، شیخ عصر بن کر دوسروں کو اللہ کا نام سکھانے اور گنگوہ کو مہبط انوار و مرجع خلافت بنانے۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھے احوال کہ آگ لینے کو جائیں پیسیری مل جائے (۱)

گنگوہ واپسی

حضرت مولانا گنگوہ واپس تشریف لائے تو حالت بالکل بدل چکی تھی نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پہننے کا، ہر وقت استغراق و محویت اور تفکر کے عالم میں رہتے۔ اکثر تمام شب روتے گزر جاتی، والدہ ماجدہ نے نیلے رنگ کی رضائی تیار کی تھی کہ مسجد کو شب میں آتے جاتے خنکی

سے محفوظ رکھے، مولانا کی گریہ وزاری کے سبب آنسوؤں کی اس قدر کثرت تھی کہ رضائی سے پونچھتے پونچھتے اس کا کئی جگہ سے رنگ تبدیل ہو گیا، آپ آخر شب مسجد میں اس انداز اور جذب و کیفیت سے ذکر جہر کرتے۔

”ایسا معلوم ہوتا کہ ساری مسجد کانپ رہی ہے خود پر جو حالت گزری ہوگی اس کی تو کسی کو کیا خبر (۱)“

شیخ کی گنگوہ آمد

اسی اثنا میں حضرت حاجی صاحب گنگوہ تشریف لائے اور مرید کو اپنے مرشد کی میزبانی اور خدمت کرنے کا موقع ملا، اور اب تو ساری زندگی کا تعلق قائم ہو گیا تھا اور مخلص مسترشد کا جو تعلق صحیح مرشد سے ہونا چاہئے اور اچھے شیخ کی جو عنایات قابل اور ذی استعداد مرید پر ہونا چاہئیں اس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ہفتہ گنگوہ میں گزرتا تو عشرہ تھانہ بھون میں، غرض ہر دس پندرہ دن بعد کئی کئی دن کے لئے تھانہ بھون جا کر شیخ کی خدمت میں حاضری دیتے۔

معاش

مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ طالب علمی کا دور گزار کر اب متاہل زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی ایسا کام چاہتے تھے کہ جس میں دین کی خدمت بھی ہو اور گزاران کی صورت بھی ایک جگہ سے ترجمہ قرآن پاک پڑھانے کی بمشاہرہ سات روپے ماہوار پیش کش ہوئی۔ مگر حاجی صاحب سے اجازت نہ ملی۔ اس کے بعد سہارنپور کے مشہور رئیس اعظم نواب شائستہ خاں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے دس روپے ماہوار پر آپ کو بلایا اور آپ اگرچہ اہل بصیرت کے نزدیک بڑے بیش قیمت تھے مگر آپ نے اپنی ہستی کو ختم کر دیا تھا دس روپے گزارے کیلئے کافی سمجھ کر چلے گئے اور اس کو منعم و رزاق خدا کا احسان سمجھ کر قبول فرمایا۔ یہ ملازمت یا نوکری چھ ماہ کر کے چھوڑ دی اور وہ توکل اختیار کیا جس کی نظیریں دنیا میں کم ہی نظر آئیں گی۔

(۱) تذکرۃ الرشید ص ۵۳ یہ بیان مولانا ابوالنصر کا ہے جو حضرت مولانا کے ماموں زاد بھائی اور طفولیت کے پرانے رفیق و

رہن زمینوں کی واپسی

سہارنپور سے واپسی پر آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جن لوگوں نے زمین کے ٹکڑے آپ کے دادا کے پاس رہن رکھے ہوئے تھے وہ واپس کئے۔ رہن کی صورت یوں پیدا ہوئی تھی کہ آپ کے والد ماجد مولانا ہدایت اللہ جائے ملازمت گورکھپور سے اپنے والد قاضی پیر بخش کو پس انداز کی ہوئی رقم بھیج دیتے اور لکھ دیتے کہ مکان یا دوکان جو چاہیں خرید لیں، مگر دادا اتنے متشرع نہ تھے، انہوں نے لوگوں کو رقم دے کر ان کی زمینیں وغیرہ رہن لینا شروع کر دیں..... حضرت مولانا جب پچیس سال کی عمر کو پہنچے اور خود مختار اور وارث ہوئے تو آپ نے تمام کاغذات و وصولی و آمدنی ورہن کے نکال کر حساب لگایا۔ اگر کسی کو دی ہوئی رقم کے برابر اس رہن سے آمدنی ہو گئی تھی تو کاغذات چاک کر دیئے اور رہن واپس کر دی۔ اور اگر آمدنی کم ہوئی تو زمین واپس کر دی اور رقم معاف کر دی اور اگر آمدنی زائد ہو گئی تو ان کو زائد رقم واپس کر دی کہ آپ نے جتنا قرضہ لیا تھا آپ کی زمین کی آمدنی اس رقم سے زائد ہو گئی ہے ہم اپنی رقم تو آپ سے کیا لیں کہ آپ کی زمین سے ہمیں اس قرض کے برابر آمدنی ہو کر یہ زائد ہو گئی ہے، یہ آپ کی امانت ہے جو آپ کو واپس کرتے ہیں، اور ساتھ ہی آپ کے حوالے کرتے ہیں، اس محاسبہ ورہن چھوڑنے میں جو روپیہ دینا پڑا اس میں گھروالی کا سارا زیور فروخت کرنا پڑا۔ اس طرح تمام قرضدار بلا گمان و امید اور حضرت امام ربانی کی دیانت و امانت کے طفیل قرضوں سے سبکدوش ہو کر از سر نو اپنی زمینوں کے مالک ہو گئے (۱)

(۱) کسی ضرورت مند کو بغیر کسی لالچ یا مفاد کے محض ہمدردی اور انسان دوستی کے خیال سے رقم قرض دینا خیرات کے برابر بلکہ اس سے زیادہ ثواب کا باعث ہے اسے قرض حسنہ کہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ضرورت مند کو قرضہ دیتے ہوئے خیال ہو کہ اس سے کوئی چیز بطور ضمانت لے لی جائے مثلاً زمین، مکان وغیرہ تو اس شکل کو رہن کہتے ہیں۔ قرضدار جب قرض واپس کر دے تو اس کو اس کی ضمانت صحیح حالت میں واپس کر دی جاتی ہے اور اس دوران میں رہن کردہ چیز یا جائیداد سے کسی قسم کا مفاد حاصل کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح سود۔ اس رہن کردہ چیز سے ہونے والی آمدنی کا باقاعدہ حساب رکھا جائے اور جب قرضدار قرض کاروپیہ واپس کرے تو اس آمدنی کا حساب کر کے اتنی رقم چھوڑ دی جائے، لیکن ہمارے معاشرے میں رہن کردہ چیز سے ہر طرح کا مفاد حاصل کرنے کو شیر مادر کی طرح جائز سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً زید اپنی دکان رہن کر کے بکر سے چھ ہزار قرض لیتا ہے تو بکر سو روپیہ ماہوار کرائے پر اس دکان کو دے کر وہ کرایہ اپنی جیب میں ڈالتا رہتا ہے پانچ سال کے بعد اگر زید قرض لی ہوئی رقم واپس نہیں کرتا تو بکر کو از خود زید کی دکان یہ کہہ کر واپس کر دینا چاہئے کہ میرا قرضہ تمہاری دکان کے کرایہ سے پورا ہو گیا، لیکن ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ رہن کردہ چیز کی آمدنی اور وہ روپیہ اسی طرح زید کے ذمہ رہتا ہے جب تک وہ ادا نہ کرے۔ (ارشاد)

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے زمینیں بغیر قرضہ لئے واپس کر کے کہ ان سے آمدنی قرضے کے برابر ہو گئی تھی یا قرضہ سے زائد، آمدنی کو مع زمین واپس کر کے جو مثال قائم کی وہ اس زمانہ میں الشاذ کا معدوم ہے، اور اگر کہیں ہے تو وہ انہیں حضرات کے تربیت کردہ افراد میں ہے اور شاید ہی کہیں ملے۔ یہ ایک بڑا مسئلہ تھا جو حضرت کی بے حد پریشانی کا باعث تھا۔ وارث و خود مختار ہوتے ہی اس کا حل فرما کر رب العالمین کی عبادت کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے پر ساری توجہ مرکوز کر دی۔ اور اس میں اس قدر محنت کی کہ اس سے آپ کی جسمانی حالت ایسے درجے کو پہنچ گئی کہ دیکھنے والے خیال کرتے تھے کہ کسی اندرونی بیماری اور مہلک مرض کا شکار ہیں، بے خبروں کو کیا علم کہ اس انسان نے ایسے شافی مطلق اور حکیم سے لو لگا رکھی ہے کہ جس سے لو لگانے کے بعد تمام روگ ختم ہو جاتے ہیں اور وہ خود ایسے مقام کی طرف بڑھ رہا ہے کہ بیشتر روگی لوگ اسکی توجہ سے شفا پائیں گے۔

اب حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ اس مقام پر آگئے تھے کہ بلا خوف و متہ لائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کریں۔ ان میں ہمت و دلیری، مروت و شجاعت اور صاف گوئی و حق گفتاری کا جذبہ ابھر آیا تھا، اگرچہ وہ بچپن ہی سے اس کے حامل تھے لیکن اب صحبت شیخ نے گویا سان پر چڑھا کر آب و تاب کو تیز کر دیا تھا۔

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف جب انسان حق کی تلوار بن کر لوگوں کے سامنے آتا ہے تو اس میں قہاری و غفاری اور قدوسی و جبروت کا عکس نظر آتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے مقاصد احکام کا معیار و عکاس بن جاتا ہے، اس کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، اس کی کوئی اپنی خواہش نہیں ہوتی، جو کچھ کرتا ہے کتاب و سنت کی روشنی میں کرتا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان حالات کی ناسازگاری اور تکالیف و مصائب کے پہاڑ اس کے وقار و تمکنت کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں، خطرناک سے خطرناک حالات اس کے عزائم کو متزلزل نہیں کر سکتے وہ تاریکیوں میں ایمان کی شمعیں جلاتا اور طوفانوں سے ٹکراتا ہے۔ اس کے ابتدائی مراحل زندگی میں لوگ اس کو سمجھتے ہیں کہ یہ غریب و تنگ دست انسان کیا کر سکتا ہے یہ کیا اور اس کی بساط کیا، لیکن سچائی کا موقف، ایمان و عمل صالح کی دولت اسے حیات

جا وداں عطا کرتی ہے اور وہ بالآخر لوگوں کا محبوب بن جاتا ہے۔

والعصران الانسان لفي خسر الا الذين آمنوا وعملوا الصالحات
وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر (القرآن الحکیم)
زمانے کی قسم! بے شک انسان یقیناً خسارے میں ہے مگر وہ لوگ (کامیاب ہیں) جو
اللہ پر ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے اور حق کی وصیت کرتے رہے اور صبر کی
وصیت کرتے رہے۔

قدوسی حجرہ میں خلوت نشینی

جیسا کہ سابق میں گذرا حضرت مولانا شیخ رحمہ اللہ کی چند روزہ صحبت ہی سے کندن ہو گئے۔
آپ کو محبوب کے تصور و ذکر میں لذت آنے لگی اور اسی سرور انبساط میں ہر وقت مگن رہنے
لگے، ظاہر ہے کہ اس حالت میں جلوت سے گھبراہٹ اور خلوت سے پیار ہو جاتا ہے یہی
حال حضرت مولانا رحمہ اللہ کا تھا بقول صاحب تذکرۃ الرشید۔

الغرض امام ربانی کی وہ عالی اور بلند ہمت جو خدائی خزانہ عامرہ سے فطرتاً آپ کو عطا
ہوئی تھی سرتاپا تمام وکمال تحصیل قرب الہی میں صرف ہونے لگی، اور آپ کی عمر عزیز کا، لحظہ
لحظہ جو حق تعالیٰ نے تجارتِ آخرت کیلئے جواہرات بنا کر اس المال قرار دیا ہے پائیدار
منفعت کے کسب میں گزرنے لگا، رات کی سنسان گھڑیوں میں آپ اپنے نجات دہندہ
کو پکارا کرتے، اندھیری شب کی سیاہ چادر اوڑھ کر اپنے پرورش کنندہ خالق کو سجدہ کرتے،
اس کے دربار میں حاضر ہو کر ناک رگڑتے، گڑ گڑاتے اور روتے روتے بیتاب ہو جایا
کرتے تھے، لوگوں کے پاس بیٹھتے ہوئے اکتاتے، گھبراتے اور تنگدل ہوا کرتے تھے،
جنگل کے درختوں کی سنسانہٹ آپ کو پسند آتی اور ویران خالی گھروں کے گوشوں سے
آپ کو انس حاصل ہوتا تھا، برادری کی کسی تقریب یا جلسہ میں آپ مدعو ہوتے تو آپ کی
زبان حال یہ شعر پڑھتی

در محفل خود راہ مدہ ہمجو منے را افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را
اور کوئی غیر آباد ڈھنڈا یا شکستہ و ہزیمت خوردہ کھنڈر نظر آتا تو بے اختیار آپ کی حالت
پکارتی ۔

دیوانہ کو ویرانہ سے کیوں لطف نہ آئے آخر تو ہر اک شخص کا انجام یہی ہے
 سب دھندے ہیں دنیا کے جو مٹ جائیں گے اک دن خلوت میں خدا ڈھونڈیے بس کام یہی ہے
 آپ کا نسب شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے جدہ کی جانب
 سے جا ملتا تھا، حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت بلکہ خلافت پانے کے بعد آپ کا
 روحانی نسب بھی ان سے جا ملتا تھا۔ آپ کے دادا نے سابقہ سکونت کو ترک اور گنگوہ قیام کر
 کے سکنی نسبت بھی قائم کر دی تھی، حضرت امام چونکہ قطب العالم شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ
 کے صحیح جانشین بننے والے تھے لہذا ابھی ایک مرحلہ کی تکمیل باقی تھی کہ امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ اسی
 حجرہ اور خلوت گاہ کو اپنی خلوت گاہ بنائیں جہاں قطب العالم اپنے محبوب حقیقی کی یاد میں
 سالہا سال تک ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے تھے، قطب العالم رحمۃ اللہ علیہ کا یہ حجرہ آپ کے
 روضہ مبارک کے متصل مسجد کی پشت پر واقعہ تھا لیکن گردش زمانہ کی وجہ سے اب گدھوں
 گھوڑوں کا اصطبل بنا ہوا تھا اور اگر اس کی حالت صحیح ہوتی تو متولیان خانقاہ اور دوسرے
 ظاہری جانشینوں کی شاید رال ٹپکتی اور اس پر ان کا قبضہ ہوتا، چونکہ خدا کو منظور تھا کہ
 قطب العالم کا صحیح روحانی جانشین اس کو اپنی خلوت گاہ بنائے لہذا اس کی ایسی حالت ہو گئی
 تھی کہ متولی اس سے صرف نظر کرتے رہے۔ حضرت مولانا کی اب جو یہ حالت ہوئی تو
 خلوت نشینی کیلئے کسی ایسے مقام کی تلاش ہوئی جہاں یک سوئی اور توجہ قلب سے خالق بے
 نیاز کی یاد کر سکیں۔ چنانچہ آپ نے اسی حجرے کو منتخب فرمایا جس کا اوپر ذکر گذر چکا ہے، آپ
 نے جب اس حجرے کا جائزہ لیا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رو دیئے، جہاں
 کسی زمانے میں اپنے وقت کا سب سے بڑا شیخ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہِ ناز میں اپنی
 جبین نیاز رگڑا کرتا تھا آج وہاں مچھروں، مکھیوں کی بھنھناہٹ سنائی دیتی تھی، اور گدھوں کا
 مسکن تھا، اللہ تعالیٰ نے لعل کو گدڑی میں چھپا رکھا تھا، اب اس بے بہا لعل کا قدردان
 جوہری سن بلوغ کو پہنچ گیا تھا، چنانچہ امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے بہتی آنکھوں اور روتے دل کے
 ساتھ بہ نفس نفیس اپنے ہاتھوں سے اس حجرے کو غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے صاف
 کیا گھر پے سے زمین کھود کر ہموار کی، صاف ستھری مٹی لا کر اس کو لپیلا پوتا، نئی مٹی ڈلوائی،
 سوراخ بند کئے، زمین پر بوریا کا فرش بچھایا، گوشوں میں لوبان کی دھونی دی، عطر چھڑکا
 اور اس مقدس حجرہ کو از سر نو آباد کیا جو سوائین سو برس سے آپ کی آمد کا انتظار کرتے کرتے

خستہ و تباہ ہو چکا تھا، اور یہی خستگی و کہنگی اس کے آج تک محفوظ رہنے کا سبب ہوئی، تین سو برس میں گنگوہ میں ہزاروں افراد آئے لیکن وہ اس حجرہ کے اہل نہ تھے اور اب جو اہل آیا تو امانت اس کے سپرد ہو گئی۔

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور میخانہ

طب

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ خاصے عرصہ تک خلوت میں یاد الہی سے اپنے قلب کو آباد کرتے رہے اور جب حرارت عشق الہی میں پگھل کر زر خالص بن گئے تو اب از خود لوگوں سے انس پیدا ہونے لگا، قدرت جن خوش نصیب افراد کو امت کی اصلاح و تربیت کے لئے چنتی ہے کم و بیش ہر ایک کو یہ مرحلہ ضرور پیش آتا ہے کہ قدرت پہلے ان کو کچھ عرصہ کے لئے اپنا قرب حاصل کرنے میں کوشاں و سرگرداں رکھتی ہے۔ جب ان کے ہر بن موسیٰ اللہ ہو اللہ ہو کی صدائیں نکلنے لگتی ہیں تب ان کے دل میں منجانب اللہ ٹھیراؤ پیدا کر کے ان کو تربیت خلق پر مامور کر دیا جاتا ہے اور لوگ رفتہ رفتہ ان کے جانب کشش محسوس کرتے ہیں۔ ان کی باتوں میں تاثیر اور ان کی صحبت میں اللہ کی یاد آتی ہے۔ حضرت گنگوہیؒ پر بھی یہ مرحلہ آیا اور اس مرحلہ میں اجتماعی اور سکون حاصل کر کے پھر رفتہ رفتہ لوگوں سے مانوس ہونے لگے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے لگے اور قدرت کی طرف سے وہ اسباب پیدا ہوئے کہ جنہوں نے امام ربانی کو طب جسمانی کی طرف متوجہ کیا اور وہ لوگ جو آپ کو کسی باطنی مرض اور مہلک بیماری میں مبتلا سمجھتے تھے ابتداً آپ کی طرف جسمانی بیماریوں کے لئے رجوع کرنے لگے اور چند ہی روز میں آپ کے معالج ہونے کی شہرت قرب و جوار میں پھیل گئی۔ اور اس طرح حضرت مولانا کسی قسم کے مالی احسان سے بھی بچے۔ ملازمت آپ کے فریضہ کی راہ میں رکاوٹ تھی اس لئے چھ ماہ کے بعد ہی اس کو چھوڑ دیا کیونکہ طبعاً اس سے وحشت تھی۔ اس کو چھوڑ کر متوکلانہ و زاہدانہ زندگی گزارنا شروع کر دی تھی لیکن اسباب و وسائل کے درجہ میں اہل و عیال کے لئے نان و نفقہ درکار تھا اس کی طرف سے یہ غیبی سامان پیدا ہوا کہ آپ کی والدہ کی خالہ بیمار ہو گئیں اور بقول حضرت مولانا حکیم صاحبزادہ مسعود احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (حضرت کے بیٹے)

ایک بار حضرت مولانا قدس سرہ کی والدہ کی خالہ بیمار ہوئیں اور سخت تکلیف کا سامنا ہوا۔ دست قے کچھ نہ تھے اسفل معدہ میں درد تھا جس نے بے چین کر رکھا تھا۔ حکیم مولوی محمد تقی صاحب اپنی خالہ کے معالج تھے دوائیں پلاتے تدبیریں کرتے کئی روز گزر گئے مگر مریضہ کو کوئی نفع محسوس نہ ہوا۔ حضرت مولانا کی عمر اس وقت کم و بیش ۲۲ سال کی تھی، مانی نے آپ سے شکایت کی کہ ”مجھے محمد تقی کی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا بیٹے تو بھی بڑا عالم فاضل ہے تو ہی کچھ کر اور کوئی دوا ایسی بتا جس سے میری تکلیف رفع ہو۔“ حضرت مولانا قدس سرہ نے اس وقت سکوت فرمایا اور کچھ جواب نہ دیا مگر مانی کی بے حد تکلیف پر دل میں خیال ضرور پیدا ہو گیا کہ اس طرف توجہ کروں چنانچہ آپ وہاں سے اٹھے اور میزان الطب میں معدہ کی بحث نکال کر مطالعہ شروع فرمایا (۱)، غرضیکہ حضرت مولانا نے مانی صاحبہ کا علاج فرمایا حکم خدا سے وہ صحت یاب ہو گئیں۔ اس سے مستورات میں چرچا ہو گیا اور پرانے پرانے مریض ٹوٹ پڑے، اللہ تعالیٰ نے آپ کے دست مبارک میں شفا رکھ دی جو مریض آتا آپ ”اکسیر اعظم“ اور ”میزان الطب“ کو غور سے دیکھ کر اس کی تشخیص و تجویز فرماتے، نتیجہ اس کو آرام آ جاتا۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حضرت مولانا حکیم مسعود احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے خاصے واقعات کا ذکر فرمایا ہے، ہمیں اس پورے قصے میں جو بات نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سے چونکہ ایک بڑا کام لینا چاہتے تھے۔ لہذا آپ کی طرف لوگوں کو متوجہ اور راغب کر دیا۔ اور یہ کہ آپ کو اپنی متوکلانہ زندگی میں کسی کا احسان نہ اٹھانا پڑے۔ اور بغیر کسی قسم کا کوئی دنیاوی کاروبار کئے۔ آپ کی قوت لایموت کا سامان فراہم ہوتا رہا۔ چنانچہ آپ نے مطب کو بھی بطور پیشہ کے اختیار نہ کیا بلکہ خدمتِ خلق کا رجوع دیکھ کر انسان دوستی خدا ترسی اور شفقت کی نگاہ سے اس کو کرتے تھے (۲) اور اس سے اتنا ہی شروع میں

(۱) تذکرۃ الرشید ص ۶۳ (۲) اور تھوڑے عرصہ کے بعد پھر اسے بھی چھوڑ دیا اور بالکل متوکل ہو گئے۔

حاصل ہوتا تھا کہ بمشکل گزارا ہوتا تھا، تذکرۃ الرشید میں آپ کے مشہور و معروف چند نسخوں اور ان کے اجزا کا بھی ذکر آیا ہے۔ دلچسپی رکھنے والے اصحاب تذکرۃ الرشید کا مطالعہ فرمائیں ہم نے یہاں اس کا مختصر ذکر کیا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ علم طب کی پیغمبر علیہ السلام نے تعریف فرمائی ہے اور یہ خدمت خلق اور غمگساری و ہمدردی کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہے بشرطیکہ اسی

نیت سے کیا جائے۔

بہتر ہے وہی خلق میں جو خلق خدا کو پہونچائے نفع، عام ہے جان کا ہو کہ تن کا
بس علم تو دو ہی ہیں بحکم شہ لولا کہ ایک علم رہ دین دوم علم بدن کا

تحریک آزادی اور حضرت گنگوہی

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ سمیت ان حضرات نے جو حصہ لیا اس کا اجمالاً تذکرہ آپکا ہے تفصیل کی نہ وہاں گنجائش تھی نہ یہاں، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تینوں حضرات کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت غار ثور پر عمل کرتے ہوئے تین دن روپوش رہے اور چونکہ غار ثور میں روپوشی کے دنوں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر دشمن قابونہ پاسکے تھے اسی طرح اس ہندی نژاد محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن کی روپوشی کے بعد (باوجودیکہ وارنٹ گرفتاری جاری اور پولیس تلاش کر رہی تھی) خلاف سنت ہونے کی وجہ سے جب مزید روپوشی سے انکار کر دیا تو سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع کے صدقے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری عمل میں نہ آئی، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہجرت کا ارادہ فرمالیا اور خفیہ طریقے سے ساحل کی راہ لی

شیخ کی محبت

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے روانہ ہونے کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ کی مفارقت کا بے پناہ صدمہ تھا، آپ کو اس صدمہ میں نیند نہیں آتی تھی، یہی خواہش تھی

کہ کسی طرح ایک مرتبہ اور زیارت کر لوں۔ لیکن شیخ کی جائے قیام کا علم نہ تھا بصدقت پتہ چلا کہ آپ پنجلا سے ہیں، چنانچہ وہاں پہنچے، ملاقات ہوئی زیارت سے مشرف ہوئے، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے بے حد اصرار کیا کہ مجھ کو بھی اپنے ہمراہ لے لیجئے۔ مگر حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ راضی نہ ہوئے اور فرمایا۔

”میاں رشید احمد تم سے تو حق تعالیٰ نے بہتیرے کام لینے ہیں گھر اومت ہندوستان سے نکلتے وقت تم سے ضرور ملوں گا۔“ اور حاجی صاحب نے ملاقات کا یہ وعدہ پورا فرمایا۔

رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی گرفتاری کا قصہ آگے آ رہا ہے، حاجی صاحب رحمہ اللہ کا ذکر آیا ہے تو دو واقعات کا ذکر یہیں کر دینا مناسب ہے، حضرت مولانا رحمہ اللہ کی گرفتاری اور جیل جانے پر ایک دفعہ یہ خبر پھیلی کہ ان کو پھانسی کا حکم ہو گیا ہے، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کو بھی یہ خبر پہنچی، تذکرۃ الرشید میں ہے:-

براویت مولوی ولایت حسین اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ایک دن فرمانے لگے کہ ”میاں کچھ سنا کیا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا؟“ خدام نے عرض کیا کہ حضرت کچھ پتہ نہیں، ابھی تک تو کوئی خبر نہیں آئی، فرمایا ”ہاں حکم ہو گیا چلو“ یہ فرما کر اٹھ کھڑے ہوئے، حکیم صاحب کا بیان تھا کہ برسات کا زمانہ تھا مغرب کے بعد اعلیٰ حضرت اور غالباً مولوی مظفر حسین صاحب کا ندھلوی غرض تین آدمی چلے شہر سے نکل کر تھوڑی دور جا کر اعلیٰ حضرت زمین کی گھاس کے قدرتی سبز مخملی فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر سکوت فرما کر گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا ”پھر چلو مولوی رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا خدائے تعالیٰ کو ان سے ابھی بہت کچھ کام لینا ہے“ چنانچہ چند روز بعد اس کا ظہور ہو گیا..... والحمد للہ علیٰ ذالک۔

ایک اشکال اور اس کا حل

پچھلی سطور میں گزرا ہے کہ حاجی صاحب رحمہ اللہ نے مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کی اس استدعا

پر کہ میں بھی آپ کے ہمراہ چلوں گا فرمایا تھا کہ ”تم سے تو حق تعالیٰ نے ابھی بہتیرے کام لینے ہیں“ جب یہ بات منکشف ہو چکی تھی تو پھر پھانسی کی خبر کا کیوں یقین کیا، اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ کشف کا تعلق امور باطن سے ہے اور خبر احکام ظاہر سے تعلق رکھتی ہے، کشف کے مقابلہ میں جب خبر آجائے تو اس کا تبیین ایک فطری امر ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کی تعلیم ہے۔ اگرچہ خبر دینے والا فاسق ہی کیوں نہ ہو، ہاں اگر کسی مطلق خبر کی تردید پھر کشف سے ہو جائے تو اس سے پہلے کشف کو اتنی قوت ضرور مل جائے گی کہ وہ مطلق خبر کی تردید کر سکے۔ جس خبر کی تردید نہیں ہو سکتی وہ صرف خبر عدل ہے، علامہ خالد محمود عقیدۃ الامت کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:-

”نبوت پر جس غیب کا اظہار ہو اس میں قطعیت ہوتی ہے اور وہ اخبار غیبیہ یقینی طور پر معصوم ہوتی ہیں۔ جن میں شک، وسوسے یا شیطان کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہو سکتا اور نبوت کے علاوہ جتنے بھی مقامات ہیں جن میں کہ بعض اخبار غیبیہ کا اظہار ہوتا ہو ان میں وہ قطعیت نہیں ہوتی کہ ان پر احکام شرع یا احکام عدالت کی بنا رکھی جاسکے۔“ (عقیدۃ الامت ص ۴۸)

اعلیٰ حضرت وعدہ خلاف نہ تھے

حضرت مولانا رحمہ اللہ سے ایک دفعہ کسی نے سوال کیا کہ حضرت حاجی صاحب نے تو آپ سے حجاز روانہ ہونے سے پہلے ایک ملاقات کا وعدہ فرمایا تھا مگر آپ جیل میں رہے اور رہائی سے قبل حضرت عازم حجاز ہو گئے یہ وعدہ کب پورا ہوا۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے بہت ہی ہلکی آواز میں فرمایا ”اعلیٰ حضرت وعدہ خلاف نہ تھے“ چنانچہ دوسرے طرق سے معلوم ہوا کہ حضرت حاجی صاحب باوجود سنگین پہرہ کے جیل میں حضرت مولانا سے جا کر ملے، کئی گھنٹے باتیں کر کے شب ہی میں واپس ہوئے اور عرب کو روانہ ہوئے۔

گرفتاری اور زنداں

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ پنبلا سے گنگوہ تشریف لائے، یہاں ان کے احباب نے اصرار کیا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ کی گرفتاری کا وارنٹ نکل چکا ہے چنانچہ اپنی

دادھیال قصبہ رامپور تشریف لے گئے۔ اور حکیم ضیاء الدین کے مکان میں مقیم ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد گارڈن کرنیل فرانسسیسی غلام علی سکند قصبہ ملی پور ضلع سہارنپور منجر کے ہمراہ ستر سواروں کے ساتھ گنگوہ پہنچا اور آتے ہی مولانا کی تلاش کی، سوار ادھر ادھر پھیل گئے، مسجد اور خانقاہوں کے حجروں کو دیکھا، ان کے ملنے والوں کے مکان کی تلاشی بھی لی، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں زاد بھائی ابوالنصر صاحب جو صورت و وضع میں حضرت سے بہت مشابہت رکھتے تھے مسجد کے گوشہ میں گردن جھکائے مراقبہ میں بیٹھے تھے کہ دوڑ کر سپاہی نے گردن پر زور کا ہاتھ مارا اور قبضہ میں لے کر پکارا چل کھڑا ہو، کیا گردن جھکائے بیٹھا ہے، مولوی ابوالنصر نے گردن اٹھائی اور جدھر اس نے کہا چل کھڑے ہوئے۔ حضرت مولانا کے دروازے پر ان کو لا کھڑا کیا اور کہا کہ گھر کی تلاشی دلوا اور دکھا کیا کیا ہتھیار ہیں۔ عرصہ تک مولوی ابوالنصر مار کھاتے ذلت سہتے رہے مگر یہ نہیں بتایا کہ میں مولوی رشید احمد نہیں ہوں، جب فوجیوں کو معلوم ہوا کہ یہ مولانا رشید احمد نہیں ہیں اور ان کو حکیم امین بخش نے بتلایا کہ حضرت مولانا رامپور میں ہیں، اس وقت مولوی ابوالنصر کی رہائی ہوئی۔ فوجی رام پور پہنچے اور مولانا گنگوہی کو حکیم ضیاء الدین صاحب کے مکان سے گرفتار کر لیا، آپ کے چاروں طرف محافظ پہرہ دار تعینات کر دیئے گئے اور بند بھلی میں آپ کو سوار کر کے سہارنپور روانہ کیا، بیل تیز رفتار تھے اور حکم یہی تھا کہ جلد سے جلد لے جاؤ اس لئے کچی سڑک پر وہ خاک اڑتی تھی کہ راہ گیروں کی آنکھیں اندھی ہو جاتی تھیں، مولوی ابوالنصر پریشان اور ان کے بوڑھے باپ مولوی عبدالغنی جنہوں نے مولانا کو پرورش کیا تھانگے پاؤں پیادہ سواروں کی تیز رفتاری کا مقابلہ کرتے بھلی کے پیچھے پیچھے آرہے تھے، صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا عالم پریشانی میں ڈوبے ہوئے غبار سے آنکھیں بند بول کے کانٹوں سے پاؤں زخمی، خدا جانے کہاں جا رہے تھے اور کس طرف قدم اٹھ رہا ہے آخر ایک جگہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، حضرت مولانا سہارنپور پہنچتے ہی جیل خانے بھیج دیئے گئے اور جنگی پہرہ کی نگرانی لگادی گئی۔

مولانا عبدالغنی کو جب ہوش آیا وہ پھر دوڑے راستہ میں سہارنپور کے ایک صاحب نے بتایا کہ مولانا سہارنپور کے جیل خانہ میں ہیں، مولانا عبدالغنی خود بھوکے پیاسے تھے مگر ان کو حضرت کی بھوک کا زیادہ خیال تھا، چنانچہ انہوں نے نانوتہ کے کسی کیلی برادر کی معرفت

حضرت کو کھانا پہنچایا، وہاں سے کنکریوں پر کوئلہ سے لکھا ہوا یہ فقرہ ان کے پاس پہنچا کچھ مت گھبراؤ بحمد اللہ آرام میں ہوں۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ جن کے والد ماجد مولوی محمد تقی صاحب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شہید ہو چکے تھے، انہوں نے جب حضرت کی گرفتاری کی خبر سنی تو خدا کا شکر ادا کیا کہ حق کی راہ میں باپ شہید ہوا اور خاوند جیل میں ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی تین چار یوم کال کوٹھری میں بند رہے اور پندرہ روز جیل خانہ میں رہے۔ تحقیقات اور پیشی پر پیشی ہوتی رہی، آخر عدالت سے حکم ہوا کہ واقعہ تھانہ بھون کا ہے اس لئے مقدمہ مظفر نگر منتقل کیا جائے۔ چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی ننگی تلواروں کے پہرہ میں دیوبند کے راستہ سے دوپڑاؤ کر کے پایادہ مظفر نگر لائے گئے اور مظفر نگر کے جیل خانہ کی حوالات میں بند کر دئے گئے۔ دیوبند کے قریب سے جب مولانا گنگوہی گزرے تو مولانا محمد قاسم صاحب مقررہ راستہ سے کچھ ہٹ کر بغرض ملاقات پہلے سے آکھڑے ہوئے تھے، گو خود بھی ان کا وارنٹ تھا اور روپوش زندگی گزار رہے تھے۔ بیتابی شوق نے اس وقت انہیں چھپنے نہیں دیا، دور سے سلام ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرائے۔

ثابت قدمی اور رہائی

مظفر نگر کے جیل خانہ میں آپ کو تقریباً چھ ماہ رہنے کا اتفاق ہوا، اس زمانہ میں آپ کے استقلال، عزم، ہمت اور ارادوں میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک آپ کی نماز ایک وقت بھی قضا نہیں ہوئی، حوالات کے دوسرے قیدی آپ کے معتقد ہو گئے تھے ان میں سے بہت سے آپ کے مرید ہوئے، باجماعت جیل خانہ کی کوٹھری میں نماز ادا کرتے تھے، ارشاد ظاہری و باطنی سے آپ کسی دن غافل نہیں ہوئے۔ وعظ و پند اور نصیحت کے ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ لوگوں کو سناتے اور وحدانیت کا سبق دیا کرتے تھے۔ جب عدالت میں جاتے جو دریافت کیا جاتا ہے تکلف اس کا جواب دیتے، آپ نے کبھی کوئی کلمہ دبا کر یا زبان موڑ کر نہیں کہا کسی وقت جان بچانے کی کوشش نہیں کی۔ جو بات کہی سچ کہی اور جس بات کا جواب دیا خدا کو حاضر ناظر جان کر واقعات اور حقیقت حال کے مطابق دیا، پوچھا گیا کہ تم نے سرکار کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے، تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا، کبھی حاکم دھمکاتا، ہم تم کو پوری سزا دیں گے۔ آپ فرماتے کیا مضائقہ ہے، بالآخر چھ مہینے جیل میں رہنے کے بعد آپ کی رہائی ہوئی۔

رہائی کے بعد خفیہ نگرانی

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ رہا تو ہو گئے تھے لیکن ان پر سی آئی ڈی کا پہرہ مرتے دم تک تھا، مریدوں کے روپ میں، مہمان کی شکل میں، مرید بننے کے بہانے سے آتے اور اپنا کام کر کے چلے جاتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک شخص تشریف لائے اور اس درجہ عقیدت کا اظہار کیا کہ کوئی ان پر شک نہیں کر سکتا تھا کہ یہ حضرت کے معتقد نہیں ہیں، جس وقت حضرت کے سامنے آئے اور درخواست بیعت کی تو حضرت نے جھڑک دیا اور فرمایا جاؤ میرے یہاں تمہارا کام نہیں، میں ہرگز مرید نہیں کروں گا، یہ حضرت روئے اور حضرت کے متعلقین سے سفارش کرائی، مگر جس نے بھی سفارش کی اس کو بھی یہی جواب ملا، میں کہہ چکا ہوں کہ نہیں مرید کروں گا اس کو کہہ دو یہاں نہ ٹھہرے۔ اگر نہ جائے تو نکال دو اور اسباب باہر پھینک دو، حضرت کی اس اس بے رخی پر لوگوں کو بھی افسوس ہوا، مگر سوائے تعمیل حکم کے کوئی چارہ نہ تھا، اس کا اسباب خانقاہ سے باہر کر دیا اس پر بھی وہ حسن عقیدت کا اظہار نہ چھوڑتا تھا اور رورو کر کہتا، کچھ بھی ہو میں تو ضرور بیعت ہوں گا، حکیم محمد یوسف صاحب کو اسکی حالت دیکھ کر ترس آیا۔ اس کو اپنی بیٹھک میں ٹھہرا کر وعدہ کیا کہ میں حضرت سے سفارش کروں گا کہ تمہیں مرید فرمائیں۔ دوسرے دن حکیم صاحب حضرت کی خدمت میں گئے کہنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ حضرت نے خود فرمایا کہ آنے والا کہاں ہے، تم نے اسے کیوں ٹھہرا رکھا ہے، کرایہ کا انتظام کر دو اور کہہ دو چلتا بن۔ اب ان الفاظ کے بعد حکیم صاحب خاموش ہو کر چلے آئے بیٹھک میں قدم رکھا تو دیکھا کہ مسافر کتاب کھولے کچھ لکھ رہا ہے۔ حکیم صاحب کے آتے ہی جلدی سے کتاب بند کر کے جزدان میں لپیٹ جمائل بنا کر گلے میں ڈال لی۔ اب حکیم صاحب مشتبه ہو گئے، خیال پیدا ہوا کہ جمائل کو دیکھا جائے اس میں کیا ہے، حکیم صاحب نے ایک رات مسافر کو باتوں میں لگائے رکھا۔ کافی رات تک باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ وہ نیند کے غلبہ سے عاجز آگیا، جب انہوں نے دیکھا کہ یہ سونا چاہتا ہے تو یہ کہہ کر چلے آئے اچھا اب سو جائیے۔ مسافر لیٹا اور لیٹتے ہی گہری غفلت کی نیند سو گیا اس وقت انہوں نے اسکی گردن میں سے جمائل نکالی، لیمپ کے سامنے لا کر کھولی تو کہیں انگریزی

کہیں فارسی کہیں اردو اور کہیں عربی لکھی ہوئی ہے۔ عجلت کے ساتھ ورق گردانی کی تو ایک صفحہ پر کسی انگریز حاکم کے نام چٹھی کی نقل پر نظر پڑی جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے گورنمنٹ کی خیر خواہی میں جان تو جان اپنے ایمان کی بھی پرواہ نہیں کی مگر افسوس میری قدر جیسی ہونی چاہئے تھی ویسی نہ ہوئی، اس عبارت کو دیکھ کر حکیم صاحب کانپ اٹھے اور کتاب بند کر کے اسی طرح مسافر کے گلے میں حائل ڈال کر چلے گئے، علی الصباح کرایہ کاٹو لیا اور اس کو رخصت کر دیا، حکیم صاحب حضرت کی خدمت میں آئے تو حضرت مسکرائے اور آہستہ سے فرمایا ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا اس کو روانہ کر دو تم ہی نہیں مانے۔

درس و تدریس

گرفتاری سے رہائی کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے باوجود مسند آرائے تلقین و ارشاد ہونے کے درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا، گویا علوم باطنی کے ساتھ ظاہری علوم شرعیہ و فنون کی تعلیم میں بھی مشغول ہو گئے۔ اسی دوران میں آپ نے تیسرا حج کیا اور اس کے بعد ایک سال میں صحاح ستہ کے دورہ کو ختم کرانے کا آپ نے التزام کیا اور اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر دیا، چنانچہ درس حدیث کا یہ سلسلہ ۱۲۶۵ھ سے لے کر ۱۳۱۲ھ تک انچاس سال چلتا رہا اور اس دوران میں تین سو سے زائد حضرات نے آپ سے دورہ حدیث کی تکمیل کی، آپ کے سب سے پہلے شاگرد (گنگوہ میں) سید مومن علی تھے جنہوں نے آپ سے شرح جامی پڑھنا شروع کی اور آخری شاگرد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جس سال حضرت مولانا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دورہ حدیث پڑھا ہے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بینائی جا رہی تھی اور آنکھوں میں پانی اتر رہا تھا، یہ آپ کا آخری سال تھا اس کے بعد فتاویٰ اور ارشاد و تلقین کا سلسلہ تو جاری رہا لیکن تعلیم دینا ترک کر دیا، انچاس سالہ تعلیمی دور میں آپ سے پڑھنے والے ہند، برما، کابل، افغانستان ہر جگہ سے آئے بعض سالوں میں ستر اسی طلبہ کا مجمع رہا۔

طریقہ تدریس

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایسے محدث تھے کہ جن میں اجتہاد و استنباط کی تمام صلاحیتیں

بدرجہ اتم موجود تھیں، حافظہ و ثقاہت، تقدیس و تبحر، فراست و ہمہ دانی، خوبی تطبیق و ارتباط، جودت ذہن اور اتقان و عدالت جتنے اوصاف و خوبیاں ایک اچھے محدث استاد میں پائی جانی ضروری ہیں ان تمام سے آپ متصف تھے، آپ کے درس حدیث میں ایک خاص خوبی تھی کہ مضمون حدیث سن کر اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا، یہ خاص اثر اس لئے تھا کہ اس دور میں آپ ہر فرد سے زیادہ شیعہ سنت تھے۔ آپ صحیح معنوں میں محب رسول اور شیدائی سنت تھے، آپ کی تدریس میں محویت کا ایسا عالم ہوتا تھا کہ ہر شریک درس کو یہ خواہش ہوتی کہ سلسلہ درس دراز ہو اور جب سبق ختم ہوتا تو خیال ہوتا کہ ابھی تشنگی باقی ہے کاش سبق جاری رہتا۔ لیکن جب سبق کے اوراق و صفحات شمار کئے جاتے تو حیرت ہوتی کہ اس قدر سبق کیونکر ہو گیا، آپ کی تقریر کے بعد کتب شروح اور حواشی دیکھنے کی مطلق ضرورت نہ رہتی تھی اور یوں خیال ہوتا تھا کہ تمام شرحوں اور تفصیلات کا خلاصہ حضرت نے سامنے کر دیا ہے۔

صحاح میں سب سے پہلے عموماً جامع ترمذی شریف شروع کراتے ہر حدیث کا ترجمہ اور معنی سلیم اور عام فہم الفاظ میں بیان فرماتے اور نفس مطلب کو اس طرح کھول کر بیان کرتے کہ کوئی الجھن باقی نہ رہتی، اس کے بعد اگر تلاوت کی گئی حدیث کا بظاہر کسی دوسری حدیث یا کسی آیت قرآن سے تعارض نظر آتا تو اس کو رفع فرماتے۔ بقدر ضرورت اسماء الرجال ذکر کرتے رواۃ کی پوری تحقیق، توثیق، تضعیف بیان فرماتے اگر سیاق و سباق میں کوئی مخفی ارتباط ہوتا تو اس کو کھولتے۔ طلبہ کے اعتراضات پر ذرا چین جبیں نہ ہوتے، ایک دفعہ ایک طالب علم قرأت کر رہا تھا ”عطارہ“ کا لفظ آیا اس نے سمجھ لیا کہ یہ عطر سے مشتق اور اس کا فلاں معنی ہے بلا تکان آگے پڑھتا چلا گیا، ایک پٹھان طالب علم کو سمجھ نہ آیا۔ اس نے قاری کے کہنی ماری اور کہا کہ ٹھہرو ہم نہیں سمجھا عطارہ معنی اچہ؟ حضرت نے فرمایا ”زوجہ عطر فروشہ“ قاری پڑھنے لگا اس نے پھر کہنی ماری اور کہا حضرت ”عطارہ معنی اچہ؟ ہم نہیں سمجھا“ آپ نے فرمایا ”عطر فروش کی بیوی“ قاری پھر پڑھنے لگا، پٹھان نے تیسری دفعہ کہنی ماری اور تیز نظر سے دیکھا۔ اور کہا، ”ٹھہرو ہم نہیں سمجھا عطارہ کا معنی“۔ اس مرتبہ امام ربانی رحمہ اللہ نے اونچی آواز سے فرمایا ”عطر بیچنے والے کا جو رو“ اب پٹھان خوش ہوا اور کہا ”ہاں سمجھا ہاں بھائی چلو“ اس لطیفہ یا حکایت سے قارئین بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت کسی سوال پر خفا نہیں ہوتے تھے۔

ترمذی شریف کے ختم ہونے پر صحاح کی دوسری کتابیں ہوتیں ان میں ترجمہ نہ ہوتا، البتہ

کوئی نئی حدیث آتی یا مولف کی عبارت ہوتی تو اس کا معنی و مطلب مثل سابق بیان فرماتے۔ حضرت تو ہر وقت ہی الوضو و سلاح المومن“ وضو مومن کا ہتھیار ہے کے نظریے سے مسلح رہتے لیکن حدیث شریف کے درس میں تمام طلباء کو با وضو رہنے کی صراحتاً ہدایت فرمایا کرتے، پڑھاتے وقت خوش رو رہتے تاکہ سائل کو سوال کرنے میں جھجک نہ ہو، اگر کبھی طلبہ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو کوئی ایسی لطیف حکایت یا واقعہ بیان فرماتے کہ طلبہ کی تکان دور ہو جاتی حضرت مولانا مذہب حنفیہ کی اگرچہ مدلل مکمل ترجیح کرتے جاتے مگر کیا مجال کہ کسی جگہ کسی دوسرے فقیہ یا امام کی ذرا سی تنقیص ہو جائے، فرمایا کرتے کہ مجھے حنفی مسلک سے خاص محبت ہے اور اس کی حقانیت پر کلی اطمینان ہے، اگر کسی طالب علم نے کوئی ایسی بات کہہ دی کہ جس سے دوسرے مسلک کی توہین و تنقیص کا پہلو نکلتا تو فوراً عملاً اس کی اصلاح فرماتے، یہاں تک کہ نفس تقلید میں بھی تعصب کا حد سے بڑھنا آپ کو پسند نہ تھا، بعض طلبہ تشدد و عصبیت میں محدثین کے متعلق کوئی ذرا ناگوار کلمہ کہہ دیتے تو حضرت کے چہرہ پر کراہت کے آثار پیدا ہوتے اور فوراً امام بخاری رحمہ اللہ اور دیگر مذاہب کی ترجیح مذہب حنفیہ پر ظاہر کرتے اور فرماتے کہ ان حضرات نے ان وجوہ کی بناء پر اس مسلک کو اختیار کیا ہے جب طلبہ کی بدظنی دور ہو جاتی تو پھر آگے چلتے۔

کسر نفسی اور تواضع

باوجود اس فضل و کمال کے آپ نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے اور کبھی اپنے آپ کو کسی دوسرے پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت نے ایسی بلیغ تقریر فرمائی کہ طلبہ جھوم گئے اور بے اختیار درس ہی میں حضرت کے سامنے آپ کی تعریف کرنے لگے آپ نے بے رباختہ قسم کھا کر فرمایا..... ”میں اپنے کو تم میں سے کسی کے برابر بھی نہیں سمجھتا چہ جائیکہ زیادہ سمجھوں“ آپ کو قسم کھانے کی مطلق عادت نہ تھی لیکن اس موقع پر بلا اختیار قسمیہ الفاظ آپ سے صادر ہو گئے۔

طلبہ کے جوتے اٹھائے

ایک دفعہ درس حدیث میں بارش شروع ہو گئی، طلبہ نے جلدی جلدی کتابیں اور تپائیاں

(کتابیں رکھنے والی چھوٹی چھوٹی میز) اٹھائیں اور چل دیئے اس کے بعد طلبہ نے دیکھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کندھے کی چادر میں طلبہ کی جوتیاں ڈالی ہوئی ہیں اور اٹھائے چلے آرہے ہیں طلبہ بہت نادام و حیرت زدہ ہوئے، فرمایا کہ۔

”اس میں کوئی بری بات ہے تمہاری خدمت کرنا تو میری نجات کا باعث ہے طلبائے دین کے لئے تو حدیث شریف کے الفاظ میں مچھلیاں سمندر میں، چیونٹیاں بلوں میں دعا کرتی ہیں اور فرشتے تمہارے قدموں کے نیچے اپنے پر بچھاتے ہیں اور تم تو مہمانان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو کہ حدیث پڑھنے آئے ہو“

طلبہ پیارے پیغمبر کے مہمان ہیں

حضرت طلبہ کی مدارات اور عزت و تکریم میں ہر وقت کوشاں رہتے اگر کسی کو کوئی غم یا فکر لاحق ہوتا تو صبر و تسلی کے کلمات سے تسکین بخشتے، جس طرح ان کے اپنے دل میں طلبہ دین کی عزت تھی، چاہتے تھے کہ دوسرے بھی ان کی اسی طرح عزت کریں۔ آپ کو یہ ہرگز گوارہ نہ تھا کہ کوئی ان کو بنظر حقارت دیکھے۔ ایک طالب علم کا کھانا کسی جگہ لگایا ہوا تھا اس کو دیکھا کہ کھانا کھلا ہوا بغیر کسی کپڑے وغیرہ کے لا رہا ہے۔ پوچھا کہاں کھانا مقرر ہے؟ اس نے آپ کے کسی رشتہ دار کا نام لیا فرمایا کہ اچھا اب وہاں سے کھانا نہ لانا، ہمارے گھر سے آیا کریگا ادھر اپنے رشتہ دار سے ناراضگی کے کلمات کہلا بھیجے کہ اس وجہ سے ان کو اس طرح کھانا دیتے ہو کہ یہ پردیسی ہیں ان کو دروازہ کا فقیر سمجھا گیا سو کیا مضائقہ ہے۔ ”ملک خدا تنگ نیست پائے گدالنک نیست“ تم اپنی روٹی اپنے پاس رکھو خدا ان کا اور جگہ انتظام کر دیگا“ وہ عفت مآب عورت جن کے گھر سے کھانا آتا تھا حاضر ہو کر معذرت خواہ ہوئیں اور خطا معاف کرائی اور کہا آئندہ دستر خوان میں کھانا ڈھک کر تعظیم کے ساتھ پیش کیا کروں گی، آپ نے منظور فرمایا۔

طلبہ کے عقائد و اعمال کی نگرانی

آپ ایک وقت طلبہ کے استاد بھی تھے اور شیخ بھی، اگرچہ طلبہ آپ سے رسمی بیعت نہ

کرتے ہوں تاہم آپ دونوں چیزوں کو ملحوظ رکھ کر طلبہ کی ہر طرح اصلاح و تربیت فرماتے تھے آپ کی زندگی کا مشن ہی یہ تھا کہ لوگوں کے عقائد و اعمال درست کئے جائیں۔ شرک و بدعت کا رد کیا جائے تاہم سبق پڑھاتے وقت اس کا بہت زیادہ اہتمام تھا، شرک و بدعت کا جگہ جگہ قلع قمع فرماتے۔ توحید و اتباع سنت کی ترغیب دیتے صرف زبانی نصیحت پر اکتفا نہ فرماتے بلکہ ضرورت پڑنے پر تیزی اور سختی بھی فرماتے اور اس کے ساتھ توجہ قلبی اور روحانی فیضان سے تاریک دلوں کو منور کرتے اور زنگ دور فرماتے، بعض اوقات طلبہ کا پورے کا پورا حلقہ محو حیرت ہوتا کہ جلسہ کا جلسہ آسمانی سکنیت کے نزول کا احساس کر رہا ہے۔ سلوک و معرفت کے حقائق دوران درس بیان فرماتے کہ طلبہ کو وجد آجاتا۔ غرضیکہ طلبہ کی ہر طرح دیکھ بھال کرتے ان کی نشست و برخاست، چال ڈھال، گفتار و کردار، وضع قطع ہر چیز کا خیال رکھتے اگر کسی طالب علم کو دیکھتے کہ وہ اپنے پڑھے ہوئے عمل پیرا نہیں ہے تو جب تک اس میں خوشگوار تبدیلی پیدا نہ ہو جاتی آپ بے چین رہتے۔

فراست ایمانی

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ”مومن کی فراست سے بچو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے“ حضرت مولانا طلبہ کی ہر وقت کڑی نگرانی رکھتے تھے، اگر کوئی طالب علم ایسا نظر آتا کہ اس کے متعلق یہ محسوس فرماتے کہ اس میں کچھ کجی ہے جو درست نہیں ہو سکتی اور یہ پڑھ لکھ کر لوگوں کو گمراہ کرے گایا پھر سلسلہ کی بدنامی کا باعث ہو گا تو اس کو سبق شروع نہ کراتے۔ بطائف الخیل ٹال دیتے یا روکھا پین دکھاتے کہ وہ خود ہی چلا جائے ہاں جس طالب علم کو سعید پاتے تو اس کی دلداری فرماتے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے۔

ہدایہ کی تعلیم

آپ کتب حدیث کے علاوہ دوسرے فنون و علوم کی کتب بھی پڑھاتے تھے۔ لیکن فلسفہ و منطق سے آپ کو نفرت تھی لہذا دوران تدریس ان کتابوں کو نہیں پڑھایا بلکہ ان علوم سے بے رغبتی دلانے کی کوشش کرتے۔ شروع میں آیا کہ سید مومن علی آپ کے گنگوہ میں پہلے شاگرد تھے اور ان کو آپ نے شرح جامی پڑھانا شروع کی۔ مدرسہ مصباح العلوم بریلی کے ایک مدرس ذکر

کرتے تھے کہ میں نے ہدایہ جلد ثانی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی اور اس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ چودھویں مرتبہ ہے کہ تم کو پڑھا رہا ہوں۔ جس انسان نے فطرتاً ذہنی اور دماغی صلاحیتوں سے بہرہ وافر پایا ہو اور پھر مولانا مملوک علی ایسے یگانہ روزگار استاد سے تعلیم حاصل کی ہو اور ان سے اپنی ذہانت و ذکاوت کی تحسین کرائی ہو وہ انسان جب صحاح اور دیگر کتب کو بیسیوں مرتبہ پڑھائے گا تو اس کے تجربہ علمی و فقہی کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔

سہ دری کا قصہ

گذشتہ اوراق میں معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت نے قدوسیہ حجرہ کو نشست کی جگہ بنالیا تھا اسی میں مطب تھا اور اسی میں اول اول پڑھانا شروع کیا۔ جب طلبہ کی تعداد بڑھی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اب مزید کوئی کمرہ تعمیر ہو، آپ کا بھی خیال ہوا اور خدام نے بھی اصرار کیا، چنانچہ مخلص احباب کے اصرار اور کچھ امداد پر آپ نے اپنی طرف سے باقی رقم ڈال کر حجرہ کے سامنے ایک مختصر سہ دری بنوائی۔ اس دوران میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت و ناموری ہو چکی تھی جب آپ نے حجرہ قدوسیہ صاف کر کے اس میں نشست رکھی تو خانقاہ سے نسبت کرنے والے پیرزادے خاموش رہے بلکہ خوش ہوئے کہ ایک غلیظ گندگی کی جگہ صاف ہو گئی، مگر اب جب دیکھا کہ حضرت کی طرف خلق خدا کا رجوع ہو رہا ہے تو ان کو اپنی دکانداری ختم ہوتی نظر آئی۔ اور حسد و رقابت کی آگ میں جلنے لگے، حضرت کا رد شرک و بدعت بھی ان کو حد درجہ ناگوار تھا کہ ان میں بیشتر اس قسم کی برائیاں گھر کر چکی تھیں لیکن انہیں کوئی بہانہ ہاتھ نہ آتا تھا کہ آپ کی مخالفت کریں، کئی سال گزر گئے لیکن اب جب حضرت نے سہ دری بنوائی تو مشورے ہونے لگے کہ ”آج مولوی رشید احمد نے سہ دری بنائی ہے کل کو کچھ اور عمارت بنوا کر اپنی ملکیت کا دعویٰ کریں گے چلو ان کو اس مکان سے بے دخل کریں اور جو کچھ لاگت اس تعمیر میں لگی ہے وہ ان کو دے کر قبضہ چھڑائیں۔“ چنانچہ پیرزادے اکٹھے ہو کر آپ کے پاس آئے اور حرف مطلب زبان پر لائے۔ حضرت کی خداداد ہیبت اور خدام و طلباء کی تعداد کی بنا پر ایک خاصا مجمع بنا کر آئے تھے کہ اگر لڑائی کرنا پڑی تو کریں گے حضرت کو جب علم ہوا کہ یہ اس لئے آئے ہیں تو فرمایا۔

”بہت اچھا اتنی سی بات کیلئے مجمع کے آنے کی کیا ضرورت تھی اگر کسی ادنیٰ آدمی اور اپنے

یہاں کے نائی دھوبی سے بھی یہ پیام کہلا بھیجتے تب بھی مجھ کو چھوڑ دینے میں تامل نہ ہوتا۔“ یہ فرما کر اتنی لاگت جو آپ کی جیب خاص سے خرچ آئی تھی لے کر اسی وقت طلبہ سے فرمایا کہ بستر کپڑے اور کتابیں وغیرہ سب نکال لو اور حجرہ خالی کر دو..... اندازہ کیجئے کہ جب اس حجرہ میں گھوڑے اور گدھے باندھے جاتے تھے اور دھوبیوں نے اس پر قبضہ جما رکھا تھا اس وقت شیخ رحمہ اللہ کی اولاد میں سے کسی پیر زادے کو خیال آیا نہ دل دکھا۔ مگر اب جب اس میں قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کا نغمہ گونجا اور روح افزا باد نسیم سے لہرانے والے درختوں کا باغ جمایا گیا تو ان پیر زادگان کو قبضہ کی سوچ بھی۔

بہر حال حضرت نے فوراً جگہ خالی کر دی اور ایک دن کی بھی مہلت نہ مانگی کپڑے وغیرہ گھر پہنچا دئے۔ کتابیں مسجد میں لا کر رکھ دیں اور اپنا عصا اور تسبیح ہاتھ میں لے کر مسجد میں قبلہ رخ آ بیٹھے، ذرا بھی خیال نہ آیا کہ برسہا برس سے اس جگہ رہ رہا ہوں۔ آپ کے رشتہ داروں، عزیزوں اور جان نثار شاگردوں پر جو کچھ بیتی اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے مگر حضرت نے کسی کو زبان تک نہ ہلانے دیا اور یوں فرمایا..... کہ جس نے کوئی لفظ زبان سے نکالا وہ میرا دوست نہیں بلکہ دشمن ہے۔

پہلا حج

آپ کے دن بڑی غربت اور تنگدستی سے گزر رہے تھے لیکن حرمین شریفین کی حاضری کے لئے آپ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے لیکن صورت حال یہ تھی کہ آپ کی اقتصادی حالت اس قدر کمزور تھی کہ بمشکل اہل و عیال کا گذران ہوتا تھا بلکہ یہاں تک کہ آپ کی خواہش یہ ہوتی کہ جس حال میں پڑا ہوں اسی گمنامی و گوشہ نشینی کی حالت میں پڑا رہوں کسی آنکھ یا کان کو اس کی خبر نہ ہو۔ ان حالات میں حرمین شریفین تک آنا جانا کیسے ہو؟ لیکن جب طلب سچی ہو تو اللہ تعالیٰ اسباب پیدا فرما دیتے ہیں۔

ڈپٹی عبدالحق رامپوری کا قصد حج ہوا اور انہوں نے اپنے اہل و عیال اور متعلقین و وابستگان کا ایک جم غفیر ساتھ لیجانا چاہا، حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری جو حضرت حافظ شہید رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز تھے ڈپٹی صاحب کے احباب میں سے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے حکیم صاحب کو بھی ساتھ لیا، حکیم صاحب حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے عشاق میں سے تھے۔ کیونکہ انہیں

علم تھا کہ میرے پیر و مرشد نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے زانو پر جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ حکیم صاحب نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا تو ڈپٹی صاحب بلا ادنیٰ تا مل مان گئے بلکہ اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے، کہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسا محب رسول صلی اللہ علیہ وسلم و متبع سنت ہمارے قافلے میں شریک ہو مولوی ابوالنصر کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں زاد بھائی جو حضرت کے بچپن کے ساتھی اور جان نثار رفیق تھے۔ ان کو جب علم ہوا کہ مولانا سفر حج پر جا رہے ہیں تو انہوں نے اپنا اثاثہ اونے پونے بیچ کر معہ اہلیہ معیت اختیار کی ان دنوں سفر حج انتہائی دشوار تھا اور فریضہ حج کی ادائیگی سب فرائض سے مشکل تھی۔ ایسا بھی ہوتا کہ دھانی کشتیاں تین تین چار چار ماہ سمندر میں ہچکولے کھاتی رہتیں آپ کے سفر میں سخت طوفان آیا تمام مسافر گھبرا گئے۔ مگر آپ نہایت پرسکون تھے لوگوں کی گھبراہٹ پر انہیں یہ کہہ کر تسلی دی کہ ”بھئی کوئی مرے گا تو ہے نہیں ہم تو کسی کے بلائے ہوئے جا رہے ہیں خود نہیں جا رہے“ اور جہاز جب اصلی حالت پر آیا تو کپتان نے گھڑی دیکھ کر بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے طوفان کی وجہ سے ہمیں آٹھ دن کی مسافت تین دن میں طے کرا دی ہے۔

رویائے صالحہ

آپ کے شریعت و طریقت دونوں کے شیخ یعنی حضرت شاہ عبدالغنی مجددی اور حضرت حاجی صاحب علی الترتیب مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں قیام کئے ہوئے تھے حرمین شریفین کی حاضری اور تسخین کی زیارت کے تصور نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو بے خود بنا رکھا تھا، مکہ معظمہ میں حاجی صاحب کی زیارت ہوئی۔ حج کے دوران حضرت حاجی صاحب نے اپنے طالب صادق کو ہر وقت ہمراہ رکھا آپ نے مکہ معظمہ میں خواب دیکھا۔ ”ابدال جیسے اہل خدمت اولیاء کا ایک گروہ جا رہا ہے اور آپ ان کو دیکھ رہے ہیں، آپ فرماتے تھے کہ میں نے خواب ہی میں دعا مانگی کہ یا اللہ مجھے بھی ان سے لاحق کر دے۔ یہ دعا مانگ کر میں ان کے پیچھے دوڑا اور ان کی جماعت میں مل گیا“

صبح کو اعلیٰ حضرت کو خواب سنایا تو مسکرا کر فرمایا ”پھر اب کیا چاہتے ہو لاحق تو ہو گئے“ مکہ معظمہ ہی میں دوسرا خواب دیکھا۔

”آپ کے ہاتھ کی چاروں انگلیوں سے خون جاری ہے دو سے بکثرت

اور تیسری سے کم اور چوتھی سے اور کچھ کم۔“

آپ نے یہ خواب مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے بیان کیا انہوں نے تعبیر دی کہ ”تمہاری چاروں نسبتیں (چشتی سہروردی نقشبندی قادری) جاری ہوں گی دو کا جریان بہت ہوگا، حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ان چاروں نسبتوں کا جس طرح فیضان ہوا اس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ لیکن آپ بکمال انکساری فرمایا کرتے تھے کہ ”اس وقت سے اب تک منتظر ہوں مولوی مظفر حسین زندہ ہوتے تو کہتا۔ کہ آپ ہی نے تعبیر فرمائی تھی لیجئے اب کچھ کیجئے۔“

مدینہ منورہ میں شاہ عبدالغنی کی زیارت کی۔ ڈپٹی عبدالحق مرحوم مدینہ ہی میں فوت ہو کر جنت البقیع میں مدفون ہوئے نیک آدمی تھے اللہ تعالیٰ نے بہتر سلوک فرمایا۔

واپسی میں آپ شدید بیمار ہو گئے جہاز ہی میں زندگی سے مایوسی ہو گئی اور یہ مایوسی بمبئی میں ایک ماہ برائے علاج اور ایک ماہ اندور میں برائے علاج کے قیام میں مسلسل رہی بالآخر اندور کے شاہی حکیم حکیم محمد اعظم کے علاج سے افاقہ ہونا شروع ہوا (۱) گنگوہ پھنچ کر سات آٹھ ماہ کے بعد مکمل صحت یابی ہوئی۔ اس پورے سفر اور طویل علالت میں مولوی ابوالنصر نے تیمارداری کا حق ادا کر دیا تفصیلات جاننے کے بعد خیال ہوتا ہے کہ اس طرح کے تیماردار شاید انسانی تاریخ میں چند ہی گذرے ہوں، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے کہ ”ابوالنصر تو میری ماں ہے“ اور شاید میرا حقیقی بھائی بھی اتنی خدمت نہ کرتا جتنی انہوں نے کی“

آپ سفر حج کو اوائل ۱۲۸۰ھ میں روانہ ہوئے اور محرم ۱۲۸۲ھ کو واپس گنگوہ پہنچے۔

دوسرا حج

آپ نے دوسرا حج ۱۲۹۴ھ میں کیا اور اس سفر حج میں اللہ کے ایسے ایسے نیک بندوں نے شرکت کی کہ شاید ہندوستان میں اس سے پہلے اور اس کے بعد اس کی نظیر نہ مل سکے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مہتمم دارالعلوم دیوبند، شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ، حکیم ضیاء الدین

(۱) حکیم محمد اعظم بمشاہدہ ایک ہزار روپیہ ماہوار اندور میں ملازم تھے ان کی مشہور تصنیف ”اکسیر اعظم“ ہے حضرت گنگوہی برائے علاج اس سے استفادہ کیا کرتے حضرت گنگوہی اگرچہ غربت اور سفر ہی میں تھے تاہم حکیم صاحب نے ان کی جائے قیام پر آکر معائنہ کیا اور معجون عنبر کی علاج تجویز کیا۔

صاحب رحمہ اللہ، مولانا محمد مظہر صاحب رحمہ اللہ بانی مظاہر العلوم سہارنپور کے علاوہ تقریباً سو بڑے بڑے عالم و فاضل اس قافلے میں شریک تھے، اس سفر کی پورے ملک میں شہرت ہو گئی لہذا گھر سے لے کر ساحل تک ہر جگہ فقید المثل استقبال ہوا۔ ایسے صلحاء و علماء کے سفر حج پر اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کی جو بارش ہوئی ہوگی اس کا کون اندازہ لگا سکتا ہے، حضرت حاجی صاحب کو اطلاع مل چکی تھی۔ لہذا اعلیٰ حضرت باوجود ضعف و نقاہت اور پیرانہ سالی کے مکہ معظمہ سے باہر استقبال کیلئے نجانے کتنی دیر سے انتظار کر رہے تھے، قافلے کے آنے پر ہر ایک سے مصافحہ کیا اور سب کو تقریباً اپنے پاس ٹھہرایا، ۱۲۹۵ھ میں واپسی ہوئی۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی وفات

اسی سفر میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ بیمار ہوئے اور اس بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ مرض الموت کا سبب بنی اور ۱۲۹۷ھ میں راہی ملک بقا ہوئے، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کو اس کا شدید صدمہ ہوا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ”مجھے مولوی محمد قاسم کی مفارقت کا اتنا صدمہ ہوا کہ اگر ایک بات نہ ہوتی تو اسی وقت میری جان نکل جاتی“ کسی خادم نے عرض کیا کہ حضرت وہ کیا بات تھی فرمایا ”وہی جس کی وجہ سے تم مجھے بڑا سمجھ رہے ہو۔“

تیسرا حج

۱۲۹۹ھ میں آپ نے تیسرے حج کا دفعۃً ارادہ کیا اور ایسے وقت میں کیا کہ بظاہر حج کے دنوں میں پہنچنا مشکل تھا ۴/ ذی قعدہ کو گنگوہ سے روانہ ہوئے بمبئی سے جب جہاز چلا ہے تو چودہ روز حج میں باقی تھے خدا کا فضل شامل حال تھا نویں دن جدہ پہنچ گئے، کامران میں قرظینہ کیلئے جہاز کا ٹھہرنا شد ضروری تھا لیکن غیبی کشش کی بناء پر جہاز کشاں کشاں چلتا رہا اور باوجود کامران میں رکنے کی ہدایت کے نہ رکا جس کی وجہ سے جہاز کو تین ہزار روپیہ جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ حضرت جب مکہ معظمہ پہنچتے ہیں تو اگلے دن ارکان حج شروع ہو گئے۔

ایک گنگوہ کے شخص اس سال حج کے لئے روانہ ہوئے مگر حضرت کی خواہش کے باوجود پہلے چل دیئے اور واپسی میں بھی جلد چل نکلے نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ماہ قرظینہ کے لئے راستہ میں ٹھہرنا پڑا خرچ بھی زیادہ ہوا اور وقت بھی زیادہ لگا۔ حضرت کا جہاز نہ آتے ہوئے

رُکا اور نہ جاتے ہوئے۔

آپ کا تیسرا حج آخری حج تھا اس کے بعد سفر حج کا اتفاق نہیں ہوا بالاستقلال تعلیم و تعلم میں مشغول ہو گئے۔

مدارس کی سرپرستی

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود کتاب و سنت کی اشاعت کیلئے وقف تھا دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے تاحیات آپ سرپرست رہے۔ مظاہر العلوم سہارنپور کی بناء دارالعلوم دیوبند کی بناء کے چھ ماہ بعد جب ۱۲۸۳ھ میں رکھی گئی۔ اسکے بانی حضرت مولانا سعادت علی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد مظہر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سرپرست تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ (محدث سہارنپوری) اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دونوں کا انتقال ہو گیا اور یہ سال ہندوستان میں مدارس دینیہ کی تاریخ میں عام الحزن اور سال غم کہلاتا ہے۔ مظاہر العلوم اور دارالعلوم دونوں مدرسے یتیم ہو گئے، چنانچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ جو اس سے پہلے ان مدارس کی طرف مستور تھی اب علانیہ ہو گئی اور آپ ان کے مستقل سرپرست و نگران ہو گئے۔

دارالعلوم کا جلسہ دستار بندی

۱۳۰۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں چوتھا جلسہ دستار بندی ہوا۔ جو اس کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس میں تشریف لائے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ سمیت گیارہ حضرات کی دستار بندی ہوئی، اس جلسہ پر دیوبند میں اتنا بڑا اجتماع ہوا کہ اس سے قبل شاید ہی کبھی ہوا ہو، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے دستار بندی کی، خوشادہ خوش نصیب حضرات کہ جن کی دستار بندی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی۔ جلسہ کے اگلے دن جمعہ تھا، مولانا رفیع الدین صاحب و مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا وعظ سننے کو بہت دل چاہتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ آپ کا جی چاہتا ہے تو جو کچھ مجھے آتا ہے کہہ دوں گا۔ اگلے دن جامع مسجد میں وعظ فرمایا، اس وعظ کی کیفیت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے الفاظ میں پڑھیے کہ

جو روایتی قسم کے مہتمم نہ تھے، تکلف و تصنع سے بے نیاز، سادگی و خلوص کے پیکر اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین، یقین نہیں آتا کہ انہوں نے رواداد تقریر میں ذرا بھی مبالغہ کیا ہوگا، سالانہ رواداد مدرسہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

و عظ کیا گویا سامعین کو مئے محبت الہی کے خم کے خم پلا دیئے، درودیوار تک مست تھے اور عجیب کیفیت ظاہر تھی کہ کہیں دیکھی نہ سنی۔ اللہ اللہ! اس کے خاص بندوں کے سیدھے سیدھے الفاظ اور سادہ بیان اور ڈھیلی ڈھیلی زبان میں کیا کیا تاثیرات ہیں کہ بشر کیا شجر و حجر بھی مان جاتے ہیں۔ مولانا نے کوئی دقیق مضامین علمیہ بیان نہیں فرمائے۔ یہی وضو اور نماز کے مسائل بیان کئے اور اخلاص کے بیان میں کسی تقریب سے ایک دفعہ باواز بلند اللہ کہا، معلوم نہیں کہ کس دل اور کیسے سوز و گداز سے اللہ کا نام لیا کہ تمام مجلس و عظ لوٹ گئی اور آہ وزاری کی آواز سے مسجد گونج اٹھی ہر شخص اپنے حال میں مبتلا تھا۔ اس وقت بعض اشخاص نے مولوی صاحب کو دیکھا کہ کمال وقار سے منبر پر خاموش بیٹھے ہیں، اور اہل مجلس کی طرف متوجہ ہیں، یقین ہوتا ہے کہ اگر مولوی صاحب ایسے متوجہ نہ ہوتے تو اہل جلسہ کو دیر تلک افاقہ نہ ہوتا مگر اللہ رے حوصلہ کہ خود ویسے ہی مشغول رہے۔

سینہ میں قلزم کو لے قطرہ کا قطرہ ہی رہا (۱)



جامع الصفات

اسلام اور ایمان کے الفاظ اور ان کے معنوں پر علماء نے بالتفصیل کلام کیا ہے جس کا خلاصہ اور مفہوم یہ ہے کہ انسان اعضائے ظاہر اور اپنے قلب کو حق تعالیٰ شانہ کی اطاعت و فرمانبرداری میں مشغول رکھے۔ اس کی زبان اور دل میں مطابقت پائی جائے جو کام اس کے ہاتھ پاؤں سے ظاہر ہوں اور جو باتیں اس کی زبان سے نکلیں اس پر اس کا دل راضی ہو، طبیعت کو اس کا خوگر بنانا کہ شریعت حقہ اور سنت نبویہ پر عمل کرنا اس طرح مرغوب ہو جس طرح کہ تندرست اور عقلمند آدمی کو غذا کی رغبت ہوتی ہے مطلوب و محمود ہے۔ اس کے حصول کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے اس کو سلوک و معرفت یا تصوف و احسان کہتے ہیں۔ حضور نبی ﷺ کی سنتوں سے پیار اور شریعت حقہ کے احکام پر عمل کرنا عادت بن جائے، کسی تکلف کی حاجت نہ رہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے جب ایسے لوگوں کی صحبت و رفاقت میسر ہو کہ جن کی ہر حرکت اور سکون آقائے نامدار حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ہو۔ سنت نبویہ پر عمل کرنا ان کا طبعی شیوہ اور خلق و شعار بن چکا ہو۔

حضور نبی کریم ﷺ کامل انسان تھے۔ آپ کی جملہ حرکات و سکنات جن کو عادات کہا جاتا ہے مکمل اعتدال پر تھیں۔ آپ کی تقلید ہر انسان کے دل کو معتدل بنا سکتی ہے۔ اعضائے ظاہر کو دل کے ساتھ خاص تعلق ہے، اگر مسلمان اپنے ظاہری اعمال کو حضور نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق اور اپنی عادات کو حضور ﷺ کے متبع کر دے گا تو اس کے اعضاء اور عادات میں اعتدال پیدا ہو کر دل کی کجی دور ہو جائے گی، نیکی سے اسے محبت اور گناہ سے نفرت ہوتی چلی جائے گی۔ عبادات باطبع مرغوب و محبوب بن جاتی ہیں، اور کسی امر میں اللہ تعالیٰ کی اگر نافرمانی ہو جائے تو اس سے دل کو کوفت اور ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہوتے ہوتے معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ قلب کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں وہ لذت محسوس ہوتی ہے کہ جس کے سامنے دنیا کی کسی لذت کی کوئی

حقیقت نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر سے ایک لمحہ غفلت ہفت اقلیم کی دولت چھن جانے سے زیادہ مغموم بناتی ہے، صبح کے وقت نوافل تہجد اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ لو لگانے سے جو انہیں دولت میسر آتی ہے پوری کائنات کی مادی دولت اس کے مقابلہ میں ہیج نظر آتی ہے، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو خلیفہ نے سنجر کے علاقہ کا گورنر بنانا چاہا آپ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

چوں چتر سنجر رخ بختم سیاہ باد در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانکہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب من ملک نیم روز بیک جو نمی خرم
لیکن یہ زہد اور دنیا سے بے رغبتی ان کو غاروں اور صحراؤں کے گوشے میں نہیں بھیجتی کہ دنیا سے قطع تعلق ہو جائیں۔ وہ دنیا میں دوسرے انسانوں کے ساتھ رہ کر اپنی تمام مساعی کو لوگوں کو خدا سے ملانے میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن دنیا میں رہ کر دنیا کے خواہش مند اور لوگوں سے معاوضہ کے طالب نہیں ہوتے، ان کی مثال کشتی اور دریا کی ہوتی ہے کہ کشتی دریا میں رہنے کے باوجود پانی کے اوپر تیرتی ہے پانی کو اپنے اندر نہیں آنے دیتی، اگر پانی اس کے اندر داخل ہو جائے تو غرق ہو جاتی ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو اتباع نبی کریم صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم میں جو انہماک اور فنائیت حاصل تھی اس کی نظیر آپ کے زمانہ میں نہیں ملتی۔ بلکہ یوں کہئے کہ آپ اس بارے میں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خوش قسمت افراد میں سے ایک تھے، جن پر پوری امت فخر کر سکتی ہے۔ آپ نے ایک جگہ طریقت و شریعت کی ماہیت بیان فرمائی ہے جو ہدیہ ناظرین ہے۔

”علم الصوفیۃ علم الذی ظاہرا و باطنا وقوۃ الیقین و هو العلم الاعلیٰ
حالہم اصلاح الاخلاق و دوام الافتقار الی اللہ تعالیٰ حقیقۃ التصوف
التخلق باخلاق رضاء اللہ تعالیٰ و سلب الارادۃ و کون العبد فی رضاء اللہ
تعالیٰ اخلاق الصوفیۃ ما ہو خلقہ علیہ السلام بقولہ انک لعلی خلق عظیم
وما ورد بہ الحدیث و تفصیل اخلاقہم ہکذا التواضع ضدہ الکبر۔ المداراۃ
واحتمال الاذی عن الخلق۔ المعاملۃ برفق و خلق حسن و ترک غضب
و غیظ۔ المراساۃ و الایثار بفرط الشفقۃ علی الخلق و هو تقدم حقوق الخلق

علی حظوظہ السخاوة. التجاوز والعفو طلاقة الوجه والبشرة. السهولة
ولين. الجانب ترك التعسف والتكلف. انفاق بلاقتار وترك الادخار،
التوكل القناعة بيسير من الدين، الورع ترك المراء والجلال والعتب الابعق
ترك الغل والحقد والحسد ترك المال والجاه وفاء الوعد، الحلم الاناءة
التواد والتوافق مع الاخوان، والعزلة عن الاغيار، وشكر المنعم بذل الحياة
للمسلمين الصوفي يهذب الظاهر والباطن في الاخلاق والتصوف ادب
كله. ادب المحضرة الا لآلهية الاعراض عما سواه حياء واجلالاً وهيبة
اسواء المعاصي حديث النفس وسبب الظلمة“

(تذكرة الرشید ص ۱۱، دوسرا حصہ)

صوفیہ کا علم نام ہے ظاہر و باطن علم دین اور قوت یقین کا اور یہی علم اعلیٰ ہے، صوفیہ کی
حالت اخلاق کا سنوارنا اور ہمیشہ خدا کی طرف لو لگائے رکھنا ہے، تصوف کی حقیقت اللہ تعالیٰ
کے اخلاق سے مزین ہونا اور اپنے ارادہ کا چھن جانا اور بندے کا اللہ تعالیٰ کی رضا میں بالکلیہ
مصروف ہو جانا ہے۔ صوفیہ کے اخلاق وہی ہیں جو جناب رسول اللہ ﷺ کے ہیں حسب
فرمان خداوند تعالیٰ کہ بیشک تم بڑے خلق پر (پیدا کئے گئے) ہو اور نیز جو کچھ حدیث میں آیا
ہے (اس پر عمل اخلاق صوفیہ میں داخل ہے) صوفیہ کے اخلاق کی تفصیل اس طرح ہے۔
اپنے آپ کو کمتر سمجھنا اور اس کی ضد ہے تکبر۔ مخلوق کے ساتھ تطف کا برتاؤ کرنا اور
خلقت کی ایداول کو برداشت کرنا۔ نرمی اور خوش خلقی کا معاملہ کرنا اور غیظ و غضب کا چھوڑ
دینا۔ ہمدردی اور دوسروں کو ترجیح دینا۔ خلق پر فرط شفقت کیساتھ جس کا یہ مطلب ہے کہ
مخلوق کے حقوق کو اپنے حظ نفسانی پر مقدم رکھا جائے۔ سخاوت کرنا۔ درگزر اور خطا کا معاف
کرنا۔ خندہ روئی اور بشاشت جسم، سہولت اور نرم پہلو رکھنا۔ تصنع اور تکلف کا چھوڑ دینا۔ خرچ
کرنا بلا تنگی اور بغیر اتنی فراخی کے کہ احتیاج لاحق ہو۔ خدا پر بھروسہ رکھنا۔ تھوڑی سی دنیا پر
قناعت کرنا۔ پرہیزگاری۔ جنگ و جدل اور عتاب نہ کرنا مگر حق کیساتھ۔ بغض و کینہ اور
حسد نہ کرنا۔ عزت و جاہ کا خواہشمند نہ ہونا۔ وعدہ پورا کرنا۔ بردباری۔ دور اندیشی۔ بھائیوں
کیساتھ موافقت و محبت رکھنا اور اغیار سے علیحدہ رہنا۔ محسن کی شکر گزاری اور جان کا مسلمانوں
کے لئے خرچ کرنا۔ صوفی اخلاق میں اپنا ظاہر و باطن مہذب بنا لیتا ہے اور تصوف سارا ادب

ہی کا نام ہے۔ بارگاہِ احدیت کا ادب یہ ہے کہ ماسوائے اللہ سے منہ پھیر لیا جائے۔ شرم کے مارے حق تعالیٰ کے اجلال و ہیبت کے سبب تحدیثِ نفس (یعنی نفس سے باتیں کرنا) بدترین معصیت اور ظلمت کا سبب ہے۔

امام ربانی رحمہ اللہ نے صوفی اور اچھے انسان اور مسلمان کی جو تفصیل بالا جمال مندرجہ بالا عبارت میں فرمائی ہے۔ وہ ان تمام کتب کا خلاصہ ہے جو چودہ سو سال میں اسلام کی تعبیر و تشریح میں لکھی گئی ہیں۔ اور ہر وہ مرشد یا شیخ یا معلم جو صحیح معنوں میں اس نام کا حامل ہوگا اس میں ان صفات کا پایا جانا ضروری ہے۔ خود حضرت گنگوہی رحمہ اللہ میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اور وہ اپنے زمانے کے فردِ وحید تھے جو صحیح معنوں میں شرک و بدعت کے مخالف اور احکام شرعیہ و سننِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی تھے۔ حق یہ ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو اسوۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں رنگ لیا تھا۔ مدح و ذم ان کے لئے یکساں تھی۔ نہ تعریف انہیں خوش کرتی تھی اور نہ ہی ان کی مذمت ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات چھوڑتی تھی۔

شیخ کا امتحان

پہلی بار جب آپ ایک چلہ تھانہ بھون رہے آئے۔ چند دن ٹھہرنے کے بعد خیال ہوا کہ حضرت حاجی صاحب پر کھانے کا بوجھ ہے کوئی اور انتظام کرنا چاہئے، لیکن ایسا انتظام دشوار تھا لہذا جانے کی اجازت چاہی۔ حاجی صاحب نے فرمایا ابھی چند روز اور ٹھہرو میں خاموش ہو گیا۔ لیکن یہ فکر ہوا کہ کھانے کا کیا کروں گا تھوڑی دیر بعد حاجی صاحب تشریف لائے اور میرے دسوسہ پر مطلع ہو کر کہا ”میاں رشید احمد کھانے کی فکر مت کرنا ہمارے ساتھ کھائیو“ چنانچہ دوپہر کو گھر سے کھانا آیا ایک پیالہ میں لذیذ کوftے تھے اور دوسرے میں معمولی سالن تھا۔ حاجی صاحب نے معمولی سالن کا پیالہ میری طرف کر دیا۔ اتنے میں حافظ ضامن شہید رحمہ اللہ آگئے اور فرمانے لگے بھائی صاحب! رشید احمد کو اتنی دور ہاتھ بڑھانا پڑتا ہے اس پیالہ کو ادھر کیوں نہیں رکھ لیتے۔“ اعلیٰ حضرت نے بے ساختہ جواب دیا ”کہ اتنا بھی غنیمت ہے کہ اپنے ساتھ کھلا رہا ہوں۔ جی تو چاہتا ہے کہ چوڑ ہوں اور چماروں کی طرح ایک ہاتھ پر روٹی رکھ دیتا“ یہ فقرہ کہنے کے بعد حاجی صاحب نے مولانا گنگوہی کی طرف دیکھا۔ مولانا گنگوہی فرماتے ہیں کہ ”حضرت کا یہ دیکھنا اس لئے تھا کہ کچھ تغیر تو نہیں۔ مگر الحمد للہ

میرے قلب پر بھی اس کا کچھ اثر نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ حقیقت میں جو کچھ حضرت فرماتے ہیں بالکل سچ ہے، اس دربار سے روٹی ہی کا ملنا کیا تھوڑی نعمت ہے جس طرح بھی ملے بندہ نوازی ہے۔ اس کے بعد حضرت نے پھر کبھی میرا امتحان نہیں لیا۔ ”اس کے بعد فرمایا۔“ اسی لئے مجھ کو کچھ آیا نہیں“

(تذکرۃ الرشید ج ۲ ص ۸۷)

مجھے اس کی تمنا نہیں

ایک دفعہ نانوتہ یارام پور تشریف لے گئے۔ سردی کے موسم میں آپ گاڑھے کی میلی دوہراوڑھے ہوئے بیٹھے تھے۔ آپ کے دائیں بائیں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم ضیاء الدین صاحب بیٹھے تھے۔ ایک صاحب آئے اور دائیں بائیں مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔ آپ کو باوجود درمیان میں بیٹھے ہوئے عام آدمی خیال کر کے چھوڑ دیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب چونکہ آپ سے بے تکلف تھے لہذا مسکرائے، امام ربانی نے مطلب سمجھا اور فرمایا، ”الحمد للہ مجھے اس کی تمنا نہیں کہ لوگ مصافحہ کریں۔“

بدعت اور ضلالت سے نفرت

اتباع سنت کا جذبہ جس قدر آپ کے قلب میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اسی قدر شدید جذبہ بدعت و گمراہی کے خلاف تھا۔ چنانچہ آپ کسی گمراہی یا خلاف شریعت کام کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ کرنال سے گنگوہ ایک بار آئی جس میں رقاصہ بھی تھی۔ اس بارات میں کچھ لوگ آپ کے ملنے والے تھے۔ آپ اس دن صبح اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد میں منہ ڈھانپ کر لیٹ گئے۔ واقف کار لوگ سلام کرنے کیلئے آئے۔ دیر تک آپ کے پاس بیٹھے رہے مگر آپ نے منہ نہ کھولا۔ بالآخر ایک صاحب بولے کہ حضرت ہم تو زیارت کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ آپ نے منہ ڈھانپنے غصہ میں جواب دیا کہ ”میری زیارت میں کیا دھرا ہے؟“ چنانچہ ایک سفید ریش بزرگ نے معاملہ سمجھ کر عرض کیا کہ حضرت ہم تو رنڈی کو ساتھ لائے نہیں، بیٹی والوں کی حرکت ہے۔ آپ نے بے ساختہ فرمایا کہ ”میاں بیٹی والے کسی کے خدا تو نہیں ہیں کہ اُن کا کہنا مانا ہی جائے۔“ اسی جملے سے بہت سے حاضرین کے دل بھر آئے۔ وہ لوگ جب چلے گئے تو آپ نے منہ کھولا اور اٹھ بیٹھے۔

اس میں تیسرے تم تھے

آپ کے جد امجد شاہ عبدالقدوس کا عرس ہوتا تھا۔ آپ اس کو بند کرنے پر قادر نہ تھے۔ اول اول آپ کو صبر کرنا دشوار تھا لہذا آپ ان دنوں رام پور چلے جاتے تھے مگر جب آخر میں اس ایذا قلبی کی برداشت آپ کو دے دی گئی تو آپ یہ زمانہ خانقاہ ہی میں گزارتے۔ اگر کوئی آپ کا معتقد ان دنوں آجاتا تو آپ کو تکلیف ہوتی۔ آپ اکثر ناراض ہوتے اور ترکِ تکلم فرمادیتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا حافظ محمد صالح صاحب (۱) حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی زیارت سے بے تاب ہو کر گھر سے نکل پڑے۔ اتفاق سے عرس کا زمانہ تھا۔ اگرچہ آنے والے کو اس کا وہم بھی نہ تھا مگر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ اپنے شیدائے سنت کے ہاتھوں مجبور تھے آپ سے نہ ہو سکا کہ ان کی مزاج پر سی کریں یا محبت و مدارات سے پیش آئیں، آپ نے بجز سلام کے جواب دینے کے ان سے یہ بھی نہ پوچھا کہ روٹی کھائی یا نہیں اور کب آئے یا کیوں آئے۔ مولانا محمد صالح کو اسی طرح کئی دن گزر گئے حضرت کا رخ پھرا ہوا دیکھنا جس طرح شاق گذر رہا تھا اس کو انہی کے دل سے پوچھنا چاہئے تھا، حاضر خدمت ہوتے اور خاموش بیٹھ کر رنجیدہ و محزون واپس ہو جاتے، آخر اس حالت کی تاب نہ لا کر حاضر خدمت ہوئے اور رو کر عرض کیا کہ حضرت مجھ سے کیا قصور ہوا جس کی یہ سزا مل رہی ہے۔ میں تو اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے واسطے معاف کر دیجئے۔ اس وقت حضرت نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا کہ ”میرا قصور نہیں کیا جس کو میں معاف کر دوں خدا کی خطا کی ہے اس سے معافی چاہو“ اس وقت مولانا سمجھے کہ عرس کے دنوں میں آنا گوار گذرا ہے۔ چنانچہ آپ نے قسم کھا کر فرمایا ”کہ خدا شاہد ہے مجھے تو عرس وغیرہ

(۱) حضرت مولانا حافظ محمد صالح رحمہ اللہ، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ آپ صاحب فضل و کمال بزرگ تھے اور سلف صالحین کے زہد و تقویٰ کی تصویر، مشرقی پنجاب کے مشہور و معروف مدرسہ عربیہ ”مدرسہ رشیدیہ“ رائے پور ضلع جالندھر کے آپ بانی تھے۔ یہ مدرسہ آج کل جامعہ رشیدیہ کے نام سے سہی وال میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اسکے دور قدیم کے صدر مدرس حضرت مفتی فقیر اللہ (جو متحدہ پنجاب کے نامی گرامی مفتی تھے) کے فرزند ارجمند مولانا حبیب اللہ اس کے ناظم اور مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا حافظ محمد عبد اللہ صاحب شیخ الحدیث ہیں۔ حضرت حافظ محمد صالح صاحب کے دو صاحبزادے حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب مقیم چک ۱۱، (۱۱-ایل) نزد چیچہ وطنی اور حضرت پیر جی عبداللطیف صاحب مہتمم مدرسہ تجوید القرآن چیچہ وطنی ہیں۔ دونوں صاحب نسبت اور صاحب قال و حال بزرگ ہیں۔ اس مدرسہ رشیدیہ کے پہلے مہتمم مولانا فضل احمد صاحب نے چک (۱۱) (۱۱-ایل) چیچہ وطنی میں چند سال قبل تقریباً سو سال کی عمر میں وفات پائی۔

کے ساتھ ابتدا ہی سے شوق نہیں اور نہ مجھے اس کا علم تھا۔

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ اگرچہ تمہاری نیت عرس میں شرکت کی نہ تھی مگر جس راستہ میں دو آدمی عرس کیلئے آرہے تھے اسی میں تیسرے تم تھے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

من کثر سواد قوم فهو منہم جو آدمی کسی قوم کی کثرت کا باعث ہوا وہ انہی میں سے ہے

عمل پر مداومت اور استقامت

اصل کرامت شریعت کے اعمال و احکام پر استقامت اور مداومت ہے۔ یہ بڑا کٹھن اور مشکل کام ہے زندگی کے ہر شعبہ میں سنت رسول کا خیال رکھنا اور ساری زندگی اس پر عمل کرنا سب سے بڑا مجاہدہ اور سب سے بڑی عبادت ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ میں یہ بات کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ اگر ایک آدمی آپ کو دس سال قبل مل کر گیا اور دس سال بعد پھر آیا تو آپ میں بلا کم و کاست اسی طرح اتباع شریعت کی محویت اور فنائیت دیکھتا تھا اور اسی استحکام و استقامت کے ساتھ اوامر کی پابندی اور نواہی سے اجتناب کو پاتا تھا۔ آپ کے مخالفین نے آپ کے خلاف بہت زور لگایا اور بہت کچھ تحریریں شائع کیں مگر الحمد للہ مخالفین کو باوجود حد درجہ مخالفت کے آپ کی ذات پر کبھی کسی ایسے طعن یا الزام کا موقع نہیں ملا جس کا عیب یا برائی ہونا عند الشریعہ مسلم ہو۔ آپ کے ہنروں کو عیب بنایا گیا اور سنت و اصل شریعت سے فرط محبت کی وجہ سے بدعات سے جو تنفر تھا اس کو معصیت بنا کر آپ کی تکفیر کی گئی۔ آج جب کہ آپ کو اس دنیا سے گزرے ہوئے پون صدی سے اوپر کا عرصہ ہو رہا ہے اگر پوری مخلوق جمع ہو کر بھی کوئی ایسا واقعہ نکالنا چاہے جس میں آپ کی نماز کا قضا ہو یا جماعت سے کاہلی و سستی یا کسی شرعی پسندیدہ امر سے ذرہ برابر بے رغبتی یا غفلت ثابت ہوتی ہو تو نہیں نکال سکتی۔

باکس برس کے بعد تکبیر اولی فوت

دیوبند کا جلسہ دستار بندی جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اس میں ایک دن غالباً عصر کی نماز میں ایسا اتفاق پیش آیا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب نماز پڑھانے کو مصلے پر کھڑے ہوئے تو تکبیر اولیٰ کہی جا چکی اور امام نماز شروع کر اچکا تھا۔ سلام پھیرنے کے بعد دیکھا گیا کہ جو وجود بڑے

بڑے حوادث اور اعزاء کی اموات، تنگ دستی و غربت میں کبھی پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ادا اس اور پریشانی کا مظہر تھا اور آپ رنج کے ساتھ یہ الفاظ فرما رہے تھے ”افسوس بایں برس کے بعد آج تکبیر اولیٰ فوت ہو گئی۔“

ہوا میں اڑنا، سمندر میں اپنے پاؤں پر چلنا اسی طرح کی دوسری خوارق عادت باتیں کم درجہ کی کرامات ہیں اصل کرامت یہ استقامت و دوام ہے جو شاید کروڑوں میں سے ایک کو حاصل ہوتا ہے۔

شب بیداری و تہجد گزاری

”تذکرۃ الرشید“ میں حضرت مفتی عزیز الرحمن کی زبانی حضرت گنگوہی کے انضباط اوقات درج ہوئے ہیں ساری عمر تقریباً اس پر عمل کیا، کبھی اس میں تبدیلی یا تغیر نہیں ہوا۔ مولانا منیر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک سفر حج میں ساتھ تھے۔ ایک روز آدھی رات کے بعد ان سے کہا کہ دو ڈول سمندر سے پانی کے نکال دو، غسل کروں گا۔ نانوتوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ابھی تو بہت رات باقی ہے صبح ہونے دیجئے اگر ایک رات تہجد قضا ہو گئی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر حضرت کو یہ منظور نہ ہوا اور اسی وقت غسل فرما کر نماز تہجد ادا فرمائی اور حسب معمول فجر تک تلاوت قرآن اور وظائف میں مشغول رہے۔

او مردود تو اللہ ہے؟

ایک فقیر صوفی آپ سے بہت پیار محبت رکھتا تھا آپ بھی اس کو فقیر درویش سمجھ کر اس کا ادب و احترام کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس فقیر نے آپ سے کہا کہ جانے ہو کہ یہ جو ذکر ”اللہ ہو“ کرتا ہوں کیا کہتا ہوں؟ یہ کہتا ہوں ”اللہ ہوں“ یہ سن کر آپ نے فوراً طیش میں آکر فرمایا کہ ”او مردود تو اللہ ہے؟“ سابقہ دوستی یا مروت کا ذرہ بھر لحاظ نہیں کیا۔ اس کے بعد پھر اس فقیر کی کبھی صورت نہ دیکھی۔

گنگوہی بھی دیکھتا چلوں

داروغہ اسد علی صاحب انسپکٹر پولیس پشاور کو شیخ کی تلاش تھی۔ انہوں نے رخصت لے کر ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا۔ بیسیوں درویش حضرات سے ملے۔ افغانستان تک گئے

مگر کسی جگہ کسی کو سنت کے اتباع میں کامل نہ دیکھا۔ رخصت ختم ہونے کو تھی واپسی میں مظفر نگر ریل میں گنگوہ اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ سن کر گنگوہ چلے گئے کہ شاید یہیں مقصد حاصل ہو۔ دیکھوں کیا انداز ہے۔ گنگوہ پہنچے ایک ہی دن میں ان کا غنچہ بدل کھلا۔ اور یاس امید سے بدل گئی۔ آپ کو داروغہ صاحب نے دیکھا کہ ہر ہر بات میں سنت کا کمال اتباع کرتے ہیں چنانچہ بیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔

جانب اولیٰ کو بھی ترک نہ فرماتے

مولانا علی رضا صاحب حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس برسوں رہے اور حضرت کی شاگردی کی، اس کے بعد وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے اور کڑی نگاہوں سے حضرت گنگوہی کے ایک ایک فعل کو دیکھتے کہ شیخ کی تلاش تھی اور شیخ کامل کو دیکھنا چاہتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ برسوں میں ایک دفعہ بھی حضرت کا کوئی فعل خلاف سنت نہیں پایا بلکہ حضرت حتی المقدور مستحبات اور جانب اولیٰ (بہتر) کو بھی ترک نہ فرماتے تھے لیکن مباح سے آگے قطعاً نہ بڑھتے تھے۔ مباح کاموں کو یعنی جائز کاموں کو کر کے آپ کو روحانی خوشی نہ ہوتی تھی مگر سنن و مستحبات اور واجبات و فرائض عمل کر کے آپ کی طبیعت میں ایسا انشراح اور مزاج میں ایسی لطافت و بشارت پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر دیکھنے والا محسوس کر لیتا تھا۔

بدعات کو دیکھ کر آنسو بھر لاتے

دنیا میں ہدایت کا پھیلنا آپ کو اس درجہ محبوب و مرغوب تھا کہ اس سے زیادہ آپ کو کسی چیز میں لذت نہ آتی تھی اور مخلوق کی گمراہی و جہالت سے اسی قدر آپ کو صدمہ اور رنج ہوتا تھا۔ حق کی اشاعت اور باطل کی تردید میں جی توڑ کر کوشش فرماتے تھے۔ اگرچہ آپ مناظرہ و مباحثہ سے طبعاً متنفر تھے لیکن بدعات و معصیت کو پھیلنے والی تحریر دیکھ کر آپ غصے کو ضبط نہ کر سکتے تھے، آپ کی آنکھوں میں آنسو اتر آتے بلکہ غصہ اور رنج کے باعث خون اتر آتا اور آپ کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے۔ چنانچہ آپ سنت کا دامن تھام کر نہایت ضبط سے کام لے کر اس کی تردید میں جواب لکھتے۔ پھر اس کا طبع ہونا اور چھپنا آپ کو پسند آتا جو آدمی اس کی ذمہ داری اٹھاتا اس سے بہت خوش ہوتے اور دعاء کرتے۔

مجھے تحقیق نہیں

اگر آپ کو کسی مسئلہ کا علم نہ ہو تا یا اس کے بارے میں آپ کی تحقیق مکمل نہ ہوتی تو لاادری ”میں نہیں جانتا“ کہنے میں آپ کو کوئی جھجک یا گھبراہٹ نہ ہوتی تھی۔ بلا تامل یا بے تکلف فرمادیتے کہ میں اس مسئلہ کو نہیں جانتا یا مجھے یہ مسئلہ نہیں آتا۔ اس بات کا ذرہ بھر خیال نہیں کرتے تھے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک پرچہ ایک شخص کے پاس دیکھا جس پر چند سوالات اور حضرت کی طرف سے ان کے جوابات تھے۔ اسی پرچہ میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ”بچوں کو نزع کی تکلیف زیادہ کیوں ہوتی ہے؟“ اس کا جواب حضرت نے صرف یہ لکھا تھا کہ ”مجھے تحقیق نہیں۔“

حوادث اور صدمات پر صبر

دنیاوی حوادث و صدمات میں آپ صبر کرنے میں کوہ استقلال تھے۔ ایک دفعہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کے پانچ عزیز آپ کا نواسہ، بیٹا، اہلیہ، مرحوم بیٹے کی بیوی شیرخوار بچہ چھوڑ کر، اور نواسی یکے بعد دیگر فوت ہو گئے لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا کمال صبر کا مظاہرہ کیا کہ لوگ انگشت بدنداں تھے۔ ان کا کبھی تذکرہ نہ کرتے۔ زندگی میں تین واقعات ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جانے والوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ مولانا یحییٰ کاندھلوی (آپ ان پر غایت درجہ مشفق و مہربان تھے) سے ایک موقع کی مناسبت سے فرمایا۔ ”مولوی یحییٰ تمہاری عقل کو ہیضہ تو نہیں ہو گیا“ ان کے جانے کے بعد مولانا دوسرے سا بھی سے فرمانے لگے کہ میں نے مولوی یحییٰ کو ویسے ہی کہہ دیا ورنہ ہمارے گروہ میں سبھی ان کو عقل مند مانتے ہیں۔ انہوں نے اثباتاً جواب دیا تو فرمایا مزاج دانی تو مسعود احمد کی ماں ہی کو تھی..... اس سے قارئین یہ خیال نہ فرمائیں کہ شاید حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو ان حوادث کا صدمہ ہی نہیں ہوا۔ صدمہ تو ہر انسان کو ہوتا ہے مگر حضرت اظہار نہیں فرماتے تھے بس اتنا ہی اظہار ہوتا جتنا سنت سے ثابت ہے۔ ورنہ صدمہ تو بہت ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ..... محمود احمد (بیٹے کی وفات) نے میری کمر توڑ دی۔ آپ کے ایک خادم مولوی رحمت اللہ پانی پتی خطوں میں ہمیشہ محمود احمد کو سلام لکھتے آخر سال کے بعد امام ربانی نے ان کے کسی

خط کے جواب میں یوں تحریر فرمایا۔ ”آپ خط میں حافظ مسعود احمد کو سلام لکھا کریں۔ حافظ محمود احمد مرحوم دو سال ہوئے کہ اس عالم سے رحلت فرما کر مجھ ناکارہ کو پریشان و حیران کر گئے ہیں، جب تم اس کو سلام لکھتے ہو مجھ کو بے قراری ہو جاتی ہے۔ آئندہ ان کا نام مت لکھنا۔“

جوابات میں جلدی

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ سوالات ایک آدمی کے ہاتھ لکھ کر بھیجے اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ جوابات جلدی عنایت نہ فرمائیے۔ سوالات بہت سے اور خاصے دقیق تھے اور آپ کو آشوب چشم کی تکلیف تھی۔ مگر آپ نے دین کے بارے میں سوالات کے جواب میں تاخیر مناسب خیال نہ کی اور جوابات تحریر کر دیئے۔ البتہ جوابات مختصر ہونے کی وجہ بیان فرمائی کہ آشوب چشم میں مبتلا ہوں چنانچہ چشم بند کردہ جواب لکھ رہا ہوں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ بیس پچیس خطوط ایک دن میں آجاتے اور اکثر میں سوالات ہوتے اور اپنے حالات لکھ کر ان کا علاج پوچھا ہوتا تھا۔ آپ ان سب کا جواب دن ہی میں عنایت فرماتے کبھی مہمانوں کی کثرت یا دوسری دینی خدمات کی مشغولیت کے سبب آپ کو فرصت کم ہوتی تو عشاء کے بعد ان کے جوابات تحریر فرماتے۔

دل جوئی اور تسلی

آپ دوسروں کی دل جوئی و تسلی جیسی مناسب انداز میں فرماتے اس کی بہت کم نظیر ملتی ہے ایک شخص نے خواب دیکھا کہ گویا آپ کی وفات ہو گئی ہے۔ اس خواب نے اس کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ آپ نے بے ساختہ جواب دیا کہ ”بھائی تمہارے سامنے زندہ تو بیٹھا ہوں اور آخر کبھی تو مروں گا ہی۔ مگر کیا ضروری ہے۔ کہ خواب کے ساتھ ساتھ تعبیر بھی واقع ہو جائے؟“

حریمین اور اس کے متعلقات سے محبت

انسان کو جس کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے اس کے تمام متعلقات سے محبت ہو جاتی ہے۔ حضرت امام ربانی کے دل میں حق تعالیٰ شانہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت از حد راسخ تھی۔ اس لئے حریمین شریفین کے خس و خاشاک تک کو آپ محبوب سمجھتے اور سر آنکھوں پر

رکھتے تھے۔ مدینہ کی کھجوروں کی گٹھلیاں پسوا کر رکھتے اور ان کو کبھی کبھی پھانکا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ”لوگ زمزم کے ٹینوں اور گٹھلیوں کو یو نہی پھینک دیتے ہیں، یہ نہیں خیال کرتے کہ ان چیزوں کو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی ہوا لگی ہے۔“ ایک مرتبہ مدنی کھجور کی گٹھلی پسپی ہوئی حضرت نے مولانا عاشق الہی کو دی اور فرمایا کہ اس کو پھانک لو۔ اور ایک دفعہ مدینۃ الرسول کی مٹی عطا فرمائی کہ اس کو کھالو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت مٹی کھانا تو حرام ہے آپ نے فرمایا ”میاں وہ مٹی اور ہوگی۔“

اگر کوئی رینہ منورہ یا مکہ معظمہ سے آپ کے لئے کوئی تبرک یا تحفہ لاتا تو آپ اس کو اس قدر خوشی سے قبول کرتے کہ ہدیہ دینے والے کا جی خوش ہو جاتا اور آپ فوراً ہی تمام حاضرین میں اسکو تقسیم فرمادیتے اور اگر کوئی شخص کوئی چیز مانگ لیتا تو فوراً ہی اسے عطا فرمادیتے اور خوش ہوتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے تسبیح مانگی، آپ کے پاس بیش قیمت خوبصورت تسبیح تھی۔ ان کے حوالہ کی اور فرمایا ”پڑھتے رہنا ایسا نہ ہو کہ ویسے ہی رکھی ہوئی ہے۔“ حضرت امام ربانی کا جی چاہتا تھا کہ ہر شخص حرمین شریفین سے اور وہاں سے آئی ہوئی چیزوں سے اسی طرح محبت و پیار رکھے جس طرح خود ان کو تھا۔ ایک مرتبہ مولانا محمد اسماعیل کو موم بتی کا ذرا سا ٹکڑا عنایت فرما کر کہا کہ اس کو نکل جاؤ اور ایک بار غلاف کعبہ کے ریشم کا اتار ایثار کیا اور کہا ”اس کو کھالو۔“

جناب آداب

شعار اسلام کی ترویج آپ کو حد درجہ مرغوب تھی اگر کوئی خلاف سنت سلام کرتا تو آپ غصہ کو ضبط نہ کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ ایک صاحب آئے۔ آپ بیت الخلاء گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مونڈھا اٹھا، آپ کی چارپائی کے پاس رکھ کر بغیر مجمع کو سلام کئے بیٹھ گئے اور جب حضرت آئے تو دور ہی سے انہوں نے پکارا۔ ”جناب آداب“ حضرت نے فوراً بے ساختہ جواب دیا ”کون بے ادب ہیں جن کو شریعت کا ایک ادب بھی نہیں معلوم“ ایک مرتبہ ایک صاحب آئے اور بولے ”حضرت سلامت“ آپ کے چہرہ پر غصہ کا اثر ظاہر ہوا اور فرمایا ”مسلمانوں والا سلام چاہئے یہ کون ہے حضرت سلامت والا“۔ اس شخص نے عرض کیا میں کچھری میں رہتا ہوں وہی عادت ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ”یہاں تو کوئی کچھری نہیں ہے بھائی میں تو

فقیر آدمی ہوں۔“ وہ حضرات جو سنت کی محبت سے عاری اور محبت کے ثمرات سے ناواقف ہیں وہ حضرات کے اس انداز کو بدخلقی پر محمول کریں گے، جس زمین قلب میں محبت رسول کا بیج ہی نہیں پڑا، ان کو کوئی کیونکر سمجھائے کہ یہ واقعات خلاصہ اصلاحات قلب ہیں۔

حضرت رحمہ اللہ کا سنت مصطفویہ کے ساتھ عشق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ آپ کو عربی مہینے چھوڑ کر انگریزی مہینوں کا بلا ضرورت استعمال کرنا سخت گراں گذرتا تھا۔ ایک صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر تھے کہ ان سے کسی نے پوچھا گوالیار کب جاؤ گے؟ انہوں نے جواب دیا جولائی کی فلاں تاریخ کو۔ تو حضرت رحمہ اللہ نے تاسف کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ اور ماہ و تاریخ نہیں ہیں۔ جو انگریزی مہینوں کا استعمال کیا جاوے “یہی وجہ ہے کہ حضرت کی تحریرات میں کہیں انگریزی یا ہندی مہینوں کا نام نہیں۔

منطق و فلسفہ سے نفرت

اسی طرح منطق و فلسفہ کے ساتھ آپ کا تنفر عداوت کے درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ میرا جو مرید اور شاگرد منطق اور فلسفہ کے ساتھ اشتغال رکھے گا وہ میرا مرید اور شاگرد نہیں۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دنیا کے نفع کی تو امید ہے۔ اور یہ سب کچھ کتاب و سنت کے ساتھ والہانہ شغف و عشق کا ثمرہ تھا۔ آپ کے بال بال اور روئیں روئیں سے بطحائی پیغمبر کی ہر ادا پر شیفگی ٹپکتی تھی اور آپ کا ہر بن موگو یا زبان بنا ہوا تھا۔ جس سے بجز اتباع شریعت کی آواز کے دوسری صدا نہ نکلتی تھی۔ آپ نے اپنا سب کچھ حب رسول کے سپرد کر دیا تھا، آپ کی زبان، آنکھ، کان، بولنے، دیکھنے، اور سننے سے پہلے یہ دیکھتے تھے کہ آیا اس بات کی اجازت پیغمبر ﷺ سے ملتی ہے یا نہیں؟

بیٹے کو گھر سے نکال دیا

آپ کے صاحبزادے مولانا محمود احمد بری صحبت کے اثر سے پہلوانی اور کسرت وغیرہ میں مبتلا ہو کر دینی تعلیم اور قید شرع سے کچھ باہر ہو چلے تھے۔ آپ نے یہ حالت دیکھ کر خدا اور رسول کی محبت کو بیٹے کی محبت پر ترجیح دی اور بیٹے کو گھر سے نکال دیا اور کہلا بھیجا کہ

محمود مجھے شکل نہ دکھلائے۔ آپ اس کے لئے دعا کرتے رہے۔ آپ کی دعا مستجاب ہوئی اور حق تعالیٰ کے فضل و توفیق نے صاحبزادہ کے دل پر دستک دی اور حالت اصلاح کے قریب ہوئی تو آپ نے اسے بلا بھیجا اور فرمایا۔ ”محمود کیا ابھی تیرے سنبھلنے کا وقت نہیں آیا۔ خدا کے بندے اس بدن کو فرہ کرنے میں کیا دھرا ہے۔ اس وقت کو یاد کر جب گور میں کیڑے مکوڑوں کی غذا بن جائے گا۔ سنبھل اور اپنی بد عادتیں چھوڑ۔“

اس مختصر مگر جامع نصیحت کا بیٹے پر وہ اثر پڑا کہ گویا کلیپٹ گئی اور وہ ذاکر و شاغل بن گئے۔ قرآن پاک حفظ کیا اور عالم ہوئے مگر عمر نے وفانہ کی۔ یا تو حضرت نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا تھا اور یا یہ حالت ہوئی کہ اس کی اصلاح کے بعد مفارقت موت سے آپ اس کی یاد میں تلملاتے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ”آج کہتا ہوں بارہ برس ہو گئے جب سے محمود مرا ہے مجھے ہنسی نہیں آئی“ اور یہ محبت محمود کی صورت سے نہ تھی بلکہ اس کی عمدہ سیرت سے تھی جو بعد توبہ کے اس نے بنالی تھی، اگر وہ زندہ رہتے تو بہت بڑے بزرگ ہوتے۔ غرضیکہ حضرت مولانا، پیغمبر ﷺ کی اس حدیث کے مطابق کہ ”مومن کامل نہ ہو گا جب تک کہ میں اس کے نزدیک مال و اولاد اور جان سے زیادہ عزیز و محبوب نہ بن جاؤں“ صحیح اور کامل مومن تھے۔ آپ شریعت حقہ اور سنت بیضاء کی محبت میں ایسے فنا تھے کہ اپنے نفس کی باگ ڈور مکمل طور پر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں دے دی تھی۔

عاشقی چسیت بگو بندہ جاناں بودن پابدستے دگرے، دست بدستے دگرے

طاب اللہ ثراہ وجعل الفردوس مثواہ

حسن صورت، حلیہ مبارک

کمال حسن سیرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسن صورت میں بھی ممتاز مقام عطا فرمایا تھا، آپ کا سراپا نہایت خوش انداز اور خوبصورت تھا۔ آپ متناسب الاعضاء حسین و جمیل اور اس درجہ وجیہ تھے کہ بھرے مجمع میں پہچانے جاتے تھے۔ قد سیدھا میانہ، بدن دہرا، سرد میانہ بال نرم اور جوانی کے زمانہ میں نہایت سیاہ تھے۔ پیشانی کشادہ اور صاف و شفاف، جس میں معبود کی عبادت کا نشان دیکھتا تھا۔ بھویں گنجان اور کمان کی طرح خمیدہ لیکن ایک

دوسرے سے علیحدہ تھیں۔ آنکھیں بڑی، سرگیں جن کی سفیدی کے اندر سرخ ڈورے جھلکتے تھے، پتلی سیاہ اور بینائی کے زمانہ میں نظر دور بین اور نہایت تیز تھی، حلقے بدر کے ہالہ کی طرح روشن اور چمکتے ہوئے۔ مڑگان دراز اور رسیلی، رخسار نرم و نازک اور پر گوشت، ناک ہموار اور درازی مائل۔ لب کشادہ سرخی مائل دہن، مردانہ اور دانت نہایت سفید اور چمک دار گویا موتیوں کی لڑی، زرخندان سب جیسی۔ ریش مبارک گول گنجان۔ گردن چمک دار گویا چاندی کی صراحی، سینہ فراخ اور پیٹ کے برابر، ہاتھ سڈول بھرے ہوئے، ہتھیلی فراخ۔ انگلیاں سیدھی نرم۔ پر گوشت پنڈ لیاں۔ پاؤں چکنے صاف شفاف اور بلند۔ آواز لطیف لیکن بلند کہ بات سمجھنے میں کسی کو تکلف نہ ہوتا تھا خوش الحان، تبسم کناں، راست گو اور فصیح و بلیغ تھے۔ شجاعت و قوت میں مشہور، تواضع اور حسن معاشرت میں امام و مقتدی، ذکر و فکر میں ہر وقت مستغرق، عقیل و مدبر، صائب الرائے اور عادل، سخی و بہادر، حلیم و صابر، عفت مآب و شاکر، جمیع اوصاف سے متصف اور تمام خصائل رذیلہ سے طبعاً متنفر تھے۔

(مذکرۃ الرشید ج ۲ ص ۵۳)

لطافت طبع اور ادراک حواس

آپ خلقی طور پر لطیف المزاج تھے لیکن کثرت ذکر نے اس لطافت کو دو چند کر دیا تھا آپ کے محسوسات اتنے قوی ہو گئے تھے کہ معمولی سی چیز کا بھی ادراک فرما لیتے تھے۔ ایک دن استنجا کے لئے جا رہے تھے۔ فرمایا کہ تمباکو کی بو آرہی ہے۔ خادم نے بعد میں دیکھا تو وہاں پان کی پیک پڑی تھی۔ اس کو کھرچ کر صاف کر دیا گیا تو واپسی پر فرمایا اب نہیں ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ضبط بھی کمال کا تھا، اگر اظہار سے کسی کو تکلیف پہنچنے کا احتمال ہوتا تو لطیف اشارے سے کہتے ورنہ خاموش رہتے۔ ایک مرتبہ چند آدمی بیٹھے تھے۔ جن کے کپڑوں سے میلے اور عرق آلود ہونے کی وجہ سے بو آرہی تھی۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ”میاں یحییٰ کبھی نہا بھی لیا کرو دیکھو جسم سے پسینہ کی بو آرہی ہے“

ایک دفعہ مولانا یحییٰ صاحب کے چھوٹے بھائی محمد الیاس (حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ) بانی تبلیغی جماعت) دس گیارہ برس کی عمر میں تھے دے پاؤں آئے اور چپکے سے حضرت کی مجلس میں بیٹھ گئے۔ معاً حضرت نے گردن اٹھائی اور فرمایا بچے کا سا سانس ہے“ کسی نے عرض کیا، محمد الیاس آئے ہیں۔ ایک بار مغرب کی نماز کے بعد واپسی پر ایک لڑکے کے پاس

سے گذرے تو فرمانے لگے۔ ”نمبردار کی سی بو آتی ہے“ عرض کیا گیا کہ ”نمبردار کا لڑکا اکرام الحق کھڑا ہے“..... حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی روایت ہے کہ بھائی عبدالرحمن چائے پکایا کرتے تھے اور بڑے شوق سے عمدہ چائے پکاتے اور حضرت کو بھی پیش کرتے، حضرت اکثر فرماتے کہ ”چائے میں کچے پانی کا ذائقہ آتا ہے“ عبدالرحمن صاحب ایک دن دل میں کہنے لگے کہ آج پانی اتنا پکا دوں گا کہ بھاپ بن کر اڑ جائے۔ بہر حال بہت دیر تک پانی پکا کر چائے پیش کی گئی تو فرمایا کہ کچے پانی کا ذائقہ تو اس میں بھی ہے، انہوں نے عرض کیا کہ حضرت وہم ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ عبدالرحمن صاحب نے جو دودھ گھر سے منگوا کر ملا لیا تھا اس میں گھر والوں نے کچھ پانی ملا دیا تھا..... حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) حضرت کے لئے چائے پکاتے مگر یہی بات حضرت فرماتے، بڑا غور کیا بات سمجھ میں نہ آئی، بالآخر پتہ چلا کہ چائے کی پیالیاں ٹھنڈے پانی یا کچے پانی سے دھونے کے بعد خشک نہیں کی جاتیں۔ چنانچہ اس کے بعد اس کا اہتمام کر کے چائے پیش کی گئی تو فرمایا۔ ”آج کچے پانی کی بو نہیں ہے۔“

اس طرح کی حکایتیں بے شمار ہیں سیرت کے باب میں ان کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت جسمانی اور روحانی دونوں لحاظ سے بڑے ذکی الحس، نازک مزاج اور معمولی اشیاء کا بھی ادراک کرتے تھے۔ دنیاوی امور میں اظہار نہ کرتے تھے مگر دینی معاملات میں اظہار کر کے عیوب و معصیات پر گرفت کرتے اور اصلاح احوال کی سعی فرماتے تھے۔

سواد تحریر

آپ کا خط نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھا۔ ہمیشہ رواں دواں اور قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ کئی ایک لوگوں کے پاس اب تک ان کی تحریریں موجود ہیں۔ آپ کی طویل تحریریں باریک قلم سے لکھی ہوئی موجود ہیں۔ جن کے مضامین بھی علمی ہیں، ہمیشہ قلم برداشتہ لکھنے کے عادی تھے اور لکھتے وقت حاضرین سے باتیں کرتے، ان کے سوالات کے جوابات دیتے تھے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود مجال ہے کہ کوئی لفظ غلط لکھ کر کاٹنا پڑا ہو۔ کبھی ایسا کرتے نہیں دیکھا گیا۔ جو فتوے و خطوط پریشانی و فکر کی حالت میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ نہایت غور و فکر کے بعد اطمینان سے لکھے گئے ہیں۔

تقریر تحریر کے مثل تھی

آپ کی تقریر بھی تحریر کے مثل صاف، جامع لیکن مختصر ہوتی تھی۔ جس میں جوامع الکلم کا پورا عکس نظر آتا ہے۔ آپ مسلسل تقریر فرماتے تو وہ گویا موتیوں کی لڑی ہوتی۔ ہر بات اپنے موقع پر ترتیب سے بیان کرتے چلے جاتے تھے۔ تقریر اور تحریر میں اس چیز کا ہونا عالی دماغی اور یکسوئی ذہن پر دلالت کرتا ہے اور پتہ دیتا ہے کہ اس انسان کا ذہن بالکل صاف ہے۔ اس میں کسی الجھن یا شک و ریب کا گزر نہیں۔

روزانہ کے معمولات

نماز فجر سے فارغ ہو کر آٹھ نو بجے تک ذکر و فکر میں خلوت کے اندر مشغول رہتے تھے۔ بعد ازاں نوافل پڑھتے اور طلبہ کو سبق شروع کر دیتے۔ جب ظاہری بینائی جاتی رہی تو تدریس ترک کر دی اور اس کی جگہ ارشاد و تحقیق کا دروازہ کھل گیا۔ اثناء سبق میں اگر کوئی مریض دوا پوچھتا تو بتاتے (طب جیسا کہ گذر ابا قاعدہ نہیں پڑھی تھی مگر ذہن اور حافظہ قوی ہونے کی وجہ سے ایک دو کتب کے مطالعہ سے تمام امراض و ادویات مستحضر رہتی تھیں) اول باقاعدہ مطب فرمایا۔ بعد ازاں قارورہ دیکھنا چھوڑ دیا کہ نسبت اور لطافت طبع اس کی متحمل نہ ہو سکی۔ صرف نبض اور بیان حال پر تشخیص و تجویز کا مدار رہا، جب آپ کے صاحبزادہ مولانا حکیم مسعود احمد دہلی سے طب حاصل کر کے آگئے تو مطب وہ کرنے لگے، اور آپ نے یہ کام ترک کر دیا۔ تدریس سے فارغ ہو کر خطوط اور استفتاء کے جوابات دیتے۔ جب تک بینائی رہی خود ہی جوابات لکھتے رہے۔ بعد ازاں مولانا یحییٰ کو تحریر کر دیتے۔ روز دو پہر کو دھوپ گھڑی سے گھڑی درست کرتے اس کا بے حد اہتمام تھا۔ کھانا کھاتے اور تھوڑی دیر کے لئے قیلولہ فرماتے (استراحت کرتے) نماز ظہر سے فارغ ہو کر قرآن پاک دیکھ کر تلاوت کرتے۔ بینائی جانے کے بعد زبانی تلاوت کرتے اور اس کے بعد پھر تدریس و تعلیم ہوتی عصر سے مغرب تک مجلس عام ہوتی تھی۔ حسب موقع کلمات نصائح اور قصص اکابر بیان فرما کر عوام و خواص کی تربیت فرماتے تھے، بعد مغرب نفل اوابین پڑھ کر مکان پر تشریف لے جاتے اور بعد نماز عشاء آرام فرماتے۔ علی الصبح تین بجے بیدار ہو کر تہجد پڑھتے۔ ابتداء میں آٹھ رکعت نفل پڑھتے تھے، بعد میں دس کا

معمول ہو گیا تھا۔ رکعات نفل بہت طویل ہوتیں۔ نوافل سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن پاک اور وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ اگر کچھ کسل ہوتا تو تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جاتے۔ ہمیشہ آپ کا یہ معمول رہا۔ اس میں کبھی تغیر و تبدل نہ ہوتا تھا۔ پوری زندگی اس پروگرام کے مطابق گذاردی۔ رمضان المبارک میں آپ کی عبادت میں مشغولی بڑھ جاتی تھی۔ (۱)

اپنے معاملات میں تقویٰ اور احتیاط اس قدر تھے کہ مسائل مختلف فیہا میں قول راجح اور اقرب الی الاحتیاط کو اختیار فرماتے تھے چاہے اس میں دقت ہی کیوں نہ ہو، مگر عام لوگوں کے لئے سہولت کو مد نظر رکھتے تھے اور وہ پہلو ان کو بتاتے تھے جس میں ان کو آسانی ہو۔ آپ کی احتیاط کی ایک ادنی مثال یہ ہے کہ آپ اپنی بیماریوں میں چاہے وہ کتنی شدید کیوں نہ ہوتیں ہمیشہ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ مرض الموت میں جب تک اتنی سکت رہی کہ دو تین آدمیوں کے سہارے سے کھڑے ہو سکیں۔ نماز کھڑے ہو کر پڑھی اور انہی کے سہارے رکوع و سجود کئے۔ خدام نے عرض کیا کہ بیٹھ کر نماز گزرائیے مگر نہ کچھ جواب دیا اور نہ ہی قبول فرمایا۔ ایک روز مولانا محمد یحییٰ نے کہا کہ حضرت اگر اس وقت بھی بیٹھ کر نماز جائز نہیں تو پھر اور کس وقت ہوگی اور وہ کونسی صورت ہوگی آپ نے فرمایا..... کہ ”امام صاحب کے نزدیک قادر بقدرۃ الغیر (غیر کے سہارے قدرت رکھنے والا) تو قادر ہوتا ہے اور جب میرے دوست ایسے ہیں کہ مجھ کو اٹھا کر نماز پڑھاتے ہیں تو میں کیونکر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہوں“ اور جب ضعف اس قدر ہو گیا کہ دوسروں کے سہارے بھی کھڑے ہونے کی ہمت نہ رہی تو اس وقت چند نمازیں بیٹھ کر پڑھیں۔ گویا بتلادیا کہ اتباع شرع اس کو کہتے ہیں کہ تقویٰ اس کا نام ہے اور اختیار اولی اس طرح ہوتا ہے۔

لباس غذا وغیرہ

لباس آپ ہر طرح کا پہن لیتے تھے۔ گاڑھا کھدر بھی پہنا اور اعلیٰ شال بھی استعمال کی۔ آپ کے نزدیک دونوں برابر تھے، لیکن مرغوب لباس سادہ تھا البتہ ستھرائی کا بہت خیال رکھتے چاہے ہلکا کپڑا ہوتا چاہے بڑھیا، صاف ستھرا ہوتا، غسل کرنے کی عادت روز کی تھی اور کبھی کبھی گرمیوں میں عشاء کے بعد بھی غسل فرما لیتے تھے۔ اگر کبھی میلا لباس پہنا تو نماز کے وقت

ضرورت تبدیل کر لیا۔ میلے کپڑے سے نماز نہ پڑھتے تھے اور فرمایا کرتے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتیں اس کے دربار میں حاضر ہوتے وقت بدن پر ہونی چاہئیں۔

حلال و لذیذ چیزوں سے آپ کو نفرت نہ تھی، عمدہ، ادنیٰ، کھانا بطیب خاطر کھاتے تھے اور ایک جیسی خوشی و فرحت حاصل کرتے تھے۔ کبھی کسی خاص غذا کے پابند نہ ہوتے نہ کسی شے کا بذات خود کوئی اہتمام فرمایا۔ البتہ ٹھنڈا پانی آپ کو بہت مرغوب تھا اور اس کا خانقاہ میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ ٹھنڈا پانی پی کر آپ بہت خوش ہوتے اور یوں فرماتے کہ یہ بڑی نعمت ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ کو ٹھنڈا پانی بہت مرغوب تھا۔ اسی لئے آپ نے دعا فرمائی ہے۔

اللہم اجعل حبك وحب من
يحبك احب الی من مالی
واہلی ومن الماء البارد

اے اللہ! اپنی محبت اور اپنی ذات سے
محبت کرنے والے شخص کی محبت میرے
مال، میرے اہل اور ٹھنڈے پانی سے
زیادہ مجھے محبوب کر دے۔

خمیری روٹی اور شوربے سے خاص رغبت تھی کہ یہ دونوں چیزیں سریع الہضم ہونے کی وجہ سے معدہ میں گرائی اور عبادت میں کسل پیدا نہیں کرتیں۔

خوشبو سے حد درجہ رغبت تھی۔ خصوصاً گلاب کا پھول اور عطر زیادہ پسند کرتے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ مولوی محمد قاسم کو گلاب سے بہت محبت تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ گلاب آنحضرت ﷺ کے عرق سے بنا ہے یہ حدیث..... اگرچہ ضعیف ہے مگر ہے تو حدیث..... چائے کی عادت نہ تھی۔ میسر ہوتی تو پی لیتے ورنہ نہ پیتے کبھی ہفتوں مسلسل پی اور کبھی ہفتوں نہیں پی جب تک دانت تھے اصرار پر پان کھا لیتے تھے۔ بینائی جانے پر لاٹھی کے سہارے مسجد کو آتے جاتے مگر یہ عادت نہ تھی کہ کوئی لاٹھی تھامے یا راستہ بتاتا چلے۔ آپ کو اول تو اٹکل تھی۔ دوسرے دیوار تھام کر اور ٹوہ کر چلتے تھے..... کھلکھلا کر آپ ساری عمر کبھی نہیں ہنسے۔ اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت کا ہر وقت غلبہ رہتا۔ بعض دفعہ ایسے قصے بیان فرماتے کہ سننے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے مگر آپ تبسم کناں ہوتے۔

نماز سے شغف، خدا کے وعدوں پر یقین

عام طور پر بیمار ہونے پر رغبت علاج کی طرف نہ تھی۔ احباب و خدام ہی اس کا خیال

فرماتے تھے۔ بینائی جانے پر متوسلین نے بہت کوشش کی کہ آنکھ بنوالی جائے مگر آپ راضی نہ ہوئے۔ کبھی تو یہ فرمایا کہ ”آدمی اپنے قویٰ کو دیکھے، آنکھ ہی درست ہو کر کیا کرے گی۔ دیکھو قاری عبد الرحمن نے آنکھ بنوائی، چھ ماہ کے بعد انتقال ہو گیا۔“ کبھی فرماتے ”آنکھ بنوانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ نماز پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اتنی کون تکلیف اٹھائے“ کبھی یہ فرمایا کہ ”بھئی میں نہیں بنواتا سنتا ہوں کہ آنکھ بننے پر طبیب چند روز حرکت کرنے کی ممانعت کر دیتا ہے اور مجھ سے بڑھاپے میں نماز نہیں چھوڑی جاتی.... لیکن جب سبحان علی خاں سول سرجن نے جو اس فن میں مشہور ڈاکٹر اور ماہر و سند یافتہ طبیب تھے خود حاضر ہو کر واثق وعدہ کیا کہ حضرت کوئی نماز قضا نہ ہوگی۔ چند گھنٹے حرکت سے پرہیز ہو گا جو فجر اور ظہر کے درمیان ممکن ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ ”مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہو سکتی اور آنکھوں بغیر میرا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے۔“ مولوی عبد اللہ نے از حد اصرار کیا تو آخر میں اصل بات فرمادی کہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ جس کی آنکھ لے لے اور وہ اس پر صبر کرے تو اس کا بدلہ جنت ہے سو شاید یہی ایک ذریعہ حصول جنت ہو۔ مجھے تو اندھا رہنا ہی پسند ہے اور ایک مرتبہ خاص لوگوں سے یوں بھی فرمایا کہ میاں پہلے تو آنکھیں بند کرنی پڑتی تھیں۔ الحمد للہ اب خود بند ہو گئیں پھر ان کے کھلوانے کی تمنا کیسی؟

عوام کیلئے سہولت

اوپر گذرا کہ اپنی ذات کیلئے تو حضرت ہر حال میں احتیاط اور اولیت کو اختیار فرماتے تھے۔ مگر عوام کے لئے جہاں تک ہو سکتا سہولت مد نظر رکھتے۔ البتہ بدعات و معصیات میں آپ کو تشدد پسند تھا اور سد الباب مبادی و مقدمات پر بھی عدم جواز کا فتویٰ دیتے تھے مثلاً محرم کو شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا سچا واقعہ بیان کرنے کو منع فرماتے تھے کہ اس میں روافض سے تشبہ ہے۔ دوسرے موقع پر بیان کرو کیوں وہ ان دنوں اس واقعہ کے سہارے صحابہ پر سب دشتم بھی کرتے ہیں۔ لیکن عام مسائل میں جہاں تک سہولت نکلتی اس کو اختیار فرماتے اور عموم بلوی کا بہت خیال فرماتے، ایک دفعہ تمباکو نوشی کا ذکر آیا تو فرمایا کہ ”مکروہ ہے کیونکہ منہ سے بد بو آتی ہے اور حقہ پر کیا منحصر ہے بد بو کی اور چیزیں مثلاً لہسن، پیاز، مولیٰ وغیرہ سب کچھ کھانا مکروہ ہیں“ ایک صاحب نے عرض کیا کہ بعض مولویوں نے تو حرام کہا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا،

سب غلط ہے تمباکو مثل اور ماکولات کے مباح ہے۔ اس پر کسی خادم نے عرض کیا کہ رمضان شریف میں چھٹی دم لگا کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمباکو نشہ آور ہے۔ آپ نے فرمایا خالی معدہ میں کالی مرچ سنگھادی جائے تو وہ بھی بے ہوش کر دیتی ہے، میاں تمباکو نشہ نہیں کرتا بلکہ اس کی تیزی خلو معدہ کے وقت البتہ بے ہوش کر دیتی ہے۔

نظر کی تیزی

ایک دفعہ حکیم ضیاء الدین کے یہاں راجپور تشریف لے گئے۔ ایک شخص صبح کو قارورہ لے کر آیا، اور حکیم صاحب کے سامنے پیش کیا۔ حضرت فاصلہ پر بیٹھے تھے۔ آپ نے دور ہی سے قارورہ پر نظر ڈالی اور جب وہ شخص قارورہ پھینکنے گیا تو آپ نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ ”اس مریض کا علاج سنبھل کر کرنا“ حکیم صاحب نے پوچھا حضرت کیوں؟ آپ نے فرمایا کہ ”اس کا حال ابتر ہے“ جب وہ شخص واپس آیا تو اس نے مریض کی ہچکی وغیرہ کی وہ کیفیت بیان کی، جو عالم نزع میں ہوتی ہے چنانچہ حکیم صاحب نے اسے ٹال دیا۔

ذکر پر ترغیب و ترہیب

کوئی شخص کیسا ہی قلب بگاڑ کر آپ کے پاس آتا، آپ اس کی اصلاح میں دریغ نہ کرتے بشرطیکہ اصلاح کی سچی طلب لے کر آیا ہو، خدام کی عیب پوشی میں آپ کو خاص ملکہ تھا خود بلند ہمت تھے۔ خدام و متوسلین کو عالی حوصلہ بناتے، پس ہمتوں کو ابھارتے اور اکثر فرماتے کہ جو کچھ حق تعالیٰ توفیق دے، کئے جاؤ ہمت نہ ہارو، اگر قلب میں اثر نہ ہو نہ سہی، آخر زبان سے ذکر ہونا تھوڑا نفع ہے۔ جب زبان اللہ کے ذکر کے سبب دوزخ سے بچے گی تو دل بھی تو ساتھ ہی بچے گا۔ مریدین میں یاس و ناامیدی نہ پیدا ہونے دیتے۔ مگر ایک حالت پر قائم و قانع رہنا گوارا نہ تھا، تحریر، تقریر، ہر انداز سے غرض جسطرح بن پڑتا ہر پہلو سے خدام کو توجہ الی اللہ کی ترغیب دلاتے اور یوں فرماتے کہ جتنا بھی ہو سکے کرو اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اسی سے ترقی ہوگی۔

وَلٰكِنْ شَكَرْتُمْ لَا زِيْدَنَّكُمْ وَلٰكِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (قرآن حکیم)

اور اگر تم شکر ادا کرو گے تو البتہ میں (نعمت) زیادہ کروں گا اور اگر کفران (نعمت) کرو گے تو بیشک میرا عذاب شدید ہے۔

اگرچہ گذشتہ سارا مضمون ”تذکرہ الرشید“ سے ماخوذ ہے اکثر جگہ اس کی عبارتیں خلاصہ کر کے پیش کر دی ہیں اور کسی جگہ جوں کے توں فقرے لے لئے ہیں۔ تاہم یہاں ایک طویل اقتباس ”تذکرۃ الرشید“ سے من وعن نقل کیا جاتا ہے۔ (۱)

”آپ ذکر اللہ کی تحریص و ترغیب میں یکتائے زمانہ تھے۔ عالم ہو یا جاہل، خاص ہو یا عامی، شریف ہو یا وضع، امیر ہو یا غریب، جو کوئی بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا فوراً ابدی اور رغبت الی الآخرت کا حسب مقدور کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لے کر جاتا تھا۔ اس وقت (۲) خدا کی مخلوق کی کئی ہزار راست گفتار زبانیں اس مضمون متفق ہیں کہ آپ کی صورت دیکھ کر خدا یاد آتا اور آپ کی صحبت میں بیٹھ کر دنیا سے نفرت پیدا ہوتی تھی۔ اتباع اور تمسک بالسنتہ کی تعلیم صرف آپ کی زبان نہ تھی بلکہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک جو افعال آپ سے صادر ہوتے وہ سب یہ سبق پڑھاتے اور یاد کرایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ کا نام انسان کا بڑا رفیق ہے اور بطحائی پیغمبر کا اتباع مسلمان کا اصل مقصود اور رضا کے مخلوق کا مضبوط وسیلہ۔“

حق تعالیٰ نے آپ کو جس مشغلہ میں لگایا تھا، اس کے اندر آپ کو اس درجہ پختگی عطا کی گئی تھی کہ کبھی فرق نہیں آیا۔ آفتاب عالم تاب صبح کو طلوع ہوتا اور شام کو افق مغرب میں غروب ہو جاتا تھا، ماہ تاب کبھی ہلال بن کر نکلتا اور کبھی بدر بنتا، کبھی دکھائی دیتا اور کبھی عالم کی نظروں سے چھپ جاتا تھا، کبھی روز روشن ہوتا تھا اور کبھی شب تاریک، کسی وقت سردی جلوہ گر ہوتی اور کسی وقت گرمی، غرض عالم حادث ہر روز مختلف ہوتا اور دنیا اپنے انقلاب عظیم کو ہر لمحہ پلٹتی اور بدلتی رہتی تھی مگر حضرت امام ربانی قدس سرہ کا ایک دم تھا کہ مضمون واحد یعنی خدائے یکتا وحدہ لا شریک معبود کی عبادت میں یکساں مصروف تھا۔ آپ اپنے نفس نفیس کی حیثیت سے اس خاصیت میں فرد تھے

(۱) میرے کانوں میں مولانا غلام رسول مہر کے بار بار کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے ہیں کہ ”تذکرۃ الرشید“ بہت عمدہ کتاب ہے اسکو پڑھ کر بڑا دل خوش ہوتا ہے۔ میں نے سالک صاحب (عبد المجید سالک) اور اپنے کئی دوسرے احباب کو یہ کتاب پڑھائی ہے اس کتاب کو پڑھ کر مولانا رشید احمد گنگوہی کی عظمت دلوں میں پیدا ہوتی ہے وہ اپنے دور کے سب سے بڑے آدمی تھے۔ ”ملخصاً“

(۲) تذکرۃ الرشید حضرت امام ربانی کی وفات کے دو سال بعد لکھا گیا تھا۔

کہ متغیر عالم کے تغیرات کا اثر آپ کے مستحسن مشغلہ پر نہ پڑا۔ آپ کے حالات زمانہ کے ماتحت بن کر بے شک تھے مگر سنت کے اتباع کا امر مشترک سب کو شامل اور ہر حالت میں موجود تھا۔ آپ کا دل اندر سے یوں چاہتا تھا کہ دنیا میں ایک تنفس بھی ایسا نہ ہو جس سے حق تعالیٰ کی معصیت اور جناب رسول اللہ ﷺ کی مخالفت ظاہر ہو۔ آپ شفقت کے درجہ میں اپنے نفس ہی کے خیر طلب نہ تھے بلکہ تمام عالم کے ساتھ آپ کو یہ ہمدردی تھی کہ کاش دوزخ میں جانے والا ایک بشر بھی نہ رہے۔ آپ اس درجہ رقیق القلب تھے کہ کسی کی حالت تکلیف یا تنگی و بد حالی سنتے تو بے چین ہو جاتے تھے۔ واقف ہو یا نا واقف، یگانہ ہو یا بے گانہ، کسی شخص کی بد حالی و عسرت آپ کو گوارا نہ تھی۔ جس طرح دنیا کی عسرت و بد حالی آپ کو صدمہ پہنچاتی، اس سے زیادہ آخرت کے افلاس پر آپ تنگ دل و بے چین ہوتے تھے، کسی شخص کی معصیت اور بد دینی سن کر آپ کو جس درجہ حزن ہوتا اور اس کے لئے آپ کا دل رویا اور دعا کیا کرتا تھا شاید اپنے فقر و افلاس پر بھی کسی کو رنج نہ ہوتا ہو گا۔ دشمن سے دشمن کے لئے بھی آپ نے کبھی بد دعا نہیں کی“ (۱)

ﷺ

بیعت و ارشاد

گر ہوائے اس سفر داری دلا دامن راہبر بگیر و پس بر آ
در ارادت باش صادق اے فرید تابیا بے گنج عرفاں را کلید
بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

بیعت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان کسی اچھے پرہیز گار، متقی، عالم با عمل اور باصلاحیت شخص کے ہاتھ پر توبہ کرے کہ میں آئندہ سے نیک کام کروں گا اور گناہوں سے اجتناب کروں گا۔ اور یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر اس طرح کا عزم وہ اکیلا کرے تو اس میں وہ استقلال و استقامت پیدا نہیں ہوتی جو ماضی کی عادات کو چھوڑنے اور مستقبل میں اچھی عادات پیدا کرنے میں کام دے سکے۔ خلیق احمد نظامی نے ”تاریخ مشائخ چشت“ میں مقصد بیعت کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے اس میں ایک جگہ چند سطروں میں بیعت کا فلسفہ بیان فرماتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بیعت میں ایک نفسیاتی مصلحت پوشیدہ ہے۔ جب انسان اپنے ماضی کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیتا ہے تو بہت سی باتیں اس کو اخلاق و مذہب کے خلاف نظر آتی ہیں۔ اس کا ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے وہ دل ہی دل میں اپنی معصیتوں سے توبہ کرتا ہے لیکن اسے اطمینان نہیں ہوتا۔ اس سے قلب میں ایک بے چینی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ماضی کا تصور اس کے لئے سوہان روح بن جاتا ہے اس کی توبہ اس تصور پر غالب نہیں آتی..... اب وہ ایک پاک باطن، نیک نفس انسان کے ہاتھ پر ترک معاصی اور تقویٰ کا عہد کرتا ہے شیخ یقین دلاتا ہے کہ..... ”تائب بامتنقی برابر است (۱)“..... اس کے دل کے زخموں پر ایک پھلیا سالگ

(۱) حدیث نبوی ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔ توبہ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جس سے کبھی گناہ نہیں ہوا (ابن ماجہ باب ذکر التوبہ)

جاتا ہے وہ اپنے مستقبل کو نئی امیدوں، محکم یقین اور بیدار احساس کے ساتھ سنوارنے کی کوشش کرتا ہے (۱)

جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں (اے محمد) وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے سو جو عہد شکنی کرتا ہے تو اپنی ذات کی مضرت پر عہد توڑتا ہے اور جس نے وہ عہد پورا کیا جو اللہ سے کیا تھا اس کو عنقریب اجر عظیم ملے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۖ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهِ اللَّهُ فَمَن يُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا.

(سورہ فتح پارہ ۲۶)

تصوف کے سلاسل اربعہ

چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، چاروں سلسلوں میں بیعت کا طریقہ یہی تھا کہ ایک کامل شیخ کے ہاتھوں پر اپنے گناہوں کی کوئی توبہ کرے اور شیخ کے سامنے آئندہ کے لئے نیک کام کرنے کا عہد کرے لیکن مرشد اور شیخ عامل شریعت اور تابع سنت ہونا ضروری ہے۔ یونہی رسمی طور پر کسی شہرت یافتہ پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا تاکہ ہم بھی اس کے مریدوں میں شامل ہو جائیں۔ بیعت کے مقصد کو پورا نہیں کرتا، بیعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان شیخ سے اپنے باطن کی اصلاح کرائے۔ جس طرح جسمانی امراض کے علاج کے لئے کسی ماہر معالج مستند طبیب اور کوالیفائڈ ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روحانی امراض کے لئے بھی ماہر معالج کی ضرورت ہے لاکھوں میں شاید کوئی ایسا آدمی ہو جو طب کی کتابیں پڑھ کر اپنا آپ علاج کر سکے۔ لیکن جو ایسا کر سکتا ہے وہ پھر ایسا نہیں کرتا بلکہ اچھے سے اچھے معالج کی تلاش کر کے علاج کراتا ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بخار کی بیشمار اقسام میں سے وہ تمیز نہ کر سکے کہ مجھے کونسا بخار ہے، اسی طرح روحانی امراض میں وہ بعض امراض کو صفات سمجھ کر اس پر عمل پیرا رہے اور ساری عمر اس کو دور کرنے کی کوشش نہ کرے، تکبر اور غرور کو خودی اور خودداری سمجھ لے علیٰ ہذا القیاس دوسری بیماریوں کو خوبیاں سمجھتا رہے۔

یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر سلف و خلف نے بیشمار کتابیں لکھی ہیں۔ اگر آج کل بعض

لوگ تصوف یا پیری مریدی کو اپنے دنیاوی مفاد کیلئے استعمال کرتے اور اس سے اپنی وجاہت بڑھاتے ہیں، اگر آج کل بے عمل صوفی یا بدکردار جاہل پیر اور گمراہ سجادہ نشین اس پاکیزہ راستے کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس کی اصلاح کرنا چاہئے نہ کہ سرے سے سلوک و طریقت ہی کا انکار کر دیا جائے۔ یہ تو بالکل اسی طرح ہے جس طرح آج کل کے لوگوں کے اسلام کو محض چند رسوم اور عقائد فاسدہ و باطلہ کا مجموعہ دیکھ کر اسلام ہی کو ختم کرنے کی مذموم کوشش شروع کر دی جائے۔

حضرت مولانا گنگوہی کی ایک عربی عبارت سے اسی مضمون میں واضح ہو چکا ہے کہ صوفی کسے کہتے ہیں اور سلوک و معرفت کیا ہے۔ تصوف دین و شریعت کی روح و معنی یا کیف و کمال کا نام ہے، جس کا کام انسان کے باطن کو تمام رذائل اور برے اخلاق سے پاک صاف کرنا ہے اور ان باطنی امراض یعنی رذائل اور اخلاق ذمیمہ کو دور کرنے اور اپنی روحانی صحت کی اطلاع کے لئے ایک ایسے شخص سے رجوع کرنے کو کہ جو رذائل اور اخلاق ذمیمہ سے پاک ہو، بیعت کہلاتا ہے مولانا ابوالکلام آزاد ”تذکرہ“ میں تحریر فرماتے ہیں۔

”الغرض توفیق الہی کی سینکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت و تربیت غیبی کے ہزاروں بھیس ہیں۔ سب سے زیادہ آسان و پرامن راہ یہ ہے کہ رہنمائی طریق میں سے کسی صاحب ارشاد کی ہمت و صحبت حاصل ہو جائے“ (تذکرہ ص ۲۹۸) ”نظام شمسی کی طرح نظام انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں مگر تم کو ان کا حال نہیں معلوم۔ تم کو اجرام سماویہ کا مرکز معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم عالم انسانیت کے نظام و مراکز کے کشف کیلئے کتنا زمانہ درکار ہو گا؟ تاہم اتنا معلوم رہے کہ ہر دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکز شمسی کی طرح تمام انسانوں کا مرکز محبت اور کعبہ انجذاب ہوتا ہے۔ اور جس طرح نظام شمسی کا ہر متحرک ستارہ صرف اس لئے ہے کہ کعبہ شمس کا طواف کرے اسی طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے ہجوم بھی صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ اس مرکز انسانیت اور کعبہ ہدایت کا طواف کریں۔ زمین والوں پر ہی موقوف نہیں آسمانوں میں بھی

صرف انہی کے کارناموں کی بکار ہوتی ہے“ (تذکرہ ص ۶۶)

شیخ یا پیر منتخب کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح سے جانچ اور پرکھ لیا جائے کہ آیا وہ کتاب و سنت کا پابند اور معاملات و معاشرت میں ٹھیک ہے۔ ایسے شیخ کا انتخاب کرنے کے بعد پھر شیخ پر اسی طرح اعتماد کیا جائے جس طرح کہ طبیب حاذق پر کیا جاتا ہے۔ اپنے باطنی امراض کا ذکر کر کے انکا علاج پوچھا جائے اور شیخ جو حکم دے اس کو پورے طور پر نبھایا جائے۔

حضرت گنگوہی..... ایک مرشد کامل

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور ان کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شیخ و مرشد میں جن خصوصیات و صفات کا ہونا ضروری ہے وہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ کتاب و سنت کی تعلیمات اور احکامات کو پڑھتے جانیے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کو دیکھتے جانیے معلوم ہوگا کہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہے۔ طبیب کامل کیلئے ضروری نہیں کہ وہ خود بھی حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کرے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ خود پورا صحت مند ہی ہو تو علاج کرے لیکن روحانی معالج کے لئے ضروری ہے کہ وہ جن کا علاج کرتا ہے یا جن روحانی بیماریوں سے نجات پانے کے لئے لوگ اس کے پاس حاضر ہوں وہ خود ان امراض سے پاک ہو اور روحانی طور پر مکمل صحت یاب ہو۔ ایسا شیخ، شیخ کامل نہیں ہے جو خود امراض باطنی میں مبتلا ہو مگر دوسرے کی اصلاح و تزکیہ کا بیڑا اٹھائے۔ اس سلسلے میں یہ مثال بڑی بلیغ ہے کہ ایک بزرگ شخصیت کے پاس ایک عورت اپنے بچے کو لئے حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اس کو نصیحت کریں کہ گڑنہ کھایا کرے اور دعا بھی کریں تو انہوں نے فرمایا کہ کل آنا، عورت دوسرے روز حاضر ہوئی تو آپ نے بچے کو نصیحت بھی فرمائی اور دعا بھی کی۔ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ نصیحت کل کیوں نہ فرمائی۔ تو جواب دیا کہ کل میں نے بھی گڑ کھایا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر آج میں اسے نصیحت کرتا ہوں تو اس کا اثر نہ ہوگا۔ لہذا میں نے کہا کہ کل آنا۔ اندازہ فرمائیے کہ اگر ایک جائز امر میں نصیحت کے لئے اس سے خود احتیاط کی ضرورت شیخ کامل کے نزدیک ضروری ہے تو ترک سنن، منکرات و فواحش اور باطنی امراض میں واعظ و ناصح یا شیخ کے لئے کتنا ضروری ہوگا کہ وہ ان کا مرتکب و فاعل نہ ہو۔ قرآن پاک اس کو اللہ کی ناراضگی کا موجب بتاتا ہے کہ انسان خود تو عمل نہ کرے لیکن دوسرے کو نصیحت کرے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ (القف: ۳)

اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو منہ سے جو نہیں کرتے بڑی بیزاری کی بات ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو۔

جسم ظاہر ہے لہذا اس کے امراض واضح اور علاج و تدبیر بھی ظاہر ہے لیکن روح باطن کی چیز ہے لہذا اس کی بیماریاں خفی ہیں۔ ان کو دیکھنے اور علاج کرنے کیلئے بصیرت اور فقاہت کی ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے میں جس طرح ان پڑھ جاہل اور اناڑی بڑے بڑے القاب کیساتھ اپنے حکیم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اسی طرح روحانی دنیا میں گمراہ، بد عقیدہ اور بے عمل لوگ مسند طریقت پر براجمان ہیں۔ ایک حکیم یا طبیب غلط تجویز و تشخیص سے بیماری کو طول دینے یا مریض کی جان لینے کا سبب بنتا ہے اور گمراہ پیر یا مرشد ایمان کی خرابی اور گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ بعض بڑے نامور اور مستند طبیب علاج کرتے بھی ہیں اور علاج کرنا سکھاتے بھی ہیں۔ اسی طرح شیخ کامل عوامی تربیت بھی کرتا ہے اور اس سے زیادہ ایسے لوگوں کی اصلاح کر کے ان کو امراض روحانی کا معالج بناتا ہے جو صحیح طور پر وسیع پیمانے پر لوگوں کا علاج کر سکیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا دربار اپنے وقت کا سب سے بڑا مطب بھی تھا کہ جہاں آنے والوں کے مرض دیکھ کر ان کی دوا تشخیص کی جاتی تھی اور ایسی تربیت گاہ بھی تھا کہ جہاں علاج کرنا سکھایا جاتا تھا۔

صدق و طلب کا امتحان

کئی لوگ رسمی طور پر دیکھا دیکھی کسی بڑے پیر کا مرید ہونے کے لئے آجاتے ہیں یا کسی دنیوی غرض و مفاد کے لئے کسی بڑے شیخ سے بیعت ہوتے ہیں یا بعض امتحاناً آجاتے ہیں کہ دیکھیں شیخ کیسا ہے اصلاح مقصود نہیں ہوتی۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس بارے میں اپنی خداداد صداقت و فقاہت اور بصیرت و فراست ایمانی کو کام میں لاتے تھے اور دیکھتے تھے کہ آیا آنے والا طلب صادق سے واقعتاً اپنی اصلاح کرنا چاہتا ہے؟ اور اس کی یہ طلب کہاں تک ہے۔ چنانچہ اس طرح کی مثالیں کثرت سے ہیں کہ ایک آدمی بیعت کے لئے حاضر ہوا لیکن حضرت نے انکار فرمادیا، دیکھنے والوں کو تعجب ہوا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ حضرت کا انکار ٹھیک تھا۔ لوگ آج کل بطور فیشن بیعت ہوتے ہیں۔ مطلق غذا کے لئے سچی بھوک کی ضرورت ہے، اس کے

بغیر غذا کتنی ہی لذیذ یا مرغن کیوں نہ ہو، کوئی فائدہ نہیں دیتی، بلکہ الٹا نقصان کرتی ہے، اسی طرح طلب صادق کے بغیر اذکار و اشغال وغیرہ کچھ فائدہ نہیں دیتے۔

مولوی ولایت حسین صاحب کہتے ہیں کہ فراغت علم کے بعد میں نے خیال کیا کہ بیعت کرنا چاہئے۔ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مولانا فضل الرحمنؒ مراد آبادیؒ دو بزرگ ذہن میں تھے۔ زیادہ عقیدت مولانا فضل الرحمنؒ سے تھی۔ لیکن حضرت گنگوہیؒ سے بذریعہ تحریر درخواست بیعت کی۔ تو فرمایا کہ اس وقت نہ بیعت جائز اور نہ نافع، ایک روز رہ کر جب روانگی کے وقت رخصت کیلئے حاضر ہوا تو فرمایا کہ یہ سب شیطانی دھوکے ہیں کہ مشغلہ علم سے باز رکھ کر اوراد و وظائف کی طرف مشغول کرتا ہے۔ تم نے حدیث میں پڑھا ہے کہ شیطان پر ہزار عابد سے ایک عالم بھاری ہے۔ جاؤ اور کتب درسیہ پڑھاؤ..... اس کے بعد حضرت گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کا ارادہ پختہ ہو گیا اور یکسوئی ہو گئی تو درخواست منظور کر لی گئی اور بیعت کر لیا۔

ایک نوجوان جو شکل و صورت سے بڑے صالح نظر آتے تھے، بیعت کیلئے حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا میں تمہیں قطعاً بیعت نہیں کروں گا۔ مولانا محمد یحییٰ کی سفارش بھی کام نہ آئی ایک دن ڈاک میں خط آیا جو گالیوں سے شروع ہوتا تھا، ایک دو فقرے مولانا محمد یحییٰ نے پڑھے پھر رک گئے۔ حضرت نے پوچھا کہ تمہیں علم بھی ہے یہ کس کا خط ہے اور پھر فرمایا کہ یہ انہی صاحب کا ہے جن کی بیعت کی سفارش تم نے کی تھی سہارنپور پہنچ کر عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

ایک بزرگ آئے۔ دیکھا نہ آؤ بھگت ہے نہ تعظیم و تکریم۔ اس لئے بہت رنجیدہ ہوئے بادل نحواستہ درخواست بیعت کی، آپ نے انکار فرمایا اور کہا ”یہاں کیا دھرا ہے میں مرید نہیں کروں گا“ یہ صاحب جب تک رہے نہ کسی سے بات کی اور نہ کھلے آخر چلے آئے اور پھر جس کسی سے ملے تو یوں کہا ”میاں کیا دھرا ہے بس دور کے ڈھول ہیں جس کا نام خلق ہے اس کا پتہ بھی نہیں۔ ہم تو امتحان لینے گئے تھے، جب یہ رنگ دیکھا تو چلے آئے، مرید ہو کر لیتے کیا؟“

ایک دن خانقاہ میں دو شخص آئے حضرت سے مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔ آپ نے دریافت فرمایا کون؟ انہوں نے عرض کیا کہ ”حضرت ہم آپ کے مرید ہیں“ آپ نے بے ساختہ فرمایا ”نہیں تم میرے مرید نہیں“ انہوں نے پھر عرض کیا کہ ”حضرت آپ کو یاد نہیں رہا“ مگر حضرت نے پھر وہی ارشاد فرمایا انہوں نے پھر کہا حضرت نے پھر کہا کہ ”نہیں تم میرے ہرگز مرید نہیں“ آخر دونوں صاحب حجرہ سے باہر آئے اور مفتی کفایت اللہ صاحب کے پاس بیٹھ

کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ اسی اثناء میں کہنے لگے کہ مولوی صاحب یہاں کھانا بھی ملے گا یا نہیں؟ مفتی صاحب اس سوال پر چونکے اور کہا کہ میاں لنگر تو یہاں ہے نہیں کہ جس کا جی چاہے آئے حضرت کے جو مہمان آتے ہیں وہ کھانا بھی کھا لیتے ہیں باقی خیر صلا ہے۔ مہمان صاف گو تھے یہ جواب سن کر کہنے لگے کہ ہم نے تو کھانے کے واسطے یہ ڈھنگ نکالا تھا مگر مولوی صاحب پہچان گئے۔

ایک قصہ اسی قسم کا پہلے گزر چکا ہے کہ ایک صاحب آئے اور بیعت کی درخواست کی تو حضرت نے نہ صرف انکار کیا بلکہ ڈانٹا اور کہا کہ چلے جاؤ اور اگر نہ جائیں تو اسباب اٹھا کر پھینک دو۔ حکیم محمد یوسف کو ترس آیا۔ گھر لے جا کر تشفی دی اگلے دن حکیم صاحب نے قصد کیا کہ اس کے بارے میں کچھ کہیں۔ لیکن حضرت نے ان کے کہنے سے پہلے ہی فرمایا کہ اسے کیوں ٹھہرا رکھا ہے ٹو کرادو اور کہہ دو کہ چلتا ہو..... اب حکیم صاحب کیا کہتے؟ عصر کے بعد تقریب پیدا کرنا چاہی تو حضرت نے بولنے سے پہلے ہی فرمایا کہ اس کو ابھی چلتا نہیں کیا؟ حکیم صاحب نے عرض کیا حضرت آئے مہمان کو کس طرح نکالا جائے۔ آپ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا کیسی مروت؟ آخر پھر چپکے چلے آئے۔ اور رات کو معلوم ہوا کہ وہ حکومت کا جاسوس ہے۔ اگلے دن صبح صبح روانہ کیا اور حضرت کی خدمت میں آئے۔ تو حضرت مسکرائے اور آہستہ سے فرمایا ”ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس کو چلتا کرو، تم ہی نے نہ مانا۔“

ایک بار ایک طالب علم بیعت کیلئے آئے آپ نے فرمایا تحصیل علم کرو اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ طالب علم عموماً حجت کے عادی ہوتے ہیں کہنے لگے کہ حضرت فراغت کے بعد خدا جانے کیا ہو کون مرے کون جئے؟ آپ نے فرمایا کہ دین کا کام بند نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو توفیق ہوئی تو میرے بعد دوسرے تمہیں بیعت کر لیں گے۔ طالب علم نے پھر کہا ممکن ہے کہ میں ہی مرجاؤں آپ نے فرمایا ”طلب میں مرجاؤ گے تو اچھا ہے“ جب اس پر بھی طالب علم کی تقریر ختم نہ ہوئی اور بار بار سوال ہوا کہ میرا جی چاہتا ہے مجھے تو مرید کر ہی لیجئے۔ تو آپ کو غصہ آگیا، لیٹے سے اٹھ بیٹھے اور فرمایا تم طالب علم ہو، اچھا بتاؤ مرید کے کیا معنی؟ طالب علم نے جواب دیا کہ ”کسی کام کا ارادہ کرنے والا“ آپ نے فرمایا ”جی تو کہتا ہوں تمہیں ابھی مرید کے معنی بھی معلوم نہیں اور مرید ہونے آگئے۔ یہ باب افعال سے ہے، ہمزہ سلب کا ہے مرید کے معنی ہیں مسلوب الارادہ کہ جو پیر کہے وہی مان لے۔ اپنی طرف سے ارادہ ہی نہ

کرے۔ "اس پر طالب علم خاموش ہوئے اور پھر نہیں کہا کہ مجھے مرید کر لو۔ آپ طالب علموں کو مرید نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ حضرت تھانوی جیسے ذکی، سلیم الفطرت اور ذہین طالب علم کو بیعت نہیں کیا۔ اکثر طلبہ کی عادت ہوتی ہے کہ سندلی اور خیال کیا کہ چلو اب بیعت سے بھی فارغ ہو لیں۔ حضرت انکار فرما دیتے تھے۔ اس طرح کے سینکڑوں واقعات پیش آئے چند ایک مثلاً پیش کر دیئے ہیں۔

اگر کوئی مرید ہونے آتا تو اس کو استخارہ کرنے کو کہتے اور اکثر کو کئی کئی دفعہ استخارہ کرنے کا حکم دیا۔ ذی شعور یا پڑھے لکھے جس وقت آپ سے بیعت ہونا چاہتے تو آپ اول ان کو ٹالتے اور یہ فرما کر کہ مجھے کیا آتا ہے اور یہاں کیا رکھا ہے ان کی طلب کا پہلا امتحان لیا کرتے تھے۔ اور اگر اس پر بھی ان کی خواہش رہتی تو پھر ان کو بیعت کی غایت بتاتے کہ بیعت کا مقصود تو یہ ہے کہ آدمی کچھ کرے اور دو مہینے یہاں آکر رہے اگر یہ نہ کر سکے تو مرید ہونے سے کیا نفع؟ اس کے بعد بھی اگر سائل کہتا کہ حضرت حصول برکت سلسلہ بھی بڑا نفع ہے تو آپ اس کو داخل سلسلہ فرما لیتے..... لیکن اس کے عکس اگر ان پڑھ دیہاتی بیعت کے لئے آتے تو فوراً بیعت کر لیتے عورتوں کو بھی عموماً جلد بیعت کر لیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ عورتوں کو اگر کچھ پڑھنے کو بتایا جائے تو اس کو فوراً معمول بنالیتی ہیں۔

بیعت کا طریقہ

بیعت ہمیشہ با وضو کرتے اور چونکہ آپ ہمیشہ با وضو رہتے تھے اس لئے بیعت بھی عموماً ہر وقت ہی کر لیتے تھے۔ کوئی خاص وقت متعین نہ تھا جس وقت بھی آپ کا منشاء ہوا طالب کو وضو کرنے کا حکم ہوا تو آپ نے توبہ کرادی مگر پھر بھی صلوٰۃ مکتوبہ کے بعد خصوصاً عصر یا جمعہ کے بعد آپ بیعت فرمایا کرتے تھے۔ جس وقت آپ کسی کو بیعت فرماتے تو گردن نیچے جھکا لیتے اور طالب کو مخاطب بنا کر یوں فرمایا کرتے تھے۔

"کہو ایمان لایا میں خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے نبیوں پر، اور تقدیر پر، کہ بھلا برا سب خدا ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد زندہ ہونے پر، توبہ کی میں نے کفر سے، شرک سے، بدعت سے اور ساری معصیت سے، عہد کیا میں نے جھوٹ نہیں بولوں گا، چوری نہیں

کروں گا، زنا نہیں کروں گا، کسی پر جھوٹا بہتان نہیں باندھوں گا، پانچ وقت کی نماز پڑھوں گا، رمضان کے روزے رکھوں گا، اگر مال ہو گا تو حج کروں گا، زکوٰۃ واجب ہوگی تو زکوٰۃ دوں گا، اگر کوئی قصور ہو جائے گا تو فوراً توبہ کروں گا،

بیعت کی میں نے رشید احمد کے ہاتھ پر خاندانِ چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ میں

اس کے بعد آپ ہاتھ چھوڑ دیتے اور مختصر مگر جامع نصیحت فرمایا کرتے تھے، کہ بیعت نام عہد کا ہے جو خدا سے کیا جاتا ہے سو اس کا دھیان رکھنا چاہئے کہ ٹوٹنے نہ پائے، اصل بیعت یہی ہے کہ آدمی اپنے وعدے کا پکار ہے اور حق تعالیٰ کی رضا کا طالب رہے سنت کا اتباع ہر وقت ملحوظ رکھے، اس سے قدم نہ ہٹائے، اسکے بعد بزرگوں نے جو طریق ذکر و شغل کا تجویز کیا ہے۔ وہ اسی کی مضبوطی کے لئے ہے۔ جس کو ہمت ہو وہ کرے اور نہ ہو سکے تو اپنی نماز، روزہ کو درست رکھے یہی سب کچھ ہے۔

آپ اپنے متوسلین سے تعارف حاصل فرماتے اور کیسا ہی اجنبی کیوں نہ ہوتا، کم سے کم اس کا نام ضرور دریافت فرمالیا کرتے تھے، حدیث کے اور اد تعلیم کرنے کے بعد فرماتے کہ اپنی گنجائش دیکھ لینا جتنا ہو سکے اتنا کرنا چاہئے۔ تھوڑا ہو مگر ہمیشہ ہو، نباہ بڑی چیز ہے۔ یہ بات ٹھیک نہیں کہ آج کیا اور کل چھوڑا۔ کوئی کام ٹھانے بغیر نہیں سنورتا، خاص کر دین کا کام اس میں تو بڑی پختگی کی حاجت ہے۔ پیر کی مٹھی میں کچھ نہیں دھرا ہوتا کہ مریدوں کو پکڑا دے۔ پیر کا کام تو بتا دینا ہے، کرنا اپنا کام ہے بندہ سے جو کچھ ہو سکے کرے اور کوتاہی کی توبہ کرے کہ بشر ہر وقت خطا کار ہے۔

دیہاتی لوگ خدمت میں حاضر ہوتے تو حضرت ان سے بہت ہی بشاشت سے گفتگو کرتے تھے اور چونکہ آپ کے ہاں کوئی رکھ رکھاؤ یا تکلف نہیں تھا لہذا دیہاتی بھی بے تکلف باتیں کرتے اور ہر طرح کے مسائل پوچھتے۔ آپ ان سے دیہاتی زبان میں گفتگو فرماتے۔ یہ نظارہ بڑا فرحت بخش ہوتا کہ مخلص اور بے ریا دیہاتی کس بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے کئی لوگ شاید اسے گستاخی یا معیوب سمجھتے ہوں لیکن سچی بات یہ ہے کہ اصل تمدن یہی ہے، اور یہی حضور ﷺ کی تعلیم ہے

قبول ہدیہ

منتسبین اور نیاز مندوں سے ہدیہ قبول کرنے میں آپ کا معمول مختلف تھا، بعض سے

قبول کر لیتے اور بعض سے نہیں، کئی دفعہ ایسا ہوا کہ لوگوں نے خاصی رقوم پیش کیں مگر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اصرار کے باوجود قبول نہیں فرمایا۔ اگر حاجت مند خدام کچھ پیش کرتے تو آپ انکار کر دیتے کہ مجھے حاجت نہیں اور تم حاجت مند ہو اپنے صرف میں لاؤ۔ مگر جب دیکھتے کہ خادم کا دل ٹوٹا اور روئے دیتا ہے تو قبول کر لیتے۔ بعض دفعہ کسی مخلص سے بہت تھوڑا ہدیہ بڑی بشاشت و انبساط سے قبول فرمایا۔

ایک دفعہ ایک مخلص خادم مولانا محمد اسماعیل نے نذر پیش کی اور بے حد اصرار کیا اور چونکہ بہت بے تکلف تھے اس لئے کہا کہ یہ تو آپ کو لینی ہی ہوگی۔ مگر آپ نے نہ مانا اور ہر بار یہی کہا کہ میاں مجھے ضرورت نہیں ہے۔ ایک دوسرے مخلص نے نذر گزرائی تو ان کو بھی انکار کر دیا، اور فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اتنا دیا ہے کہ مجھ سے اور میرے مہمانوں سے کھایا بھی نہیں جاتا میں لے کر کیا کروں گا۔ ایک سے کہا کہ کیا نفع کہ دوسرے روپوں میں ملا کر رکھ لوں گا، تمہارے تو اس سے بیسیوں کام نکلیں گے۔ آخر جب ان کا اصرار بہت بڑھا تو آپ نے روپوں پر ہاتھ رکھ دیا اور فرمایا لو بس میں نے لے لئے، اب ان کو میری طرف سے اپنے بال بچوں پر خرچ کرو۔

متوسلین و ممتاز خلفاء

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں ایسے منتخب حضرات شامل ہیں کہ ان میں سے ایک ایک فرد پر جماعت کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، خصوصاً بعض علماء تو ایسے ہیں کہ جن کو حدیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم..... فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادنا کم..... اور..... فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد..... کا مصداق ٹھہرا یا جاسکتا ہے۔ مثلاً حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ تو ایسے باکمال حضرات ہیں کہ جن کو عالم اسلام کا ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں بڑے بڑے جید علماء آپ کے حلقہ ارادت میں شریک ہوئے اور پچاس ہزار کے لگ بھگ دوسرے متوسلین ہیں۔ جن میں امراء، روساء، عوام غرض کہ ہر طبقہ و جماعت کے افراد شریک ہیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے ریاست بھوپال حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونا چاہتی تھیں مگر حضرت حاجی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف راغب ہوئیں اور مراسلت شروع ہوئی۔ اول تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ملیح طرز سے امتحان طلب لیا۔ لیکن جب بیگم صاحبہ کی طرف سے اصرار و اخلاص کا مظاہرہ ہوا، تو آپ نے تحریر فرمایا۔

”بیعت دو وجہ سے کی جاتی ہے۔ ایک تو بغرض تحصیل نسبت و حصول برکاتِ طریقت۔ اس کیلئے ایک مدت دراز مرشد کے پاس رہنا ضروری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نہ میں وہاں آسکتا ہوں نہ بیگم صاحبہ کی یہاں تشریف آوری مناسب ہے اور بدوں اسکے یہ بیعت بیکار ہے۔ دوسری بیعت بغرض شرکت و تعلق بزرگان جس میں محض دخول سلسلہ ہوتا ہے اس کو اول تو بندہ کچھ مفید نہیں جانتا۔ دوسرے اس وجہ سے رئیسہ دام اقبالہا کو جو میرے حال پر نظر عنایت و توجہ اور التفات ہوگی، اس سے مجھے سخت ندامت ہوگی۔ نیز اس کی شہرت سے اہل حاجات بھی بندہ کو روز روز تنگ کریں گے جن میں سے کسی کی سعی و سفارش مناسب ہوگی کسی کی غیر مناسب، پھر یہ کہ جب رئیسہ دام اقبالہا کو میرے ساتھ محبت و اخلاص ہے تو یہ تعلق و اتحاد حاصل ہے بائیں ہمہ اگر اصرار ہو تو دو شرط سے مجھے منظور ہے ایک یہ کہ میرے ساتھ قدیمی برتاؤ میں کوئی تفاوت نہ آوے اور میرے ساتھ کسی قسم کی مروت و احسان نہ ہو۔ دوسرے اس امر کا اظہار نہ ہو۔ اگر یہ دونوں امر منظور ہوں تو میں ان کی بیعت اس امر پر قبول کرتا ہوں کہ اتباع سنت اور اجتناب بدعت کو اپنا شعار رکھیں اور حق پرستی و عدل گستری و انصاف سے رعایا پروری میں مصروف ہوں۔ والسلام“

چنانچہ رئیسہ عالیہ مذکورہ نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا والا نامہ پڑھ کر مولوی محمد محی الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ قاضی ریاست کو خط دے کر بھیجا اور آپ نے ملکہ کو بیعت کر لیا۔ اس بیعت کے آٹھ ہفتہ بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا اگر اس بیعت میں بھی تاخیر ہو جاتی تو مدوحہ کا افسوس دو چند ہو جاتا جو ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ ہجری کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر ہوا تھا۔

حسی کرامات

عوام کے نزدیک ایسی کرامات جو قانون عادت سے خارج اور صورت عجب ہوں بڑا کمال ہیں۔ مثلاً کسی کے مافی الضمیر مطلع ہو جانا، پانی پر چلنا، ہوا پر اڑنا وغیرہ۔ لیکن خواص کے نزدیک بڑا کمال کرامت معنوی ہے جیسے شریعت پر مستقیم رہنا۔ مکارم اخلاق کا خوگر ہو جانا، نیک کاموں کا بے تکلف صادر ہونا، عادات ذمہ سے قلب کا طاہر ہو جانا اور کوئی سانس غفلت میں نہ گذرنا۔ یہ وہ کرامت ہے جس میں استدراج کا احتمال نہیں اور وہ یکتائی ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں۔ اگر پہلی قسم کی چیزوں میں سے کوئی پائی جائے اور دوسری صفات سے انسان خالی ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ البتہ اگر دوسری قسم کی صفات کے ساتھ پہلی چیزوں میں سے کوئی امر پایا جائے تو سونے پر سہاگہ ہے تاہم یہ یاد رہے کہ ضروری نہیں کہ جو شخص کمالات معنوی کا حامل ہو، اس میں کرامات حسی ضرور پائی جائیں۔ ولایت اور عبدیت کیلئے دوسری صفات بس کرتی ہیں۔ الحمد للہ ہمارے بزرگان دیوبند دونوں کے حامل ہیں بلکہ یوں کہئے کہ وہ ہر لحاظ سے جامع اور کامل ہیں عشق کی مستی اور جذب و شوق بھی پایا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ کتاب و سنت کے ساتھ تمسک عملی کی وہ شان ہے جو صرف خاصان خدا اور مقربان بارگاہ ہی کا حصہ ہے

ہم سمنذر (۱) باش وہم ماہی کہ در اقلیم عشق

روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

کمالات معنوی کے بعد کمالات حسی کا ذکر کرنا غیر ضروری سا ہے تاہم بعض لوگوں کے نزدیک بزرگوں کو سوانح کا یہ بھی ایک حصہ ہے انہی کے ذوق کی خاطر چند ایسے واقعات کا ذکر کیا جا رہا ہے (اسی قبیل کے چند واقعات ”مرشد کامل“ کے عنوان کے تحت ذکر ہو چکے ہیں)

ہاتھ جھٹک دیئے

ایک دفعہ ایک نابینا شخص پا پیادہ میرٹھ سے گنگوہ پہنچا اور کہا کہ اللہ کا نام سیکھنے آیا ہوں۔ اہل

(۱) سمنذر، ایسے جانور کا نام ہے جو آگ میں پیدا ہوتا اور آگ میں زندہ رہتا ہے۔

خانقاہ اس کے عاشقانہ شوق سے بہت متاثر ہوئے اور خوب خاطر مدارات کی۔ حضرت مسجد میں تشریف لائے، اس نے مصافحہ کرنا چاہا تو آپ نے ہاتھ جھٹک دیئے اور بڑی لاپرواہی کے ساتھ اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ ہر چند اس نے اپنی طلب کا سچا ہونا اور مدت دراز سے زیارت کا متمنی و آرزو مند ہونا ظاہر کیا۔ مگر حضرت نے مطلق التفات نہ کیا۔ اہل خانقاہ کو تعجب ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ مگر کسی کو پوچھنے یا کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بعض مخلصین نے بالآخر سفارش کر دی تو آپ کو یہ بات ناگوار گزری اور غصے سے فرمایا ”جب تمہیں دخل نہیں تو اس کام میں بولا کیوں کرتے ہو۔ اس کے قلب کو تو دیکھو دنیا بھری پڑی ہے“ خیر وہ نابینا چلا گیا دس بارہ روز کے بعد عرس تھا کسی نے دیکھا کہ قوالی میں خوب خوب حال لاتے تھے جس نے خانقاہ میں اس کا ذوق شوق حضرت کے متعلق دیکھا تھا پوچھا کہ ”میاں حضرت کے ساتھ شوق و ولولہ کہاں گیا“ وہ نابینا صاحب تھے راست گو کہنے لگے..... بھیا یہ تو یاروں کے دھندے ہیں خیال تھا تمہارے میاں صاحب پر سکہ جم جائے گا تو آؤ بھگت ہوگی، عرس تک دن نکال لوں گا۔ پھر عرس میں حال قال میں بھرم بندھے گا۔ باقی کیسا شوق اور کیسی تمنائے زیارت، ہم تو سیاح آدمی ہیں یوں ہی گزارتے پھرتے ہیں۔

نے خادم ہیج کس نہ مخدوم کسے
گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

ابھی چائے موجود تھی

مولوی شریف حسین مداری جو حضرت کے شاگرد تھے، حضرت کے دیوبند تشریف لانے پر ایک سماوار میں بڑے عمدہ چائے بنا کر بڑے شوق سے لائے۔ دیکھا تو بیٹھک اشخاص سے بھری ہوئی تھی۔ سوچتے رہے کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں، آخر یہ سوچ کر کہ خاص خاص حضرات کو پلا دیتا ہوں، دہلیز پر بیٹھ گئے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا، مولوی شریف حسین ایک طرف سے پلانا شروع کر دو، وہ پریشان تو ہوئے لیکن تعمیل ارشاد میں داہنے ہاتھ سے تقسیم کرنا شروع کر دی، تقریباً پچیس آدمی مجمع میں موجود تھے۔ سب نے چائے پی لی تو سماوار کھول کر دیکھا تو اس میں ابھی چائے موجود تھی اور یہ برتن صرف چھ پیالی کا تھا۔

آفتاب کے منہ پر سے ابر کھل گیا

حضرت کا معمول تھا کہ ہر روز ۱۲ بجے دوپہر کو حجرہ کی گھڑیاں دھوپ گھڑی سے ملاتے تھے ایک دفعہ ایسا ہو کہ متواتر کئی دن ابر محیط رہا اور دھوپ نہ نکلی ایک دن دھوپ نکلی تو اس طرح کہ کبھی دھوپ کبھی بادل، حضرت بارہ بجے سے کچھ قبل گھر سے تشریف لائے اور مولوی علی رضا سے کہا کہ جب بارہ بجیں مجھے خبر کرنا اور خود قریب ہی ایک جگہ لیٹ گئے، جب آئے تو دھوپ تھی لیکن جس وقت سایہ خط کے قریب (۱۲ کے خط کے قریب) پہنچنے لگا تو دفعۃً ایک بہت بڑا بادل سورج پر چھا گیا۔ گھبرا کر عرض کیا گیا کہ حضرت دھوپ چھپ گئی، آپ اٹھ کر دھوپ گھڑی کے پاس آگئے، آپ کا آنا تھا کہ بادل درمیان سے پھٹ گیا۔ آپ نے گھڑی ملائی اور حجرہ میں تشریف لے گئے۔ یا تو ایسا تھا کہ ابھی دس بارہ منٹ آفتاب نہ نکلے گا یا آپ کے آتے ہی آفتاب کے منہ پر سے ابر کھل گیا اور ایسا ہو گیا جیسے کوئی برقع سے منہ کو نکال دے یا جھرو کے سے جھانکنے لگے۔

جا جا پہاڑ پر چڑھ جا

مولوی عبد السبحان صاحب انسپکٹر پولیس گوالیار کے ایک تحصیلدار دوست برخواست کر دیئے گئے خاصی کوشش کی کہ دوبارہ تقرری ہو مگر ناکامی ہوئی۔ بالآخر دعا کیلئے گنگوہ پہنچے۔ حضرت نے فرمایا ”تمہارے وطن کے قریب جو میدان ہے وہاں ایک مجذوب فقیر رہتے ہیں ان سے ہمارا سلام کہہ دینا“ تحصیلدار صاحب سمجھے کہ ٹال دیا، دل برداشتہ ہو کر واپس ہو گئے اور فقیر کے پاس بھی نہ گئے۔ کچھ دنوں بعد اتفاقاً ادھر گزر ہوا، تو فقیر مجذوب بیٹھا ہوا تھا۔ دور ہی سے ان کو دیکھ کر فقیر نے کہنا شروع کیا ”بابا مولوی صاحب نے بھیجا ہے جا جا پہاڑ پر چڑھ جا“ یہ سن کر انہوں نے حضرت کا سلام تو پہنچا دیا مگر رنجیدہ و مغموں یہ سوچتے ہوئے مکان کو واپس ہوئے کہ مولانا نے یوں ٹالا اور انہوں نے اس طرح ٹالا، کام کچھ بھی نہ ہوا۔ اسی بیچ و تاب میں تحصیلدار صاحب مکان پر پہنچے تو حکم آیا ہوا تھا کہ تم بحال کئے گئے اور مینی تال کا تبادلہ ہوا۔

تم گنگوہ ہی جاؤ

مولوی عبد السبحان صاحب کے ایک دوست مولوی محمد قاسم صاحب کاشغر بندوبست

ریاست گوالیار سے ریاست کی جانب سے تین لاکھ روپے کا مطالبہ ہوا۔ ان کے بھائی مولانا فضل الرحمن صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں گنج مراد آباد پہنچے۔ انہوں نے وطن دریافت کیا، عرض کیا گیا دیوبند مولانا نے تعجب کیساتھ فرمایا۔ گنگوہ حضرت مولانا کی خدمت میں کیوں نہ گئے۔ اتنا لمبا سفر کیوں اختیار کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت یہاں مجھے عقیدت لائی ہے مولانا نے فرمایا تم گنگوہ ہی جاؤ۔ تمہاری مشکل کشائی حضرت گنگوہ ہی کی دعا پر موقوف ہے۔ تمام روئے زمین کے اولیاء بھی اگر دعا کریں تو نفع نہ ہوگا۔ چنانچہ واپس ہوئے اور بوسیہ حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب نے سفارش کی تو حضرت امام ربانی نے ارشاد فرمایا کہ میرا کوئی قصور نہیں کیا، یہ صاحب مدرسہ عربی دیوبند کے مخالف ہیں جو اللہ کا ہے۔ سو قصور وار بھی اللہ پاک کے ہوئے حق تعالیٰ سے توبہ کریں۔ بندہ دعاء کرے گا۔ چنانچہ ادھر انہوں نے توبہ کی ادھر مطالبہ سے کمشنر صاحب کی برأت ہو گئی۔

دو رکعت پڑھو

ایک مرتبہ دو اجنبی شخص آئے۔ سلام و مصافحہ کے بعد بیعت کی تمنا ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا ”دو رکعت پڑھو“ حضرت کے اس ارشاد پر تھوڑی دیر تو دونوں صاحب گردن جھکائے بیٹھے رہے پھر چپکے سے اٹھ کر چلے گئے۔ جب دروازہ سے باہر ہو لئے تو حضرت نے فرمایا دونوں شیعہ تھے۔ میرا امتحان لینے آئے تھے۔ حاضرین میں سے بعض آدمی اس کی تحقیق کو ان کے پیچھے گئے اور معلوم کیا تو واقعی رافضی تھے۔

ورنہ گمراہی کا احتمال ہے

مرزا غلام احمد قادیانی جس زمانے میں براہین لکھ رہے تھے اور ان کا اخبارات میں چرچا ہو رہا تھا اس وقت تک ان کو حضرت امام ربانی رحمہ اللہ سے عقیدت تھی۔ اس طرف جانے والوں کو پوچھا کرتے تھے کہ حضرت مولانا اچھی طرح ہیں؟ اور دہلی سے گنگوہ کتنے فاصلے پر ہے؟ راستہ کیسا ہے وغیرہ، اسی زمانہ میں حضرت نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ ”کام تو یہ شخص اچھا کر رہا ہے مگر پیر کی ضرورت ہے ورنہ گمراہی کا احتمال ہے“ اس کے بعد ہی مجددیت، مہدویت، و عیسویت کے خیالات ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔

اچھا جلدی کیا ہے

افسر الاطباء حکیم احمد سعید امرہوی رحمۃ اللہ علیہ بیعت ہونا چاہتے تھے مگر کسی جگہ نظر نہ ٹکی اسی خیال سے گنگوہ حاضر ہوئے۔ حضرت کے کمال اتباع سنت کو دیکھ کر عقیدت پیدا ہوئی مگر پھر یہ خیال ہوا کہ جب تک ادھر ہی سے قلب کو نہ کھینچا جائے گا بیعت نہ کروں گا۔ کئی دن کے قیام میں معمولات پسندیدہ اور اخلاق حمیدہ دیکھ کر ارادہ کر ہی لیا۔ بعض خدام کے واسطے سے درخواست کی، حضرت نے صاف انکار فرمادیا کہ نہیں بیعت نہیں کروں گا۔ ”بڑے لوگوں کو مرید بنا کر جان کو آفت میں ڈالنا ہے، کوئی سفارش کراتا ہے کوئی الزام لگاتا ہے۔ غرض ٹھیک نہیں“ حکیم صاحب بڑے افسردہ ہوئے کہ مجھ میں یہ قابلیت نہیں کہ مرجع خلایق اور کامل راہبر کی دست بوسی نصیب ہو۔ اب اسی افسوس میں کئی دن گزر گئے آخر ایک دن حضرت کو حجرہ میں تنہا دیکھ کر اندر چلے گئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے محرومی کی امید نہ تھی گو میں ناقابل ہوں مگر حضرت تو سب سے قابل ہیں۔ حضرت نے ان کو فرمایا ”اچھا جلدی کیا ہے، ابھی اپنے قلب کا اطمینان تو کر لو“ حکیم صاحب اپنے وسوسہ پر بہت نادم ہوئے اور معذرت کی آپ نے فرمایا۔ نہیں نہیں بیعت سے متعلق انسان کو ہر طرح قلب مطمئن کر ہی لینا چاہئے۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

پس بہر دستے نباید داد دست

بالفعل تم واپس جاؤ اور اپنا کام شروع کرو۔ حق تعالیٰ برکت عنایت فرمائے گا۔ اسکے بعد حکیم صاحب کے قلب پر سکون طاری ہونا شروع ہو گیا بے چینی دور ہو گئی اور وہ تعلق قائم ہو گیا جو مرید کو اپنے شیخ سے ہوتا ہے۔ وطن سے حیدر آباد گئے تو دنیاوی برکات بھی حاصل ہوئیں۔ افسر الاطباء کا خطاب ملا، اور بڑے بڑے ڈاکٹروں کے مقابلہ کے باوجود اعزاز دن بدن بڑھتا رہا۔

شیخ عبدالقادر گیلانی کے حکم سے بیعت

حضرت منشی رحمت علی صاحب جالندھری خلیفہ ارشد حضرت شاہ عبدالرحیم راپوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے تھے۔ ان کو جب شیخ کی تلاش ہوئی تو حضرت شیخ

عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خواب میں زیارت ہوئی اور انہوں نے فرمایا کہ گنگوہ جاؤ اور مولوی رشید احمد سے بیعت کرو۔ چنانچہ حضرت منشی صاحب حضرت سے بیعت ہوئے۔

خواب میں مرشد کی اطلاع

اسی طرح حضرت حافظ محمد صالح صاحب (نکودری جالندھری) کو جب مرشد کی تلاش ہوئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میں اس بزرگ سے بیعت لوں گا جس کی مجھے خواب میں زیارت ہو۔ چنانچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت ہوئی۔ پھرتے پھرتے گنگوہ پہنچے اور جاتے ہی پہچان لیا غالباً دھڑ بھی اطلاع ہو چکی تھی۔ درخواست بیعت پر فوراً بیعت کر لیا۔ اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں اول تو متوسلین بھی حضرت کی صحبت کیمیا اثر سے اس کو معمولی بات سمجھتے تھے نہ کسی کو یاد رکھنے کی طرف توجہ ہوئی، نہ محفوظ کرنے کا خیال پیدا ہوا، پھر بھی ”تذکرۃ الرشید“ میں حضرت مولانا عاشق الہی نے بڑے سائز کے تیس صفحات میں ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے اس بات کی تکمیل کے لئے چند واقعات لے لئے ورنہ

اس شرح بے نہایت کز حسن یار گفتند

حد نیست کز ہزاراں کاندہ عبارت آمد

وصال

۱۲ جمادی الاول ۱۳۲۳ھ کو آپ تہجد کی نماز میں مشغول تھے کہ آپ کے پاؤں کی دو انگلیوں کے درمیان کسی جانور نے کاٹا۔ آپ کو محویت نماز کے سبب احساس بھی نہ ہوا۔ جب فجر کی نماز کیلئے باہر آئے تو کپڑوں پر خون کی سرخی تھی جلدی کپڑے تبدیل کر کے جماعت کرائی اور جب چارپائی پر جا کر لیٹے تو معلوم ہوا کہ انگلیوں پر خون جما ہوا ہے۔ خاصا خون نکل چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ضعف و نقاہت اور کمزوری و غنودگی طاری رہنے لگی۔

۲۷ جمادی الاول ۱۳۲۳ھ مطابق ۳۱ جولائی ۱۹۰۵ء آپ کو تپ لرزہ ہوا۔ پاؤں کے زخم کو معمولی سمجھ کر خاص علاج نہ کیا تھا۔ اب اس جگہ نیلگوں چھالے پڑ گئے، یہ بھی خیال ہوا

کہ کسی نے سحر نہ کیا ہو۔ ہر طرح کا علاج معالجہ کیا گیا۔ مگر جو وقت مقدر تھا وہ کب ٹل سکتا تھا، اسی زخم کی وجہ سے ورم ہو گیا جو بڑھتے بڑھتے اوپر کو چڑھتا گیا۔

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کو چھ روز سے جمعہ کا انتظار تھا بیوم شنبہ دریافت فرمایا کہ آج کیا جمعہ کا دن ہے؟ خدام نے عرض کیا کہ حضرت آج تو شنبہ ہے، اسکے بعد درمیان میں کئی بار یوم جمعہ کو دریافت کیا، حتیٰ کہ جمعہ کے دن جس روز وصال ہوا، صبح کے وقت پھر دریافت فرمایا کہ کیا دن ہے؟ اور جب معلوم ہوا کہ جمعہ ہے تو فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ باختلاف روایت ۸ یا ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کو بیوم جمعہ بعد اذان یعنی ساڑھے بارہ بجے آپ نے دنیا کو الوداع کہا اور اٹھتر سال سات ماہ تین یوم کی عمر میں رفیق اعلیٰ کی جانب ہنستے اور مسکراتے ہوئے سدھارے۔

تاریخ ہائے وفات

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ
 حضرت شاہ عبدالرحیم راپوری رحمۃ اللہ علیہ
 حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
 حضرت مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ
 مولانا محمد شفیع گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ
 مولانا محمد شفیع گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

انہ فی الآخرة لمن الصالحین
 کنت حمیدا لمت شہیدا.
 مولانا عاش حمیدا مات شہیدا
 حی دخل الخلد.
 اے وائے نہاں شد آفتاب عرفان
 گفتند کہ وے شدہ خراماں بجان

تصنیفات و تالیفات

- ۱ تصفیۃ القلوب : حضرت حاجی صاحب کی تصنیف ضیاء القلوب کا اردو ترجمہ۔
- ۲ امداد السلوک : تصوف کے رسالہ 'مکیہ' کا ترجمہ جو اوائل شباب میں کیا۔
- ۳ ہدایۃ الشیعہ : ہادی علی شیعہ لکھنوی کے اعتراضات کے جوابات۔

- ۴ زبدۃ المناسک : حج کے متعلق تمام مسائل ضروریہ۔
- ۵ لطائف رشیدیہ : چند آیات قرآنی کے نکات اور پردہ شرفاء ہند کا حدیث سے ثبوت
- ۶ فتاویٰ میلاد و عرس وغیرہ مع تصدیقات دیگر علماء۔
- ۷ رسالہ تراویح : بیس رکعت تراویح کا احادیث سے ثبوت۔ الرای النجیح فی اثبات التروایح۔
- ۸ قطوف دانیہ : محلہ کی مسجد میں جماعت ثانیہ کی کراہت کا فقہ سے ثبوت۔
- ۹ جمعہ فی القری : اہل حدیث کے اس فتوے کا جواب ہے جس میں انہوں نے گاؤں میں جمعہ جائز ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اوثق العری۔
- ۱۰ رد الطغیان : کلام مجید کے اوقاف کو بدعت ثابت کرنے والوں کا جواب۔
- ۱۱ احتیاط الظہر : اسکا ثبوت کہ جہاں جمعہ ہو جاتا ہے وہاں احتیاط ظہر کی ضرورت نہیں
- ۱۲ ہدایۃ المغتدی : قرآن فاتحہ خلف الامام کے جوابات۔
- ۱۳ سبیل الرشاد : رد عدم تقلید۔
- ۱۴ براہین قاطعہ : انوار ساطعہ کا جواب نیز رد بدعت و تحقیق سنت میں لاثانی کتاب جو حضرت کے حکم سے لکھی گئی اور آپ نے اول تا آخر بغور مطالعہ کر کے تصدیق فرمائی۔

۱۵ فتاویٰ رشیدیہ

۱۶ رسالہ خطوط از نام مولوی قدرت اللہ صاحب



دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم مشرب علماء و فضلا کے حالات و مجاہدات، خدمات اور بے مثال کارناموں کا قابل قدر اور قیمتی و زریں سلسلہ

سوانح علمائے دیوبند

جلد دوم

سوانح علمائے دیوبند کی جلد اول آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں جلد دوم میں ساڑھے چھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل مندرجہ ذیل علمائے کرام کے تفصیلی حالات اور مجاہدات ملاحظہ فرمائیں۔

- حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
- حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ
- حضرت حاجی سید محمد عابد حسین دیوبندیؒ
- حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ
- حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہیؒ
- شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ
- فخر العلماء حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ

تیسری، چوتھی اور پانچویں جلد زیر طبع ہے۔

نواز پبلی کیشنز دیوبند کی دیگر مطبوعات

ہادی عالم سیرت پاک کے موضوع پر محترم ولی رازی صاحب کی اردو زبان میں دنیا کی پہلی بغیر نقطوں والی تصنیف۔ عاشقان رسول کے لئے ایک تحفہ، شاندار کمپیوٹرائزڈ نئی کتابت، نیا گیٹ اپ۔ تصحیح شدہ جدید ایڈیشن۔ صفحات 304 عام قیمت - 80 /

حکایات اسلاف دیوبند (مکمل) ڈاکٹر نواز دیوبندی نے پاکستان کے مصنف مولانا اعجاز احمد خاں سنگھانوی کی دو جلدوں پر مشتمل ”حکایات الاسلاف“ سے صرف اسلاف دیوبند کی معتبر اور سبق آموز حکایات کا انتخاب کیا ہے خصوصیت سے ماضی قریب کے علماء کی حکایات کو ترجیح دی گئی ہے۔ صفحات 368 عام قیمت - 92 /

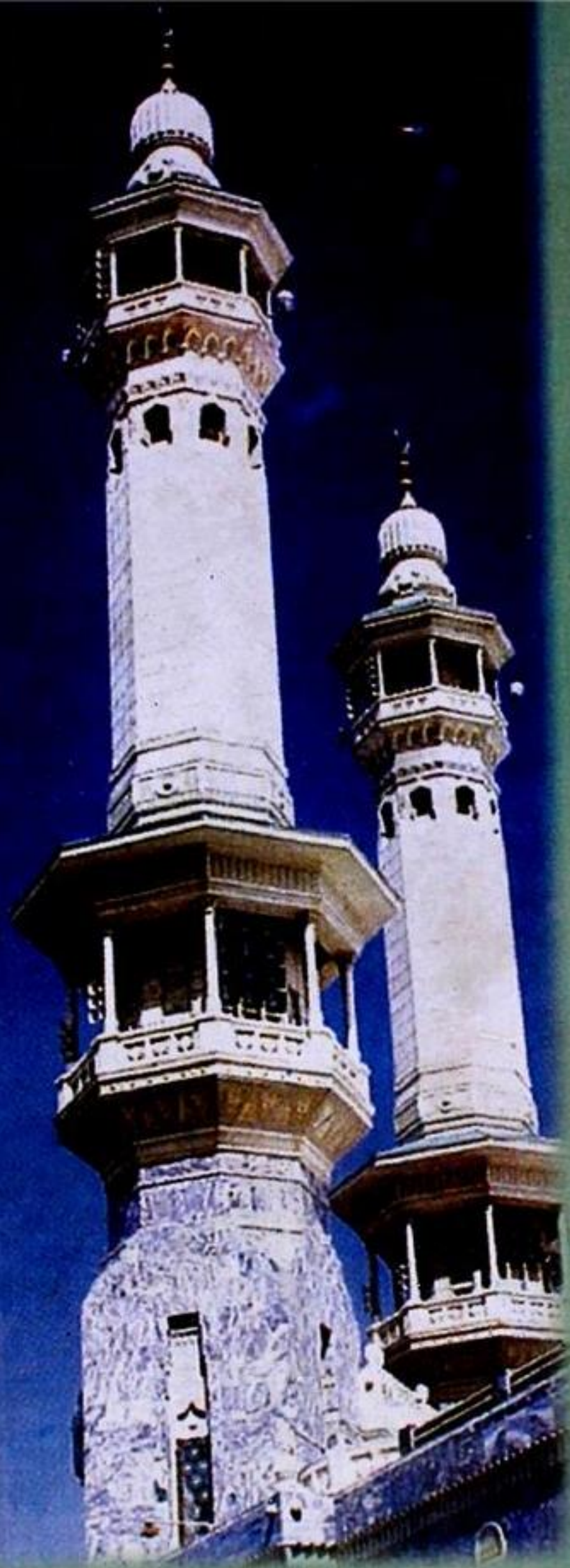
ذاتی ڈائری سکھ دھرم کو ترک کر کے اسلام کا جام توحید پینے والے اور ریشمی رومال تحریک کے عظیم مجاہد۔ امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی خود نوشت ”ذاتی ڈائری“ ایک تاریخی دستاویز ہے اور ان کے درد دل کا آئینہ بھی۔ حضرت سندھی کے مزید تحقیقی حالات رولٹ کمیشن کی رپورٹ اور حضرت سندھی کا ایک معرکتہ الآرا خطاب آپ کے مطالعہ کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ صفحات 72 عام قیمت - 20 /

تاریخ آب زمزم محترم سید محبوب رضوی کا ایک تحقیقی مقالہ۔ آب زمزم کا سائنٹیفک تجزیہ۔ عام قیمت - 4 /

عارف باللہ حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب کی مندرجہ ذیل نایاب تصانیف اب زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

مفید الوارثین	80/-	الجواب المتین	30/-	حیات خضر	26/-
إطافہ ثمانیہ	16/-	چہل حدیث	16/-	مولوی معنوی	18/-
تعبیر نامہ خواب	12/-	دست غیب	12/-	میراث المسلمین	12/-
تعبیر صادق	10/-	مدایہ المقتدین	8/-	ارشاد النبی	10/-
مسافر آخرت	8/-	گلزار سنت	8/-	ناقابل اعتبار روایات	12/-

Nawaz Publications Deoband



Nawaz Publications

Deoband, Pin: 247554 U.P. (INDIA)

toobaa-elibrary.blogspot.com